جاسوسی ڈائجسٹ
ستمبر 2014
معراج رسول

مدیر اعلیٰ
عذرا رسول

پبلشر و پروپرائٹر: عذرا رسول • مقام اشاعت: C-63 فیز II ایکسٹینشن ڈیفنس کمرشل ایریا مین کورنگی روڈ کراچی 75500
پرنٹر: جمیل حسن • مطبوعہ: ابن حسن پرنٹنگ پریس ہاکی اسٹیڈیم کراچی

عزیزانِ من، السلام علیکم!

ستمبر کا شمارہ آپ کے ذوق کی نذر ہے۔ دنیا بھر میں حکمراں طبقے کی لوٹ مار کوئی نئی بات نہیں ہے۔ دولت میں اضافہ اور اچھے اللّے تللّے اور ذہن کے اقتدار کی چوکھٹ پر پیشانیاں رگڑ رگڑ کر لہولہان کرلینے والے ہر ملک اور ہر خطے میں موجود ہیں۔ ابلاغ کے ذرائع محدود تھے تو یہ کہانیاں زیادہ عام نہیں ہوتی تھیں۔ جب سے ان ذرائع میں بے رحم کیمروں اور دیگر الیکٹرونک آلات کا دخل ہوا ہے خواب گاہوں تک کی سرگوشیاں گونجنے لگی ہیں۔ امریکا، فرانس، برطانیہ سے لے کر بھارت، ہمارے سوڈان تک متعدد لوگ پکڑے جاچکے ہیں اور سزایاب بھی ہوئے ہیں۔ کرپشن ایک عالمی ناسور ہے جو ہر سو پھیلا ہوا ہے اور تمام تر انسدادی تدبیروں کے باوجود پھیلتا ہی جارہا ہے۔ اس سے مقننہ محفوظ ہے نہ انتظامیہ اور نہ عدلیہ۔ ابلاغ کے شعبے میں بھی اتفاقوں اور بعض قسمت کے فیصلے آئے دن سنائی دیتے ہیں۔ بعض اوقات ہوتی ہے۔ ہر ایک موقع ملنے پر حسبِ توفیق ہاتھ دھولیتا ہے لیکن مشکل یہ ہے کہ اقتدار ہر ملک میں سیاست دانوں کے قبضے میں ہوتا ہے۔ درحقیقت وہی اپنے ملک اور قوم کا چہرہ ہوتے ہیں اس لیے ان کے بگڑنے جانے پر وہی سب سے زیادہ بدنام اور بے اعتبار ہوتے ہیں۔ ایک مچھلی پورے تالاب کو گندا کرتی ہے، اسی طرح ایک بدنیت اور بدقماش سیاست داں اپنی پوری برادری کی ذلت و رسوائی کا سبب بنتا ہے اور اس کی اڑائی ہوئی کیچڑ سے پارساؤں کے دامن بھی آلودہ ہوجاتے ہیں۔ دوسری طرف اربوں کے سودے بھی اور کھربوں کے ٹھیکے حاصل کرنے والے شہرۂ آفاق ادارے کروڑوں اور اربوں کے نذرانے اور کک بیک خفیہ تجوریوں میں لیے ان زرپرستوں کے آگے پیچھے منڈلاتے رہتے ہیں اور انہیں ترغیب و ترہیب کے جال میں پھانس لیتے ہیں جو عوام کے ٹیکسوں کا سرمایہ لٹا جاتا ہے۔ ٹینکوں اور بموں کا بوجھ جاتا ہے۔ تعمیر تک کو نہیں بخشا جاتا۔ ورکسی سے لنگوٹی تک جو رکھوا جاتا ہے وہ ایک پیکس رہتا ہے۔ ملکی بہبود کے نام پر ہر حربے سے اِل خزانے میں جمع کیا جاتا ہے اور پھر اس کے کھانے اور اڑانے کا بندوبست کیا جاتا ہے۔ واسطہ ٹیکسوں کی مد میں جتنی زیادہ رقم آتی ہے خزانہ اتنا ہی تنگ دست ہوتا ہے اور گھپلوں کے مواقع وسیع ہوجاتے ہیں۔ دس لاکھ ٹیکس پر دس فیصد کرپشن کے صرف ایک لاکھ بنتے ہیں مگر بیس لاکھ کے خزانے پر اٹھ فیصد سے کرپشن دو لاکھ ساٹھ ہزار کا بنتا ہے۔ عوام کو ہندسوں کے فریب میں الجھانے والے ماہرین خوشی کے شادیانے گانے لگتے ہیں کہ کرپشن میں دو فیصد کمی آگئی ہے۔ اس لعنت کا حجم بڑھ جانے کا قصہ دوسرے سے گول کر جاتے ہیں۔ یہ بہت اذیت ناک صورتِ احوال ہے۔ اپنے ملک کا حال بھی کچھ اچھا نہیں۔ جو دنیا بھر میں ہو رہا ہے وہ یہاں بھی پورے اعتماد کے ساتھ ہو رہا ہے۔ جدھر کی ہوا ہے سب اُدھر ہی چل رہے ہیں۔ ہم اپنی محدود وسائل میں اس عالمی رجحان کو کسی طرح کم نہیں کرسکتے لیکن اپنے ملک میں بھرپور قانون سازی اور اس کی مکمل پاس داری کرکے اس فتنے پر قابو پاسکتے ہیں۔ سوال یہ ہے کہ اس کارِ خیر کی ابتدا کون کرے گا۔ مسند نشین یا ان کے جانشین یا بیچارے ہم جیسے لوگوں کی دعائیں لے گا۔ اس امید کے ساتھ اب چلتے ہیں محفل کی طرف جہاں ہندسوں کا نہیں، الفاظ کا گورکھ دھندا ہوتا ہے۔

راولپنڈی سے عرفان راجا کی ستائش ”2004ء سے جاسوسی سے تعلق ہے۔ اس وقت 9th کلاس کا طالب علم تھا اور آج ایم ایس سی ریاضی کرنے کے بعد تحقیق و تدریس سے منسلک ہوں اور جاسوسی کا ساتھ بھی ہنوز برقرار ہے۔ اگست کے شمارے کا سرورق بھی زبردست لگا۔ ادارے کے دیرینہ کارکن شاہد حسین صاحب کی وفات پر بہت افسوس ہوا۔ اللہ تعالیٰ مغفرت فرما کر جنت الفردوس میں اعلیٰ مقام عطا فرمائے۔ کہانیوں میں جواری سے آغاز ہوا۔ فرید الدین عرف خاور عرف سلیم اب کہ تم اختر راجا بن گیا ہے اور اس قسط میں بدر شاد کا کردار بھی کھل کر سامنے آ رہا ہے۔ ملک صاحب احمد اقبال کہانی میں تیزی لا رہے ہیں۔ اس کے بعد آوارہ گرد نے جاسوسی میں شائع ہونے والی بہت سی کہانیوں کی تیز رفتاری کے ریکارڈ توڑ دیے۔ مجری صاحب قانونی طور پر اور عملی اختیار کرنے کے حامی تھے لیکن قسمت پھر بیگم صاحب کے در پہ لے گئی اور اب حسنی تحریر سے کی توقع ہے۔ آسیہ کا کردار عجیب رہا۔ اب اس بار کی خاص کہانی بھی تجسس زدہ کر جانے۔ مریم کے خان کی کہانی میں کاشف زبیری جھلک محسوس ہوئی۔ سادہ مجھ آپ کی خوشی کی ہے۔ جمشید جان بہ بار اور دقار دہشت کی خوشی کی زیادہ محسوس ہوئی کیونکہ ان کے پاس ہوس، حرص اور لالچ کا زہر تھا جو بچھو کے زہر سے زیادہ تکلیف دہ ہے۔ زندان شکن میں کاشف زبیری نے پرانے دوستوں سے ملاقات کراکے طبیعت میں خوش مزاجی پیدا کردی۔ ہنسی اور مزاح کے پیرائے میں مصنف نے لالچ، حرص اور ہوس جیسے عناصر کو نمایاں کیا۔ منظر امام نے بھی تحفہ کی صورت میں ادھی کاوش پیش کی۔ ہار جیت میں مصنف نے اپنی مشکلات کی خود وضاحت کی۔ کہانی ادھوری تھی لیکن زود مکمل میں کہانی کو سمیٹ گیا۔ ابتدائی صفحات اس مرتبہ دو چند دینے کے حصے میں آئے جہاں انہوں نے دوسرے کی شکل میں ادھی تحریر پڑھنے کے لیے دی۔ فرحان نے دولت کے لالچ میں بے گناہ انسانوں کو موت سے ہمکنار کیا بدلے میں خود بھی موت خرید لی۔ شوکت اللہ کا کردار بھی عبرت انگیز تھا۔ برے کاموں اور حرص و دولت کا انجام اذیت ناک موت ہی ہوتی ہے۔ قیصر اور مریم کے کردار اچھے انداز میں پیش کیے گئے۔ کفارہ میں عمارا زادے انسانی روحوں کی دکانیں کی۔ باصول میں بھی اپنے ہم پیشہ سے ٹکرا گیا اور مکاری خود شکار ہوگیا۔ جفا در جفا میں بشریٰ اسجد نے ظلم کی کتھا سنائی۔ داستان جہرے میں بے رحمانی کے عنصر کی وضاحت کی گئی لیکن انجام چونکا دینے والا تھا۔ جوہر دیانت کی صفت میں اچھی ابلیس اور مار باکے ڈنگ میں بجسس کی لیکن حاضر دماغی اور خوش قسمتی سے دونوں سے چھٹکارا حاصل کرلیا۔ مجموعی طور پر شمارہ اچھا رہا۔“

اٹک ورلی سے تصویر العین کی نمبر نگاری ”ٹائٹل بہت زبردست تھا نیچے دائیں طرف موجود شخص کو دیکھ کر اداکار فیصل رحمان یاد آگئے۔ مسعود

شاہد حسین کی وفات کا پڑھ کر بہت افسوس ہوا۔ خدا مرحوم کے گھر والوں کو صبر جمیل عطا فرمائے اور مرحوم کو جنت الفردوس میں جگہ عطا فرمائے۔ تفسیر عباس بھائی کو دیکھ کر بہت خوشی ہوئی۔ مبارکاں بھائی۔ شکر ہے کہ تفسیر بھائی آپ کا چپ شاہ کا روزہ ٹوٹا اور انٹری ہوئی۔ مبشر حسن تبصرہ پسند کرنے کا بہت شکریہ۔ محمد صفدر معاویہ میں ہمیشہ پہلی بار میں آپ کا نام ایسر معاویہ پڑھتی ہوں کیونکہ آپ کا نام پڑھ کر یہی نام ذہن میں آتا ہے۔ محمد قدرت اللہ نیازی کا تبصرہ بھی جاندار تھا۔ افتخار حسین اعوان، نازک دل کا چارہ الٹا ہے دل ہمیشہ مضبوط ہونا چاہیے۔ ذریا اعجاز ایمانداری کو ادارہ آپ کا مشورہ آپ پر ہی لاگو کر دے سوالیہ کیئر فل۔ سید جمیل کو بھی اس کا مطلب آپ کے ساتھ وہ والا معاملہ ہے کہ ہمیشہ دیر کر دیتا ہوں۔ ثاقب تبسم! بہت عرصہ بعد رونق بخشی محفل کو۔ محمد وقاص خالد جاسوسی کی محفل میں تو آگئے لیکن خانپور کے پیڑے تو ساتھ نہیں لائے، بہرحال خوش آمدید۔ انیلا یقین مانو میں نے کڑک چائے پی کر تبصرہ نہیں لکھا اور ناتی گرمی میں بھلا بھی کون پی سکتا ہے مگر پھر بھی تمہیں کڑک لگا پتا نہیں کیوں۔ محمد عزیر اسد ایسا کبھی کبھار ہو جاتا ہے اتنا غصہ صحت کے لیے ٹھیک نہیں، اب تو نام ٹھیک شائع ہوا ہے۔ اپنے غصے پر پانی ڈال دو۔ جاسوسی کی پہلی کہانی واقعی جاسوسی کی جان تھی۔ بااصول میں جینیٹ اور جی دونوں ہی شکار تھے اور دونوں ہی شکاری بھی تھے۔ لیکن ذہنی طور پر حاضر دونوں میں سے ایک ہی نے زندہ رہنا تھا اور یہ اعزاز جینیٹ کے حصے میں آیا۔ منظر امام کی تحفہ ہم سب کے لیے عید کا تحفہ ثابت ہوئی۔ مسٹر صاحب کی حرکتیں شروع میں عجیب لگیں لیکن انجام پڑھ کر مزہ آ گیا۔ کاشف زبیر کی دوراں خشک نے ہنسا ہنسا کر پیٹ میں بل ڈال دیے۔ آوارہ گرد میں ریحان کی خود غرضی پر بہت غصہ آیا۔ اب تجسس اس بات کا ہے کہ شہزادہ اور بیگم صاحب کا کیا تعلق ہے۔ ہار جیت بھی زبردست کہانی تھی۔ مریم کے خان ایک زبردست رائٹر ہیں اور ان کی ہر کہانی ہی بہترین ہوتی ہے۔ اس بار بھی نیش زنی بہت ہی اچھی کہانی تھی لیکن سجاد کا کردار اچھا نہیں لگا، اینڈ ضرور اچھا تھا۔ کترنیں اور کارٹون نما قام جوکس بہت اچھے تھے۔“

ظاہر پیر، رحیم یار خان سے ظاہر چوہدری کی بار یک بینی ”اس دفعہ بیدار کافی تنگ ور اور دل جلانے کے بعد (دوسروں کی طرف سے) 9 اگست کو نصیب ہوا۔ دوشیزہ کی تیکھی آنکھوں سے وعدے کے مطابق انگلیاں تھا کے صاحب بہادر کا جائزہ لیا۔ وہ غالباً ناؤن فی کا پاپ پلا رہے ہیں جس کا کسی نے سودا مانگ لیا۔ ساتھ ہی موجود ستمگر دوشیزہ کی طرح ہی تا کا بھاگی کا مرتکب پایا گیا۔ شاہد حسین کے انتقال کا پڑھ کے دکھ ہوا۔ باری تعالیٰ مرحوم کو اپنے جوارِ رحمت میں جگہ اور پسماندگان کو صبر عطا فرمائے۔ ذرا آگے لالہ افتخار اعوان مسلسل تجربے، ذریا اعجاز صاحبہ اپنے مخصوص جارحانہ انداز اور شاہ جی ازلی معصومانہ شوخی بھری سنجیدگی کے ساتھ موجود ہیں۔ وقاص خالد نے بھی آخر کار میری طرح جرأت کر ہی لی۔ تبصرے سب ہی دوستوں کے اچھے ہیں۔ لالہ کبیر عباسی، ملک ادالوں سعید اور اپنے گرائیں اور دوست وہ مظہر سلیم بھائی کی کمی محسوس ہوئی۔ عادت سے مجبور سب سے پہلے جواری سے ابتدا کی۔ سلوانی کی دھوکا دہی دل ماننے کو تیار نہیں۔ دوسرے تو بھی اتنا کہ نہیں راجا ندیم اختر صاحب اگلے چھ مہینے ہاجرہ بیگم کی پناہ گاہ میں سوچنے میں نہ گزار دیں۔ راجا صاحب کی صلاحیتوں کا تو میں معترف ہو گیا۔ بھلا لاکھ ڈاسٹیرنگ والی گاڑی کو دھکا لگا کے اسٹارٹ کرنا وہ بھی قلم کے کسی عام انسان کے بس کی تو بات نہیں۔ بھٹی صاحب کے قلم سے تحیر اور ایکشن سے بھرپور سلسلہ آوارہ گرد شروع ہوا ہے اب تک کافی تیز جا رہا ہے۔ ریحان کی مطلب پرستی تو دوبارہ عاصم کا توشہ خاص ہے۔ آسیہ کا کردار کافی جاندار لگ رہا ہے۔ بیگم صاحبہ کی شہزادی میں دلچسپی سے بھی پردہ اٹھ رہا ہے۔ نیش زنی مریم کے خان کی تحریر کافی ایڈونچر زدہ، ساری کہانی کا نچوڑ ایک ہی فقرے میں بیان کر دیا۔ ادھر ملک میں انسانوں کی کوئی قدر و قیمت نہیں، پر صاحب بچھو کی بہت قیمت ہے۔ جاسوسی کے اولین صفحات پر وہ جیند رشید کی خالص جاسوسی طرز کی تحریر کافی بہتر رہی۔ ایسے لگا جیسے کوئی تھرل الفلم دیکھ رہا ہوں۔ جمیل میاں کی واپسی بھی اچھی رہی۔ راجا کی دوبارہ واپسی سے محرومی پر افسوس کا اظہار ہی کر سکتے ہیں، اجالی جریاست پنگا کون لے۔ باقی شمارہ ابھی زیرِ مطالعہ ہے۔“

کراچی سے مسفرہ حسین کی جسارت ”خط لکھنے کی جسارت پہلی بار کر رہی ہوں۔ (اچھے کام میں دیر کیوں؟) امید ہے نظر انداز نہیں کیا جائے گا۔ جاسوسی نے اب کی بار کافی سے زیادہ انتظار کرایا، خیر انتظار کا بھی اپنا ہی مزہ ہے۔ بالآخر بعد از خرابی بسیار 15 اگست کو دید سے مستفید ہوئے اور عید سعید کی خوشیوں کا مزہ دوبالا ہو گیا۔ سرورق قدرے مناسب تھا۔ احباب کی محفل میں تفسیر عباس بابر کو مبارکباد۔ ذریا اعجاز کا جاندار تبصرہ بھی پسند آیا۔ تصور پڑھ کے ہمیشہ کی طرح بہترین تبصرہ لے کر آئیں۔ بابا ایمان کا مسلسل غیاب باعث تشویش ہے۔ ان سے گزارش ہے کہ اب واپس آ جائیں دنیا کے کام تو چلتے ہی رہتے ہیں۔ انیلا بھی کیا اچھا لکھ لیتی ہیں۔ بڑی واہ ہے آپ کراچی میں کہاں پائی جاتی ہیں؟ ورلڈ ریکارڈ یہ ہے کہ میں نے شمارہ دو دن میں تمام کر کے رکھ دیا۔ کیونکہ جلدی بہت زیادہ تھی اور وقت بہت کم۔ انتخاب کوئی مانے یا نہ مانے یہ ان کی مرضی پر منحصر ہے۔ پر اثر و شاندار اور نہایت دلچسپ تحریر درمکدے سے کہانیوں کا آغاز کیا۔ بہترین اور منفرد عنوان پر بنی اس تحریر نے قطعاً بور نہیں کیا۔ مریم کا شاندار کردار بہت پسند آیا۔ عورت، مرد کے شانہ بشانہ میدانِ عمل میں چل سکتی ہے چل رہی ہے۔ قبر کا پراسرار و سنجیدہ کردار بھی اچھا لگا۔ آوارہ گرد کی چوتھی قسط بھی شاندار رہی۔ آسیہ ایک بہترین اضافہ ہے۔ ریحان ملک کی منافقت سے دکھ ہوا۔ شہزادہ اور بیگم صاحب کا آپس میں کیا رشتہ ہے یہ تجسس ہنوز باقی ہے۔ احمد اقبال کی جواری جمود اور یکسانیت سے دوچار ہے۔ کاشف زبیر کی دلچسپ و چٹیلی تحریر دوراں خشک جمیل کا تذکرہ دکا نمبر اور راجا کی دلچسپ بے وقوفیاں بھی اچھی لگیں۔ دو ستارہ چہرے اچھی کہانی تھی۔ پرفریب راستوں میں کھو کر گم ہو جانے والوں کا تذکرہ دلچسپ جنت بھی خوب رہا۔ ڈاکٹر صاحب کی سنسنی خیز ایڈونچر ایکشن تحریر آوارہ گرد زبردست رہی۔ ہار جیت خاص نہیں لگی۔ مریم کے خان کی نیش زنی نے میلہ لوٹ لیا۔“ (کیا آپ کو لکھنے لکھانے سے بھی کچھ شغف ہے؟)

اوکاڑہ سے تفسیر عباس بابر کی لفاظی ”لفظوں کا انتظار گویا صدیوں پر محیط ہو گیا جو ڈھلتی ہوئی شام کے ساتھ۔ بالآخر 15 اگست کو جاسوسی کا چاند ان گنت روشن ستاروں کے جھرمٹ میں دل کے فلک پر اپنی منفرد و شاہانہ آب و تاب، تمکنت کے ساتھ طلوع ہوا۔ سرورق پر ڈاکٹر صاحب نے ایک دفعہ پھر نہایت مہارت و مشاقی کے ساتھ دلکش رنگوں کا منفرد استعمال کیا۔ دوشیزہ سرورق کا ملکوتی حسن اور دل آویز تبسم قابلِ داد و دید ہے۔ محفل نکتہ چینی میں ادارے کے اظہار خیال سے کئی تلخ و مسموم سوالات ذہن کے پردۂ اسکرین پر روشن ہوتے۔ امتِ مسلمہ کا مسلسل زوال و انحطاط یقیناً نا پسندیدہ اعمال کا نتیجہ ہے۔ خواہ

مسلم پانی سے بھی ارزاں ہو کر رہ گیا ہے۔ فرقہ بندی بے کیسی ذاتیں ہیں اور ہمارے تنزل و زبوں کا باعث بھی یہی باتیں ہیں۔ دعا ہے کہ رب عظیم مسلمانانِ عالم کو ایک اور نیک ہونے کی توفیق عطا فرمائے۔ ادارے کے دیرینہ کارکن و مصور شاہد حسین کے انتقال پر ملال نے نہایت افسردہ کر دیا لیکن موت سے کس کو رستگاری ہے۔ اللہ مرحوم کی مغفرت فرما کر پسماندگان کو صبر جمیل عطا فرمائے، آمین۔ بہاولپور سے بشریٰ افضل کی موجودگی نے مطمئن کیا۔ مانسہرہ سے سید اکبر شاہ، امتحان میں کامیابی کے لیے تہ دل سے مبارک باد۔ ڈیرہ اسماعیل خان سے سید عبادت حسین کاظمی یاد رکھنے کے لیے از حد نوازش۔ آپ نے دل سے یاد کیا اور ہم حاضر خدمت ہو گئے۔ اوکاڑہ سے بہت پیاری تصویر انجم! آپ کا بھی شکریہ کہ آپ ہمیں یاد رکھتی ہیں، ہمیں بھی یہ افواہ ہے کہ... تفسیر بابر اور تصویر انجم بہن بھائی ہیں اور ہمیں یہ افواہ بہت پسند آئی۔ سید شکیل حسین کاظمی اور ثریا اعجاز کے بہترین تبصرے دل کی آنکھوں سے پڑھے۔ علی پور چٹھہ سے ثاقب تبسم تگیز عرصہ طویل کے بعد نمودار ہوئے بہترین تبصرے کے ساتھ۔ کراچی سے انجیلی... اس سے بہتر ہے کہ کبیر عباسی اور ادارے والوں کو ادارے سمیت مریخ یا پلیس برف کے قدرتی کارخانوں میں ... کیا خیال ہے؟ کہانیوں میں سب سے پہلے روبینہ رشید کی بہترین اور دلچسپی سے بھرپور تحریر درندے پڑھی۔ بھیڑ کی کھال میں چھپے بھیڑیوں کا چشم کشا ماجرا۔ انسانی جبلت و خصلت کا روح فرسا قصہ۔ مصنوعی اشیا کے لیے انسانی خون کو اس قدر ارزاں کر دینا۔ ابلیس کے پیروکاروں کا مکروہ و قبیح عمل ہے۔ ڈاکٹر عبدالرب بھٹی کی سنسنی خیز کہانی آوارہ گرد، نہایت دلچسپ، زبردست اور شاندار رہی۔ کاشف زبیر کی زندان شکن نے متاثر نہیں کیا، ہم ان سے ایسی تھکا دینے والی تخلیقات کی توقع نہیں رکھتے۔ کنارہ میں فنکار آزاد نے بے حد متاثر کیا۔ امجد رئیس کی با اصول کے کیا کہنے۔ تحریر ریاض کی سبقت بھی کامیاب رہی۔ نوٹ ساز اور جلاد جفا بھی پسند آ گئیں۔ سرورق کا پہلا رنگ بار جیت تو دے بہتر تھا۔ دوسرا رنگ پسندیدہ ترین مریم کے خان کا منفرد دلچسپ اسلوب، نیش زر دل کی آنکھوں سے بصد شوق پڑھا۔"

گورنمنٹ کالونی اوکاڑہ سے شوکت شہریار لکھتے ہیں "اس مرتبہ کافی انتظار کے بعد جاسوسی کا دیدار ہوا، دل باغ باغ ہو گیا۔ سرورق بہت خوب صورتی سے سجایا گیا تھا اور حسینہ صاحبہ پرخمار آنکھوں سے دعوتِ نظارہ دے رہی تھی۔ حالاتِ حاضرہ سے آگاہی کے بعد محفل میں داخل ہوئے تو اپنے پیارے بھائی جناب تفسیر عباس بابر کو کرسی صدارت پر براجمان پایا اور ان کا لکھا گیا تبصرہ تو مزہ ہی دے گیا۔ بشریٰ افضل صاحبہ طاہرہ گلزار اب عمر کے اس حصے میں ہیں جہاں بھولنا کوئی خاص بات نہیں۔ سید اکبر شاہ کے تبصرے کے اوپر سے گزرتے ہوئے تصویر انجم تک پہنچے تو طویل غیر حاضری کے باوجود بھی وہ سابقہ جاہ و جلال میں نظر آئیں۔ مسعود صاحب آپ کمانے کی بات کرتے ہو؟ ہم تو سب کچھ بھول کر جاسوسی پڑھتے ہیں۔ قدرت اللہ بھائی بھی مس انجیلی سے گلہ و شکوہ کر رہے تھے۔ افتخار حسین اعوان بھائی طاہرہ گلزار کے تبصرے کی تو کسی کو بھی سمجھ نہیں آئی اس میں آپ کا کوئی قصور نہیں۔ سیف اللہ خان کا ادارے سے گلہ اور ادارے کا جواب پڑھ کر بہت ہنسی آئی۔ سیف صاحب! دریا میں رہ کر مگر مچھ سے بیر نہیں پالتے۔ (یا آپ مگر مچھ کس کو کہہ رہے ہیں؟) ثریا اعجاز اس دفعہ اچھے موڈ میں تھیں۔ سید شکیل کاظمی کے تبصرے کو انجوائے کرتے ہوئے محفل میں خالد کو جاسوسی میں دیکھ کر کہتا ہوں۔ انجیلی صاحبہ! ہم آپ کی معذرت قبول کرتے ہیں۔ عبادت کاظمی، بشیر حسین، اویس احمد خان، محمد عزیر کے تبصرے شاندار تھے۔ کہانیوں میں سب سے پہلے درندے پڑھی اور یہ بہت اچھی کہانی تھی۔ خاص طور پر اس کا انجام چوہدری مرتضیٰ کا ہوا اور مریم اور قمبر ایک رشتے میں بندھ گئے۔ دو ساتھ چہرے پڑھی تو ایسا لگا کہ جیسے کوئی خواب دیکھ رہا ہے مگر ڈاکٹر قیلوڈ اور مارگریٹ کا انجام دیکھ کر حقیقت کا پتا چلا۔ کنارہ ایک زبردست کہانی تھی اگر تکی اپنی ضد چھوڑ کے بیٹے کے پاس چلی جاتی تو وہ بے چارہ بے موت نہ مرتا۔ با اصول میں ہنی اور جینیفر کے متعلق پڑھ کے بے اختیار رومانا اور دیا آ گیا کہ شیلے پہ رہنا... منظر امام اس دفعہ استاد بھیرو کو لے کر آئے۔ پہلے پہل تو استاد جی پر بے حد غصہ آیا لیکن جب کہانی کا انجام پڑھا تو بے اختیار آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ زندان شکن پڑھ کے جاسوسی کے اتنے دن تک نہ ملنے کا دکھ ختم ہو گیا۔ کاشف صاحب! اب آپ جلدی اور شنو کی شادی کروا دیں تو مہربانی ہو گی۔ آوارہ گرد اس مرتبہ تھرل اور ایکشن سے بھرپور تھی اور شہزی کا کردار اب نکھر کر سامنے آیا ہے۔ سرورق کا پہلا رنگ بار جیت اس ماہ کی بیسٹ اسٹوری تھی۔ دوسرا رنگ نیش زر دولت کی ہوس کے ماروں کی کہانی تھی۔ مجموعی طور پر اس دفعہ کا شمارہ بیسٹ تھا۔"

مصدق محمود دانش کی گاؤں کنگ سہانی ضلع گجرات سے تنقید نما کرکے "سرورق حسب معمول تین افراد کی مثلث تھا۔ سگار کے کش لیتا پرانی فلموں کا ہیرو نما شخص بڑے اسٹائل سے کسی کو گھور رہا تھا جبکہ دوسرا ولن جیسا آدمی آنکھوں میں خباثت لیے کچھ ایسا ہی کام کر رہا تھا۔ مس سرورق جس کی تیکھی آنکھیں کوئی اور ہی کہانی سنا رہی تھیں۔ چٹکی کی محفل میں پہنچے تو تفسیر عباس بابر صاحب کو براجمان پایا، تبصرہ بھرپور اور جامع تھا پسند آیا۔ تصویر انجم صاحبہ کی کراری کراری باتیں مزہ دے گئیں، مختصر کرکے۔ ایم اے ہاشمی اور طاہرہ گلزار صاحبہ کو خوب رگڑا لگایا۔ باقی دوستوں کے تبصرے بھی اچھے تھے۔ روبینہ رشید کی درندے سنسنی اور ہنگامے سے بھرپور کہانی تھی۔ قمبر اور مریم کے کردار پسند آئے۔ جواد کی تو مستقل وارد ڈھوپ میں ہی لگا ہوا ہے۔ بے چارہ کسی ایک جگہ ٹکتا ہی نہیں۔ ریشم کی ہمت کو داد۔ ڈاکٹر عبدالرب بھٹی کی آوارہ گرد بے شک بہت مقبول ہوئی ہے مگر اس میں فرضیت نمایاں ہے اور کئی جھول ہیں۔ شیرو اور عرف شہزی کا کردار اس کا واضح ثبوت ہے۔ بہرحال انتظار ہے کہ فرضی پن کی وجہ سے کہانی مستحکم نہیں ہو پا رہی۔ سرورق کے دونوں رنگ آنکھوں اور دل کو خوب بھائے۔ بار جیت حقیقت کی ترجمانی کر رہی تھی۔ دوسرا رنگ مریم کے خان کا نیش زر گوشہ و تر بلندی پر لے گیا۔ چھوٹی یعنی مختصر طرز کی کہانیوں میں دو ساتھ چہرے اور جلاد جفا بھی کہانیاں تھیں، پسند آ گئیں انعام کرکے۔ یہ ہوا جاسوسی کا پوسٹ مارٹم۔"

ڈیرہ اسماعیل خان سے سید عبادت کاظمی کی مصروفیت "رم جھم برستی بارش میں 8 تاریخ کو جاسوسی خریدا۔ ہمیشہ کی طرح حسینہ کی آنکھوں پر توجہ دی گئی تھی۔ سرورق حسب معمول جاذب نظر تھا۔ دوستوں کی محفل میں انٹری دی۔ وکٹری اسٹینڈ پہ اپنے بھائی جان تفسیر عباس کو دیکھ کر بہت خوشی ہوئی۔ اپنے تبصرے کو دیکھ کر بے ساختہ چیخ نکل گئی کیونکہ ہمارے نام کے ساتھ کسی صاحبہ کا نام لگا دیا گیا تھا۔ حالانکہ ہماری زندگی میں ابھی کوئی صاحبہ آئی نہیں۔ آپ نے میرے بھائی صائم کا نام بگاڑ دیا۔ (ہم صاف اور واضح لکھا کریں) محمد صفدر! میں نے تین ماہ کے جاسوسی اکٹھے خریدے تھے کیونکہ تعلیمی مصروفیت کی

لکھاری حضرات آج بھی گمنام ہیں۔ اس سلسلے میں میری ایک تجویز ہے اگر قابل قبول ہو تو آپ اس پر عمل کر سکتے ہیں۔ اپنے ماہنامے میں ہر مہینے کسی ایک رائٹر کے حالاتِ زندگی تصاویر کے ساتھ شائع کریں۔ امید ہے کہ تجویز پر غور کریں گے۔ اس سے یقیناً آپ کا اور قارئین کا بھی فائدہ ہوگا۔''

سید اکبر شاہ، اوگی مانسہرہ سے رقت کی قلت کا شکار ہیں، لکھتے ہیں۔ ''حسینۂ سرورق نے خاموش آنکھوں سے ہی وعید دی کہ تنقید نہیں ہونی چاہیے۔ وعید بھی خاطر میں لائے اور بے دلی بھی شامل حال تھی۔ کہا، آپ تو نہایت ہی بد صورت، چالاک، مکار اور فریبی بانکی ہیں۔ ہی نہیں۔ منصب وجاہت خلافِ روایت قدرے بہتر حالت میں نظر آئے۔ مخفل یاریاں وو دستیاں تک داخل ہوتے ہی مدیر اعلیٰ کا مدعا پڑھا۔ فلسطین پر اسرائیل کی جارحیت و بربریت مگر اسلامی دنیا کی خاموشی سے دل خون خون ہوا۔ تنسیر عباس حاضر محفل تھے۔ جرمانہ وصول کرنے کے بجائے انعام دیا گیا۔ بشریٰ افضل! آپ کی طرح آپ کے تبصرے بھی بڑھاپے کا شکار ہو گئے ہیں۔ اب پلیز ہم دل بیان کرنے تو بیٹھ جاتا، ہم پہلے ہی عاشقوں کے گروہ سے برسرِ پیکار ہیں۔ تصویر العین آپی! ہم تعلیمی سلسلے میں گھر سے دور رہتے ہیں۔ کئی ہفتوں بعد ڈیرہ یار پر بہار و گل و گلزار نصیب ہوتا ہے۔ ہمیں اپنی کی اک بات کے متعلق یقین ہے کہ اس سے کئی عاشقانِ نامراد کے دل روشن ہوئے ہوں گے۔ تنقید برائے اصلاح ہو۔ شکیل بھائی فل ایکشن میں نظر آئے۔ شادی کے بعد شادو! یہی ایسا ہوگا اور پھر جب شار صاحب ہوئے پھر تو... باقی آپ نسوار کی قدر جانیے۔ حسینۂ سرورق کے میک اپ کا کام انگلی کے نام۔ ابرار وارث اور شہزادہ کو مسار صاحبان معالج دل رحجان بیان کرنے آ جاتے ہیں۔ شکوہ گستاخی نہ ہو بعد میں کہ کوئی صاحب سرور نہ تھا۔ مطالعے کی ابتدا آوارہ گرد سے کی۔ آسیہ کا ہمدرد بنا، دنیا چھا تھا مگر ریحان نے جلدی پٹری بدل دی۔ بیگم صاحب کا وہ دل رفتہ رفتہ عیاں ہوتا جا رہا ہے۔ ڈاکٹر عبدالرب بھٹی کے قلم کا اعجاز ہے کہ ہر قسط بجلی پر بھاری پڑتی ہے۔ جواری میں چودھری کو تیسری بار شناخت ملی۔ معاملہ عجیب ہے۔ ایکشن سے محروم کہانی کو خواہ مخواہ طول دیا جا رہا ہے۔ بار جیت، بار نعیم کی تحریر سرورق کی پہلی کہانی منتخب کی گئی۔ خرم کے اغوا سے شروع ہو کر راست بیگ کی موت پر ختم ہوئی۔ بہت دلچسپ اور تحیر زدہ کرنے والی تحریر تھی۔ سرمو ز پر سنسنی خیزی اور تجسس۔ منظر امام نے تحفے کے طور پر مشوروں بھر احقہ لکھا۔ کاش زبیر دندان شکن میں جمیل اور راجا کو ایکشن میں لے آتے۔ جہاں راجا کو قربانی دندان دینی پڑی۔ تحریر پُر مزاح اور دلچسپ تھی۔ کچھ کہانیاں مطالعے کی طلب گار ہیں۔''

راجل سے ڈاکٹر علی گوہر چانڈیو کا پیغام رسانی ''اس ماہ کا شمارہ اپنی تمام تر رنگینیوں کے ساتھ 16 تاریخ کو ہی ملا۔ سرورق پر الپر افیار حسینہ اچھی تمام دلفریبی کے باوجود بھی صوفے پر بیٹھے شخص کو گھیرنے میں ناکام ہو رہی تھی۔ فہرست بھی ہمیشہ کی طرح بوجھل تھی۔ چٹکی نکا چٹکی میں اس مرتبہ دوستوں نے کچھ کم ہی ڈال رکھی تھی۔ تنسیر عباس بابر صاحب کو مبارک ہو۔ تبصرہ خوب تھا۔ تصویر العین صاحبہ کافی مدت کے بعد جلوہ گر ہوئیں۔ دنیا کا زیادہ منظر حکمرانوں اور موجودہ حکمرانوں کے درمیان موازنہ کرتی نظر آئیں۔ محمد عزیر اسد صاحب ادارے سے اتنی خفگی اچھی نہیں، میرا بھی نام ایک بار غلط لکھا تھا لیکن ہم نے تو کبھی شکایت نہیں کی۔ کچھ دیر چند ناقتوں کا خیال رکھنا بھی کتنوں میں ضروری ہوتا ہے۔ ٹرسٹ آف آل و دمدے سے اشارت کیا۔ زیادہ دیر پا ۲ ترجمے نہیں تھا۔ احمد اقبال کی اسٹوری جواری کو تو جانے کیا ہو گیا ہے۔ خاور سلیم ایک گھر سے نکل کر دوسرے میں پناہ لے لیتا ہے۔ کچھ بھی سامنے نہیں آ رہا۔ اسٹوری کو تھوڑا اسرار دلچسپ موڑ پر ڈالیں۔ اس کے بعد دل کی دھڑکن کو ساکت رہنے والی کہانی آوارہ گرد میں پہنچے۔ بلاشبہ آوارہ گرد ایک اچھی قسم کی اسٹوری ہے اور تھرل سے بھرپور ہے۔ ہمیں ایسی ہی کہانیاں بہت پسند تھیں۔ شہزی بے چارہ دکھ جھیلتے سورماؤں سے لڑ رہا ہے اور بیگم صاحبہ جانے کیسی شہزی پر اتنی مہربان کیوں ہوتی جا رہی ہیں۔ بابا فرشہزی نے ایک غلطی کر ہی دی۔ کمیل والا نے اسے ہوش و حواس میں رہنے کا اشارہ بھی کیا لیکن مجبوراں میں ہوش و حواس کہاں سلامت رہتے ہیں۔ سرورق کی پہلی کہانی منفی پر سنسنی خیز رہی۔ لیکن جب ہم دوسری کہانی تک پہنچے تو وہ گھٹے پانی پتا بھی بھول گئے۔ سیاہ بچھوؤں کو حاصل کرنے کے لیے اپنے دلوں میں لالچ، بہرحال سیاہ بچھوؤں کے گڑھے میں پہنچ جانا اور وہاں سے بائو کو زندہ سلامت واپس آنا بھی ایک عظیم کارنامہ ہے۔ کتر نوں میں بیمونہ عزیز، کاشف سعید کی باتیں پسند آئیں۔ میرا ایک دوست جو عرصہ 25 سال سے آپ کا مسلسل خاموش قاری ہے اس کی جانب سے سلام قبول فرمائیں۔ (وعلیکم السلام۔ اگلی دفعہ وہ خود حاضر ہو کے سلام کریں) ایک تمنا اس کے ساتھ اجازت۔''

محمد قدرت اللہ نیازی، حکیم ٹاؤن خانیوال سے لکھتے ہیں۔ ''اگست 2014ء کے شمارے کے لیے اتنے چکر لگائے کہ خود ہی گھن چکر بن گئے۔ 7 تاریخ کو ملا۔ سرورق اس لحاظ سے غیر معمولی رہا کہ کئی بار حضرات مناسب حلیے میں موجود تھے۔ اس کے علاوہ ورائٹی میں اور پستول بھی زیورِ حسن سے تھا۔ آوارہ گرد میں بیگم صاحبہ کی شہزاد پر خصوصی عنایات کا بھید آشکارا ہوا۔ شہزاد ریحان کے لیے جو بھی جذبات رکھتا ہو ہمیں ریحان پر شدید غصہ ہے جس شخص نے اس کی ماں کی جان بچانے کے لیے خود کو مشکل میں ڈالا وہ اسی کو گرفتار کروانے پر کمر بستہ ہو گیا۔ کمیل والا اور شہزاد کے مکالموں نے خوب لطف دیا۔ اولین صفحات پر دینہ رشید کی وجہ سے کافی زبردست رہی۔ تحریر کا اسلوب اگرچہ مفرقی تحریر جیسا تھا تاہم کہانی پر گرفت کافی مضبوط تھی۔ اف اتنے زیادہ قتل؟ اس کے بجائے تو بہتر تھا کہ ریحان، شوکت اللہ کا کام تمام کر دیتا۔ شوکت اللہ کا کردار خاصا جاندار تھا تاہم آخر میں بہت آسانی سے اسے تبصرہ نگار صنف کا شکار بنا دیا گیا۔ مریم کا کردار اپنی شوخی و شرارت کی وجہ سے خاص رہا۔ مریم کے خان نے سرورق کا دوسرا رنگ تحریر کیا۔ پیش لفظ میں سیاہ بچھو کا تذکرہ تھا۔ سیاہ بچھو کے بارے میں اخبار اور ٹی وی چینلز پر بھی اس سے قبل پڑھتے اور دیکھتے رہتا۔ ہمارے گاؤں کے قریب موجود ٹیلوں پر لاہور سے آئی ہوئی ٹیم نے کیمپ لگا کر سیاہ بچھو پکڑنے کی کوشش کی جو کارآمد نہ ہو سکی۔ مریم کے خان کی تحریر سے کافی معلومات ملیں۔ سرورق کا پہلا رنگ بار جیت بار نعیم کی تحریر نے بھی کافی رنگ جمایا۔ کاشف زبیر کی جمیل سیریز میں کاشف زبیر دانت کی چوری کا تذکرہ لے کر آئے۔ اس سے پہلے گردوں اور دیگر جسمانی اعضا کی چوری کا تذکرہ تو سنتے رہے اب یہ کاشف صاحب نے نیا آئیڈیا دیا ہے۔ کاش اس کو کوئی دندان شکن نہ پڑھے۔ راجا کے ساتھ برا ہوا۔ جمیل کو چاہیے تھا پچاس ہزار لینے کے بجائے ویڈیو کسی چینل کو دے دیتا، بچھو راجاؤں کا بھلا ہو جاتا۔ نوٹ ساز میں جس طرح سر بریٹی نے کہانی کے بخیے ادھیڑے، اس سے حقیقتاً مصنف چکرا جاتے ہوں گے۔ اے پی ایم کی اصطلاح کا بھی دلچسپ استعمال کیا گیا۔ بشریٰ اسجد کی جادو جا تیا کہہ رہی۔ اب ذرا ذکر ہو جائے چٹکی کتھ چٹکی کا۔ تنسیر عباس

بھرپور تبصرے کی مبارک باد۔ آپ کے ماہا ایمان کے بارے میں کیے گئے تبصرے پر کم از کم میں خاموش ہی رہنا چاہوں گا۔ ادارے کے دیرینہ کارکن اور مصور شاہد حسین کی رحلت کی خبر پڑھی، اللہ ان کو جنت الفردوس میں اعلیٰ مقام عطا فرمائے اور لواحقین کو صبر عطا فرمائے۔"

از عبدالجبار رومی انصاری لاہور سے اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہیں "پہلی دفعہ چٹکی نکتہ چینی جاسوسی کی محفل میں حاضر ہو رہے ہیں، امید ہے اخری ادارے کو شکریہ کا موقع دیں گے۔ یوں تو ہم جاسوسی کے پرانے قاری ہیں لیکن صرف خاموش مطالعے میں ہی زیادہ وقت گزارا۔۔۔ جاسوسی کی دنیا میں تو ہزار بار گتھیاں دیکھی ہیں، ہنستی مسکراتی تحریریں تو کبھی ایڈونچر سے بھرپور سنسنی خیز ایکشن اور کبھی پیار و محبت کے دل گداز قصے۔ الغرض زندگی کے ہر شعبے سے مشرق و مغرب کے ادوار و مقامات سے اپنی جداگانہ تحریروں سے مزین جاسوسی کی بہت کچھ کہا جاتا ہے۔ چٹکی نکتہ چینی کی بزم میں مسالے دار چٹ پٹی تحریریں آئیں، بہت۔۔۔ مزہ دیتی ہیں۔ چونکہ یہ میرا پہلا خط ہے لہٰذا نکتہ چینی کے حوالے سے فی الحال کچھ نہیں کہوں گا۔ درندے، دوستانہ چہرے، بیچارہ جفا، بار جیت، آوارہ گرد، بہترین تحریریں تھیں۔ یہ سب لکھنے والوں کی کاوش ہے جو ہم تک اتنی زبردست تحریریں تخلیق کر کے پہنچاتے ہیں۔ ادارہ جاسوسی اور سب لکھنے والوں اور نکتہ چینی کی محفل میں سب حاضرین کو دل سے سلام۔"

کراچی سے الیکلی کی زرا لی شوخیاں "آج پھر ہم آنکھیں چمکاتے، دوپٹے ہلاتے دو آنکھوں، ہلکی آنکھوں والوں کے گوش گزار کرنے چلے ہیں۔ منصف اعلیٰ کی حالات حاضرہ پر تحریر بھی آنکھوں میں قدرے نچی ہی گئی۔ چٹکی نکتہ چینی میں اس بار چٹکی زیادہ ہو گئی۔ تقسیم عباس بابر نایاب بلکہ کم یاب خیالات تھے آپ کے۔ خالد وقاص صاحب گزر دو اور سینیوٹ کے جاسوسی کا حصہ بنے۔ زویا اعجاز عرف وزی آپا! آپ کافی بہتر ہیں۔ لیکن اگر اپنے اندر سے "مس" نکال دیں تو بہترین ہو سکتی ہیں۔ صفدر معاویہ آپ تو جاسوسی کی انجینئر خریدیں کہ صبح شام دیدار رہے گا۔ سیف اللہ بھائی! الیکلی کے سارے کام الجھے ہوتے ہیں۔ قدرت اللہ بھائی! شکریہ میری شاعری پسند آئی۔ سید اکبر شاہ! آپ کو اول آنے پر مبارک باد۔ سید عبادات، صائمہ، تصویر الحسین، بشریٰ حسن، بشریٰ افضل جی کے تبصرے جاندار تھے۔ سید شکیل کاظمی صاحب! آپ کو تبصرہ میں ایک سر پر ہاتھ رکھنے والا ہے۔ پھر زویا آپا کو یقین آئے گا۔ جو تبسم نقی آپ کے حسین انداز اور خوب رو خیالات سے مرصع در فتح تبصرہ من کو بھا گیا۔ شمارہ اگست کی کہانیاں بھی جیت رہیں۔ سرورق رشیدہ کی درندے صفحات اول کا حق ادا کر گئی۔ جواری بھی اس بار اچھے ہاتھ پاؤں مارنے میں کامیاب رہا۔ مریم کے خان کی نقش زدہ بہترین اسٹوری ہے۔ خطروں سے کھیل کر اپنا مقصد پانا تو دلیر لوگوں کا کام ہے۔ سیاہ بچھوؤں کا معما بھی حل ہوا۔ سلیم انور کی دوستانہ چہرے میں وفا اور دغابازی کو سامنے لایا گیا۔ مارگریٹ اور جون جیسے کردار بہت تھے۔ حیثیت میں تنویر ریاض صاحب نے پر فریب راہوں پر چلنے والوں کو سبق دینے کی کوشش کی۔ امجد رئیس کی بااصول تو پھر بااصول ہی تھی۔ سیر پر سوا سیر تو پھر آتا ہی ہے۔ آوارہ گرد میں بھٹی صاحب نے اداری دلچسپی کا بھرپور سامان رکھا۔ شہزری کی شوخیاں عروج پر تھیں۔"

ساہیوال سے اعجاز احمد راحیل کی یاد آوری "زندگی کی انتھک مصروفیات میں اس قدر مگن ہوئے کہ اپنے جاسوسی کے لیے لکھنا ہی بھول گئے مگر جی محبت اور لگن نے تعلق ٹوٹنے نہیں دیا، اس تعلق کو نبھانے کے لیے آج ایک سال بعد ہم نے اپنے بھائیوں جیسے دوستوں برادر شکیل حسین کاظمی، تقسیم عباس بابر، آغا فرید لالا جانی اور کبیر عباسی کے اصرار پر قلم کو حرکت دی۔ عذاب انتظار کے مشکل لمحے ایسے کہ بیت ہی نہیں رہے تھے۔ آخر 7 اگست کو جاسوسی کے درشن ہوئے۔ سرورق جاسوسیت سے بھرپور اپنی مثال آپ تھا۔ فہرست کی سجاوٹ قابل ستائش ہے۔ حقیقت پر مبنی اداریہ خون کے آنسو رلا گیا۔ تقسیم عباس بابر کافی عرصہ بعد آئے اور چھا گئے۔ بشریٰ افضل کی باتیں زبردست رہیں۔ سید اکبر شاہ کی اخری بھی خوب رہی۔ تصویر الحسین کا دوستوں پر کیا گیا تبصرہ اچھا لگا۔ صفدر معاویہ اور قدرت اللہ بھائی اچھے تبصرے کے ساتھ تھے۔ برادر افتخار اعوان کا مختصر تبصرہ دل کو چھو گیا۔ لاہور سے زویا اعجاز کی آمد جیت رہی۔ زویا جی نوک جھونک سے تو محفل میں رونق ہے۔ برادر شکیل کاظمی کا انداز بیان لاجواب رہا۔ سعدیہ بخاری کو دیا گیا مشورہ پسند آیا۔ خانیوال سے محمد وقاص خالد کی اخری خوب رہی۔ محترمہ الیکلی کیا آپ نے علم نجومیات کی ڈگری لی ہوئی ہے۔ ویسے انداز تحریر دلچسپ ہے۔ اب کچھ بات اسٹوریز پر ہو جائے۔ سب سے پہلے آوارہ گرد جو کہ بھٹی صاحب کی اچھی کاوش ہے۔ جواری بھی اس بار اپنے مقصد میں بڑھانے میں کامیاب رہی۔ ویسے اقبال صاحب یہ بار بار شادی کا ڈھونگ رچانے کا سلسلہ کب تک جاری رہے گا؟ درندے بھی ابتدائی صفحات کا حق ادا کر گئی۔ انسان اپنے مفاد میں ہر راہ سے گزر جاتا ہے۔ نقش زدہ مریم کے خان کی بہترین اسٹوری ثابت ہوئی۔ اپنے مقصد کے حصول کے لیے کی جانے والی سنگین و خطرناک کوششوں کی دلچسپ کہانی تھی۔ بار جیت اسی کی بار جیت پسند آئی۔ وقت لوگوں کو بدل دیتا ہے مگر کچھ لوگ اپنے عزائم پر ڈٹے رہتے ہیں۔ نیل کا کردار جاندار تھا۔ کاشف زبیر کی داستان شکن میں راجا اور علیشہ کی جوڑی اپنی تمام تر شرارتوں کے ساتھ موجود تھی۔ امجد رئیس صاحب کی بااصول اچھی رہی۔ ہنستی کھیلتے پر ولا بہت ہوئی۔ مجموعی طور پر اگست کا شمارہ مطمئن کر گیا۔"

اسلام آباد سے انور یوسف زئی کی ناپسندیدگی "جاسوسی اس بار قدرے تاخیر سے 5 تاریخ کو ملا۔ سرورق بس گزارے لائق تھا۔ خون والے جاوید سعید کافی عرصے سے غائب ہیں شاید وہ بھی شکیل کاظمی صاحب کی طرح اپنا نام نہ پا کر بلیک لسٹ میں دیکھ کر ناراض ہو گئے۔ بی بی طاہرہ گلزار کی خدمت میں عرض ہے کہ تبصرہ نگاری میں تعریف اور تنقید دونوں ہی شامل ہوں تو بہتر ہوتا ہے۔ بھائی صفدر معاویہ! یہ خواب ہی تو زندگی میں نت نئے رنگ بھرتے ہیں۔ کراچی کی بی بی الیکلی کی رائے سے سو فیصد متفق ہوں کہ ہر خواب کی تعبیر اچھی نہیں ہوتی۔ جب ہی جاسوسی اس بار 2 تاریخ کے بجائے 5 جولائی کو ملی۔ اب ذرا کہانیوں پر ایک طائرانہ نظر۔ قسط وار کہانی آوارہ گرد کچھ تاثر نہ دے پائی۔ اس سے بہتر تھا کہ طاہر مغل یا احمد اقبال کی کوئی کہانی شامل اشاعت کر لی جاتی۔ سرورق کی دونوں کہانیاں سوداگر اور تحفہ عشق نے بڑا لطف دیا۔ بزدل اور شاہی کے کردار بے حد جاندار اور جاسوسی کے معیار کے عین مطابق تھے۔ شمارے کی اولین کہانی آتش رہا غیر معمولی تھیں اور ترجمہ شدہ ہونے کی وجہ سے کچھ پلے نہیں پڑی۔ کہانیوں کے خاکے اس بار بہتر تھے اور تحریر میں بھی بس ٹھیک تھیں۔"

ظلمت کدہ

کاشف زبیر

رات کی سفاک ظلمتیں اور مہیب سناٹے جب کسی خورشید کو معدوم کرنے کی مذموم کوشش کرتے ہیں تو قدرت کی تعزیریں حرکت میں آجاتی ہیں... طلوعِ صبحِ بہاراں کی راہ میں حائل ہونے والے نیست و نابود ہو جاتے ہیں... روشنیوں کی راہ میں دیوار بننے والے جب سیلِ زماں کے تھپیڑوں کی زد میں آتے ہیں تو خس و خاشاک کی طرح بہہ جاتے ہیں... ملیا میٹ ہو جاتے ہیں... سرزمینِ وطن پر غاصبوں اور درندوں کے عزائم پر مبنی ایسے ہی کرداروں پر مشتمل دلچسپ داستان... دہشت پسندی اور دولت کی فراوانی رکھنے والے جب اپنے ارادوں کی تکمیل پر آتے ہیں تو ہر عہد کا فرعون... نمرود... ہلاکو اور چنگیز ایک بار پھر زندہ نظر آنے لگتا ہے... وحشیوں کے انسانیت سوز مظالم نگاہوں کے سامنے حقیر صورت لگتے ہیں۔ مگر سچ بولنے... سچ دکھانے اور سچ کا ساتھ دینے والے جہاں گرد کبھی پسپا نہیں ہوتے۔ سچ جھوٹ... مکر و فریب کی جنگ کا سنسنی خیز احوال...

موجودہ تناظر میں آج کی جھلکی... جلتی چراغ... جرم شناس ذہن کی تحریر

عمران سجاد اپنے شاندار سجے سجائے دفتر میں آیا۔ ہر چیز صاف ستھری اور اعلیٰ درجے کی تھی۔ بارہ سال پہلے وہ اس دفتر سے اچانک رخصت ہوا تو اس وقت یہ اتنا شاندار نہیں تھا۔ ہاں صاف ستھرا اس وقت بھی بہت تھا کیونکہ عمران... خود صفائی پسند شخص تھا۔ اس وقت اس کا اردلی غلام علی اس کے کمرے کو شیشے کی طرح چمکا کر رکھتا تھا۔ آج پندرہ سال بعد وہی غلام علی موجود تھا۔ اپنی پھرتی اور ہر شے پر نظر کی بدولت وہ آنے والے ہر صاحب کا منظورِ نظر بن جاتا تھا۔ ہر جانے والا صاحب آنے والے سے جو آخری بات کرتا تھا وہ غلام علی کی ہوتی تھی لیکن اس بار آخری صاحب کو غلام علی کی سفارش کا موقع نہیں ملا تھا۔ کیونکہ وہ ایک قاتلانہ حملے میں اپنے محافظوں سمیت جاں بحق ہو گیا تھا۔

جب اس پوسٹ کے لیے عمران سجاد کا نام آیا تو غلام علی خوش ہو گیا۔ اب اسے کسی سفارش کی ضرورت نہیں تھی۔ عمران... اسے یہاں دیکھ کر خوش ہوا تھا۔ وہ کرسی پر بیٹھا اور اس نے سامنے رکھے ہولڈر سے پین اٹھا کر دیکھا۔ پین نیا لیکن آزمایا ہوا تھا۔ یہ بھی غلام علی کی خاصیت تھی۔ وہ صرف صفائی ستھرائی کا خیال نہیں رکھتا تھا اس کمرے کی ایک ایک چیز گویا اس

کے ذمے تھی۔ وہ پورا خیال رکھتا تھا کہ ہر چیز ورکنگ میں ہو۔ معمولی سے معمولی چیز تک پر اس کی نظر ہوتی تھی۔

عمران... نے پین واپس ہولڈر میں لگا دیا۔ اس کے سامنے جدید ایل سی ڈی مانیٹر، کی بورڈ اور ماؤس چمک رہے تھے۔ جب وہ یہاں سے گیا تو اس کے دفتر میں کمپیوٹر نہیں تھا۔ بلکہ پورے محکمۂ پولیس میں گنتی کے چند کمپیوٹرز تھے جن سے کام بھی نہیں لیا جا سکتا تھا۔ اب اس لحاظ سے خاصی ترقی ہو گئی تھی۔ جدید کمپیوٹرز آ گئے تھے۔ گاڑیاں اور جدید آلات بھی مل گئے تھے۔ اب ہر سپاہی کے پاس خودکار رائفل ہوتی تھی۔ تھری ناٹ تھری کا زمانہ گزر گیا تھا۔ باقی دنیا میں یہ زمانہ بہت پہلے گزر گیا تھا لیکن ہمارے ہاں گزرے زیادہ عرصہ نہیں ہوا تھا۔ یہ دفتر اور یہ شعبہ عمران... کے ماتحت ہی قائم ہوا تھا۔ تین سالوں میں وہ جب تک یہاں رہا، شہر کی حالت بدل گئی تھی۔ خوف و دہشت کے سائے خاصی حد تک چھٹ گئے تھے پھر وہ واپس چلا گیا۔ دوسرے آنے والے عمران... کی طرح محنتی اور ذہین نہیں تھے اس لیے انہوں نے اپنے جیسے ماتحت پسند کیے اور چند سالوں میں اس شعبے کا بیڑا غرق ہو گیا۔

عمران... دارالحکومت واپس چلا گیا۔ اس خاص شعبے کی تشکیل کے لیے اس کی خدمات صوبائی حکومت کو دی گئی تھیں۔ اس وقت وہ جوان تھا۔ اب وہ ادھیڑ عمری کی حدود میں داخل ہو چکا تھا۔ رعنا عمران... کی بیوی پہلے بھی تھی اور محبوبہ بعد میں۔ یہ ترتیب آج بھی برقرار تھی جبکہ ان کی شادی کو دس برس ہو چکے تھے۔ جاب سے ہٹ عمران... کے لیے ناممکن تھا کہ وہ اس کی کوئی بات ٹال دے۔ رعنا سے اس کی ملاقات سرکاری معاملے میں ہوئی تھی۔ وہ بن ماں باپ کی لڑکی تھی۔ ماں بچپن میں مرگئی اور باپ اس کی نوعمری میں قتل کر دیا گیا۔ قاتل جو رشتے دار تھے، اصل میں اس کی زمین پر قابض ہونا چاہتے تھے۔

جوانی تک رعنا اپنی خالہ کے پاس رہی۔ جو خود غریب تھی اور اس کی وراثت کے حصول میں اس کی مدد نہیں کر سکتی تھی اس لیے رعنا نے عدالت سے رجوع کیا۔ عدالت نے وزارت داخلہ کو کیس بھیجا اور عمران... کے سپرد یہ کیس کیا گیا۔ اس نے کوشش اور بھاگ دوڑ کر کے رعنا کی وراثت اسے دلوا دی لیکن ساتھ ہی مشورہ دیا کہ وہ اسے فروخت کر دے ورنہ یہ زمین اس کے باپ کی طرح اسے بھی کھا جائے گی۔ رعنا نے اس... مشورے پر عمل کیا کیونکہ یہ بات عمران... نے کہی تھی اور اس عرصے میں عمران اس کے لیے سب کچھ بن گیا تھا۔ جب عورت ایک مرد کو اپنا سب مان لیتی ہے تو جلد یا بدیر وہ اسے اپنا بنا کر چھوڑتی ہے۔ ایسا ہی رعنا نے کیا۔ ایک سال کے اندر ان کی شادی ہو چکی تھی۔ ان کی عمروں میں فرق تھا۔ رعنا اس سے دس سال چھوٹی تھی۔ دس سال پہلے ہی ان کی شادی ہوئی تھی۔ قدرت نے اولاد نہیں دی تھی۔ اس کے باوجود وہ ایک دوسرے کے ساتھ خوش تھے۔

شادی سے پہلے رعنا سمجھ گئی تھی کہ عمران... یہ نوکری کچھ اصولوں کے تحت کر رہا ہے اس لیے وہ شادی کے بعد جاب کے معاملے میں دخل دیتی تھی لیکن اس بار اس نے کھل کر مخالفت کی تھی۔ عمران... کو چند ہفتے پہلے اندازہ ہو گیا تھا کہ شاید اسے اس پوسٹ کے لیے نامزد کیا جائے گا۔ جب یہ بات حتمی ذرائع سے اس کے علم میں آئی تو اس نے رعنا کو بتایا اور اس نے فوری مخالفت کی۔ ''آپ دیکھ چکے ہیں اس پوسٹ پر کام کرنے والے پہلے شخص کا کیا حشر ہوا ہے؟''

''اس حشر میں دیگر عوامل کا حصہ زیادہ ہے۔ تم جانتی ہو میں ایسی کوئی علت نہیں رکھتا۔''

رعنا سمجھتی تھی، اس کا شوہر عمران سجاد جسے بننے کو بزدلی سمجھتا تھا۔ اس نے ہمیشہ ملازمت برائے خدمت کی تھی یہی وجہ تھی کہ مفاد پرست لوگ اسے زیادہ عرصے کسی جگہ برداشت نہیں کرتے تھے۔ ضرورت پڑنے پر جو لوگ اسے لگاتے تھے، وہی ضرورت ختم ہونے پر اسے او ایس ڈی بنانے میں ایک دن کی تاخیر بھی نہیں کرتے تھے۔ آج بھی وہ مفاد پرست جانتے تھے کہ اس پوسٹ کے لیے عمران سجاد ہی مناسب ترین آدمی ہے۔ باقی جن افسران کے نام زیر غور آئے تھے، وہ سب اس پوسٹ سے بچنے کے لیے ایڑی چوٹی کا زور لگا رہے تھے اور وہ اپنی کوشش میں یوں کامیاب رہے کہ عمران سجاد کی طرف سے ایسی کوئی کوشش نہیں ہوئی تھی۔ یوں اس پوسٹ کے لیے عمران سجاد کا نام نکل آیا۔ رعنا نے آخری حربے کے طور پر کہا۔ ''ٹھیک ہے، پھر میں بھی آپ کے ساتھ چلوں گی۔''

رعنا نے شادی کے بعد سوشل ورک میں ماسٹر کیا تھا اور اب ایک این جی او کے ساتھ کام کر رہی تھی۔ ''تم جاب چھوڑ دو گی؟''

''ہاں آپ سے زیادہ کچھ اہم نہیں ہے۔ میں آپ کو اکیلے جانے نہیں دوں گی۔''

عمران... خوش ہو گیا۔ وہ خود بھی اکیلے نہیں جانا چاہتا

تھا۔ وہ برسوں سے دارالحکومت میں تھا۔ یہاں اس کا آبائی گھر تھا۔ اس کے بہن بھائی تھے۔ نگران سے دور جانا مسئلہ نہیں تھا ہاں رعنا کے بغیر وہ نہیں رہ سکتا تھا۔ خوش قسمتی سے اسے آنے سے پہلے پولیس سول لائن میں ایک چھوٹا بنگلا مل گیا جو اگرچہ اس کے عہدے کے لحاظ سے چھوٹا تھا لیکن اس کے لحاظ سے کافی تھا۔ فیصلہ ہوتے ہی وہ روانہ ہو گیا اور آج پندرہ دن بعد اس کی باقاعدہ جوائننگ تھی۔ رعنا نے کچھ سامان لیا اور سادہ سے انداز میں گھر سیٹ کر لیا تھا۔ ایک بیڈ روم سیٹ تھا اور نشست گاہ سجائی تھی، باقی گھر تقریباً خالی تھا۔ البتہ بنگلے کا چھوٹا سا لان پھولدار پودوں اور بیلوں سے بھرا ہوا تھا۔ اسے دیکھ کر رعنا خوش ہوئی تھی۔ کچن کا خاصا سامان لینا تھا مگر ابھی گزارا چل رہا تھا۔ رعنا نے فیصلہ کیا کہ وہ رفتہ رفتہ خود سامان لے آئے گی۔ پولیس لائن کے ساتھ ہی مارکیٹ تھی جہاں سب مل جاتا تھا۔

انہیں یہاں ایک عورت ملازمہ مل گئی تھی جو صبح سے شام تک کام کرتی تھی۔ صفائی ستھرائی اور کپڑے دھونا اس کی ذمے داری تھی۔ بنگلے کے گیٹ پر پولیس گارڈز ہوتا تھا اور عمران ... کو ڈرائیور اور دو گارڈز بھی ملے ہوئے تھے۔ وہ سول لائن سے باہر نکلتا تو دو محافظ گاڑیاں اسے اسکورٹ کرتیں۔ عمران ... کو یہ سب پسند نہیں تھا مگر وہ جانتا تھا، یہ مجبوری تھی۔ دہشت گرد بہت آزاد اور بے باک ہو گئے تھے۔ کیونکہ وہ پکڑے نہیں جاتے اور پکڑے جاتے تو انہیں سزا نہیں ہوتی تھی اور اگر سزائے موت ہوتی تو اس پر عمل درآمد نہیں ہوتا۔ انہیں سزائے قید ہوتی تو ان کے ساتھی جیلوں پر حملہ کر کے انہیں چھڑا لے جاتے تھے۔ اس لیے دہشت گرد اور جرائم پیشہ جرم کرنے کے لیے آزاد تھے۔

عمران .... رعنا کے بارے میں سوچ رہا تھا کہ اس کا ... پی اے دستک دے کر اندر آیا۔ اسد اللہ اسمارٹ اور خوش رو نوجوان تھا۔ اس نے کہا۔

"سر ایک گھنٹے بعد آپ کی پریس کانفرنس ہے۔ اس کے فوراً بعد آپ چیمبر آف کامرس کے وفد سے ملیں گے۔"

عمران ... مسکرایا۔ "تمہارا مطلب ہے مجھے بہت سے جھوٹ بولنے اور دعوے کرنے کے لیے تیار رہنا چاہیے۔"

اسد اللہ سنجیدہ رہا۔ "سر اٹ از اے پارٹ آف ڈیوٹی۔"

"ٹھیک ہے، میں تیار رہوں گا۔ کوئی خاص ایجنڈا تو نہیں ہے۔"

"نہیں سر، صرف تعارف ہوگا اور پھر سوالات ہوں گے۔"

"ریاض علی شاہ کا کیس تو ہمارے پاس نہیں ہے؟" اس نے اپنے پیشرو کے بارے میں پوچھا۔

"نہیں سر، یہ کیس کرائم برانچ دیکھ رہی ہے۔"

"اس کا انجام بھی نامعلوم ہوگا۔" عمران ... نے کسی قدر تلخی سے کہا اور پھر اسد اللہ کا شکریہ ادا کیا۔ وہ واپس چلا گیا۔ پریس کانفرنس تو خیر ایک روایت تھی لیکن یہ چیمبر آف کامرس کا وفد کس خوشی میں آرہا تھا۔ اس نے سوچا اور آئی جی سے کال ملانے کو کہا۔ ویسے وہ فری ہینڈ کے ساتھ آیا تھا مگر دفتری پروٹوکول کے مطابق وہ صوبے کے آئی جی کا ماتحت تھا۔ رابطہ ہونے پر پہلے دونوں افسران میں رسمی کلمات کا تبادلہ ہوا پھر عمران ... نے چیمبر آف کامرس کے وفد کے بارے میں پوچھا۔ "ان کی آمد سمجھ سے بالاتر ہے۔"

"ممکن ہے وہ نیو ٹریڈ ٹاور کے بارے میں بات کرنے آرہے ہوں۔"

"نیو ٹریڈ ٹاور۔" عمران ... نے سوچ کر کہا۔ "وہی عمارت جو اب شہر کی سب سے بلند عمارت ہوگی جسے این ٹی ٹی کا نام دیا گیا ہے۔"

"بالکل وہی... ایک مہینہ پہلے وہ مکمل ہو چکی ہے اور اس میں بہت سے دفاتر بھی کھل چکے ہیں۔ لیکن اس کا باضابطہ افتتاح پرسوں ہے۔ اس میں چیف منسٹر مہمانِ خصوصی ہوں گے۔"

"چیف منسٹر موجود ہوں گے تو پھر سیکیورٹی کا کوئی ایشو نہیں ہونا چاہیے۔"

"تم ٹھیک کہہ رہے ہو لیکن ملنے میں کوئی حرج نہیں ہے۔"

عمران سجاد کا موڈ نہیں تھا مگر کیونکہ آئی جی نے بھی مشورہ نما حکم دے رہا تھا اس لیے اب اسے ملنا تھا۔ عمران ... کو الجھن ہو رہی تھی۔ وہ چاہتا تھا کہ فوری کام شروع کر دے۔ ابتدائی بریفنگ سے اسے اندازہ ہو گیا تھا کہ شہر پر بے پناہ دباؤ ہے۔ انہیں بیک وقت کئی طرف سے چیلنج تھا۔ شہری مافیا، سیاسی جماعتوں کے مسلح ونگز، فرقہ پرست تنظیمیں اور دہشت گرد گروہ بہت طاقت ور تھے اور ریاض کی موت سے عوام میں تاثر ابھرا تھا کہ جو لوگ خود اپنی حفاظت کے اہل نہیں تھے وہ ان کی حفاظت کیا کریں گے اور شہر کو ان لوگوں سے نجات کیسے دلائیں گے۔ عمران ... جانتا تھا کہ یہ

تاثر درست تھا۔ جس کام کی توقع صرف اس سے اور اس کے شعبے سے کی جا رہی تھی، وہ اصل میں پوری حکومت اور تمام عوام کی ذمے داری بھی بنتا تھا۔ وہ جو کر سکتے تھے، وہ ایسا ہی تھا جیسے کوئی کسی زہریلے پودے کی شاخیں اور پتے کاٹتا رہے اور اصل پودا محفوظ رہے۔ وہ سائز میں سکڑ جاتا تھا مگر ختم نہیں ہوتا اور جیسے ہی موقع ملتا وہ پھر پوری قوت سے ابھر آتا تھا۔

بہرحال اسے اپنا کام تو کرنا تھا اور پوری محنت اور ایمان داری سے کرنا تھا۔ اس نے سوچا اور بیٹ اٹھائے ہوئے کھڑا ہو گیا۔ پریس کانفرنس دفتر کے سامنے لان میں ہو رہی تھی۔ وہ باہر آیا تو اسے لگا جیسے وہ جنگی مورچے میں نکل آیا ہو۔ وہاں جا بہ جا خاردار تاریں تھیں اور ریت سے بھری بوریوں کی مدد سے مورچے بنائے ہوئے تھے۔ واچ ٹاورز پر مشین گن بردار سپاہی تھے۔ دیواروں کی اونچائی ماضی کے مقابلے میں دگنی کر دی گئی تھی اور مین گیٹ دوہرے لوہے کی چادروں والے دو گیٹس پر مشتمل ہو گیا تھا۔ اس کے آگے بھی کنکریٹ کی کئی رکاوٹیں کھڑی تھیں۔ اس کے باوجود وہ محفوظ نہیں تھے۔ جنگ کا کلیہ ہے کہ دفاع کرنے والا سست اور حملہ کرنے والا چست ہوتا ہے۔ اس لیے وہ ہمیشہ ایسے حملہ کرتا کہ دفاع کرنے والے سمجھ نہ پائیں۔ صحافی حضرات آچکے تھے اور اس کے خطاب کے بعد پہلے سوال سے اسے اندازہ ہو گیا پریس کانفرنس اتنی آسان نہیں ہوگی جتنی وہ سوچ کر آیا تھا۔

عمران سجاد سوچ سمجھ کر سوالات کے جواب دیتا رہا۔ اس نے متنازعہ سوالات کو نظر انداز کیا اور بلند بانگ دعووں سے بھی گریز کیا۔ آدھے گھنٹے بعد بیشتر صحافی مایوسی کے عالم میں رخصت ہو گئے تھے۔ وہ اس سے اپنی مرضی کی بات کہلوانے میں ناکام رہے تھے مگر یہ عمران... کی کامیابی نہیں تھی۔ وہ جانتا تھا کہ قلم دوسرے ہاتھوں میں ہے اور وہ اس سے بے شمار طریقوں سے کام لے سکتے تھے۔ چیمبر آف کامرس کے وفد سے ملاقات کے لیے میٹنگ ہال کا انتخاب کیا گیا تھا کیونکہ ان کی تعداد دشکل سے درجن بھر تھی اور یہ وہ لوگ تھے جو اس شہر اور ملک کی معیشت کے بارے میں فیصلے کرتے تھے۔ بدقسمتی سے وہ فیصلہ کرتے ہوئے ملک و قوم سے زیادہ اپنے مفاد کا خیال رکھتے تھے۔ جب وہ وفد سے ملاقات کے لیے میٹنگ روم میں داخل ہوا تو ایک لمحے کو ٹھٹک گیا۔ سامنے ہی عمران اکبر بیٹھا ہوا تھا۔

☆☆☆

عمران سجاد شکاگو ائرپورٹ پر اترا تو لاؤنج میں جاتے ہوئے وہ کسی سے ٹکرایا۔ اس نے مڑ کر دیکھا تو سامنے ایک پاکستانی کو پایا۔ اس کا لباس اور چہرہ بتا رہا تھا کہ وہ پاکستانی ہے۔ عمران.... نے نرم لہجے میں کہا۔ ''آرام سے یار.... اتنی جلدی کس بات کی ہے؟''

نوجوان اس کا ہم عمر لیکن وزن میں کسی قدر زیادہ تھا۔ اس کے لیے بھاری بیگ کے ساتھ اپنا وزن سنبھالنا بھی مسئلہ ہو رہا تھا اسی لیے لڑکھڑا کر وہ عمران.... سے ٹکرا گیا۔ اس نوجوان نے گول شیشوں والی عینک لگا رکھی تھی اور اس کے بے ترتیب بال بکھرے ہوئے تھے۔ اس نے ہانپتے ہوئے کہا۔ ''جلدی تو ہے یار صرف پانچ سال کے لیے آیا ہوں اور اس مدت میں آ بندہ پچاس سال میں دولت مند بننے کے طریقے سیکھنے ہیں، وقت نہیں ہے۔''

عمران... چونکا۔ ''تم بھی اسکالرشپ پر آئے ہو؟''

وہ بھی چونکا۔ ''تم بھی....''

''ہاں۔'' عمران.... نے اس کی طرف ہاتھ بڑھایا۔ ''عمران سجاد دارالحکومت سے۔''

پہلی بار نوجوان کے چہرے پر مسکراہٹ آئی۔ ''عمران اکبر صوبائی دارالحکومت سے۔ ہم ہم وطن ہی نہیں ہم نام بھی ہیں۔ کہاں آئے ہو؟''

''شکاگو یونیورسٹی۔'' عمران سجاد نے کہا۔

''میں بھی وہیں آیا۔'' عمران اکبر نے کہا۔ ''میں نے تو پہلے ہی بتا دیا ہے کہ بزنس کا شعبہ منتخب کیا ہے اور تم نے؟''

''ان کو پکڑنے کا شعبہ جو بزنس میں چکر بازی کرتے ہیں۔'' عمران سجاد ہنسا تو عمران اکبر بدستور سوالیہ نظروں سے اسے دیکھتا رہا۔ اس نے وضاحت کی۔ ''کرمنالوجی۔''

''اوہ.... لیکن فائدہ.... ہمارے ہاں تفتیش کا موثر ترین طریقہ رائج ہے جو دنیا کے چند ہی ملکوں میں ہے۔'' اکبر نے کہا۔

وہ لاؤنج میں پہنچ گئے تھے۔ انہوں نے طے کیا کہ وہ ساتھ ہی یونیورسٹی جائیں گے، ایک سے دو بھلے۔ کسٹم اور امیگریشن کے مراحل سے فارغ ہو کر وہ ساتھ ہی یونیورسٹی پہنچے تھے۔ انہوں نے ایک ہی ٹیکسی کی تھی۔ عمران سجاد کا خیال تھا کہ آدھا کرایہ عمران اکبر دے گا مگر منزل پر پہنچ کر وہ آرام سے ٹیکسی سے اترا اور اپنا بیگ اٹھا کر روانہ ہو گیا۔ کرایہ عمران سجاد کو دینا پڑا اور اس نے اسی وقت سوچ لیا تھا کہ ہم وطنی اپنی جگہ لیکن وہ ان معاملات

میں اکبر پر انحصار نہیں کرے گا جن میں کیش لگ رہا ہو۔ وہ محدود رقم لایا تھا۔ یونیورسٹی صرف تعلیم، رہائش اور کھانے پینے کے اخراجات برداشت کرتی جبکہ اس کے علاوہ بھی کئی اخراجات تھے۔

عمران سجاد کا تعلق متوسط گھرانے سے تھا۔ اس نے ایف ایس سی کے امتحان میں پورے ضلع میں اول پوزیشن حاصل کی تھی۔ اس نے امریکا میں تعلیم کے لیے اسکالرشپ کی درخواست دی اور کیونکہ اسکالرشپ براہِ راست دیے جا رہے تھے اس لیے کسی وزیر، سفیر، بیوروکریٹ اور جاگیردار یا صنعت کار کے بچے کے بجائے عمران سجاد کو اسکالرشپ مل گئی۔ چھ مہینے بعد پہلے سمسٹر میں اس نے پورے گروپ میں نمبر ٹو پوزیشن حاصل کی۔ دوسرے سمسٹر میں وہ پہلے نمبر پر آیا اور تیسرے سمسٹر تک وہ مجموعی طور پر پہلے نمبر پر آ گیا تھا۔ اس نے یہ سبقت ڈگری کے حصول تک برقرار رکھی تھی۔

عمران اکبر کا شعبہ دوسرا تھا اس لیے اس سے ملاقات کا موقع کم ملتا تھا مگر ان میں ملاقات ہوتی تھی۔ اسے حیرت ہوتی تھی کہ اکبر یونیورسٹی کی ہر تقریب میں آگے آگے ہوتا تھا۔ اس کے شعبے میں شاید ہی کوئی فرد ایسا ہو جس سے اس کی دوستی یا اچھے تعلقات نہ ہوں۔ لڑکیاں اس کی دیوانی تھیں۔ اس کے آگے پیچھے گھومتی تھیں۔ عمران سجاد اس کی وجہ جانتا تھا۔ وہ بلا کا چرب زبان تھا۔ پڑھنے میں اتنا تیز نہیں تھا مگر اساتذہ میں مقبول تھا اس لیے ہمیشہ اچھے نمبر لے جاتا تھا۔ اس کے برعکس سجاد اپنے آپ میں مگن رہنے والا لڑکا تھا۔ لڑکیاں تو ایک طرف رہیں اس کی لڑکوں سے بھی دوستی نہیں تھی۔ اس کے شعبے میں جنوبی ایشیا سے تعلق رکھنے والے سارے انڈین تھے اور ان سے اس کی بنتی نہیں تھی۔ شام کے وقت ایک ریستوران میں ویٹر کا کام کرتا۔ اس کا اسے اچھا معاوضہ مل جاتا تھا۔

رات کے وقت وہ اضافی اسٹڈی کرتا تھا۔ اسی وجہ سے وہ اپنی کلاس میں سب سے آگے رہتا تھا۔ پھر ایک واقعہ ایسا ہوا کہ اس کا نام تمام... اخبارات میں آیا اور ایک ٹی وی سے اس کا انٹرویو بھی نشر ہوا۔ یونیورسٹی کی ایک لڑکی کو ریپ کا نشانہ بنا کر قتل کر دیا گیا تھا۔ آثار بتا رہے تھے کہ یہ کام کسی اندر کے آدمی کا ہے۔ کیونکہ لڑکی کا تعلق اسی کے ڈپارٹمنٹ سے تھا۔ اس لیے عمران سجاد نے اپنے طور پر تفتیش کی اور اسے اندازہ ہوا کہ قاتل اصل میں یونیورسٹی میں صفائی کا سامان مہیا کرنے والا فرد تھا۔ وہ عام طور سے شام کے وقت آتا تھا جب کلاسز ختم ہو چکی ہوتی تھیں اور عمارتیں سنسان ہو جاتی تھیں۔ لڑکی کسی وجہ سے وہاں موجود تھی اور وہ اس کا شکار بن گئی۔ لڑکی کے پاس سونے کی چین اور ایک ہیرے کی انگوٹھی تھی جو اسے اس کی دولت مند ماں نے تحفے میں دی تھی۔ واردات کے بعد یہ دونوں چیزیں غائب تھیں۔

عمران نے اپنی تفتیش کا خلاصہ ان پولیس افسران کے سامنے رکھا جو اس کیس کی تفتیش کر رہے تھے اور انہوں نے عمران... کے بتائے راستے پر چل کر قاتل کو گرفتار کر لیا۔ مجرم کے پاس سے سونے کی چین بھی نکلی اور انگوٹھی اس نے فروخت کر دی تھی۔ عمران... پولیس کو مطلع کر کے اس معاملے سے الگ ہو گیا۔ اس نے اس سے فائدہ اٹھانے اور شہرت حاصل کرنے کی کوشش نہیں کی تھی لیکن پولیس افسران نے خود اعتراف کیا کہ عمران نے ان کی مدد کی تھی۔ اس کے بعد سب پریس اور میڈیا پر آیا۔ شہر کی انتظامیہ کی جانب سے عمران سجاد کو قانون سے تعاون کرنے پر اعزاز دیا گیا تھا۔ پھر ایک ٹی وی پروگرام میں اس کا انٹرویو بھی نشر ہوا۔ یونیورسٹی نے ایک تقریب منعقد کی جس میں عمران... کے ساتھ مقتول لڑکی کے گھر والوں کو بھی بلایا گیا تھا۔ وہ بھی عمران... کے شکر گزار تھے کہ اس نے انصاف کی فراہمی میں اپنا کردار ادا کیا۔ قاتل کو سزائے موت سنائی گئی بعد میں یہ سزا چالیس سال قید میں بدل دی گئی۔

عمران سے... آخری سمسٹر میں تھا جب اسے بعض ٹیکنیکل کمپنیوں کی جانب سے ملازمت کی پیشکش ہوئی۔ یہ اچھی پیشکش تھی کیونکہ اس میں نہ صرف اچھی تنخواہ تھی بلکہ بعد میں امریکی شہریت بھی مل سکتی تھی مگر اس نے انکار کر دیا۔ اتفاق سے اکبر کو پتا چل گیا اور وہ اس کے پاس آیا۔ اس نے اصرار کیا کہ وہ یہ پیشکش قبول کر لے مگر عمران... نے کہا۔ ”میں سرکاری خرچ پر آیا ہوں اس لیے میں واپس جانے کا پابند ہوں۔“

”کہاں کا سرکاری خرچ... یہ امریکی اسکالرشپ ہے۔“

”ہاں لیکن یہ مجھے نہیں میرے وطن کو دی گئی ہے اور پھر مجھے ملی ہے۔“

اکبر نے اسے عجیب نظروں سے دیکھا۔ ”تم عجیب باتیں کرتے ہو۔“

”یہ اصولی بات ہے۔“ عمران نے کہا۔ ”میرے دادا تقسیم سے پہلے پولیس میں ایک اعلیٰ عہدے پر تھے لیکن صرف اس لیے وہ ملازمت چھوڑ کر آ گئے کہ وہ نئے ملک کے

حامی تھے۔ یہاں ان کو وہ پوسٹ نہیں ملی جو وہاں چھوڑ کر آئے تھے۔ اس بات سے تم سمجھ لو، اصول پسندی ہمارے خاندان میں شامل ہے۔''

اکبر یہ بات سمجھ نہیں سکا تھا کہ اس میں اصول کہاں سے آگئے لیکن اس نے پھر اصرار نہیں کیا اور اس کے بعد ان کی ملاقات نہیں ہوئی۔ ماسٹر کی ڈگری ہاتھ میں آنے ہی عمران نے واپسی کی سیٹ بک کرائی تھی۔ ان پانچ سالوں میں اس نے کچھ رقم بچائی تھی۔ اس نے گھر والوں اور دوست احباب کے لیے تحفے لیے۔ کیونکہ اس نے پہلی پوزیشن حاصل کی تھی اس لیے اسے ڈگری کے ساتھ میڈل اور کیش ایوارڈز بھی ملا تھا۔ ساتھ ہی اسے یونیورسٹی کی طرف سے آگے پڑھنے کی پیشکش ہوئی تھی۔ خود اس کی بھی خواہش تھی کہ آگے پڑھے۔ مگر وہ اس پیشکش سے کسی بھی صورت فائدہ اٹھا سکتا تھا۔ اس لیے اس نے فی الحال واپسی کو ترجیح دی۔ اس کی ماں اس وقت گزر گئی تھی جب وہ میٹرک میں تھا۔ اب اس کا بوڑھا باپ اور اس کے بہن بھائی اس کی واپسی کے منتظر تھے۔ پانچ سال میں وہ صرف ایک بار وطن گیا تھا۔ بعد میں جب اسے پہلی بار پوسٹ ہٹا کر فارغ کیا گیا تو اس نے یونیورسٹی کی پیشکش قبول کی تھی اور مزید تین سال وہ یہاں پڑھتا رہا تھا۔ اس نے کرمنالوجی میں پی ایچ ڈی کی تھی۔

☆☆☆

آئی جی کا اندازہ غلط تھا چیمبر آف کامرس کا وفد شہر کی تجارتی سرگرمیوں میں حائل رکاوٹوں اور خاص طور سے بھتہ مافیا کے خلاف کارروائی کا مطالبہ لے کر آیا تھا۔ عمران سجاد نے انہیں یقین دلایا کہ اس کے بس میں جو ہوا وہ لازمی کرے گا۔ اس نے وفد سے کہا کہ وہ پہلے ہی بھتا خوری پر قابو پانے کے لیے ایک میکنزم وضع کر رہا ہے جیسے ہی یہ مکمل ہوگا وہ اسے تاجروں اور صنعت کاروں کی مدد سے اپلائی کرے گا۔ میٹنگ کے بعد اس نے کہا۔ ''آپ میں سے کچھ حضرات مجھے اپنا سیل نمبر دے دیں۔ میں آپ سے اور آپ مجھ سے جب ضروری ہو فوری رابطہ کر سکیں۔''

عمران... کی توقع کے عین مطابق نمبر دینے والوں میں عمران اکبر بھی شامل تھا۔ اس میٹنگ میں اس نے عمران ... سے شناسائی ظاہر نہیں کی تھی۔ حالانکہ وہ اسے طویل برسوں کے بعد بھی پہچان گیا تھا۔ میٹنگ کے فوراً بعد سی ایم ہاؤس سے کال آگئی۔ پرسوں ہونے والی تقریب میں اس کے شعبے کے رول پر بات ہونی تھی۔ اسے شام سی ایم ہاؤس طلب کیا گیا تھا۔ عمران... جانتا تھا کہ دوران جاب اسے غیر متعلقہ معاملات میں زیادہ الجھنا پڑے گا جن کا تعلق وی آئی پیز سے ہوتا ہے۔ گزشتہ دو عشرے میں وی آئی پیز کا ایسا ماحول پروان چڑھا تھا کہ اب حکومت کے بیشتر اقدامات ان کے گرد ہی گھومتے تھے۔

عمران ... برسوں سے صورت حال دیکھ رہا تھا اور کڑھ رہا تھا۔ اس نے اس دوران میں متعدد تجاویز حکام کو پیش کی تھیں، ان میں سے کچھ پر کام ہوا تھا مگر باقی ڈسٹ بن میں ڈال دی گئی تھیں۔

شام کو وہ سی ایم ہاؤس کی بے مقصد میٹنگ میں شریک ہوا کیونکہ سیکیورٹی پلان پہلے ہی تشکیل دیا جا چکا تھا۔ کل شام سے پولیس کمانڈوز این ٹی ٹی پر پوزیشن سنبھال لیتے۔ اس کے بعد بم ڈسپوزل والے بلڈنگ کو کلیئر کرتے، چھت پر اسنائپرز کی ڈیوٹی ہوتی اور آنے والے چوبیس گھنٹے تک عمارت میں چڑیا کا بچہ بھی پر نہیں مار سکتا تھا۔ علاقے کی سیکیورٹی رینجرز کے سپرد تھی۔

☆☆☆

سی ایم ہاؤس سے واپسی پر عمران سجاد نے وہاں سے دو چیزیں لی تھیں۔ ایک سیکیورٹی پلان اور دوسرا این ٹی ٹی کا نقشہ لے آؤٹ جس میں سیکیورٹی کی ہر تفصیل بیان کی گئی تھی۔ رعنا کی طبیعت ٹھیک نہیں تھی، کسی قدر فلو کا اثر تھا۔ کھانے کے بعد وہ عمران ... کو کافی دے کر سونے چلی گئی۔ ملازمہ صبح آتی اور شام چھ بجے چلی جاتی تھی۔ عمران... کافی لے کر نشست گاہ میں آگیا۔ سیکیورٹی پلان معمول کے مطابق تھا لیکن این ٹی ٹی کا لے آؤٹ دیکھ کر اسے حیرت ہوئی۔ اس بلڈنگ کی اندرونی سیکیورٹی عالمی معیار کے مطابق تھی۔ نیلگوں شیشوں سے مزین ساڑھے چار سو فٹ بلند اور چھتالیس منزلہ اس عمارت کی تعمیر اور تحفظ میں جدید ترین پیمانوں کا پورا خیال رکھا گیا تھا۔ یہ پوری عمارت تجارتی دفاتر کے لیے مخصوص تھی۔ جس کمپنی نے اسے تعمیر کیا تھا، اس نے عمارت کے حصے فروخت کرنے کے بجائے انہیں کرائے پر دینے کا فیصلہ کیا تھا۔ اس شہر اور ملک کی ہی نہیں بلکہ بین الاقوامی فرمز جو یہاں کاروبار کرتی تھیں، ان کی خواہش تھی کہ این ٹی ٹی میں ان کا دفتر ہو اس لیے تعمیر مکمل ہونے سے پہلے ستر فیصد اس کا بک ہو چکا تھا۔

عام افراد کے لیے عمارت میں داخلے کا ایک ہی راستہ تھا جس پر جدید ترین آلات لگے تھے۔ یہ آلات نہ صرف معمولی سی بارودی مقدار کا سراغ لگا سکتے تھے بلکہ ہر

قسم کے آتشیں اسلحے کی نشان دہی بھی کر سکتے تھے۔ پوری عمارت میں تقریباً ایک ہزار ہائی ریزولیوشن کیمرے لگے تھے جو سو فٹ کی دوری سے آدمی کا چہرہ شناخت کر سکتے تھے۔ یہ کیمرے عمارت اور اس کے آس پاس ہر ممکنہ جگہ نظر رکھتے تھے جہاں سے کوئی فرد گزر سکتا تھا۔ اس کے علاوہ انفراریڈ آلات، دھوئیں اور آگ کی نشان دہی کرنے والے سنسر بھی لگے ہوئے تھے۔ عمارت کے ہر حصے میں آگ بجھانے والے جدید ترین آلات موجود تھے۔

ان تمام سیکیورٹی اور نگرانی کے آلات کی مدد سے بیسمنٹ میں موجود کنٹرول روم میں چھ آپریٹر پوری عمارت پر نظر رکھتے تھے۔ تمام متعلقہ افراد اور ریڈیو کی مدد سے آپس میں منسلک تھے۔ کسی بھی ہنگامی صورت حال میں متعلقہ افراد کو خبردار کرنے میں چند سیکنڈ کا وقت لگتا۔ لفٹس کے علاوہ آمدورفت کے لیے ایمرجنسی میں چار زینے تھے۔ دو زینے عام آمدورفت کے لیے تھے جو لابی نمبر دو اور تین سے شروع ہوتے تھے اور دو ہنگامی حالات کے لیے مخصوص تھے اور یہ لابی نمبر ایک میں کھلتے تھے کیونکہ یہ لابی داخلی دروازے کے بالکل سامنے تھی۔ ہر لفٹ اور عمارت میں ہر فلور پر متعدد جگہوں پر انٹرکام سسٹم لگے ہوئے تھے جن کی مدد سے کوئی بھی فرد کنٹرول روم سے بات کر سکتا تھا۔ اس کا مقصد معلومات حاصل کرنا یا کسی ہنگامی صورت حال میں مدد طلب کرنا تھا۔ عمران۔۔۔ فائل دیکھ رہا تھا۔ رات کے گیارہ بج گئے تھے۔ وہ سوچ رہا تھا کہ اب سونا چاہیے صبح اسے بہت کام تھا۔ موبائل کی بیل بجی تو اس نے سوچا کہ اس وقت کس کا فون آ گیا۔ اس نے موبائل اٹھایا تو اسکرین پر عمران اکبر کا نام آ رہا تھا۔

''ہیلو۔'' عمران سجاد نے کال ریسیو کی۔

''کیا حال ہیں دوست۔'' عمران اکبر نے بے تکلفی سے کہا۔ ''سوری میٹنگ میں مناسب نہیں لگا کہ تم سے پرانی شناسائی کا اظہار کرتا۔''

''تم نے اچھا کیا۔ یہ ہم دونوں کے لیے مناسب نہیں ہوتا۔'' عمران سجاد نے بھی بے تکلفی سے کہا۔ ''میرا خیال تھا کہ تم امریکا میں ہو گے۔ تمہیں یہاں دیکھ کر حیرت ہوئی۔ ایسا لگا جیسے تم نے جو کچھ پچاس سال میں حاصل کرنے کا سوچا تھا وہ بیس اکیس سال میں حاصل کر لیا ہے۔''

''امریکا میں کچھ عرصے رہا تھا۔ جلد میں نے محسوس کر لیا کہ وہاں مجھے سچ مچ پچاس سال لگ جائیں گے اور پھر ایک حد سے اوپر جانا ممکن نہیں رہے گا۔ دوسرے مسائل بھی تھے اس لیے میں واپس آ گیا۔''

''ہاں یہاں میدان کھلا ہے۔'' عمران سجاد نے سادگی سے کہا۔ ''ڈالر کمانے کی جو آزادی یہاں میسر ہے وہ دنیا میں کہیں نہیں ہے۔''

''درست کہا تم نے۔''

''یہاں کیا کر رہے ہو؟''

''ہر وہ کام جس میں نفع ہو۔''

''کوئی خاص فیلڈ نہیں ہے؟'' عمران سجاد نے بے یقینی سے کہا۔ ''تم چیمبر آف کامرس میں اسنے اوپر ایسے ہی تو نہیں پہنچے ہو گے؟''

''مختلف ہیں، اسٹاک، آٹو موبائل، بلڈنگ اور بلڈرز۔'' اکبر نے بے پروائی سے کہا۔ ''تم سناؤ۔۔۔ مجھے اندازہ نہیں تھا کہ اس دفتر میں تم سے ملاقات ہو گی۔''

''پندرہ سال پہلے یہ دفتر میں نے ہی قائم کیا تھا۔ تین سال یہاں رہا پھر واپس چلا گیا۔ بنیادی طور پر فیلڈ رول کا بندہ ہوں اس لیے اِدھر اُدھر ہوتا رہتا ہوں۔''

''شہر پندرہ سال پہلے کے مقابلے میں بہت بدل گیا ہے۔''

''ہاں سب بدل گیا ہے کیونکہ ہم نے اپنی سوچ نہیں بدلی ہے۔''

اکبر ہنسا۔ ''تم اب بھی کتابی باتیں کرتے ہو۔''

''نہیں میں عمل پر زیادہ یقین رکھتا ہوں۔''

''تب تم ناکام رہو گے۔'' اکبر نے کچھ دیر رک کر کہا۔ ''دوست یہاں صرف مفاد پر یقین رکھنے والے کامیاب ہوتے ہیں۔''

''اب تک تو میں نے ایسا نہیں کیا اور ناکام بھی نہیں رہا۔ جو ذمے داری سونپی گئی، اسے کامیابی سے نبھایا۔''

''دوست بالآخر تم ناکام رہو گے۔ بہت سے لوگوں کی طرح جو کتابی باتیں کرتے تھے اور پھر انہوں نے ہار مان لی ہے۔''

''ممکن ہے کبھی میں بھی ہار مان جاؤں کیونکہ میں کمزور انسان ہوں لیکن دوست میں جن اصولوں پر یقین رکھتا ہوں تاریخ گواہ ہے فاتح وہی رہے ہیں۔ سقراط کے زہر کے پیالے سے لے کر حسینؓ کے کربلا میں آخری سجدے تک لیکن شاید تم یہ بات نہیں سمجھو گے۔''

''بالکل نہیں سمجھوں گا کیونکہ میں کچھ اور طرح کے اصول رکھتا ہوں۔''

''انہیں اصول نہیں کہتے۔ خیر چھوڑو یہ بتاؤ تم یہ سول

والی تقریب میں مدعو ہو؟''

''مدعو۔'' اکبر ہنسا۔ ''دوست یہ میری تقریب ہے میں این ٹی ٹی کا مالک ہوں۔ میں نے بتایا تھا نا کہ ایک بزنس بلڈر کا بھی ہے۔''

''اوہ!'' عمران سجاد حیران ہوا۔

''گڈ نائٹ دوست اپنا خیال رکھنا، ممکن ہے آنے والے دنوں میں تم مشکل وقت گزارو۔'' اکبر نے کہا اور کال کاٹ دی۔ عمران... سوچ رہا تھا کہ اس نے کال کیوں کی تھی، کیا صرف یہ بتانے کے لیے وہ کتنا دولت مند ہو گیا ہے؟

☆☆☆

عمران صبح ساڑھے چھ بجے اٹھا تو رعنا پہلے ہی اٹھ گئی تھی۔ حالانکہ اس کی طبیعت پوری طرح ٹھیک نہیں ہوئی تھی۔ رات بھی اسے ہلکی سی حرارت رہی تھی۔ ملازمہ نو بجے آتی تھی اس لیے رعنا کو اٹھنا پڑا۔ عمران غسل اور دوسری ضروریات سے فارغ اور تیار ہو کر آیا تو رعنا ناشتا بنا چکی تھی۔ اس نے عمران... کے سامنے ناشتا لگایا تو اس نے سوالیہ نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔ وہ بولی۔ ''میرا دل نہیں چاہ رہا بس چائے لوں گی۔''

''ٹھیک ہے لیکن بعد میں ناشتا کر لینا۔'' عمران... نے کہا اور ناشتا کرنے لگا۔ ''نہیں ڈاکٹر کے پاس جا کر ٹریٹمنٹ کرلو گی یا میں کسی کو بھیج دوں؟''

''ذرا دیکھ کر لوں گی۔'' رعنا نے جواب دیا۔ ''ٹھیک ہے ڈاکٹر کو دکھا دوں گی ویسے مجھے کچھ چیزیں بھی لینی ہیں۔''

''ٹھیک ہے پھر مجھے بتاؤ۔''

رعنا ہچکچائی پھر اس نے پوچھ لیا۔ ''آج جلدی آئیں گے؟''

عمران جانتا تھا آج ان کی شادی کی سالگرہ تھی۔ وہ دونوں جانتے تھے مگر وہ اس بارے میں بات نہیں کرتے اور نہ ہی بہت اہتمام سے مناتے تھے۔ رعنا اس دن کوئی نیا سوٹ پہن لیتی اور کھانے میں ذرا اہتمام کر لیتی تھی۔ عمران... پرفیوم گفٹ کرتا تھا۔ رعنا کو خوشبو اچھی لگتی تھی۔ بس یہ ان کی شادی کی سالگرہ ہوتی تھی۔ عمران... نے نفی میں سر ہلایا۔ ''جلدی جانا مجبوری ہے واپسی میں دیر ہو گی۔ بہرحال ڈنر سے پہلے آ جاؤں گا۔''

ناشتا کر کے عمران... نے اپنا بریف کیس اٹھایا۔ رعنا اسے باہر تک چھوڑنے آئی۔ موسم سرد ہو رہا تھا اور بہت تیز ٹھنڈی ہوا چل رہی تھی۔ عمران... نے اسے منع کیا کہ وہ باہر نہ آئے، اس کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے پھر بھی رعنا برآمدے تک آ گئی۔ عمران کے گارڈز اور گاڑیاں آ گئی تھیں۔ آدھے گھنٹے بعد وہ ٹیرو ٹاور کے سامنے تھا اور ابھی آٹھ بجے تھے۔ سی ایم نو بجے آتے اور سوا نو بجے بلڈنگ کا افتتاح ہوتا۔ شہر بلکہ صوبے کی بلند ترین عمارت کا افتتاح کرنا یقیناً سی ایم کے لیے بھی اہم موقع تھا۔ ہر سیاست داں کی طرح وہ خود نمائی کا کوئی موقع ہاتھ سے جانے نہیں دیتے تھے۔

عمران... کا شعبہ دوسرا تھا لیکن وہ پولیس کمانڈوز کے سربراہ نعمان صدیقی سے رابطے میں تھا۔ نعمان پولیس کمیونیکیشن وین میں تھا۔ اس کا دستہ عمارت کے اندر مختلف جگہوں پر پوزیشن سنبھال چکا تھا۔ بارہ گھنٹے پہلے بم ڈسپوزل اسکواڈ نے پوری عمارت کو چیک کر کے کلیئر کر دیا تھا۔ آس پاس کی سڑکوں پر رینجرز تعینات تھی۔ تقریب کے لیے سی ایم کے ساتھ ان کے دو مشیر دو وزیر، کچھ ذاتی گارڈز اور ایک درجن بزنس مین اندر جا سکتے تھے۔ تقریب کی کوریج سرکاری فوٹو گرافر اور کیمرا مین کرتے، بعد میں فوٹیج اور ویڈیو میڈیا کو فراہم کی جاتی۔ پہلے تقریب کے بعد این ٹی ٹی کی سیڑھیوں پر ایک مختصر پریس کانفرنس کا منصوبہ تھا مگر سیکیورٹی وجوہات کی بنا پر اسے منسوخ کر دیا گیا۔ آئی جی اور دوسرے اعلیٰ افسران منظر سے غائب تھے۔ ممکن ہے وہ نہ آتے کیونکہ ان کا یہاں کام نہیں تھا مگر ہو سکتا تھا کہ نمبر بنانے کے لیے وہ آ جاتے۔

عمران... کے شعبے کے آدمی سادہ لباس میں آس پاس موجود تھے۔ انہیں مشکوک گاڑیوں اور افراد پر نظر رکھنے کی ذمے داری سونپی گئی تھی۔ بوقت ضرورت وہ رینجرز کی مدد حاصل کر سکتے تھے۔ کیونکہ پولیس کمانڈوز موجود تھے اس لیے عمران... کے شعبے کے ایلیٹ دستے کی ضرورت نہیں تھی۔ عمران... کے ساتھ اس کا نائب اختر عباس تھا۔ اختر چار سال سے فورس میں تھا وہ بھی وزارت داخلہ سے آیا تھا اور عمران... کے گروپ کا آدمی تھا اس لیے دونوں میں اچھی بن رہی تھی۔ اختر کی کارکردگی اچھی رہی تھی۔ خاص طور سے دہشت گردوں کے ایک نیٹ ورک کے خلاف اس کی دلیرانہ کارروائی نے شہر کو بڑی تباہی سے بچا لیا تھا۔ دہشت گرد ایک فائیو اسٹار ہوٹل پر حملے کا منصوبہ بنا چکے تھے جہاں زیادہ تر غیر ملکی ٹھہرتے تھے اور عمل سے صرف دو گھنٹے پہلے اختر اور اس کی ٹیم نے چھاپا مار کر ان سب کو مع اسلحے اور گولہ بارود کے گرفتار کر لیا تھا۔ عمران... نے اختر سے کہا۔ ''تم یہاں رکو میں ذرا اندر کا چکر لگا کر آتا

ہوں۔"

اندر پولیس کے ایک درجن کمانڈوز تھے۔ اتنے ہی باہر بھی موجود تھے۔ کیونکہ تقریب محدود اور محفوظ جگہ تھی اس لیے گارڈز کا لشکر جمع نہیں کیا گیا تھا۔ عمران..... کے سینے پر اس کا کارڈ آویزاں تھا۔ وہ اندر مین لابی میں آیا جہاں تقریب کا انعقاد ہونا تھا۔ یہاں چھ کمانڈوز تھے اور تین تین دوسری لابیوں میں تھے۔ یہاں آنے کے بعد عمران... کو پتا چلا تھا کہ عمارت کی اپنی سیکیورٹی بند کر دی گئی تھی کیونکہ کنٹرول روم کے عملے کو عمارت میں رہنے کی اجازت نہیں دی گئی تھی۔ وہ حیران ہوا تھا اس نے نعمان سے پوچھا تو اس نے کہا۔ "یہ سیکیورٹی پروٹوکول میں شامل ہے۔ سائٹ پر کوئی غیر متعلقہ فرد نہیں رہ سکتا ہے۔"

عمران..... نے اعتراض کیا۔ "اس صورت میں پولیس کے ماہرین کو کنٹرول روم میں ہونا چاہیے تھا۔"

"میں نے بھی یہی تجویز دی تھی لیکن آئی جی صاحب نے اتفاق نہیں کیا۔ ان کا کہنا ہے پوری عمارت چیک کر لی گئی ہے باہر سے کوئی غیر متعلقہ فرد یہاں نہیں آسکتا..... پھر تقریب مین لابی میں ہوگی اور سی ایم صاحب آدھے گھنٹے میں وہیں سے واپس چلے جائیں گے۔"

"بات صرف آدھے گھنٹے کی نہیں ہے۔" عمران... نے سوچ کر کہا۔ "بہرحال اب تو فیصلہ ہو چکا ہے۔"

"ہاں اب ہم کچھ نہیں کر سکتے۔"

این ٹی ٹی کے تمام کیمرے اور سیکیورٹی و نگرانی کے آلات بند تھے۔ لفٹس بند تھیں۔ صرف زینے کھلے تھے۔ پولیس اسنائپرز سیڑھیوں سے اوپر گئے تھے۔ ان کی تعداد چار تھی اور یہ چاروں طرف نظر رکھ سکتے تھے۔ عمران... نے دونوں لابیوں کا معائنہ کیا۔ سب معمول کے مطابق تھا۔ کمانڈوز چوکس تھے۔ وہ واپس آرہا تھا تو اس نے ایک پولیس مین کو تھرماس سمیت اندر جاتے دیکھا۔ موسم سرد تھا اس لیے اہلکاروں کو چاق چوبند رکھنے کے لیے چائے دی جارہی تھی۔ یہ بھی معمول کے مطابق تھا اس لیے عمران... نے توجہ نہیں دی۔ تھرماس لے جانے والا ساتھ میں کاغذی کپ کا ڈبا بھی لے کر گیا تھا۔ وہ اہلکاروں کو چائے دینے لگا۔ سوائے دو کے کسی نے انکار نہیں کیا۔ ان کو چائے دے کر وہ پولیس والا سیڑھیوں کی طرف بڑھ گیا۔ وہ یقیناً اوپر اسنائپرز کو چائے دینے جارہا تھا اس لیے کسی نے اسے نہیں روکا۔

پولیس مین کی عمر زیادہ نہیں تھی مشکل سے بیس بائیس

سیال کا تھا اور حال ہی میں بھرتی شدہ لگ رہا تھا۔ کیونکہ اس نے مکمل یونیفارم کے ساتھ اپنا کارڈ بھی گلے میں لٹکایا ہوا تھا اس لیے کسی نے توجہ نہیں دی۔ ویسے بھی ابھی ٹیم کے آنے میں سوا گھنٹا باقی تھا۔ سیڑھیوں پر آتے ہی اس کی چال میں تیزی آگئی اور کسی ایتھلیٹ کی طرح سیڑھیاں چڑھنے لگا۔ تھرماس اس نے اسٹریپ سے شانے پر لٹکا لیا تھا۔ اتنی منزلیں چڑھنا آسان کام نہیں تھا مگر وہ تقریباً ایک جیسی رفتار سے بیالیسویں منزل پر پہنچا اور رکا لیکن سانس لینے کے لیے نہیں بلکہ اس نے جیب سے ایک شیشی نکالی جس میں بے رنگ سیال تھا۔ اس نے سیال کے چند قطرے بہت احتیاط سے تھرماس کا ڈھکن کھول کر اندر ٹپکائے اور تھرماس بند کر کے اسے ہلانے لگا۔ تقریباً دس منٹ رکنے کے بعد وہ چھت پر آیا۔ پولیس والے چونکے لیکن اپنے آدمی کو دیکھ کر پرسکون ہوگئے اور پھر تھرماس دیکھ کر خوش ہوئے۔

آج سردی اچھی خاصی تھی۔ اوپر سے تیز ہوا چل رہی تھی اور اس بلندی پر اس کا اثر زیادہ ہی تھا اس لیے کسی نے چائے سے انکار نہیں کیا۔ اس نے سب کو کپ بھر کر دیے اور وہ چسکیاں لینے لگے۔ نوجوان پولیس والا جانے کے بجائے وہیں رکا رہا۔ اس کا انداز ایسا تھا جیسے ان کے طلب کرنے پر وہ مزید چائے دینے کے لیے رکا ہے مگر دوسرے کپ کی نوبت نہیں آئی، سب سے پہلے وہ گرا جس نے سب سے پہلے کپ ختم کیا تھا۔ دوسرے اس کی طرف متوجہ ہوئے لیکن صورت حال سمجھنے سے پہلے ایک ایک کر کے گرتے چلے گئے۔ ان کی اسنائپر رائفلیں اسٹینڈز پر رکھی رہ گئیں۔ یہ طویل فاصلے پر مار کرنے والی رائفلیں تھیں۔ نوجوان نے تھرماس وہیں چھوڑا اور تیزی سے واپس سیڑھیوں پر آیا اور راہداری سے ہوتا چالیسویں فلور کی لفٹس کی طرف آیا۔ اس نے زور لگا کر ایک لفٹ کے دونوں پٹ کھول لیے۔

لفٹ نیچے تھی۔ اس نے خلا میں اوپر دیکھ کر آہستہ سے سیٹی بجائی۔ جواب میں ویسی ہی سیٹی کی آواز آئی۔ جب نوجوان نے دوسری بار سیٹی بجائی تو ایک رسی نیچے گری اور اس سے ایک آدمی پھسلتا ہوا نیچے آیا۔ اس نے سیاہ رنگ کا لباس پہن رکھا تھا اور پشت پر خاصا بڑا سا بیگ بندھا ہوا تھا۔ نوجوان نے اسے اندر کھینچا رسی ڈھیلی ہوئی تو دوسرا اور پھر یکے بعد دیگرے درجن افراد برآمد ہوئے تھے۔ اس دوران میں نوجوان نے دوسری لفٹ کا دروازہ بھی کھول دیا تھا اور اس سے بھی درجن افراد باہر نکلے۔ سب ایک جیسے سیاہ لباس اور حلیے میں تھے اور سب کے سروں پر سیاہ ٹوپی تھی۔ لفٹ سے اترنے والا پہلا آدمی سرخی مائل سانولا تھا اور نقوش کسی حد تک وسط ایشیائی باشندوں جیسے تھے۔ اس کے ساتھ دو افراد اور تھے۔ صورت سے وہ تینوں آپس میں بھائی لگ رہے تھے۔ اس نے نوجوان سے پوچھا۔

”چائے سب نے پی؟“

”نہیں نیچے دو افراد نے انکار کیا۔“

”اوپر والے؟“

”ان کو دگنا ڈوز دے دیا ہے۔ وہ سب بے ہوش ہیں۔“

وسط ایشیائی مسکرایا۔ ”وہ بے ہوش نہیں ہوں گے۔“

نوجوان چونکا۔ ”کیا مطلب؟“

”وہ مر چکے ہوں گے۔ یہ دوا دگنی کرنے پر زہر بن جاتی ہے۔“ اس نے کہا اور اپنے ساتھیوں کو اشارہ کیا۔ آٹھ آدمی اوپر کی طرف گئے۔ کچھ دیر بعد ان میں سے چار پولیس اسنائپرز کی لاشیں لے کر نیچے آئے۔ وسط ایشیائی نے ٹھیک کہا تھا۔ لاشیں بے لباس تھیں ان کی وردیاں اتار لی گئی تھیں۔ انہیں رسی کے ذریعے دو دو کر کے دونوں لفٹوں کے خلا میں لٹکا دیا گیا۔ سارا کام نہایت پھرتی اور مہارت سے کیا گیا تھا۔ لاشوں کو گلے میں رسی باندھ کر اس طرح لٹکایا کہ دو لاشیں ایک ہی رسی میں آگئی تھیں۔ یہ کام کر کے لفٹس کے دروازے بند کر دیے گئے۔ اب اگر کوئی غیر متوقع طور پر آ جاتا تو اسے لاشیں نظر نہیں آتیں۔ وسط ایشیائی نقوش والا اوپر چھت پر آیا۔ اس کے چاروں آدمی پولیس کی وردی پہن کر اسنائپر رائفلوں پر آگئے تھے۔ اب کوئی دور سے دیکھتا تو انہیں پولیس اسنائپر ہی سمجھتا۔

وسط ایشیائی اوپر سے مطمئن ہو کر نیچے آگیا۔ اس کی نظر اپنی کلائی پر موجود گھڑی پر مرکوز تھی۔ ساڑھے آٹھ بج چکے تھے۔ ٹھیک آدھے گھنٹے بعد انہیں حرکت میں آنا تھا۔ وسط ایشیائی کے ساتھی ایک جیسے لباس اور حلیے میں ایک سے لگ رہے تھے۔ وسط ایشیائی بہت صاف اردو بول رہا تھا لیکن اس دوران میں صرف اسی نے زبان کھولی تھی باقی سب بالکل خاموش کھڑے تھے۔ جیسے ہی گھڑی کی سوئیاں نو پر پہنچیں، وسط ایشیائی کے لباس سے ہلکی سی بیپ کی آواز آئی اور وہ کھڑا ہو گیا۔ اس نے اپنے ساتھیوں سے کہا۔

”چلو۔“

انہوں نے اپنی ٹوپیاں کھینچ کر منہ پر کر لیں اور اب وہ نقاب بن گئی تھیں۔ سوائے ان کی آنکھوں کے اور کچھ نظر

نہیں آرہا تھا۔ ان کے ہاتھوں میں دستانے اور پیروں میں ربڑ کے کریپ سول کے جوتے تھے۔ ایک منٹ بعد وہ سب بے آواز قدموں سے سیڑھیاں اتر رہے تھے۔

☆☆☆

چیف منسٹر کا قافلہ ٹھیک آٹھ بج کر پچپن منٹ پر این ٹی ٹی کے سامنے پہنچا۔ ایک قطار میں ایک جیسی تین سیاہ لیموزین تھیں اور یہ سب بلٹ پروف اور بم پروف گاڑیاں تھیں۔ سی ایم ان میں سے کسی ایک گاڑی میں سفر کرتے تھے اور گاڑی چلانے والے ڈرائیور کو بھی علم نہیں ہوتا تھا کہ ان کی گاڑی میں سی ایم ہیں یا نہیں۔ اگلی گاڑی سے سی ایم کا پی اے اترا اور سیدھا نعمان کے پاس آیا۔ اس نے پوچھا۔ ''ایوری تھنگ از اوکے۔''

''یس سر۔'' نعمان نے کہا۔ باہر موجود پولیس کمانڈوز اب گاڑیوں کے آس پاس پھیل رہے تھے۔ عمران ... وہیں تھا لیکن اس نے آگے آنے کی کوشش نہیں کی۔ اسے معلوم تھا سی ایم نے اسے وفاق کے دباؤ پر قبول کیا ہے ورنہ اس پوسٹ کے لیے وہ انہیں قابل قبول نہیں تھا۔ عین اسی وقت بزنس مین وفد بھی وہاں پہنچ گیا۔ اگرچہ وہ میزبان تھے۔ خاص طور سے ...... اکبر لیکن انہیں پہلے آنے کی اجازت نہیں ملی تھی۔ ان کی گاڑیاں بھی پہلے روک دی گئی تھیں۔ بہرحال اب وہ این ٹی ٹی کی سیڑھیوں تک پہنچے۔ سرکاری کیمرا مینوں نے اپنا کام شروع کیا۔ سی ایم آگے آئے اور بزنس مین وفد نے ان کا استقبال کیا۔ ٹھیک نو بجے وہ عمارت میں داخل ہو چکے تھے۔ عمران ... کی توجہ ان لوگوں کے بجائے آس پاس تھی۔ اس نے واکی ٹاکی پر اختر سے پوچھا۔ ''سب ٹھیک ہے۔ کوئی مشکوک فرد یا گاڑی آس پاس نہیں ہے؟''

''کلیئر سر۔'' اس نے کہا۔

''پھر بھی ہوشیار رہنا۔'' عمران ... نے کہا اور سڑک پار کر کے عمارت کے داخلی دروازے کی طرف بڑھا۔ اب صرف دروازے پر چند پولیس کمانڈوز موجود تھے۔ وہ پوری طرح چوکس تھے۔ عمران ... اندر داخل ہوا تو اسے تقریب والا حصہ دکھائی دیا۔ تقریب فرسٹ لابی میں جاری تھی جہاں این ٹی ٹی کا نام اور مخصوص نشان ایک کرسٹل بال پر بنایا گیا تھا اور یہ لابی کے وسط میں لگی تھی۔ اس کے نیچے تقریباً پانچ فٹ قطر کا چھوٹا سا تالاب تھا جس میں چاروں طرف سے جھرنے کی طرح پانی گر رہا تھا۔ کرسٹل بال کو سرخ ریشمی چادر سے ڈھک دیا گیا تھا اور جب سی ایم افتتاحی ربن کاٹتے تو یہ چادر اوپر کی طرف اٹھ جاتی اور کرسٹل بال اندر سے روشن ہو جاتی۔ عمران ...... یہ سب تفصیلات جانتا تھا اور اسے اس تقریب سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ وہ کسی اور وجہ سے اندر آیا تھا۔ اس نے آنے کے بعد ایک مگ چائے اور پی تھی اور زیادہ چائے مسئلہ بن جاتی تھی۔ وہ بائیں طرف والی لابی میں آیا اور وہاں موجود ایک پولیس اہلکار سے واش روم کا پوچھا۔ اس نے رہنمائی کی۔

''سر یہ سیڑھیوں کے نیچے جو دروازہ ہے یہ بیسمنٹ میں جاتا ہے۔ نیچے اترتے ہی سیدھے ہاتھ پر باتھ روم ہے۔''

اکبر سر ہلاتا ہوا اس طرف بڑھ گیا۔ جیسے ہی وہ دروازے کے اندر گیا' اس کی رہنمائی کرنے والا پولیس اہلکار اچانک نیچے گر پڑا۔ اس کا دوسرا ساتھی بھی گرا تھا اور تیسرا جس نے چائے نہیں پی تھی' وہ ان کی طرف بڑھا۔ اسی لمحے سیڑھیوں سے دبے قدموں پہلا نقاب پوش نمودار ہوا۔ اس کے ہاتھ میں موجود سائلنسر لگی رائفل نے شعلہ اگلا اور تیسرا پولیس کمانڈو بھی ڈھیر ہو گیا۔ اس کے منہ سے ہلکی سی کراہ نکلی تھی۔ گولی چلانے والا تیزی سے اس کے پاس آیا اور اسے زندہ پا کر ایک فائر اور کیا۔ باقی دو کی طرف اس نے آنکھ اٹھا کر نہیں دیکھا تھا۔ اسے معلوم تھا وہ کسی قابل نہیں رہے ہوں گے۔ پھر وہ اور اس کے ساتھی تقریب والی لابی کی طرف بڑھ گئے۔ وہاں سے کسی قدر بڑبڑاہٹ کی آوازیں آ رہی تھیں۔ اس کا مطلب تھا کہ چائے میں شامل دوا نے اثر شروع کر دیا تھا۔

☆☆☆

رعنا نے عمران ... کے جانے کے بعد کچھ دیر آرام کیا پھر ملازمہ آ گئی۔ اس نے اسے کام بتائے اور بولی۔ ''میں ڈاکٹر کے پاس جا رہی ہوں۔ کچھ سامان لینا ہے شاید دیر ہو جائے۔''

''میں سب دیکھ لوں گی بی بی۔'' ملازمہ نے مستعدی سے کہا۔

رعنا کو بھوک نہیں تھی، اس نے صرف چائے پی تھی۔ اس نے گاڑی نکالی۔ یہ عمران .... نے آتے ہوئے دارالحکومت سے بک کرا کے بھیج دی تھی۔ یہ چار سال پرانی گاڑی بھی جو عمران ... نے اپنی ساری جمع پونجی سے لی تھی۔ وہ اس کا بہت خیال رکھتا تھا۔ اسپتال زیادہ دور نہیں تھا اور یہاں چوبیس گھنٹے او پی ڈی کھلی ہوتی تھی۔ رعنا کو زیادہ دیر انتظار نہیں کرنا پڑا کیونکہ اتنی صبح رش نہ ہونے کے برابر تھا۔

لیڈی ڈاکٹر نوجوان اور خوش اخلاق تھی، اس نے رعنا کا معائنہ کیا۔ اس کا حلق اور کان کا اندرونی حصہ دیکھا اور بولی۔ ”وائرل انفیکشن ہے لیکن خاص بات نہیں ہے آج کل چلا ہوا ہے۔ تین دن ور ابھی ٹھیک ہو جائے گا۔“ وہ پرچہ اٹھا کر نسخہ لکھنے لگی پھر اسے خیال آیا۔ ”پریگننسی کا ایشو تو نہیں ہے؟“

رعنا نے نفی میں سر ہلایا۔ ”نہیں۔“

”آر یو شیور... شادی کو کتنا عرصہ ہوا ہے؟“

”دس سال....“

”بچے ہیں۔“

”نہیں مَم۔“ رعنا نے گہری سانس لی۔

”کبھی پریگننسی ہوئی؟“

”نہیں۔“

”ٹیسٹ کرایا؟“

”ہاں ایوری تھنگ از اوکے۔“

”آپ کے ہسبنڈ؟“

”وہ بھی بالکل ٹھیک ہیں۔“

”گویا قدرت کی طرف سے دیر ہے۔ میرا مشورہ ہے آپ دوا لینے سے پہلے ٹیسٹ کرالیں۔ آدھا گھنٹا لگے گا۔ بہت ہائی پوٹینسی اینٹی بایوٹک ہے جو آپ کو دے رہی ہوں۔ پریگننسی میں بالکل نہیں دی جاتی ہے۔“

رعنا ہچکچائی پھر اس نے سر ہلا دیا۔ ”ٹھیک ہے۔“

☆☆☆

عمران اکبر اور دوسرے لوگ سی ایم کے عقب میں موجود تھے۔ سی ایم کے ہاتھ میں قینچی تھی اور وہ ربن کاٹنے جا رہے تھے کہ اچانک کسی نے کہا۔ ”ارے اسے کیا ہوا؟ یہ گر گیا ہے؟“

سی ایم مڑے تو وفد کے اراکین اس پولیس کمانڈو کو دیکھ رہے تھے جو اچانک گر پڑا تھا صرف وہی نہیں یہاں موجود چھ کے چھ پولیس کمانڈوز اچانک ہی لڑھک گئے تھے۔ سی ایم نے حیرت سے کہا۔ ”انہیں کیا ہوا ہے بابا؟“

سی ایم کے ذاتی گارڈز کا انچارج چوکنا ہو گیا۔ اس کا نام یوسف شاہ تھا۔ کسی زمانے میں وہ نامی گرامی ڈاکو ہوا کرتا تھا۔ سی ایم اس پر پورا بھروسا کرتے تھے۔ اس نے کہا۔ ”سر کچھ گڑبڑ ہے سر آپ باہر چلیں۔“

خود سی ایم بھی خطرہ بھانپ گئے تھے لیکن اس سے پہلے وہ باہر کی طرف قدم اٹھاتے اچانک ہی ایک طرف رکھے نیم آرام گملوں کے پیچھے سے کچھ نقاب پوش نمودار ہوئے اور انہوں نے آتے ہی سی ایم کے چاروں ذاتی محافظوں کو نشانہ بنایا۔ تین ڈھیر ہو گئے لیکن یوسف بروقت پیچھے گرنے کی وجہ سے بچ گیا تھا۔ بے آواز فائرنگ کا نشانہ صرف گارڈز ہی نہیں دو بیورو کریٹس بھی بنے تھے۔ رائفل یوسف کے پاس بھی تھی لیکن اس نے بروقت درست فیصلہ کیا۔ اس کی رائفل کا رخ نیچے تھا اور اس کے خلاف چار رائفلیں اٹھی ہوئی تھیں۔ اس کی ذرا سی حرکت اسے چھلنی کر دیتی۔ اس نے رائفل گرا دی اور ایک نقاب پوش نے آگے آتے ہوئے لات مار کر رائفل اس سے دور کر دی۔ دوسرا نقاب پوش جس کی رائفل اس کے نشانے پر تھی، اس نے یوسف کو حکم دیا۔

”کھڑے ہو جاؤ ہاتھ سر پر ہوں۔“

یوسف نے حکم کی تعمیل کی۔ اس دوران میں وہاں مزید نقاب پوش آ گئے تھے اور ان میں سے کچھ نقاب پوش تیسری لابی کی طرف جا چکے تھے اور جتنے یہاں تھے وہ بھی تعداد میں ان سے... زیادہ تھے۔ یوسف کے تینوں ساتھی مارے جا چکے تھے۔ ان کی لاشیں اور دونوں لاپتہ شا موجود بے ہوش پولیس کمانڈوز کو گھسیٹ کر ریسپشن کے پیچھے ڈال دیا گیا۔ جن دو نے جانے کی غلطی کی ان کو اجل کا سامنا کرنا پڑا۔ جب وہ پراسرار مسلح نقاب پوش لاشوں کو کھینچ کر لا رہے تھے، وہ سب پھٹی پھٹی نگاہوں سے انہیں دیکھ رہے تھے۔ اب انہیں اپنی فکر لاحق ہو گئی تھی۔ سی ایم اب تک خاموش تھے۔ انہوں نے پہلی بار زبان کھولی۔

”بابا کون ہو تم لوگ اور کیا چاہتے ہو؟“

”ہم کون ہیں یہ بتانے کے لیے یہ کافی ہے۔“ رسط الشبائی نے رائفل لہرا کر کہا۔ ”اور کیا چاہتے ہیں یہ جلد پتا چل جائے گا۔ ابھی صرف اتنا چاہتے ہیں کہ سب اپنی زبان بند رکھیں۔“

ایک نقاب پوش نے یوسف کی تلاشی لے کر اس کے لباس میں چھپا ہوا پستول نکال لیا تھا۔ پھر اس کے ہاتھ پشت پر کر کے نائلون کی ہتھکڑی سے باندھ دیے۔ اب نقاب پوش سب کی تلاشی لے رہے تھے۔ ایک نقاب پوش سی ایم کے پاس آیا اور کھردرے لہجے میں بولا۔ ”تلاشی دو۔“

سی ایم کسی قدر خوف زدہ بھی تھے لیکن اس بات پر بھڑک اٹھے۔ ”تم جانتے ہو کس سے بات کر رہے ہو؟“

”جی سائیں۔“ رسط الشبائی نے کہا۔ ”آنربل چیف منسٹر سے۔ پلیز تعاون کیجیے ورنہ صوبہ پھر دوبارہ کے لیے

چیف منسٹر سے محروم ہو جائے گا اور کل تک کوئی دوسرا چیف منسٹر کا حلف اٹھائے گا۔"

"پلیز سر۔" سی ایم کے پی اے نے آہستگی سے کہا۔ اس بار سی ایم نے تلاشی لینے دی۔ ان کے پاس سے بھی ایک چھوٹا سا کولٹ پسٹل برآمد ہوا جس کا دستہ ہاتھی دانت کا بنا ہوا تھا۔ اسلحے کے علاوہ بھی جو کچھ تھا، وہ لے لیا گیا۔ اس میں موبائل بھی تھے۔ دوسروں کی تلاشی میں بھی ہر چیز لے لی گئی تھی۔ ایک نقاب پوش تمام نکلنے والا سامان ایک تھیلے میں جمع کر رہا تھا۔ اس سارے عمل میں مشکل سے دس منٹ کا وقت لگا تھا۔ اسٹل اور ویڈیو کیمرا مین سہمے ہوئے کھڑے تھے۔ وسط ایشیائی نے وہاں موجود لوگوں کا حساب لگایا۔ وہ کل انیس تھے۔ اس دوران میں اس کے کچھ ساتھی مصروف عمل تھے۔ انہوں نے دونوں داخلی دروازوں... پر وہ سیاہ ڈبے کے بکس اس طرح لگائے کہ انہیں ہٹائے بغیر دروازے کھل نہیں سکتے تھے۔ انہیں لگانے کے بعد جب نقاب پوش پیچھے ہٹے تو وسط ایشیائی نے جیب سے ایک چھوٹا سا موبائل سائز کا آلہ نکالا اور اس کا رخ ان کی طرف کر کے بٹن دبایا تو فوراً ہی ان پر سرخ روشنیاں جلنے بجھنے لگی تھیں۔ سی ایم اور دوسرے لوگ یہ نہیں دیکھ سکے کیونکہ وہ جہاں تھے وہاں سے یہ دروازے نظر نہیں آ رہے تھے۔ اس کے بعد دوسرے بیگوں سے کچھ عجیب ساخت کی جیکٹس نکالیں۔ ان میں بیلٹس اور بکل تھے جو جیکٹ کے سامنے والے حصے سے نکل رہے تھے۔ سب سے پہلے ایک نقاب پوش یہ ڈیوائس سی ایم کے پاس لے آیا وہ خوف زدہ ہو گئے۔ "یہ کیا ہے؟"

جواب میں وسط ایشیائی نے پسٹول کی نال سی ایم کے ماتھے پر رکھ دی اور سرد لہجے میں بولا۔ "فی الحال آپ بھول جائیں کہ آپ سی ایم اور یہاں باس ہیں۔ سوال کی اجازت نہیں ہے۔ سمجھے۔"

سی ایم نے کبھی موت کو یوں براہ راست محسوس نہیں کیا تھا انہوں نے بڑی مشکل سے سر ہلایا۔

☆☆☆

عمران سجاد سیڑھیوں سے نیچے آیا۔ وائن روم دو ڈائننگ سروس ایریا کے ساتھ تھے۔ اگرچہ یہ اسٹاف کے عملے کے لیے مخصوص تھے لیکن ان کا معیار کسی فائیو اسٹار ہوٹل کے واش روم سے کم نہیں تھا۔ اچانک اس کے واکی ٹاکی نے بیپ دی۔ اس نے جلدی سے واکی ٹاکی نکالا۔ یہ اختر تھا۔ اس نے کہا۔ "سر اندر سب ٹھیک ہے؟"

وہ چونکا۔ "کیا ہوا؟"

"داخلی دروازوں کے ساتھ کچھ پُراسرار سرگرمیاں ہوئی ہیں۔ ایسا لگ رہا ہے جیسے دروازوں کے اندر کچھ لگایا گیا ہے۔"

"باہر موجود بابا کا دکیا کر رہے ہیں؟"

"وہ باہر موجود ہیں لیکن وہ اس جگہ سے بیس فٹ کے فاصلے پر ہیں۔"

"سب کو چوکس کر دو، میں جیسے ہی ہوں۔ صورت حال دیکھ کر اب ڈیل کرتا ہوں۔" کہتے ہوئے عمران... نے واکی ٹاکی آف کیا اور اپنا پسٹول نکال کر دبے قدموں سیڑھیوں کی طرف بڑھا۔ وہ فکر مند ہو گیا تھا۔ اس نے پہلے باہر کی سن گن لی۔ خاموشی پا کر اس نے ذرا سا دروازہ کھولا اور باہر دیکھا لیکن اسے لابی میں جہاں تک نظر جاتی تھی کوئی نظر نہیں آ رہا تھا۔ پھر اس نے سر نکال کر باہر جھانکا۔ لابی خالی تھی۔ یہی بات شک کے لیے کافی تھی یہاں موجود کمانڈوز کسی صورت اپنی ڈیوٹی چھوڑ کر نہیں جا سکتے تھے۔ رہی سہی کسر فرش پر پڑے خون کے نشان نے پوری کر دی۔ ایک جگہ کچھ خون گرا تھا اور پھر خون کا ہی کھینچے جانے کا نشان تھا جو فرنٹ لابی کی طرف جا رہا تھا۔ یہاں کچھ ہو چکا تھا۔ وہ باہر آیا اور محتاط قدموں سے آگے آیا۔

عمران... کو لابی کے کونے سے ہی اندازہ ہو گیا کہ افتتاحی تقریب میں کچھ بن بلائے مہمان پہنچ گئے تھے اور وہ معاملات کو کنٹرول کر رہے تھے۔ عمران... دیکھنے سے قاصر تھا کیونکہ درمیان میں بڑے سائز کے گملے رکھے تھے جن پر سائے میں اُگنے والے بڑے پتوں کے پودے لگے تھے مگر آوازیں تصویر پیش کر رہی تھیں۔ وہ زمین پر لیٹ گیا اور اسی طرح رینگتا ہوا گملوں تک آیا۔ اس نے دو گملوں کے درمیان موجود معمولی سے خلا سے جھانکا۔ اسی وقت سی ایم کے ماتھے پر پسٹول رکھ کر ڈیوائس پہنائی جا رہی تھی۔ ایک بیلٹ بغل سے گزری اور دو شانوں سے گزریں۔ انہیں عقب میں ایک چوکور ڈبے سے گزار کر کھینچ لیا گیا تھا اور پھر ان کے سرے موڑ کر اسی ڈبے میں ڈال دیے گئے۔ آخر میں سینے پر موجود ڈیوائس پر لگے پینل پر چند بٹن دبائے تو ڈیوائس آن ہو گئی، اس کی روشنیاں جلنے بجھنے لگی تھیں۔ ایک نقاب پوش نے کہا۔

"یہ بارود کی جیکٹ ہے مسٹر سی ایم۔ ایک بار لگنے

کے بعد اسے کوڈ ملا کر ہی ناکارہ کیا جا سکتا ہے۔ دوسری صورت میں یہ مقررہ وقت کے بعد خود بہ خود پھٹ جائے گی۔"

اس بار سی ایم خوفزدہ ہو گئے۔ "پر کیوں بابا..... اگر کوئی مطالبہ ہے تو بولو..... اس کی کیا ضرورت ہے؟"

"ضرورت ہے۔" اس نے کہا۔ اس کے آدمی دوسروں کو بھی جیکٹ پہنا رہے تھے اور انہیں اکٹھا کر رہے تھے۔ یرغمالیوں کو اس لیے بھی نہیں بتایا گیا تھا کہ مقرر کردہ وقت کیا تھا جس کے بعد یہ جیکٹس پھٹ جائیں۔ سب ہی خوف زدہ تھے لیکن کوئی انکار نہیں کر سکتا تھا۔ دوسری صورت میں انہیں یقینی موت کا سامنا کرنا پڑتا۔ ایک درجن جیکٹس سی ایم، ان کے دونوں مشیروں اور نو بزنس مینوں کو پہنا دی گئی تھیں۔ ان میں عمران اکبر بھی شامل تھا۔ دو زخمی تھے یا بے ہوش تھے اور ایک بچ گیا تھا کیونکہ مزید کوئی جیکٹ باقی نہیں رہی تھی۔ یہ کام مکمل ہوتے ہی نقاب پوش نے ایک ادھیڑ عمر بزنس مین شہاب الدین کو آگے بلایا۔ "تم چیمبر آف کامرس کے نائب صدر ہو۔ میں نے سنا ہے تم بہت اچھا بولتے ہو۔ آج تمہیں اپنی اس صلاحیت کا مظاہرہ کرنا ہے۔"

شہاب الدین خوفزدہ تھا مگر اس نے ہمت کر کے کہا۔ "مجھے کیا کرنا ہے؟"

جواب میں نقاب پوش نے اسے ایک کاغذ تھمایا اور اس کے ایک ساتھی نے چھوٹا سا لیکن جدید ترین میگا فون لا کر شہاب الدین کے حوالے کیا۔ نقاب پوش نے کہا۔ "تمہیں باہر جا کر اس کاغذ پر لکھا ہوا پیغام پڑھنا ہے۔"

"کس کے سامنے؟"

"میڈیا کے سامنے۔" نقاب پوش نے جواب دیا۔ "کچھ پہلے سے باہر موجود ہے اور مزید آ چکا ہوگا۔"

عمران... غور سے سن اور دیکھ رہا تھا۔ یہاں سے دکھائی دیا جانے والا حصہ محدود تھا لیکن اس نے محسوس کیا کہ ان لوگوں کی تعداد کہیں زیادہ ہے جنہوں نے سی ایم اور دوسرے لوگوں کو یرغمال بنا لیا تھا۔ انہوں نے تمام یرغمالیوں کو بارود کی جیکٹس پہنا دی تھیں۔ صورت حال سنگین ترین تھی۔ یہ تو واضح تھا کہ دہشت گرد پہلے سے اندر موجود تھے۔ انہوں نے سی ایم کے اندر آتے ہی انہیں اور دوسروں کو یرغمال بنا لیا تھا اب سوال یہ تھا کہ وہ آخر چاہتے کیا تھے؟

☆☆☆

اختر پریشان تھا کیونکہ نہ صرف اندر کی صورت حال غیر واضح تھی بلکہ عمارت کے سامنے سڑک کے پار میڈیا کی تعداد میں اچانک ڈرامائی اضافہ ہو گیا تھا۔ اختر نے نعمان سے پوچھا۔ "یہ کیا ہے؟ یہ کس خوشی میں یہاں چلے آ رہے ہیں؟"

"پتا نہیں۔ میں نے اوپر والوں کو صورت حال سے آگاہ کر دیا ہے۔"

"میرا خیال ہے سامنے موجود پولیس کمانڈوز کو ہٹا لینا چاہیے کسی صورت میں یہ آسان نشانہ ثابت ہوں گے۔"

"میں نہیں ہٹا سکتا۔" نعمان نے بے بسی سے کہا۔ "میں طے شدہ سیکیورٹی سے ہٹ کر کچھ نہیں کر سکتا۔"

"لعنت ہو۔" اختر نے کہا اور تیزی سے سڑک کی طرف بڑھا جہاں دو عدد براڈ کاسٹ وین خاصی اندر آ چکی تھیں۔ اس نے آگے والی وین کو روکا اور بولا۔ "کس کی اجازت سے تم لوگ یہاں تک آئے ہو؟"

اگلی گاڑی سے ایک خوب صورت اور تیز طرار سی لڑکی مائیک لے کر اتری اور اس نے الٹا ہی سوال کیا۔ "یہ خبر درست ہے کہ دہشت گردوں نے این ٹی سی میں سی ایم اور دوسرے لوگوں کو یرغمال بنا لیا ہے؟"

اختر نے اس کا سوال نظر انداز کیا اور رینجرز اہلکاروں کو حکم دیا۔ "انہیں یہاں سے ہٹاؤ۔"

رینجرز اہلکار آگے بڑھے۔ اچانک پیچھے سے شور بلند ہوا۔ پولیس کمانڈوز چلا رہے تھے۔ اختر نے مڑ کر دیکھا۔ بلڈنگ کے اندر سے ایک شخص باہر آیا اور اس کے سینے پر کچھ بندھا ہوا تھا۔ پولیس کمانڈوز پیچھے ہٹ گئے۔ اختر تیزی سے اس طرف آیا۔ باہر آنے والا شخص بزنس پارٹی کا ایک رکن تھا اور اختر اسے جانتا تھا۔ اس کا نام شہاب الدین تھا۔ وہ سیڑھیوں کے اوپری حصے پر رک گیا۔ پولیس کمانڈوز سیڑھیوں سے نیچے آ گئے تھے اور ان کی گنوں کا رخ شہاب الدین کی طرف تھا۔ وہ چلا چلا کر اسے دور رہنے کو کہہ رہے تھے۔ اس کے سینے پر بندھی جیکٹ واضح طور پر خطرناک لگ رہی تھی۔ اختر نے چلا کر کہا۔ "خبردار... کوئی گولی نہ چلائے۔"

شہاب الدین ہراساں تھا اور اس کے ہاتھ میں ایک کاغذ لرز رہا تھا۔ اختر اوپر آیا تو اس نے خبردار کیا۔ "میرے پاس... مت آؤ یہ بم ہے۔"

اختر نے نرمی سے پوچھا۔ "بم کس نے پہنایا ہے؟"

"میں نہیں جانتا..... وہ بہت سارے ہیں۔ انہوں نے نقاب پہن رکھا ہے اور سی ایم صاحب کو بھی ایسی ہی

جیکٹ پہنائی ہے، وہاں موجود سب کو پہنائی ہیں۔"
اختر کا سانس ایک لمحے کو رکا۔ "وہاں جو پولیس اور سی ایم صاحب کے ذاتی باڈی گارڈ تھے؟"
"وہ سب بے ہوش ہو گئے یا مارے گئے۔ آنے والوں نے فائرنگ بھی کی.... لیکن پولیس والے اس سے پہلے ہی گر گئے تھے۔"
اختر نے اس کی بات کاٹی۔ "ایک منٹ! باہر کسی فائر کی آواز نہیں آئی۔"
"ان کے ہتھیاروں پر سائلنسر ہیں۔ انہوں نے دروازوں پر دو بہت بڑے بم لگائے ہیں اگر کسی نے اندر گھسنے کی کوشش کی تو یہ بلاسٹ ہو جائیں گے۔"
اختر کا ذہن تیزی سے سوچ رہا تھا۔ "وہ کہاں سے آئے تھے؟"
"لابی نمبر دو سے۔"
"تعداد کتنی ہے؟"
"کم سے کم سولہ سترہ بندے ہیں۔"
"سی ایم صاحب اور باقی لوگ خیریت سے ہیں؟"
"نہیں، دو بزنس مین عظیم شاہ اور امیر بھائی مارے گئے ہیں، انہیں گولیاں لگی ہیں۔"
"اس کاغذ میں کیا ہے؟"
"ایک نقاب پوش نے مجھے یہ کاغذ اور میگا فون دیا ہے۔ اس کا حکم ہے کہ میں یہ پڑھ کر سناؤں۔"
"اگر آپ ایسا نہ کریں...."
"یہ بم دیکھ رہے ہو، اس پر ٹائمر سیٹ ہے اور اسے صرف وہی روک سکتے ہیں۔ کسی نے اسے روکنے یا اتارنے کی کوشش کی تو یہ بلاسٹ ہو جائے گا۔" شہاب الدین نے بم کی طرف اشارہ کیا۔ پھر اس نے میگا فون کا بٹن دبایا اور کاغذ بلند کر کے پڑھنا شروع کیا۔
"پورے ملک کو اطلاع دی جاتی ہے۔ ہم نے این ٹی بلڈنگ میں وزیر اعلیٰ اور ایک درجن دوسرے افراد کو یرغمال بنا لیا ہے۔ ہمارا مطالبہ ہے کہ ہمارے جیلوں میں بند ساتھی رہا کیے جائیں اور حکومت پچاس کروڑ روپے تاوان ادا کرے۔ دوسری صورت میں وزیر اعلیٰ سمیت یرغمالیوں میں سے کوئی زندہ نہیں بچے گا۔ تمام یرغمالیوں کے جسم پر اسی طرح کی بارودی جیکٹس باندھ دی گئی ہیں۔ ان جیکٹس کے ساتھ لگے ٹائمر پر وقت سیٹ کر دیا گیا ہے اور وہ چوبیس گھنٹے سے زیادہ کا نہیں ہے مگر اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ یہ جیکٹ صرف وقت پر اڑیں گی بلکہ انہیں ایک ریموٹ سے بھی اڑایا جا سکتا ہے۔ ثبوت سامنے ہے...." یہ کہتے ہوئے شہاب الدین کی آنکھیں پھیل گئیں۔ ان میں موت کی وحشت اتر آئی تھی۔ اس کے ہاتھ سے کاغذ اور میگا فون چھوٹ گیا۔
اختر جیسے خودکار انداز میں حرکت میں آیا اور اس نے پیچھے کی طرف جست لگائی۔ وہ ابھی ہوا میں تھا کہ دھماکا ہوا اور وہ اڑ کر سڑک پر جا گرا۔ اسے چوٹیں آئی تھیں مگر وہ بچ گیا تھا۔ اس نے رکتے ہی پلٹ کر دیکھا۔ جہاں شہاب الدین تھا اب وہاں کچھ نہیں تھا، ہاں چاروں طرف خون اور گوشت کے لوتھڑے ضرور بکھرے ہوئے تھے۔ اختر کے کان میں ابھی تک دھماکے کی گونج تھی۔

☆☆☆

ریسپشن کے ساتھ لگے بڑے سائز کے ایل سی ڈی پر وہ سب یہ منظر دیکھ رہے تھے۔ کم سے کم تین چینل شہاب الدین کی لائیو کوریج کر رہے تھے۔ میگا فون کی وجہ سے اس کی آواز صاف سنائی دے رہی تھی۔ کیمرے زوم کر کے اس پر مرکوز کر دیے گئے تھے اس لیے جب بلاسٹ ہوا تو سب بہت واضح تھا۔ سی ایم اور دوسرے اچھل پڑے تھے۔ سی ایم نے کہا۔ "یہ کیا یا.... مائی گاڈ.... یہ کیسے ہوا؟"
وسط الشبانی نے جیب سے ہاتھ نکالا تو اس میں ایک چھوٹا سا ریموٹ دبا ہوا تھا۔ "یہ اس سے ہوا۔" اس نے ریموٹ بلند کر کے کہا۔ "اب تمہیں اور باہر والوں کو پتا چل گیا ہوگا کہ موت تمہارے جسم سے لگی ہے اور ایک سیکنڈ میں تمہیں ساتھ لے جا سکتی ہے۔"
"اس کی کیا ضرورت تھی؟" اکبر چلایا تھا۔ "ابھی تم نے اپنا مطالبہ پیش نہیں کیا اور اتنے لوگوں کی جان لے لی۔"
"اس سے حکومت کو اندازہ ہوگا کہ ہم کتنے سنجیدہ ہیں اور ہمارا مطالبہ ہر صورت پورا ہونا چاہیے۔"
وسط الشبانی کہہ کر ریسپشن کی طرف آیا جہاں ایک چھوٹی سی جگہ میں انفارمیشن سسٹم نصب تھا۔ کمپیوٹر اور دوسرے لوازمات موجود تھے۔ وسط الشبانی نے سسٹم آن کیا اور انٹرنیٹ کنکشن ملا کر کی بورڈ پر انگلیاں چلانے لگا۔ ایک مخصوص ویب سائٹ کھولی۔ اس ویب سائٹ تک ہر شخص کی رسائی نہیں تھی لیکن اس کے پاس یوزر آئی ڈی اور پاس ورڈ تھا اس لیے وہ کھولنے میں کامیاب رہا۔ اس نے ویب سائٹ دیکھی اور مطمئن ہو کر سر ہلایا۔ اس پر کچھ اعداد و

شمار آ رہے تھے جو تیزی سے بدل رہے تھے۔ ایسا لگا جیسے سب اس کی توقع کے مطابق ہوا تھا۔ اس وقت نو بج کر پچاس منٹ ہوئے تھے۔

☆☆☆

ایل سی ڈی بڑی بلندی پر لگا ہوا تھا اس لیے عمران... بھی دیکھ رہا تھا۔ جب شہاب الدین نے آخری الفاظ ادا کیے تو اس کا دل دھڑکا تھا اور اسی لمحے دھماکا ہوا۔ پھر اس نے نقاب پوش کی بات سنی۔ اس نے جیلوں میں بند اپنے ساتھیوں کی رہائی کا مطالبہ کیا تھا۔ پچاس کروڑ روپے کا مطالبہ شاید ضمنی تھا اصل میں انہیں اپنے ساتھیوں کو چھڑانا تھا۔ پستول کے دستے پر عمران... کی گرفت سخت ہوگئی۔ اس نے سوچا کہ اگر وہ اچانک بھی حملہ کرے تو کتنے لوگوں کو مار سکتا ہے زیادہ سے زیادہ دو دشمن اس کے بعد وہ مارا جائے گا اور یقیناً دو تین آدمیوں کے مرنے سے دہشت گردوں کو کوئی فرق نہیں پڑے گا۔ سی ایم اور دوسرے لوگوں کو اس کا کوئی فائدہ نہیں ہوگا۔ ہاں وہ زندہ اور آزاد رہے گا تو شاید کچھ کر سکے گا۔ وہ دبے قدموں واپس بیسمینٹ میں آیا۔ اس نے واکی ٹاکی نکال کر آن کیا اور اختر کو کال کی۔ اس نے کال ریسیو کی۔

''آپ کہاں تھے، میں مسلسل کال کر رہا تھا۔''

''میں لابی کے قریب تھا اور پوشیدہ رہنے کے لیے اسے آف کیا تھا۔'' عمران... نے سرد لہجے میں کہا۔ ''تم بدحواس ہو رہے ہو تمہیں ہرگز نہیں کال کرنا چاہیے تھا۔''

اختر شرمندہ ہو گیا۔ ''سوری سر، میرے اعصاب منتشر ہو گئے ہیں۔''

''حالانکہ ایسے موقع پر اعصاب مضبوط ہونے چاہئیں۔ یہ بتاؤ باہر کی کیا پوزیشن ہے؟ میڈیا کو کب اطلاع پہنچی؟''

''پونے نو بجے ایک درجن بڑے نیوز چینلز کو نامعلوم کالز ملیں جن میں بتایا گیا کہ سی ایم کو این پی ٹی میں یرغمال بنا لیا گیا ہے۔''

''یہ انہی کا کام ہے کیونکہ نو بج کر بیس منٹ تک یہاں سب معمول کے مطابق تھا۔'' عمران... نے کہا۔ ''میں اس وقت بیسمینٹ میں موجود واش روم تک آیا تھا۔''

''ایسا لگ رہا ہے یہ دہشت گرد یا تو اندر چھپے ہوئے تھے یا پھر آسمان سے نازل ہوئے ہیں۔''

عمران... نے سوچ کر کہا۔ ''نعمان سے پوچھو کیا اس کا اوپر موجود اسنائپرز سے رابطہ ہے؟''

نعمان پاس ہی تھا۔ اس نے واکی ٹاکی لے کر کہا۔ ''ہاں ان سے رابطہ ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ نیچے کا کچھ نہیں معلوم۔''

''کیا وہ کام آ سکتے ہیں؟''

''وہ کمانڈوز ہیں اور اسنائپر کی اضافی تربیت حاصل کی ہے۔''

''یہ لوگ اندر موجود تھے اور کہیں چھپے ہوئے تھے کیونکہ گزشتہ چوبیس گھنٹے سے یہاں پولیس کا قبضہ ہے اس دوران میں کوئی نہیں یہاں نہیں آ سکتا تھا۔''

''لیکن عمارت کی مکمل تلاشی لی گئی تھی۔'' نعمان نے کہا۔

''منصوبہ بہت منظم اور زبردست بافند لگ رہے ہیں۔ یہ پوری پلاننگ کے ساتھ آئے ہیں اور اسی کے مطابق عمل کر رہے ہیں۔'' عمران... نے سوچتے ہوئے کہا۔ ''یہ ممکن ہے کہ انہوں نے چھت پر موجود اسنائپرز کو نظر انداز کر دیا ہو۔''

''آپ کا مطلب ہے وہ....'' نعمان بولتے بولتے رک گیا۔

''فی الوقت ان سے رابطہ نہ کیا جائے اور میرے بارے میں کسی کو مت بتانا کہ میں کہاں ہوں، یہ بات بس تم دونوں تک محدود رہے۔''

''یہ ممکن نہیں سر۔'' نعمان نے دبے لہجے میں کہا۔ ''کچھ دیر میں آئی جی سمیت تمام اعلیٰ حکام کی آمد لازمی ہے۔''

''اس صورت میں تم کہہ سکتے ہو کہ میرے بارے میں صرف اختر جانتا ہے۔''

''اوکے سر، میں یہی کہوں گا۔'' نعمان نے کہا اور واکی ٹاکی اختر کو تھما دیا۔ عمران... اسے کچھ ہدایت دینے لگا۔ عمران... سے ہدایت لے کر اختر نے دفتر کال کی اور متعلقہ کے ایجنٹ دستے کو پوری تیاری کے ساتھ این پی ٹی پہنچنے کا حکم دیا۔ کچھ دیر بعد آئی جی آ گیا اور اس نے چارج سنبھال لیا۔ حسن شیخ پرانا پولیس مین تھا۔ چالیس سال سے وہ اس نوکری میں تھا اور اسے دوسری بار ایکسٹینشن ملی تھی۔ اس نے سب سے پہلے اس پورے علاقے کو سیل کیا اور عام لوگوں کے لیے بند کر دیا۔ اس کے حکم پر پولیس نے این پی ٹی سے کم سے کم دو سو گز دور چاروں طرف رکاوٹیں کھڑی کر دی تھیں۔ آس پاس کی تمام عمارتیں خالی کرا لی گئی تھیں۔ اب یہاں پولیس تعینات تھی۔ آدھے گھنٹے کے اندر پانچ سو

اضافی پولیس اہلکار وہاں پہنچ گئے تھے۔ اردگرد کی عمارتوں پر دور مار گنوں اور بھاری مشین گنوں سے مسلح افراد لگا دیے گئے تھے اور اب بہ ظاہر دہشت گردوں کے فرار کا کوئی امکان نہیں تھا۔ صوبے کی سیاسی قیادت چیف منسٹر ہاؤس پہنچ گئی اور ملک کا وزیر داخلہ یہاں آنے کے لیے دارالحکومت سے روانہ ہو چکا تھا۔ حسن شیخ نے فیصلہ کیا کہ اب اندر موجود افراد سے بات کر لی جائے۔ اس نے کمیونیکیشن وین سے اندر کال ملانے کو کہا۔ اس وقت سوا دس بج رہے تھے۔

☆☆☆

ریسپشن پر موجود فکسڈ فون کی بیل بجی تو وسط الشبانی نے کال ریسیو کی۔ ”ہیلو۔“

”میں آئی جی حسن شیخ بات کر رہا ہوں۔“

”آئی جی صاحب.... فرمائیے میں آپ کی کیا خدمت کر سکتا ہوں؟“

”میں مین آف کنٹرول سے بات کرنا چاہتا ہوں۔“

”میں ہی یہاں کا مین آف کنٹرول ہوں۔“

”او کے مسٹر تم کیا چاہتے ہو.... اس طرح دہشت پھیلانے کا مقصد؟“

”یہ دہشت نہیں ہے، ہماری سنجیدگی ہے۔“

”اس معاملے میں میڈیا کو کیوں شامل کیا ہے؟“

”تاکہ تم لوگ بھی سنجیدہ رہو اور کسی احمقانہ حرکت سے گریز کرو۔“ وسط الشبانی نے جواب دیا۔ ”اپنی نااہلی چھپانے کے لیے تم سب کر سکتے ہو لیکن اب میڈیا پر سب اوپن ہے اور تم اپنی نااہلی چھپانے کے لیے کچھ نہیں کر سکو گے۔“

”ہماری طرف سے کوئی حرکت نہیں ہوگی۔“ آئی جی نے کہا۔ ”ہم چاہتے ہیں کہ معاملہ مزید خون خرابے کے بغیر حل ہو جائے۔“

”میں بھی یہی چاہتا ہوں اور یہ صرف اسی صورت ممکن ہے کہ ہمارے مطالبات پورے کر دیے جائیں۔“

”تم نے پچاس کروڑ روپے اور جیل میں قید اپنے ساتھیوں کی رہائی کا مطالبہ کیا ہے۔“

”ہاں ان کی فہرست جلد تم ٹی وی چینلز پر دیکھ سکو گے۔“ وسط الشبانی نے کلائی کی گھڑی دیکھی۔ ”میرا خیال ہے پونے گیارہ تک بریکنگ نیوز چل رہی ہوں گی۔“

☆☆☆

ملک بھر کا میڈیا ہیجان میں مبتلا تھا اور اس کا اظہار نیوز کاسٹرز کے رویوں سے بھی ہو رہا تھا جو تمام چینلز میں نیوز کاسٹرز نان اسٹاپ بول رہے تھے اور ان کا انداز ایسا تھا جیسے کوئی ان پر گن تانے ہوئے ہے۔ پونے گیارہ بجتے ہی تقریباً تمام چینلز نے بریکنگ نیوز چلانی شروع کر دی کہ انہیں دہشت گردوں کے مطالبے کی فہرست مل گئی ہے۔ مزے کی بات ہے سب اسے ایکسکلوزیو کی پٹی کے ساتھ پیش کر رہے تھے۔ جیسے یہ خبر صرف ان کے چینل سے نشر ہو رہی ہے۔

جن لوگوں کو جیلوں سے رہا کرنے کا مطالبہ تھا۔ اس فہرست میں ایک درجن نامی گرامی دہشت گردوں کے نام تھے۔ یہ دہشت گرد مختلف جرائم میں عمر قید سے لے کر سزائے موت کے سزاوار قرار دیے گئے تھے اور ان میں سے کچھ پر ہنوز مقدمات چل رہے تھے۔ حیران کن طور پر ان دہشت گردوں کا تعلق کسی ایک گروہ یا تنظیم سے نہیں تھا بلکہ یہ مختلف تنظیموں اور گروہوں سے تعلق رکھتے تھے۔ ان میں صرف ایک قدر مشترک تھی کہ ان پر دہشت گردی کی دفعات کے تحت مقدمے تھے اور ان کو خصوصی عدالتوں سے سزائیں سنائی گئی تھیں۔ اس بریکنگ نیوز کے فوراً بعد حالات حاضرہ کے ماہرین بذات خود یا فون کی مدد سے چینلز پر براجمان ہوئے اور صورت حال پر قیاس آرائیوں اور تجزیوں کے گھوڑے دوڑانا شروع کر دیے۔

☆☆☆

آئی جی سے بات کر کے وسط الشبانی مطمئن لگ رہا تھا۔ تمام یرغمالی لابی میں نشستوں پر موجود تھے اور ان کے سامنے نصف درجن مسلح نقاب پوش تھے جو ان پر پوری طرح نظر رکھے ہوئے تھے۔ باقی نفری لاجز کے مختلف حصوں میں تھے۔ عظیم شاد اور امیر بھائی وِم ٹوز جھکے تھے اس لیے ان کی لاشیں بھی ریسپشن کے پیچھے پہنچا دی گئی تھیں مگر فرش اور نشستوں پر پھیلا خون بتا رہا تھا کہ یہاں کیا کچھ ہو چکا ہے۔ شباب الدین کی موت کا منظر انہوں نے ٹی وی پر دیکھا تھا کیونکہ اس جگہ سے باہر کا منظر دکھائی نہیں دے رہا تھا درمیان میں بہت سی رکاوٹیں اور چیزیں حائل تھیں۔ اسی طرح باہر والوں کو اندر کا منظر دکھائی نہیں دے رہا تھا ویسے بھی لابی ٹی کے شیشے اندھے تھے یعنی ان میں باہر سے کچھ نظر نہیں آتا تھا۔ وسط الشبانی ریسپشن کے پیچھے سے نکلا۔ اس کے جوانوں نے داخلی دروازے کے سامنے لگی چار فٹ اونچی نالکر سے بنی دو دیواروں کے پیچھے جگہ بنائی تھی۔ آنے جانے والوں کو ان دیواروں کے درمیان سے گزرنا پڑتا تھا۔ ان میں سنسرز لگے تھے اور دوسری رکاوٹیں بھی تھیں۔

یوں آنے والے ہر شخص کو چیک کیا جا سکتا تھا۔ باقی آس پاس پھیلے ہوئے تھے۔ اس نے اپنے تین آدمیوں کو اشارے سے بلایا اور دھیمی آواز میں بولا۔

”نیچے جا کر بیسمنٹ مکمل چیک کرو۔“

”باس وہاں کسی کے پائے جانے کا امکان نہیں ہے۔“ ایک نے کہا۔

”بحث مت کرو۔“ رسط الشبابی کا لہجہ سخت ہو گیا۔ اس پر وہ تینوں خاموشی سے سیڑھیوں کی طرف بڑھ گئے۔ ایسا لگ رہا تھا ان سب کو اپنے مشن اور اس عمارت کے بارے میں مکمل علم تھا۔ اس لیے کوئی کسی سے سوال نہیں کر رہا تھا اور ہر ایک اپنا کام کر رہا تھا۔ وہ سیڑھیوں سے اتر کر بیسمنٹ میں آئے۔ این ڈی کی بیسمنٹ خاصی بڑی تھی اور یہ عمارت کے تین چوتھائی کے قریب رقبے پر پھیلی ہوئی تھی۔ یہاں ملازمین کے لیے ایک چھوٹا کیفے ٹیریا بھی تھا جبکہ دفاتر کے ملازمین کے لیے کیفے ٹیریا دوسری منزل پر تھا۔ مگر فی الحال یہ کام نہیں کر رہا تھا۔ ایک بڑا حصہ سرونٹس کے لیے مخصوص تھا۔ یہاں صفائی ستھرائی سے لے کر ہر قسم کی مرمت میں کام آنے والا سامان موجود تھا۔ یہاں ایک چھوٹی سی ورکشاپ بھی تھی جس میں چیزیں ٹھیک کی جاتی تھیں۔ کارز لفٹس والا حصہ باقی بیسمنٹ سے الگ تھا۔ یہاں سے صرف لفٹ کی مدد سے اوپر جایا جا سکتا تھا۔ مگر اس وقت لفٹس بھی بند تھیں اور فولادی چینوں والا گیٹ بھی بند تھا۔

ایک کار مینٹننس شاپ تھی۔ جیسا کہ اب جنریٹرز اور سینٹرل کولنگ سسٹم کی مشینری نصب تھی۔ کنٹرول روم سیڑھیوں کے پاس تھا اور یہ بھی بند تھا۔ بیشتر روشنیاں بجھی ہوئی تھیں اور اکثر جگہوں پر تاریکی تھی۔ مگر ان کے لیے مسئلہ نہیں تھا۔ سب کی رائفلوں پر تیز روشنی والی ٹارچ لگی ہوئی تھی۔ انہوں نے وہ روشن کر لی اور دبے قدموں چلتے ہوئے بیسمنٹ کے مختلف حصے چیک کرنے لگے۔ ان میں سے ایک واش رومز کی طرف آیا۔ ایک بڑے حصے میں برابر برابر لیڈیز اور جینٹس واش روم تھے۔ نقاب پوش پہلے لیڈیز باتھ روم میں آیا۔ فرنٹ میں بڑا سا شیشہ لگا تھا جس کے آگے تین جدید واش بیسن لگے ہوئے تھے۔ سامنے چار الگ الگ ٹوائلٹس تھے۔ یہ تقریباً چھ فٹ اونچے پارٹیشن سے بنے ٹوائلٹس تھے۔ اس نے تمام ٹائلٹ چیک کیے اور جیسے ہی باہر نکلا ایک ٹوائلٹ کے اوپر لگی جالی ہٹی اور عمران... اندر آیا۔ یہ جالی اصل میں ایگزاسٹ سرنگ کی تھی جو دونوں واش رومز سے ہوا کھینچ کر باہر لے جاتی تھی۔

عمران... نے ان لوگوں کی آوازیں پہلے ہی سن لی تھیں جب وہ نیچے آ رہے تھے اور اسے چھپنے کے لیے سب سے مناسب جگہ واش روم لگی تھی۔ جب تک چیک کرنے والے نے لیڈیز واش روم دیکھا، اس نے اس طرف والی جالی کھول لی۔ یہ صرف کلپس کی مدد سے لگی تھی تاکہ آسانی سے کھولی اور لگائی جا سکے۔ جیسے ہی نقاب پوش نکلا، وہ دوسری طرف اتر گیا۔ درمیان میں مشکل سے ڈیڑھ فٹ کا خلا تھا اور وہ اس میں تک نہیں سکتا تھا۔ نقاب پوش کے دوسرے واش روم میں جانے سے پہلے وہ اس طرف کی جالی لگا چکا تھا۔ اختر سے بات کرنے کے بعد اس نے واپس جالی پھر بند کر دی تھی۔ چند منٹ بعد وہ تینوں بیسمنٹ پوری طرح چیک کر کے جا چکے تھے۔ عمران... نے محسوس کیا کہ وہ پروفیشنل تھے۔ انہوں نے کوئی کونا نہیں چھوڑا تھا اور بہت منظم انداز میں خاموشی سے اپنا کام کیا تھا۔ ان کے نکلتے ہی اس نے پھر اختر سے رابطہ کیا۔ اختر نے اسے بتایا کہ دہشت گردوں نے اپنے مطالبات میڈیا کے ذریعے پیش کر دیے تھے۔ وزیراعلیٰ ہاؤس میں ایک اعلیٰ سطحی اجلاس جاری تھا جس میں ملک کا وزیر داخلہ اور صوبے کا گورنر بھی شریک تھے اور اس میں صورت حال پر غور کیا جا رہا تھا۔ وزیر داخلہ ائرفورس کے ایک خاص تیز رفتار طیارے سے یہاں پہنچا تھا۔

”میرے بارے میں پوچھا؟“

”نہیں سر کیونکہ آئی جی صاحب بھی چلے گئے ہیں اور یہاں کے معاملات ندیم ہاشمی صاحب کے سپرد ہیں۔“

”ندیم ہاشمی۔“ عمران... نے گہری سانس لی۔ پولیس کے محکمے میں اگر کسی شخص نے ترقی کے لیے سب سے کم اپنی صلاحیت کو زحمت دی تھی تو وہ ندیم ہاشمی تھا۔ جوڑ توڑ اور خوشامدانہ سازشیں اس کے وجود میں کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھیں۔ کہا جا رہا تھا کہ صوبے کے اگلے آئی جی کے لیے وہ ابھی سے صوبائی حکمرانوں اور اسٹیبلشمنٹ کی چوائس بن چکا تھا۔ ”وہ یقیناً سب سے آخر میں ہوگا۔“

اختر ہنسا۔ ”اسی وجہ سے جان بچی ہے ورنہ آپ جانتے ہیں وہ کتنے سوالات کرتے ہیں۔“

”ہمارے آدمی آ گئے؟“

”دس منٹ میں پہنچ جائیں گے۔“

”سنو اگر مرکزی وزیر داخلہ یہاں آ گئیں تو ان سے میری بات کرانا۔“ عمران... نے کہا۔ ”دوسری صورت میں تم مجھے گمشدہ ظاہر کر سکتے ہو۔“

"میں سمجھ گیا جناب۔" اختر نے کہا اور اسی لمحے عمران... کے پاس موجود موبائل نے بیل دی۔ وہ چونکا۔ وہ بھول گیا تھا کہ اس کے پاس موبائل ہے اور آن ہے۔ اس نے پھرتی سے موبائل نکال کر اسے خاموش کر دیا۔

☆☆☆

وسط ایشیائی لابی نمبر دو میں ہی تھا۔ اس کے تینوں آدمی باہر آئے اور رپورٹ دی کہ نیچے کوئی نہیں ہے۔ بیسمنٹ خالی ہے۔ اس نے کہا۔ "ٹھیک ہے، تم میں سے دو یہیں رہیں اور ایک سامنے چلا جائے۔"

ان میں سے دو رک گئے اور ایک سامنے والی لابی میں چلا گیا۔ وسط ایشیائی وہیں رہا پھر وہ ٹہلتا ہوا سیڑھیوں کی طرف بڑھا۔ بیسمنٹ کی طرف جانے کے دو دروازے تھے۔ ایک اس لابی سے جاتا تھا اور دوسرا لابی نمبر تین سے جاتا تھا۔ اسی طرف عمارت کا سروس ڈور تھا لیکن وہ بہت مضبوط دھات کا بنا ہوا اور اندر سے بند تھا اس لیے اس سے کسی کا اندر آنا ممکن نہیں تھا۔ درحقیقت سیکیورٹی فورسز کے لیے عمارت میں آنا کوئی مسئلہ نہیں تھا کیونکہ چاروں طرف سے یہ شیشوں پر مشتمل تھی۔ کسی بھی طرف سے شیشہ توڑ کر بہ آسانی اندر آیا جا سکتا تھا۔ وسط ایشیائی دروازے کے پاس پہنچ کر مڑا تھا کہ اسے لگا جیسے بیسمنٹ کی طرف سے آواز آئی ہو۔ آواز کسی موبائل کی بیل کی تھی مگر یہ مشکل سے چند سیکنڈ کے لیے تھی۔ اس نے دروازے کی طرف دیکھا۔ اسی لمحے سامنے سے ایک نقاب پوش نمودار ہوا جس کے پاس یرغمالیوں سے حاصل کی ہوئی اشیا تھیں۔ اس نے کہا۔

"باس سی ایم کے موبائل کی بیل بجی تھی۔"

"تمام سیل فون بند کر دو۔" اس نے حکم دیا اور اگلی لابی کی طرف بڑھ گیا۔

☆☆☆

سی ایم ہاؤس میں جاری اس اجلاس میں سوائے سی ایم اور ان کے دو مشیرانِ خصوصی کے باقی پوری صوبائی حکومت، گورنر اور وفاقی وزیر داخلہ شریک تھے۔ صوبائی وزیرداخلہ نے کہا۔ "ان کا مطالبہ کسی صورت تسلیم نہیں کیا جا سکتا۔ ان دہشت گردوں کو حکومت نے بڑی کوشش اور قربانی کے بعد پکڑا ہے۔"

"اتفاق سے اب تک قربانی چھوٹے درجے کے پولیس اور دیگر آئی ڈی اہلکاروں نے دی ہے۔" وفاقی وزیر داخلہ نے سرد لہجے میں کہا۔ "کیا صوبائی حکومت اور حکمران پارٹی اپنا وزیراعلیٰ قربان کرنے کا حوصلہ رکھتی ہے۔"

"بات صرف وزیراعلیٰ کی نہیں ہے۔" آئی جی نے کہا۔ "وہاں ملک کے ایک درجن بڑے بزنس مین بھی یرغمال ہیں۔"

"ان میں سے کم سے کم ایک مارا گیا ہے اور دو شدید زخمی ہیں۔" اس بار وفاقی وزیرداخلہ نے آئی جی کی طرف دیکھا۔ "مجھے افسوس ہے اس معاملے میں پولیس کا کردار نہایت ناکارہ رہا ہے۔ آخر وہ دہشت گرد اندر کیسے پہنچے؟"

"پولیس کمانڈوز کے سربراہ کا خیال ہے وہ پہلے سے اندر موجود تھے۔" آئی جی نے وضاحت کی۔

"کیسے؟" وفاقی وزیر داخلہ نے میز پر ہاتھ مارا۔ "جب کل پوری بلڈنگ چیک کی گئی تھی تو اتنے سارے لوگ کیوں سامنے نہیں آئے۔"

"میرا خیال ہے صحیح سے چیکنگ نہیں کی گئی۔" گورنر نے کہا۔ "پھر یہ نئی بلڈنگ ہے اس کے بہت سے حصے سامنے بھی نہیں ہوں گے۔"

"اس کے باوجود دہشت گردوں کا اندر پہنچنا اور سی ایم سمیت درجن سے زیادہ افراد کو یرغمال بنا لینا پولیس کی ناکامی ہے۔" وفاقی وزیرداخلہ نے اصرار کیا جس پر آئی جی اور صوبائی وزیرداخلہ کے چہرے سرخ ہو گئے تھے مگر وہ کچھ کہنے کی پوزیشن میں نہیں تھے۔ یہ ان کی ذمے داری تھی اور وہ اسے پورا کرنے میں ناکام رہے تھے۔ وفاقی وزیر داخلہ نے آئی جی کی طرف دیکھا۔ "انسداد دہشت گردی سیل کا انچارج کہاں ہے؟"

"اسے ایس پی کے پاس ہونا چاہیے تھا۔" آئی جی نے تلخ لہجے میں کہا۔ "لیکن جب میں وہاں پہنچا تو وہ مجھے نظر نہیں آیا۔ وفاقی نے بلاوجہ اسے یہاں بھیجا۔"

"بلاوجہ نہیں۔" وفاقی وزیرداخلہ نے تردید کی۔ "وہ اس شعبے کے لیے موزوں ترین شخص ہے اور مسٹر آئی جی آپ بھول رہے ہیں اس نے اس وقت یہ شعبہ قائم کیا تھا جب آپ ایس پی تھے۔ تین سال میں اس نے اس شہر کو بہت حد تک پرامن بنا دیا تھا۔ بہرحال ہم یہاں بحث کرنے نہیں بلکہ یہ فیصلہ کرنے کے لیے آئے ہیں کہ دہشت گردوں کے مطالبات پر کیا فیصلہ کرنا ہے۔"

"یہ تو طے ہے کہ ان کا مطالبہ کسی صورت تسلیم نہیں کیا جا سکتا......" صوبائی وزیرداخلہ نے کہا۔ "ان درجن دہشت گردوں کو چھوڑ دینے کا مطلب ہے کہ حکومت نے دہشت گردی کے خلاف گھٹنے ٹیک دیے ہیں۔"

"اس صورت میں ہمیں ان کے خلاف آپریشن کرنا

ہوگا۔" رفاقی وزیرِ داخلہ نے کہا۔ "میرا نہیں خیال کہ سی ایم سیٹ کوئی بچ سکے گا کیونکہ دہشت گردوں نے انہیں عملاً بم پر بٹھا دیا ہے۔ کیا پولیس اور دوسرے صوبائی ادارے اس قابل ہیں کہ دہشت گردوں سے نمٹ سکیں اور سی ایم سیٹ رہ رہے افراد کو بہ حفاظت آزاد کرا سکیں؟"

"معذرت کے ساتھ۔" آئی جی نے کہا۔ "یہ صلاحیت تو فوج سمیت کسی وفاقی ادارے میں بھی نہیں ہے۔ بلکہ اگر امریکی سی آئی اے کوشش کرے تب بھی کامیابی کا امکان بہت کم ہوگا۔"

وزیرِ داخلہ سوچ میں پڑ گیا۔ اسے احساس تھا کہ یہ نہایت مشکل مرحلہ ہے۔ فیصلہ کرنا آسان نہیں تھا۔ دہشت گردوں نے بہت منصوبہ بندی سے کام کیا تھا اور انہوں نے یقیناً کوئی راستہ نہیں چھوڑا تھا۔ اس نے کھڑے ہوتے ہوئے کہا۔ "میں وزیرِاعظم سے بات کرلوں پھر کارروائی آگے بڑھاتے ہیں۔"

رفاقی وزیرِ داخلہ میٹنگ روم سے باہر چلا گیا اور وہ سب ایک کونے میں چلتے بڑے سائز کے ٹی وی کی طرف متوجہ ہوگئے۔ اس کی آواز بند تھی لیکن اسکرین پر سب دکھایا جا رہا تھا۔ صوبائی وزیرِ داخلہ نے سر پہ ہاتھ مارا۔ "اب ان کو کون روکے یہ سب بتا دالے تو جامے سے باہر ہو جانے تھے۔"

"اس کا موقع بھی ان کو ہم ہی دیتے ہیں۔" گورنر نے سرد لہجے میں کہا۔ اس نے آئی جی کی توجہ اسکرین کے نیچے چلتی خبر کی پٹی کی طرف کی۔ چند الفاظ کی خبر میں بتایا گیا تھا کہ اسٹاک ایکسچینج تیزی سے کریش کی طرف بڑھ رہا ہے۔ آج ٹریڈنگ کا آغاز ہی برا تھا۔ انڈیکس پوائنٹ ہر گزرتے منٹ کم ہو رہا تھا۔

☆☆☆

تمام ٹی وی چینل ایک دوسرے سے بڑھ چڑھ کر شہاب الدین کے دھماکے میں ٹکڑے ٹکڑے ہونے کا منظر بار بار دکھا رہے تھے۔ ان چینلز کو ذرا احساس نہیں تھا کہ شہاب الدین کے اہلِ خانہ اور جاننے والے بھی ٹی وی پر یہ منظر دیکھ رہے ہوں گے اور ان کے دلوں پر کیا گزر رہی ہوگی؟ نیچے چلتی نیوز کی پٹی تازہ ترین صورتِ حال سے آگاہ کر رہی تھی لیکن اس میں حقیقی خبر کا عنصر کم تھا اور قیاس آرائیاں جاری تھیں۔ ساتھ ہی تبصرے بھی چل رہے تھے۔ جس میں مبصرین متنانی بمبار بنی سے ہوتے ہوئے سرحد پار تک جا پہنچے تھے لیکن کسی کو علم نہیں تھا کہ ان ٹی وی کے اندر

کیا ہو رہا ہے اور وہاں حملہ کرنے اور سی ایم سیٹ دو درجن سے زیادہ افراد کو یرغمال بنانے والوں کے مقاصد کیا تھے؟ وسط ایشیائی ٹی وی اور یرغمالیوں کے درمیان ٹہل رہا تھا سب کی نظریں ٹی وی پر مرکوز تھیں اسی لیے مجبوراً اسے بھی دیکھنا پڑ رہا تھا۔ تمام نشستیں ایک جیسی تھیں اور محمود و ایاز ایک ہی صف میں تھے۔ بزنس مینوں کی صف میں ایک موسیٰ بھائی بھی تھا۔

موسیٰ بھائی نے بہت چھوٹے پیمانے سے بزنس کا آغاز کیا تھا۔ وہ کھڈی کے بنے تولیے اور رومال فروخت کرتا تھا پھر اس نے اپنا ایک چھوٹا یونٹ لگایا اور آج اس کی صرف اسی شہر میں چار ٹیکسٹائل ملز دن رات کپڑا تیار کر رہی تھیں۔ روپے کے لحاظ سے اس کا شمار کھرب پتی افراد میں ہوتا تھا۔ موسیٰ بھائی کے بارے میں مشہور تھا کہ جذبات کا عنصر اس کے وجود میں شامل ہی نہیں تھا۔ وہ نہایت ٹھنڈے دماغ سے ہر فیصلہ کرتا تھا اور یہی وجہ تھی کہ اس کا شمار شہر کے کامیاب ترین بزنس مینوں میں ہوتا تھا۔ کئی انسانی جذبوں پر.... جیسا اس کے نزدیک بیکار کی مشق تھی جہاں ہنسی کی ضرورت ہوتی تھی وہاں وہ مسکراتا بھی نہیں تھا۔ گزشتہ دو گھنٹے میں وہ بالکل خاموش اور کسی سوچ میں گم رہا تھا۔ اس لیے جب اس نے اچانک بلند آواز میں قہقہہ لگایا تو سب نے اسے یوں دیکھا جیسا اس کا دماغ چل گیا ہو۔ وسط ایشیائی نے ٹہلتے ہوئے رک کر اسے دیکھا تو اس کے دائیں بائیں بیٹھے افراد ذرا سرک کر اس سے دور ہو گئے تھے۔

"کیا کر رہے ہو موسیٰ بھائی۔" برابر میں بیٹھے بزنس مین نے آہستہ سے کہا۔ "یہ کون سا موقع ہے ہنسنے کا؟"

"ہاں موقع تو رونے کا ہے۔" موسیٰ بھائی نے خود پر قابو پاتے ہوئے کہا۔ "پر کیا کرے ہنسی آ گیا.... اصل میں کچھ یاد آ گیا تھا۔"

"کیا یاد آ گیا؟" وسط ایشیائی نے دلچسپی سے اسے دیکھا۔

"میں ذرا بیلنس شیٹ چیک کیا تھا۔"

"کیسی بیلنس شیٹ؟"

موسیٰ بھائی نے پھر قہقہہ مارا۔ اس نے اپنی کنپٹی پر انگلی ماری۔ "ادھر سب ہوتا ہے.... پہلے میں بھی سمجھتا تھا.... میرا اکاؤنٹنٹ بعد میں بتاتا تھا میں اسے پہلے بتا دیتا تھا.... پر یہ دوسرا بیلنس شیٹ ہے.... آج اسے بیلنس کر کے دیکھا تو اس میں لاس آیا۔"

وسط ایشیائی بدستور اسے سوالیہ نظروں سے دیکھ رہا

تھا۔ موسیٰ بھائی نے کچھ دیر بعد پوچھا۔ ''ابھی میں سوچ رہا تھا کہ ابھی یہاں کوئی افراتفری ہو اور سب مر جائیں پر میں بچ جاؤں۔ تو یہ بارود کا جیکٹ کون اتارے گا؟''

''کوئی نہیں۔'' وسط ایشیائی نے کہا۔ ''صرف ٹھیک کوڈ لگا کر اسے کھولا جا سکتا ہے اس کے علاوہ کسی بھی طریقے سے کھولنے کی کوشش کی گئی تو نتیجہ ایک ہی ہوگا۔''

''ہوم۔'' موسیٰ بھائی نے کہا۔ وہ سانولے رنگ کا وسیع ماتھے والا شخص تھا۔ اس کے سامنے کے بال اڑ گئے تھے۔ پیلی آنکھوں کے ساتھ سرخ دانت کثرت سے پیش کرتے تھے کیونکہ وہ مسلسل پان کھانے کا عادی تھا۔ وہ پچپن سال کا تھا اور اتنے کا ہی دکھائی دیتا تھا۔ چہرے پر سختی اور شک کا ملا جلا تاثر تھا۔ استخوانی جسم پر قیمتی سوٹ جھول رہا تھا۔ ''پھر میں بچ گیا تو کیا ساری عمر اس کے ساتھ رہے گا؟''

وسط ایشیائی مسکرایا مگر نقاب نے اس کی مسکراہٹ کسی نے نہیں دیکھی۔ ''ہاں اس صورت میں تمہیں ساری عمر اسی جیکٹ کے ساتھ گزارنی پڑے گی لیکن یہ تمہاری خوش فہمی ہے کیونکہ اس میں ٹائمر بھی لگا ہوا ہے۔ یوں سمجھ لو اب تمہارے پاس بس گھنٹے بھی نہیں ہیں۔ اگر اسے درست کوڈ لگا کر نہ روکا گیا تو یہ بہر صورت پھٹ جائے گی۔''

موسیٰ بھائی پھر ہنسا۔ اس بار اس نے قہقہہ نہیں لگایا۔ ''لاؤ میں بیلنس بھی ٹھیک نہیں آتا۔ یہ تو سوچا نہیں تھا۔'' اس نے سر جھکا کر بم کی طرف دیکھا۔ ''پھر اگر اس پر ٹائمر نہ ہو تو آدمی کوشش تو کر سکتا ہے کوڈ لگاتا رہے کبھی تو کوئی لگ جائے گا۔''

''اس کا کوئی امکان نہیں ہے کیونکہ یہ پانچ عدد کا کوڈ ہے اور ہر بم میں پہلے سے سیٹ ہوتا ہے۔ پہلے چار نمبر ملانے پر کچھ نہیں ہوگا لیکن پانچواں نمبر ملاتے ہی کوڈ غلط ہونے کی صورت میں......''

''ہوم۔'' موسیٰ بھائی نے اس کی بات کاٹ کر کہا۔ ''اب ہم سمجھ گیا...... شٹ کچھ کچھ بیلنس ہو رہا ہے۔''

سب خوفزدہ تھے اور...... اکبر ابھی نظروں سے موسیٰ بھائی کو دیکھ رہا تھا۔ وہ موسیٰ بھائی کے دائیں طرف ایک آدمی کے بعد بیٹھا تھا۔ موسیٰ بھائی سے کچھ دیر پہلے ہی ایم کے ایک مشیر نے جو خاصا دبنگ سیاست داں مشہور تھا اور حزب اختلاف اور سیاسی مخالفوں کے بارے میں اس کے بیانات لوگوں کی توجہ کا مرکز بنتے تھے۔ اس نے ان لوگوں کو سمجھانے کی کوشش کی کہ وہ اچھی زندگیوں سے کھیل رہے ہیں، وہ حکومت کی طاقت سے نہیں لڑ سکتے۔ ان پر

ایک نقاب پوش نے اس کے منہ پر گھونسا مار کر اس کا ایک دانت فارغ کر دیا تھا۔ اس کے بعد سے سب خاموش تھے اور کسی نے بولنے کی جرأت نہیں کی تھی۔ وسط ایشیائی ایک بار پھر ریسپشن کے کمپیوٹر پر آیا اور اس نے دوبارہ ویب سائٹ اوپن کی۔ اگرچہ پی ار کی پر بھی خبر آئی تھی لیکن یہ ویب سائٹ مسلسل خبر دے رہی تھی۔ کسی کو علم نہیں تھا کہ وہ بار بار یہاں آ کر کیا کرتا ہے۔ اس نے مطمئن ہو کر ویب سائٹ بند کر دی اور ریسپشن کے پیچھے سے نکل آیا۔ ساڑھے گیارہ بج رہے تھے اور ابھی بیذرا اخر یہ کم سے کم تین گھنٹے جاری رہنا۔ اس کے بعد اسے منصوبے کے دوسرے حصے پر عمل کرنا تھا اور اس حصے کے لیے وہ اس کھیل میں شامل ہوا تھا۔ تاوان میں ملنے والے پچاس کروڑ روپے اس کے حصے میں آنے تھے۔

☆☆☆

عمران...... نے بتی بند کر دی تھی اور ریسپشن کے دروازے سے ممکنہ حد تک دور آ گیا۔ پھر اس نے رعنا کو کال کرنے کی کوشش کی لیکن یہاں سگنل بہت کم تھے۔ دو بار کوشش کے باوجود کال نہیں ملی تھی۔ وہ دروازے کے پاس تھا تو سگنل تھے لیکن اس میں خطرہ تھا اس کی آواز اوپر جا سکتی تھی۔ تیسری کوشش میں بتی جانے لگی۔ رعنا نے فوراً کال ریسیو کی۔ ''رعنا میں بات کر رہا ہوں۔'' عمران نے کہا لیکن دوسری طرف سے رعنا مسلسل ہیلو ہیلو کر رہی تھی۔ اسے عمران...... کی آواز گئی ہی نہیں تھی۔ مجبوراً اس نے کال کاٹ دی۔ اس نے سوچا پھر وہ سیڑھیوں کے پاس واش روم میں آیا یہاں سگنل تھے اس نے رعنا کو کال کی۔ اس نے ریسیو کرتے ہی کہا۔ وہ پریشان تھی۔

''عمران...... آپ کہاں ہیں، میں نے ابھی ٹی وی پر دیکھا ہے۔''

عمران...... نے پہلے سوچا کہ اسے بے خبر رکھے لیکن پھر اس نے سچ کہنے کا فیصلہ کیا۔ ''رعنا میں مشکل میں ہوں، میں اس عمارت میں ہوں جس میں دہشت گردوں نے وزیر اعلیٰ کو یرغمال بنا رکھا ہے۔ ان کی تعداد زیادہ ہے لیکن میں آزاد اور چھپا ہوا ہوں۔''

رعنا روہانسی ہو گئی۔ ''پہلے میں نے آپ کا نمبر ملایا مگر اس پر کوئی جواب نہیں آ رہا تھا پھر میں نے اختر کو کال کی تھی لیکن وہ کچھ نہیں بتا رہا ہے۔ میرا دل کہہ رہا تھا کہ آپ مشکل میں ہیں۔ شکر ہے آپ سلامت اور آزاد ہیں۔ پلیز آپ وہاں سے نکل جائیں یہ بہت خطرناک لوگ ہیں۔''

"اول تو یہ ممکن نہیں ہے۔" عمران..... نے دھیمی آواز میں کہا۔ "بلڈنگ میں آنے جانے کا صرف ایک راستہ ہے اور وہ اس پر پوری طرح قابض ہیں۔ دوسرے اگر مجھے موقع ملا تب بھی میں یہاں سے نہیں جاؤں گا۔"

"عمران... پلیز۔" رعنا کی آواز مزید بھیگ گئی۔

"یہ فرض کی ادائیگی کا وقت ہے، اس سے منہ موڑنے کا نہیں۔" عمران... نے مضبوط لہجے میں کہا۔ "میں تم سے یہ توقع نہیں رکھتا کہ تم مجھے پیچھے ہٹنے کو کہو گی، میں تم سے توقع رکھتا ہوں کہ تم دعا کرو گی کہ میں اس امتحان سے سرخرو ہو کر نکلوں۔"

رعنا دبی آواز میں رونے لگی پھر اس نے خود پر قابو پاتے ہوئے کہا۔ "میں آپ کے لیے دعا کروں گی۔ میں ابھی ڈاکٹر کو دکھا کر آ رہی ہوں۔"

"اس نے کیا کہا؟"

"وائرل انفیکشن ہے، لیکن ڈاکٹر نے مجھے اینٹی بائیوٹک نہیں دی۔"

"کیوں؟"

"عمران...." رعنا کی آواز بھرا گئی۔ "میں امید سے ہوں، ڈاکٹر نے کہا ہے نائنٹی نائن پوائنٹ سیون پرسنٹ چانس ہے۔"

عمران اکبر کی سمجھ میں نہیں آیا تھا کہ اس موقع پر اس خوشخبری پر کیا ردعمل ظاہر کرے۔ اس نے بہ مشکل کہا۔ "تمہیں یقین ہے؟"

"سچ کہوں عمران... مجھے بھی یقین نہیں آ رہا ہے۔ پہلے میں بہت خوش تھی لیکن اب...."

"اب بھی کچھ نہیں ہوا ہے۔" عمران... نے اس کی بات کاٹ کر کہا۔ "یہ سب اوپر والے کے فیصلے ہیں وہ جسے چاہتا ہے نوازتا ہے اور جس سے چاہتا ہے، لے لیتا ہے۔ رعنا تم حوصلہ رکھو اور میری کامیاب واپسی کی دعا کرو۔"

رعنا خود پر قابو پانے لگی۔ "عمران... میں آپ سے کوئی وعدہ نہیں لے رہی لیکن آپ کو میرا ایک کام کرنا ہو گا۔"

"کیسا کام؟"

"آپ شام آتے ہوئے ایک لیٹر دودھ کا کارٹن لیتے آیئے گا۔ میں نے ابھی دیکھا ختم ہو گیا ہے۔ آپ لائیں گے نا؟" اس کی آواز پھر بھرانے لگی۔

"رعنا میں...."

"نہیں وعدہ کریں آپ لائیں گے۔ میں کچھ اور سننا نہیں چاہتی۔"

اکبر نے گہری سانس لی۔ "ٹھیک ہے، میں لاؤں گا۔"

"ٹھیک ہو، اپنا خیال رکھیے گا۔"

"تم بھی اور اب کال مت کرنا۔ میں موبائل بند کر رہا ہوں۔"

"میں آپ کا انتظار کروں گی، اللہ حافظ۔" رعنا نے کہا اور کال بند کر دی۔ عمران... نے گہری سانس لی اور موبائل بند کر دیا۔ جس خبر کا وہ شادی کے بعد سے منتظر تھا وہ اسے کس وقت ملی تھی۔ اس نے واکی ٹاکی پر اختر سے رابطہ کیا۔ اس نے کچھ دیر بعد کال ریسیو کی اور آہستہ سے بولا۔

"سر یہاں مسئلہ ہو گیا ہے۔ آئی جی صاحب واپس آ گئے ہیں اور انہوں نے حکم دیا ہے کہ ہمارے آدمی یہاں سے دور رہیں۔"

"نان سینس۔" عمران... برہم ہو گیا۔ "اس کا دماغ درست ہے، یہ پولیس کے بس کی بات نہیں ہے۔ اس نے میرے بارے میں پوچھا؟"

"یس سر، میں نے بتایا کہ آپ رابطے میں نہیں ہیں۔"

"یہاں اور کون آیا ہے؟"

"صوبائی وزیر داخلہ اور چند صوبائی وزیر.... وفاقی وزیر داخلہ ابھی تک نہیں آئے۔"

عمران کو مایوسی ہوئی۔ "ان کا آنا ضروری ہے ورنہ یہ لوگ معاملہ خراب کر دیں گے۔ بہرحال تم تیاری کرو، این ڈی اے سے آرکٹ پلان لو۔ اس میں دیکھو عمارت کے بائیں طرف ایک چھوٹی سی گلی ہے۔ یہ اسی عمارت کا ایک حصہ ہے۔ اس گلی سے ایک آٹومیٹک فولادی گیٹ ہے۔ اسے صرف اندر سے کھولا جا سکتا ہے لیکن وہ سارا سسٹم آف ہے جس سے اسے کھولا جا سکتا۔ اس صورت میں اسے صرف گیس ویلڈ سے کاٹا جا سکتا ہے۔ تم اس کا معائنہ کرو اور لے آرکٹ پلان بھی دیکھو۔"

"میں کر لوں گا سر۔" اختر نے کہا۔ "اگر گیٹ کاٹنا ممکن ہوا تو پھر کیا کرنا ہے؟"

"ہمارا دستہ اس راستے سے اندر آئے گا۔ یہاں دو عدد کار گو لفٹ ہیں اور یہ بھی بند ہیں۔ لیکن ان کا دروازہ کھول کر ان کی مدد سے اوپر آیا جا سکتا ہے۔ سوائے گراؤنڈ کے ہر فلور پر کھلتی ہیں۔"

"میں سمجھ گیا سر، میں ابھی دیکھتا ہوں۔"

"میں تمہیں دس منٹ بعد کال کروں گا۔ اگر کوئی آس پاس ہو تو مست رہبو کرنا۔"

"یس سر۔"

واکی ٹاکی بند کر کے عمران... دبے قدموں سیڑھیوں کی طرف آیا۔ اس نے باہر کی سن گن لی اور پھر جھک کر دروازے کے نیچے کی خفیف درز سے باہر جھانکا تو فوراً ہی اسے دو جوتے نظر آگئے جو دروازے سے مشکل سے چند فٹ دور تھے۔ وہ کتنی ہی احتیاط سے دروازہ کھولتا یہ ممکن ہی نہیں تھا کہ باہر موجود فرد متوجہ نہ ہوتا۔ وہ بال بال بچا تھا۔ عمران... اسی طرح دبے قدموں واپس نیچے آگیا جیسے اوپر گیا تھا۔ وہ اب جمینیٹ کے دوسرے حصے کی طرف جا رہا تھا جس کا راستہ لابی نمبر تین میں نکلتا تھا اور وہاں بھی اوپر جانے والی سیڑھیاں تھیں۔ مگر یہاں بھی اسے پہرے دار نظر آئے تھے۔ انہوں نے اس کے لیے کوئی راستہ نہیں چھوڑا تھا۔ اسے ایک بار پھر احساس ہوا کہ اس کا واسطہ عام دہشت گردوں سے نہیں ہے۔ یہ انتہائی منظم اور تربیت یافتہ تھے جو ہر پہلو پر نظر رکھے ہوئے تھے۔

☆☆☆

بارہ بج چکے تھے اور وہ تقریباً ڈھائی گھنٹے سے اسی جگہ بیٹھے تھے۔ سی ایم صاحب کو پیاس لگی اور انہوں نے ہمت کر کے وسط انشبائی سے پانی مانگا۔ وہ ریسپشن سے ٹیک لگا کر کھڑا تھا۔ اس نے نفی میں سر ہلایا۔ "یہاں پانی نہیں ہے۔"

"پھر پانی کہاں ہے؟"

"یہاں کولر لگے ہیں لیکن ان پر فی الحال منرل واٹر کی بوتلیں نہیں لگی ہیں۔"

"یہ پانی ہے۔" سی ایم نے فوارے کی طرف اشارہ کیا۔

"پی لو اگر پی سکتے ہو۔" وسط انشبائی نے بیپروائی سے کہا۔ "ممکن ہے عام حالات میں تم یہ پانی اپنے کتوں کو بھی نہ پلاؤ۔"

اس طنز پر سی ایم خون کے گھونٹ پی کر رہ گئے۔ لیکن اس کے بعد انہوں نے پیاس کی شکایت نہیں کی۔ دوسری طرف موسیٰ بھائی... اکبر سے کہہ رہا تھا۔ "تم کو سمجھ میں آرہا ہے یہ کیا ہو رہا ہے؟"

"نہیں!...." اکبر نے خشک لبوں پر زبان پھیری۔

"یہ سارا بلیس شٹ کا معاملہ ہے۔" موسیٰ بھائی نے رازدارانہ انداز میں کہا۔ "اب دیکھو نا... میرا بیوی مر گیا... میں بزنس کرتا رہا... میرا بیٹا کینسر کا مریض تھا ادھر لندن کے ایک ہاسپٹل میں پڑا تھا۔ میں علاج کرایا.... لاکھوں پاؤنڈ خرچ کیا پر بزنس کرتا رہا۔ وہ مر گیا۔"

"پلیز موسیٰ بھائی یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں......"

اکبر نے آس پاس دیکھا۔ "یہ وقت ایسی باتوں کا نہیں ہے۔"

"یہی تو وقت ہے ایسا بات کا۔" موسیٰ بھائی بولا۔ "دیکھو موت چیخنے سے لگا ہے۔"

اکبر کے تاثرات عجیب سے ہو گئے۔ اس نے آہستہ سے کہا۔ "موسیٰ بھائی یہ کیسی بات کر رہے ہیں۔ میں نے آج تک آپ کے منہ سے ایسی باتیں نہیں سنیں۔"

"اکبر بھائی تم عقل مند ہے... جانتا ہے جب آدمی کے سامنے زندگی ہو تو وہ ایسا بات نہیں کرتا ہے لیکن جب موت سامنے ہو تو آدمی ایسا ہی بات کرتا ہے۔"

"پلیز موسیٰ بھائی۔" دوسری طرف بیٹھے جوان، خوش پوش اور خوش رو بزنس مین راحیل ممتاز نے کہا۔ "موت کی باتیں نہ کریں۔"

"چیخنے سے لگا نے جیسا ہے اور کہتا ہے موت کی بات نہ کرے۔"

ستارونے باربار

بیوی کے ڈرتے ہوئے شوہر نے وکیل سے مشورہ کیا۔
"اگر میں اپنی بیوی کو طلاق دوں تو کم سے کم کتنی رقم خرچ ہو گی؟"

"ہزار روپے میری فیس۔" وکیل صاحب نے بتایا۔
"تقریباً پینے ہی روپے کا خرچ اور بیوی کا حق مہر اس کے علاوہ ہوگا۔"

شوہر نے کہا: "اتنا خرچ تو شادی میں بھی نہیں آیا تھا۔ سو روپے نکاح خواں کے لیے تھے اور تین سو روپے کی نکاح کے لیے مٹھائی آئی تھی۔"

وکیل صاحب نے منہ بنا کر کہا۔ "سستے کام کا یہی انجام ہوتا ہے۔"

امتیاز احمد، کراچی کی حوصلہ مندی

"مجھے امید ہے حکومت ان کے مطالبات مان لے گی۔" راحیل کے لہجے میں امید تھی۔ "اور سی ایم صاحب بھی ہیں۔"

راحیل ممتاز کا مطلب تھا کہ حکومت شاید ان کے لیے ان دہشت گردوں کے مطالبات نہ مانے مگر اپنے سی ایم کے لیے ضرور مان جائے گی۔ اکبر نے کہا۔ "مجھے بھی امید ہے حکومت ان کی بات مان جائے گی۔"

"بابا مطالبہ تو تب مانا جائے جب کیا جائے گا۔" موسیٰ بھائی نے عجیب سے لہجے میں کہا۔ "ان لوگوں نے مطالبہ تھوڑی کیا ہے۔ کیا مانگ رہا ہے، پچاس کروڑ روپیہ.... بابا یہاں کون سا ایسا آدمی ہے جس کے پاس اس وقت اتنا کیش نہ نکلے... سب کے پاس ہوگا..... کچھ کے پاس ارب روپیہ کیش ہوگا اور یہ مانگ رہا ہے پچاس کروڑ روپیہ۔"

وسط ایشیائی جو کچھ فاصلے پر تھا اور ساری گفتگو سن رہا تھا اس نے اچانک مداخلت کی۔ "بس اس وقت تک کے لیے اتنی گفتگو کافی ہے۔"

"یہ لوگ اتنی دیر کیوں کر رہے ہیں۔" سی ایم نے اچانک کہا۔ "سنو میری فون پر بات کراؤ.... میں وزیر اعلیٰ ہوں، میں حکم دے سکتا ہوں۔ وہ بندے چھوٹ جائیں گے اور تمہیں تاوان بھی مل جائے گا۔"

"ابھی تمہارا حکم کوئی نہیں مانے گا۔ ابھی وہ لوگ حساب لگا رہے ہوں گے کہ تم کتنے ضروری ہو اور یہ سب کتنے ضروری ہیں۔" وسط ایشیائی نے بزنس مین پارٹی کی طرف اشارہ کیا۔ "وہ سارا حساب کر کے پھر فیصلہ کریں گے کہ کیا کرنا ہے اور اس میں وقت تو لگے گا۔"

موسیٰ بھائی چہکا۔ "میں ٹھیک بولا نا؟.... سارا چکر بیلنس شیٹ کا ہے۔"

سی ایم سمیت سب کے چہرے زرد پڑ گئے۔

☆☆☆

آفیسر نے اختر کو طلب کیا تھا۔ وہ آیا تو آفیسر نے بلا تمہید پوچھا۔ "عمران کہاں ہے؟"

"میں نہیں جانتا سر، جب سے یہ واقعہ ہوا ہے وہ غائب ہیں۔" اختر نے بے ساختہ جھوٹ بولا۔ ساتھ ہی وہ فکرمند تھا کہ یہ جھوٹ پکڑا نہ جائے۔

"تم واکی ٹاکی پر کس سے بات کر رہے تھے؟" اس نے اچانک پوچھا تو وہ ایک لمحے کے لیے گڑبڑا گیا۔

"سر اپنے آدمیوں سے۔"

آفیسر کچھ دیر اسے دیکھتا رہا پھر اس نے ہاتھ آگے کیا اور چٹکی بجا کر بولا۔ "گیو اِٹ۔"

"سر...." اختر نے کہنا چاہا۔

"مجھے دو۔" آفیسر دہاڑا۔ "تم نے مجھ سے جھوٹ بولا ہے، میں تمہیں ابھی سسپنڈ کر دوں گا۔"

اختر کی حالت خراب ہو گئی۔ وہ چھوٹے درجے کا افسر تھا، اعلیٰ آفیسر کے مقابل نہیں کھڑا ہو سکتا تھا۔ "سوری سر.... چیف کا آرڈر ہے کہ ان کے بارے میں کسی کو نہ بتایا جائے۔"

"وہ کہاں ہے؟" اس بار آفیسر کا لہجہ نرم تھا۔

"وہ بلڈنگ میں ہیں، اس واقعے سے کچھ پہلے وہ اندر گئے تھے اور وہ اس وقت مصیبت میں ہیں۔"

"دہشت گردوں کو اس کے بارے میں نہیں معلوم؟"

"نہیں سر..... وہ آزاد ہیں۔"

"اور تم اب بتا رہے ہو۔ اتنا وقت ضائع کرنے کے بعد.... واکی ٹاکی مجھے دو۔" آفیسر نے پھر کہا تو اختر کو واکی ٹاکی اسے دینا پڑا۔

☆☆☆

عمران... مایوسی کے عالم میں واپس پلٹ رہا تھا کہ اچانک واکی ٹاکی نے بپ دی۔ آواز بہت بلند اور واضح تھی۔ اختر کو ہدایت دینے کے بعد اس نے واکی ٹاکی کی بیل بند نہیں کی تھی۔ اسے امید نہیں تھی کہ اختر پھر کال کرنے کی حماقت کرے گا۔ کال کاٹتے ہوئے وہ تیزی سے نیچے آیا اور اس نے واکی ٹاکی آف کر دیا۔ وہ راہداری میں تھا کہ اوپر سے دروازہ کھلنے کی آواز آئی پھر ایک آدمی نیچے آیا۔ خوش قسمتی سے وہ تاریکی میں تھا اس لیے آنے والے اسے فوری نہیں دیکھ سکتے تھے۔ مگر اسے تلاش کیا جاتا اور یہاں چھپنے کی کوئی جگہ نہیں تھی۔ واش روم کے ساتھ اندر جانے سے پہلے ایک چھوٹی سی دو چھتی نما جگہ تھی جو شاید کسی مقصد کے تحت بنائی گئی تھی لیکن اسے استعمال نہیں کیا گیا تھا اور وہ خالی پڑی ہوئی تھی۔ عمران... نے پہلے ہی اسے دیکھ لیا تھا کہ موقع پڑنے پر وہ پناہ گاہ بن سکتی ہے۔ اس نے اچھل کر اس پر ہاتھ جمائے اور ایک پاؤں اوپر ٹکا کر چڑھ گیا۔

یہ جگہ بہت محفوظ نہیں تھی، زیادہ آدمی آتے اور تفصیلی تلاشی لی جاتی تو وہ پکڑا جاتا۔ فوراً ہی لابی نمبر دو کے زینے سے بھی دو لوگ نیچے آنے لگے۔ ٹارچ کی روشنیاں لہرا رہی تھیں۔ لابی نمبر تین سے آنے والے اب پاس تھے اور وہ

نمبر لابی سے آنے والے نوان سے بھی پاس تھے۔ وہ عمران ..... کے بیچے آپس میں ملے اور انہوں نے بہت آہستہ سے سرگوشی میں ایک دوسرے کو سمجھایا کہ کس نے کہاں کہاں چیک کرنا تھا؟ پھر وہ بھیڑ میں پھیل گئے۔ ایک آدمی پھر واش روم میں گیا تھا اور جیسے ہی وہ جینٹس واش روم کو چیک کر کے نکلا، اکبر خاموشی سے نیچے اترا آیا اور دبے قدموں سیڑھیاں چڑھ کر اوپر آ گیا۔ اس نے کھلے دروازے سے باہر جھانکا اور کسی کو نہ پا کر وہ دبے قدموں اس طرف کے ریسپشن کاؤنٹر کے پیچھے آیا۔ اس نے موبائل نکال کر آن کیا اور اختر کو کال کی۔ ''میرے پاس وقت نہیں ہے، میں کسی وقت بھی پکڑا جاؤں گا۔ تم یہ کال آن رکھنا..... میں سیل میوٹ کر رہا ہوں۔''

''میں سمجھ گیا جناب۔'' اختر نے فکرمندی سے کہا۔ ''معذرت کہ صاحب نے جان لیا کہ میں آپ سے رابطے میں ہوں۔ انہوں نے کال کی تھی۔''

''اوکے..... اس سیل سے شاید تم لوگوں کو اندر کا حال معلوم ہوتا رہے۔'' عمران..... نے کہتے ہوئے موبائل کو میوٹ پر کیا اور پھر کاؤنٹر کے پیچھے سے نکل کر وہ گملوں تک آیا۔ اس کے پیچھے وہ شخص تھیں جن پر یرغمالی بیٹھے ہوئے تھے۔ اس نے احتیاط سے موبائل ایک پودے کے بڑے پتوں میں چھپا دیا پھر اس نے اپنا پستول بھی اسی میں چھپا دیا اور فوراً واپس گیا۔ ابھی تک یہاں کوئی نہیں آیا تھا۔ یہ اس کی خوش قسمتی تھی۔ اب وہ پکڑا جاتا تو کسی کا دھیان گملوں کی طرف نہ جاتا کہ ان میں کچھ چھپایا گیا ہے۔

وہ سیڑھیاں اتر کر نیچے آیا اور بائیں طرف روانہ ہو گیا کیونکہ اس طرف کوئی نظر نہیں آ رہا تھا لیکن یہ اس کی غلطی تھی۔ وہ راہداری میں تھا کہ اچانک اس پر روشنی پڑی اور کسی نے سرد لہجے میں کہا۔ ''ہلنا مت دونوں ہاتھ اوپر۔''

عمران..... نے ہاتھ اوپر کر لیے۔ فوراً ہی تاریکی سے دو افراد برآمد ہوئے، ایک نے اس کے گھٹنے پر پیچھے سے لات ماری اور وہ نیچے گرا تھا۔ ضرب شدید تھی درد کی لہر نے اسے تڑپا دیا۔ اس نے بمشکل اپنی آواز پر قابو رکھا۔ اس کے ہاتھ قابو کر کے پیچھے کر لیے اور دوسرے نے اس کی تلاشی لی۔ اس کے پاس سے والٹ، ٹائی، پرس اور کار کی چابیاں نکلی تھیں۔ تلاشی لینے والے نے پوچھا۔ ''ہتھیار اور موبائل کہاں ہے؟''

''ہتھیار اور موبائل گھر بھول آیا تھا۔''

انہوں نے اس کے دونوں ہاتھ آگے کر کے نائیلون کی کسا جانے والی ہتھکڑی سے باندھ دیے اور اسے دھکے دیتے ہوئے اوپر لائے۔ سامنے والی لابی میں جہاں سب جمع تھے، اسے دھکا دے کر وسط البنانی کے سامنے گرا دیا گیا۔ وہ گھٹنوں کے بل نیچے ہوا اور ہاتھ ٹکا کر خود کو گرنے سے بچا لیا۔ وسط البشانی غور سے اسے دیکھ رہا تھا، اس نے آہستہ سے کہا۔ ''او تو تم ہو..... مسٹر سجاد..... مجھے اندازہ نہیں تھا کہ تمہارے جیسا خطرناک آدمی یہاں ہوگا اور یہ ہماری خوش قسمتی کہ تم ہمارے قابو میں آ گئے۔''

''تم مجھے جانتے ہو۔'' عمران ... کھڑا ہو گیا۔ اس نے ایک نظر اعلیٰ عہدے دار اور دوسرے لوگوں کو دیکھا جن میں..... اکبر بھی شامل تھا۔

''بہت اچھی طرح۔'' وسط البشانی نے ....

..... ''اس کے پاس سے کیا نکلا ہے؟'' وسط البشانی نے اپنے ساتھیوں سے پوچھا۔ تلاشی لینے والے نے اس کی چیزیں پیش کیں اور اس نے فوراً نوٹ کر لیا۔ ''تمہارا موبائل اور ہتھیار کہاں ہے؟''

''وہ افراتفری سے گھر میں رہ گئے۔'' عمران ..... نے جواب دیا۔ ''میں عجلت میں گھر سے نکلا تھا۔''

وسط البشانی نے معنی خیز انداز میں سر ہلایا۔ ''ٹھیک ہے..... بہرحال اگر تم غلط کہہ رہے ہو تب بھی کوئی فائدہ نہیں ہے یہاں تم بے بس ہو۔''

''اس جیسا آدمی کبھی بے بس نہیں ہوتا۔'' موسیٰ بھائی نے مداخلت کی۔ ''یہ موت سے نہیں ڈرتا ہے اور جو موت سے نہیں ڈرتا ہے، وہ کبھی بے بس نہیں ہوتا.....''

''تم اسے جانتے ہو؟'' وسط البشانی نے موسیٰ بھائی کی طرف دیکھا۔

''نہیں بابا..... پہلی بار دیکھا ہے..... پر میں آدمی پہچانتا ہے۔''

''اوکے مسٹر سجاد! تم یہاں آرام سے بیٹھو، میں ذرا تمہارے اوپر والوں سے بات کر لوں۔ ان کو بتاؤں کہ تم بھی میرے پاس آ گئے ہو۔''

وسط البشانی ریسپشن پر آیا۔ اس نے گھڑی کی طرف دیکھا۔ ایک بج رہا تھا۔ اس نے فون اٹھایا جواب ایجنسی بن گیا تھا اور اس کا رابطہ پولیس کمیونیکیشن وینا سے تھا۔ دوسری طرف سے اوپریٹر نے کہا۔ ''یس سر، آئی ہیلپ یو۔''

''کیوں نہیں اپنے افسر سے بات کراؤ۔''

فوراً ہی اعلیٰ افسر لائن پر آ گیا۔ ''میں مسٹر مین آف

کنٹرول۔"

"غور سے سنو مسٹر افسر۔" وسط ایشیائی نے کھردرے لہجے میں کہا۔ "میں تمہارے کسی تھانے میں قتل کی ایف آئی آر درج کرانے نہیں آیا ہوں جوانی و بربودگی ہے۔ ممن کھٹنے بہت ہونے ہیں۔"

"معاملہ اتنا آسان نہیں ہے۔" پولیس افسر نے نرم لہجے میں کہا۔ "اس میں صوبائی اور وفاقی حکومتیں دونوں شریک ہیں اور تم جانتے ہو دونوں کا تعلق الگ پارٹیوں سے ہے۔ فیصلے پر پہنچنے میں کچھ وقت لگے گا۔"

"میں ان کو ایسی لیبز دینا جانتا ہوں مسٹر۔" وسط ایشیائی نے خاص انداز میں کہا اور فون رکھ کر وہ اس بزنس مین کی طرف آیا جو بارودی جیکٹ سے بچ گیا تھا اور ان میں سب سے مطمئن وہی تھا۔ لیکن جب وسط ایشیائی نے اسے گریبان سے پکڑ کر اٹھایا تو اس کی آنکھوں میں خوف اتر آیا۔ اس نے مزاحمت کی۔

"مجھے کہاں لے جا رہے ہو؟"

لیکن وسط ایشیائی اسے کھینچتا ہوا ایک طرف شیشے کی دیوار تک لایا اور اسے دیوار کی طرف منہ کر کے کھڑا کر دیا۔ ایک آدمی اس کے اشارے پر اس کے پیچھے آ گیا اور اپنی رائفل تان لی۔ اس دوران میں ریسیپشن کا فون مسلسل بیل دے رہا تھا۔ وسط ایشیائی فون کی طرف آیا اور ریسیور اٹھا کر بولا۔ "آفیسر، تم دیکھ رہے ہو ایک یرغمالی شیشے کی دیوار کے ساتھ کھڑا ہے۔"

"میری بات سنو۔" آفیسر نے مضطرب لہجے میں کہا لیکن اس سے پہلے ہی وسط ایشیائی اپنے آدمی کو اشارہ کر چکا تھا۔ اس نے ہلکا سا برسٹ مارا۔ آدمی کی پشت چھلنی ہو گئی۔ وہ شیشے سے لگا اور پھر پھسلتا ہوا نیچے گر پڑا۔ اس کا خون شیشے پر لگ گیا تھا۔ وسط ایشیائی نے سرد لہجے میں کہا۔ "میرا خیال ہے اب تم لوگوں کو فیصلہ کرنے میں آسانی ہو گی۔ اب ہر آدھے گھنٹے بعد ایک یرغمالی اسی طرح مارا جاتا رہے گا۔ تم لوگ شوق سے میٹنگ اور فیصلے کرتے رہو۔" اس نے یہ کہہ کر فون پٹخ دیا۔

☆☆☆

بزنس مین اکرم رضی کے مارے جانے کا منظر ساری قوم نے دیکھا تھا اور وزیر داخلہ ٹی وی پر یہ منظر دیکھ رہا تھا۔ وہ وزیراعظم سے رابطے میں تھا۔ "اب آپ بتایئے کہ ہم کیا کریں۔" اس نے کہا۔ "صوبائی حکومت کا خیال ہے کہ آپریشن کیا جائے۔"

"اس صورت میں کوئی نہیں بچے گا۔" پی ایم نے کہا۔

"تب کیا ان کا مطالبہ تسلیم کر لیا جائے؟"

"بالکل نہیں۔ اس صورت میں دنیا کو بہت غلط پیغام جائے گا۔ اگر ہم اسی طرح دہشت گردوں کے سامنے جھکتے رہے تو باہر کے لوگ ہم پر اعتماد کیسے کریں گے اور یہاں کون سرمایہ کاری کرے گا؟"

وزیر داخلہ سمجھ رہا تھا کہ معاملہ رفتہ رفتہ خون ریزی کی طرف جا رہا ہے۔ دہشت گردوں نے ایک اور آدمی کی جان لے کر واضح کر دیا تھا کہ وہ پوری تیاری سے آئے تھے اور ان کے مطالبات نہ مانے گئے تو وہ کچھ بھی کر سکتے تھے۔ ایسے میں جبکہ حکومت کسی صورت ان دہشت گردوں کو رہا نہیں کر سکتی تھی جنہوں نے بہت بڑے جرائم کیے تھے اور ایک ایک آدمی درجنوں کا قاتل تھا۔ تو سوائے آپریشن کے اور کیا چارہ رہ جاتا تھا۔ وزیراعظم نے کہا۔ "اسپیشل سیل کے لیے جو آدمی بھیجا گیا تھا کیا نام ہے اس کا؟"

"عمران سجاد۔" وزیر داخلہ نے کہا۔ "بدقسمتی سے وہ بھی عمارت کے اندر تھا اور آخری اطلاع کے مطابق وہ پکڑا گیا ہے لیکن اس نے ایک ٹریپ لگا دیا ہے۔ اس نے اپنا موبائل فون اس طرح پلانٹ کیا ہے کہ وہاں ہونے والی تمام گفتگو سنائی دے رہی ہے۔"

"یہ بہت کام کی اطلاع ہے۔" پی ایم نے مضطرب لہجے میں کہا۔ "یقیناً اس نے اندر سے قیمتی معلومات فراہم کی ہوں گی؟"

"اس کا رابطہ اپنے نائب سے رہا ہے۔ اس کا کہنا ہے کہ عمران سجاد جب تک آزاد تھا، مجھ سے بات کرنا چاہتا تھا لیکن بدقسمتی سے نائب کی پہنچ مجھ تک نہیں تھی۔"

"صوبائی حکومت اور آئی جی کیا کر رہے تھے۔" پی ایم برہم ہو گئے۔ "یہ ان کی نااہلی ہے اور اب بھی وہ کچھ کرنے کو تیار نہیں ہیں۔ اس وقت اسٹاک مارکیٹ تقریباً کریش ہو چکی ہے۔ مجھے مشورہ دیا جا رہا ہے کہ اسے بچانے کے لیے ٹریڈنگ روک دی جائے۔"

کیونکہ یہ اس کا شعبہ نہیں تھا اس لیے اس نے کچھ نہیں کہا۔ "میں پھر نائب سے بات کرتا ہوں اور اس کے بعد آپ کو صورت حال بتاتا ہوں۔"

ایک منٹ بعد اختر فون پر وزیر داخلہ سے رابطے میں تھا۔ اس نے کہا۔ "جناب باس نے اندر سے مجھے کہا تھا کہ میں ایلیٹ فورس کا دستہ بلوا لوں اور بلڈنگ کے دائیں طرف موجود کارگو لفٹ سے اندر گھسنے کی کوشش کروں۔"

"تو تم نے ایسا کیوں نہیں کیا؟"

"آئی جی نے مجھے حکم دیا ہے کہ اس جگہ سے ہٹا دیا ہے۔" اختر نے اپنی مجبوری بیان کی۔ "میں کوئی کارروائی کرنے کی اتھارٹی نہیں رکھتا ہوں۔"

"میں تمہیں اتھارٹی دے رہا ہوں فوری طور پر اپنے آدمی اندر بھیجنے کی کوشش کرو لیکن رازداری کا خیال رہے۔" اختر خوش ہو گیا۔ "لیکن وزیرِ اعظم...."

"اسے میں دیکھ لوں گا۔" وزیرِ داخلہ نے فیصلہ کن انداز میں کہا۔ "اب وہاں کے انچارج تم ہو۔ کچھ دیر میں رینجرز اور آرمی کے دستے وہاں پہنچ رہے ہیں۔ پولیس کو ہٹا دیا جائے گا۔"

چند منٹ بعد عمران.... کے شعبے کا خصوصی دستہ جو اٹھارہ افراد پر مشتمل اور اس قسم کی صورتِ حال سے نمٹنے کے لیے پوری طرح تربیت یافتہ تھا، دیوار پھلانگ کر بلڈنگ کی پچھلی گلی میں آ گیا تھا۔ ان کے پاس فولاد کاٹنے کے لیے گیس ویلڈنگ کے آلات بھی تھے۔ دوسری طرف وزیرِ داخلہ خود دہشت گردوں کے سرغنہ کو کال کر رہا تھا۔

☆☆☆

ریسپشن کے فون کی گھنٹی بج رہی تھی۔ ایک بج کر بیس منٹ ہو چکے تھے۔ وسط ایشیائی بظاہر گھنٹی سے بے نیاز کمپیوٹر پر اسی ویب سائٹ کا جائزہ لے رہا تھا اور اس کے انداز سے لگ رہا تھا کہ وہ مطمئن ہے کہ اس کا مقصد پورا ہو رہا ہے۔ یہاں اسے کوئی دیکھنے والا نہیں تھا اس لیے وہ سر ہلا رہا تھا۔ اچانک اس کے ایک آدمی نے کہا۔ "باس باہر ایک آدمی کچھ دکھا رہا ہے۔"

وسط ایشیائی ریسپشن کے پیچھے سے نکل کر داخلی دروازے تک آیا۔ وہاں سادہ لباس میں ایک شخص کارڈ بورڈ اٹھائے کھڑا تھا جس پر لکھا تھا۔ "انٹیریئر منسٹر کالنگ یو پلیز پک دی کال۔" کچھ دیر بعد آدمی نے بورڈ گھمایا، دوسری طرف یہی جملہ اردو میں لکھا ہوا تھا۔ وسط ایشیائی نقاب تلے مسکرایا۔ وہ پلٹ کر ریسپشن کی طرف آیا اور ریسیور اٹھایا۔ "اوہ.... جناب وزیرِ داخلہ صاحب.... مجھے اپنی قسمت پر یقین نہیں آ رہا ہے۔"

"تم اپنی قسمت کو دوبارہ آزما سکتے ہو۔" وزیر نے بے تکے انداز میں کہا۔

"کیا مطلب؟"

"مطلب یہ کہ ہم کوشش کر رہے ہیں کہ تمہارے مطالبات کو پورا کیا جائے لیکن یہ بات تم بھی سمجھتے ہو کہ اس میں کئی دشواریاں ہیں۔"

"ان ہی دشواریوں کو دور کرنے کے لیے ایک یرغمالی اپنی جان سے گیا۔"

"خون بہانا کسی مسئلے کا حل نہیں ہوتا ہے۔ تم یقین کرو اگر ہم نے طاقت کے استعمال کا فیصلہ کر لیا تو نتیجہ کچھ بھی نکلے کوئی ہمیں برا نہیں کہے گا۔ تم میری بات سمجھ رہے ہو نا؟ دہشت گردی کے خلاف لوگوں کی قوتِ برداشت کم ہوتی جا رہی ہے۔"

وسط ایشیائی سمجھ رہا تھا۔ اس نے سر کو خفیف سی جنبش دی۔ "میں سمجھ رہا ہوں لیکن تم لوگ نہیں سمجھ رہے ہو۔ اتنے گھنٹے بہت ہوتے ہیں۔"

"فیصلہ ساز اتھارٹی میں تاخیر ہو رہی تھی۔ اب یہ مسئلہ میرے ہاتھ میں ہے اس لیے ہم تم سے بات کرنے کے لیے تیار ہیں۔"

"میں نے سنا ہے آپ کو مذاکرات کا کھیل کھیلنے کا بہت شوق ہے۔" اس نے استہزائیہ انداز میں کہا۔ "مگر میرے ساتھ یہ کھیل نہیں چلے گا۔ آپ کے پاس دس منٹ ہیں۔"

"نہیں پلیز.... اس طرح تم مشکل پیدا کر رہے ہو۔ اس کے برعکس تم نرمی کا مظاہرہ کرو گے تو تمہارے مطالبات ماننے میں آسانی رہے گی۔"

"مجھے مطالبات منوانے کے لیے نرمی کا مظاہرہ کرنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے جبکہ میں سختی کر کے اپنے مقاصد حاصل کر سکتا ہوں۔ افسوس آپ نے ایک اور زندگی اپنی سست روی کی نذر کر دی ہے۔ آپ سے بیس منٹ بعد بات ہو گی۔ اس سے اگلے یرغمالی کے بارے میں۔" اس نے ریسیور رکھا اور ریسپشن سے باہر آیا۔ اس نے تمام... یرغمالیوں کا جائزہ لیا۔ پھر اس نے یوسف کو اشارہ کیا اسے بھی جیکٹ نہیں پہنائی گئی تھی۔ اس کے اشارے پر یوسف اٹھ کر سامنے آیا اور اس نے بے خوفی سے کہا۔

"کیا اب میری باری ہے؟"

"بالکل درست اور مجھے تمہاری بہادری پسند آئی ہے اس لیے تمہارے سر پر گولی ماری جائے گی تاکہ تم فوراً موت سے ہمکنار ہو جاؤ۔"

"ہم میں سے کوئی نہیں بچے گا آج۔" موسیٰ بھائی دوسروں سے کہہ رہا تھا۔ "اپنا اندر کا بیلنس شیٹ بھی بنانا ہے۔"

"تو اب موسیٰ بھائی اپنا بیلنس شیٹ فی الحال بند

رکھو۔" وسط ایشیائی نے اسی کے لہجے میں کہا اور یوسف کو آگے دھکیلا۔ عمران ۔۔۔ نے کہا۔

"یہ تم اچھا نہیں کر رہے ہو اس طرح تم باہر والوں کو طاقت کے استعمال کا جواز دو گے۔"

"اس کے برعکس میرا یقین ہے کہ میں اپنا مقصد حاصل کر لوں گا۔" وسط ایشیائی نے سرد لہجے میں کہا اور یوسف کو بیرونی شیشے کی دیوار کے پاس لے گیا۔ چند لمحے بعد ایک فائر کی آواز آئی اور پھر خاموشی چھا گئی۔ ان سب کی حالت خراب ہو گئی تھی۔ وسط ایشیائی واپس آیا تو عمران ... کا چہرہ اور آنکھیں سرخ ہو رہی تھیں۔ وہ ضبط کر رہا تھا۔ وسط ایشیائی کچھ دیر اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر گھورتا رہا پھر ریسپشن کی طرف چلا گیا۔ عمران ۔۔۔ نے کچھ دیر بعد کہا۔

"تمہیں یقین ہے، تم نے اس عمارت کو مکمل طور پر ٹھیک کور کر لیا ہے؟"

"ہاں یہ عمارت مکمل طور پر ہمارے قبضے میں ہے۔"

"تم بھول رہے ہو اس عمارت کی چھت پر چار عدد پولیس اسنائپر موجود ہیں۔"

"پولیس اسنائپر۔" اس نے آہستہ سے کہا۔ "یا صرف پولیس کی وردی اور ہتھیار ار چھت پر موجود ہیں۔"

عمران کا دل ایک لمحے کو رکا۔ اسے شروع سے یہ خدشہ تھا۔ اسے یقین نہیں تھا کہ جو لوگ اتنی باریک بینی سے منصوبہ بنا کر آئے ہیں، انہوں نے چھت کے اسنائپرز کو آزاد چھوڑ دیا ہوگا۔ اس نے زور سے چبا کر کہا۔ "تم نے ان چاروں کو بھی مار دیا ہے۔ ان کی جگہ تمہارے آدمی ہیں چھت پر۔"

وسط ایشیائی ہنسا۔ "اس میں چلانے کی کیا بات ہے جب ہم نے ایک درجن پولیس والے مارے ہیں۔ ان کے علاوہ آٹھ افراد اور مارے جا چکے ہیں تو ان چار کے مارے جانے پر اتنا تعجب کیوں ہے؟"

"کیونکہ باہر والے سمجھ رہے ہیں کہ وہ پولیس اسنائپر ہیں۔" عمران ۔۔۔ نے اس بار بھی نسبتاً بلند آواز سے کہا لیکن چلایا نہیں تھا اسے امید تھی کہ اس کی آواز دوسری طرف سنی گئی ہوگی۔ وہ اس گملے سے چھ سات فٹ کے فاصلے پر تھا جس میں اس نے موبائل اور پستول چھپایا تھا۔ عمران ... سمجھ رہا تھا کہ دہشت گرد مشکل سے کسی کو چھوڑیں گے۔ ان کی زندگیاں صرف ایک صورت میں بچ سکتی ہیں کہ باہر سے مداخلت کی جائے لیکن پولیس سے اسے توقع نہیں تھی کہ وہ کوئی ٹھوس حکمت عملی بنا سکتے ہیں۔ وہ سوچ رہا تھا کہ کاش وہ باہر ہوتا تو کچھ کر سکتا تھا لیکن باہر ہونے کی صورت میں وہ اتنا باخبر نہ ہوتا۔ یہ اور بات تھی کہ اندر رہ کر وہ اس باخبری کا اتنا فائدہ نہیں اٹھا سکتا تھا۔

☆☆☆

آئی جی کا موڈ آف تھا کیونکہ وزیر داخلہ نے معاملہ اپنے ہاتھ میں لیتے ہوئے اختر کو انچارج بنا دیا تھا۔ آئی جی، نعمان اور اختر کمیونیکیشن وین میں تھے۔ یہاں اختر مسلسل ایلیٹ ٹیم سے رابطے میں تھا۔ انہوں نے تھیس بلڈنگ سے کارگو لفٹ والے راستے کے فولادی گیٹ کی چولیں کاٹنا شروع کر دی تھیں۔ اندر جانے کے لیے کم سے کم تین چولیں کاٹنا لازمی تھیں کیونکہ ہر چول چھ انچ کی تھی۔ آئی جی نے کہا۔

"ہم فضا سے حملہ کر سکتے ہیں ہیلی کاپٹر والوں سے تیزی سے اتر سکتے ہیں اور پھر نیچے جا کر دہشت گردوں کا صفایا کر سکتے ہیں۔"

"سر.... یہ کام کون کرے گا؟"

"آرمی کا دستہ۔" آئی جی نے فوراً ذمے داری لینے سے انکار کر دیا۔

"آرمی حاضر ہے۔" وین کے دروازے سے آواز آئی اور کرنل کے رینک لگائے ایک ادھیڑ عمر شخص اندر آیا۔ اس نے آئی جی کی طرف ہاتھ بڑھایا۔ "کرنل ادریس مظفر۔"

آئی جی نے بے دلی سے اس سے ہاتھ ملایا اور اختر کی طرف اشارہ کیا۔ "مین آف ایکشن۔"

اختر نے اس سے ہاتھ ملایا۔ "آرمی اس سلسلے میں ہماری کیا مدد کر سکتی ہے؟"

"ہر قسم کی۔" کرنل نے کہا۔

"فضائی حملہ ممکن ہے۔" آئی جی نے کہا۔ "انہیں ہیلی کاپٹر سے نشانہ بنایا جا سکتا ہے؟"

"نہیں اس کے لیے نزدیک جانا پڑے گا اور اسنائپرز زیادہ بہتر پوزیشن میں ہوں گے۔ اگر وہ تربیت یافتہ ہیں تو ان کا نشانہ لینے کے لیے پڑ جائیں گے۔" کرنل نے نفی میں سر ہلایا۔ "ہاں کمانڈو دستہ اتارا جا سکتا ہے لیکن اس میں بھی شدید لڑائی اور جانی نقصان کا امکان ہے۔"

"اس سے زیادہ خطرناک بات یہ ہوگی کہ نیچے موجود دہشت گرد جان جائیں گے اوپر والوں سے یقیناً ان کا رابطہ ہوگا۔" اختر نے کہا۔

"آپ کیا کر رہے ہیں؟"

"میرا شعبہ کام کر رہا ہے، ہمارا چیف اندر پھنسا ہے لیکن وہ ہم سے یک طرفہ رابطے میں ہے۔"

"وہ کیسے؟"

اختر نے کرنل کو بتایا کہ عمران سجاد کس طرح سے ان سے رابطے میں تھا اور اس کی مدد سے انہیں اندر کی بہت سی اہم باتوں کا علم ہوا ہے۔ شعبے کا ایلیٹ دستہ اس وقت این بی پی میں گھسنے کی تیاری کر رہا تھا۔ کرنل نے سر ہلایا۔ "یہ کام ہو سکتا ہے لیکن دہشت گردوں کو بے خبر رکھنا ضروری ہے۔ میرے ساتھ بیک اپ ٹیم ہے۔ رینجرز نے پورے علاقے اور آس پاس کی عمارتوں کا کنٹرول سنبھال لیا ہے۔ اب اسنائپر اور مشین گنز آدمی کے ہیں۔"

اختر نے ویڈیو پر ایلیٹ ٹیم کے سربراہ سے پوچھا۔ "فرار کا کام کہاں تک ہوا؟"

"ایک کٹ گئی ہے اور دوسری بھی ایک طرف سے کاٹ دی ہے سمجھ لیں آدھا کام ہو گیا ہے پندرہ منٹ میں۔ مزید پندرہ منٹ بعد ہم اندر ہوں گے۔"

اختر نے گھڑی دیکھی، پونے دو بج رہے تھے۔ اگلے یرغمالی کے مارے جانے میں پندرہ منٹ کا وقت باقی تھا۔ ابھی تک دہشت گردوں نے اپنے رویے میں کوئی لچک نہیں دکھائی تھی۔ انہوں نے مسلسل سخت رویہ دکھایا تھا اور درجن سے اوپر افراد کی ہلاکت کا باعث بن چکے تھے۔ کمیونیکیشن روم میں ایک طرف کی پارٹیشن پر مختلف چینلز دکھائے جا رہے تھے۔ اس معاملے میں دہشت گردوں نے میڈیا کو براہ راست ملوث رکھا تھا۔ وہ انہیں اپ ڈیٹ کر رہے تھے اور جو بات سرکاری میڈیا سے چھپا رہی تھی، وہ ان کی طرف سے میڈیا کو مل رہی تھی۔ دروازہ کٹنے میں وقت لگ رہا تھا۔ اس کا مطلب تھا کہ کم سے کم ایک یرغمالی اور اپنی جان سے جائے گا۔ اگر دہشت گرد اپنی دھمکی پر قائم رہتے۔

☆☆☆

ایک بج کر پچاس منٹ پر وزیر داخلہ نے پھر کال کی۔ وسط ایشیائی نے کال ریسیو کی۔ "کیا سوچا تم لوگوں نے....."

"پی ایم کی زیر صدارت اجلاس جاری ہے۔" وزیر داخلہ نے کہا۔ "اس میں فیصلہ ہوگا۔"

وسط ایشیائی نے سرد لہجے میں پوچھا۔ "فیصلے میں مزید کتنا وقت اور جانیں لگیں گی؟"

"دیکھو اگر تم اسی رفتار سے یرغمالیوں کو مارتے رہے تو تمہارے پاس کچھ نہیں بچے گا۔"

"تم ٹھیک کہہ رہے ہو۔" خلاف توقع وسط ایشیائی نے تسلیم کیا۔ "اب مجھے بتاؤ کہ فیصلہ کب تک ہوگا؟"

"اس میں کچھ وقت لگ سکتا ہے۔" وزیر داخلہ نے کہا۔ "تم نے یہ پلان تیار کیا ہے اور اپنی جان داؤ پر لگا کر آئے ہو اسی طرح تمہیں سمجھنا چاہیے کہ ہم بہت سے بہت کچھ اپنا داؤ پر لگا کر ہی کسی فیصلے پر پہنچ سکتے ہیں۔"

"میں سمجھ رہا ہوں۔" اس نے کہا۔ "میں چار بجے تک کی مہلت دے رہا ہوں۔"

وزیر داخلہ خوش ہو گیا۔ "میں تمہارا شکر گزار ہوں، ایک درخواست اور ہے۔ یرغمالیوں کے ساتھ بہتر سلوک کیا جائے۔ انہیں کھانے پینے اور واش روم کی سہولت دی جائے۔ وہ ساڑھے چار گھنٹے سے اسی پوزیشن میں ہیں۔"

"ٹھیک ہے، میں ان کا خیال رکھوں گا۔" وسط ایشیائی نے کہا۔ "لیکن یہ بتا دوں کسی قسم کی مہم جوئی کے آغاز میں ہی یہ سب مارے جائیں گے اور ہم تو آئے ہیں مرنے کا سوچ کر..... اس لیے اگر کسی کارروائی کا ارادہ ہو تو اسے فوری طور پر روک دو۔ گیند اب تمہارے کورٹ میں ہے۔"

"کوئی کارروائی نہیں ہوگی۔" وزیر داخلہ نے یقین دلایا۔

☆☆☆

وزیر داخلہ نے اختر کو کال کی۔ "ایلیٹ دستے کو روک دیا جائے۔"

"سر! اس نے گیٹ کھول لیا ہے اور وہ لفٹ والے حصے میں داخل ہو گئے ہیں۔"

"فی الحال انہیں وہیں روک دیا جائے۔" اس نے سخت لہجے میں کہا۔ "دہشت گردوں سے بات جاری ہے ہمیں چار بجے تک کی مہلت مل گئی ہے۔"

اختر اور دوسرے حیران رہ گئے۔ دہشت گردوں نے یوٹرن لیا تھا اچانک وہ نہ صرف یرغمالیوں کی ہلاکت سے رک گئے تھے بلکہ انہوں نے حکومت کو مطالبات پر غور کرنے کی مہلت بھی دے دی تھی۔ اختر نے کہا۔ "یس سر! میں انہیں اسٹینڈ بائی کر دیتا ہوں۔"

اختر ایلیٹ دستے کو نئی ہدایات دے رہا تھا کہ آئی جی نے ٹی وی کی طرف اشارہ کیا۔ "یہ کیا کہہ رہے ہیں، آواز کھولو۔"

آپریٹر نے آواز کھولی تو نیوز کاسٹر بتا رہا تھا۔ این بی پی پر قبضہ کرنے والوں کی طرف سے تازہ پیغام ملا ہے کہ انہوں نے یرغمالیوں کی ہلاکت روک دی ہے اور حکومت کو چار بجے تک مہلت دی ہے کہ وہ فیصلہ کر لے۔ اختر بے چینی

سے سن رہا تھا۔ کرنل بھی سوچ میں پڑ گیا۔ اس نے کہا۔ ''یا تو دہشت گردوں کا باہر اپنے موجود ساتھیوں سے رابطہ ہے۔''

''میرا خیال ہے ایسا ہی ہے۔'' آئی جی نے سر ہلایا۔

''یا کیا جناب؟'' اختر نے پوچھا۔

''یا پھر یہ فیصلہ بھی نپا تلا تھا۔ انہوں نے پہلے سے طے کیا ہوا ہے کہ کس وقت کیا کرنا ہے۔ وہ ویسا ہی کر رہے ہیں۔''

''مگر کیوں؟'' اختر نے سوال کیا۔ ''ان کا مقصد کیا ہے؟''

وہ سب سوچ رہے تھے کہ دہشت گردوں کا مقصد کیا ہے' جو وہ بتا رہے ہیں یا ان کا اصل مقصد چھپا ہوا ہے۔

☆☆☆

یہی بات عمران سجاد سوچ رہا تھا۔ اس نے نقاب پوش کو وزیر سے بات کرتے سنا تھا اور وہ بھی حیران تھا۔ جب یہ سارا معاملہ شروع ہوا تو اسے لگا کہ یہ دہشت گردی کی عام واردات ہے جس سے سارا ملک آئے دن دوچار رہتا ہے۔ مگر اب اسے لگ رہا تھا ان لوگوں کا مقصد کچھ اور تھا اور وہ جس طرح سے یہ سارا کھیل کھیل رہے تھے، وہ بہت نپا تلا اور پہلے سے سوچا ہوا تھا۔ عمران نے بھی محسوس کیا کہ اچانک بہت سخت رویے سے یوں نرم پڑ جانا بھی حالات کی وجہ سے نہیں تھا بلکہ یہ پہلے سے طے شدہ ہوا تھا۔

وزیر داخلہ سے بات کر کے وسط ایشیائی دوبارہ ریسپشن کے کمپیوٹر پر آیا۔ اس نے ویب سائٹ چیک کی اور پھر ایک یو ایس بی نکال کر اسے کمپیوٹر سے منسلک کر کے ایک پروگرام چلایا۔ اس پروگرام نے کمپیوٹر میں گزشتہ چار گھنٹے میں استعمال کا سارا ڈیٹا اڑا دیا تھا۔ اب کوئی معلوم نہیں کر سکتا تھا کہ اس کمپیوٹر سے کیا کام لیا گیا تھا۔ یہ کام کر کے وہ یرغمالیوں کی طرف آیا۔ ان میں سے کئی کے چہرے بتا رہے تھے کہ وہ ضبط کی خاصی اوپری منزلوں سے گزر رہے تھے۔ وسط ایشیائی نے کہا۔ ''تمہارے لیے خوش خبری ہے۔''

''پلیز مجھے واش روم جانا ہے۔'' ایک بزنس مین نے التجا کی۔

''ابھی سب کو موقع ملے گا۔ پہلے تم جاؤ گے۔'' اس نے کہا اور اپنے ساتھیوں کی طرف دیکھا۔ ان میں سے چار الگ ہوئے اور ان میں سے چار افراد کو لے کر بیسمنٹ کی طرف چلے گئے۔ یہ بھی پہلے سے طے شدہ لگ رہا تھا۔ پھر ایک بیگ کھولا گیا جس میں کھانے اور پینے کا سامان تھا۔ سب کو پانی اور کھانے کی چیزیں دی گئی تھیں۔ حالانکہ پہلے اس نے پی ایم کی... درخواست پر پانی کی موجودگی سے انکار کیا تھا۔ سوائے موبی بھائی کے سب نے لی تھیں۔ اس نے انکار کر دیا۔

''اب کیا کرے گا کھا کر، ساری عمر کھایا پر کس کام آیا۔ اپنا باڈی دیکھ رہا ہے۔''

''موبی بھائی پانی لے لو۔'' عمران نے کہا۔

''کیا فائدہ ایسا پانی کہ آدمی پی کر بھی پیاسا رہے۔''

''لگتا ہے موبی بھائی ساری عمر کا فلسفہ آج ہی بول لیں گے۔'' ایک بزنس مین نے مسکرا کر کہا۔ ان لوگوں کی اب جان میں جان آئی تھی۔ اس سے پہلے تو سب کی حالت خراب تھی۔ پہلا گروپ واپس آیا تو دوسرا گروپ گیا۔ اس میں پی ایم اور ان کے مشیر بھی شامل تھے۔ ان کی واپسی دس منٹ بعد ہوئی اور پھر آخری گروپ گیا۔ عمران نے جانے سے انکار کر دیا۔ وہیں سے تو بگڑ گیا۔

جب آخری گروپ واش روم سے آیا تو ڈھائی بج رہے تھے۔

☆☆☆

پی ایم کی قیادت میں اجلاس جاری تھا جس میں اعلیٰ سیکیورٹی حکام بھی شریک تھے۔ دہشت گردوں کی طرف سے یک دم نرمی اور چار بجے تک کی مہلت زیر بحث تھی۔ سیکیورٹی ماہرین کا کہنا تھا کہ اس میں ان کی کوئی چال بھی ہے کیونکہ اب تک وہ غیر معمولی سخت رویے کا مظاہرہ کرتے آئے تھے۔ مگر پی ایم اور وزیر داخلہ نے ان کی رائے پر زیادہ توجہ نہیں دی تھی۔ وہ خوش تھے کہ معاملات بغیر خون خرابے کے حل ہونے کا امکان پیدا ہو چلا تھا۔

عمران سجاد کا موبائل کام کر رہا تھا اور وہ کسی حد تک وہاں ہونے والی گفتگو سن رہے تھے۔ یہ گفتگو وزیراعظم کے اجلاس میں بھی ریلے کی گئی تھی۔ عمران کے شعبے کے ایلیٹ دستے کو کارروائی سے روک دیا گیا تھا لیکن وہ این بی ٹی کے اندر رسائی میں کامیاب ہو گیا تھا۔ اگر ضرورت پڑتی تو انہیں استعمال کیا جا سکتا تھا۔ کیونکہ ایکشن کی صورت بڑی تباہی لازمی تھی۔ ایک گھنٹے کے اجلاس اور گرما گرم بحث کے بعد بھی معاملہ وہیں اٹکا ہوا تھا۔ سیکیورٹی حکام دہشت گردوں کی رہائی کے خلاف تھے جبکہ سیاست داں اور وزرا ان کی رہائی کے حق میں تھے۔ بالآخر وزیراعظم نے اکثریت کی رضامندی سے یہ ٹاسک وزیر داخلہ کے سپرد کر دیا کہ وہ

دہشت گردوں سے مذاکرات کی کوشش کرے اور اگر کوئی صورت نہ نکل سکے تو پھر وہی فیصلہ بھی کرے کہ آگے کیا کرنا ہے۔

☆☆☆

وزیرداخلہ نے تین بجے پر کال کی۔ "ہم کوشش کر رہے ہیں کہ صوبائی اور وفاقی حکام تمہاری فہرست میں شامل افراد کی رہائی پر آمادہ ہو جائیں۔"

"اور وہ نہ آمادہ ہوئے تو۔"

"تب تمہیں اپنے مطالبے میں لچک لانا ہوگی کیونکہ آپریشن کا فیصلہ ہوا تو نہ تمہیں کچھ ملے گا اور نہ ہمیں۔"

"جب تم یہ بات جانتے ہو تو..."

"پلیز تم ہماری پوزیشن پر غور کرو۔ حکومت پر آپریشن کے لیے بہت دباؤ ہے اس کے باوجود ہم چاہتے ہیں کہ یہ مسئلہ مزید خون بہائے بغیر حل کر لیا جائے۔"

"ایسا لگ رہا ہے تم میری نرمی کا غلط مطلب نکال رہے ہو۔"

"نہیں.... میں کہہ رہا ہوں ہماری مشکل سمجھنے کی کوشش کرو۔ ہمارے لیے طاقت کا استعمال زیادہ آسان ہے لیکن ہم ایسا کرنا نہیں چاہتے ہیں۔"

"دوسرے لفظوں میں تم ان درجن افراد کو رہا نہیں کرو گے؟" وسط الشبابی نے سوچتے ہوئے کہا۔ "ہمارا ایک مطالبہ اور بھی تھا وہ کب پورا ہوگا؟"

"رقم کا مطالبہ پورا کیا جا سکتا ہے۔" وزیرداخلہ پر امید ہو گیا۔

"ٹھیک ہے رقم یہاں پہنچا دی جائے۔ اس کے بعد ہم فیصلہ کریں گے کہ اب کیا کرنا ہے۔"

"تم دس منٹ انتظار کرو میں بتاتا ہوں کہ رقم کتنی دیر میں پہنچ جائے گی۔"

"رقم پانچ ہزار کے استعمال شدہ نوٹوں پر مشتمل ہونی چاہیے۔"

"پچاس کروڑ بڑی رقم ہے لیکن اس کا جلد بندوبست کیا جا سکتا ہے۔" وزیرداخلہ نے کہا تو اس نے ریسیور رکھ دیا۔ اگر کوئی اس وقت وسط الشبابی کا چہرہ دیکھ سکتا تو اسے اس کی مسکراہٹ صاف دکھائی دیتی۔ وہ باہر آیا تو اسے عمران... کسی فکر میں گم نظر آیا وہ اس کی اور وزیرداخلہ کی گفتگو سن رہا تھا۔

☆☆☆

وفاقی بینک کے حکام سے رابطہ کر کے پوچھا گیا کہ پانچ ہزار کے استعمال شدہ نوٹوں پر مشتمل پچاس کروڑ روپے کی رقم کتنی دیر میں فراہم کی جا سکتی ہے۔ وہاں سے بتایا گیا کہ یہ رقم کم سے کم دو گھنٹے میں فراہم کی جا سکے گی۔ وزیرداخلہ نے رقم کی فراہمی کا حکم دیا۔ وزارت خزانہ حکام حرکت میں آ گئے۔ متعلقہ بینک افسران وہاں پہنچ رہے تھے اور استعمال شدہ نوٹ سیف والٹ سے نکال کر ان کی گنتی شروع کر دی گئی تھی۔ ایک خاص حفاظتی وستہ بینک پہنچ گیا تھا۔ وہ یہ رقم لے کر این ٹی ٹی تک پہنچاتا۔ وزیرداخلہ کو امید تھی کہ رقم ملنے کے بعد دہشت گردوں کا رویہ نرم ہو جائے گا اور وہ اپنے مطالبے پر ڈٹے رہنے کے بجائے اپنی جان بچانے کی فکر کریں گے۔ اس نے کال کر کے ان کے سرغنہ کو اطلاع دی۔

"رقم چھ بجے تک وہاں پہنچ جائے گی۔"

"رقم کے ساتھ ہمیں ایک بڑا آرمرڈ ٹرک بھی چاہیے۔" وسط الشبابی نے مطالبہ کیا۔

"رقم اسی میں آئے گی۔"

"رقم تین بیگوں میں مساوی مقدار میں ہونی چاہیے۔ ہم پہلے اسے چیک کریں گے۔"

"تم اپنی تسلی کر سکتے ہو۔" وزیرداخلہ نے کہا۔ "ہمیں یرغمالیوں کے بارے میں تشویش ہے میں سی ای او سے بات کرنا چاہتا ہوں۔"

خلاف توقع وسط الشبابی مان گیا۔ اس نے اشارے سے سی ای او کو بلایا۔

سی ای او نے آکر ریسیور لیا۔ "بابا آپ لوگ کیا کر رہے ہو؟" اس نے تلخی سے کہا۔

"ہم آپ کو اور باقی یرغمالیوں کو آزاد کرانے کی کوشش کر رہے ہیں۔" وزیرداخلہ نے نرمی سے کہا۔ "مجھے امید ہے ہم جلد کامیاب ہو جائیں گے۔"

"یہ جو انہوں نے جسم پر بم باندھا ہوا ہے۔"

"یہ بھی اتر جائے گا ایک بار آپ کو آزاد کرا لیا جائے تو سب ہو جائے گا۔ رقم والا مطالبہ مان لیا ہے۔ وہ چھ بجے تک وہاں پہنچ جائے گی۔"

ساڑھے چار بج گئے تھے۔ وسط الشبابی نے سی ای او سے ریسیور لے کر اسے واپس اپنی جگہ کا حکم دیا۔ اس کے بعد اس نے اپنے دو ساتھیوں کو اشارہ کیا اور وہ لابی نمبر تین میں آ گئے۔ یہاں وسط الشبابی نے دھیمی آواز میں کہا۔

"پلان نو پر عمل شروع کر دو۔"

اس کے ساتھیوں نے سر ہلایا۔ ان میں سے ایک

لانبا نمبر ٹین کی سیڑھیوں کی طرف بڑھ گیا اور دوسرا لانبا نمبر دو کی طرف چلا گیا۔ خود وسط الشبانی جیسجٹ میں آیا۔ اس نے سائلنسر زدہ پستول سے فائر کر کے کنٹرول روم کا لاک توڑا اور اندر داخل ہو گیا۔ اس نے سسٹم آن کیا اور اس کے بعد لانبا نمبر ٹین کی لفٹ نمبر چار آن کر دی۔ یہ کام کر کے وہ باہر آ گیا۔ آدھے گھنٹے بعد اس کے دونوں ساتھی بھی واپس آ چکے تھے اور انہوں نے سروں کی خفیف جنبش سے بتایا کہ کام ہو گیا ہے۔ اس وقت سوا پانچ بج رہے تھے۔ باہر سورج ڈوبنے کے قریب تھا اور چھ بجے تک لازمی تاریکی چھا جاتی کیونکہ آسمان پر بدستور گہرے بادل تھے۔ ساڑھے پانچ بجے اسے اطلاع ملی کہ رقم روانہ ہو چکی ہے۔ وزیرِ داخلہ کے بجائے یہ اطلاع آئی جی نے دی تھی اور اس نے مطالبہ کیا کہ خیر سگالی کے طور پر وہ بھی چند یرغمالیوں کو رہا کر دیں مگر وسط الشبانی نے یہ مطالبہ مسترد کر دیا۔ اس نے کہا۔

''پولیس آفیسر یا تو سب آزاد ہوں گے یا نہیں ہوں گے۔ یہ ہماری مرضی سے کھیلا جائے گا۔ رقم آنے سے پہلے تمام سیکورٹی اہلکاروں کو اینا ٹی بی سے کم سے کم دو سو گز دور ہٹا لیا جائے۔ ٹرک سیڑھیوں تک لایا جائے گا۔ ٹرک میں صرف ایک آدمی ہو گا جو ڈرائیو کرے گا اور وہی رقم اندر لائے گا۔''

آفیسر نے اعتراض کیا۔ ''رقم زیادہ ہے، ایک آدمی نہیں لا سکتا۔''

''وہ باری باری تینوں بیگ لا سکتا ہے۔'' وسط الشبانی نے اعتراض مسترد کر دیا۔ ''کوئی دوسرا آدمی نظر نہیں آنا چاہیے۔''

''اوکے کوئی دوسرا آدمی نہیں آئے گا۔'' آفیسر نے یقین دہانی کرائی۔ ''اس بات کی کیا ضمانت ہے کہ رقم ملنے کے بعد یرغمالی رہا کر دیے جائیں گے۔''

''کوئی ضمانت نہیں ہے۔ پہلے رقم مل جائے اس کے بعد بات کی جائے گی۔'' وسط الشبانی نے کہا اور گھڑی دیکھتے ہوئے ریسیور رکھ دیا۔ پونے چھ بج رہے تھے۔ وہ ریسپشن سے نکل کر یرغمالیوں کے پاس آیا۔ اس نے سب کا جائزہ لیا۔ موسیٰ بھائی جو اپنے سینے پر بندھے بم پر ہاتھ رکھے بیٹھا اس نے اچانک کہا۔

''مجھے کچھ کہنا ہے۔''

''کیا کہنا ہے؟''

''ادھر نہیں کہنا پاس آ کر کہنا ہے۔''

''اوکے ادھر آؤ۔'' وسط الشبانی نے اسے اجازت دی۔ موسیٰ بھائی اٹھا اور وسط الشبانی کے پاس آیا۔ تب اس نے دیکھا بم کا پینل آن تھا اور اس پر چار اسٹار بنے ہوئے تھے یعنی اس پر چار نمبر ملا دیے گئے تھے۔ موسیٰ بھائی نے ایک نمبر پر انگلی رکھی ہوئی تھی۔ وہ بولا۔ ''دیکھ رہا ہے نا... بس ایک بٹن دبانے کا ہے اور بوم۔''

☆☆☆

اختر ہیڈ فون کان سے لگائے بیٹھا تھا۔ فون کال ایک مشین کی مدد سے سنی جا رہی تھی جو آواز کو نمایاں کر رہی تھی۔ وہ چونکا۔ اس نے آئی جی اور کرنل کو اشارہ کیا۔ ''سنیں کیا ہو رہا ہے؟''

ان دونوں نے بھی ہیڈ فون لگا لیے تھے۔ دوسری طرف صورت حال میں اچانک تبدیلی آئی تھی۔ موسیٰ بھائی نامی بزنس مین نے اپنے سینے پر بندھے بم کی مدد سے الٹا دہشت گردوں کو دھمکی دی تھی۔ اختر نے فوری طور پر وزیرِ داخلہ کو کال کی اور اسے صورت حال سے آگاہ کر کے بولا۔

''سر یہ موقع ہے ہم اسپیشل دستے کو استعمال کریں۔''

''نہیں پہلے صورت حال کا درست اندازہ لگاؤ اس کے بغیر کوئی قدم اٹھانا خودکشی ہو گی۔ وہ ایک شخص ہے اور مجرموں کے مقابلے کا آدمی نہیں ہے اگر انہوں نے اسے قابو کر لیا تو آپریشن کی صورت میں بہت خرابی ہو گی۔''

اختر کو مایوسی ہوئی۔ اس کا خیال تھا کہ اسے فوری اجازت مل جائے گی۔ یہ اچھا موقع تھا جو ضائع جا رہا تھا۔ وہ پھر سے کال سننے لگا۔

☆☆☆

موسیٰ بھائی کو بم کے کی پیڈ پر انگلی رکھے دیکھ کر وسط الشبانی کے ساتھی چند قدم پیچھے ہٹ گئے تھے لیکن وہ سکون سے جیکٹ کی جیبوں میں ہاتھ ڈالے اپنی جگہ کھڑا رہا۔ اس نے پوچھا۔ ''موسیٰ بھائی کیا کہنا چاہتے ہو؟''

''بتایا تھا نا آج دوسرا اپلنس ٹیسٹ دیکھا اس میں لاس ہی لاس نکلا تو سوچا ذرا اسے ٹھیک کر لے۔''

''تم جان بچانا چاہ رہے ہو؟''

''نہیں میں چاہتا ہے کہ ان سب کو جانے دے۔ ہم تم آپس میں نمٹ لیں گے۔''

''اگر میں انکار کروں؟'' وسط الشبانی نے کہا۔ اس کے ہاتھ بدستور اپنی جیکٹ کی جیب میں تھے۔

''تو بٹن دبا دے گا۔'' موسیٰ بھائی نے کہا۔

''یاد رہے تمہارے ساتھ سب مریں گے۔'' وسط الشبانی نے بے پروائی سے کہا۔

موسیٰ بھائی نے اسے حیرت سے دیکھا۔ "تیرے کو اپنی پروا بھی نہیں ہے؟"

موسیٰ بھائی کی اس حرکت نے سب کو دنگ کر دیا تھا۔ کسی نے سوچا بھی نہیں تھا کہ وہ ایسی حرکت کر گزرے گا۔ اکثر کے رنگ سفید پڑ گئے تھے۔ سب سے زیادہ خراب حالت سی ایم کے مشیروں کی تھی۔ عمران سجاد نے کہا۔ "موسیٰ بھائی! پاگل ہو گئے ہو کیا سب کو مروا دو گے؟"

"تم کو کچھ نہیں ہوگا۔" موسیٰ بھائی نے کہا اور آگے جانے کی کوشش کی۔ وہ ان سے دور جا رہا تھا مگر وسط ایشیائی نے اسے واپس دھکیل دیا۔

"نہیں دوست تم یہیں رہو گے اگر مریں گے تو سب ساتھ مریں گے اکیلے مرنے میں کیا مزہ؟"

"موسیٰ بھائی یہ کیا کر رہا ہے بابا؟" سی ایم نے کہا۔

"یہ بیلنس شیٹ ٹھیک کر رہا ہے۔" وسط ایشیائی ہنسا پھر اس نے ایسی حرکت کی کہ سب دنگ رہ گئے۔ "پر اس کی ہمت نہیں ہو رہی ہے میں ٹھیک کرتا ہوں۔" اس نے کہتے ہوئے کی پیڈ کا ایک بٹن دبا دیا۔ دبی دبی چیخیں نکلیں اور متوقع دھماکے کے خوف سے سب نیچے جھک گئے مگر کچھ نہیں ہوا۔ وسط ایشیائی پھر ہنسا۔ "بیلنس نہیں ہوا موسیٰ بھائی.... ہوگا کیسے... اس کھیل کے ماسٹر تم نہیں ہو.... میں ہوں۔" اس نے جیب سے ہاتھ نکالا تو اس میں ریموٹ دبا ہوا تھا۔ "اس کی مدد سے اسے آن کیا جا سکتا ہے بلاسٹ کیا جا سکتا ہے تو آف بھی کیا جا سکتا ہے۔"

موسیٰ بھائی کا چہرہ مرجھا گیا۔ اس نے مرے انداز میں کہا۔ "ادھر بھی لاس آیا۔ اب کیا کرے گا تو؟... میرے کو شوٹ؟"

"نہیں موسیٰ بھائی میرے کو تیرا بہادری پسند آیا۔ تم نے ان لوگوں کو بچانے کا سوچا جن میں سے ہر شخص اس قابل ہے کہ اسے چوک پر پھانسی دی جائے۔ جا اپنی جگہ جا کر بیٹھ۔" وسط ایشیائی نے موسیٰ بھائی کا شانہ تھپکا۔

"اب اپنے کو بیلنس شیٹ دوسرا طریقے سے ٹھیک کرنا ہوگا اگر ادھر سے بچ گیا۔"

"سمجھ لو تم کو ایک موقع ملا ہے۔" وسط ایشیائی نے نرمی سے کہا اور موسیٰ بھائی اپنی جگہ بیٹھا تو سب نے سکون کا سانس لیا۔ پہلی بار عمران سجاد نے وسط ایشیائی کو تعریفی انداز میں دیکھا۔

"تم نے سچ مچ ہر پہلو پر نظر رکھی ہے۔"

"یہ میرا کام ہے۔" اس نے کہا اور سامنے والے حصے کی طرف چلا گیا۔ اس کے ساتھی اب ذرا پیچھے ہو کر لیکن پوری چوکسی سے ان پر نظر رکھے ہوئے تھے۔ وسط ایشیائی نے دروازے کے باہر دیکھا۔ سامنے کہیں پولیس یا کسی اور سیکیورٹی ایجنسی کا فرد نظر نہیں آ رہا تھا۔ کم سے کم سامنے سے سب کو پیچھے ہٹا لیا گیا تھا۔

☆☆☆

آئی جی نے طنزیہ انداز میں اختر کی طرف دیکھا۔ "تم فوری کارروائی کی بات کر رہے تھے، اگر تمہارے آدمی حرکت میں آ جاتے تو اب کیا صورت حال ہوتی اندر.... یہ پاگل کا بچہ اس نے سب کو مروانے میں کوئی کسر نہیں چھوڑنی تھی۔" آئی جی کے لہجے میں برہمی آ گئی۔

"سب حالات کے مطابق فیصلہ کر رہے ہیں۔" کرنل نے اسے ٹھنڈا کیا۔ "اس وقت اختر نے بھی غلط نہیں کہا تھا اس کی جگہ میں ہوتا تو یہی کرتا۔"

اختر دوبارہ اغلاط کو تازہ ترین صورت حال سے آگاہ کرنے لگا۔ اس نے سکون کا سانس لیا کہ اس نے درست فیصلہ کیا تھا۔ اگر وہ اس وقت آپریشن کی اجازت دے دیتا تو صورت حال بہت خراب ہو سکتی تھی۔ اس نے رقم کا بتایا۔ "وہ پہنچنے والی ہوگی۔"

☆☆☆

چھ بجنے میں دس منٹ پر این پی پی کے سامنے ایک آرمرڈ ٹرک نمودار ہوا اور ریورس ہو کر بلڈنگ کی سیڑھیوں کی طرف آنے لگا اور سیڑھیوں سے تقریباً لگ کر رک گیا تھا۔ یہاں ابھی تک شہاب الدین کے جسم کے ٹکڑے اور گوشت کے لوتھڑے بکھرے ہوئے تھے۔ پھر ٹرک سے ایک شخص اترا اور اس نے دونوں ہاتھ اٹھا کر دروازے کی طرف دیکھا۔ وسط ایشیائی کے اشارے پر ایک شخص نے شیشے کے پاس جا کر اسے ہاتھ کے اشارے سے آگے آنے کو کہا۔ باہر اب تاریکی تھی اور اندر روشنی تھی اس لیے اب اندر کا منظر دکھائی دے رہا تھا۔ آدمی ٹرک کے عقبی حصے میں آیا اور دروازہ کھول کر اس نے اندر سے ایک بیگ نکالا اور اسے لے کر سیڑھیوں سے اوپر آیا۔ بیگ خاصا وزنی تھا۔ وسط ایشیائی کے اشارے پر بم ہٹا کر ایک دروازہ کھولا گیا۔ آدمی نے بیگ اندر رکھا اور پلٹ کر گیا۔ پھر اس نے دوسرا بیگ رکھا اور ایک منٹ بعد تیسرا بیگ بھی لے آیا۔ وسط ایشیائی نے کہا۔ "ٹرک کی چابی کہاں ہے؟"

آدمی نے جواب دیا۔ "وہ اسی میں لگی ہے۔"

"اسے ٹرک میں لگے رہنے دو اور تم جاؤ۔"

آدمی واپس چلا گیا۔ اس نے ٹرک اسی طرح چھوڑ دیا تھا۔ اس کے جاتے ہی وسط ایشیائی کے اشارے پر اس کے ساتھی رقم والے بیگ اندر دو نمبر لابی میں لے آئے۔ یہ جگہ باہر سے نظر نہیں آتی تھی۔ تقریباً سب کی پشت پر بڑے سائز کے بیگ تھے اور ان میں سے کچھ بیگز سے سامان نکال لیا گیا تھا اور کچھ بیگز اب کھولے گئے تھے۔ ان میں بھی رقم کی گڈیاں بھری ہوئی تھیں۔ وسط ایشیائی کے آدمی بینک سے آنے والی گڈیاں چیک کر کے ایک دوسرے بیگ میں رکھنے لگے اور جو بیگ خالی ہوتا اس میں اپنے بیگز سے نکالے کرنسی نوٹوں کے بنڈل بھرنے لگے۔ یہ بھی پانچ ہزار والے نوٹ تھے۔ یہاں بھی ایسا لگ رہا تھا وہ طے شدہ منصوبے کے مطابق کام کر رہے ہیں۔ جب وہ یہ کام کر رہے تھے تو وسط ایشیائی ریسپشن کے فون پر آیا اور اس نے رابطہ کیا۔ دوسری طرف آئی جی تھا۔ وسط ایشیائی نے کہا۔ ”غور سے سنو ہم قیدیوں کی رہائی کے مطالبے سے دست بردار ہو رہے ہیں اور ٹھیک چھ بج کر تیس منٹ پر اسی آرمرڈ ٹرک میں یہاں سے روانہ ہوں گے۔ ہمارے جانے کے بعد بے شک تم اندر آ سکتے ہو اور یرغمالیوں کو اپنی تحویل میں لے سکتے ہو۔“

آئی جی نے پوچھا۔ ”لیکن ان کو جو بم باندھے گئے تھے؟“

”ان کے کوڈز تمہیں مل جائیں گے جب ہم کسی محفوظ مقام پر پہنچ جائیں گے۔ اگر کسی نے راستے میں روکنے کی یا اسی قسم کی کوئی کوشش کی تو ان میں سے کوئی نہیں بچے گا۔ بموں کے ٹائمر میں اب زیادہ وقت نہیں رہا ہے۔“

”کوئی تمہیں نہیں روکے گا۔“ آئی جی نے یقین دلایا۔

”اس صورت میں سب محفوظ رہیں گے۔“ وسط ایشیائی نے کہا اور ریسیور رکھ کر خاموشی سے فون کا تار درمیان سے کھینچ کر توڑ دیا۔ اب کوئی اس فون کو استعمال نہیں کر سکتا تھا۔ یرغمالی اس کی گفتگو سن رہے تھے اور ان کے چہروں پر بیک وقت امید و یاس کی کیفیت تھی۔ وسط ایشیائی نے ان سے کہا۔ ”ہم جا رہے ہیں لیکن تم میں سے کوئی اپنی جگہ سے حرکت نہ کرے۔ جب تک تمہارے لوگ یہاں نہ آ جائیں ایسی کسی حرکت کی صورت میں مجھے صرف ایک بٹن دبانا ہوگا۔“ اس نے ریموٹ دکھایا۔ ”تم میں سے کوئی زندہ نہیں بچے گا۔“

تین مسلح افراد بدستور ان پر تعینات تھے۔ وسط ایشیائی لابی نمبر دو میں آیا جہاں اس کے ساتھی رقم کی منتقلی کا کام مکمل کر چکے تھے۔ بینک سے آنے والی رقم جن بیگوں میں ڈالی گئی تھی، وہ پشت پر باندھنے والے تھے۔ وسط ایشیائی اور اس کے دو ساتھیوں نے یہ بیگ اپنی پشت پر باندھ لیے، وسط ایشیائی ایک نقاب پوش کے پاس آیا۔ اس نے آہستہ سے کہا۔ ”رفیق، ... تم سب یہاں سے نکلو... کوئی تمہیں نہیں روکے گا۔ جب تم محفوظ مقام پر پہنچ جاؤ تو مجھے کال کرو گے۔“

”یس باس۔“ اس نے کہا۔

”گڈ۔“ وسط ایشیائی نے اس کی پشت پر ہاتھ مارا۔

اس دوران میں دروازے سے لگے دونوں بم اٹھا کر ڈی ایکٹی ویٹ کر کے بیگ میں رکھ لیے گئے تھے۔ یہ بھی آرمرڈ ٹرک میں ساتھ جانے۔ اس نے گھڑی دیکھی اور بولا۔ ”ناؤ گو۔“

وسط ایشیائی اور اس کے دو ساتھی لفٹ کی طرف آئے اور اندر داخل ہو کر آخری فلور کا بٹن دبایا تھا۔ جس وقت لفٹ کا دروازہ بند ہو رہا تھا۔ باقی نقاب پوش باہر کا رخ کر رہے تھے۔ یرغمالیوں پر مسلط تینوں نقاب پوش بھی پیچھے ہٹے اور پھر وہ عمارت سے نکل گئے۔ باہر آتے ہی وہ بیگوں سمیت ٹرک کے عقبی حصے میں سوار ہوئے۔ دو آگے چلے گئے۔ یہ کل اٹھارہ افراد تھے جیسے ہی عقب میں دروازہ بند ہوا ٹرک حرکت میں آ گیا۔

☆☆☆

وزیر داخلہ، آئی جی اور دوسرے حکام مسلسل آپس میں رابطے میں تھے۔ زمینی راستے کلیئر کر دیے گئے تھے لیکن اوپر آسمان پر ایک ہیلی کاپٹر موجود تھا اور وہ ٹرک پر نظر رکھتا۔ اب تک یہ ہیلی کاپٹر این فی ٹی کے اوپر تھا۔ پھر وہ ٹرک کے ساتھ حرکت میں آ گیا اور این فی ٹی سے دور جانے لگا۔ ان لوگوں کو امید تھی کہ وہ اس طرح دہشت گردوں کے ٹھکانے تک رسائی حاصل کر لیں گے۔ ہیلی کاپٹر میں موجود سیکیورٹی اہلکار نائٹ ویژن دوربینوں سے ٹرک پر نظر رکھتے۔ اگر وہ درمیان میں کہیں گاڑی تبدیل کرتے تو بھی ان کا تعاقب کیا جا سکتا تھا۔ وزیر داخلہ کے حکم پر دو ہیلی کاپٹر آ رہے تھے۔ اگر دہشت گرد تقسیم ہوتے تو وہ سب کا الگ الگ تعاقب کرتے مگر اس وقت ان کی پہلی ترجیح سی ایم اور دوسرے یرغمالیوں کو بحفاظت بازیاب کرانا تھا۔ اس کے بعد ہی وہ دہشت گردوں کے خلاف حرکت میں آتے۔

☆☆☆

عمران تجار اپنی جگہ ساکت تھا۔ وہ سر جھکائے یوں بیٹھا تھا جیسے اس کی توجہ کہیں نہ ہو مگر وہ سب سن رہا تھا اور اس کا ذہن سوچنے میں مصروف تھا جیسے ہی دہشت گرد باہر نکلے، وہ حرکت میں آگیا۔ وہ اٹھ کر داخلی دروازے کے ساتھ موجود کھڑکی تک آیا۔ اس وقت وہ نقاب پوش لفٹ میں سوار ہو رہے تھے۔ انہوں نے رقم کے بیگ بھی اٹھا رکھے تھے۔ جیسے ہی لفٹ حرکت میں آئی۔ وہ ریسپشن کی طرف آیا۔ اس نے ریسیور اٹھایا مگر فوراً ہی اس کی نظر فون کے ٹوٹے تار پر گئی۔ اس نے ریسیور پھینک کر کاؤنٹر کے ساتھ موجود درازیں کھول کر دیکھنا شروع کیں اور بالآخر ایک دراز میں اسے پیپر نائف مل گیا۔ وہ اسے لے کر عمران اکبر کی طرف آیا اور پیپر نائف اس کی طرف بڑھاتے ہوئے بولا۔

”میرا ہاتھ کھولو۔“

عمران اکبر نے اس کی ہتھکڑی کاٹتے ہوئے کہا۔ ”تم کیا کرنا چاہ رہے ہو؟“

”ان کو روکنا ہے۔“

”کیسے، وہ جا چکے ہیں۔“

”سب نہیں، کچھ یہاں موجود ہیں۔“ اس نے کہا اور اسی لمحے ہتھکڑی کٹ گئی۔ ہاتھ آزاد ہوتے ہی عمران تجار نے کھلے سے اپنا پستول اور موبائل نکالا مگر وہ بند ہو گیا تھا۔ اتنی دیر میں اس کی بیٹری جواب دے گئی تھی۔ اس نے موبائل جیب میں رکھا اور پستول بیلٹ میں اڑسا۔ سی ایم نے کہا۔

”مسٹر عمران تجار تم کیا کر رہے ہو؟“

”سر... میرا خیال ہے تمام دہشت گرد یہاں سے نہیں گئے ہیں کچھ یہاں موجود ہیں۔ آپ سب یہیں رہیں جب تک باہر سے مدد نہ آجائے۔ اپنے طور پر کچھ مت کیجیے گا۔“

”اگر وہ یہاں ہیں تو خطرہ ہے۔“ عمران اکبر نے فکرمندی سے کہا۔ ”وہ ریموٹ سے بم اڑا سکتا ہے؟“

”اگر اسے ایسا کرنا ہے تو وہ بہر صورت کر گزرے گا۔“ عمران تجار نے کہا اور داخلی گیلری میں آیا کیونکہ اس نے اسی طرف ان لوگوں کو جاتے دیکھا تھا اور وہ سب سے قریب تھا۔ اس نے لفٹ کھلنے کی آواز بھی سنی تھی۔ جب وہ لفٹ کے پاس پہنچا تو وہ آخری فلور پر پہنچ گئی تھی۔ عمران نے انتظار کیا۔ چند سیکنڈ بعد اس نے بٹن دبایا اور لفٹ نیچے آنے لگی۔ اچانک ایک جھماکا سا ہوا اور لفٹ کے اوپر روشن پینل بجھ گیا۔ عمران — کے کانوں نے سنسناتی آواز سنی اور اس نے برق رفتار جست لگائی۔ جیسے ہی وہ لفٹ کے سامنے سے ہٹا ایک دھماکے سے اس کے پٹ کھلے اور گرد و غبار کے ساتھ لفٹ کا ملبا بھی باہر آیا تھا۔ ایسی ہی سنسناتی آوازیں دوسری لفٹوں سے بھی آ رہی تھیں مگر وہ سب گرا نہ رہی تھیں۔ وہ سمجھ گیا تھا دہشت گردوں نے لفٹس ناکارہ کر دی تھیں اب اوپر جانے کا ایک ہی راستہ بچا تھا۔ اگرچہ اس کے بارے میں بھی اسے خدشہ تھا کہ وہ بھی نہ بند کر دیا گیا ہو۔ عمران — اٹھ کر سیڑھیوں کی طرف بھاگا تھا۔

☆☆☆

وسط ایشیائی اور اس کے ساتھی چھتیسویں فلور پر لفٹ سے اترے اور وسط ایشیائی نے جیب سے ایک مختلف ریموٹ نکالا اور اس کا بٹن دباتے ہوئے کہا۔ ”گڈ بائے لفٹس۔“

اوپر کی طرف چند ہلکے دھماکے سنائی دیے تھے۔ فوراً ہی ان کو اوپر لانے والی لفٹ اور باقی لفٹوں کے رستے نیچے گرنے لگے تھے۔ ان کی سنسناتی آوازیں صاف سنائی دے رہی تھیں۔ انہوں نے پہلے ہی لفٹوں کے اوپری حصوں میں ریموٹ کنٹرولڈ بم لگا رکھے تھے۔ پھر اس نے ریموٹ کا ایک بٹن اور دبایا تو نیچے سیڑھیوں کی طرف سے دھماکے سنائی دیے تھے۔ وسط ایشیائی نے نقاب اتار دیا اور مسکرا کر بولا۔ ”اب کوئی اوپر نہیں آسکتا۔“

اس کے ساتھیوں نے بھی نقاب اتار دیے تھے اور ساتھ ہی نائٹ ویژن نکال کر ماتھے پر لگا لیے تھے۔ وہ سیڑھیوں سے چھت پر آئے جہاں ان کے چار ساتھی پولیس اسنائپر کے روپ میں موجود تھے۔ وسط ایشیائی نے اپنی جیکٹ سے ایک بڑا دوربین کی ساخت کا آلہ نکالا اور اس کا ایریل اوپر کر کے نیچے دیکھا جہاں تاریکی چھا گئی تھی اور نیچے روشنیاں جل اٹھی تھیں۔ مگر چھت پر تمام روشنیاں بالکل بند تھیں اور یہاں تاریکی کا راج تھا مگر انہیں کوئی فرق نہیں پڑ رہا تھا کیونکہ انہوں نے نائٹ ویژن کا گلز لگا لیے تھے اور اب انہیں سب دن کی طرح صاف نظر آ رہا تھا۔ سڑکوں پر گاڑیوں کی ہیڈلائٹس روشن تھیں لیکن ان میں یہ اندازہ کرنا ناممکن تھا کہ اس میں سے آرمرڈ ٹرک کون سا ہے۔

وسط ایشیائی نے اپنے ساتھیوں کی طرف دیکھا اور سر کو جنبش دی اور پھر آلے پر لگا ہوا بٹن دبا دیا۔ سیکنڈ سے بھی پہلے نیچے دور ایک سڑک پر بہت بڑا شعلہ نمودار ہوا تھا۔ جب تک دھماکے کی آواز یہاں تک آئی وسط ایشیائی کے ساتھی اپنے دور آرمیوں کو شوٹ کر چکے تھے۔ رائفلوں پر

سائلنسر کی وجہ سے آواز نہیں آئی تھی جب تک باقی دو صورت حال کو سمجھتے وہ بھی ان کی گولیوں کا نشانہ بن گئے۔ حفظ ماتقدم کے طور پر انہوں نے ایک ایک برسٹ اور چلایا تھا۔ چاروں یقینی طور پر ختم ہو گئے تھے۔ وسط ایشیائی نے مطمئن انداز میں سر ہلایا۔ ”یہ کام بھی نمٹ گیا برادرز.... اب منصوبے کا آخری حصہ ہے۔ اس کے بعد ہمیں کوئی پکڑ نہیں سکے گا اور جو ہمیں پکڑنے سے بھی پہلے ہم اس دولت کے ساتھ اس ملک کی سرحد کراس کر جائیں گے۔“

اس کا ایک ساتھی مسکرایا۔ ”یہ اتنی دولت ہے کہ ہم سالوں آرام سے بیٹھ کر کھا سکتے ہیں۔“

☆☆☆

صورت حال یک دم سنسنی خیز ہو گئی تھی۔ دہشت گردوں کو لے جانے والا آرمرڈ ٹرک اچانک ہی ایک دھماکے سے تباہ ہو گیا تھا۔ دھماکا اتنا شدید تھا کہ ٹرک کی مضبوط زرہ بکتر باڈی کے ٹکڑے ٹکڑے ہو گئے تھے۔ اس میں موجود کسی فرد کے بچنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ جب بکیورٹی اہلکار ٹرک کے ملبے کے پاس پہنچے تو وہاں ہوا میں جلنے لوہے اور جلتے گوشت کی بو تھی۔ اس سے پہلے ہی اختر اور اس کا دستہ عمارت کی طرف روانہ کیا جا چکا تھا کیونکہ دہشت گرد یہاں سے جا رہے تھے اس لیے الیٹ دستے کو کار گولف والے حصے سے واپس آ کر سامنے والے حصے سے این ٹی میں جانے کا حکم دیا گیا تھا۔ اختر اور اس کے آدمی اندر داخل ہوئے تو وہاں سی ایم اور دوسرے بدستور کرسیوں پر موجود تھے۔ ان کے پیچھے بم ڈسپوزل کے ماہرین بھی آ رہے تھے۔ انہوں نے آتے ہی انہیں آلات سے چیک کیا اور حیران رہ گئے۔

”کسی جیکٹ میں بم نہیں لگا ہے۔“

اختر نے کہا۔ ”یہ کیسے ممکن ہے؟.... ٹھیک سے چیک کرو۔“

ماہرین پھر سے چیک کرنے لگے۔ اختر عمران کو دیکھ رہا تھا مگر وہ وہاں نہیں تھا۔ اس نے عمران کے بارے میں پوچھا۔ سی ایم کے ایک مشیر نے بتایا۔ ”وہ پتا نہیں کہاں چلا گیا تھا۔ اس کے جانے کے بعد یہاں کئی دھماکے سنائی دیے تھے۔“

اسی لمحے اختر کو ریڈیو پر آئی جی نے کہا۔ ”دہشت گردوں کا ٹرک دھماکے سے تباہ ہو گیا ہے۔“

”میرے خدا.... کہیں وہ چیف کو ساتھ تو نہیں لے گئے تھے؟“

”نہیں۔۔۔۔ وہ ان کے جانے کے بعد گیا تھا۔“ اکبر نے کہا۔ ”میں نے اسے لابی نمبر دو کی طرف جاتے دیکھا تھا۔“

اختر نے آئی جی کو تازہ ترین صورت حال سے آگاہ کیا اور لابی نمبر دو کی طرف آیا تو اس نے لفٹ کو تباہ پایا۔ اس کے آدمی چیک کر رہے تھے۔ انہوں نے بتایا کہ اس لابی کی تمام لفٹس ناکارہ ہو گئی تھیں۔ صرف اس لابی کی نہیں بلکہ تینوں لابیز کی لفٹس کیبل ٹوٹنے سے بیکار ہو چکی تھیں اور اب صرف زینے سے اوپر جایا جا سکتا تھا۔ اختر کو امید تھی کہ شاید کار گو لفٹس کام کر رہی ہوں لیکن چند منٹ بعد اسے پتا چلا کہ وہ بھی ناکارہ ہو چکی ہیں۔ موبائل جام ہونے سے وہ عمران ۔۔۔ سے رابطہ نہیں کر سکتا تھا۔ لابیز اور بیسمنٹ کا حصہ دس منٹ میں دیکھ لیا گیا تھا۔ اس کا مطلب تھا کہ عمران ۔۔۔ سیڑھیوں سے اوپر گیا تھا۔

☆☆☆

عمران سیاہ دکھتی پنڈلی کے ساتھ ہر ممکن تیزی سے سیڑھیاں چڑھ رہا تھا۔ نقاب پوش کی ٹھوکر سے شاید اندر سے گوشت پھٹ گیا تھا۔ ابھی وہ کچھ ہی اوپر گیا تھا کہ اوپری فلور سے دھماکا سنائی دیا۔ دھماکے کی شدت کہیں زیادہ تھی۔ اس کا دل دھڑکا اور وہ ایک لمحے کو رکا لیکن پھر تیزی سے چڑھنے لگا۔ اوپر سے کنکریٹ کے ریزے اور گرد نیچے آ رہی تھی۔ بیسویں فلور کے بعد اس کی رفتار سست پڑنے لگی تھی۔ اس کی سانس قابو میں تھی۔ دارالحکومت میں وہ روز تین میل دوڑتا تھا۔ اس کا اسٹیمنا لاجواب تھا لیکن پنڈلی کا درد بڑھ رہا تھا۔ وہ چند لمحے کے لیے رکا اور پھر چڑھنے لگا۔ تیسویں فلور تک آتے سیڑھیوں پر ملبا بڑھ گیا تھا ایسا لگ رہا تھا کہیں اوپر سیڑھیاں دھماکے سے تباہ کر دی گئی تھیں۔ پینتیسویں فلور پر اس کا خدشہ حقیقت بن کر سامنے آ گیا۔ یہاں سیڑھیوں کا تقریباً دو فٹ کا حصہ تباہ ہو گیا تھا۔ نہ صرف سیڑھیاں بلکہ ریلنگ بھی تباہ ہو گئی تھی اور اوپر جانے کا کوئی راستہ نہیں بچا تھا۔ کنکریٹ تباہ ہونے سے اس کے اندر کی سلاخیں نکل آئی تھیں۔ وہ نیچے سے بچا ہوا ٹوٹی سیڑھی تک آیا۔

جس وقت دہشت گرد مصروف عمل تھے تو عمران۔۔۔ سوچ رہا تھا اور اسے لگ رہا تھا کہ وہ جو کچھ ظاہر کر رہے ہیں، ویسا نہیں ہے۔ گولوں کے پیچھے ان کی پر اسرار سرگرمیاں جاری تھیں۔ عمران۔۔۔ سن رہا تھا اور اندازہ لگانے کی کوشش کر رہا تھا کہ وہ کیا کر رہے ہیں۔ لفٹ کی آواز سن کر اسے اندازہ ہو گیا کہ دہشت گرد جو اٹھیں بنا رہے تھے اس کے برعکس کچھ کرنے جا رہے تھے۔ ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ اوپر والے بھی نیچے آ جاتے لیکن یہاں نیچے سے کچھ اوپر جا رہے تھے۔ جب وہ لفٹ کے سامنے پہنچا تو اس کی تصدیق بھی ہو گئی تھی کہ کچھ دہشت گرد نیچے سے اوپر گئے تھے۔ مگر وہ اوپر کیوں گئے تھے؟ اس وقت اسے موبائل یا واکی ٹاکی کی کمی شدت سے محسوس ہو رہی تھی۔

اگر وہ رابطہ کر پاتا تو فضائی نگرانی کے لیے کہتا۔ پولیس کے پاس رات کے وقت نگرانی کے لیے ہیلی کاپٹر نہیں تھے لیکن یہ معاملہ ایسا تھا کہ آرمی سے مدد لی جا سکتی تھی۔ اسے علم نہیں تھا کہ فضا میں تین ہیلی کاپٹر موجود تھے مگر وہ تباہ ہونے والے ٹرک کی نگرانی کر رہے تھے۔ اس نے ٹوٹی سیڑھیوں کی طرف دیکھا۔ اس طرف کی لائٹس بھی دھماکے سے تباہ ہو گئی تھیں لیکن نیچے اور اوپر کی لائٹس کی روشنی کسی حد تک یہاں آ رہی تھی۔ اس نے اوپر کنکریٹ سے نکلے سریے کو دیکھا۔ وہ تقریباً آٹھ فٹ کی بلندی پر تھا اگر وہ جست لگاتا تو شاید اسے پکڑ سکتا تھا مگر کیا وہ مضروب پنڈلی کے ساتھ اتنی اونچی جست لگا سکتا تھا۔ عمران ۔۔۔ نے سوچا اور پھر گہری سانس لے کر تیار ہوا۔ اس نے جھک کر پوری قوت سے خود کو اوپر اچھالا۔ اس کا جسم خلا میں گیا تھا۔ ایک لمحے کو اسے لگا کہ وہ نیچے سیڑھیوں پر جا گرے گا مگر اسی لمحے سلاخ اس کے ہاتھ میں آ گئی۔ اسے جھٹکا لگا اور وہ جھولنے لگا۔

☆☆☆

چھت پر ایک بڑا سا دھاتی سوٹ کیس پہلے سے موجود تھا۔ وسط ایشیائی نے نمبر ملا کر اسے کھولا اور اس میں موجود لوہے کی راڈز اور حصے نکال کر آپس میں جوڑنے لگا۔ پانچ منٹ میں اس نے ایک فولادی کمان تیار کر لی جس میں نہایت طاقتور اسپرنگ تھا۔ کمان جوڑ کر وہ اس کے اسپرنگ کو چابی کی مدد سے اسے تنی ہوئی حالت میں لانے لگا۔ یہ کام کر کے اس نے دیوار کے ساتھ اسٹینڈ پر کمان نصب کی۔ اس کا جھٹکا بہت تیز ہوتا تھا اور درست نشانے کے لیے اسے اسٹینڈ پر فکس کر کے ہی استعمال کیا جا سکتا تھا۔ اس میں ایک جدید الیکٹرانک دوربین لگی تھی۔ اس کے ایک ساتھی نے رسی سے منسلک تیر لا کر کمان میں پھنسایا۔ یہ سخت ترین دھات کی الائے سے بنا ہوا مخصوص ساخت کا تیر تھا جو کنکریٹ کی دیوار میں گھس کر آگے سے کھل جاتا اور کنکریٹ میں پھنس کر رہ جاتا۔

رسی کا لچھا اسٹینڈ کے پاس پڑا تھا۔ وسط البشانی نے اسکرین کو ایڈ جسٹ کیا اور دیکھنے لگا۔ تقریباً ایک کلومیٹر دور چار منزلہ اسکول کی عمارت واضح دکھائی دے رہی تھی۔ وسط البشانی نے اس کے اوپر کنکریٹ سے بنی پانی کی ٹنکی کا نشانہ لیا۔ دوربین میں کراس بتا رہا تھا کہ نشانہ ٹنکی تھی۔ اس نے سانس روک کر کلپ دبایا اور زبردست طاقت سے تیر کمان سے نکلا اور رسی سمیت فضا میں لپکا۔ پتلی لیکن مضبوط ترین رسی کا لچھا نہایت سرعت سے کھل رہا تھا۔ دو سیکنڈ بعد وہ پوری قوت سے ٹنکی سے ٹکرایا اور اس میں گھس گیا۔ ابھی رسی کا خاصا لچھا باقی تھا۔ وسط البشانی کے دوسرے ساتھی نے پھرتی سے اسے خاص کلیمپس کی مدد سے چھت کی دیوار سے باندھ دیا۔ اب اسے صرف کاٹ کر کھولا جا سکتا تھا۔ وسط البشانی نے اپنے ساتھی کی طرف دیکھا اور بولا۔ ”دوستو چلو۔“

پہلے ایک نے فولادی ہک جو اس کی بیلٹ سے بندھا ہوا تھا، اسے رسی کے گرد لگایا۔ یہ خود سے کسی صورت نہیں نکل سکتا تھا۔ وہ اچھل کر دیوار کے دوسری طرف خلا میں گیا اور پھر نہایت تیزی سے رسی کے سہارے جھولتا ہوا اسکول کی عمارت کی طرف جانے لگا۔ رات کی تاریکی اور سرمئی بادلوں کی موجودگی میں اس کا سیاہ لباس والا وجود نیچے سے نظر نہیں آ سکتا تھا۔ اگر اس وقت اوپر ہیلی کاپٹر ہوتا تو وہ ان کو دیکھ سکتا تھا۔ مگر وہ ترک کی طرف جا چکا تھا۔ رسی نے پہلے آدمی اور رقم کا مشترکہ بوجھ آرام سے سنبھال لیا تھا۔ جب وہ تقریباً چار سو گز آگے نکل گیا تو دوسرا روانہ ہوا۔ اور پھر وسط البشانی نے اپنا ہک رسی سے لگایا۔ اس کی نظر اپنے آگے جاتے ساتھی پر تھی۔ جیسے ہی وہ نصف راستے میں پہنچا وسط البشانی بھی اچھل کر دیوار کے پار گیا اور بہت تیزی سے نیچے جانے لگا۔ اس وقت ان کا پہلا ساتھی اسکول کی چھت پر پہنچ چکا تھا۔ اسے وہاں پہنچنے میں مشکل سے ایک منٹ لگا تھا۔

اسی لمحے چھت پر سیڑھیوں کا دروازہ کھلا اور عمران ... پستول سامنے کیے نمودار ہوا۔ وہ باہر آتے ہی دیوار کے ساتھ ہو گیا کیونکہ نیچے سے آتی روشنی میں وہ نمایاں ہو جاتا۔ یہاں تاریکی تھی مگر اس نے محسوس کر لیا کہ یہاں کوئی نہیں تھا۔ البتہ چھت پر کچھ لاشیں موجود تھیں۔ پھر وہ اسٹینڈ پر لگی کمان دیکھ کر چونکا اور تیزی سے اس طرف آیا۔ کمان اور دیوار کے ساتھ بندھی رسی دیکھ کر اسے سمجھنے میں ایک لمحہ لگا تھا کہ دہشت گرد کس طرح فرار ہو رہے تھے۔ اس نے جھک کر کمان کی دوربین میں دیکھا اور اسے ایڈ جسٹ کیا۔ ایک شخص رسی کے وسط میں تھا اور بہت تیزی سے نیچے جا رہا تھا۔ عمران نے پستول کی نال رسی پر رکھی لیکن اس سے پہلے وہ فائر کرتا کسی خیال نے اس کا ہاتھ روک لیا۔ اس نے وہاں موجود سامان کی تلاشی لی اور اسے کمان والے سوٹ کیس سے فولادی کلپ مل گیا جو بیلٹ سے منسلک کیا جا سکتا تھا لیکن اس کے پاس بیلٹ نہیں تھی۔

اس نے اسے اپنے ہی رسی سے منسلک کیا اور اس کی اسٹریپ ہتھیلی پر لپیٹ کر دیوار کے پار پاؤں لٹکائے اور پھر کھسک کر خلا میں گر گیا۔ ایک جھٹکا لگا اور وہ تیزی سے نیچے جانے لگا۔ اس کا جسم خلا میں جھول رہا تھا۔ جیسے جیسے وہ نیچے جا رہا تھا اس کی رفتار بڑھتی جا رہی تھی۔ عمران ... زمین سے کوئی دو سو فٹ کی بلندی پر تھا اور یہ بلندی مسلسل کم ہو رہی تھی مگر رفتار بڑھتی جا رہی تھی۔ وہ سوچ رہا تھا کہ اس رفتار سے چھت پر اترا تو تصادم اس کی ہڈیاں توڑ دے گا۔ پھر اسے دہشت گردوں کا خیال آیا انہوں نے یقیناً کوئی نہ کوئی تدبیر کی ہوگی بچنے کی۔ وہ دوسری عمارت سے تقریباً دو سو گز دور تھا اچانک رسی ڈھیلی ہوئی۔ اس کا تناؤ ختم ہو گیا اور عمران ... نیچے گرنے لگا۔ ان لوگوں نے یقیناً رسی کاٹ دی تھی۔ اس کا دل اچھل کر حلق میں آ گیا۔ وہ اب بھی زمین سے سو فٹ اوپر تھا۔ اس رفتار اور اتنی بلندی سے گرنے کے بعد اس کا بچنا مشکل تھا۔

☆☆☆

وسط البشانی کے ساتھی نے پیچھے آنے والے عمران ... کو دیکھ لیا تھا۔ یہاں چھت پر پانی کی ٹنکی کے ساتھ ربر فوم کے گدے ٹنکی کے گرد لگے تھے۔ یہ فرش پر بھی تھے اور ٹنکی کے ساتھ دیوار سے بھی لگائے گئے تھے اور وہ آ کر اس سے ٹکرائے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ ان کی ہڈیاں ٹوٹنے سے بچ گئی تھیں۔ جیسے ہی وسط البشانی کے پاؤں زمین پر لگے اس کے ساتھی نے کہا۔ ”پیچھے کوئی آ رہا ہے۔“

وسط البشانی نے پلٹ کر دیکھا۔ آنے والا خاصا قریب آ گیا تھا۔ اس نے ایک لمحہ ضائع کیے بغیر رائفل کی نال رسی پر رکھ کر فائر کیا اور رسی کٹ گئی۔ رسی لمحے میں غائب ہوئی اور پیچھے آنے والے کا ہیولا اب زمین کی طرف جا رہا تھا۔ اتنی بلندی اور رفتار سے گرنے کے بعد اس کے بچنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ اس نے مطمئن ہو کر سر ہلایا اور اپنے ساتھیوں سے کہا۔ ”یہاں سے ابھی نکلنا ہے۔“

وہ دونوں آگے تھے۔ وہ سیڑھی سے نیچے آئے جہاں

اسکول کا چوکیدار بندھا پڑا تھا۔ اس کی آنکھوں پر پٹی بندھی تھی۔ وسط الشیائی کے ایک ساتھی نے اس کی طرف رائفل کی تھی لیکن اس نے روک دیا۔ ''اس کی ضرورت نہیں ہے۔ یہ ہمیں نہیں جانتا ہے، چلو یہاں سے۔''

باہر نکلتے ہوئے انہوں نے اپنی رائفلیں اسکول کے دروازے پر چھوڑ دی تھیں کیونکہ وہ انہیں چھپا نہیں سکتے تھے۔ اس کے بعد وہ پیدل چل پڑے۔ وہ جانتے تھے کہ اس وقت تمام سڑکوں پر سخت چیکنگ ہو رہی ہوگی اور ہر گاڑی کو روکا جا رہا ہوگا۔ مگر وہ جانتے تھے انہیں اس علاقے سے کیسے نکلنا ہے۔ اب تک سب پلان کے مطابق ہوا تھا۔ اسکول کی گلی سے نکلنے سے پہلے وسط الشیائی نے دونوں کو گلے لگایا اور بولا۔ ''اپنا خیال رکھنا جیسا کہا ہے، ویسا ہی کرنا۔ ہم جلد ملیں گے۔''

''بالکل برادر۔'' ان دونوں نے کہا اور وہ الگ الگ روانہ ہوگئے۔

☆☆☆

زمین کی طرف جاتے ہوئے عمران... کے ذہن میں آخری خیال رعنا اور اپنے ہونے والے بچے کا آیا تھا۔ شاید اس کے نصیب میں نہیں تھا کہ وہ انہیں دیکھ سکتا۔ اگلے ہی لمحے اس کا جسم اس آرائشی درخت سے ٹکرایا جو آج کل جا بجا سڑکوں کے ساتھ لگائے جا رہے ہیں۔ بے پناہ رفتار کی وجہ سے عمران... اور بری نرم شاخیں توڑتا ہوا نیچے کی سخت شاخوں سے الجھتا بھی زمین پر گرا تو رفتار نہ ہونے کے برابر رہ گئی تھی۔ اس کے باوجود اسے جسم کے کئی حصوں پر سخت چوٹ آئی تھی۔ وہ کراہتے ہوئے اٹھا اور اپنا جسم ٹٹولنے لگا۔ کچھ دیر تو یقین نہیں آیا کہ قدرت نے اسے یوں بچا لیا۔ اگر وہ اس درخت کے علاوہ کہیں بھی گرتا تو اس کا بچنا محال تھا اور اگر بچ بھی جاتا تو یقیناً اس کی کئی ہڈیاں ٹوٹ جاتیں اور وہ کسی قابل نہ رہتا۔ اس نے اپنا پستول چیک کیا۔ وہ اس کی کمر سے لگا ہوا تھا پھر اس نے اندازہ لگایا کہ وہ کہاں تھا۔

اسکول اس دو رویہ سڑک کے سامنے والی لائن کی پچھلی گلی میں تھا۔ فرنٹ پر سارے بنگلے ایک یا دو منزلہ تھے، جبکہ اسکول چار منزلہ تھا۔ وہ اس علاقے میں سب سے بلند تھا اسی لیے دہشت گردوں نے اسے منتخب کیا تھا۔ اسے وہاں تک جانے کے لیے دو طرفہ گلی میں سے کسی ایک طرف سے جانا تھا۔ اس نے سوچا اور دائیں طرف بڑھا۔ اس کا اندازہ تھا کہ وہ اسی طرف سے نکلنے کی کوشش کریں گے۔ جبکہ بڑی سڑکیں جو علاقے سے باہر جاتی تھیں، وہ اسی طرف تھیں مگر پھر وہ راستے میں رک گیا۔ وہ واپس پلٹا اور اس بار بائیں طرف بڑھا۔ اسے خیال آیا تھا کہ جو لوگ اتنی پلاننگ سے سارا کام کر سکتے ہیں، کیا انہیں یہ خیال نہیں آیا ہوگا کہ اتنی بڑی واردات کے بعد تمام سڑکوں کی ناکا بندی کر دی جائے گی اور یہاں سے گاڑی میں نکلنا ممکن نہ ہوگا۔ فرار کے لیے انہوں نے یقیناً پیدل کا راستہ سوچا ہوگا اور فرار کے لیے مناسب راستہ بائیں طرف سے تھا۔ عمران... اس علاقے سے واقف تھا۔ وہ تیزی سے گلی کے کونے کی طرف جا رہا تھا کہ سامنے سے ایک نوجوان موبائل فون پر بات کرتا آ رہا تھا۔ عمران... نے اسے روک کر کہا۔

''مجھے اس موبائل کی ضرورت ہے۔''

پستول بدست آدمی کو دیکھ کر نوجوان کی آنکھیں پھیل گئیں اور اس نے فوراً موبائل اسے تھما دیا اور گھگھیائی آواز میں بولا۔ ''پلیز مجھے شوٹ مت کرنا۔''

''میں ڈاکو نہیں ہوں پولیس افسر ہوں۔'' عمران... نے کہا۔

''یہ دوسرا موقع ہے جب مجھے لوٹنے والے نے خود کو پولیس افسر قرار دیا ہے۔'' نوجوان نے سرد آہ بھری۔

''تمہارا گھر کہاں ہے، نام کیا ہے؟''

''گھر وہ سامنے ہے اور نام کامران ہے۔'' نوجوان نے کہا۔

''ٹھیک ہے گھر جا کر بیٹھو، میں کسی وقت بھی آ کر تمہارا موبائل دے جاؤں گا۔ اس میں بیلنس ہے؟''

''ابھی پانچ سو کا کارڈ لوڈ کیا ہے۔''

عمران... نے اس کے شانے پر تھپکی دی اور آگے بڑھ گیا۔ اس دوران میں موبائل سے مسلسل کسی لڑکی کے ہیلو ہیلو کرنے اور کالج سے فریاد کی آوازیں آ رہی تھیں کہ وہ اپنی خیریت سے مطلع کرے۔ عمران... نے کہا۔ ''کامی خیریت سے ہے۔'' اس نے کال کاٹی اور اختر کو کال کی۔ اس نے دوسری بیل پر کال ریسیو کی۔ ''اختر یہ میں ہوں، عمران!''

''سر آپ!'' اختر بولا۔ ''آپ کہاں ہیں؟''

''میں این ٹی ٹی سے فرار ہونے والے دہشت گردوں کے تعاقب میں ہوں۔''

''وہ تو سب مارے گئے آرمرڈ ٹرک میں دھماکا ہوا اور کوئی نہیں بچا۔''

"میں ان ہی میں ان میں دہشت گردوں کی بات کر رہا ہوں جو ایف بی آئی کی چھت سے فرار ہوئے ہیں۔ وہی اصل لوگ ہیں۔ مجھے یقین ہے ٹرک میں دھماکا بھی انہوں نے ہی کیا ہے۔"

"چھت سے کیسے فرار ہوئے؟" اختر نے بے چینی سے کہا۔ "میرے آدمی چھت پر پہنچ رہے ہیں۔"

"انہوں نے ایک اسکول کی چھت تک رسی باندھی اور اس سے فرار ہوئے ہیں۔ میں بھی رسی سے نیچے آیا ہوں۔" عمران ... نے لوکیشن بتائی۔ "پولیس کو فوری طور پر اس علاقے اور آس پاس کی سڑکوں کی ناکا بندی کا حکم دو، اگر آئی جی ... بر کرے تو اعلیٰ عہدیدار سے بات کرو۔"

اختر سے بات کرتے ہوئے عمران اس گلی میں داخل ہوا اور بروقت داخل ہوا تھا کیونکہ اسے دور ایک چھوٹے سے میدان میں ایک شخص نظر آیا.... اس نے سیاہ لباس اور پشت پر سیاہ بیگ باندھ رکھا تھا جو اس نے رسی سے جانے والے شخص کی پشت پر دیکھا تھا۔ اس نے اختر کو بتایا کہ ایک مشکوک فرد نظر آگیا ہے۔ عمران نے اب پاؤں اور جسم کی دوسری چوٹوں کی پروا کیے بغیر دوڑنا شروع کر دیا تھا۔ اس نے پستول والا ہاتھ جیکٹ کی جیب میں کر لیا کیونکہ پستول دیکھ کر بلاوجہ سنسنی پھیل جاتی اور ممکنہ آگے جانے والا تعاقب سے واقف ہو جاتا۔ وہ اس سے کم سے کم دو سو گز دور تھا اور معمول سے تیز رفتار سے جا رہا تھا۔ اختر نے بتایا کہ آس پاس موجود پولیس اس علاقے کی طرف جا رہی ہے اور وہ چند منٹ میں وہاں پہنچ رہی ہے۔ بیگ والا میدان سے دائیں طرف ایک گلی میں مڑ گیا۔ بیلنس کا سوچ کر اس نے اختر سے کہا۔

"تم مجھے اسی نمبر پر کال کرو۔"

اختر نے اسے کال بی ... اس نے عمران ... کو بتایا کہ رینجرز کے دستے آگے سڑکوں پر ناکا بندی کر رہے ہیں۔ عمران نے حکم دیا۔ "پیدل یا گاڑی میں جانے والے ہر فرد کی مکمل تلاشی لی جائے کسی کو تلاشی کے بغیر نہ جانے دیا جائے چاہے اس کے ساتھ عورتیں اور بچے کیوں نہ ہوں۔"

اب بیگ والا اس سے سو گز آگے تھا۔ اس نے ایک بار بھی پلٹ کر نہیں دیکھا تھا۔ وہ پوری طرح پُر اعتماد تھا کہ کوئی اسے پکڑ نہیں سکتا... اور یہی اعتماد اسے لے ڈوبنے والا تھا۔ عمران نے اسے ایک اور گلی میں مڑتے دیکھ کر اندازہ کیا کہ وہ کس طرف نکل سکتا ہے پھر وہ اس کے متوازی گلی میں آیا اور ہر ممکن تیزی سے اس کے سر تک پہنچا۔

اس وقت تک بیگ والا گلی کے سرے تک آ گیا تھا۔ عمران .... نے کونے سے جھانکا اور اسے اپنی طرف آتا دیکھ کر دیوار سے چپک گیا۔ جیسے ہی وہ ذرا آگے نکلا، عمران .... نے عقب سے اس پر پستول تانتے ہوئے کہا۔ "رک جاؤ اور دونوں ہاتھ اوپر کر لو۔"

وہ رک گیا پھر اس نے سکون سے کہا۔ "عمران سجاد... تم زندہ ہو؟"

"ہاں... تم نے ابھی تک ہاتھ اوپر نہیں کیے۔"

وسط ایشیائی عمران ... کی طرف مڑا۔ "میں ہاتھ اوپر نہیں کروں گا تو تم کیا کرو گے؟"

"میں تمہیں شوٹ کر دوں گا۔"

"کر دو.... بعد میں بھی میرا یہی انجام ہونا ہے۔" اس نے بے پروائی سے کہا۔ "پھانسی سے پہلے تفتیش کے نام پر مجھے مار دیا جائے گا۔"

"میں آخری بار کہہ رہا ہوں ہاتھ اوپر کر لو۔" عمران نے سخت لہجے میں کہا۔ اس کی انگلی لبلبی پر دباؤ ڈال رہی تھی۔ "تمہارے دونوں ساتھی کہاں ہیں؟"

"وہ یہاں سے جا چکے ہیں اور باقی سب مر چکے ہیں۔ تمہارے ہاتھ کچھ نہیں آئے گا۔"

"میرے ہاتھ تم آؤ گے۔"

"نہیں دوست، میں بھی تمہارے ہاتھ نہیں آؤں گا۔ تم مجھے شوٹ کر سکتے ہو گرفتار نہیں۔"

"میں تمہارے دونوں گھٹنے چھلنی کر دوں گا تو تم مرو گے نہیں۔"

"لیکن اگر میں اپنا پستول نکالنے کی کوشش کروں تو تم یقیناً میرے سینے یا سر میں گولی مارو گے۔" اس نے کہا اور اس کا ہاتھ جیکٹ کی جیب کی طرف بڑھنے لگا۔

"میں کہہ رہا ہوں، رک جاؤ۔" عمران بولا۔

"تم مجھے شوٹ کیوں نہیں کر رہے ہو۔" اس نے کہا اور تیزی سے جیکٹ میں ہاتھ ڈال کر پستول نکالنے کی کوشش کی لیکن عمران ... نے فائر کر دیا۔ وہ جھٹکے سے پیچھے گیا اور اس کا پستول ہاتھ سے نکل کر دور جا گرا تھا۔ عمران آگے بڑھا اور اس کے سینے پر پاؤں رکھ کر کہا۔

"یہ تمہاری غلط فہمی تھی کہ میں تمہیں شوٹ کر دوں گا۔ بازو پر گولی لگنے سے تم مرو گے نہیں۔" عمران ... نے کہتے ہوئے اس کے سر پر پستول کا دستہ مارا اور وہ بے ہوش ہو گیا۔ عین اس وقت وسط ایشیائی کا ایک ساتھی سڑک عبور کرتے ہوئے رینجرز کی نظر میں آیا اور للکارنے پر اس نے بھاگنے

کی کوشش کی مگر اسے موقع نہیں ملا۔ ایک رینجرز اہلکار نے اس پر فائر کر دیا اور وہ گر گیا۔ جب رینجرز اس تک پہنچے تو وہ دم توڑ رہا تھا۔ اس دوران میں اختر اور اس کے آدمی پہنچ گئے تھے۔ عمران ان کی رہنمائی کر رہا تھا۔ اس نے بے ہوش وسطی ایشیائی کو اختر کے ہمراہ اسپتال روانہ کیا۔ اس نے اسے سخت ہدایت دی کہ زخمی کو مسلسل اپنی نگرانی میں رکھنا ہے اور کسی کی تحویل میں نہیں دینا ہے۔ اسے دوسرے دہشت گردوں کے مارے جانے کی اطلاع ملی۔ پچاس کروڑ روپے کی رقم میں سے دو تہائی ان دونوں کے پاس سے نکل آئی تھی مگر ان کا تیسرا ساتھی غائب تھا۔ آئی جی اور دوسرے لوگ بھی وہاں پہنچ گئے تھے۔

سی ایم اور دوسرے لوگوں کو باندھے جانے والے بم نقلی نکلے تھے اور صرف شہاب الدین کو لگایا جانے والا بم اصلی تھا۔ وہ بے چارہ قربانی کا بکرا ثابت ہوا تھا۔ بے ہوش پولیس کمانڈوز کو اسپتال منتقل کیا گیا تھا انہیں کوئی زہر دیا گیا تھا اور ان کی حالت ٹھیک نہیں تھی لیکن ڈاکٹروں کا خیال تھا وہ بچ جائیں گے۔ یرغمالیوں اور پولیس کمانڈوز میں سے چودہ افراد مارے گئے تھے جبکہ دہشت گردوں میں.... پچیس میں سے تئیس مارے گئے اور ایک گرفتار تھا صرف ایک فرار میں کامیاب ہوا تھا اور اس کی تلاش جاری تھی۔ مگر عمران .... مطمئن نہیں تھا اسے لگ رہا تھا کہ اس سارے معاملے کے پس پشت اصل کہانی کچھ اور تھی۔ یہ معاملہ ختم ہوا تو اسے رعنا کی فکر ہوئی۔ پہلے اس نے سوچا کہ اسے کال کرے لیکن پھر اس نے خود گھر جانے کا فیصلہ کیا۔ بے ہوش دہشت گرد کو لے جانے والی ایمبولینس کے ساتھ آنے والے پیرامیڈک نے عمران کی مرہم پٹی کر کے اسے اینٹی بائیوٹکس انجکشن بھی دے دیا تھا اس لیے اس نے اسپتال جانے سے انکار کر دیا۔ وہ گھر کی طرف روانہ ہوا۔ گھر کے قریب اسے راستے میں خیال آیا اور اس نے گاڑی ایک سپر اسٹور پر رکوائی۔ ڈرائیور نے کہا۔

"صاحب کچھ منگوانا ہے تو میں لا دیتا ہوں۔"

"نہیں یار مجھے ہی لانا ہے۔" وہ گاڑی سے اتر کر لنگڑاتا ہوا سپر اسٹور میں داخل ہوا اس نے وہاں دودھ کا کارٹن لیا اور واپس آ گیا۔ وہ گھر پہنچا تو رعنا برآمدے میں ستون سے سر ٹکائے بیٹھی تھی.... عمران کو دیکھ کر اس کے چہرے پر سکون آ گیا تھا اور جب عمران نے دودھ کا کارٹن سامنے کیا تو اس کی آنکھیں چھلک گئی تھیں۔

☆☆☆

سپریم کورٹ کے تین معزز جج صاحبان کے سامنے عمران سجاد موجود تھا..... جسٹس نے کہا۔ "مسٹر عمران سجاد کیا آپ کے خیال میں سپریم کورٹ کے سامنے یہ کیس پیش کرنا ضروری تھا؟"

"بالکل یور آنر۔" اس نے کہا۔ "میں نے یہ کیس پہلے تمام اخبارات کے سامنے پیش کیا۔ مگر میری تحفظات کو نظر انداز کر دیا گیا جبکہ مجھے یقین ہے اگر سب ملزموں سے پوچھ گچھ کی جائے اور سائنٹفک تفتیش کی جائے تو اصل مجرم پکڑے جا سکتے ہیں۔"

"رپورٹ بھیجے ہوئے کتنا عرصہ ہو گیا ہے؟"

"آج کے دن تین ہفتے مکمل ہو گئے ہیں۔"

"آپ چاہتے ہیں کہ سپریم کورٹ اس کیس کی سماعت کرے۔"

"بالکل یور آنر.... میرا مطالبہ ہے نہ صرف سماعت کی جائے بلکہ ذمے داروں کے خلاف فوجداری مقدمات قائم کر کے انہیں سزا دی جائے۔"

"مسٹر عمران سجاد....." جسٹس نے نرم لہجے میں کہا۔ "آپ جانتے ہیں کہ اعلیٰ عدلیہ پر کیسوں کا کتنا بوجھ ہے؟"

"جی یور آنر.... میں اچھی طرح جانتا ہوں لیکن بوجھ ہونے سے آپ یقیناً نئے کیس کی سماعت سے انکار نہیں کرنے دیں گے۔ یور آنر میری معلومات کے مطابق سپریم کورٹ میں ہر دن درجنوں نئے کیس آتے ہیں اور اعلیٰ عدالت انہیں سنتی اور فیصلہ دیتی ہے۔"

"آپ کے خیال میں یہ کیس اس قابل ہے کہ اسے براہ راست سپریم کورٹ میں پیش کر دیا جائے؟"

"ہر لحاظ سے یور آنر.... دہشت گردی کے اس واقعے میں چھبیس افراد اپنی جان سے گئے۔" عمران نے کہا۔ "وہ سب بہت خطرناک اسلحے اور پوری پلاننگ کے ساتھ آئے تھے۔ انہوں نے صرف ایک درجن سے زیادہ یرغمالیوں اور پولیس والوں کی جان ہی نہیں لی بلکہ اپنے دو درجن ساتھی بھی موت کے گھاٹ اتار دیے۔ میں نے ایک دہشت گرد کو جو اس واردات کا سرغنہ تھا، زخمی حالت میں گرفتار کیا۔ صرف ایک دہشت گرد فرار ہونے میں کامیاب ہوا اور وہ اب تک گرفتار نہیں ہوا ہے۔"

"جو پکڑا گیا ہے، کیا اس نے اقرار کیا کہ یہ سب اس نے کیا ہے؟"

جسٹس کے سوال پر عمران نے نفی میں سر ہلایا۔

"یور آنر! اس نے اپنی زبان بند رکھی ہے لیکن اس کے خلاف ثبوت موجود ہیں اور اس کا مقدمہ دہشت گردی کی مخصوص عدالت میں چل رہا ہے۔"

"جب اس کے خلاف کیس چل رہا ہے تو اعلیٰ عدلیہ میں اس کیس کو پیش کرنے کا مقصد؟" تیسرے جج نے پہلی بار سوال کیا۔

"جنابِ! میں اس کیس کا دوسرا پہلو سپریم کورٹ میں پیش کرنا چاہ رہا ہوں۔ معزز جج صاحبان مجھے اجازت دیں کہ میں اپنی رپورٹ کا خلاصہ پیش کروں اس کے بعد یقیناً معزز عدالت کے لیے فیصلہ کرنا آسان ہوگا کہ میری درخواست قابلِ سماعت ہے یا نہیں۔"

جسٹس نے سر کو خفیف سی جنبش دی۔ "آپ اپنی رپورٹ کی سمری پیش کریں۔"

عمران نے ایک چھوٹی فائل کھولی۔ "جنابِ! سب سے پہلے میں اس واقعے کے بارے کچھ حقائق پیش کرنا چاہوں گا۔ تحقیق سے پتا چلا کہ دہشت گرد واقعے سے تین گھنٹے پہلے این ٹی ٹی میں داخل ہوئے اور انہوں نے لفٹس کے اوپر موٹرز اور کیبل کے لیے بنے مخصوص کیبن میں جائے پناہ بنائی۔ انہوں نے دو الگ الگ خانوں میں جگہ بنائی اور اپنے سامان سمیت وہیں چھپے رہے۔ انہوں نے اندر تک رسائی کیسے حاصل کی اس کا جواب این ٹی ٹی کی سیکیورٹی کے پاس نہیں ہے۔ پولیس نے اسٹاف کے کئی افراد کو گرفتار کیا لیکن چند دن بعد بغیر کسی وجہ کے چھوڑ دیا۔ نہ ہی پولیس نے اپنی رپورٹ میں واضح کیا کہ انہوں نے گرفتار شدگان سے کیا تحقیق کی۔ وہ ان کی بے گناہی کے کس طرح قائل ہوئے اور انہوں نے بغیر عدالت میں پیش کیے ان افراد کو کیسے چھوڑ دیا۔ یہ ایک اہم نقطہ ہے۔"

عمران سجاد نے صفحہ پلٹا۔ "این ٹی ٹی کی سیکیورٹی میں بارود اور اسلحے کی نشان دہی کرنے والے جدید ترین اسکینرز نصب ہیں اور ان کی کارکردگی بالکل درست پائی گئی لیکن یہ اسکینرز دہشت گردوں کو اسلحے سمیت پکڑنے میں ناکام رہے۔ یہ دوسرا نقطہ ہے یور آنرز۔۔۔۔ این ٹی ٹی کی سیکیورٹی میں کیمروں کا اہم ترین کردار ہے اور یہ کیمرے چوبیس گھنٹے کام کرتے ہیں مگر کوئی ایک کیمرا بھی ان دہشت گردوں کی آمد ریکارڈ نہیں کرسکا۔ واقعے سے دو دن پہلے رات دو سے تین بجے کے درمیان کیمرے پُراسرار طور پر بند پائے گئے۔ این ٹی ٹی کے کنٹرول روم کے رات کے سپروائزر کا بیان ہے کہ کمپیوٹر سسٹم میں کسی خرابی کی وجہ سے یہ کیمرے بند ہوئے تھے۔ مگر حالات بتا رہے ہیں کہ یہ کام جان بوجھ کر کیا گیا ہے۔ مین سیکیورٹی بھی ناکام رہی اور وہ ان کو دیکھنے اور روکنے میں ناکام رہے۔" عمران نے کہتے ہوئے اگلا صفحہ پلٹا۔

جسٹس نے پوچھا۔ "کیا ان تمام مشکوک خرابیوں اور کوتاہیوں کی باقاعدہ تفتیش کی گئی؟"

عمران نے نفی میں سر ہلایا۔ "یور آنر جب میں نے سرغنہ کو زندہ گرفتار کیا تو اس کے دو گھنٹے بعد ہی کیس کا چارج پولیس نے سنبھال لیا تھا اور اگلی صبح مجھے باضابطہ بتا دیا گیا کہ اب اس کیس سے میرا تعلق نہیں ہے۔"

"اوکے کیری آن۔۔۔۔!" جسٹس نے کہا۔

"افتتاحی تقریب سے چوبیس گھنٹے پہلے پولیس کمانڈوز اور عام پولیس نے این ٹی ٹی کی سیکیورٹی اپنے ذمے لی۔ بم ڈسپوزل نے پوری عمارت کو چیک کیا اور کلیئر قرار دیا۔ ان کی رپورٹ میں لفٹس بھی کلیئر ہیں جبکہ دہشت گرد لفٹس کے اوپر موجود خانوں میں چھپے تھے اور یہ کوئی خفیہ جگہ نہیں ہے یہاں تک رسائی بہت آسان ہے لیکن نامعلوم وجوہات کی بنا پر لفٹیں چیک نہیں کی گئیں۔ اس کے علاوہ این ٹی ٹی کا کنٹرول روم جہاں سے کیمرے اور دوسرے آلات استعمال ہوتے تھے، وہ بند کردیا گیا۔ یوں دہشت گردوں کو مکمل آزادی مل گئی کہ وہ کسی کی نظروں میں آئے بغیر پوری عمارت میں دندناتے پھریں۔"

"آپ کے خیال میں دہشت گردوں کو یہ آزادی دی گئی تھی؟" جج نمبر دو نے سوال کیا۔

"میری رائے ہاں میں ہے لیکن میں اس کا فیصلہ نہیں کرسکتا یہ عدالت کا کام ہے۔" عمران نے کہا۔

"اس موقع پر باہر میں آپریشن کون تھا؟" چیف جسٹس نے پوچھا۔ عمران نے گہری سانس لی۔

"یور آنر درحقیقت کوئی بھی نہیں۔۔۔۔ باہر موجود رینجرز بھی کمان کے بغیر تھی اور کسی ہنگامی صورت حال میں اس کے پاس کوئی ہدایت موجود نہیں تھی۔"

"یہ تو ایسا لگ رہا ہے کہ دہشت گرد جتنے منظم اور پلاننگ کے تحت تھے، سیکیورٹی ادارے بالکل منتشر اور بغیر کسی پلاننگ کے تھے۔" جج نمبر تین نے تبصرہ کیا۔

"بدقسمتی سے کچھ ایسا ہی تھا یور آنر۔" عمران نے کہا۔ "دہشت گردوں نے سب اپنی پلاننگ کے مطابق کیا اور ایک ایک اسٹیپ پہلے سے طے شدہ تھا۔"

"کیا گرفتار شدہ دہشت گرد نے اس کا اعتراف کیا ہے؟"

"نہیں یور آنر! اس نے پولیس سے کسی قسم کا کوئی تعاون نہیں کیا ہے۔ ہمیں اس کا اصل نام تک نہیں معلوم ہے۔ ماہرین کا کہنا ہے اس کا تعلق وسط ایشیا کے کسی ملک سے ہے۔ فنگر پرنٹس ریکارڈ اور تصاویر سے بھی کوئی مدد نہیں مل سکی۔"

"بلاشبہ دہشت گردوں نے بہت پلاننگ سے کام کیا لیکن آخر میں کیا ہوا۔ وہ درجن مارے گئے اور ایک گرفتار ہوا صرف ایک بچ کر نکل سکا۔ تاوان کی رقم کا دو تہائی حصہ واپس مل گیا۔ اس لحاظ سے وہ ناکام رہے۔" چیف جسٹس نے کہا۔

"بظاہر ایسا ہی لگ رہا ہے یور آنر۔" عمران ۔۔۔ نے کہا۔ "لیکن واقعاتی شواہد سے کچھ چیزیں واضح ہیں۔ اول آرمرڈ ٹرک میں دھماکا ان دہشت گردوں کی پلاننگ تھی جو این ٹی بی کی چھت سے فرار ہوئے۔ اس طرح انہوں نے مرنے والے دہشت گردوں سے کام لیا اور جب کام نکل گیا تو ان سے چھٹکارا حاصل کر لیا۔"

"مسٹر عمران سجاد تمہارا مطلب ہے اصل ماسٹر مائنڈ وہی تینوں تھے؟" جج نمبر دو نے پوچھا۔

"یہ بات تقریباً درست ہے یور آنر۔ کیونکہ اصل رقم ان کے پاس تھی اور آرمرڈ ٹرک میں جعلی کرنسی تھی۔"

"اس کا مقصد کیا ہو سکتا ہے؟"

"یور آنر دھماکے کے بعد اگر ٹرک سے کرنسی نہ ملتی تو فوراً شک جاتا کہ کرنسی اور اصل لوگ کہاں ہیں۔" عمران ۔۔۔ نے کہا۔ "اس لیے دہشت گردوں نے اصل کرنسی اپنے پاس رکھی اور ٹرک میں جعلی کرنسی چھوڑ دی تھی۔ تاکہ انہیں فرار کا موقع ملے۔"

اعلیٰ جج صاحبان کے تاثرات بتا رہے تھے کہ بات سمجھ میں آ رہی ہے۔ جسٹس نے کہا۔ "اس کے باوجود دہشت گرد ناکام رہے۔ صرف ایک فرار ہو سکا اور اگر گرفتار شدہ ملزم زبان کھول دے تو وہ بھی گرفتار ہو سکتا ہے۔"

"ایسا بالکل ممکن ہے یور آنر۔" عمران ۔۔۔ نے کہا۔ "ان کا منصوبہ بڑی حد تک ناکام رہا۔ کیونکہ میں این ٹی بی میں موجود تھا اور میں نے کسی حد تک بھانپ لیا تھا کہ دہشت گرد دھوکا دے رہے ہیں اور ان کا ارادہ وہ نہیں جو وہ بیان کر رہے ہیں۔ ان میں سے تین افراد این ٹی بی میں رہے اور پھر چھت کے راستے فرار ہوئے۔ اگر میں ان کا تعاقب نہ کرتا تو وہ یقیناً نکل جاتے کیونکہ اس علاقے میں کوئی سکیورٹی نہیں تھی۔"

"تم یہ کہنا چاہ رہے ہو مسٹر سجاد کہ دہشت گرد تمہاری وجہ سے ناکام ہوئے۔۔۔؟" جسٹس نے کہا۔

"نہیں یور آنر، میں یہ کہنا چاہ رہا ہوں کہ میری وجہ سے ان کے منصوبے کا ایک حصہ بڑی حد تک ناکام رہا لیکن اس سارے معاملے کے پس پشت جو لوگ تھے ان کا اصل منصوبہ پوری طرح کامیاب رہا۔"

"مسٹر عمران سجاد تم کیا کہنا چاہتے ہو؟" جسٹس نے اس بار سرد لہجے میں کہا۔ "کھل کر اور ٹو دی پوائنٹ بات کرو۔۔۔ عدالت کا وقت یقیناً قیمتی ہے۔"

"مجھے عدالت کے وقت کا احساس ہے یور آنر۔" عمران ۔۔۔ نے ادب سے کہا۔ "لیکن مجھے آپ کے بہت سے سوالوں کے جوابات دینے پڑ رہے ہیں اس لیے تفصیل طول کھینچ رہی ہے۔ اب میں اس رپورٹ کی طرف آتا ہوں۔ جب کیس باضابطہ طور پر میرے شعبے سے لے لیا گیا تو میں نے اپنے طور پر کچھ تحقیقات کیں اور اس نتیجے پر پہنچا کہ اس کے پس پردہ کوئی اور شخص ملوث ہے۔ وہی شخص جس نے سکیورٹی پروٹوکول کو بالائے طاق رکھوایا۔ جس نے این ٹی بی میں دہشت گردوں کو سہولت اور آسانی فراہم کی۔ اصل سوال جس نے مجھے متوجہ کیا، وہ اس واقعے سے اٹھایا جانے والا فائدہ تھا۔

"جب دہشت گرد یرغمالیوں کو ہلاک کر رہے تھے اور ٹی وی پر اسے دکھایا جا رہا تھا۔ اس کا سب سے منفی اثر اس شہر کی اسٹاک مارکیٹ پر پڑ رہا تھا۔ اسٹاک مارکیٹ تقریباً کریش ہو گئی۔ اگلے دن جو سروے تفصیلات سامنے آئیں اس کے مطابق اسٹاک مارکیٹ گرنے سے سرمایہ کاروں کو کھربوں روپے کا نقصان ہوا۔ یور آنر میں نے یہ جاننے کے لیے کہ اس روز اسٹاک مارکیٹ میں کیا ہوا، کئی سرمایہ کاروں اور اسٹاک بروکرز سے بات کی اور اس سے یہ تصویر سامنے آئی کہ اسٹاک کی قیمت مجموعی طور پر پندرہ سے بیس فیصد گری تھی۔ کہیں کہیں یہ قیمت ساٹھ سے ستر فیصد گری تھی۔ لیکن مشہور اور معروف کمپنیوں کے اسٹاک کی قیمت بیس فیصد سے زیادہ نہیں گری تھی اور بعض کمپنیاں غیر معمولی نقصان سے محفوظ رہیں۔ میرے علم میں یہ عجیب بات آئی ہے۔ ماہرین کا کہنا ہے کہ جب اسٹاک کی قیمت گرتی ہے تو سرمایہ کار اپنا سرمایہ لگانے سے گریز کرنے

ہیں۔ مگر اس روز شام کے وقت اچانک ہی تین بروکرز اور اسٹاک فرموں کی طرف سے معروف کمپنیوں کے شیئرز کی بڑے پیمانے پر خریداری کی گئی۔ یور آنر خریدے گئے شیئرز کی مالیت تقریباً ایک کھرب روپے بنتی ہے اور یہ تمام شیئرز صرف تین اسٹاک بروکرز فرموں نے خریدے اور تمام خریداری اسٹاک ایکسچینج کے آخری گھنٹے میں ہوئی۔ اس وقت شیئرز کی قیمت گراوٹ کے آخری حصے میں تھی۔ صرف ایک ہفتے بعد جب اسٹاک مارکیٹ اپنا انڈکس پوائنٹ پھر سے حاصل کر چکی تھی اور ایک ہفتہ پہلے سو ارب روپے میں حاصل کیے گئے شیئرز کی قیمت ایک سو چالیس ارب روپے ہو چکی تھی تو مزید ایک ہفتے کے دوران میں انہیں قسطوں میں فروخت کر دیا گیا۔ یوں ان تین فرموں نے صرف دو ہفتے میں چالیس ارب روپے کی خطیر رقم چھوٹے سرمایہ کاروں کی جیب سے نکلوائی۔"

"مسٹر عمران سجاد، یہ آپ کس طرح کہہ سکتے ہیں۔" جسٹس نے سوال کیا۔ "اسٹاک ٹریڈنگ ایک قانونی بزنس ہے اور کوئی بھی سرمایہ کار اس میں اپنا سرمایہ لگا سکتا ہے۔ ممکن ہے اسٹاک کی گری قیمت سے فائدہ اٹھا کر ان تین فرموں نے سرمایہ کاری کی ہو؟"

"میں آپ سے متفق ہوں یور آنر۔" عمران سجاد نے جواب دیا۔ "اگر یہ تینوں فرمز این ٹی ٹی کے مالک مسٹر عمران اکبر کی ملکیت نہ ہوتیں تو میں بھی یہی سمجھتا۔ مجھے یقین ہے کہ اس واقعے کے پیچھے عمران اکبر اور حکومت کے چند افراد کا ہاتھ ہے جنہوں نے اس سے فائدہ اٹھایا۔ اصل شخص عمران اکبر ہے اور باقی بھاری مالی فائدے کے لیے اس کے آلۂ کار بنے۔ اگر عدالت اس واقعے کی مکمل تحقیق کا حکم دے تو جلد یہ لوگ بھی کھل کر سامنے آجائیں گے۔ میرے پیش کیے حقائق کی بنیاد پر تفتیش کر کے بدنما مالی واقعے کے ذمے داروں تک پہنچا جا سکتا ہے اور انہیں عدالت کے کٹہرے میں طلب کیا جا سکتا ہے۔"

تینوں ججوں نے آپس میں کچھ تبادلہ خیال کیا اور پھر عدالت آدھے گھنٹے کے لیے برخاست کر دی گئی۔ آدھے گھنٹے بعد جج اپنے چیمبر سے باہر آئے اور انہوں نے عمران سجاد کی درخواست قبول کرنے اور اس کیس کی انکوائری کرنے کا اعلان کیا۔

☆☆☆

عمران اپنے دفتر میں اخبار دیکھ رہا تھا۔ سپریم کورٹ نے این ٹی ٹی کیس میں ایف آئی اے کو تفتیش کا حکم دیا اور

ساتھ اس کیس میں شامل تمام مشکوک افراد کے نام ایگزٹ کنٹرول لسٹ میں ڈالنے کا حکم دیتے ہوئے پندرہ دن بعد باقاعدہ سماعت کی تاریخ دے دی تھی۔ وہ مسکرایا۔ وہ اچھی طرح جانتا تھا کہ قانون کی چکی سست چلتی ہے لیکن بہت باریک پیستی ہے۔ یہ کیس اپنے منطقی انجام کو ضرور پہنچے گا۔ اس کی مفصل رپورٹ میڈیا پر آچکی تھی اور آج اس پر زور و شور سے پروگرام چل رہے تھے۔ غلام علی کچھ دیر پہلے اس کے لیے چائے رکھ کر گیا تھا۔ اس نے چائے اٹھائی اور رعنا کا نمبر ملایا۔ "کیسی ہو..... صبح میں نکلا تو تم سو رہی تھیں۔"

"ٹھیک ہوں لیکن طبیعت سست ہے۔" رعنا نے کہا۔ "مجھے یہاں کا موسم راس نہیں آیا ہے۔"

"ممکن ہے کچھ عرصے میں تمہیں یہاں کے موسم سے چھٹکارا مل جائے۔" عمران نے کہا۔ اسی لمحے اسد اللہ دروازے پر دستک دے کر اندر آیا اور اس کے سامنے ایک سیل لفافہ رکھ کر واپس چلا گیا۔ عمران نے پیپر نائف سے سیل اور لفافہ کھولا۔ اس میں وفاقی حکومت کی طرف سے خط تھا کہ اس کی خدمات صوبے سے واپس لے لی گئی تھیں اور اسے ہدایت کی گئی تھی کہ ایک ہفتے کے اندر واپس دارالحکومت میں رپورٹ کرے۔ وہ ایک طرف خط پڑھ رہا تھا اور دوسری طرف رعنا کی بات سن رہا تھا جو کہہ رہی تھی کہ اسے اپنا شہر اور اپنا گھر بہت یاد آرہا ہے۔ وہ چپ ہوئی تو عمران نے ہنس کر کہا۔ "مبارک ہو اللہ نے تمہارے شکوے سن لیے ہیں۔"

"کیا مطلب؟"

"مطلب یہ کہ ہم ایک ہفتے میں واپس جا رہے ہیں، اب تم سب سے پہلے ڈاکٹر سے مشورہ کرو کہ تم فضائی سفر کر سکتی ہو یا نہیں۔"

رعنا فکرمند ہو گئی۔ "عمران۔ کیا آپ کا....."

"ٹرانسفر ہو گیا ہے۔" اس نے بات مکمل کی۔ "لیکن تم فکر مت کرو مجھے اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا کیونکہ میں کام کرنے والا آدمی ہوں اس لیے ہر جگہ کام کر سکتا ہوں۔"

فون رکھ کر اس نے چائے کی پیالی اٹھالی۔ اس کے چہرے پر سکون تھا کیونکہ اسے پورا اعتبار تھا جلد وہ وقت آئے گا جب اس ملک میں انصاف ہوگا۔ حق دار کو اس کا حق ملے گا اور سزا وار کو سزا ملے گی۔

قربانی کا بکرا

تنویر ریاض

حسابی گوشوارہ مرتب کرنا ذہین لوگوں کا کام ہے... ذہانت ہی خرد بُرد اور نقصان کو مفادات میں بدلنے کی راہیں سجھاتی ہے... ایک ایسی ہی حسابی کہانی کا گوشوارہ... جو انسان کی سیمابی فطرت کے مطابق الجھتا جارہا تھا...

ہندسوں کے کھیل میں زندگی کو داؤ پر لگا دینے والوں کا قصہ...

ایک ایسی لڑکی سے انٹرویو کرنا میرے لیے مشکل مرحلہ تھا جو سمجھتی تھی کہ مردوں کے ساتھ اس کے مسائل ہیں۔ وہ اسپتال میں داخل تھی اور اس کے جسم پر گولیوں کے زخم تھے۔ اس عورت کی دو مرتبہ شادی ہو چکی تھی اور جلد ہی دوسری بار بھی طلاق ہونے والی تھی جبکہ ابھی وہ تینتیس سال کی بھی نہیں ہوئی تھی۔ میں ایک تربیت یافتہ نفسیاتی مشیر بھی ہوں اور لوگوں کی نفسیات کو سمجھنے کی تھوڑی بہت صلاحیت رکھتی ہوں۔ خاتون شٹ کے بارے میں جو ابتدائی معلومات

دستیاب ہوئی تھیں، ان سے میں نے یہی نتیجہ اخذ کیا تھا کہ نتالی ایک ایسی عورت ہے جو فوری طور پر اپنی پسند اور ناپسند کے زیر اثر آجاتی ہے اور اس وقت اس کی جو حالت تھی، اس میں یہ رجحان مزید مضبوط ہو گیا تھا۔ اسی لیے میں اس کی جانب سے کسی ایسے تاثر کی توقع کر رہی تھی جو میری کوششوں کو کمزور کر سکتا تھا۔

میں جان بوجھ کر اس کے برابر والے بستر پر گئی اور آہستہ سے بولی۔ ”کیا میں صحیح جگہ پر آئی ہوں مسز نتالی شمٹ؟“

”میں نتالی شمٹ ہوں۔“ پردے کی دوسری جانب سے ایک ادھ مری ہوئی آواز آئی۔ ”ادھر آجاؤ۔“

میں اس کے سرہانے پہنچی تو دیکھا کہ اس کے جسم کو مختلف مشینوں اور ٹیوبوں نے جکڑ رکھا ہے جس کی وجہ سے وہ کافی بے آرامی محسوس کر رہی تھی۔ اس کے بال سرخ اور جسم فربہ تھا لیکن مجھے اس کا چہرہ بے رونق نظر آیا۔ چادر کے نیچے اس کے جسم کا دایاں حصہ قدرے اوپر کی جانب اٹھا ہوا تھا۔ غالباً اسی جگہ اسے گولی لگی تھی۔

”تم کون ہو؟“ اس نے بیزاری سے پوچھا۔

”میں مسز کارکی معاون ہوں۔“ میں نے جواب دیا۔ ”وہ کسی وجہ سے نہیں آسکے لیکن انہوں نے مجھے کچھ سوالات دیے ہیں۔ اگر تم بہتر محسوس کر رہی ہو تو ٹھیک ہے ورنہ میں بعد میں بھی آسکتی ہوں۔ دراصل مجھے اس راستے کا پتا نہیں تھا اس لیے آنے میں تھوڑی سی دیر ہو گئی۔ امید ہے کہ تم برا نہیں مانو گی۔“

”ٹھیک ہے، بیٹھ جاؤ۔“ اس نے گہری سانس لیتے ہوئے کہا۔

میں نے کرسی گھسیٹ کر اس کے بستر کے پاس کی اور بیٹھتے ہوئے بولی۔ ”میرا پہلا سوال یہ ہے کہ کیا تمہیں اس واقعے کے بارے میں کوئی نئی بات یاد آئی؟“

اس نے کراہتے ہوئے کہا۔ ”اسے بتا دینا کہ مجھے بہت کم باتیں یاد رہی ہیں۔“

”ایسا کیوں ہے؟“ میں نے پوچھا۔ ”کیا یہ دواؤں کی وجہ سے ہے۔ یقیناً وہ بہت ہولناک واقعہ تھا۔“

”کیا تمہیں معلوم نہیں۔ میں خوش قسمت ہوں کہ بچ گئی۔ میری سوتیلی بہن الزبتھ، اس کا شوہر آرث اور ایک تیسرا شخص جس نے مجھ پر گولی چلائی تھی، وہ مر گیا اور کسی کو معلوم نہیں کہ وہ کون تھا۔ کیا میں وہ آرٹیکل رپورٹر نہیں؟“

”ہرگز نہیں۔“ میں نے اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔ ”مسز کار اس بارے میں کچھ نہیں جانتے۔ وہ اس کا کھوج لگانے کی کوشش کر رہے ہیں اور اسی لیے میں یہاں آئی ہوں۔ وہ تمہاری کمپنی کے سیکیورٹی مشیر ہیں اور ان کا نام غلط طریقے سے اس کتاب میں شامل کیا گیا جو ان کی ساکھ کے لیے خطرناک ہے۔“

میں نے لمحہ بھر رک کر اس کے تاثرات جاننا چاہے پھر اپنی بات جاری رکھتے ہوئے بولی۔ ”خیر، اب میں دوسرے سوال کی جانب آتی ہوں۔ تم کتنے عرصے سے ریٹ لیب میں کام کر رہی ہو اور اس سے پہلے کہاں ملازمت کرتی تھیں؟“

”میں نے نومبر 94ء میں کام شروع کیا تھا اور مجھے الزبتھ نے ہی اس کے بارے میں بتایا تھا۔ اس سے پہلے میں فائیو کاؤنٹی ایمبولنس کے دفتر میں کام کیا کرتی تھی لیکن مجھے وہ ملازمت چھوڑنا پڑی کیونکہ وہاں دونوں منیجرز مجھے ہراساں کرتے تھے۔ میرا مطلب جنسی طور پر ہراساں کرنا نہیں بلکہ میں ان کے لیے خطرہ تھی کیونکہ اسمارٹ اور اپنے کام میں ماہر ہونے کی وجہ سے بحث کرنے سے نہیں ڈرتی تھی اور وہ اسے برداشت نہیں کر سکتے تھے۔“

”امید ہے کہ ریٹ لیب میں تمہیں بہتر ماحول ملا ہوگا؟“

”ہاں، فرق یہ پڑا کہ یہاں ایک عورت میری باس تھی۔“

”اور مسٹر کولبو؟“

”وہ میرے معاملے میں نہیں بولتا تھا۔“

”مجھے یہ جان کر خوشی ہوئی۔“ میں نے پیڈ پر لکھتے ہوئے کہا اور اگلا سوال داغ دیا۔ ”پولیس کی رپورٹ واضح نہیں ہے، تم دوسرے متاثرین کے ساتھ کیوں نہیں تھیں؟“

”میں غسل خانے میں تھی۔ میرا کیبن پچھلے حصے میں ہے اور میں وہاں بیٹھ کر گھر جانے کے لیے گاڑی کا انتظار کر رہی تھی۔“

”کیا تم سمجھتی ہو کہ قاتل کو تمہارے خاندان سے کوئی دشمنی تھی؟“ میں نے اگلا سوال کیا۔ ”اور اگر ایسا ہے تو کیا تم اس کی ممکنہ وجہ بتا سکتی ہو؟“

”نہیں۔“ اس نے وثوق سے کہا۔ ”ولیکن الزبتھ اور آرث کے درمیان جھگڑا ہوتا رہتا تھا اور وہ شاید...“

”یہ بات تم یقین سے کہہ رہی ہو یا تمہارا اندازہ ہے؟“

''صرف اندازہ۔ الزبتھ اور میں حقیقی بہنوں کی طرح قریب نہیں تھے۔ میری ماں اور اس کے ڈیڈی کی ملاقات ہوئی تو میں گیارہ اور الزبتھ اٹھارہ سال کی تھی۔''

میں نے کاغذ پر لکھے سوالوں پر نظر دوڑائی اور کہا۔ ''یہ سوال یہاں نہیں لکھا لیکن میں اپنے طور پر پوچھ رہی ہوں۔ میرا خیال ہے کہ تمہاری شوہر سے علیحدگی ہوگئی ہے۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ وہ تمہیں پریشان کر رہا ہو اور اس نے تمہیں خوف زدہ کرنے کے لیے کسی شخص کو بھیج دیا ہو؟''

''ہمارے پاس کوئی جائداد نہیں ہے اور نہ ہی بچے ہیں۔ ہمارے درمیان طلاق کے مسئلے پر بھی کوئی اختلاف نہیں تھا لہٰذا وہ ایسی حرکت کیوں کرے گا؟''

''بس یونہی مجھے خیال آیا۔ اس لیے پوچھ لیا۔'' میں نے تھوڑا سا خجل ہوتے ہوئے کہا۔ ''اپائنٹمنٹ بک میں مسٹر کار کے آنے کا وقت ساڑھے چار بجے لکھا ہوا ہے۔ کیا تم اس بارے میں کچھ جانتی ہو؟''

''ہاں، میں جانتی ہوں۔ یہ وقت انہوں نے ہی دیا تھا۔'' وہ زور دیتے ہوئے بولی۔

''اوہ!'' میں نے حیرت سے ہونٹ سکیڑتے ہوئے کہا۔

''میں نے ہی ان کا فون ریسیو کیا تھا۔ اس وقت میں کھانے کے وقفے میں استقبالیہ پر بیٹھی ہوئی تھی۔ انہوں نے آرٹ کے بارے میں پوچھا۔ وہ پلانٹ پر گیا ہوا تھا۔ میں نے کہا کہ اگر اس کے لیے کوئی پیغام ہو تو بتا دیں۔ انہوں نے ایک نمبر دیا اور کہا کہ آرٹ انہیں فون کرلے۔ آرٹ نے ایسا ہی کیا اور جب میں چار بجے جانے لگی تو آرٹ اور الزبتھ نے کہا کہ مجھے کچھ دیر انتظار کرنا ہوگا کیونکہ مسٹر کار ساڑھے چار بجے سیکیورٹی کے معاملات پر بات کرنے کے لیے آرہے ہیں۔''

''لیکن وہ نہیں آیا اور الزبتھ یا آرٹ نے کسی اور شخص کو اندر آنے دیا۔ کیوں؟''

''یہ تم اپنے باس سے پوچھو۔'' وہ چلّاتے ہوئے بولی۔ ''آر جے کار سے پوچھو۔''

''کیا تم نے اس شبہے کا اظہار پولیس سے کیا تھا؟''

''نہیں، مجھے اب اس کا خیال آیا ہے۔ آرٹ اور آر جے کار ایک دوسرے کو پسند نہیں کرتے تھے۔ اس کی ہمیشہ یہ کوشش ہوتی تھی کہ آرٹ سے زیادہ سے زیادہ کام لے۔''

میں کھڑے ہوتے ہوئے بولی۔ ''مجھے شک ہے کہ تمہیں غلط اطلاع دی گئی ہے مسز شمٹ۔''

''میرا خیال ہے کہ تمہارے پاس بھی درست معلومات نہیں ہیں۔'' اس نے جواب میں کہا۔ ''تم ایک ایسے شخص کی وکالت کر رہی ہو جو بہت بڑا جھوٹا ہے۔ الزبتھ اور آرٹ مر چکے ہیں اور میں کچھ اور سوچ رہی ہوں۔ میں نے صرف ایک آدمی کو دیکھا تھا لیکن یہ بھی تو ہوسکتا ہے کہ وہ وہ ہوں اور دوسرا پہلے والے کو گولی مار کر چلا گیا ہو۔ اسی لیے باہر کوئی کار نہیں تھی کیونکہ تمہارا باس جائے وقوعہ سے اپنی غیر موجودگی ثابت کرنا چاہتا ہے۔''

میں نے جواب میں کچھ نہیں کہا تو وہ بولی۔ ''مجھے اعتراف ہے کہ فون کرنے والا کوئی اور شخص بھی ہوسکتا ہے۔ میں نے اس سے پہلے کبھی یہ آواز نہیں سنی تھی۔''

''ہاں۔'' میں نے تائید میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ''مجھے واقعی افسوس ہے کہ میں نے تمہارے آرام میں خلل ڈالا۔ تمہاری زندگی واقعی مشکل ہوگئی ہے۔ تمہارے والدین اس صورتِ حال سے کیسے نمٹ رہے ہیں؟''

''انہیں صرف الزبتھ کی موت کا غم ہے۔ یہاں تک کہ ماما جو میری سگی ماں ہیں، وہ بھی یہی کہہ رہی ہیں کہ تم خوش قسمت ہو کہ زندہ بچ گئیں۔ ان دونوں کی زبان پر بس یہی جملہ ہے۔ لہٰذا میں بھی ایسی باتوں کی پروا نہیں کرتی۔''

''ایسا مت سوچو۔ تم ان کے لیے بہت اہم ہو لیکن اس وقت وہ صدمے کی کیفیت میں ہیں۔''

''تم جانتی ہو کہ میں خود بھی بہت غم زدہ ہوں۔''

''ہاں، میں جانتی ہوں۔ کاش تمہاری کچھ مدد کر سکتی۔''

اس نے غیر یقینی کے عالم میں دیکھا اور بولی۔ ''کوئی بھی میری مدد نہیں کرسکتا۔''

''پھر تم خود اپنی مدد کرنے کی کوشش کرو۔'' میں نے زور دیتے ہوئے کہا۔

اس نے کوئی جواب دیے بغیر کروٹ بدل لی۔ غالباً اسے میری موجودگی ناگوار گزر رہی تھی یا پھر وہ تھکن اور بے آرامی محسوس کر رہی تھی۔ میں نے خدا حافظ کہا اور باہر چلی گئی۔

☆☆☆

میرا نام آر جے کار ہے۔ میں نہیں سمجھتا کہ ریٹ لیب میں ہونے والے واقعے کی تحقیقات کروں کیونکہ کسی نے

اس سلسلے میں میری خدمات حاصل نہیں کیں۔ ٹریبون میں شائع ہونے والی خبر سے مجھے پورے واقعے کا علم ہوا جس میں تین افراد مارے گئے اور ایک زخمی ہے۔ جب اتنا زیادہ خون خرابا ہو تو پولیس باہر کے لوگوں کو شامل کرنا پسند نہیں کرتی ویسے بھی اس میں تحقیقات کی کوئی ضرورت نہیں، یہ جرم خون آلود ہونے کے باوجود بہت سادہ تھا۔ ایک آدمی جولائی کے مہینے میں چیرکی سے پیرا ئی ٹیکنالوجی فیکٹری کے دفتر میں داخل ہوا اور اس نے فائر کھول دیا اس کے بعد خود کو بھی گولی مار لی۔

اس کیس میں میری شمولیت ثانوی وقائع کے زمرے میں آتی تھی۔ ریٹ لیب کارپوریشن اس واقعے کی ذمے داری سیکیورٹی کے مشیر یعنی مجھ پر ڈالنا چاہ رہی تھی۔ ان کا خیال تھا کہ میں اس حادثے کی پیش بینی اور قتل عام کو روکنے میں احتیاطی تدابیر اختیار کرنے میں ناکام رہا اور وہ میرے خلاف قانونی کارروائی کرنے کی دھمکی دے رہے تھے... کم از کم اس حادثے کے فوراً بعد کمپنی کے چیئرمین جے۔ بی۔ ہاک نے میری آنسرنگ مشین پر جو پیغام بھیجا۔ اس سے تو یہی مطلب نکلتا تھا۔

گو کہ میں جانتا تھا کہ وہ غلط ہے لیکن اس کے باوجود مجھے یہ احساس بھی ہو رہا تھا کہ شاید وہ سو فیصد غلط نہ ہو۔ لہٰذا اس معاملے میں خود ہی اپنا کلائنٹ بننا پڑ گیا تاکہ ان غلط الزامات کے خلاف اپنا دفاع کرنے کے ساتھ ساتھ یہ بھی ثابت کر سکوں کہ یہ الزامات درست نہ تھے۔ دوسری صبح میں نیند پوری نہ ہونے کے باوجود علی الصباح اٹھ گیا اور ٹیلی فون کے ذریعے اپنی دن بھر کی مصروفیات منسوخ کر دیں۔ اس کے بعد میں نے سمٹ پولیس کے چیف کو دو باتوں کے لیے فون کیا۔ ایک تو جرم کے بارے میں پولیس کا سرکاری موقف جاننے کے لیے اور دوسری یا جائے واردات کا معائنہ کرنے کی اجازت کے لیے۔ میں نے انچارج پولیس مین سے اصرار کیا کہ وہ مجھے اس جرم پر بات کرنے کے لیے ساڑھے نو بجے ملاقات کا وقت دے۔

ریٹ لیب کا قیام جنگ عظیم دوم کے دوران عمل میں آیا تھا۔ جب اس کمپنی کو فوری طور پر فوج کے شعبۂ مواصلات کے لیے شارٹ ویو اور مواصلاتی نظام کے دوسرے حصوں کی فراہمی کا کام سونپا گیا۔ ٹرانزسٹر اور دوسرے آلات کے مارکیٹ میں آجانے کے بعد یہ پلانٹ 1960ء سے بیکار پڑا ہوا تھا۔ 1983ء میں ریسرچ اینڈ انجینئرنگ ٹیکنالوجی حاصل کی گئی اور ادارے کو جدید خطوط پر استوار کیا گیا۔ جہاں انتہائی جدید قسم کے ہائی ٹیک آلات بننے لگے جن کا زیادہ استعمال طب کے شعبے میں ہوتا تھا۔

1994ء کے آغاز میں کمپنی کو حکومت کی جانب سے ایک ٹھیکا مل گیا اور بورڈ آف ڈائریکٹرز نے پلانٹ سیکیورٹی کو بہتر بنانے کے لیے کئی اقدامات کیے جن میں دن اور رات میں گارڈز کی نگہبانی کے علاوہ خطرے کے الارم کی تنصیب بھی شامل تھی۔ اس نظام کو بہتر بنانے کی ذمے داری مجھے سونپی گئی اور میں نے اس سلسلے میں کئی اقدامات تجویز کیے جن میں موشن سنسر، وڈیو کیمرے اور سوائپ کارڈ کے ذریعے پلانٹ میں داخلہ وغیرہ شامل تھے۔ میری تجاویز کو منظور کر لیا گیا اور سیکیورٹی کی نگرانی بھی مجھے سونپ دی گئی۔ لیکن بجٹ کی خاطر ان اقدامات کو صرف پلانٹ تک محدود کر دیا اور کہا گیا کہ بقیہ حصوں مثلاً پارکنگ لاٹ، مرکزی داخلی دروازہ اور دفتر کی عمارت کو بعد میں اپ گریڈ کر دیا جائے گا لیکن جولائی 1996ء تک اس کی نوبت نہیں آئی۔ البتہ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ ایک مسلح شخص کو دفتر کی عمارت میں داخل ہونے کا موقع ضرور مل گیا۔

میں نے اپنی گاڑی پارکنگ لاٹ میں کھڑی کی اور اطمینان سے چلتا ہوا دفتر کی عمارت تک پہنچ گیا۔ اتنے بڑے حادثے کے باوجود مجھے وہاں سیکیورٹی کا کوئی خاص بندوبست نظر نہیں آیا۔ البتہ دروازے پر ایک باوردی پولیس والے نے مجھے غور سے ضرور دیکھا لیکن اس نے میرا شناختی کارڈ دیکھا، نہ تلاشی لی اور نہ ہی میرا بریف کیس دیکھنے کی زحمت گوارا کی اور میں اطمینان سے اس کے پاس سے گزر گیا۔ مرکزی دفتر کے باہر ہال میں سادہ کپڑوں میں ملبوس ایک پولیس والے نے مجھے غور سے دیکھا اور قریب آکر بولا۔ ”تم آر بیچ کار ہو؟“

میں نے اثبات میں سر ہلایا تو وہ بولا۔ ”میں بریکیٹ ہوں۔ آؤ اندر چلتے ہیں۔“

وہ مڑا اور میں اس کے پیچھے پیچھے دروازے سے گزرتا ہوا اندر چلا گیا جہاں یہ واقعہ پیش آیا تھا۔ یہ استقبالیہ کمرا تھا۔ وہاں ایک خاتون اور ایک مرد اپنے کام میں مصروف تھے اور انہوں نے خون آلود قالین کے چاروں طرف زرد رنگ کا ٹیپ لگا دیا تھا جس پر نظر پڑتے ہی میرے ذہن میں سارا نقشہ گھوم گیا تاہم میں بریکیٹ کی زبانی تفصیل جاننا چاہ رہا تھا۔ اس نے کہنا شروع کیا۔

''وہ شخص ساڑھے چار بجے یہاں آیا۔ دفتر کا عملہ آدھ گھنٹا پہلے جا چکا تھا اور ڈیڑھ گھنٹے بعد پلانٹ پر رات کی شفٹ آنے والی تھی۔ تین افراد اس وقت بھی یہاں موجود تھے۔ ان میں پلانٹ منیجر آرٹ کولیبو، پرسنل ڈپارٹمنٹ کی ہیڈ الزبتھ جو آرٹ کولیبو کی بیوی بھی ہے اور نتالی شمٹ ہے رول کلرک اور الزبتھ کی سوتیلی بہن۔ اس اجنبی کو دیکھ کر کوئی جھنجھلایا اور قیاس بھی ہے کہ وہ کولیبو اور اس کی بیوی میں سے کوئی ایک ہوگا۔ دو منٹ بعد گولیاں چلنے کی آواز آئی۔ نتالی شمٹ اس وقت عقبی حصے میں واقع غسل خانے میں تھی۔ وہ یہ دیکھنے کے لیے دوڑتی ہوئی آئی کہ کوریڈور میں کیا ہو رہا ہے لیکن اس نے آدھا فاصلہ ہی طے کیا تھا کہ اجنبی نے اس کے قدموں کی آواز سن لی اور اس جانب بڑھا۔'' برکیٹ کہتے کہتے رک گیا اور اپنی بات جاری رکھتے ہوئے بولا۔ ''پھر اس نے نتالی کے دھڑ کا نشانہ لے کر گولی چلا دی۔ وہ مڑی اور الٹے قدموں بھاگنے لگی۔ وہ شخص اس پر فائر کرتا رہا لیکن اس کا نشانہ خطا ہو گیا۔ نتالی نے اپنے آپ کو دوبارہ غسل خانے میں بند کر لیا۔ اس دوران قاتل نے اس کا تعاقب کیا اور غسل خانے کے دروازے پر پانچ فائر کیے۔ ان میں سے ایک گولی اس کے بازو پر لگی۔ وہ چلائی اور فرش پر ڈھیر ہو گئی۔ قاتل واپس آیا۔ اس نے بندوق کی نال کا سوراخ اپنے جبڑے کے نیچے رکھا اور ٹریگر دبا دیا۔ پہلے دو مقتول کولیبو اور الزبتھ میز کے پیچھے مردہ پائے گئے۔ نتالی نے پندرہ منٹ انتظار کیا پھر رینگتی ہوئی غسل خانے سے نکلی اور پہلے کیبن میں جا کر پولیس کو فون کیا۔''

برکیٹ سانس لینے کے لیے رکا پھر کہنے لگا۔

''ٹھیک ہے کہ یہ ایک جرم ہے لیکن اس کے علاوہ بھی ہم بہت سی چیزوں پر کام کر رہے ہیں۔ ان میں سے پہلی بات تو یہ کہ قاتل کون تھا؟ اس کی کہیں سے شناخت نہیں ہو رہی۔ پارکنگ لاٹ میں کوئی ایسی گاڑی نہیں ملی جس پر ریٹ لیب کا مونوگرام بنا ہو۔ ابھی تک اس کی انگلیوں کے نشانات کی بھی تصدیق نہیں ہو سکی۔ نتالی یا پلانٹ کے دوسرے لوگ بھی اسے شناخت نہیں کر پائے لیکن مجھے خوشی ہے کہ تم نے صبح فون کر کے اس معاملے میں دلچسپی ظاہر کی، اب دیکھو۔''

اس نے مجھے میز سے اٹھا کر ایک موٹی سی کتاب پکڑا دی جس میں 1996ء کے روزانہ اپائنٹمنٹ درج تھے۔ میں نے ورق پلٹنا شروع کیے اور ایک صفحے پر میری نگاہ جم کر رہ گئی۔ وہاں لکھا تھا آرچے کار۔ ساڑھے چار بجے۔ سیکیورٹی میٹنگ۔''

''نتالی نے مجھے بتایا کہ اسی وجہ سے وہ لوگ وہاں رکے ہوئے تھے۔ نتالی کی کار صبح خراب ہو گئی تھی اور وہ ٹیکسی کے ذریعے دفتر آئی تھی اور واپس گھر جانے کے لیے کسی گاڑی کے انتظار میں تھی۔'' برکیٹ نے دوبارہ بولنا شروع کیا۔ ''اس نے ہمیں یہ بھی بتایا کہ جس شخص نے گولیاں چلائیں وہ تم نہیں تھے۔ کولیبو نے تمہارا جو حلیہ بیان کیا تھا اس کے مطابق تم بھاری جسامت والے بدصورت شخص ہو جبکہ قاتل کا قد صرف پانچ فٹ نو انچ تھا اور اس کے جسم یا چہرے پر کوئی پیدائشی نشان بھی نظر نہیں آیا۔ یہ رہی اس کی تصویر۔''

اس نے جیکٹ کی جیب سے تصویر نکال کر مجھے پکڑا دی جس میں مقتول کا چہرہ واضح طور پر نظر آ رہا تھا۔ چوڑا ماتھا، سیاہ گھنگریالے بال، پھیلی ہوئی آنکھیں، لمبی ناک اور چہرے پر مونچھیں، داڑھی۔

''تم اسے جانتے ہو؟''

میں نے نفی میں سر ہلا دیا۔ ''لیکن میرا اندازہ ہے کہ کوئی نہ کوئی اسے جانتا ہوگا۔ آرٹ یا اس کی بیوی۔ کھڑکی میں بلٹ پروف شیشہ لگا ہوا ہے پھر انہیں ریوالور کی نال سے نہیں ڈرنا چاہیے تھا۔''

''ایک اور مزے دار بات بھی سن لو۔'' برکیٹ نے سپاٹ لہجے میں کہا۔ ''جس ریوالور سے گولی چلائی گئی وہ کولیبو کا تھا۔ عام طور پر اس کی میز کی سب سے اوپر والی دراز میں ہوتا ہے۔ وہ ایک پرانا سروس آٹومیٹک ریوالور تھا۔ میرے پاس جو معلومات تھیں وہ بتا دیں۔ اب تمہاری باری ہے۔''

''ٹھیک ہے۔ میں تمہیں تھوڑا سا پس منظر بتاتا ہوں۔'' میں نے کہا۔ ''اپریل 1994ء میں مجھ سے یہاں کی سیکیورٹی ضروریات کا جائزہ لینے اور ان کے حل کے لیے تجاویز دینے کو کہا گیا۔ میری تجاویز منظور کر لی گئیں لیکن کمپنی نے صرف پلانٹ کی سیکیورٹی کو بہتر بنانے پر اتفاق کیا اور بقیہ حصوں پر عمل درآمد روک دیا گیا۔ اتفاقیہ طور پر میں آرٹ کولیبو کو جانتا تھا اور اس کی بیوی سے بھی مل چکا تھا۔ اس لیے یہ حادثہ میرے لیے صدمے کا باعث ہے۔ آرٹ ایک اچھا انسان ہونے کے علاوہ کمپنی سے بھی مخلص تھا۔ اس سے جب بھی سیکیورٹی کے معاملات پر بات ہوئی تو اس نے ہمیشہ کمپنی کے فیصلے کا دفاع کیا کہ

فی الوقت دفتر کی عمارت، داخلی دروازوں اور پارکنگ
لاٹ کے لیے مجوزہ تجاویز پر عمل درآمد ملتوی کر دیا
جائے۔ اس کے بعد اس موضوع پر زیادہ بات نہیں
ہوئی۔ میں یہ نہیں کہتا کہ اگر میری تجاویز پر عمل کرلیا جاتا
تو گزشتہ روز ہونے والے حادثے سے بچا جا سکتا تھا۔
لیکن ان کی وجہ سے بہت سی باتیں سامنے آ سکتی تھیں۔''

''وہ کیسے؟''

''صرف پلانٹ کے بجائے عمارت کے باہر اور اندر
ویڈیو کیمرے لگے ہوتے۔ باہر بوتھ پر ایک گارڈ بٹھا دیا
جاتا جو ہر آنے جانے والے پر نظر رکھتا۔ عمارت کے گرد
حفاظتی باڑ ہوتی اور دفتر کے لیے علیحدہ سے ویڈیو کیمرا نصب
کیا جاتا۔ اس طرح ہم کم از کم یہ معلوم کر سکتے تھے کہ حملہ
آور کیسے اندر داخل ہوا۔ ان کیمروں کی مدد سے اس واقعے
کی ویڈیو فوٹیج بھی مل جاتی۔''

''لگتا ہے کہ تم غیر ضروری خبرداری پر اصرار کر رہے
تھے۔'' برکیٹ نے چبھتے ہوئے لہجے میں کہا۔

''بالکل نہیں۔ میں نے صرف وہی چیزیں منگوائیں
جو کمپنی نے منظور کی تھیں۔ ویسے بھی میں صرف مشورہ دیتا
ہوں اور اسی کا مجھے معاوضہ ملتا ہے۔ میں کوئی چیز فروخت یا
نصب نہیں کرتا اور نہ ہی کمپنی سے کوئی کمیشن لیتا ہوں۔ میں
صرف ایسے لوگوں کی فہرست تیار کرتا ہوں جو کمپنی کو مطلوبہ
اشیا اور خدمات فراہم کر سکیں۔''

''ٹھیک ہے۔ تم اس واقعے کے بارے میں کیا کہنا
چاہو گے؟'' برکیٹ نے کہا۔

''پہلی بات تو یہ کہ مجھے تمہارا کام کرنے یا یہ بتانے
سے کوئی دلچسپی نہیں کہ اسے کس طرح کیا جائے۔ میں صرف
یہ جاننا چاہتا ہوں کہ یہ واقعہ کیوں پیش آیا۔ فی الحال اس
بارے میں کچھ معلوم نہیں۔ دوسری بات یہ کہ میرے لیے
اہم بات یہ نہیں کہ حملہ آور کون تھا بلکہ یہ جاننا زیادہ ضروری
ہے کہ وہ کسے مارنا چاہ رہا تھا۔ آرٹ، اس کی بیوی یا سالی یا
پھر تینوں کو... اس شخص کی شناخت کا سوال ثانوی نوعیت کا
ہے۔ یہ بھی دیکھنا ہوگا کہ میرا نام اپائنٹمنٹ بک میں کیوں
درج کیا گیا جبکہ ایسا کوئی اپائنٹمنٹ طے نہیں تھا۔ یہ جاننا بھی
ضروری ہے کہ اس شخص نے آرٹ کی دراز سے ریوالور کیسے
نکالا۔ میں جانتا تھا کہ یہ ریوالور اس کی دراز میں موجود ہوتا
ہے اور شاید دوسرے لوگوں کو بھی یہ بات معلوم تھی۔ میں
نے آرٹ کے علاوہ دوسرے لوگوں کو بھی سمجھایا تھا کہ
ریوالور کی موجودگی تشدد کو دعوت دینے کا باعث ہو سکتی ہے۔

''ایک بات اور۔'' میں نے لمحہ بھر توقف کرنے کے
بعد کہا۔ ''تم نے بھی شاید سنا ہو کہ آرٹ اور اس کی بیوی کے
درمیان تعلقات خوش گوار نہیں تھے۔ میں جب اپریل کے
مہینے میں یہاں آیا تو آرٹ نے مجھے بتایا تھا کہ ان کے
درمیان صلح ہو گئی ہے لیکن وہ بات اپریل کی تھی۔ دوسری
بات یہ کہ میں بچ جانے والی لڑکی شنالی سے انٹرویو کرنا چاہتا
ہوں۔ وہ جب بھی اس کے لیے تیار ہو جائے۔''

''وہ شاید تم سے بات کرنے پر تیار نہ ہو۔'' برکیٹ
اپنا کان کھجاتے ہوئے بولا۔ ''میں خود بھی اس سے بات
نہیں کر سکا۔ خوش قسمتی سے گزشتہ روز اس کا فون ایک
خاتون پولیس آفیسر نے ریسیو کیا تھا ورنہ شاید وہ ابھی تک
خاموش ہی رہتی۔''

''ایسا کیوں ہے؟'' میں نے تعجب کا اظہار کرتے
ہوئے پوچھا۔

''اس کا کہنا ہے کہ مردوں نے ہمیشہ اس کے لیے
مسائل پیدا کیے ہیں۔ لگتا ہے کہ اسے مردوں سے کوئی مسئلہ
ہے۔''

''اس کا حلیہ بتا سکتے ہو؟'' کیونکہ میں اس سے پہلے
کبھی نہیں ملا تھا۔ اس لیے یہ سوال پوچھنا پڑا۔

''اس کی عمر تیس سال، بال سرخ لمبے اور گھنگھرالے
ہیں۔ قد پانچ فٹ چار انچ، وزن تھوڑا سا زیادہ لیکن دیکھنے
میں بری نہیں لگتی۔ وہ دوسرے شوہر سے بھی طلاق لینے والی
ہے۔ شاید مردوں سے تنازعے کی ایک وجہ یہ بھی ہو۔''

''اس کے زخم کیسے ہیں؟''

''پہلو والا زخم کافی خراب ہے اور خون بھی کافی بہہ
چکا ہے۔ اس لیے میرا اندازہ ہے کہ اسے کچھ عرصہ اسپتال
میں رہنا ہوگا۔''

چند مزید معلومات کا تبادلہ کرنے کے بعد برکیٹ
مجھے اپنے ساتھ عمارت کے دوسرے حصے دکھانے لے گیا
پھر اس نے دس منٹ کے لیے مجھے تنہا چھوڑ دیا تاکہ میں گھوم
پھر کر اپنے طور پر کچھ سراغ لگا سکوں۔ جب وہ واپس آیا تو
میں نے کہا۔ ''پلانٹ پر کام ہو رہا ہے۔ یہاں کا انچارج
کون ہے اور اس کا دفتر کہاں ہے؟''

''یہ میرا مسئلہ نہیں ہے۔ میرا خیال ہے کہ اسسٹنٹ
پلانٹ منیجر ہی یہاں کا انچارج ہوگا۔ اس کا نام کارول کی
ہے۔''

☆☆☆

میں شنالی سے مل کر واپس آئی تو آرچ کار سے ٹیک

سے میرا انتظار کر رہا تھا۔ مجھے دیکھتے ہی بولا۔ ”تمہاری ملاقات کیسی رہی؟ مجھے اس کے بارے میں بتاؤ؟“

”وہ عورت شدید تکلیف میں ہے۔“ میں نے کہنا شروع کیا۔ ”اسے دو مرتبہ ڈرپ لگ چکی ہے اور مختلف دوائیں دی جا رہی ہیں۔ تاہم اسے تمہارے سوالوں کے جواب دینے میں کوئی دشواری نہیں ہوئی۔ میں نے واپس آتے ہوئے ایک نرس سے اس کی حالت کے بارے میں دریافت کیا تھا۔ اس کا کہنا تھا کہ توقع کے برخلاف اس کی صحت یابی کی رفتار بہت سست ہے لیکن اس کی زندگی کو کوئی خطرہ نہیں۔“

”کیا وہ تمہیں کوئی ایسی بات بتانے کے قابل تھی جو ہم نہیں جانتے؟“

”ایسی کئی باتیں ہیں۔ ایک تو یہ کہ اس نے چار بجے کے بعد چند منٹ ہی اپنی بہن اور بہنوئی کے ساتھ گزارے ہوں گے پھر وہ اپنے کیبن میں چلی گئی جو عمارت کے عقبی حصے میں واقع ہے۔ دوسری بات یہ کہ اس کی سوتیلی بہن نے اسے کافی تحفظ فراہم کیا ہوا تھا کیونکہ گزشتہ ملازمت میں اس کا مرد سپروائزر سے جھگڑا چلتا رہا۔ تیسری بات یہ کہ اس نے اس واقعے میں اپنے شوہر کے ملوث ہونے کے امکان کو مسترد کر دیا۔ ایک اور اہم نکتہ بھی ہے اور وہ یہ کہ اس نے یہ بات پولیس کو نہیں بتائی۔“

”شاید اس لیے کہ وہ زخمی ہوگئی تھی اور بعد میں دواؤں کے زیرِ اثر چلی گئی۔“

”میرا بھی یہی اندازہ ہے۔ بہرحال وہ لنچ بریک میں استقبالیہ پر بیٹھی ہوئی تھی جب کسی نے فون پر بتایا کہ وہ اوجے کا ڈیول رہا ہے۔ اس نے آرٹ کولبو سے بات کرنے کی خواہش ظاہر کی جو لنچ پر گیا ہوا تھا۔ اس شخص نے ایک نمبر دیا اور کہا کہ جب مسٹر کولبو واپس آئیں تو اسے کال بیک کرلیں۔ چار بجے نتالی کو بتایا گیا کہ اسے کچھ دیر رکنا ہوگا کیونکہ مسٹر کاو ساڑھے چار بجے میٹنگ کے سلسلے میں آرہے ہیں۔“

”اس کے علاوہ کوئی بات؟“

”سب سے زیادہ خراب بات یہ ہوئی کہ نتالی تمہارے خلاف ہوگئی۔ اس نے اس جانب اشارہ کیا کہ تم نے ہی قاتل کو بھیجا تھا اور جب اس نے دوسرے لوگوں کو مار دیا تو اسے بھی گولی مار دی۔ میں نے اسے بتایا کہ اس کے پاس غلط اطلاعات ہیں لیکن میں نہیں سمجھتی کہ اس پر میری بات کا اثر ہوا ہوگا۔“

”گھر جانے سے پہلے ایک پولیس انسپکٹر میرے دفتر آیا تھا اور اس نے جائے واردات سے میری غیر موجودگی کو نوٹ کرلیا ہوگا۔ اسے ایسا کرنا بھی چاہیے تھا لیکن جب وہ نانہ پولیس اسپتال گئی تو معلوم ہوا کہ نتالی مجھ پر کیا الزام تراشی کر رہی ہے۔“

”اسے الزام مت دو۔ وہ انتہائی غیر مطمئن عورت ہے۔ جذباتی طور پر افسردہ، نفسیاتی پریشان، زخمی اور ناامید۔ میں نہیں سمجھتی کہ ان سب باتوں کا اثر اس کے زخموں اور تکلیف پر کتنا ہوگا۔ اس وقت اسے مشوروں کی ضرورت ہے۔“

”تم یہ کہنا چاہ رہی ہو کہ وہ عورت ذہنی انتشار میں مبتلا ہے۔“

”میں یہ نہیں کہہ رہی لیکن وہ کئی اعتبار سے غیر مطمئن ہے۔“ میں نے صوفے پر پہلو بدلتے ہوئے کہا۔ ”میرے پاس بھی اطلاعات ہیں۔ تم نے کیا معلوم کیا؟“

”میں نے اندازہ لگایا ہے کہ برکیٹ منی کا ماموں نہیں ہے اور وہ مجھ پر بھروسا کرتا ہے۔ میرے پاس جو معلومات ہیں، ان کا بیشتر حصہ برکیٹ نے ہی فراہم کیا ہے۔ انگلیوں کے نشانات کی وجہ سے قاتل کی شناخت ہوگئی ہے۔ اس کا نام والٹے مارٹن ہے۔ اس پر فراڈ کے دو الزامات ہیں اور 91ء میں پیرول پر رہائی پانے کے بعد وہ کسی کی نظروں میں نہیں آیا۔ تم نے اخبار میں اس کی تصویر تو دیکھی ہوگی۔“

”ہاں، تمہاری تصویر کے ساتھ ہی شائع ہوئی تھی۔ تم بھی اس کی طرح مشہور ہوگئے ہو۔“ میں نے اسے چھیڑتے ہوئے کہا۔ ”اس کے علاوہ کیا معلوم ہوا؟“

”برکیٹ کے کہنے کے مطابق 94ء میں الزبتھ اپنے شوہر کو چند ہفتوں کے لیے چھوڑ کر چلی گئی تھی لیکن بعد میں صلح ہوگئی اور اس کے بعد سے وہ دونوں ہنسی خوشی رہ رہے تھے۔ اس کے علاوہ میں نے ذاتی طور پر یہ معلوم کیا کہ اپائنٹمنٹ بک جو آرٹ کولبو کی میز پر رکھی ہوتی ہے وہ استقبالیہ ڈیسک پر پائی گئی جبکہ استقبالیہ کلرک کا کہنا ہے کہ سوا دو بجے جب وہ ڈیوٹی ختم کر کے گئی تو یہ کتاب وہاں موجود نہیں تھی اور نہ ہی اسے بعد میں کیے جانے والے اندراج کے بارے میں کچھ پتا ہے۔ گویا یہ عملے کے کسی دوسرے فرد کی حرکت ہے۔ میں نے اس صفحے کی کاپیاں حاصل کرلی ہیں اور میں کسی ہینڈ رائٹنگ ایکسپرٹ کی خدمات حاصل کر کے معلوم کروں گا کہ یہ کس کی تحریر ہے۔ میں دوسروں کو شک کی نگاہ سے دیکھنے کا عادی نہیں ہوں لیکن مجھے معلوم ہونا چاہیے کہ

میرا نام کس لیے لکھا گیا۔ نتالی کی فراہم کردہ معلومات کے مطابق لگتا ہے کہ آرٹ نے ہی اس کتاب میں میرا نام لکھا ہوگا لیکن میں اسے اچھی طرح جانتا ہوں۔ وہ ایسا شخص نہیں تھا کہ اسی روز سہ پہر کے اپائمنٹ کا اندراج تین گھنٹے پہلے کتاب میں کرتا۔"

"اب ہم آلۂ قتل کی جانب آتے ہیں۔ پہلی بات تو یہ کہ حملہ آور نے دستانے پہن رکھے تھے جس کا تذکرہ کرنا برکیٹ بھول گیا۔ دوسری بات یہ کہ آرٹ کے معاون کی لڑکی کا کہنا ہے کہ اس نے گزشتہ جمعرات کو یہ ریوالور آرٹ کی میز کی اوپر والی دراز میں دیکھا تھا لہٰذا میں یہ فرض کیے لیتا ہوں کہ سوموار کے دن بھی وہ وہیں ہوگا جبکہ کارتوسوں کا ڈبا اب بھی وہیں ہے جو تقریباً آدھا خالی ہے۔ اس میں سے کل بارہ فائر ہوئے ہیں۔

"میں نے آج بھی دن کا بیشتر وقت وہیں گزارا اور ان ملازمین سے بات کرنے کی کوشش کی جو دفتر کی عمارت میں کام کرتے ہیں کیونکہ وہ ابھی تک جائے واردات بھی جا رہی ہے۔ اس لیے میں نے ڈورمین کے دفتر کے باہر بیٹھ کر وہاں سے گزرنے والے ملازمین سے بات کی جو کہ آسان کام نہیں ہے۔ جے بی ہاک وہاں موجود نہیں تھا لیکن گزشتہ روز اس نے مجھے اور برکیٹ دونوں کو اپنے ملازمین سے بات کرنے سے روک دیا تھا۔ تاہم اتنا ضرور معلوم ہو گیا کہ کمپنی میں لاگت میں کمی اور بچت پر زور دیا جا رہا ہے جس میں کچھ ملازمین کی چھانٹی بھی شامل ہے اور یہ بات بہت سے لوگوں کے ذہن میں تھی۔ آرٹ اور الزبتھ کو اس پر عمل کرنے کی ذمے داری سونپی گئی تھی جبکہ احکامات اوپر سے آئے تھے۔ بک کیپنگ سے تعلق رکھنے والے ایک شخص نے بتایا کہ کمپنی کے کچھ سرکاری ٹھیکے منسوخ ہو گئے تھے اور حکمہ طور پر اسے ناقص مشینری سپلائی کرنے پر جرمانہ ادا کرنا پڑ رہا تھا۔ ایک اور افواہ یہ بھی تھی کہ کمپنی نے انتہائی کم نرخوں پر سرکاری ٹھیکے حاصل کر کے بھاری نقصان اٹھایا تھا اور دیوالیہ ہونے کے قریب تھی۔ آرٹ اور الزبتھ کی پوزیشن کمپنی میں بہت اچھی تھی لیکن نتالی شمٹ کے ساتھ لوگوں نے سرد مہری اختیار کر رکھی تھی۔ گو کہ اس کی صلاحیت کا اعتراف کیا جاتا تھا اور وہ اسے بہتر تنخواہ پر بک کیپنگ کے شعبے میں بھیجنا چاہ رہے تھے لیکن اس نے انکار کر دیا۔ اس سلسلے میں ایک نکتہ بہت اہم ہے اور وہ ہے ملازمین کی چھانٹی اور اس پر الزبتھ کافی کام کر رہی تھی۔"

"کیا رائے مارٹن بھی نکالے جانے والے لوگوں میں شامل تھا۔"

"کم از کم ابھی تک تو وہ اس خانے میں فٹ نہیں بیٹھتا۔"

"نہ ہی اپائمنٹ بک میں تمہارے نام کی موجودگی سے کوئی فرق پڑتا ہے۔ البتہ قاتل کی خودکشی کے امکان کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔"

"برکیٹ اس پہلو پر غور کر رہا ہے۔ شاید وہ کچھ معلوم کرنے میں کامیاب ہو جائے۔ اس دوران۔۔۔"

"اس دوران تم ناکافی معلومات کی بنا پر کوئی نتیجہ اخذ نہیں کر سکتے۔"

"میں یہ کہنا چاہ رہا تھا کہ آج رات میں ریٹ لیب جاؤں گا۔ برکیٹ کل صبح عمارت کو کھول دے گا۔ اس سے پہلے میں کچھ تلاش کرنا چاہتا ہوں۔ اس نے مجھے ایسا کرنے کی اجازت دے دی ہے۔"

☆☆☆

"میرے پاس اس کیس سے متعلق کچھ معلومات ہیں اور میں تم سے ملنے آ رہا ہوں۔ آٹھ اور ساڑھے آٹھ بجے کے درمیان اپنے دفتر میں ہی رہنا۔"

آنسرنگ مشین پر یہ پیغام دیکھ کر میں چونک گیا۔ وہ کسی مرد کی آواز تھی اور اس کا لہجہ نشا کر کے رہنے والوں جیسا تھا۔ مجھے اس کی نیت ٹھیک لگ رہی تھی۔ اس کے باوجود میں نے مسلح ہونا ضروری سمجھا۔ وہ آٹھ بج کر آٹھ منٹ پر اکیلا ہی آیا لیکن میں محسوس کر سکتا تھا کہ اس کے کم از کم دو ساتھی باہر انتظار کر رہے ہوں گے۔ وہ بہت زیادہ جسیم شحیم نہیں تھا البتہ اس کا قد پانچ فٹ گیارہ انچ کے قریب رہا ہوگا۔ سر سے گنجا، گول چمکتی آنکھیں، لمبی ناک اور کلین شیو۔ میں اسے پہچان نہیں سکا۔ اس نے ادھر اُدھر دیکھتے ہوئے کہا۔ "تم تنہا ہو؟"

وہ میز کے پاس کھڑا ہو گیا اور بھاری آواز میں بولا۔ "میرا تم سے کچھ لینا دینا نہیں لیکن میں پولیس والوں سے بات نہیں کرنا چاہتا تھا۔ اس لیے تمہارے پاس آیا ہوں۔"

یہ کہہ کر اس نے کرسی گھسیٹی اور اس پر بیٹھتے ہوئے بولا۔ "میرے پاس کچھ معلومات ہیں جو صرف ہم دونوں تک محدود رہیں گی۔ تم رے مارٹن میں دلچسپی رکھتے ہو؟"

"شاید۔" میں نے کندھے اچکاتے ہوئے کہا۔

"پہلے وہ صرف رے مارٹن تھا۔ اس کا نام پہلی بار پولیس ریکارڈ میں اس وقت آیا جب اس پر ڈلاس میں جنسی زیادتی کا الزام عائد ہوا۔ تین سال پہلے وہ یہاں واپس

آ گیا اور اپنے اصلی نام رے مارٹنز کے ساتھ رہنے لگا۔ وہ بے روزگار تھا چنانچہ ہم نے اسے ایک ریسٹوران میں ملازمت دلوا دی لیکن ایک سال پہلے یعنی 91ء میں کرسمس کے موقع پر وہ کسی کو کچھ بتائے بغیر نظروں سے اوجھل ہو گیا۔ تم میری بات سن رہے ہو۔"

میں نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

"ایک بات اور۔ اسی سال ستمبر میں، ہم دونوں یعنی میں اور میرا دوست اسی ریسٹوران میں ڈنر کر رہے تھے، رے نے مجھے ایک کہانی سنائی۔ دو روز قبل وہاں دو خوب صورت عورتیں آئیں اور بار میں بیٹھ کر باتیں کرنے لگیں۔ رے اپنی جگہ پر بیٹھے بیٹھے انہیں سن سکتا تھا۔ ان میں سے ایک بولی۔ مجھے لگتا ہے کہ یہاں میں کسی ایسے شخص کو تلاش کرنے میں کامیاب ہو جاؤں گی جو میرے شوہر کو مار سکے۔ شاید میں کل دوبارہ آؤں۔"

"دوسرے روز وہ اکیلی بار میں آئی لیکن اسے مطلوبہ شخص نہیں ملا۔ تھوڑی دیر بعد رے اس کے پاس گیا اور یوں ظاہر کیا جیسے وہ اس کے کام آ سکتا ہے جب ہم نے یہ قصہ سنا تو اس میں کوئی جان نظر نہیں آئی۔ رے جیسا نرم طبیعت قاتلوں کا ساتھ نہیں دے سکتا تھا لہٰذا ہم نے اسے اس معاملے سے دور رہنے کا مشورہ دیا جسے اس نے مان لیا۔ تین یا چار ماہ بعد وہ کام سے غیر حاضر ہو گیا جہاں وہ کرائے پر رہتا تھا وہاں سے اپنا سامان بھی لے گیا جس سے ہم نے یہی نتیجہ نکالا کہ وہ سیدھے راستے پر چلنے میں اکتاہٹ محسوس کر رہا تھا اور دوبارہ جرائم پیشہ لوگوں میں چلا گیا ہے۔ ہمارا خیال تھا کہ وہ نیو یارک چلا گیا ہے جہاں اسے اپنے کام کے لیے مناسب ماحول مل سکتا تھا۔

منگل کے اخبار میں اس کی تصویر ایک خبر کے ساتھ شائع ہوئی۔ میں نے اس پر یقین کر لیا کیونکہ پولیس والوں کو جھوٹ بولنے کی ضرورت نہیں تھی۔ البتہ ان کے پاس درست معلومات نہیں تھیں۔ رے ایک نرم مزاج شخص تھا۔ اس کی ہر بات صاف اور سیدھی ہوتی تھی۔ وہ ایک احمق آدمی تھا۔ گزشتہ روز سے انہوں نے اسے رائے بارٹن کہنا شروع کر دیا جس کا مجرمانہ ماضی ہے۔ میں سمجھ گیا کہ کہیں نہ کہیں غلطی ہے لہٰذا میں نے جان پہچان کے لوگوں سے معلوم کرنے کی کوشش کی کہ کسی نے رے مارٹنز کو حال ہی میں دیکھا ہے تو مجھے اطلاع دیں۔ اب میں وہ اطلاع تمہیں پہنچا رہا ہوں۔ رے کو اسی شہر میں دیکھا گیا ہے۔ وہ مکمل طور پر روپوش نہیں ہوا تھا البتہ اس نے اپنی سرگرمیاں محدود کر لی تھیں۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ وہ اتنا عرصہ کیا کرتا رہا۔ میرے پاس ایک چیک ہے۔"

اس نے اپنے کوٹ کی جیب سے ایک پرچہ نکالا اور میز پر رکھتے ہوئے بولا۔ "اب بتاؤ کیا تم اس میں دلچسپی نہیں رکھتے۔"

"میں نہیں جانتا کہ تم کون ہو۔ میں تو تمہیں ایک مصیبت ہی سمجھ رہا ہوں۔"

"میں دوسروں کے لیے مصیبت ہو سکتا ہوں لیکن تمہارے لیے نہیں۔ تم تو پہلے ہی اس معاملے میں ملوث ہو چکے ہو۔ تم اس کام کا معاوضہ لینا چاہو گے؟"

"نہیں۔ میں تم جیسے لوگوں کے لیے کام کرنا پسند نہیں کرتا۔ فرض کرو اگر مجھے دلچسپی ہے تو اس کی حفاظت کی کیا گارنٹی ہے، اگر میں کوئی ایسی بات معلوم کر لوں جو تمہیں پسند نہ آئے۔"

"اس آدمی کی کوئی ضمانت نہیں دی جا سکتی جس نے رے کو جال میں پھنسایا۔"

"میں اسے یا ان لوگوں کو پولیس کے حوالے کر دوں گا۔ نہیں نہیں۔"

"میرا اندازہ ہے کہ تم جانتے ہو، پولیس والے غلطی پر تھے۔ تمہارے پاس وہ رپورٹ ہے۔" وہ کھڑے ہوتے ہوئے بولا۔ "تم چاہتے ہو کہ کوئی تمہاری نگرانی کرے۔"

"یہ اچھی بات نہیں ہو گی لیکن اگر میں تم سے رابطہ کرنا چاہوں۔"

"اس پرچے پر فون نمبر لکھا ہے۔ میں تم سے دوبارہ بات کروں گا۔ اب میرے جانے کا وقت ہو گیا ہے۔"

ابھی صرف نو بجے تھے لیکن میرا تھکن سے برا حال ہو رہا تھا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ گزشتہ شب تین بجے تک ریٹ لب میں اس سراغ کی کھوج میں لگا رہا جس پر پولیس نے توجہ نہیں دی تھی۔ اس کی تلاش میں تین مرتبہ ردی کی ٹوکری کھنگال ڈالی لیکن کچھ ہاتھ نہیں آیا۔ اس کے بعد میں نے کمپیوٹر پر ہاتھ مارا لیکن اس نے مجھے ریٹ لب کے ملازمین کے ریکارڈ تک رسائی دینے سے انکار کر دیا۔ مجھے معلوم تھا کہ سارا ریکارڈ ہارڈ کاپی کی شکل میں محفوظ ہے چنانچہ میں نے تنائی کے کیبن کے باہر رکھی ہوئی الماری میں ایسے ملازمین کا ریکارڈ تلاش کرنا شروع کیا جنہیں حال ہی میں برطرف کیا گیا تھا۔ ڈیڑھ گھنٹے کی محنت کے بعد ان چھبیس ملازمین کے نام تلاش کرنے میں کامیاب ہو گیا جنہوں نے

گزشتہ دو سال کے دوران کمپنی چھوڑ دی تھی۔ ان میں سے دس ایسے تھے جنہیں جنوری پچانوے کے بعد پہلے تین مہینوں کے دوران رخصت کیا گیا تھا اور ان کی جگہ کسی دوسرے شخص کو نہیں رکھا گیا۔ گویا کمپنی میں چھانٹی کا عمل شروع ہو چکا تھا۔ میں نے ان دس آدمیوں کے نام اور پتے اپنی نوٹ بک میں لکھے۔ مجھے خود بھی یاد نہیں کہ ایسا کیوں کیا تھا۔

☆☆☆

آر جے کار کی زبانی اس شخص کے بارے میں سن کر میں اتنی بے چین ہو گئی کہ جیسے ہی اس سے ملاقات ہوئی تو پوچھے بغیر نہ رہ سکی۔ ”کیا تم نے اس شخص کو پہچان لیا۔ وہ کوئی بدمعاش تھا؟“

آر جے نے نفی میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ”اس نے عمدہ لباس زیب تن کر رکھا تھا۔ اس لیے اس کی اصل شخصیت کے بارے میں کچھ کہنا مشکل ہے۔ اس نے بتایا کہ ریٹ لیب کے واقعے میں خودکشی کرنے والے قاتل وائے مارٹن کا اصل نام رے مارٹینز تھا اور وہ گزشتہ ڈیڑھ سال سے شکاگو میں روپوشی کی زندگی گزار رہا تھا۔ یہاں تک کہ میرے پاس آنے والے شخص کو بھی اس کے بارے میں علم نہیں تھا۔ میں فی الحال اسے مسٹر بگ کہوں گا۔ جب مارٹینز کی تصویر اخبار میں چھپی تو مسٹر بگ نے اپنے ذرائع سے پتا لگا لیا کہ مارٹینز اوک لان میں خاموشی کی زندگی گزار رہا تھا۔ جیسا کہ مسٹر بگ نے بتایا کہ چند سال پہلے اس نے مجرمانہ زندگی ترک کر دی تھی اور پریشانی کے عالم میں نیکساس سے یہاں چلا آیا۔ مسٹر بگ اور اس کے دوست نے مارٹینز کو ایک ریستوران میں ملازمت دلا دی۔ بظاہر یہی لگتا ہے کہ انہوں نے اس کی مدد کی تھی لیکن میرا خیال ہے کہ اس طرح شاید انہوں نے کسی پر احسان کیا ہو اور مسٹر بگ کی آمد کا مقصد یہی بتانا تھا کہ جو کچھ وہ کہہ رہے ہیں وہ سچ ہے۔ عام طور پر بدمعاش اپنا ریکارڈ درست رکھنے کو ترجیح دیتے ہیں اور یہی وہ نکتہ ہے جس کی وجہ سے میں مسٹر بگ کی فراہم کردہ معلومات اور اس کی نیت پر تاریخی طور پر یقین کر رہا ہوں۔“

”میرا خیال ہے کہ یہ اچھی پیش رفت ہے۔ کیا تم انسپکٹر بریکیٹ کو بتاؤ گے؟“

”میں ایسا نہیں کر سکتا۔“ آر جے کار نے کہا۔ ”یہ ایک غیر بیان کردہ معاہدے کا حصہ ہے۔ میں پولیس کو کچھ نہیں بتاؤں گا جب تک یہ معلوم نہ کر لوں کہ مارٹینز کو اس منصوبے میں شامل کرنے والا کون تھا؟“

”میرا خیال ہے کہ تم یہ معلوم کر چکے ہو؟“

”نہیں۔ یہ صرف آگے بڑھنے کے لیے نقطۂ آغاز ہے۔ میں کوئی ابہام نہیں چھوڑنا چاہتا۔ فی الحال تو مجھے نیند آ رہی ہے۔“

رات میں کسی وقت میری آنکھ کھلی تو میں نے آر جے کو کچھ کاغذات الٹتے پلٹتے دیکھا۔ اس وقت ساڑھے تین بج رہے تھے۔ مجھے اٹھتے ہوئے دیکھ کر وہ نیم خوابیدہ آواز میں بولا۔ ”معاف کرنا لیکن یہ بہت اہم ہے۔ لیٹے لیٹے اچانک ہی میرے ذہن میں یہ پتا آ گیا جو میں نے گزشتہ شب ریٹ لیب کے دفتر میں ایک لفافے پر لکھا دیکھا تھا۔ میں نے اسے اپنی نوٹ بک میں درج کر لیا تھا۔ ”آمار لیبز، 1440 ویسٹ پارکسن، اوک لان، الینوائس“ یہ وہی پتا ہے جو مسٹر بگ نے بتایا تھا۔“

”پھر؟“

”یہ لفافہ آج ڈاک کے ذریعے بھیج دیا گیا ہوگا اور شاید کل صبح اس پتے پر پہنچ جائے۔ میرا خیال ہے کہ مجھے وہاں موجود ہونا چاہیے۔“

”کیا تم وہاں جاؤ گے؟“ میں پریشان ہوتے ہوئے بولی۔

”میں صرف یہ بتانا چاہ رہا ہوں کہ کل صبح ہر حال میں چلا جاؤں گا۔“

دوسرے روز ناشتے کی میز پر ہمارے درمیان بہت مختصر گفتگو ہوئی۔ اس نے رے مارٹینز کی رہائش گاہ پر جانے کے لیے آدھے دن کی مصروفیات منسوخ کر دیں۔ میں کچھ دیر سوچتی رہی پھر فیصلہ کر لیا کہ مجھے ایک بار پھر اسپتال جانا چاہیے۔ مجھے نتالی سے مزید سوالات نہیں کرنا تھے بس اس کی خیریت معلوم کرنا چاہ رہی تھی۔

میں اسپتال پہنچی تو پہلے سے ایک شخص نتالی کے پاس بیٹھا ہوا تھا۔ مجھے دیکھتے ہی وہ کھڑا ہو گیا اور نتالی سے بولا۔ ”تم سے کوئی ملنے آیا ہے۔ میں بعد میں بات کروں گا۔ جو کچھ میں نے کہا ہے وہ یاد رکھنا۔“

اس کے جانے کے بعد میں نے نتالی سے پوچھا۔ ”کیسی ہو؟“

اس نے کوئی جواب نہیں دیا تو میں نے کہا۔ ”تم خوش نظر نہیں آ رہی ہو۔ کیا یہ شخص تمہیں پریشان کر رہا تھا؟“

”ہاں۔“ اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے اور وہ بھرائی ہوئی آواز میں بولی۔ ”میں مزید برداشت نہیں کر

سکتی۔ مجھے یہ سب بہت برا لگ رہا ہے۔"

"ٹھیک ہے پھر میں چلتی ہوں۔" میں نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔ "میں تمہاری جلد صحت یابی کے لیے دعا کروں گی۔"

میں کمرے سے باہر آئی اور تیزی سے لفٹ کی جانب لپکی۔ میں غیر ارادی طور پر نتالی کے نامعلوم ملاقاتی کا پیچھا کر رہی تھی کیونکہ وہ کسی خانے میں فٹ نہیں آ رہا تھا۔ ورنہ تو اس کا رشتے دار، خاندانی دوست اور نہ ہی میڈیکل یا ڈاکٹر۔ پھر وہ کون تھا؟ اور ان کے درمیان کس موضوع پر بات ہو رہی تھی؟

میں اسپتال کی عمارت سے باہر آئی اور تیزی سے اپنی کار کی جانب بڑھی۔ باہر جانے والے راستے پر تین گاڑیاں کھڑی تھیں۔ میں نے اندازہ لگایا کہ وہ اجنبی انہی میں سے کسی ایک کار میں واپس جائے گا۔ چنانچہ میں نے اپنی گاڑی باہر نکلنے والے گیٹ سے پچاس گز دور کھڑی کر دی اور اجنبی کا انتظار کرنے لگی۔ فی الحال میں اس کا نام مسٹر گرانڈ فرض کر لیتی ہوں۔ پانچ منٹ بعد میں نے اس شخص کو عمارت سے باہر آتے دیکھا۔ وہ فون پر کسی سے بات کر رہا تھا۔ وہ ایک لمحے کے لیے گیٹ کے باہر کھڑا ہوا اور اپنی بات مکمل کرنے کے بعد پارکنگ لاٹ میں چلا گیا۔

چالیس منٹ کے بعد اس کی مرسیڈیز بینز ایک اطالین ریسٹوران کے پارکنگ لاٹ میں داخل ہوئی جو مضافات میں واقع ایک شاپنگ مال کے قریب ہی تھا۔ میں نے اپنی گاڑی برابر والے پارکنگ لاٹ میں کھڑی کی اور سوچنے لگی کہ اب کیا کرنا چاہیے۔ ریسٹوران کے اندر جاؤں یا باہر رک کر اس کا انتظار کروں۔ اگلے آٹھ دس منٹ کے دوران لوگ ریسٹوران میں جاتے رہے لیکن باہر کوئی نہیں آیا پھر ایک کار تیزی سے آئی اور ریسٹوران کے داخلی دروازے کے قریب کھڑی ہو گئی۔ پھر اس میں سے ایک شخص برآمد ہوا۔ اس کے ہاتھ میں پارسل تھا پھر وہ دروازے میں داخل ہو گیا۔ میں متجسس نگاہوں سے اسے دیکھتی رہی۔ اس کی تیزی، غیر قانونی پارکنگ اور وقت کی وجہ سے میں اندازہ لگا سکتی تھی کہ یہ شخص مسٹر گرانڈ سے ملنے آیا ہے۔

میں گاڑی میں بیٹھی اپنی سوچوں میں گم تھی کہ پسنجر سیٹ کا دروازہ کھلا پھر میرے کانوں میں ایک آواز آئی۔

"کیا میں تمہارے ساتھ بیٹھ سکتا ہوں۔"

وہ آر جے کار تھا۔

☆☆☆

میں اس اجنبی شخص کو مسٹر گرانڈ کہہ کر پکار رہی تھی لیکن وہ مجھے کہیں نظر نہیں آیا۔ میں نے ریسٹوران میں داخل ہو کر کیبن میں جھانکنا شروع کیا اور وہ مجھے ایک کیبن میں نظر آ گیا۔ اس کی میز پر بیئر کی بوتل اور دو گلاس رکھے ہوئے تھے جس سے ظاہر ہوتا تھا کہ مسٹر گرانڈ کے ساتھ کوئی اور بھی بادہ نوشی میں شریک ہے جو وقتی طور پر موجود نہیں ہے۔ میں کیبن میں داخل ہوا اور خاموشی سے غیر حاضر شخص کی کرسی پر بیٹھ گیا۔

برکیٹ نے ٹھیک ہی کہا تھا کہ جے بی ہاک عادی شرابی ہے۔ اس نے مجھے دیکھ کر پلکیں جھپکائیں اور بولا۔

"میرا خیال تھا کہ تم مجھے نظر انداز کر رہے ہو۔ یہ محض اتفاق ہے یا تم کسی منصوبے کے تحت یہاں آئے ہو؟"

"شاید قسمت میں یہی لکھا تھا۔" میں نے جواب دیا۔

گتے کا وہ ڈبا اس کے برابر والی کرسی پر رکھا ہوا تھا جس کے تعاقب میں، میں دوسرے پارٹنر کے گھر سے یہاں تک چلا آیا تھا اور اسے لانے والا شخص مردوں کے ٹائلٹ سے نکل کر ہماری طرف آ رہا تھا۔

"اگر تم برا نہ مناؤ تو میں تھوڑی دیر کے لیے یہاں بیٹھ سکتا ہوں؟" میں نے کہا۔

"ٹھیک ہے۔" اس نے اپنے ساتھی کی طرف دیکھتے ہوئے کہا جو چند قدم کے فاصلے پر کھڑا ہوا تھا۔ "روتھگی! یہ آر جے کار ہے۔ ہمارا سیکورٹی ایڈوائزر اور اس کا کہنا ہے کہ قسمت اسے یہاں لے آئی ہے۔"

روتھگی مسکرایا لیکن وہ خوش نظر نہیں آ رہا تھا۔ "میں صرف دو منٹ بعد چلا جاؤں گا۔" میں کھڑے ہوتے ہوئے بولا۔ "تم اندر کیوں نہیں آ جاتے؟"

وہ ایک گنوار شخص تھا جسے ذرا سی بھی تمیز نہیں تھی۔ وہ فوراً ہی اپنی کرسی پر بیٹھ گیا اور اپنے لیے گلاس میں بیئر انڈیلنے لگا۔ میں نے پوچھا۔ "اس ڈبے میں کیا ہے؟"

روتھگی کے بجائے ہاک نے جواب دیا۔ "یہ محض ایک پارسل ہے اور اتنا اہم بھی نہیں ہے۔"

"کیا میں اسے دیکھ سکتا ہوں؟" میں نے ہاتھ بڑھاتے ہوئے کہا۔

"نہیں۔"

"میرا خیال ہے کہ یہ ہم سب کے لیے بہتر ہو گا۔"

"میں نہیں سمجھتا کہ میری ذاتی چیزوں کو دیکھنا تمہارے لیے بہتر ہو سکتا ہے۔"

"یہ تم کہہ رہے ہو لیکن میں ایسا نہیں سمجھتا۔" میں نے گہری سانس لیتے ہوئے کہا۔ "پہلی بات تو یہ کہ یہ پیکٹ تمہارا نہیں ہے۔ اس پر رے مارٹینز کا نام و پتا لکھا ہوا ہے اور اسے ڈاک کے ذریعے اس کے گھر بھیجا گیا تھا جو ایک گھنٹا پہلے حوالے کیا گیا۔ روتھکی گھر کے اندر موجود تھا اس نے یہ پیکٹ وصول کیا اور پچاس میل کا فاصلہ طے کر کے یہ پیکٹ تمہیں دینے کے لیے اس ریستوران تک آیا۔ میں اس کی نگرانی کر رہا تھا۔ چنانچہ مجھے بھی اس کا تعاقب کرتے ہوئے یہاں آنا پڑا۔"

میں نے اس کا ردعمل جاننے کے لیے لمحہ بھر خاموشی اختیار کی پھر بولا۔ "جو کوئی بھی بغیر اجازت یا کسی اختیار کے بغیر اس پیکٹ کو کھولے گا تو وہ غیر قانونی ہوگا اور اسے دس ہزار ڈالر کے علاوہ جیل بھی ہو سکتی ہے۔"

"میری کمپنی نے یہ پیکٹ بھیجا تھا۔" ہاک نے جواب دیا۔ "جو غلط جگہ چلا گیا۔ میں صرف اس غلطی کو درست کرنا چاہتا ہوں۔"

"مانتا ہوں کہ یہ غلطی تھی لیکن اس پر زیادہ توجہ نہیں دینی چاہیے۔ اصل بات یہ ہے کہ تم رے مارٹینز سے پوری طرح واقف نہیں تھے۔ وہ شخص چھوٹا موٹا بدمعاش نہیں تھا بلکہ اس کا تعلق شکاگو کے ایک بڑے جرائم پیشہ گروہ سے تھا جس کا تشدد اور ظلم و ستم کے حوالے سے طویل ریکارڈ ہے۔ اس مکان کی نگرانی اور روتھکی کا پیچھا کرنے والا میں اکیلا نہیں بلکہ کچھ اور لوگ بھی ہیں۔ انہوں نے دیکھ لیا ہوگا کہ میں خالی ہاتھ ہوں اور وہ اس شخص یعنی روتھکی کے بارے میں مشکوک ہو گئے ہوں گے جو اس پیکٹ کو بغل میں دبا کر ریستوران میں داخل ہوا۔ ان کا ایک آدمی باہر کار میں بیٹھا پچھلے دس منٹ سے فون پر مصروف ہے۔ وہ احمق نہیں ہیں اور انہوں نے بھی وہ سب دیکھا ہوگا جو میں دیکھ چکا ہوں اور مجھے روتھکی کا پیچھا کرنے اور اندر آتے ہوئے بھی دیکھا ہوگا۔ اگر تم یہ پیکٹ لے کر باہر نکلے تو تمہارے کار تک زندہ پہنچنے کے امکانات پچاس فیصد ہیں۔ دوسری صورت میں تمہیں ایک دو دن کی مہلت مل سکتی ہے بشرطیکہ اس سے پہلے پولیس والے تمہیں گرفتار نہ کر لیں۔"

"یہ بھی تمہاری کوئی چال ہے۔" ہاک نے کہا۔

"اگر تمہیں میری بات پر یقین نہیں آ رہا تو روتھکی کو اس پیکٹ کے ساتھ باہر بھیج کر دیکھ لو۔ دیکھتے ہیں کہ وہ کتنی دور تک جا سکتا ہے۔"

ہاک نے اپنی پیشانی پر ہاتھ پھیرا اور ویٹرس کو حریر ایک چیک لانے کے لیے کہا۔ میں نے اس کی پریشانی بھانپ لی اور گرم لوہے پر چوٹ لگاتے ہوئے بولا۔ "تم یہ پیکٹ مجھے دے دو۔ میں اسے بحفاظت یہاں سے نکال لے جاؤں گا۔ تمہارے پاس دس بجے رات تک کا وقت ہے۔ اس دوران تم اپنے بچاؤ کا بندوبست کر لو۔ اس کے بعد میں انسپکٹر بریکٹ کو فون کروں گا اور اس کی موجودگی میں اس پیکٹ کو کھولا جائے گا۔"

"تمہیں معلوم ہے کہ اس میں کیا ہے؟" ہاک نے چبھتے ہوئے لہجے میں کہا۔

"میں اندازہ لگا سکتا ہوں۔"

"تمہیں کچھ معلوم نہیں۔" وہ اپنا ہاتھ اٹھاتے ہوئے بولا۔ "صرف ہوا میں تیر چلا رہے ہو۔"

یہ کہہ کر وہ اٹھا۔ اس نے پیکٹ بغل میں دبایا اور دروازے کی طرف بڑھا۔ میں بھی اس کے پیچھے پیچھے چل دیا۔ بیرونی دروازے کے قریب پہنچ کر میں نے عقب سے اس کے کوٹ کا کالر پکڑا اور اسے دیوار سے لگاتے ہوئے ایک جھٹکے سے پیکٹ چھین لیا۔

"وہیں کھڑے رہو۔ اگر زندگی چاہتے ہو۔"

پھر میں تیزی سے باہر نکلا اور کار کی طرف بڑھ گیا۔ ہاک کو سنبھلنے کا موقع بھی نہ مل سکا لیکن وہ یہ سوچ کر حیران ہو رہا ہوگا کہ کسی نے مجھ پر گولی کیوں نہیں چلائی۔ جبکہ مجھے اس کی کوئی توقع نہیں تھی کیونکہ میرے علاوہ کسی اور نے روتھکی کا تعاقب نہیں کیا تھا۔ اس بارے میں جو کچھ ہاک سے کہا وہ سب جھوٹ تھا۔

☆☆☆

آرجے کا روہ ریستوران سے کامیاب لوٹا تو میں اس کے دفتر پہنچ گئی۔ اس نے مجھے پوری صورت حال سے آگاہ کیا اور ہم اس کی روشنی میں امکانات کا جائزہ لینے لگے۔ آرجے نے گلا صاف کرتے ہوئے کہا۔ "پہلا امکان تو یہ ہے کہ ہاک خود ہی اپنی کمپنی میں خرد برد کر رہا تھا اور اس کا ثبوت اس ڈبے میں ہو سکتا ہے۔"

"دوسری بات یہ کہ جب تم نے دفتر کی تلاشی لی تو تمہیں روتی کی نوکری میں کوئی ایسا کاغذ نہیں ملا جس میں آرٹ کولیو کو تمہیں کال کرنے کے لیے کہا گیا ہو۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ٹالی بھی اس سازش میں شریک تھی۔" میں نے بھی اپنا خیال ظاہر کیا۔

”ہم تیسرے امکان کو بھی نظرانداز نہیں کر سکتے۔“

آر جے نے کہا۔ ”اگر ان سب باتوں کو ملا کر دیکھا جائے تو لگتا یہی ہے کہ کمپنی مالی مشکلات کا شکار تھی چنانچہ ہاک نے حصے داروں کو مطمئن کرنے کے لیے چھانٹی کے احکامات جاری کر دیے لیکن درحقیقت تنخواہوں کے اخراجات میں کوئی کمی نہیں کی گئی۔ نتالی نے کمپیوٹر میں ایک جعلی اکاؤنٹ کھول رکھا تھا جس کا پرنٹ آؤٹ نہیں نکالا جاتا تھا اور اس کے ذریعے برطرف کیے گئے دس ملازمین کو نئے مگر فرضی ناموں سے ادائیگی کی جا رہی تھی۔ ان کے بینک اکاؤنٹس کی نگرانی رے مارٹنز کے سپرد تھی جو ایسے فراڈ کا ماہر تھا اور بالآخر یہ تمام رقم ہاک کو منتقل ہو جاتی تھیں۔“

کچھ دیر خاموش رہنے کے بعد میں نے کہا۔ ”چوتھا امکان یہ ہے کہ آرنٹ کو لیوا اور الزبتھ کو اسی لیے قتل کیا گیا کہ انہیں اس فراڈ کے بارے میں شبہ ہو گیا تھا اور وہ اس خرد برد کے بارے میں جان گئے تھے۔ نتالی کو بھی مارنے کا منصوبہ تھا تاکہ اس پر کسی کو شک نہ ہو۔“

”یہ سب امکانات ہیں۔“ آر جے نے کہا۔ ”لیکن مجھے ایک اور دلچسپ بات معلوم ہوئی ہے اور وہ یہ کہ ستمبر 94ء میں ایک عورت نے مارٹنز سے رابطہ کیا جس کے بارے میں یقین سے نہیں کہا جا سکتا کہ وہ کسی کرائے کے قاتل کی تلاش میں تھی البتہ اسے ازدواجی مسائل کا سامنا تھا۔“

”تمہارا اشارہ الزبتھ کی جانب ہے؟“

”نہیں۔ پہلے میں بھی یہی سمجھا تھا لیکن وہ نتالی تھی۔ اگلے مہینے اسے ریٹ لیب میں ملازمت مل گئی اور اس کے دو ماہ بعد مارٹنز منظر سے غائب ہو گیا اور اس سے اگلے مہینے ریٹ لیب میں چھانٹی کا عمل شروع ہو گیا۔“

خاموشی کا ایک اور وقفہ آیا پھر میں نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔ ”اب اگر تم یہ باکس کھولتے ہو تو تم پر کوئی الزام نہیں آئے گا کیونکہ تم یہ کہہ سکتے ہو کہ مسز گرانڈ پہلے ہی اسے کھول چکا تھا۔“

”میرا بھی یہی خیال ہے۔“

اس باکس میں دو کمپیوٹر ڈسک تھیں جن پر کوئی عنوان نہیں تھا۔ اس کے علاوہ ایک چھوٹا تولیا جس پر سیاہ پاؤڈر اور خون کے دھبے نظر آ رہے تھے۔ اس کے علاوہ دستانوں کی ایک جوڑی بھی تھی۔ سیدھے ہاتھ کے دستانے پر زیادہ سیاہ پاؤڈر اور بائیں ہاتھ کے دستانے پر تھوڑا سا خون جما ہوا تھا۔

میں اسپتال پہنچی تو معلوم ہوا کہ نتالی شمٹ کو نفسیاتی وارڈ کے انتہائی نگہداشت کے یونٹ میں منتقل کر دیا گیا ہے۔ اس نے اپنے جسم کے ساتھ لگی ہوئی نلکیوں کو علیحدہ کر کے خود کو نقصان پہنچانے کی کوشش کی تھی۔ مجھے بمشکل اس سے ملنے کے لیے پندرہ منٹ کی اجازت ملی۔ مجھے دیکھتے ہی وہ بولی۔

”تم دوبارہ آ گئیں، کیوں؟“

”میں تمہارے بارے میں فکرمند تھی۔ میرا خیال ہے کہ یہ تمہارے حق میں بہتر ہو گا اگر تم مجھے ہر بات بتا دو۔“

میری بات سنتے ہی اس کے چہرے کا رنگ بدل گیا اور اس نے بے چینی سے پہلو بدلا۔ میں نے کہا۔ ”کیا تمہیں الزبتھ اور آرنٹ کے مرنے کا افسوس نہیں ہے؟“

”میں صرف اپنے بارے میں افسردہ ہوں۔“

”کیا تم نے خود اپنے آپ کو زخمی کیا یا رے مارٹنز نے تمہاری مدد کی تھی؟“

کمرے میں گہری خاموشی چھا گئی۔ اس نے میری جانب غور سے دیکھا اور مایوس کن لہجے میں بولی۔ ”تم اس بارے میں جانتی ہو؟“

”ہاں، تم نے جو پارسل ڈاک سے بھیجا تھا وہ مل گیا ہے۔“

اس نے لمحہ بھر کے لیے آنکھیں بند کر لیں پھر بولی۔ ”ہاں، اس نے میری مدد کی تھی لیکن میں نے کبھی نہیں سوچا تھا کہ اتنی زیادہ زخمی ہو جاؤں گی۔“

”اس کا قتل کیسے ہوا؟“

اس نے دوبارہ آنکھیں بند کر لیں پھر بولی۔ ”اس نے ان دونوں کو گولیاں مارنے کے بعد مجھے نشانہ بنایا۔ اس وقت میں باتھ روم سے باہر آ گئی تھی اور میرے ہاتھ میں تولیا تھا تاکہ بارود کے پاؤڈر کا نشان میرے جسم پر نظر نہ آئے۔ میں اس کے سامنے گری اور ہم دونوں لڑکھڑاتے ہوئے استقبالیہ کے سامنے سے گزرے۔ اس نے مجھے پکڑ رکھا تھا اور سہارا دیے ہوئے تھا پھر میں نے اس کا ریوالور والا ہاتھ اوپر کیا اور اس پر اپنا ہاتھ رکھ دیا۔“

”اور بے بی ہاک؟“

”یہ منصوبہ اسی کا تھا۔“ وہ گہری سانس لیتے ہوئے بولی۔ ”جب میں نے اس کی کمپنی میں ملازمت شروع کی تو کچھ ہی دنوں بعد اس نے مجھ سے ملنا شروع کر دیا۔ کسی کو ہماری ملاقاتوں پر شبہ نہیں ہوا۔ اس نے مجھے بتایا کہ

اگر اس کے کہنے پر چلتی رہی تو بہت جلد امیر ہو جاؤں گی اور میں اس کی باتوں میں آ گئی۔ میری باس ڈوٹا کو ٹھ کو کمپیوٹر پروگرام سے کوئی دلچسپی نہیں تھی اور وہ صرف پرنٹ آؤٹ دیکھا کرتی تھی۔ لہٰذا میں نے فرضی ملازمین کے نام پر فائلیں بنائیں اور اس کام میں معاونت کے لیے رے مارٹنز کی خدمات حاصل کیں۔ میں اس کے ساتھ بھی ڈیٹنگ کرتی تھی۔ وہ بدمعاش تھا اور میری اس سے ملاقات ایک بار میں ہوئی تھی۔ اس نے جعلی بینک اکاؤنٹ کھولے اور میں ان میں آن لائن رقم منتقل کرتی رہی۔ ان فرضی اکاؤنٹس میں ہر ماہ پچاس ہزار ڈالر منتقل ہوتے تھے جن میں سے آٹھ ہزار میرے اور پانچ ہزار رے کے حصے میں آتے۔ باقی رقم ہاک کو ملتی۔ البتہ پرسنل ڈپارٹمنٹ میں بھی۔ پچھلے ہفتے اسے شک ہوا کہ کچھ گڑبڑ ہو رہی ہے۔ اس نے آرٹ کو بتایا اور آرٹ نے اس کی اطلاع اپنے باس یعنی جے بی ہاک کو دی۔"

"اس کے بعد رے کے گھر پر میٹنگ ہوئی جس کی تیاری جے بی ہاک پہلے ہی کر چکا تھا۔ میں اور رے صرف مہرے تھے۔ اس نے ہم دونوں کو پچاس پچاس ہزار ڈالر دینے کا وعدہ کیا۔ اس کے عوض رے مجھ پر گولی چلاتا اور ان دونوں کو قتل کر کے فرار ہو جاتا۔ جے بی نے آرٹ کے ساتھ اس مسئلے پر بات کرنے کے لیے ساڑھے چار بجے کا وقت طے کیا اور اسی کے کہنے پر میں نے اپائنٹمنٹ بک میں آر جے کارٹر کا نام لکھ دیا تا کہ یہ ظاہر کیا جا سکے کہ ہم جے بی ہاک کا نہیں بلکہ اس کا انتظار کر رہے تھے۔ بعد میں جے بی نے فون کر کے کہا کہ مجھے رے کو اس طرح مارنا ہوگا کہ وہ خودکشی نظر آئے اور اس نے یہ بھی بتا دیا کہ یہ کام کس طرح ہوگا۔ ایک لاکھ ڈالر کی خاطر میں اس پر بھی تیار ہو گئی۔"

اس کی بات ختم ہوئی تو میں نے کہا۔ "تم نے ہی رے مارٹنز کو دفتر میں آنے دیا اور اسے ریوالور بھی پکڑا دیا؟"

اس نے کوئی جواب نہیں دیا تو میں نے کہا۔ "رے مارٹنز تمہاری کار میں آیا تھا جس کے بارے میں تمہارا کہنا تھا کہ وہ خراب ہے اور بعد میں جے بی ہاک نے اسے وہاں سے ہٹا دیا۔"

"تم کہتی ہو تو ٹھیک ہی ہوگا۔" وہ ہار مانتے ہوئے بولی۔ اس کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔ میں نے اسے خدا حافظ کہا اور دوبارہ آنے کا وعدہ کر کے چلی آئی۔

☆☆☆

گنگی سے بات کرنے کے بعد میں نے یہی مناسب سمجھا کہ اب اس معاملے کو کسی تاخیر کے بغیر پولیس کے علم میں لانا چاہیے چنانچہ میں نے دوپہر کے کھانے کے بعد انسپکٹر برکیٹ کو فون کر کے ہاک، مارٹنز اور اس پارسل کے بارے میں سب کچھ بتا دیا البتہ مسز بگ کا کوئی ذکر نہیں کیا۔ پولیس نے اسی روز ہاک کو گرفتار کر لیا لیکن اس پر صرف سازش کرنے کا الزام لگایا جس کی ضمانت ہو سکتی تھی۔ رہائی کے تین دن بعد وہ اپنے گھر کی اسٹڈی میں مردہ پایا گیا۔ اس نے خودکشی کر لی تھی۔

اس کیس کو حل کرنے میں میرے اور جینی کے رول کا میڈیا میں کوئی ذکر نہیں کیا گیا۔ اس بارے میں انسپکٹر برکیٹ اور مقامی پولیس سے پہلے ہی معاہدہ ہو چکا تھا۔ اس کا سہرا پولیس کے سر گیا اور اس کے بدلے انہوں نے مجھے مکمل طور پر بے قصور قرار دے دیا۔ پولیس کی تحقیقات سے یہ ثابت ہو گیا کہ میں وقوعہ کے وقت ریٹ لیب کے دفتر میں موجود نہیں تھا اور یہ کہ میرا نام غلط طریقے سے اپائنٹمنٹ بک میں لکھا گیا۔

جینی کو نتالی سے بہت ہمدردی ہے اور وہ اس کے لیے دعا کرتی رہتی ہے۔ اس لیے نہیں کہ وہ فطرتاً ایسی ہے بلکہ اس لیے کہ نتالی کو اس حال تک پہنچانے والے سب مر چکے تھے۔ اسی لیے وہ ان سے شدید نفرت کرتی تھی۔ اس نے اپنی غیر مطمئن زندگی کو سنبھالا دینے کے لیے دولت کا سہارا لیا اور ہاک کا آلہ کار بن گئی جو بڑی ہوشیاری سے اپنے پتے کھیل رہا تھا۔ ایک طرف اس نے نتالی اور مارٹنز کے ذریعے الزبتھ اور اس کے شوہر کا پتا صاف کیا اور پھر مارٹنز کو بھی نتالی کے ذریعے اس طرح قتل کرایا کہ وہ خودکشی نظر آئے۔ دوسری جانب مجھے مسز بگ کے ذریعے مارٹنز کے پیچھے لگانے کی کوشش کی تا کہ میں اسے قاتل سمجھتا رہوں جو خود بھی دنیا سے رخصت ہو گیا تھا اور معاملے کی تہ تک نہ پہنچ سکوں۔ اگر اس رات دفتر کی تلاشی نہ لیتا تو شاید مجھے کبھی بھی پتا نہ چلتا کہ اس منصوبے کا خالق کون تھا۔ اس کہانی کا افسوس ناک پہلو یہ ہے کہ کسی کے ہاتھ کچھ نہ آیا اور سب کردار اپنے انجام کو پہنچ گئے۔ جس دولت کی خاطر یہ کھیل کھیلا گیا وہ بینک میں منجمد ہو گئی ہے اور اس کا دعوے دار کوئی نہیں۔

عکس

جمال دستی

ہوسِ زر کی خواہش میں کبھی قناعت کا موڑ نہیں آتا... اس کی سرحدیں لامحدود ہی رہتی ہیں... ایک شفیق باپ کی گرفتاری... بیٹی کے مستقبل اور زندگی کو تاریک بنا رہی تھی... باپ کا کہنا تھا کہ وہ جرم اس سے سرزد ہی نہیں ہوا ہے...

قتل کی ایک سنگین واردات... قاتل و مقتول ایک دوسرے کے گہرے دوست تھے...

"میں جانتا ہوں کہ یہ اچھا نہیں لگتا لیکن میں ان کے کہنے پر یہ الزام اپنے سر نہیں لے سکتا جبکہ میں نے یہ جرم نہیں کیا۔" چارلس روشن اصرار کرتے ہوئے بولا۔ اس نے جولیس سے نظریں ہٹا کر للی پر جما دیں اور اپنی بیٹی کو دیکھ کر مسکرانے کی کوشش کی جیسے اسے یقین دلانا چاہ رہا ہو کہ جو کچھ اس نے کہا وہی سچ ہے۔ اگر درمیان میں شیشے کی دیوار نہ ہوتی تو وہ اس کا ہاتھ پکڑنے کی کوشش کرتا۔ اس لیے وہ مسکرانے پر ہی اکتفا کر سکا۔ للی خاصی شکستہ حال نظر آرہی

تھی۔ اس لیے وہ اس مسکراہٹ کا اثر قبول نہ کرسکی۔ میں روشن کو الزام نہیں دے سکا کہ وہ اپنی بیٹی کو بے گناہی کا یقین دلانے میں ناکام رہا۔

روشن کی مسکراہٹ کمزور پڑ گئی اور اس نے بیٹی کے چہرے سے نظریں ہٹا کر دوبارہ جولیس پر جما دیں اور گلا صاف کرتے ہوئے بولا۔ ”میں نے جارج ویب کو قتل نہیں کیا۔“ یہ کہہ کر اس نے اپنا منہ سختی سے بند کرلیا۔

چارلس روشن کی عمر تریپن سال تھی۔ گویا وہ جولیس سے صرف گیارہ سال بڑا تھا۔ وہ چھ فٹ لمبا اور قد میں جولیس کے برابر تھا لیکن جولیس کے مقابلے میں قدرے فربہ تھا اس کا وزن دو سو دس پاؤنڈ تھا یعنی جولیس سے تیس پونڈ زیادہ۔ وہ دیکھنے میں ایک خوش شکل آدمی تھا اور ان حالات میں بھی اس کی وجاہت قابلِ دید تھی۔ اس وقت وہ روسیسٹر کی موزیوکاؤنٹی جیل میں شیشے کی دیوار کے پیچھے جیل سے ملی ہوئی ڈانگری اور اس کے رنگ سے میچ کرتی ہوئی قمیص پہنے ہوئے تھا۔ اسے دو دن پہلے اپنے بزنس پارٹنر جارج ویب کے قتل کے الزام میں گرفتار کیا گیا تھا اور اس کے خلاف مضبوط ثبوت موجود تھا۔ میرے خیال میں کوئی بھی جیوری اسے بے گناہ قرار نہیں دے سکتی تھی۔

”مسٹر روشن۔“ جولیس نے بولنا شروع کیا۔

”تم مجھے چارلس کہہ سکتے ہو۔“ روشن نے ترش روئی سے کہا اور اپنی آنکھیں سختی سے جولیس پر گاڑ دیں۔ اس کی آواز میں مزید تلخی آگئی اور وہ بولا۔ ”بہرحال تم میری بیٹی کے ساتھ چھ مہینے سے ڈیٹنگ کررہے ہو۔“

جولیس سر ہلاتے ہوئے بولا۔ ”میرے لیے یہ کہنا مشکل ہے کہ صورتِ حال کس حد تک خراب ہے۔ کیونکہ ویب کے قتل کے سلسلے میں ابھی تک صرف اخبارات اور ٹی وی سے ہی معلومات حاصل ہوئی ہیں اور جہاں تک میں سمجھ سکا ہوں کہ جمعے کے روز تم، ویب اور تمہارے کئی ملازمین تھریل ہاؤس میں میٹنگ کے لیے جمع ہوئے تھے اور تین بج کر چونتیس منٹ پر تمہیں ویب کی لاش کے ساتھ ایک کمرے میں تنہا دیکھا گیا۔ اس کے سینے میں دو گولیاں لگی تھیں۔ تمہارے کئی ملازمین کمرے میں آئے اور انہوں نے تمہیں کسی آٹومیٹک ریوالور پکڑے دیکھا۔ کیا یہ بنیادی معلومات درست ہیں؟“

”تم نے جو وقت بتایا ہے، اس کے بارے میں کچھ نہیں کہہ سکتا کیونکہ جارج کو مردہ حالت میں دیکھ کر بدحواس ہوگیا تھا۔“ روشن نے درشت لہجے میں کہا۔ ”اس کے بعد پولیس کے آنے تک جو کچھ ہوا اس کے بارے میں تفصیلات غیر واضح ہیں۔ مجھے تو یہ بھی یاد نہیں کہ کمرے میں آنے والا کون شخص تھا جس نے مجھے جارج کے ساتھ دیکھا تو کہ مجھے بعد میں بتایا گیا کہ وہاں سب لوگ ہی آگئے تھے۔“

”سب لوگوں سے تمہاری کیا مراد ہے؟“

روشن نے ناراضی سے سر ہلایا اور بولا۔ ”تمہارے لیے اس کی زیادہ اہمیت نہیں ہے۔ مجھے بتایا گیا کہ وہ تمام ملازمین جو میٹنگ میں شرکت کے لیے آئے ہوئے تھے۔ وہ مجھے دیکھنے کے لیے لائبریری میں دوڑے چلے آئے جہاں یہ واقعہ پیش آیا تھا اور انہوں نے مجھے گن پکڑے ہوئے دیکھا۔ ان میں انجیلا ہیرس جو میری اور جارج کی مشترکہ سیکریٹری ہے، سیلز کے شعبے کی سربراہ کیرولین باورز، ہمارا ڈیزائنر ٹیمور، سائمن کالو، مارکیٹنگ ہیڈ، لوگن ویلی اور مینوفیکچرنگ کا انچارج ارل گلمور ہو سکتے ہیں۔“

”تم اور ویب لائبریری میں کیا کررہے تھے؟“

روشن نے کندھے اچکائے اور بولا۔ ”میٹنگ کچھ زیادہ کامیاب نہیں رہی تھی۔ شاید تم نے بھی اس بارے میں سنا ہوگا۔“

”میں نے سنا ہے کہ یہ میٹنگ متنازع ہوگئی تھی اور اس میں جھگڑے کی نوبت آگئی تھی۔“

”ہاں ایسا ہی تھا۔ میں اور جارج کئی مہینوں سے کمپنی کی توسیع کے بارے میں بات کررہے تھے اور یہ اسی کا آئیڈیا تھا کہ توسیع کا کام شروع کردیا جائے۔ وہ ہفتے قبل وہ معمول کے مقابلے میں کچھ زیادہ ہی جھگڑالو ہوگیا اور چھوٹی چھوٹی باتوں پر مجھ سمیت ہر ایک سے تکرار کرنے لگا۔ جمعے کی میٹنگ میں اس نے اصرار کیا کہ توسیعی منصوبے کو ملتوی کردیا جائے لیکن اس کی کوئی وجہ نہیں بتائی۔ تین بجے ہم نے ایک گھنٹے کا وقفہ لیا تاکہ سب لوگ پرسکون ہوجائیں۔ میں جارج سے اتنا ناراض تھا کہ وقفہ ختم ہونے سے پہلے ہی اس سے ملنے لائبریری میں چلا گیا تاکہ تنہائی میں اس سے بات کرسکوں۔ تب میں نے دیکھا کہ وہ فرش پر لیٹا ہوا تھا گو کہ میں اسے دیکھتے ہی سمجھ گیا کہ وہ مرچکا ہے پھر بھی میں نے جھک کر اس کی نبض ٹٹولی کہ شاید اس کے بچنے کا کوئی امکان ہو، تبھی میری نظر ریوالور پر گئی اور میں نے غیر ارادی طور پر اسے اٹھا لیا۔“

”تمہیں یہ کیسے معلوم ہوا کہ ویب لائبریری میں گیا ہے؟ کیا تم اس کا تعاقب کررہے تھے؟“

روشن سر ہلاتے ہوئے بولا۔ ”ہم گزشتہ چودہ سال سے اپنی سالانہ میٹنگ تھریل ہاؤس میں کررہے ہیں اور ہر سال وقفے کے دوران میں جارج لائبریری کا رخ کرتا

تھا۔ اس کا کہنا تھا کہ گھنٹوں کی سنز مار کی کے بعد اسے تنہائی کی ضرورت ہوتی ہے۔''

''کیا میٹنگ میں ہمیشہ جھگڑا ہوتا تھا؟''

''اس پر کسی کا کنٹرول نہیں۔'' وہ تلخی سے مسکراتے ہوئے بولا۔'' جارج ہمیشہ سے ہی تھوڑا سا تیز مزاج واقع ہوا ہے۔''

للی نے اپنی آنکھیں کھولیں اور دردبھری آواز میں بولی۔''زیادتی کیا تم تیز مزاج نہیں ہو؟''

''اس جیسا نہیں۔'' روشن نے صفائی پیش کی۔ ''ممکن ہے کہ میں بھی تیز مزاج ہوں لیکن فی الحال اس بات کی اہمیت نہیں۔ تمام تر بحث و تکرار کے باوجود ہم کسی نہ کسی فیصلے پر پہنچ جاتے تھے۔ جارج اچھا انسان اور اچھا بزنس پارٹنر تھا۔''

جولیس نے قطع کلامی کرتے ہوئے ان ملازمین کے بارے میں پوچھا جو لائبریری کی طرف گئے تھے۔''جہاں تک میں سمجھ سکا ہوں، وہ لوگ عمارت کے مختلف حصوں میں پھیلے ہوئے تھے اور فائر کی آواز سن کر لائبریری کی طرف دوڑ پڑے۔''

روشن نے تائید میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔'' مجھے بھی یہی بتایا گیا تھا۔''

''لیکن تم نے کسی فائر کی آواز نہیں سنی؟''

روشن اس سوال پر حیران رہ گیا کیونکہ اس نے اس بارے میں نہیں سوچا تھا۔'' یہ واقعی عجیب بات ہے۔ میں نے کوئی آواز نہیں سنی اور میں نہیں جانتا کہ یہ کیسے ممکن ہے۔''

اسی لمحے ایک محافظ اندر آیا اور اس نے یاد دلایا کہ ملاقات کا وقت ختم ہونے میں صرف تین منٹ رہ گئے ہیں۔ جولیس نے اس کی بات سن کر سر ہلایا اور گفتگو کا سلسلہ دوبارہ شروع کرتے ہوئے بولا۔''روشن! میں جانتا ہوں کہ للی کے ساتھ ڈیٹنگ کے حوالے سے تم مجھ سے کچھ ناراض ہو۔''

روشن اس کی بات کاٹتے ہوئے بولا۔''نہیں، ایسی کوئی بات نہیں۔''

''مجھے افسوس کہ ہماری پچھلی ملاقات ان حالات میں ہو رہی ہے لیکن امید ہے کہ آج رات تک میں تمہیں بہتر پوزیشن میں دیکھ سکوں گا اور شاید تمہیں، للی اور تمہاری بیوی کے ساتھ کسی اچھی جگہ ڈنر کے لیے لے جاؤں۔''

اس جملے پر روشن اور للی نے اپنے اپنے انداز میں ردعمل کا اظہار کیا۔ للی کی آنکھیں بھیگ گئیں اور وہ اپنا ہونٹ کاٹنے لگی جبکہ روشن کی آنکھیں کچھ اور تنگ ہو گئیں۔

غبین

کال گرل

ایک امریکی دیہاتی جوڑا پہلی مرتبہ نیویارک گیا اور ایک ہوٹل میں ٹھہرا۔ دونوں ہوٹل کے حسنِ انتظام کی تعریف کررہے تھے۔ شوہر نے کہا کہ اگر وہ صرف فون کردے تو پانچ منٹ کے اندر ایک حسینہ حاضر ہوسکتی ہے۔ بیوی کو یقین نہ آیا تو شوہر نے سچ مچ ایک کال گرل کے لیے فون کیا اور پانچ منٹ سے پہلے کمرے کے دروازے پر دستک ہوئی۔

شوہر نے بیوی کو باتھ روم میں بھیج کر دروازہ کھولا تو ایک نوجوان اور حسین لڑکی سامنے تھی۔ اس نے پیسوں کا پوچھا تو لڑکی نے رات بھر کے پچاس ڈالر بتائے۔ اس پر اس نے کہا کہ وہ صرف دس ڈالر ہی دے سکتا ہے۔ لڑکی خاموشی سے لوٹ گئی۔

میاں بیوی اس بات سے بہت محظوظ ہوئے اور بیوی کو شوہر کی بات کا یقین آگیا۔ کچھ دیر بعد دونوں کھانا کھانے ایک قریبی ریستوران میں گئے تو وہاں وہی کال گرل بھی نظر آئی۔ انہیں دیکھ کر وہ مسکرائی اور شوہر کے قریب سے گزرتے ہوئے سرگوشی میں بولی۔''دس ڈالر میں تو یہی گوشت مل سکتی ہے۔''

جہلم سے ام ثامیہ کا تحفہ

روشن نے اپنا سر ہلایا اور بولا۔'' یہ سب کچھ مجھے ناقابلِ یقین لگتا ہے لیکن للی نے مجھے بتایا ہے کہ اس صورتِ حال میں کوئی شخص معجزہ دکھا سکتا ہے تو وہ صرف تم ہو۔''

محافظ نے انگلی سے اشارہ کرکے بتایا کہ ان کے پاس صرف ایک منٹ رہ گیا ہے۔ جولیس نے روشن سے پوچھا کہ جن لوگوں کا اس نے تذکرہ کیا ہے، ان کے علاوہ بھی کوئی اور شخص قتل کے وقت ٹمبل ہاؤس میں موجود تھا۔

''نہیں۔'' روشن نے ایک لمحہ توقف کرنے کے بعد کہا۔''نہیں، وہ جگہ زیادہ تر ہمارے استعمال میں رہتی ہے اس لیے کسی اور شخص کو وہاں موجود نہیں ہونا چاہیے تھا۔''

''اگر تم نے ویب کو قتل نہیں کیا تو تمہارے کس ملازم نے اسے مارا ہوگا؟''

روشن نے اپنا سر ہلایا اور بولا کہ وہ اس بارے میں کچھ نہیں جانتا۔ محافظ روشن کو کمرے سے لے جانے کے لیے اندر آگیا۔ للی بمشکل تمام اپنے قدموں پر کھڑی ہوئی۔ اس کا پورا جسم ہولے ہولے کانپ رہا تھا اور چہرہ حزن و یاس کی تصویر بنا ہوا تھا۔ اس کے باوجود وہ خوب صورت نظر آرہی تھی۔ وہ اپنی ماں سے مشابہت رکھتی تھی۔ اس لیے اس نے اداس آنکھوں سے جولیس کو دیکھا اور بولی کہ کیا اسے

یقین ہے کہ وہ اس کے باپ کو بے گناہ ثابت کرسکے گا۔

''مجھے پوری امید ہے۔'' جولیس نے اسے دلاسا دیتے ہوئے کہا۔

اس لیے وہ اپنے آپ پر قابو نہ رکھ سکی اور جولیس کے سینے پر سر رکھ کر رونے لگی۔ جب وہ پُرسکون ہوئی تو اس نے بتایا کہ وہ اپنی ماں کے پاس جارہی ہے کیونکہ وہ جانتی ہے کہ جولیس بہت مصروف ہوگا۔ اس کے جانے کے بعد جولیس نے مجھ سے کہا کہ ویب کے قتل کی تحقیقات کرنے والے پولیس سراغ رساں کے بارے میں معلوم کروں، میں یہ معلومات پہلے ہی حاصل کرچکا تھا۔ اس کا نام لیفٹیننٹ ہال میک کوری تھا۔ میں نے جولیس کے ساتھ اس کا فون پر رابطہ کروادیا۔ وہ فوراً ہی جولیس سے آدھے گھنٹے کے اندر تھریل ہاؤس میں ملاقات کرنے پر رضامند ہوگیا۔ تاہم وہ پوچھے بغیر نہ رہ سکا۔

''کیا اس ملاقات کی کوئی خاص وجہ ہے؟''

''مجھے پوری امید ہے کہ روشن کو بے گناہ ثابت کرنے میں کامیاب ہوجاؤں گا۔''

میک یہ سن کر خاصا محظوظ ہوا اور ٹیلی فون بند کرنے سے پہلے اس نے کہا کہ وہ ہمیشہ سے ہی شعبدے بازی سے لطف اندوز ہوتا رہا ہے لیکن اسے روشن کی بے گناہی پر قائل کرنا مشکل ہوگا۔ اس دوران میں، میں خاموشی سے ان کی گفتگو سنتا رہا۔ میں جانتا تھا کہ جولیس کبھی بلا وعدہ نہیں کرتا اس لیے اس سے اختلاف کرنا ممکن نہ تھا۔ میں سوچ رہا تھا کہ کہیں گھر سے دور ہونے کی وجہ سے وہ خبطی تو نہیں ہوگیا۔ وہ اپنے بیکن ملز ٹاؤن ہاؤس میں آرام دہ زندگی گزارنے کا عادی تھا جہاں اس کی پسندیدہ شراب، کتابیں، کشادہ کچن اور تیسری منزل پر واقع کنگ فو اسٹوڈیو جہاں وہ روزانہ صبح دو گھنٹے ورزش کیا کرتا تھا۔ میں جانتا تھا کہ وہ روشن ٹیگل کے گھر میں رہنے سے خوف زدہ ہے جہاں اسے تنہائی میسر آسکتی ہے اور نہ ہی اس کے آرام و ضرورت کی اشیا مہیا ہوسکتی ہیں۔ یہاں تک کہ اسے صبح کی ورزش کے لیے مناسب جگہ بھی دستیاب نہ ہوئی۔ اس کا صرف ایک ہی حل تھا اور وہ یہ کہ وہ جلد از جلد معاملات نمٹا کر اپنے گھر بوسٹن لوٹ جائے۔ جب ہمیں گاڑی میں تنہائی ملی تو میں نے اس سے پوچھا۔

''تم نے روشن سے پوچھا تھا کہ کیا اسے تمہارے اور للی کی ڈیٹنگ کے بارے میں تحفظات ہیں کیونکہ تم اس سے جھوٹ بلوانا چاہ رہے تھے۔ تم جانتے تھے کہ ان حالات میں وہ ممکنہ حد تک نرم لہجہ اختیار کرے گا جس کا مطلب جھوٹ بولنا ہی ہوا۔''

جولیس مسکراتے ہوئے بولا۔ ''میں کیوں چاہوں گا کہ وہ جھوٹ بولے۔''

''تاکہ تم اس کے بیان کی سچائی کا اندازہ لگا سکو۔ اس وقت تک میں بھی نہیں سمجھ پایا تھا کیونکہ اس نے ایسا کچھ ظاہر نہیں کیا تھا لیکن جب اس نے کہا کہ اسے تمہارے اور للی کے میل جول پر اعتراض نہیں تو وہ جھوٹ بول رہا تھا اور جب اس نے کہا کہ وہ نہیں جانتا کہ اس کے کس ملازم نے ویب کو قتل کیا ہے تو اس وقت بھی وہ جھوٹ بول رہا تھا۔''

''کیا اس سے پہلے بھی اس نے ایسا کوئی بیان دیا تھا؟'' جولیس نے پوچھا۔

''نہیں کیونکہ اس کا خیال تھا کہ وہ تمہارے سامنے سچ بول رہا ہے لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ اس نے ویب کو نہیں مارا۔ ممکن ہے کہ لائبریری میں داخل ہونے سے پہلے وہ گھبرا گیا ہو۔ اب بھی اس کو قاتل سمجھا جارہا ہے بلکہ اسے اس کا احساس نہیں ہے۔ نہ ہی اسے ان گولیوں کے چلنے کی آواز یاد ہے جو اس نے فائر کی تھیں۔ ان حقائق کے علاوہ اور کچھ عقل قبول نہیں کرتی۔''

''ایک اور امکان بھی ہے لیکن فی الحال یہ بتاؤ کہ تم تھریل ہاؤس کے بارے میں کیا جانتے ہو؟''

میں نہیں جانتا تھا کہ جولیس کس امکان کے بارے میں سوچ رہا ہے۔ فی الحال میں نے اسے چھیڑنا مناسب نہیں سمجھا اور تھریل ہاؤس کے بارے میں جو کچھ معلوم کرسکا تھا وہ بتانے لگا۔ وہ ایک بہت بڑا وکٹورین طرز کا مکان تھا جسے 1879ء میں ہوریس تھریل نے بنایا تھا۔ تھریل خاندان 1982ء تک وہاں رہا پھر معاشی حالات کے سبب اس مکان کو نیلام کرنا پڑا۔ 1990ء میں اس کی دوبارہ تزئین و آرائش کی گئی اور اسے شادیوں، کمپنی کی میٹنگوں اور ایسی ہی دوسری تقریبات کے لیے کرائے پر دیا جانے لگا۔

''کیا تم مجھے تفصیل سے ان تبدیلیوں کے بارے میں بتا سکتے ہو جو اس مکان کی تزئین و آرائش کے دوران کی گئیں؟''

اس کے لیے مجھے مزید تحقیق کرنا پڑی اور وہ نقشہ تلاش کرنا پڑا جو سٹی کونسل میں جمع کرایا گیا تھا۔ مجھ میں ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ کسی بھی کمپیوٹر میں نقب لگا کر مطلوبہ فائل تلاش کرسکتا ہوں جیسا کہ پڑھنے والے جانتے ہیں کہ میں کوئی عام گوشت پوست کا انسان نہیں بلکہ کمپیوٹر میں ہوں

اور ایک روبوٹ کی طرح کام کرتا ہوں جو جولیس کی ٹائی پن میں فٹ ہے۔ اس میں چھوٹے چھوٹے انتہائی طاقت ور کیمرے اور مائیکروفون لگے ہوئے ہیں جن کی مدد سے میرا جولیس اور باہر کی دنیا سے رابطہ رہتا ہے۔ میں نے چند ہی سیکنڈ میں تمام معلومات حاصل کرلیں اور اس کے ساتھ ہی اس امکان کے بارے میں بھی معلوم کرنے میں کامیاب ہو گیا جو جولیس کے ذہن میں تھا۔

''تم جانتے ہو۔'' میں نے تفصیلات سے آگاہ کرنے کے بعد جولیس سے کہا۔ ''اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ روشن نے ویب کو قتل نہیں کیا۔''

''اب ہمیں لیفٹیننٹ میک کو اس بارے میں قائل کرنا ہوگا۔'' جولیس نے کہا۔

میک کئی پولیس والوں کے ساتھ تھریل ہاؤس کے مرکزی دروازے پر ہمارا انتظار کررہا تھا۔ میں پہلے ہی اس کی ذاتی فائل سے اس کے بارے میں معلومات حاصل کر چکا تھا۔ اس لیے اسے پہچاننے میں دشواری نہیں ہوئی۔ اس کی عمر ستاون برس اور قد جولیس سے تین انچ کم تھا۔ وہ جولیس کو دیکھ کر آگے بڑھا اور بولا۔ ''مجھے معلوم ہوا ہے کہ تم بوسٹن کے بڑے نامی گرامی پرائیویٹ سراغ رساں ہو۔ تمہارا فون سننے کے بعد میں نے ایک آفیسر سے رابطہ کیا جس نے تمہارے بارے میں کچھ مزید باتیں بتائیں۔ اس کا نام مارک کریمر ہے۔ غالباً تم اسے جانتے ہوگے؟''

جولیس نے کوئی جواب نہیں دیا حالانکہ وہ کم از کم قتل کے پانچ کیسوں میں کریمر کے ساتھ کام کرچکا تھا۔ میک نے کہا۔ ''کریمر نے تم سے ہوشیار رہنے کے لیے کہا ہے۔ ایسی صورت میں تمہارے لیے اس کیس کو تماشا بنانا آسان نہ ہوگا لیکن میں نے بوسٹن میں ہی کیپٹن مارٹن کو بھی فون کیا تھا۔ اس نے تمہارے بارے میں ایک مختلف کہانی سنائی ہے۔ اس کا کہنا ہے کہ تم ایک ایمان دار شخص ہو اور میں خوش قسمت ہوں کہ تم اس کیس پر نظر رکھے ہوئے ہو لہٰذا میں تمہیں شک کا فائدہ دے رہا ہوں۔ حالانکہ میں نہیں جانتا کہ تم چارلس روشن کو کس طرح بے گناہ ثابت کرو گے۔ کیا تم یہ ثابت کرنے کی کوشش کرو گے کہ موقع کے پانچوں گواہ جھوٹے ہیں اور انہوں نے یہ کہانی گھڑی ہے۔''

''بالکل نہیں۔'' جولیس نے کہا۔ ''تقریباً سبھی گواہ تمہیں وہی کچھ بتا رہے ہیں جس پر انہیں یقین ہے۔ اگر تم مجھے اس جگہ تک جانے کی اجازت دو جہاں یہ قتل ہوا تھا تو میں چند منٹ میں چارلس روشن کی بے گناہی ثابت کردوں گا۔''

میک نے اپنی گردن کی پشت پر ہاتھ پھیرا اور بولا۔ ''تم یہ کہہ رہے ہو کہ تمہیں یہ ثابت کرنے کے لیے ایک منٹ چاہیے کہ میں نے غلط آدمی کو گرفتار کیا ہے؟''

''شاید اس سے بھی کم وقت لگے گا۔'' جولیس نے پُراعتماد لہجے میں کہا۔

''تب تو تمہیں ایک منٹ نہ دینا حماقت ہوگی۔''

جولیس نے کہا کہ وہ پولیس والے لائبریری کے باہر راہداری میں کھڑے ہوکر انتظار کریں جبکہ وہ خود میک اور ایک پولیس والے کو لے کر لائبریری کے اندر چلا گیا اور اس نے دروازہ بند کردیا۔ جائے وقوعہ کے گرد پولیس والوں نے ٹیپ لگا دیا تھا اور قالین کے وسط میں ایک بڑا سا خون کا دھبا نظر آرہا تھا۔ تاہم اس کے باوجود وہ ایک پُرکشش کمرا تھا جس کی دیواروں کے ساتھ کتابوں کے شیلف رکھے ہوئے تھے جن میں انیسویں صدی کی نادر و نایاب کتابوں کا ذخیرہ موجود تھا۔ ایک کونے میں بڑی سی میز اور چھ کرسیاں رکھی ہوئی تھیں۔ جبکہ دیوار کی دوسری طرف دو آرام دہ صوفے رکھے ہوئے تھے اور ان کے برابر ہی ایک آرام کرسی تھی جو خون کے دھبے سے کئی فٹ پیچھے تھی۔ ویب یقیناً اس کرسی پر بیٹھا ہوا ہوگا جب اس کا قاتل کمرے میں داخل ہوا۔

جولیس نے لائبریری کا جائزہ لیا اور بولا۔ ''اس سے پہلے کہ میں روشن کی بے گناہی ثابت کردوں، یہ جاننا چاہوں گا کہ کمرے میں داخل ہونے والا وہ پہلا شخص کون تھا جس نے روشن کو ویب کی لاش کے قریب دیکھا؟''

میک نے اپنی ڈائری دیکھی اور بولا۔ ''سب سے پہلے کیرولین ہاورز اندر آئی تھی۔ اس کے فوراً بعد ہی ارل تھورو آیا۔''

''گولیاں چلنے اور ان کے کمرے کے اندر آنے کے دوران کتنا وقفہ تھا؟''

''ان کا دعویٰ ہے کہ پندرہ سیکنڈ سے زیادہ نہیں لگے۔''

''انہوں نے لائبریری کا دروازہ بند دیکھا؟''

''ہاں۔'' میک نے اکتاہٹ کے عالم میں جواب دیا۔

جولیس ہلکے سے مسکرایا۔ کیونکہ وہ جان گیا تھا کہ جلد ہی بوسٹن واپس جانے والا ہے اور جانے سے پہلے وہ روشن کو بے گناہ ثابت کردے گا۔ وہ بک شیلف کی طرف بڑھا اور چند سیکنڈ تک اس کا جائزہ لینے کے بعد شمالی امریکا کے پرندوں کے بارے میں ایک کتاب نکالی۔ اسے کتاب کے موضوع سے نہیں بلکہ وزن سے دلچسپی تھی۔

''کیا تمہیں پرندوں سے دلچسپی ہے؟'' میک نے پوچھا۔

"مجھے ان آوازوں سے دلچسپی ہے جو وہ نکال سکتے ہیں۔" یہ کہہ کر جولیس نے وہ کتاب میز پر سے اٹھائی اور زور سے نیچے پھینک دی۔ ایک زوردار آواز پیدا ہوئی جو گولی کی آواز جیسی تھی۔ میک کی آنکھوں میں جھنجلاہٹ نمودار ہوئی۔ وہ اس حرکت کا مطلب سمجھ گیا تھا۔ اس نے دروازہ کھولا اور باہر کھڑے ہوئے دو سپاہیوں سے پوچھا کہ کیا انہوں نے کوئی آواز سنی ہے۔ ان دونوں نے نفی میں سر ہلا دیا۔

"کیا یہ کمرا ساؤنڈ پروف ہے؟" اس نے جولیس سے پوچھا۔

"ہاں جس کا مطلب ہے کہ قاتل نے گن سے فائر کرنے سے پہلے چارلس روسٹن کے اندر آنے کا انتظار کیا جس کا مزید مطلب یہ ہے کہ اس ہال میں موجود چھ آدمیوں میں سے مسٹر روسٹن واحد شخص ہیں جنہیں ویب کا قاتل نہیں سمجھا جاسکتا۔"

میک کی بھویں تن گئیں اور وہ غراتے ہوئے بولا۔ "ممکن ہے کہ گن کی آواز اتنی زیادہ ہو کہ کمرا ساؤنڈ پروف ہونے کے باوجود باہر سنی گئی ہو۔"

جولیس نے سر ہلاتے ہوئے کہا۔ "اس کے باوجود وہ آواز اتنی زیادہ نہیں ہوسکتی کہ لوگوں کی توجہ اپنی جانب مبذول کر سکے۔ میرا مشورہ ہے کہ تم ایک گن میں خالی کارتوس ڈال کر چلاؤ تاکہ تمہارا تجسس دور ہوسکے..... دوسرا مشورہ یہ ہے کہ اس واردات میں استعمال ہونے والی دوسری گن کو بھی اچھی طرح تلاش کیا جائے۔ وہ یقیناً اسی مکان میں کہیں ہوگی۔ پولیس کے آجانے کے بعد قاتل اسے اپنے ساتھ نہیں لے گیا ہوگا اور اسے اس نیت کے ساتھ کہیں چھپا دیا ہوگا کہ وہ بعد میں آکر لے جائے گا۔"

"تم اس کے لیے مرد کا صیغہ استعمال کر رہے ہو۔" میک نے کہا۔ "کیا ہم ان دونوں عورتوں کو مشتبہ افراد کی فہرست سے نکال دیں جو اس وقت یہاں موجود ہیں؟"

"میں نے ایک عام بات کہی ہے۔ قاتل کوئی بھی ہو سکتا ہے۔ اس میں مرد، عورت کی قید نہیں۔"

میک نے ایک آفیسر کو خالی کارتوس لانے کے لیے بھیجا تاکہ وہ جان سکیں کہ لائبریری کس حد تک ساؤنڈ پروف ہے۔ اس دوران اس نے دو پولیس والوں کے ساتھ مل کر مکان کی تلاشی لینا شروع کر دی۔ جولیس بھی ان کے ساتھ تھا۔ انہیں پہلی منزل پر واقع ایک باتھ روم میں ٹائلٹ ٹینک کے اندر چھپایا گیا پستول مع سائلنسر کے مل گیا۔

"قاتل نے سائلنسر کا استعمال بھی کیا... شاید وہ نہیں جانتا تھا کہ لائبریری ساؤنڈ پروف ہے۔ تم اس گن یا سائلنسر کے ذریعے اصل قاتل تک پہنچ سکتے ہو۔ میں چاہوں گا کہ پولیس تحقیقات میں تمہارا ساتھ دوں۔ آج رات بوسٹن واپس جارہا ہوں لیکن اگر تمہیں میرا تعاون درکار ہے تو مجھے خوشی ہوگی۔"

جولیس اس سے پہلے ہی مجھے کہہ چکا تھا کہ اس کے لیے رات کی فلائٹ میں جگہ تلاش کروں اور میں نے نصف شب کے قریب جانے والی پرواز میں اس کی نشست محفوظ کروادی تھی تاکہ وہ للی اور اس کے والدین کے ساتھ ایک اٹلی ورپے کے ریسٹوران میں ڈنر کر سکے۔ میں نے وہاں بھی ان کے لیے ٹیبل ریزرو کروادی تھی گوکہ وہ روسٹن کو قتل کے الزام سے بری کروانے میں کامیاب ہو گیا تھا لیکن اگر وہ نامعلوم قاتل کا پتا لگائے بغیر واپس چلا جاتا تو للی کو مایوسی ہوتی اور وہ روسٹن اور اس کی بیوی کی نظروں میں بھی گر جاتا گوکہ بات اس کی زیادہ پروا نہیں تھی لیکن اسے یہ خیال ضرور رہتا کہ للی اس کے بارے میں کیا سوچے گی۔ اسی لیے اس نے پولیس تحقیقات میں تعاون کرنے کے لیے اپنی خدمات پیش کردی تھیں۔

چند سیکنڈ سوچنے کے بعد میک نے کہا کہ اسے اس کے تعاون پر خوشی ہوگی۔ جو سپاہی خالی کارتوس لینے گیا تھا، وہ بھی واپس آگیا۔ انہوں نے تجربے کے طور پر لائبریری میں دو فائر کیے اور ان کی آواز اتنی زیادہ نہ تھی کہ لوگ انہیں سن کر لائبریری کی طرف دوڑ لگا دیتے۔ اسی طرح دوسری منزل پر موجود پولیس والوں نے بھی کچھ نہیں سنا چنانچہ میک نے جیل حکام کو فون کیا اور روسٹن کو رہا کر دیا گیا۔ اس کے بعد وہ اور جولیس سر جوڑ کر بیٹھ گئے تاکہ ویب کے قاتل کا پتا چلانے کے لیے لائحہ عمل تیار کر سکیں۔

جب میں نے محسوس کیا کہ روسٹن قاتل نہیں تھا تو میں نے اصل قاتل کے بارے میں جاننے کے لیے کمپیوٹر کے ذریعے بینک ریکارڈ، کریڈٹ کارڈ اور فون ریکارڈز کے بارے میں معلومات جمع کرنا شروع کر دیں گو کہ مجھے مکمل معلومات تو نہ مل سکیں لیکن میں ایک انتہائی اہم حقیقت معلوم کرنے میں کامیاب ہوگیا۔ وہ یہ کہ جارج ویب نے اپنے قتل سے پہلے ایک سستے سے ہوٹل میں چار راتوں کے لیے کمرا بک کروایا تھا۔ جب میں نے جولیس کو یہ بات بتائی۔ اس وقت چار بج کر ستائیس منٹ ہوئے تھے اور اس وقت وہ میک کے ساتھ بیٹھا دوسرے پانچ مشتبہ افراد کا انتظار کر رہا

تھا جنہیں دوبارہ پانچ بجے بلایا گیا تھا۔ جولیس نے میک سے واش روم جانے کا بہانہ کیا اور جب وہ باتھ روم میں تنہا تھا تو اس نے پانی کا نل پورا کھول دیا اور دبی آواز میں بولا کہ کیا میں یہ معلوم کرسکتا ہوں کہ ویب اس ہوٹل میں اپنے ساتھ کس کو لے کر گیا تھا۔

"تم یہ معلوم کرنا چاہ رہے ہو کہ اس نے انجیلا میرین یا کیرولین ہاورز میں سے کس کے ساتھ رات گزاری؟"

"ضروری نہیں۔ وہ کسی کو بھی اپنے ساتھ لے جاسکتا تھا۔ کوئی ایسا شخص جو ابھی تک منظر سے باہر ہے۔"

"اس وقت تک میں نہیں جانتا تھا کہ وہ کسے اپنے ساتھ لے کر گیا تھا۔ کریڈٹ کارڈ کی ادائیگی سے یہ معلوم کرنا ممکن نہ تھا۔ ایک خیال یہ بھی آیا کہ شاید ویب کی بیوی نے ہی اپنے بے وفا شوہر کی جان لی ہو لیکن میں اس کے ذہن ریکارڈ سے معلوم کرچکا تھا کہ قتل کی رات وہ ایک سیلون میں اپنے بال بنوا رہی تھی لیکن اگر تم چاہو تو اسے فون کرکے کچھ اگلوا سکتے ہو۔ ممکن ہے کہ اسے اس عورت پر شک ہو جس سے ویب مل رہا تھا۔ کیا میں اس کا فون ملاؤں؟"

"اس وقت نہیں۔ شاید بعد میں اس سے بات کرنے کی ضرورت پیش آئے۔"

جولیس نے پانی کا نل بند کردیا اور واشنگ روم میں میک کے پاس چلا گیا جہاں دوسرے سراغ رساں بھی موجود تھے۔ اس نے ہومی سائڈ سراغ رساں کو بتایا کہ وہ بوسٹن سے اس کیس میں معاونت کرنے آیا ہے اور اس نے پتا لگا لیا ہے کہ ویب نے اپنے قتل سے پہلے ایک موٹل میں چار راتوں کے لیے کمرا کرائے پر لیا تھا۔ جولیس نے میک کو تفصیلات بتانے کے بعد تجویز پیش کی کہ وہ کسی افسر کو تصویروں کے ساتھ موٹل بھیجے تاکہ یہ معلوم ہوسکے کہ ویب ان میں سے کس کے ساتھ موٹل آیا تھا۔

اس سے پہلے کہ میک کوئی جواب دیتا، چارلس روسٹن کو کمرے میں لایا گیا گوکہ وہ جیل سے رہا ہوچکا تھا اور اس وقت ٹائی سوٹ میں ملبوس تھا لیکن پانچ گھنٹے پہلے کے مقابلے میں زیادہ تھکا ہوا لگ رہا تھا۔ اس نے جولیس کا شکریہ ادا کیا اور میک کو پہچانتے ہوئے سر کو ہلکا سا خم دیا۔

"کیا تم جانتے ہو کہ ویب کس کے ساتھ راتیں گزار رہا تھا؟"

روسٹن نے غور سے میک کو دیکھا اور بولا۔ "یہ کس نے کہا کہ وہ اپنی بیوی کے علاوہ بھی کسی دوسری عورت کے ساتھ میل جول رکھتا تھا؟"

"اس شخص نے۔" میک نے جولیس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "اس کا کہنا ہے کہ چارج ویب نے گزشتہ ہفتے دن لائٹ موٹل میں کمرا کرائے پر لے رکھا تھا۔"

"مجھے یہ معلوم نہیں تھا۔"

"لیکن تمہیں شبہ تھا کہ ویب کا کسی کے ساتھ افیئر ہے؟"

روسٹن نے تائید میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔ "پچھلے دنوں اس کا طرزِ عمل دیکھ کر مجھے کچھ شک ہوا تھا۔ پھر میں نے کیرولین کے بارے میں اڑتی اڑتی خبر سنی۔ مجھے بہت پہلے سے شبہ تھا کہ وہ ایک دوسرے کو چاہتے ہیں لیکن کوئی ٹھوس بات سامنے نہیں آئی تھی۔"

"جب میں نے تم سے پہلے پوچھا تھا کہ ان میں سے کون ویب کا قاتل ہوسکتا ہے، اس وقت بھی تم کیرولین کے بارے میں سوچ رہے تھے؟"

"میں نہیں جانتا۔ ممکن ہے کہ اس کا نام میرے ذہن میں آیا ہو لیکن میرے پاس کوئی حقیقی وجہ نہ تھی البتہ یہ شک ضرور تھا کہ شاید وہ ایک دوسرے سے ملتے ہوں۔"

ایک سپاہی نے کمرے میں آکر بتایا کہ پانچوں مشتبہ افراد پہنچ چکے ہیں۔ اس سے پہلے یہ طے ہوچکا تھا کہ جولیس اس میٹنگ کی صدارت کرے گا اور یہ لائبریری میں ہوگی گوکہ میک کو اس سے اتفاق نہیں تھا لیکن جولیس نے اسے قائل کرلیا کہ وہ منظر بہت اہم ہوگا جب یہ مشتبہ افراد جائے وقوعہ میں داخل ہوتے وقت کس طرح اپنا ردعمل ظاہر کرتے ہیں۔

دوسرے کمرے سے ایک قالین لاکر اس جگہ ڈالا گیا جہاں خون کا دھبا پڑا ہوا تھا اور لائبریری کو جولیس کے کمرے کی شکل دے دی گئی۔ جولیس اسی کرسی پر بیٹھ گیا جہاں ویب مرنے سے پہلے بیٹھا ہوا تھا جب جولیس، میک اور روسٹن اپنی اپنی جگہوں پر بیٹھ گئے تو میک نے مشتبہ افراد کو اندر لانے کے لیے کہا۔ میں پہلے ہی ان کی پرسنل فائل تک رسائی حاصل کرچکا تھا لہٰذا جیسے ہی وہ کمرے میں داخل ہوئے، میں نے جولیس کو ان کے بارے میں پوری تفصیل بتادی۔

پہلے آنے والا چیز ہوس ویل ستاون سال کا لمبے قد کا فربہ شخص تھا۔ اس کے سر کے بیشتر بال غائب ہوچکے تھے۔ وہ اتوار کا دن تھا اور اس نے سویٹر، پتلون اور ٹینس شوز پہن رکھے تھے اگرچہ اسے اس کمرے میں داخل ہوتے وقت گھبراہٹ تھی کہ جہاں صرف دو دن پہلے ایک ایسے شخص کا قتل ہوا جس کے ساتھ وہ کام کرتا رہا تھا تو اس نے اس کا اظہار نہیں کیا۔ اس کے بجائے اس کی نظریں روسٹن پر جم کر

روشن جیسے اس نے کوئی بھوت دیکھ لیا ہو۔

''چارلس!'' اس نے بولنا شروع کیا۔ اس کی آواز میں ہلکا سا ارتعاش اور چہرے پر عجیب سی مسکراہٹ تھی۔ ''جب مجھے تمہارا پیغام ملا کہ سب ہیرتن یہاں پہنچ جاؤں تو بالکل بھی اندازہ نہیں تھا کہ انہوں نے تمہیں رہا کر دیا ہے۔ میں کچھ نہیں پایا لیکن تمہیں یہاں دیکھ کر حیرت ہو رہی ہے۔ یہ سب کیا ہو رہا ہے؟''

''پہلے تم اپنی جگہ پر بیٹھ جاؤ۔'' روشن نے رکھائی سے کہا۔ اس نے اپنے مارکیٹنگ ہیڈ کی طرف دیکھنا بھی گوارا نہ کیا اور بولا۔ ''پہلے سب لوگ اپنی اپنی نشستوں پر بیٹھ جائیں۔ اس کے بعد مسٹر جولیس صورت حال کی وضاحت کریں گے۔''

بوس ویل نے کچھ کہنا چاہا لیکن خاموش رہا۔ اس نے اچٹتی سی نظر جولیس پر ڈالی اور صوفے پر بیٹھ گیا۔ اسی وقت کیرولین باورز کمرے میں داخل ہوئی۔ اس کے پیچھے سائنس دان کارلو بھی تھا۔ کیرولین کی عمر تیس سال تھی۔ اس کے سنہرے بال شانوں تک پھیلے ہوئے تھے کیونکہ وہ چھٹی کا دن تھا۔ اس کے باوجود اس نے کام پر آنے والا لباس پہن رکھا تھا۔ کمرے میں داخل ہوتے ہی اس کی نظریں اس جانب مرکوز ہوگئیں جہاں خون کا دھبا پڑا ہوا تھا اور جسے قالین سے ڈھانپ دیا گیا تھا۔

کارلو کی عمر چالیس سال تھی۔ وہ دبلا پتلا اور لمبے قد کا تھا۔ اس نے سنہرے فریم کا چشمہ لگا رکھا تھا اور جینز کے ساتھ ٹی شرٹ پہن رکھی تھی۔ کیرولین کچھ پریشان اور خوف زدہ نظر آ رہی تھی جبکہ کارلو خاصا محتاط اور پُرتجسس تھا۔ یوں لگا جیسے وہ روشن سے کچھ کہنا چاہ رہا ہو لیکن روشن نے اس سے بھی وہی بات کی جو وہ پہلے بوس ویل سے کہہ چکا تھا۔

''اس نے ایک دفعہ بھی روشن کی طرف نہیں دیکھا۔ میں نے کیرولین کا حوالہ دیتے ہوئے جولیس سے کہا۔ ''مجھے تو اسی پر شبہ ہے۔ یقیناً اس کے ویب کے ساتھ تعلقات تھے اور اب وہ اس قتل کا الزام روشن کے سر ڈالنے کی کوشش کر رہی ہے۔''

جولیس کے کچھ بولنے سے پہلے مزید دو مشتبہ افراد کمرے میں داخل ہوئے۔ ان میں ایک انجیلا ہیرس تھی جو کافی پریشان نظر آ رہی تھی اور گھبراہٹ کے عالم میں اپنی انگلیوں کو کھینچ رہی تھی۔ اس نے پہلے اس جگہ کو دیکھا جہاں قالین پڑا ہوا تھا پھر اس کی نظریں روشن پر جم گئیں۔ اس کے ساتھ آنے والا شخص ارل گلمور تھا اور اس کے چہرے کے تاثرات سے لگ رہا تھا کہ وہ انجیلا کے لیے پریشان ہے اور مجھے یہ سمجھنے میں دیر نہیں لگی کہ وہ دونوں ڈیٹنگ کر رہے تھے۔ انجیلا کی عمر ستائیس برس تھی اور اس کا شمار خوب صورت عورتوں میں کیا جا سکتا تھا۔ اس کے ترشے ہوئے براؤن بال، بڑی بڑی سبز آنکھیں اور متناسب جسم دیکھ کر مجھے اداکارہ ڈیبی رینالڈز کی یاد آ گئی۔

ارل گلمور کی عمر چھتیس سال تھی۔ قد چھ فٹ اور دوہرے جسم کا مالک تھا اور دیکھنے میں فلم اسٹار لگتا تھا۔ میں نے فوراً ہی ان کے فون اور پیغامات کے ریکارڈز کو چیک کیا اور میرا اندازہ درست نکلا۔ وہ دونوں گزشتہ تین ہفتوں سے ڈیٹنگ کر رہے تھے۔ جب میں نے یہ بات جولیس کو بتائی تو اس نے ہلکا سا ہنکارا بھرا جیسے کہہ رہا ہو کہ یہ اطلاع مفید ثابت ہو سکتی ہے۔

روشن نے انہیں بھی صوفے پر بیٹھنے کے لیے کہا۔ انجیلا لڑکھڑائی اور اس سے پہلے کہ وہ فرش پر گر جاتی، گلمور نے اس کا بازو پکڑ لیا۔ وہ صوفے پر گرتے ہی تقریباً بے سدھ ہوگئی۔ پہلے اس نے روشن کی طرف دیکھا پھر اس کی نظریں جولیس پر جم گئیں۔ اس مرحلے پر روشن نے میک اور جولیس کا تعارف کروایا اور بتایا کہ جولیس ایک پرائیویٹ سراغ رساں ہے جس نے پہلے اسے بے گناہ ثابت کیا اور اب وہ پولیس کے ساتھ اس کیس کی تحقیقات کرنے میں تعاون پر تیار ہو گیا۔

اس کے بعد جولیس نے وضاحت سے بتایا کہ قتل کس طرح کیا گیا اور انہوں نے جن فائروں کی آوازیں سنی، وہ خالی کارتوسوں سے کیے گئے تھے تاکہ روشن پر قتل کا الزام آئے۔ پہلا ردعمل بوس ویل کا تھا۔ اس کا چہرہ سرخ ہو گیا اور وہ غصے سے بولا۔ ''کیا تم واقعی ہم میں سے کسی ایک کو جارج کے قتل کا مجرم سمجھتے ہو؟''

''میں کسی پر الزام نہیں لگا رہا بلکہ صرف حقائق بیان کر رہا ہوں۔'' جولیس نے کہا۔ ''تم میں سے کسی ایک نے ویب کو قتل کیا ہے اور مجھے امید ہے کہ بہت جلد اس کا پتا لگا لوں گا۔''

''یہ انتہائی احمقانہ بات ہے۔'' بوس ویل جھلاتے ہوئے بولا۔ پھر اس نے میک کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ ''تم پولیس سراغ رساں ہو لیکن تم نے اس شخص کو ہم پر الزامات عائد کرنے کی اجازت دے دی ہے۔''

''مسٹر جولیس جو کچھ کہہ رہے ہیں، میں اس سے مطمئن ہوں۔'' میک نے کہا۔

بوں ویل نے اپنے ساتھیوں کی طرف دیکھا کہ شاید کوئی اس کی حمایت میں بولے لیکن وہ سب خاموش رہے۔ وہ اپنی جگہ سے اٹھ کھڑا ہوا اور بولا۔ ''مجھے یہاں رکنے اور اپنے آپ کو قتل کے الزام میں شامل تفتیش ہونے کی کوئی وجہ سمجھ میں نہیں آتی۔ ویسے بھی یہ پولیس ہیڈ کوارٹر نہیں ہے اور تم مجھ سے یہ مطالبہ نہیں کر سکتے کہ میں یہاں موجود رہوں۔''

''نہیں، میں ایسا نہیں کروں گا۔'' سیک نے کہا۔ ''لیکن مسٹر روسٹن شاید مختلف انداز میں سوچ رہے ہیں۔''

روسٹن نے تائیدی انداز میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ''کسی پر کوئی الزام نہیں لگایا جا رہا اور مسٹر جولیس صرف سچ جاننے کی کوشش کر رہے ہیں۔ اگر تمہارا اس قتل سے کوئی تعلق نہیں تو تمہیں پریشان نہیں ہونا چاہیے۔ اگر تم میں سے کوئی جانا چاہتا ہے تو اسے اجازت ہے تاہم میں اسے عدم تعاون سمجھتے ہوئے اسے فوری طور پر ملازمت سے برطرف کر سکتا ہوں۔ مجھے یقین ہے کہ پولیس بھی اس کی بنیاد پر کوئی کارروائی کر سکتی ہے۔''

بوں ویل منہ بناتا ہوا اپنی جگہ پر بیٹھ گیا۔ اس کے بعد کارلو نے جولیس کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ ''ہم فرض کر لیتے ہیں کہ جو کچھ تم نے کہا، وہ سچ ہے۔ کیا یہ ممکن نہیں کہ ہمارے علاوہ کوئی اور شخص اس عمارت میں داخل ہوا، اس نے جارج کو قتل کیا اور پولیس کے آنے سے پہلے فرار ہو گیا۔''

''اس مکان میں داخل ہونے کے دو راستے ہیں جو مقفل رہتے ہیں۔'' جولیس نے کہا۔ ''اگر کوئی شخص عقبی راستے سے داخل ہوتا یا واپس جاتا تو فائر الارم بجنا شروع ہو جاتا جبکہ سامنے والے دروازے پر سیکیورٹی کیمرا لگا ہوا ہے۔ سیک! تم نے ویڈیو دیکھی ہوگی۔ کیا قتل کے وقت کوئی اور شخص بھی اس مکان میں موجود ہو سکتا ہے؟''

سیک نے نفی میں سر ہلا دیا۔

''اس کا مطلب ہے کہ تم میں سے کوئی ایک ہی جارج کا قاتل ہے۔'' جولیس نے کندھے اچکاتے ہوئے کہا۔

جولیس کے پاس تھرل ہاؤس کا نقشہ موجود تھا۔ اس نے فرداً فرداً سب سے پوچھا کہ جب انہوں نے گولیاں چلنے کی آواز سنی۔ اس وقت وہ کہاں تھے اور نقشے پر اس کی نشاندہی کر دی۔ ان میں سے کسی نے قاتل کو لائبریری میں اور نہ ہی روسٹن کو بلیئرڈ روم سے نکل کر ویب کی طرف جاتے ہوئے دیکھا۔ جولیس نے اپنی نظریں ہاورز کے چہرے پر جما دیں اور کہا کہ فائر کی آواز سننے کے بعد وہ لائبریری میں سب سے پہلے داخل ہوئی تھی۔

''اس وقت تم کچن میں تھیں اور فائر کی آواز سننے کے بعد لائبریری کی طرف دوڑ لگائی ہوگی تاکہ جلد از جلد وہاں پہنچ سکو۔''

ہاورز نے اسے گھورا لیکن کچھ بولی نہیں۔

''اس سے تمہاری بے خوفی کا اظہار ہوتا ہے۔'' جولیس نے کہا۔ ''کیا تمہیں معلوم تھا کہ ویب اس وقت لائبریری میں ہے؟''

''بالکل۔'' ہاورز نے کہا۔ ''ہر سال جب بھی ہماری سالانہ میٹنگ ہوتی ہے، جارج وقفے کے دوران اس کمرے میں ہی آرام کرتا ہے۔''

''کیا تمہارے دل میں اس کے لیے خاص جذبات تھے؟''

ہاورز نے اس سوال کا بھی جواب نہیں دیا۔ جولیس نے اسے پانچ سیکنڈ کی مہلت دی پھر براہ راست پوچھ لیا کہ کیا اس کا ویب کے ساتھ معاشقہ چل رہا تھا۔

''نہیں۔'' ہاورز نے سختی سے جواب دیا پھر اس نے انجیلا کی طرف دیکھا اور بولی۔ ''جارج شادی شدہ تھا اور میں اس کی بیوی کے ساتھ زیادتی نہیں کر سکتی تھی لیکن تم یہ سوال اس عورت سے کیوں نہیں کرتے؟''

سب کی نظریں انجیلا کی جانب اٹھ گئیں۔ جولیس نے اس سے پوچھا۔ ''کیا تمہارا جارج ویب کے ساتھ معاشقہ چل رہا تھا؟''

ہیرس نے اپنا نچلا ہونٹ دانتوں تلے دبایا اور نفی میں سر ہلا دیا۔

''جھوٹی۔'' ہاورز چلاتے ہوئے بولی۔

جولیس نے اس کی طرف دیکھا اور کہا۔ ''وہ کس طرح انجیلا کو جھوٹا قرار دے سکتی ہے؟''

''بدھ کی شام میں نے ان دونوں کو ایک سستے سے موٹل میں جاتے ہوئے دیکھا اور اس وقت مجھے بہت حیرت ہوئی جب یہ ایک کمرے میں اکٹھے داخل ہوئے۔''

انجیلا سے برداشت نہ ہو سکا اور وہ روسٹن کو مخاطب کرتے ہوئے بولی کہ وہ اس سے اکیلے میں کچھ کہنا چاہتی ہے۔ ''یہ بہت اہم ہے۔''

''تمہیں جو کہنا ہے، یہیں کہہ دو۔'' روسٹن نے جواب دیا۔

انجیلا ہیرس نے جولیس کی طرف دیکھا اور بولی۔ ''میں مسٹر ویب کے ساتھ موٹل گئی تھی لیکن اس لیے نہیں کہ ان کے ساتھ میرا معاشقہ چل رہا تھا بلکہ میں ایک پروجیکٹ کے سلسلے میں ان کی مدد کر رہی تھی۔'' پھر وہ روسٹن کی طرف دیکھتے ہوئے بولی۔ ''دراصل مجھے اس بارے میں تم سے بات

کرنی چاہیے تھی۔"

روڈسن نے ناگواری سے اس کی جانب دیکھا اور بولا۔"اب پچھتانے سے کیا ہوگا۔ ہمیں صرف وہ سب کچھ بتا دو جو تم جانتی ہو۔"

انجیلا بولی۔"مسٹر ویب نے مجھ سے وعدہ کیا تھا کہ اس بارے میں کسی کو کچھ نہ بتاؤں۔ انہیں شبہ تھا کہ کسی نے کمپنی میں تقریباً دس لاکھ ڈالر کا غبن کیا ہے۔ میں کمپنی کے رجسٹروں اور دیگر کاغذات میں اس طرح کے تضادات تلاش کر کے ان کی مدد کر رہی تھی۔"

"اس کے باوجود تم نے گلمور کو سب کچھ بتا دیا۔" جولیس نے کہا۔

وہ حیران ہوتے ہوئے بولی۔"بالکل نہیں۔ میں نے مسٹر ویب سے وعدہ کیا تھا کہ اس بارے میں کسی کو کچھ نہیں بتاؤں گی یہاں تک کہ مسٹر روڈسن کو بھی نہیں۔ البتہ میں نے اپنی گلمور کو مونٹل جانے کے بارے میں ضرور مطلع کیا تھا اور اسے بتا دیا تھا کہ کام کے سلسلے میں مسٹر ویب سے ملنے جا رہی ہوں۔"

"یہ سچ ہے۔" گلمور اس کی تائید کرتے ہوئے بولا۔ "انجیلا نے مجھے کوئی خاص بات نہیں بتائی تھی۔ میں قسم کھا سکتا ہوں۔"

"تمہاری ٹائی پن بہت دلچسپ ہے۔" جولیس نے گلمور کی ٹائی پن کی طرف اشارہ کیا جو کتے کی شکل میں تھی پھر بولا۔"کیا تمہارے پاس کوئی بل ڈاگ ہے؟"

گلمور نے جواب دینے میں تھوڑی سی ہچکچاہٹ دکھائی۔ اس وقت تک انجیلا کسی حد تک نارمل ہو چکی تھی۔ وہ مسکراتے ہوئے بولی۔"ٹرجون واقعی قابلِ تعریف ہے۔ وہ کسی کو کچھ نہیں کہتا۔"

"تمہارا مطلب ہے ٹائی ٹان۔" گلمور نے تصحیح کرتے ہوئے کہا۔

انجیلا نے پلکیں جھپکائیں جیسے وہ اندازہ لگانے کی کوشش کر رہی ہو کہ اس سے کتے کے نام کے بارے میں غلطی کیسے ہو سکتی ہے۔

"میرے کتے کا نام ٹائی ٹان ہے۔" گلمور نے ایک بار پھر زور دے کر کہا۔

"ممکن ہے۔ اگر تم نے اس کا نام ٹرجون رکھا ہوتا تو تمہارے بارے میں کچھ کہنا آسان ہو جاتا جبکہ مس ہیری کو یقین ہے کہ اس کا نام ٹرجون ہی ہے۔"

جولیس کا جملہ سن کر گلمور کے کان کھڑے ہو گئے اور وہ سوچنے لگا کہ جولیس اس کے بارے میں کیا سوچ رہا ہے۔

"اگر کمپنی کے ریکارڈ میں ٹرجون نامی کمپنی سے کاروبار سے متعلق کوئی ثبوت موجود ہے اور یہ کمپنی کوئی لین دین نہ کرتی ہو۔ اسے تم نے غبن کے لیے استعمال کیا جبکہ ویب سمجھ رہا تھا کہ یہ رقم چرائی گئی ہے۔ اس لیے میری تجویز ہے کہ میں خود بھی کمپنی کے ریکارڈ کا معائنہ کرنا چاہیے۔"

گلمور نے کئی مرتبہ پلکیں جھپکائیں اور بولا۔"ہم ٹرجون کارپوریشن کے نام سے ایک سپلائر کو استعمال کرتے ہیں لیکن اس کا مجھ سے کوئی تعلق نہیں۔"

جب گلمور اپنی باتوں سے جولیس اور کمرے میں موجود دوسرے لوگوں کو بے وقوف بنانے کی کوشش کر رہا تھا تو میں نے اس دوران اپنے دماغ میں نصب کمپیوٹر کی مدد سے اس کمپنی کے بارے میں ریسرچ کی اور یہ معلوم کرنے میں کامیاب ہو گیا کہ ٹرجون کارپوریشن کا بینک اکاؤنٹ کے مین آئی لینڈ میں تھا۔ میں نے فوراً ہی یہ بات جولیس کو بتا دی۔ اس نے گلمور سے کہا۔"ایک اچھا اکاؤنٹنٹ تمہارے اور اس کمپنی کے درمیان بہت جلد تعلق معلوم کر سکتا ہے۔"

"یہ مضحکہ خیز بات ہے۔" گلمور نے اصرار کیا۔"اگر تمہارے کہے کو سچ مان لیا جائے جو کہ نہیں ہے تو میں جارج کو قتل کیوں کرتا۔ انجیلا نے مجھے اس کام کے بارے میں کوئی تفصیل نہیں بتائی جو وہ اس کے ساتھ کر رہی تھی۔"

"تمہیں شبہ ہو گیا تھا کہ یہ لوگ کیا کر رہے ہیں؟"

"مجھے یہ کیسے معلوم ہو سکتا تھا کہ جارج لائبریری میں کب گیا اور مجھے جارج کو پھنسانے کی کیا ضرورت تھی جو ہمیشہ میرے ساتھ اچھی طرح پیش آیا۔"

"آج کل ایسے خفیہ کیمرے بہ آسانی دستیاب ہیں جنہیں کسی بھی جگہ بہ آسانی نصب کیا جا سکتا ہے۔ ایسا ہی ایک چھوٹا سا کیمرا تم نے لائبریری کے دروازے پر لگا رکھا تھا تاکہ اپنے اسمارٹ فون سے لائبریری میں آنے جانے والوں پر نظر رکھ سکو۔ ممکن ہے کہ تم اسے خریدتے وقت احتیاط نہیں برتا کر گن اور سائلنسر کے بارے میں۔ جنہیں تم نے باتھ روم میں چھپا دیا۔ جہاں تک مسٹر روڈسن کو پھنسانے کا تعلق ہے تو مجھے شبہ ہے کہ وہ تمہارا اصل نشانہ نہ تھے۔ تم نے صرف موقع سے فائدہ اٹھایا۔ ویب مر چکا تھا اور مسٹر روڈسن جیل چلے جاتے تو تمہیں بہ آسانی کے مین آئی لینڈ یا کسی اور جگہ جانے کا موقع مل جاتا اور جب تمہارا غبن سامنے آتا تو تم بہت دور جا چکے ہوتے۔"

اس موقع پر روڈسن نے مداخلت کی اور جولیس سے

پوچھا۔ ”اگر اس کا منصوبہ مجھے پھنسانے کا نہیں تھا تو میرے علاوہ دوسرا شخص کون ہوسکتا ہے؟“

جولیس نے کندھے اچکاتے ہوئے کہا۔ ”اگر تم لاعلم بری نہ جاتے تو وہاں جانے والا دوسرا شخص کون ہوسکتا ہے؟“

روشن نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔ ”انجیلا، اس کی ڈیوٹی ہے کہ وہ قلعے کے بعد لوگوں کو ایک جگہ جمع کرے۔“

انجیلا نے اپنا ہاتھ گمور کی گرفت سے آزاد کرایا اور اس سے دور ہٹ کر بیٹھ گئی۔ وہ جاننا چاہ رہی تھی کہ جو کچھ کہا جارہا ہے، کیا وہ سچ ہے؟

”بالکل نہیں ڈارلنگ۔“ گمور بوکھلاہٹ کے عالم میں بولا۔ ”تم جانتی ہو کہ ایسا نہیں ہے۔ میرا ان باتوں سے کوئی تعلق نہیں اور میں نے کبھی تمہیں نقصان پہنچانے کی کوشش نہیں کی۔“

انجیلا اس کی باتوں سے مطمئن نہیں ہوئی۔ جولیس نے وضاحت کرتے ہوئے کہا۔ ”اسے ڈر تھا کہ کمپنی کا ریکارڈ دیکھنے کے بعد تم ٹریٹون کارپوریشن اور اس کے بیچ کے درمیان ربط تلاش کرلوگی؟ اسی لیے وہ تمہیں راستے سے ہٹانا چاہ رہا تھا۔“

”یہ سب جھوٹ ہے۔“ گمور نے اصرار کیا۔ ”میں نے کوئی جرم نہیں کیا۔ میں نے جارج کو قتل نہیں کیا اور نہ ہی گن اور سائلنسر کو کسی ٹائلٹ کے بیسن میں چھپایا۔ میں نے...“

بقیہ الفاظ اس کے حلق میں اٹک کر رہ گئے۔ اسے اپنی غلطی کا احساس ہونے لگا۔ جولیس نے صرف باتھ روم کا ذکر کیا تھا۔ اس نے یہ نہیں بتایا کہ گن اور سائلنسر کو کس جگہ چھپایا گیا تھا۔ گمور نے انجیلا کو عجیب انداز سے دیکھا اور صوفے سے اٹھ کر دروازے کی طرف جانے لگا۔ وہ زیادہ دور نہیں گیا تھا کہ کیرولین باورز نے اس کا راستہ روک لیا گو کہ وہ جسامت میں اس سے کم تھی۔ اس کے باوجود تین پولیس والوں نے اسے بمشکل گمور سے الگ کیا۔

جولیس، روشن اور میک نے ریکارڈز کی چھان بین کی تو انہیں ایک گھنٹے میں ہی معلوم ہوگیا کہ ٹریٹون کارپوریشن سپلائی کیے گئے پارٹس ستر فیصد منافع کے ساتھ دوبارہ فروخت کررہی تھی اور اسی طرح گمور نے نولاکھ ڈالر کی خرد برد کی تھی۔

جب جولیس وہاں سے رخصت ہونے لگا تو میک نے اس پیچیدہ کیس کو حل کرنے میں مدد کرنے پر اس کا شکریہ ادا کیا۔

اس رات بوسٹن واپس آتے ہوئے فضائی سفر کے دوران ہم اسی موضوع پر باتیں کرتے رہے۔ مجھے سب سے زیادہ حیرت کیرولین باورز پر تھی۔ جب وہ لاعلم بری میں داخل ہوئی تو مجھے یقین ہوچلا تھا کہ وہی ویب کی قاتل ہے۔ اس کے چہرے سے جرم اور خوف جھلک رہا تھا۔ صاف ظاہر ہورہا تھا کہ وہ روشن سے شدید نفرت کرتی ہے۔ اسے یقین تھا کہ اسی نے ویب کو قتل کیا ہے اور اب وہ اپنے پیسے اور اثر و رسوخ استعمال کرکے اپنے آپ کو بچانے کی کوشش کررہا ہے۔ یقیناً اس کے دل میں ویب کے لیے شدید جذبات تھے پھر میرا ذہن گمور کی طرف چلا گیا کہ جولیس کو اس پر کس طرح شک ہوا کہ اس نے سب کو چھوڑ کر تحقیقات کا دائرہ اسی تک محدود کردیا۔ میں نے اسے کریدنے کی خاطر پوچھا۔

”میں سمجھتا ہوں کہ تمہیں اس پر یہ جان لینے کے بعد شک ہوا ہوگا کہ انجیلا ہیرس نے اسے بتادیا تھا کہ وہ ویب کے ساتھ مل کر ایک خفیہ منصوبے پر کام کررہی ہے لیکن تمہیں یہ یقین کیسے ہوا کہ وہی قاتل ہے؟“

جولیس نے کافی کا گھونٹ لیتے ہوئے کہا۔ ”اس وقت سب لوگ صورت حال کے مطابق قدرتی انداز میں نظر آرہے تھے۔ کیرولین باورز کی روشن کے لیے شدید نفرت اس کے چہرے سے عیاں تھی۔ اسے شبہ تھا کہ روشن نے ہی ویب کو قتل کیا ہے جس سے وہ خفیہ طور پر محبت کرتی تھی۔ بوس ویلیا اس لیے گھبرایا ہوا تھا کہ اس پر غیر منصفانہ طور پر ایک جرم میں ملوث ہونے کا الزام لگ رہا تھا۔ کارلو اس ساری صورت حال کے بارے میں متجسس تھا اور انجیلا ہیرس کو یہ پریشانی تھی کہ اس کے پاس جو معلومات ہیں وہ ان کا کیا کرے البتہ گمور کا رویہ مجھے بالکل مصنوعی اور جعلی لگا۔ وہ صرف انجیلا کے ساتھ اپنا تعلق ظاہر کررہا تھا چنانچہ میں نے اسی کو گھیرنے کا فیصلہ کیا کہ شاید اس سے کچھ اگلوانے میں کامیاب ہوجاؤں اور اس کا نتیجہ اعتراف جرم کی صورت میں برآمد ہوا۔“

اس کا استقبال کرنے کے لیے للی ائرپورٹ پر موجود تھی۔ وہ جس والہانہ انداز میں اس سے ملی۔ اسے دیکھ کر میں نے دل ہی دل میں خدا کا شکر ادا کیا کہ جولیس کو وہ رات روشن کے مہمان خانے میں نہیں گزارنا پڑی ورنہ اس کی شامت آجاتی۔ میں نے اس سلسلے میں جو کردار ادا کیا، اس کا ذکر کرنا ہی فضول ہے۔ ہمیشہ کی طرح اس مرتبہ بھی جولیس نے کام ختم ہونے کے بعد مجھے نظر انداز کردیا اور للی کی بانہوں میں بانہیں ڈالے اس کار کی جانب بڑھ گیا جس میں وہ دونوں ڈنر کرنے ریستوران جارہے تھے اور... میں اس وقت میں اپنے آپ کو عضو معطل سمجھ رہا تھا۔

ریسٹورنٹ میں کافی رش تھا۔ ڈاکٹر حسین وحشی نے دونوں فیڈرل ایجنٹس کو اندر داخل ہوتے ہوئے دیکھا۔ دونوں کا حلیہ اور لباس ابتر تھے۔ چہروں کے تھکے ہوئے تاثرات سے ظاہر ہو رہا تھا کہ انہیں اپنی حالت کی پروا نہیں ہے۔ انہوں نے جلد ہی ڈاکٹر کو ڈھونڈ لیا۔ رش کے باوجود ڈاکٹر وحشی اپنی میز پر اکیلا تھا۔ دونوں نے اس کے سامنے والی نشست سنبھالی۔

''ہیلو، ٹام۔'' ڈاکٹر نے ہاتھ ہلایا۔ ٹام نرم خو اور تقریباً چالیس برس کا شخص تھا۔ ڈاکٹر نے دوسرے ایجنٹ کو نہیں پہچانا تھا۔

''میں اپنے ساتھی کا تعارف کروا دوں۔'' ٹام کیمبل خود ہی بول اٹھا۔ ''ڈاکٹر، یہ جو مورفٹ ہے۔''

''وحشی، حسین وحشی۔'' ڈاکٹر نے مسکرا کر مصافحے کے لیے ہاتھ بڑھایا۔ ''لگتا ہے تم دونوں کوئی لمبا چوڑا کام نمٹا کر آ رہے ہو؟''

''ہاں، تم کہہ سکتے ہو۔'' ٹام نے کہا۔ ''ہمیں دو روز سے اپنے کپڑے تبدیل کرنے کا موقع بھی نہیں ملا۔ ایک آدمی کو اسپین سے واپس لائے ہیں۔''

''مطلب، تمہارا مطلوبہ شخص اسپین میں چھپا بیٹھا تھا؟''

''دراصل وہ انڈورا (Andorra) میں رہ رہا تھا۔ یہ چھوٹی سی غیر اہم جگہ اسپین اور فرانس کی درمیانی سرحد پر ہے۔'' ٹام نے تھکی ہوئی آواز میں بتایا۔

''کیا معاملہ تھا؟'' ڈاکٹر نے سوال کیا۔

''وہی پیسا، دھاندلی، لوٹ کھسوٹ، جھوٹ، دھوکا... ہر کسی کو یکدم دولت چاہیے۔'' ٹام نے بیزاری سے جواب دیا۔ ''انہوں نے اسے پناہ دی۔ اس کے پاس اتنی رقم تھی جو سیکڑوں برسوں میں بھی ختم نہ ہوتی اور ہمارا اس غیر اہم ریاست سے تحویل ملزمان جیسا کوئی معاہدہ بھی نہیں تھا۔''

''پھر کیا ہوا؟''

''کیا ہونا تھا۔ ہم نے بے پروائی اور عدم دلچسپی کی

ستم پیشہ

ماہ نور

کام سے دیانت داری نبھانے کا عزم اور ظرف ہر کسی میں نہیں ہوتا... وہ ایک معزز پیشے سے وابستہ تھا... اس کے آبا بھی اسی پیشے سے منسلک رہے تھے... اس نے بہتر مواقع چھوڑ کر ایک کم عہدہ قبول کیا ہوا تھا... اس کے باوجود وہ اپنے ماضی کے حوالوں سے بہتر تھا...

مریضوں کی جان و مال کا تحفظ برقرار رکھنے والے مسیحا کی مسیحائی

اداکاری کی اور خاموشی سے اس کی منتقلی کا انتظار کرتے رہے۔ بالآخر ایک روز ہمیں اطلاع ملی کہ وہ اوپن بارڈر کے بہت قریب آ پہنچا ہے۔ ہم تیار حالت میں تھے۔ امیگریشن افسر سے ہمارا رابطہ تھا۔ ایک محفوظ جگہ سے میں اور جو سرحد پار کر گئے۔ اس کو بے خبری میں دبوچا اور الٹے قدموں واپس نکل آئے۔"

"لگتا ہے کہ درحقیقت تم دونوں کو اچھی خاصی تگ و دو کرنی پڑی ہوگی اور خرچا بھی۔" ڈاکٹر وحشی نے کہا۔

"ہاں، اتنا آسان بھی نہیں تھا جیسا میں نے مختصر سنا دیا۔"

"تھا کون وہ؟" ڈاکٹر نے سوال کیا۔

"ہنری ہیمنڈ۔" تام نے فخریہ انداز میں جواب دیا۔ اسی وقت ویٹرس آن کھڑی ہوئی۔ ڈاکٹر سے آرڈر لے کر وہ چلی گئی تو ڈاکٹر نے آنکھیں سکیڑ کر نام دہرایا۔

"ہنری ہیمنڈ... یہ تو غالباً کئی برس پہلے کی بات ہے۔"

"بالکل ٹھیک۔ وہ کئی کمپنیوں کا زعفران خرد برد کر کے صاف نکل گیا تھا۔ اخبارات میں وہ کہانی کئی بار گردش کر رہی تھی۔"

"وہ اب کہاں ہے؟" ڈاکٹر وحشی نے پوچھا۔

"تمہارے حوالے۔" جو نے چونک کر تام کو دیکھا۔

"اور جو... میں بتانا بھول گیا۔ ڈاکٹر ہمارے ہی ساتھی ہیں۔ میڈیکل آفیسر۔" تام نے جو سے معذرت کی پھر ڈاکٹر سے مخاطب ہوا۔

"ڈاکٹر، آپ ہنری کے ساتھ دوسرے نئے قیدیوں کا بھی چیک اپ کر لیں۔"

"میں نئے قیدیوں کو دیکھ لیتا ہوں۔" ڈاکٹر نے سر ہلایا۔ ویٹرس واپس آ گئی اور تینوں کافی سے لطف اندوز ہونے لگے۔ کچھ دیر بعد موضوعِ گفتگو پھر ہنری ہیمنڈ کی جانب مڑ گیا۔

"تم کیا سمجھتے ہو وہ رقم واپس کر دے گا؟" ڈاکٹر نے سوال کیا۔

"یہ بات تمہیں ہنری سے پوچھنی چاہیے۔ اٹلانٹک عبور کرتے ہوئے دورانِ سفر ہم کوشش کرتے رہے لیکن اس نے ایک لفظ بھی بتا کر نہیں دیا۔ خیال ہے کہ کم از کم چار چھ سوئس بینکوں میں اس کے اکاؤنٹ ہیں جو شاید اس وقت تک ان چھوئے پڑے رہیں، جب تک وہ خود نہیں چاہے گا۔" تام نے تبصرہ کیا۔

ڈاکٹر وحشی تکنیکی انداز میں سر ہلا رہا تھا۔ "میں حیران ہوں کہ آخر آدمی جرم کی راہ اختیار کرنے کا فیصلہ کیوں کرتا ہے؟"

تام حسین نے کندھے اچکائے۔ "کون جانے؟"

"لوگ ایسے کام کر جاتے ہیں جس کی آپ توقع نہیں کر رہے ہوتے یا یوں کہہ لیں کہ ایسے لوگوں کے اقدامات آپ کی سوچ سے مطابقت نہیں رکھتے۔" جو نے پہلی بار گفتگو میں حصہ لیتے ہوئے کہا۔ "مثلاً آپ خود اپنی مثال لیں... آپ جیسا جوان اور قابل شخص پبلک ہیلتھ سروس کا انتخاب کرتا ہے... حیران کن؟ میں شرطیہ کہہ سکتا ہوں کہ آپ جیسا ڈاکٹر یارڈ ہنٹ کی اسپتال کا رخ کرتا ہے۔"

ڈاکٹر مسکرایا۔ "بات تمہاری ٹھیک ہے لیکن میں جہاں ہوں وہاں خوش ہوں۔ میرے خیال میں یہی میرے لیے بہترین جگہ ہے یا مقام ہے مثلاً تم دونوں کے لیے میرا خیال ہے کہ تم ایک فعال پولیس کے کردار میں خوشی محسوس کرتے اور تم اسے بہترین پیشہ خیال کرتے ہو۔"

"یہ بھی ٹھیک ہے۔" جو بولا۔ "اب تام کو دیکھیے گزشتہ ایک برس میں اس کی دو ترقیاں ہوئیں، دونوں بار اس نے مسترد کر دیں ورنہ اس وقت وہ آرام سے ڈی سی آفس میں ڈیسک پر ہوتا۔ تام کو مجرموں، مفروروں، ملزمان کے ساتھ آنکھ مچولی کھیلتے ہوئے زیادہ مزہ آتا ہے۔ احباب کہتے ہیں کہ اس نے ترقی نہ لے کر پاگل پن کا مظاہرہ کیا ہے جبکہ اس کا کہنا ہے کہ وہ جہاں ہے خوش ہے۔"

تام نے اثبات میں سر ہلایا۔ کچھ دیر تینوں اسی موضوع پر خیال آرائی کرتے رہے پھر وہاں سے ایک ساتھ اٹھے۔ تام کے چہرے پر الجھن اور شرمندگی کے تاثرات تھے۔

"ڈاکٹر میں معذرت خواہ ہوں لیکن... لیکن میں پھر تمہارا نام بھول رہا ہوں۔"

حسین وحشی طمانیت کے ساتھ مسکرایا۔ "کوئی بات نہیں، ایسا بیشتر افراد کے ساتھ ہوتا ہے۔ وہ مجھے یاد رکھنے میں دشواری محسوس کرتے ہیں، عجیب بات ہے؟ بہرحال حوالات کے قریب میرے دفتر آنا، کافی پئیں گے۔" پھر ڈاکٹر نے جو سونٹ کو مخاطب کیا۔ "اور تم بھی مسٹر سونٹ، کسی بھی وقت مجھے خوشی ہوگی۔"

☆☆☆

"گڈ مارننگ، مسٹر ہیمنڈ! میں ڈاکٹر وحشی ہوں یہاں کا چیف میڈیکل آفیسر۔ قیدیوں کی صحت کے معاملات میری ذمے داریوں میں شامل ہیں۔ ہر نئے قیدی کی آمد پر مجھے اس کی جانچ کرنی ہوتی ہے تاکہ میں تعین کر سکوں کہ اسے کسی قسم کا علاج معالجہ تو درکار نہیں ہے۔" ڈاکٹر نے گڈ مارننگ کے ساتھ تمام بات قیدی کے

گوش گزار کر رہا تھا۔

ہیمنڈ نے سمجھنے والے انداز میں سر ہلا دیا، کہا کچھ نہیں۔ اس کی آنکھوں کے نیچے حلقے پڑ گئے تھے۔ اس کے انداز سے بے چینی مترشح تھی۔ وہ اپنی ہتھیلیاں بار بار کھول بند کر رہا تھا۔ صاف لگ رہا تھا کہ اچانک گرفتاری اور امریکا واپسی اس پر بجلی بن کر گری تھی۔

ڈاکٹر وشنی گہری نظر سے اس کا جائزہ لے رہا تھا۔

''اس طرف آؤ۔'' ڈاکٹر نے نرم لہجے میں ملحقہ کمرے کی جانب اشارہ کیا۔

اس کمرے میں کوئی فرنیچر نہیں تھا۔ سفید دیواریں اور محض ایک بیڈ مریض کے لیے۔ کوئی ایسی چیز نہیں تھی جو کسی بھی قسم کے خلل کا باعث بنتی۔ ڈاکٹر کو اپنے کام کے لیے مکمل توجہ درکار تھی۔

''براہ مہربانی آرام سے لیٹ جائیے۔ میں خون کا دباؤ چیک کر رہا ہوں۔'' ڈاکٹر نے کہا۔

جیری ہیمنڈ کے لیٹنے کے بعد ڈاکٹر نے بلڈ پریشر کا مخصوص آلہ اٹھایا۔ اس کی چوڑی پٹی ہیمنڈ کے بازو سے لپیٹ کر اس نے ربر کے بلب نما گولے کو دبا کر ہوا اندر پمپ کرنی شروع کر دی۔

''پرسکون ہو جاؤ، کسی چیز کے بارے میں مت سوچو۔'' ڈاکٹر نے ریڈنگ دیکھتے ہوئے نرم، دھیمی آواز میں بولنا شروع کیا۔

''بالائی دباؤ کچھ زیادہ ہے۔'' ڈاکٹر کی آواز یکساں اور ہموار تھی۔ ''تمہارے اعصاب اب بھی تناؤ کا شکار ہیں لیکن کوئی بات نہیں سب ٹھیک ہو جائے گا۔ میں تمہیں بتاتا ہوں کہ پلکیں کیسے ہوتے ہیں۔ اپنی آنکھیں بند کر لو، ٹھیک ہے، پٹھوں کو ڈھیلا کر دو، گڈ۔ ہاتھ پیر سیدھے رکھو۔ ان کو ڈھیلا کر دو۔ بالکل بے جان گڈ، ویری گڈ بس میری آواز پر دھیان دو۔ تم بالکل آرام دہ حالت میں آتے جا رہے ہو۔

''میری ہدایات پر عمل کرتے رہو۔ تم آرام و سکون کی آئیڈیل حالت میں چلے جاؤ گے۔ دھیان دو تمہارے ہاتھ پیر بے جان ہونے کے بعد بالکل مردہ حالت میں ہیں۔ پیر کے ناخن سے سر کے بال تک تمہارا جسم بالکل نرم ہو گیا ہے۔ سکون کی انتہائی حالت... تمہارے اعصاب اور جسم پر کہیں کوئی دباؤ نہیں ہے۔ دماغ میں کوئی سوچ نہیں، تم صرف میری آواز سن رہے ہو... میں تمہارے ذہن کو دباؤ کے بغیر دیکھوں گا۔ تم بہت سکون کی حالت میں آ گئے ہو۔ اوہ، گڈ... بہت اچھے، ویٹ از ویری گڈ۔ تم نے آج سے قبل ایسا آرام اور سکون کبھی محسوس نہیں کیا۔ دوبارہ خیال کرو... تمہارے جسم اور دماغ پر کہیں کوئی دباؤ بالکل نہیں ہے۔ تمہاری آنکھیں بند ہیں۔ تم انہیں کھولنا نہیں چاہتے بلکہ کھول ہی نہیں سکتے۔ اگر تم واقعی اپنی آنکھیں نہیں کھول سکتے تو اس کا مطلب ہے کہ تم انتہائی آرام کی حالت میں ہو۔ اب آنکھیں کھولنے کی کوشش کرو... اوہ تم واقعی آنکھیں نہیں کھول پا رہے، ویری گڈ۔ تم آرام کی بہت گہری حالت میں چلے گئے ہو۔ تمہاری دنیا میں میری آواز کے سوا کچھ بھی نہیں۔''

☆☆☆

ڈاکٹر نے نہایت آرام اور تیزی سے اپنا کام مکمل کیا تھا۔ ڈاکٹر جیسن وشنی نے جیری ہیمنڈ کو نوویم اور خنیدہ کا لفظ استعمال کیے بغیر ڈیپ ٹرانس کی حالت میں پہنچا دیا تھا۔ نصف گھنٹا مکمل ہونے سے بیشتر اس نے ٹرانس کی مخصوص حالت کو مزید گہرا کر دیا پھر اس نے ہیمنڈ سے خفیہ اکاؤنٹس کے کوڈ نمبر معلوم کیے۔ یہ تعداد میں دو تھے۔ بیلنس معلوم کیا۔ از اں بعد ڈاکٹر نے اسے ٹرانس سے باہر نکالنے سے بیشتر ہدایات دیں کہ وہ بیدار ہونے کے بعد خفیہ اکاؤنٹس کے بارے میں ہر بات بھول چکا ہو گا۔ یہ پوسٹ ہپناٹک ہدایت تھیں۔

''اور تمہیں کبھی میرا نام یاد نہیں آئے گا۔'' ڈاکٹر وشنی نے اسی نرم و ہموار آواز میں کہا۔ اس کی آواز میں گہرا یقین اور ارتکاز تھا۔

☆☆☆

ڈاکٹر اس مرتبہ بہت مسرور و مگن تھا۔ اسے ایجنٹ ٹام کیمبل کا خیال آیا جب ایک برس قبل اس نے ٹام کو ہپناٹائز کیا تھا اور ہدایات دی تھیں کہ وہ خفیہ اکاؤنٹ رکھنے والے مجرموں کی اطلاع اسے دیتا رہے گا اور بھول جائے گا لیکن ڈاکٹر یہ ہدایات دینا بھول گیا تھا کہ ٹام... ریسٹورنٹ میں ہمیشہ اکیلا آئے گا۔ آج وہ جو موقت کے ساتھ آیا تھا۔ ڈاکٹر نے سوچا کہ موقع ملتے ہی وہ اپنی اس غلطی کا ازالہ کر دے گا۔

ہیمنڈ کمرے سے جا چکا تھا۔ ڈاکٹر کے لیے یہی بہترین جگہ تھی۔ اسے کیا ضرورت تھی کہ نجی اسپتالوں میں سارا دن مغزماری کرتا۔

اس کے مرحوم والدین بھی پیشہ ور ہپناٹسٹ تھے۔ انہوں نے پوری زندگی میں اتنا نہیں کمایا تھا۔ جتنی دولت ڈاکٹر وشنی نے ایک سال میں جمع کر لی تھی۔

شیکسپیئر کا کہا ہوا ایک ضرب المثل کی حیثیت اختیار کر گیا ہے کہ زندگی ایک اسٹیج ہے جس پر ہم سب اداکار ہیں جو اپنا اپنا کھیل دکھا کے چلے جاتے ہیں... یہی اداکار زندگی کے آغاز سے انجام تک ایک جوا کھیلتا ہے... جس میں خطرات اور حادثات کی بازی پہلی سانس کے ساتھ لگتی ہے اور آخری سانس تک جاری رہتی ہے... تخلیق کے نقائص ہوں یا بیماریاں... وہ زندگی کے ہر نومولود کو شکست سے دوچار کرنا چاہتے ہیں مگر زندگی مقابلہ کرتی ہے اور یہ کھیل انسانی تدبیر اور نوشتۂ تقدیر کے ساتھ زندگی کے تمام اہم اور غیر اہم فیصلوں میں جاری رہتا ہے... خوشی... غم... نفع... نقصان... دوستی... دشمنی... محبت اور نفرت... سب ہار جیت کے وہ روپ ہیں جن سے ہر انسان ایک جواری بن کے سامنا کرنے پر مجبور ہوتا ہے... جواری... انسانی جذبوں کے ردعمل سے جنم لینے والی وہ کہانی ہے جو نگر نگر گلی گلی اور گھر گھر نئی بھی لگتی ہے اور پرانی بھی... آپ بیتی بھی اور جگ بیتی بھی... تجسس اور حیرانی کے سارے رنگ دکھلاتی جادو اثر تحریر...

جواری

احمد اقبال

پندرہویں قسط

”تو نے اسے کھول کے بھی نہیں دیکھا؟“

”کیا تھا... ایک کتاب ہی تو تھی۔“ میں نے بے وقوفوں کی طرح کہا۔

اس نے ایک گہری سانس لی۔ ”وقت ہی سکھائے گا تجھے بھی کہ ہر شخص پر آنکھ بند کر کے اعتبار کرنے کا کیا نقصان ہو سکتا ہے۔ میرا خیال ہے کہ صرف ایک کتاب بھیجنے کے لیے وہ اتنا ترد نہ کرتے۔“

”یہ اندازہ تو ہے مجھے... وہ آزما رہا تھا کہ میں کس حد تک اعتبار کے قابل ہوں، بات کتنی توجہ سے سنتا ہوں اور ہدایات پر کس حد تک عمل کرتا ہوں۔“

اس نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھا۔ ”ہاں، ابھی تو اس نے یہی دیکھا ہوگا۔ میرے ساتھ بھی وہ بہت اچھا ہے لیکن...“

”لیکن کیا بھائی؟“

”ادھر اُدھر سے اس کے بارے میں جو سنتا رہتا ہوں میں، اس سے کچھ تشویش تھی کہ میں نے تجھے اس کے پاس کیوں بھیج دیا تھا۔“

”اس میں تشویش کی کون سی بات ہے؟“

”کیا تجھے بالکل خیال نہیں آیا... کہ تو گیا تھا کام کے لیے۔ میں نے بھی یہی کہا تھا کہ بہت دن سے مارا مارا پھر رہا ہے۔ اسے کہیں کام پر لگوا دیں۔ شاہ جی کے تعلقات کا سلسلہ بہت لمبا ہے اور بظاہر اس نے کام کر دیا مگر کام کیا ہے، اس کا کچھ پتا نہیں۔ یہ تو ایسا کوئی کام نہیں تھا جو تو نے کیا۔ دس ہزار کس بات کے؟“

”مجھے پروفیسر کا معاملہ بھی سمجھ میں نہیں آیا۔ اب وہ جس طرح رہتا ہے یہ ایک پروفیسر کی تنخواہ میں تو ممکن نہیں۔ ٹیوشن وغیرہ سے اتنا کون کما سکتا ہے۔ جب میں پہلے ملا تھا تو ایک چھوٹا سا گھر تھا۔ یہ محل اور شان و شوکت دیکھ کے میں تو حیران رہ گیا۔“

”نادر شاہ کے بارے میں لوگ عجیب عجیب باتیں بتاتے ہیں۔ کہتے ہیں کہ اس کا تعلق جرائم کی دنیا سے ہے۔ خود اس کا کوئی گروہ ہے اور اس کے سارے غیر قانونی دھندے ہیں۔ مگر میں نے کہا کہ مجھے کیا، میری تو اس نے ہمیشہ مدد کی پھر کوئی چھوٹا موٹا کام اس کا ہو تو میں کر دیتا ہوں۔“

میں نے سب کچھ سمجھ لینے کے باوجود بھائی کی طرح انجان بنے رہنا ہی بہتر سمجھا۔ ”ہاں مجھے بھی اپنے کام سے کام ہوگا۔ کوئی کام غلط لگے گا تو انکار کر دوں گا۔“

”میں پھر بات کروں گا اس سے، کوئی اچھی تنخواہ والی نوکری ہو، کسی اچھی کمپنی میں اور تنخواہ بھی معلوم ہو۔ پتا ہو کام کیا ہے روز کا۔“ وہ بڑبڑاتا ہوا چلا گیا۔

اس کی پریشانی میرے لیے بھی پریشانی تھی لیکن اس سے کہیں زیادہ پریشانی میں بے روزگاری کے ہاتھوں اٹھا چکا تھا اور محض اندیشوں کی بنیاد پر نادر شاہ کو انکار نہیں کر سکتا تھا۔ بھائی کی طرح اس کے منہ پر نہیں کہہ سکتا تھا کہ جن کاروباروں سے تم بدنام ہو ان میں مجھے شریک نہ کرو، وہ سادگی سے پوچھ لیتا کہ ایسے کون سے کاروبار ہیں تو میں بغلیں جھانکتا نظر آتا۔ کسی غلط کام کا ثبوت فراہم ہونے تک خاموشی بہتر تھی۔ ابھی تک میری نظر میں نادر شاہ وہ آدمی تھا جس نے مشکل وقت میں ہمیں بچایا تھا۔ جب اس نے پروفیسر کو ایک کتاب پہنچانے کی بات کی تو میرے دماغ میں ادھر اُدھر کی بات کیسے آتی۔ مزید یہ کہ پروفیسر نے مجھے جو دس ہزار دیے وہ میرے ارادے کے تابوت میں آخری کیل ثابت ہوئے۔ اتنی بڑی دولت کو میں انکار کیسے کرتا۔ بھوکے کو روٹی غنیمت مگر اسے پلاؤ کی پلیٹ مل جائے تو وہ خوشبو سے ہی ہوش و حواس کھو بیٹھے گا۔ دس ہزار کبھی میری جیب میں نہیں آئے تھے اور نہ آ سکتے تھے ایک دم بیسے خواہشات نے بے لگام ہو کے مجھے ناک آؤٹ کر دیا۔

اپنی پہلی باقاعدہ کمائی سے ملنے والی خوشی کے دورے کی شدت کم ہوئی تو اس کے جائز، ناجائز ہونے کا خیال بھی آیا۔ اس سے پہلے میں نے ٹیوشن بہت پڑھائی جو تھوڑے بہت پیسے ملتے تھے وہ میری چھوٹی موٹی ضروریات پوری کر دیتے تھے۔ مجھے احساس تھا کہ بھائی پر میری تعلیم و پرورش کا بار اب ختم ہو جانا چاہیے۔ احسان کا قرض اتارنا ممکن نہ تھا لیکن میں اب اپنے اخراجات پورے کر سکتا ہوں۔ بھائی کی تشویش بجا تھی۔

نادر شاہ کے دھندے غلط ہوں مجھے کیا۔ اس کے نہ جانے کتنے ملازم ہوں گے۔ وہ کسی جرم میں شریک نہیں سمجھے جا سکتے۔ جب تک کہ ان کے فرائض کی نوعیت مجرمانہ ثابت نہ ہو جائے۔ مجھے بھی اس معاملے میں محتاط رہنا چاہیے۔ میں نے سوچ لیا تھا کہ اگلی بار میں کام کی نوعیت کو دیکھ کے ذمے داری قبول کروں گا ورنہ انکار کر دوں گا لیکن اس کی نوبت ہی نہ آئی، دو دن بعد بھائی کے ساتھ ایک حادثہ پیش آ گیا۔

میں کہیں انٹرویو دینے کے لیے گیا ہوا تھا۔ وہاں سے فارغ ہوتے ہوتے شام ہو گئی۔ وہ میرے ایک دوست

کے والد کی لا فرم تھی۔ وہ بہت بڑے وکیل تھے اور انہیں آفس کے لیے ایک اسسٹنٹ کی ضرورت تھی۔ میرے دوست نے ان سے میرا ذکر کیا کہ میں پروفیسر بننے کے خواب دیکھتا ہوں تو انہوں نے مجھے طلب کر لیا۔ انگریزی میری اچھی تھی، وکیل صاحب نے کہا کہ وہ کسی بینک یا ملٹی نیشنل کمپنی جتنی تنخواہ تو نہیں دے سکتے لیکن یہاں میرے قانون کا پیشہ اپنانے کی خواہش ضرور پوری ہو سکتی ہے۔ وہ خود بھی میری امداد اور راہنمائی کریں گے اور میں نے ذہانت محنت اور شوق سے کام کیا تو ایک نہ ایک دن میں اپنے مقصد میں ضرور کامیاب ہو جاؤں گا۔ مجھے معلوم تھا کہ ان کا اسسٹنٹ بننے کے لیے کتنے کوالیفائڈ وکیل آنا چاہتے ہوں گے۔ مجھے تو ابھی قانون پڑھنا تھا اور سیکھنا تھا۔ میں نے طے کر لیا تھا کہ میں اس چیلنج کو قبول کروں گا، بگی بندھی آمدنی اور محدود اوقات کی نوکری نہیں کروں گا۔

میں اپنے دوست کے ساتھ گھومتا پھرتا شام کو گھر پہنچا اور دروازہ کھول کے اندر داخل ہوا ہی تھا کہ ایک پڑوسی نے دستک دی۔

”کہاں تھے تم فرید؟“ اس نے تشویش سے کہا۔

”کیوں؟ خیریت تو ہے نا۔“ میں نے پوچھا۔

”خیریت نہیں ہے اسی لیے تو تمہاری تلاش تھی۔ تم اسپتال جاؤ تمہارے بھائی کا ایکسیڈنٹ ہو گیا ہے۔“

”ایکسیڈنٹ؟“ میں گھبرا گیا۔ ”وہ ٹھیک تو ہے نا۔“

پڑوسی نے مجھے تسلی دی۔ ”ہاں ہاں اللہ اس نے تمہیں بلایا ہے۔“

میں سخت بدحواسی کے عالم میں اسپتال پہنچا۔ بھائی زخمی ہوا تھا لیکن خطرہ کوئی نہ تھا۔ اس کے ہاتھوں پیروں اور پیشانی اور چہرے پر خراشیں تھیں۔ وہ بستر پر سیدھا لیٹا ہوا تھا اور اس کے سرہانے یونیفارم اور بندوق والا ایک پولیس مین موجود تھا۔ مجھ سے باتیں کرنے کے لیے بھائی نے اسے ”چائے“ پینے بھیج دیا۔ میرے پوچھنے پر بھائی نے بتایا۔ ”آج صبح مجھے ہیڈ آفس جانا تھا۔ ایک رسمی سا انٹرویو تھا۔ شاید اب میری پروموشن اے وی پی کے عہدے پر ہو گی اور مجھے کسی بڑی برانچ کا چارج دیا جائے گا۔ مجھے ایک خاص کلائنٹ سے بھی ملنا تھا جو ایک گروپ آف کمپنی کا صدر ہے۔ اب یہ میرا کام نہیں تھا لیکن جو گاڑی برانچ کے لیے کیش لے کر آ رہی تھی، وہ خراب ہو گئی اور کیش لانے والے نے مجھ سے کہا کہ آپ لے جائیں۔ برانچ میں کیش شارٹ ہے۔ میں نے بیگ اپنی گاڑی میں رکھ لیے۔ یہ جگہ لکھے بغیر کہ رقم کتنی ہے۔ بینکوں میں ایسے ہی ہوتا ہے۔ نوٹ کاغذ کے پرزے ہوتے ہیں اور بس۔ اب یہ خلاف ضابطہ ہے لیکن ایسی بے ضابطگی ہر روز ہوتی ہے اور کسی کو پتا نہیں چلتا تو کوئی قیامت نہیں آتی۔ آج میری بدقسمتی کہ یہ حادثہ پیش آ گیا۔“

میں نے کہا۔ ”کہاں... اور کیسے؟“

”ظاہر ہے حادثے کا پہلے کسی کو اندازہ نہیں ہو سکتا۔ میں ایک چوک پر تھا کہ بائیں طرف..... سے آنے والی ایک گاڑی نے تیزی سے میرا راستہ روکا۔ میں نے ایک دم بریک لگائے اور گاڑی کو بائیں طرف موڑا اور اسی گلی میں گھس گیا۔ مجھے راستہ روکنے والوں کی نیت اور عزائم کا اندازہ ان کے چہرے دیکھ کر ہی ہو گیا تھا۔ وہ میرے پیچھے آئے۔ انہوں نے پیچھے سے فائر کیا اور پہلی گولی نے پچھلا ونڈ اسکرین پاش پاش کر دیا۔ میں نے پھر بھی رفتار کم نہیں کی۔“

”کتنی رقم تھی آپ کے پاس؟“

”زیادہ نہیں۔ بس پچاس لاکھ۔“

میں نے کہا۔ ”کمال ہے بھائی، یہ معمولی رقم ہے۔ آپ کو گارڈ ساتھ لینا چاہیے تھا۔“

وہ مسکرانے لگا۔ ”مجھے بتانا یاد نہیں رہا۔ کیش لانے والی گاڑی میں ایک گارڈ تھا۔ وہ بھی میرے ساتھ بیٹھ گیا تھا اور اس نے پیچھے کا ونڈ اسکرین ٹوٹ جانے کے بعد ایک گولی تعاقب کرنے والوں پر چلائی مگر پھر ایک گولی نے اس کی پیشانی میں سوراخ کر دیا۔ کیونکہ وہ مڑ کر پیچھے دیکھ رہا تھا۔ مجھے بھی ایک گولی لگی۔ یہاں شانے میں۔ لیکن اس نے ہڈی کو نقصان نہیں پہنچایا۔ گارڈ تو فوراً مر گیا۔ میں نے ہمت نہیں ہاری اور اس کی لاش سیٹ میں نکل آیا۔ فائرنگ سے ڈاکو بھی نروس ہوئے تھے اور بھگدڑ مچی تو وہ فرار ہو گئے۔ مگر میری رفتار بہت زیادہ تھی اور جب اچانک بائیں طرف سے ایک گاڑی آئی تو نہ وہ بریک لگا کے تصادم کو روکنے میں کامیاب ہوا نہ میں۔ بس ایک دھماکا سنا تھا میں نے۔ اس کے بعد کا مجھے پتا نہیں پھر آنکھ یہاں کھلی۔“

”یہ پولیس یہاں کیوں بیٹھی ہوئی ہے بھائی؟“

بھائی نے ایک ٹھنڈی سانس لی۔ ”اصل حادثہ یہی ہے نا کہ میری گاڑی میں سے گن مین کی لاش ملی لیکن وہ پچاس لاکھ نہیں ملے جو میں لے کر آ رہا تھا۔“

میں چونک پڑا۔ ”وہ رقم کہاں گئی؟“

بھائی نے نفی میں سر ہلایا۔ ”یہ کسی کو نہیں معلوم۔“

”جس گاڑی نے ٹکر ماری تھی...“

"یہی تو عجیب بات ہے۔ پولیس کو وہاں کوئی گاڑی نہیں ملی اور وہ اس بات کو تسلیم بھی نہیں کرتے۔"

"کیا مطلب، حادثے کے دس ثبوت اور بھی ہوں گے جائے واردات پر؟"

"بالکل ہوں گے۔ میری تباہ شدہ گاڑی سب سے بڑا ثبوت ہے۔ دوسری گاڑی بھاگ گئی لیکن پولیس چاہتی تو اس کے اجزا، تلاش کر لیتی۔ اس کے شیشے یا ہیڈ لائٹس کے علاوہ باڈی کے اجزا، ہو سکتے تھے اور کچھ نہیں تو پینٹ جو اکثر گرتا ہے۔"

میں نے کہا۔ "کیا بینک نے آپ کے خلاف پچاس لاکھ کے نقصان کا کیس بنایا ہے؟"

"ایف آئی آر ضرور لکھی گئی ہے اور اس میں میرا بیان بھی شامل ہے لیکن پولیس یقین نہیں کرتی تو سب شک میں مبتلا ہو گئے ہیں۔ بینک والے جانتے ہیں میرے کردار کو، لیکن اب وہ کہیں گے کہ پچاس لاکھ میں اپنی ایمانداری کی شہرت کو داؤ پر لگایا جا سکتا ہے۔ جا لیکن کچھ نہیں۔"

چائے پینے کے لیے جانے والا پولیس مین اچانک لوٹ آیا۔ اس کے ساتھ ایک سب انسپکٹر بھی تھا جس نے بغل میں فائل دبا رکھی تھی۔ مجھے اس کے لیے کرسی خالی کرنی پڑی۔ وہ تھانیدار ویسا ہی تھا جیسے کے عموماً ہوتے ہیں۔ کرخت نقوش اور سفاک چہرے والا۔ جس کی آنکھوں سے بے رحمی جھلکتی تھی۔ بندوق بردار کانسٹیبل بھائی کے سرہانے مستعد کھڑا ہو گیا۔

تھانیدار نے میری طرف ورشتی سے دیکھا۔ "چل میاں تو نکل ادھر سے، کچھ بات کرنی ہے ملزم سے۔"

بھائی نے کہا۔ "یہ میرا بھائی ہے۔"

"بھائی بہن تو اور بھی بہت ہوں گے۔ کیا میں ان سب کی موجودگی میں تفتیش کروں؟"

بھائی نے عاجزی سے کہا۔ "اسے ڈاکٹر نے یہاں رہنے کی اجازت دی ہے۔ بڑی مہربانی ہوگی آپ کی۔"

تھانیدار نے فائل کھولی۔ "چل ٹھیک ہے۔ بیان تو دیکھا ہے میں نے تیرا۔ اب کچھ سوال ہیں۔ ٹھیک جواب دے گا تو تیرے لیے بھی آسانی اور ہمارا کام بھی آسان۔ تو نے کسی گاڑی کا ذکر کیا تھا جس نے ٹکر ماری۔ مگر وہاں کوئی گاڑی نہیں ملی۔"

"وہ بھاگ گیا ہوگا۔ میں غلط نہیں کہہ رہا ہوں۔"

"بھاگ گیا ہوگا؟ یعنی کوئی بندہ چلا رہا تھا وہ گاڑی... یہ دیکھ لیا تو نمبر بھی دیکھا ہوگا؟"

پھر میں نے دیکھا۔ وہ بائیں طرف سے آیا تھا۔ میں تو یہ بھی نہیں جانتا کہ وہ مرد تھا یا عورت۔"

"گاڑی کون سی تھی؟ رنگ تو دیکھا ہوگا؟" تھانیدار مسکرانے لگا۔ "دیکھ سچ سچ بتا رہے۔"

"میں کچھ نہیں دیکھ سکا تھا۔ جب گاڑی نے ٹکر ماری تو میں بے ہوش ہو گیا تھا لیکن تم حادثے کی جگہ سے شواہد اکٹھے کر سکتے ہو۔ حادثے کے عینی گواہ بھی ہوں گے وہاں... جو گن مین میرے ساتھ تھا۔"

تھانیدار مسکراتا رہا۔ "ہاں، اس کی گواہی کی ضرورت پڑے گی تجھے۔ کیا پتا وہ قبر سے اٹھ کے آ جائے بیان دینے ورنہ..."

"ورنہ کیا۔ میں نے کون سا جرم کیا ہے۔ کیا بینک والوں نے میرے خلاف کوئی رپورٹ لکھوائی ہے؟ مجھے معلوم ہے وہ مجھ پر شک کر ہی نہیں سکتے۔ ہمارا ریکارڈ ہے ان کے سامنے... وہ جانتے ہیں کہ میں نے کبھی ایک پیسے کا غبن نہیں کیا۔"

وہ سر ہلانے لگا۔ "بالکل ٹھیک ہے۔ مگر یہ تو پچاس لاکھ کا معاملہ ہے، وہ کہاں گئے؟"

بھائی نے بے بسی سے کہا۔ "میں کیا بتا سکتا ہوں۔ میری جان بچ گئی مگر حادثے کے بعد میں بے ہوش ہو گیا تھا۔"

تھانیدار ایک دم پھٹ پڑا۔ اس نے ایک سانس میں بھائی کو انتہائی فحش گالیاں دیں۔

"آخر تم کیا چاہتے ہو؟" بھائی نے خوف زدہ ہو کے پوچھا۔

"بندے کو مل بانٹ کے کھانا چاہیے۔ پچاس لاکھ تو اکیلے ہضم کرلے یا اپنے اس بھائی کے ساتھ مل کے کہیں بھی چھپانے کی کوشش کرے تو یہ نہیں ہو سکتا۔ چل ہمیں حصے کر لے۔ ایک میرا تو ہیں تیرے ساتھ۔ ورنہ پچاس تو ہم منہ میں ہاتھ ڈال کے نکال لیتے ہیں، قبر میں لیٹے مردے سے بھی۔"

اب میں نے دخل دیا۔ "تھانیدار صاحب! مت بھولو کہ یہ اسپتال ہے، تھانہ نہیں۔"

اس نے غرا کے ایک گالی مجھے دی۔ "یہ تو سمجھائے گا مجھے؟"

"تم مریض کو ہراساں کر رہے ہو۔ میں ڈاکٹر کو بلاتا ہوں۔"

وہ مجھے خون آشام نظروں سے گھورتا رہا اور پھر فائل

بند کر کے اٹھ کھڑا ہوا۔ ''اچھا پتر! اب تھانے میں ہی بات ہوگی۔''

جب وہ چلا گیا تو میں نے بھائی کی آنکھوں میں آنسو دیکھے۔ ''یہ مجھ پر غبن کا الزام لگا رہے ہیں۔''

''یہ کچھ ثابت نہیں کر سکتے۔ آپ بالکل پریشان نہ ہوں۔ اگر آپ پر الزام آیا تو میں شہر کے سب سے بڑے وکیل کی خدمات حاصل کروں گا۔ سہروردی صاحب آپ کی وکالت کریں گے۔''

بھائی مسکرانے لگا۔ ''سہروردی صاحب ایسے کیس نہیں لیتے اور نام تو سنا ہے ان کا۔ یہ بھی معلوم ہے کہ وہ ایک کیس کی فیس کیا لیتے ہیں۔''

''وہ مجھ سے فیس نہیں لیں گے۔'' میں نے بڑے غرور سے کہا۔

''کیوں، تجھے اپنی فرزندی میں قبول کر لیا ہے انہوں نے۔''

''بھیا، میں ان کا اسسٹنٹ بن گیا ہوں۔ وہ مجھے وکالت پڑھائیں گے اور سکھائیں گے۔ آپ چاہتے تھے نا کہ میں بہت بڑا وکیل بنوں، جج بنوں۔ آپ کی یہ خواہش ضرور پوری ہوگی۔''

وہ اٹھ بیٹھے۔ ''یہ... یہ کب ہوا۔ تو نے پہلے نہیں بتایا مجھے۔''

''آج میں چاہتا تھا کہ آپ گھر آئیں تو یہ خوش خبری دوں۔ آج ہی تو بات ہوئی تھی ان سے۔''

وہ خلا میں دیکھنے لگا۔ ''یہ بہت اچھا ہوا۔ بہت ہی اچھا ہوا منا۔ مگر ابھی تو میری ایک بات سن دھیان سے۔ میری گاڑی دیکھ، شاید تھانے میں ہوگی۔''

''دفع کریں گاڑی کو۔ آپ کی جان سے بڑھ کے نہیں۔'' میں نے کہا۔

''دیکھ، گھر سے دوسری چابی لے کر تھانے جا۔ گاڑی کی ڈکی کھول۔ پیچھے بہت کاٹھ کباڑ پڑا ہے۔ جیک اور اسپیر وہیل، بریک آئل اور انجن آئل کے ڈبے۔ ان کے پیچھے پرانے کپڑے بندھے ہوئے رکھے ہیں۔ ایدھی کو دینے تھے۔''

''وہ میں دے دوں گا۔''

''اوں ہوں، ان کپڑوں کے نیچے ایک پلاسٹک بیگ ملے گا۔''

میں نے کہا۔ ''اس میں کیا ہے؟''

''کچھ زیورات ہیں اچھائی قیمتی۔ مالیت تو ان کی بھی پچاس لاکھ ہوگی لیکن ان کا ہے ایک کروڑ کا۔''

میں بھونچکا رہ گیا۔ ''کس کے ہیں وہ زیورات؟''

''ہیں کسی کے... میری ایک کلائنٹ ہیں۔ یہ زیورات بینک کے لاکر میں رکھے رہتے ہیں۔ جب ان کو ضرورت پڑتی ہے ان کا فون آجاتا ہے اور میں زیورات گھر پہنچا دیتا ہوں۔''

''مگر لاکر کی دوسری چابی کے بغیر۔''

''وہ مجھے ان کا شوفر دے جاتا ہے۔ جب ضرورت نہیں رہتی تو میں یہ زیورات واپس بینک کے لاکر میں رکھ کے چابی انہیں بھجوا دیتا ہوں۔''

''آپ ایسا کیوں کرتے ہیں بھائی۔ کیا بینک کے قوانین اس کی اجازت دیتے ہیں؟''

''یہ معاملہ اعتماد کا ہے منا۔ اور برانچ چلتی ہے منیجر کی پی آر پر۔ تو کیا جانے ہم ان کے لیے کیا کچھ کرنے پر مجبور ہوتے ہیں۔ یہ کروڑپتی پارٹی ہے۔ اس جیسے اکاؤنٹ ہولڈر اپنے لاکر میں لاکھوں کروڑوں کیش رکھتے ہیں۔ یہ آدھی رات کو فون کریں کہ جب چاہیں تو میں گھر سے جا کے بینک کھلواتا ہوں اور انہیں رقم نکالنے دیتا ہوں۔ میں انکار کروں تو وہ ڈپازٹ کسی اور بینک کو دے دیں گے اور وہاں کا منیجر یہ سب کرنے پر مجبور ہوگا۔ ان کے لیے بینکنگ کے اوقات کچھ نہیں۔ میں اپنے گھر میں بھی اتنا کیش رکھنے پر مجبور ہوں کہ کسی بھی وقت ان کی ضرورت پوری کر دوں۔ میری ترقی اور میرا مستقبل سب منحصر ہے گڈ ول پر اور ڈپازٹ پر۔''

''لیکن بھیا، فرض کرو زیورات نہ ملے؟''

''کیوں نہیں ملیں گے، پرانے میلے کپڑے ہٹا کے کون دیکھے گا اور دیکھا بھی تو بہت سے پرانے سنا پرزے ہیں۔''

''پولیس نے مجھے گاڑی نہ کھولنے دی، پھر... مالک تو آپ ہیں اور پھر... گاڑی ایک کیس میں ملوث بھی ہے۔ آپ اگر تاور شاہ سے فون کروا دیں۔'' میں نے کہا۔

بھائی کے چہرے کا رنگ تیزی سے بدلا۔ ''نہیں نہیں، اسے بالکل معلوم نہیں ہونا چاہیے... دیکھ منا! میں کسی پر بھروسا نہیں کر سکتا۔ یہ کام تجھے کرنا ہوگا جیسے بھی ہو۔ ورنہ... نوکری کیا میری زندگی خطرے میں پڑ جائے گی۔ میں خود تو جا نہیں سکتا۔''

''اچھا... اچھا، آپ پریشان نہ ہوں۔ میں کوشش کرتا ہوں، کسی سے مل ملا کے یا کچھ دے دلا کے کام ہو

جائے۔"

"ہاں، تو جاؤ اور رکھو مجھے بہت بے چینی رہے گی۔ مجھے بتا رہنا بلکہ وہ سب زیورات لے کر یہاں آ جانا۔ میں بینک کے کیشیئر کو فون کر دوں گا۔ وہ ان کو واپس لا کر میں رکھوا دے گا۔"

میں باہر آیا تو بھائی سے زیادہ خود پریشان تھا۔ بھائی کو ہر طرف سے نامساعد حالات نے گھیر لیا تھا۔ ایک طرف پچاس لاکھ کا معاملہ تھا جس میں بینک قانونی کارروائی پر مجبور تھا۔ اس میں بھائی کی سابقہ دیانت داری انہیں بری الذمہ قرار نہیں دلا سکتی تھی۔ غلطی اس کیشیئر کی تھی جس نے گاڑی خراب ہو جانے کے عذر پر بڑے واری بھائی کو سونپ دی تھی یا بھائی کی جنہوں نے اعتبار میں بڑے واری لی۔ دونوں اس نقصان کے ذمے دار سمجھے جائیں گے اور ضابطہ قانون کی خلاف ورزی کا الزام بھی دونوں پر آئے گا۔ دوسری طرف پولیس بھی بھائی کی دشمنی پر آمادہ تھی۔ ان کی نظر میں بھائی کی ایمان داری کی کوئی حیثیت نہ تھی۔ اہم شے پچاس لاکھ روپے۔ جن پر یقین تھا کہ بھائی اکیلا ہڑپ کرنا چاہتا ہے۔ ان کو حصہ مل جاتا تو کیس ختم ہو سکتا تھا۔

میرے لیے تازہ ترین اطلاع اتنی ہی رقم کے زیورات کی اس گاڑی میں موجودگی تھی۔ ان خاتون کو بھائی پر کتنا ہی اعتماد کیوں نہ ہو اگر نقصان ہوا تو ساری ذمے داری صرف بھائی پر آئے گی۔ بھائی کی بات غلط نہ تھی کہ کلائنٹس کے لیے بہت کچھ آؤٹ آف دی وے جا کے بھی کرنا پڑتا ہے لیکن آدمی کسی قانونی چکر میں پھنس جائے تو اکیلا رہ جاتا ہے۔ کون مانتا ہے کہ اس کے کہنے پر ایسا ہوا تھا۔

یہ سب سوچتا ہوا میں تھانے کی طرف چلا گیا۔ آخری وقت میں مجھے کسی حوالے کے بغیر تھانے میں قدم رکھنا بھی غیر محفوظ لگا۔ کچھ دیر پہلے ہی میں نے اس تھانے کے ایک لالچی تھانیدار کی مخالفت مول لے لی تھی۔ وہ مجھے بھی غائب کرا سکتا ہے۔ کون گواہی دے گا کہ میں تھانے پہنچا تھا اور پھر میرا سراغ نہیں ملا۔

میں رک گیا اور میں نے سوچا کہ کیوں نہ سہروردی صاحب سے فون کرا دوں۔ ان کا نام ہی کافی تھا۔ میں اپنے دوست کو ساری بات بتا سکتا تھا مگر کیا جج کے کہنے سے وہ ایسا کریں گے؟ ابھی تو میں نے ان کی فرم جوائن بھی نہیں کی تھی۔ وہ میرے یا بھائی کے بارے میں کچھ بھی نہیں جانتے تھے۔ بیٹے کے کہنے پر مجھے چانس دینا ان کے اختیار میں تھا۔ یہ معاملہ سو فیصد قانونی تھا جس کے حقائق کا ابھی کسی کو بھی پوری طرح علم نہ تھا۔ فون پر میں سارا کیس بتا کے بھائی کی وکالت نہیں کر سکتا تھا اور ان کے آفس یا گھر جا کے بات کرنا زیادہ مشکل تھا۔ پھر مجھے ایک ہمسائے کا خیال آیا جس کا بیٹا اسکول میں میرے ساتھ تھا اور اب شہر کے کسی تھانے میں پوسٹ تھا۔

ہمسائے کی مدد نے مجھے تھانے کے اندر ایک نچلے درجے کے وردی پوش سے متعارف کرا دیا جس کا رشوت کا ریٹ بہت کم تھا۔ وہ مجھ سے ملنے کے لیے باہر آیا اور صرف ایک ہزار روپے نذرانہ لے کر مجھے ایک عقبی راستے سے تھانے کے اندر پہنچا دیا۔ تھانے کا پچھلا حصہ مرکزی عمارت اور احاطے کی دیوار کے درمیان لمبی سی پٹی تھا جس میں روشنی کم تھی اور یہ حصہ آمدورفت کے لیے بھی بہت کم استعمال ہوتا تھا کیونکہ دیوار کے دوسری طرف کوئی فیکٹری تھی یا اس کی مسجد دیوار کے ساتھ تھی اور وہاں جانے کے لیے دیوار میں شگاف ڈال دیا گیا تھا۔ اس حصے میں ضبط شدہ یا برآمد ہونے والی گاڑیاں اور موٹر سائیکلیں کھڑی تھیں یا پڑی تھیں۔ مجھے آخری حصے میں بھائی کی گاڑی دکھائی دی۔ اس کے ساتھ ہی دو چار نو وارد گاڑیاں اور موٹر سائیکلیں ابھی اصل حالت میں نظر آ رہی تھیں۔

میں نے پیچھے جا کے ڈکی کھولنے میں دیر نہیں لگائی اور ٹارچ کی مدد سے ڈکی کے اندر کے اسباب پر نگاہ ڈالی۔ مجھے فوراً اندازہ ہو گیا کہ واردات ہو چکی۔ پچاس لاکھ نقد مل جانے کے بعد سرکاری ڈاکوؤں کو خیال آیا ہوگا کہ جس گاڑی میں اتنا کیش تھا اس میں اور بھی بہت کچھ مل سکتا ہے۔ یہ پیسے والے چالاک بنتے ہیں۔ دولت کو چھپانے کے لیے آنکھوں میں دھول جھونکتے ہیں۔ کارپٹ کے نیچے یا ڈکی میں بھی مال رکھتے ہیں اور ان کا تجربہ، مشاہدہ یا دولت کو سونگھنے کی حس کام کر گئی۔ انہیں گدڑی میں لال مل گئے۔

ڈکی کے اندر تمام پرانے میلے کپڑے جو بھائی نے احتیاطاً رکھے تھے ان کا مقصد زیورات کو چھپانے میں ناکام رہے تھے۔ تلاشی لینے والوں نے زیورات نکال لیے تھے اور شاید اس کے بعد دروازوں کے سائڈ پینل بھی کھول کے دیکھ لیے تھے کہ خفیہ خانوں میں کچھ مل جائے۔ میں نے دیوانہ وار چیزوں کو الٹ پلٹ کے جھاڑ کے دیکھا۔ سارا سامان جو ڈکی کے اندر ہمیشہ موجود رہتا تھا تلاشی لی گئی مگر بدقسمتی میرے بھائی پر دوسرا وار بھی کر چکی تھی۔ وہ پچاس لاکھ کے زیورات کی چوری کا مجرم بھی ہو گیا تھا۔ اور بینک کیس سے زیادہ سنگین یہ جرم تھا۔ ناکام واپس آتے ہوئے میں

پریشانی کا شکار رہتا کہ یہ خبر بھائی کو کیسے دوں؟ معلوم تھا کہ وہ بے چینی سے میرا انتظار کر رہا ہوگا۔ میرا دل چاہتا تھا کہ میں اس کے سامنے ہی نہ جاؤں۔ میں کہیں بھاگ جاؤں۔ لیکن میں نہ جاتا تو وہ سمجھتا کہ میرا چھوٹا بھائی جسے میں نے باپ اور ماں دونوں کی محبت دے کر پالا تھا پچاس لاکھ کے زیورات لے کر بھاگ گیا۔ اس نے خون کے رشتے اور ضمیر کی آواز پر دولت کو ترجیح دی۔ اس خیال کی اذیت اتنی زیادہ تھی کہ میں سیدھا اسپتال گیا اور بھائی کو حقیقت بتا دی۔

بھائی کا رنگ لائن کی طرح سفید پڑ گیا۔ وہ کانپنے لگا اور پھر بے ہوش ہو گیا۔ میں سمجھا کہ اسے دل کا دورہ پڑا ہے اور وہ مرنے والا ہے۔ ڈاکٹر نے آ کے اسے کوئی انجکشن دیا جس سے وہ سو گیا مگر میں جاگتا رہا اور اس کے چہرے پر نظر جمائے بیٹھا رہا۔ نہ جانے کیوں بار بار مجھے خیال آتا تھا کہ وہ مر چکا ہے اور میرے سامنے ایک لاش ہے۔ کئی بار میں نے اس کا ہاتھ تھام کے نبض دیکھی اور مجھے احساس بھی نہ ہوا کہ خود میری آنکھوں سے آنسو بہہ رہے ہیں۔ ڈاکٹر نے کہا تھا کہ یہ صبح تک سوتا رہے گا مگر وہ رات دو بجے جاگ گیا۔ نگرانی پر مامور مسلح کانسٹیبل نہ جانے کہاں سے ایک تپائی لے آیا تھا اور سو گیا تھا۔ سونے سے پہلے اس نے ایک ہتھکڑی بھائی کے ہاتھ میں ڈال کے اس کا دوسرا سرا اپنی کلائی میں لاک کر رکھا تھا۔

بھائی مجھے دیکھتا رہا جیسے پہچاننے کی کوشش کر رہا ہو پھر بولا۔ ”منا! تو نے ٹھیک سے نہیں دیکھا۔“

میں نے روتے ہوئے کہا۔ ”بھائی! یقین کرو میں نے ایک ایک کپڑے کو جھاڑا۔ ہر چیز اٹھائی۔ زیورات وہ نکال چکے تھے، پولیس والے۔ انہوں نے تو درازوں کے چینل بھی کھول ڈالے تھے۔“

وہ خاموش لیٹا چھت کو دیکھتا رہا اور آنسو اس کی آنکھوں سے بہہ کر تکیے میں جذب ہوتے رہے۔ ”بس منا! اب میری تو باقی زندگی جیل میں گزرے گی اگر میں زندہ بچا... لیکن تو بھاگ جا... ورنہ تو بھی میرے ساتھ مارا جائے گا۔ تو چلا جا کہیں دور... اس شہر سے، اس ملک سے نکل جا۔“

میں نے اس کا ہاتھ تھام لیا۔ ”میں تمہارے ساتھ ہوں بھائی۔ ہر جگہ، ہر حال میں۔ مجھے بتاؤ زیور کس کے تھے؟ کون تھی وہ عورت؟ میں اس سے کہوں گا کہ ہمارا گھر لے لے، گاڑی اور جو کچھ ہے سب لے لے۔ باقی میں پورا کروں گا۔ ساری عمر قرض اتاروں گا۔“

”پاگل ہے تو... اسے کوئی کمی نہیں۔ وہ جانتی ہے مجھے لیکن...“

”لیکن کیا؟ تم اس سے بات کیوں نہیں کرتے؟“

وہ نفی میں سر ہلانے لگا۔ ”میں اس سے بات نہیں کر سکتا اور بات کرنے کا فائدہ بھی کیا؟“

”آخر مجھے بتاتے کیوں نہیں۔ کون عورت ہے وہ؟“

وہ کچھ دیر خلا میں دیکھتا رہا پھر بولا۔ ”تاور شاہ کی دوسری بیوی... شیری... شہر بانو۔“

مجھے چار سو چالیس وولٹ کا کرنٹ لگا۔ ”تاور شاہ کی دوسری بیوی؟“

”ہاں، تو جانتا ہے اسے۔ یاد ہے وہ جو ہمیں ایک رات پی سی میں ملی تھی۔ ہم وہاں کھانے کے لیے گئے تھے جب میری نئی نئی پروموشن ہوئی تھی۔ میں منیجر بنا تھا۔“

میرے دماغ کو دوسرا جھٹکا لگا۔ ”وہ... وہ تو... بہت کم عمر تھی۔ لڑکی تھی۔“

”مگر وہی اس کی دوسری بیوی ہے۔ شیری... اب تو شادی کو بھی چھ سال ہو گئے۔“

”وہ تو بہت بے تکلفی اور اعتماد کے ساتھ آپ سے بات کر رہی تھی۔ آپ نے اسے اوائڈ بھی کیا تھا۔“

وہ کچھ دیر بعد بولا۔ ”وہ اور میں کلاس فیلو تھے۔ دو سال تک۔ بعد میں بھی ملتے رہے۔“

میں بھائی کو دیکھتا رہا۔ ”آپ اسے پسند کرتے تھے اور وہ؟“

بھائی نے اقرار میں سر ہلایا۔ ”میرے یا اس کے پسند کرنے سے کیا ہو سکتا تھا۔ ماں باپ نے جہاں مناسب سمجھا اس کی شادی کر دی۔“

”اور اس نے کر لی؟“

”ہاں، کیا کرتی وہ۔ میں کسی طرح بھی اس کے لائق نہیں تھا۔ اس کی ایک صنعت کار کا دیکھی بھالی تھی۔ بڑا خاندان تھا۔ ہم جیسے اس کے گھر میں کام کرتے تھے۔“

”پھر خاک محبت تھی اسے آپ سے۔“

”زندگی ایسے ہی چلتی ہے۔ فلم کی طرح نہیں۔ لڑکیاں بہت کمزور، بے بس اور مجبور ہوتی ہیں۔ میں اسے قصوروار نہیں سمجھتا۔ قصور میرا تھا کہ اس کا سوشل اسٹیٹس دیکھے بغیر اس کے چکر میں پڑ گیا تھا۔ فرہاد ہوتا تو کچھ کر کے دکھاتا۔ خود کو اس کے قابل بناتا۔ وہ میرے ساتھ کیسے رہ سکتی تھی آخر۔ یہی بات تو میں نے اسے سمجھائی تھی آخری ملاقات میں۔ جو ناممکن ہے وہ ناممکن ہے۔ اس کے لیے رونا

کیسا اور تقدیر سے کیا شکوہ۔ اب یہ مجھے کیا معلوم تھا کہ اس کے اور میرے راستے بچھڑ جائیں گے۔ نادر شاہ کبھی کبھی مجھے بلالیتا تھا کیونکہ اسے مجھ پر اعتماد تھا۔ وہ باہر سے فون کر دیتا تھا ایک شخص پچاس ہزار یا ایک لاکھ لائے گا۔ میرے فلاں اکاؤنٹ میں ڈال دینا۔ اس کے کتنے اکاؤنٹ تھے۔ یہ مجھے معلوم تھا۔ میرے پاس اس کے دستخط شدہ چیک پڑے رہتے تھے۔ وہ فون پر کہتا تھا کہ اس نام کے بندے کو اتنی ادائیگی کردو۔ میں کردیتا تھا۔"

"آپ کو معلوم نہیں تھا کہ اس کے دھندے کیسے ہیں؟"

"پہلے نہیں معلوم تھا۔ جب معلوم ہوا تو میں مجبور تھا، انکار نہیں کرسکتا تھا۔ بینک کے جس نائب صدر کی سفارش سے مجھے ترقی ملتی رہی، وہ نادر شاہ کا خاص آدمی تھا۔ اس کا دست راست، اس کا فرنٹ مین۔ اس کے کالے دھندوں سے مجھے کیا لینا دینا۔ جب ضرورت پڑی اس نے ہماری مدد کی تو جانتا ہے۔"

"اب کوئی مدد نہیں کرے گا وہ؟"

"مجھے پورا بھروسا ہے اس پر۔ لیکن معاملہ بینک کا ہے۔ انشورنس کمپنی کا نقصان ہوگا۔ یا تو وہ نقصان پورا کرے یا پولیس سے ڈکیتی کا کیس پکا کرائے۔ ثبوت شہادت کے ساتھ۔ پھر بھی کیس تو چلے گا۔ آگے جج سے نمٹنا ہوگا۔" وہ بہت مایوس تھا۔

"اور... وہ جس کے زیورات تھے؟"

"معلوم نہیں ممتاز۔ کچھ پتا نہیں کل کیا ہوگا۔ وہ خاموش رہ سکتی ہے یا نہیں۔ معاملہ اس کے شوہر کا بھی ہے۔ اس سے وہ کیسے چھپائے گی اور کب تک۔ سچ بتائے گی تو کیا وہ یقین کرے گا؟"

"نادر شاہ کو نہیں معلوم کہ اس کی بیوی کے اعتماد کی وجہ کیا ہے؟"

"اعتماد تو نادر شاہ کو بھی بہت ہے۔ مگر بیوی کا معاملہ مختلف ہوتا ہے۔ وہ شوہر سے کہتی تو وہ بھی یہ کام مجھ سے کراتا اور میں کرتا۔ مگر اس نے براہ راست مجھ سے کہا۔ یہ سلسلہ تو دو سال سے چل رہا تھا۔"

"اور نادر شاہ کو پتا نہیں تھا؟"

بھائی نے نفی میں سر ہلایا۔ "میرا خیال تھا اس نے شوہر کو بتادیا ہوگا مگر ایسا نہیں تھا۔ مجھے گھر میں آنے جانے کی آزادی تھی مگر یہ حقیقت ہے کہ میں نے کبھی نظر اٹھا کے شیری کو نہیں دیکھا تھا۔ نہ یہ سوچا تھا کہ وہ مجھے کس نظر سے دیکھتی ہے۔ میں جانتا تھا کہ نادر شاہ مجھے بھی زندہ دفن کراسکتا ہے اور اپنی بیوی کو بھی۔ خرابی پرانے تعلق کو چھپانے سے ہوئی۔ اچھا تھا اگر ہم خود ہی بتادیتے کہ ایک کلاس میں پڑھتے رہے۔ ہمارے ساتھ تو بہت سے دوسرے لڑکے بھی تھے اور لڑکیاں بھی۔ ساتھ پڑھنا کون سا جرم ہے لیکن اس کو چھپانا خواہ مخواہ کا جرم بن گیا۔"

"بھائی! اگر وہ چاہے تو آج بھی آپ کو بچا سکتی ہے۔ ابھی زیورات کی کوئی بات نہ کرے۔ بعد میں کوئی بھی کہانی بنالے۔ گھر میں سے غائب ہوگئے۔ گاڑی میں رہ گئے تھے۔ کسی نے نکال لیے۔ میں کہیں بھول آئی۔ وہ ہر جگہ آتی جاتی رہتی ہے۔ باہر بھی۔"

"اتنا بڑا جھوٹ بولنا آسان نہیں ہوتا، اس بیوی کے لیے جس کا شوہر نادر شاہ ہو۔" وہ مایوسی سے بولا۔

قصہ مختصر، تین دن بعد بھائی کو اسپتال سے ڈسچارج کردیا گیا اور پولیس ہم دونوں کو تفتیش کے لیے تھانے لے گئی۔ تفتیش کے وہ تین دن جہنم کے عذاب سے بدتر تھے۔ ان کا تصور کر کے آج بھی میرا جسم سرد پڑ جاتا ہے۔ تفصیل عذاب ناک بھی ہے اور شرمناک بھی۔ اس میں نہ جانا ہی بہتر ہے۔ یوں سمجھ لو کہ ہر لمحہ ہم مرجانے کی آرزو میں مرتے تھے لیکن ہمیں مزید عذاب کے لیے زندہ رکھا جاتا تھا۔

پولیس نے ایک تھیوری بنالی تھی۔ وہ مفروضات قائم کرتے ہیں اور کڑیاں ملاتے جاتے ہیں اور پھر اس پر اڑ جاتے ہیں۔

اس دوران ہمیں دیگر تلخ تجربات بھی ہوئے۔ بھائی نے نادر شاہ سے رابطہ قائم کرنے کی کوشش کی اور ناکام رہا۔ معلوم ہوا کہ وہ ملک میں ہی نہیں ہے، پتا نہیں کہاں ہے اور معلوم نہیں کب لوٹے گا۔ پھر اس نے اپنے مہربان بینک کے نائب صدر سے رابطہ کیا تو صاف جواب ملا کہ وہ چوروں، ڈاکوؤں کی سفارش نہیں کرسکتا اور بینک کے پچاس لاکھ ہضم کرنا ہمارے لیے آسان نہ ہوگا۔ پہلی ایف آئی آر بینک کی جانب سے لکھوائی گئی تھی۔ دوسری مقتول گارڈ کی درج کرائی گئی جس میں مجھ پر انگلی اٹھائی گئی تھی۔ یہ اس کی بیوہ نے لکھوائی تھی۔ پھر تیسری ایف آئی آر بینک کے اس کیشیئر کی طرف سے آئی جس نے گاڑی خراب ہونے کے بعد کیش میرے بھائی کے سپرد کردیا تھا کہ برانچ پہنچا دے۔ اس نے الزام لگایا کہ گاڑی میں کوئی خرابی نہیں تھی۔ غالباً خود بھائی نے اس کا ایک تار نکال دیا تھا۔ اس نے دیکھا تو وہ بینک کی گاڑی کے قریب مشکوک انداز میں کھڑا

ہوا تھا۔ پتا چلا کہ کچھ دیر پہلے وہ بونٹ کھول کے انجن کو دیکھ رہا تھا۔ گاڑی اسٹارٹ نہیں ہوئی تو اس نے اصرار کیا کہ گاڑی اس کے حوالے کر دیا جائے کیونکہ برانچ میں ایمرجنسی تھی۔۔ اس نے گارڈز کو بھی ساتھ بٹھایا حالانکہ میں یہ نہیں چاہتا تھا۔ میں گارڈز کو بینک کے قریب ہی ایک ورکشاپ سے کسی مکینک کو بلاتا یا خود چلا جاتا۔ گاڑی چند منٹ میں اسٹارٹ ہو جاتی۔ غالباً بھائی کی نیت پہلے سے خراب تھی اور اس نے پچاس لاکھ کے لیے ڈکیتی اور حادثے کا ڈراما پہلے سے تیار کر لیا تھا۔

سب ہمارے تابوت میں اپنی اپنی کیل ٹھوک رہے تھے اور ہم تختۂ دار کی جانب دھکیلے جا رہے تھے۔ غبن، چوری، ڈکیتی اور قتل جیسے سنگین الزامات کے لیے ثبوت شہادت اور گواہ سب تیار تھے۔

ایک دن ہمیں چودہ دن کا ریمانڈ لینے کے لیے پولیس نے عدالت کے سامنے پیش کیا تو مجسٹریٹ نے انکار کر دیا اور ہمیں جوڈیشل ریمانڈ پر جیل بھیج دیا گیا۔ وہاں ہمارے ساتھ کوئی برا سلوک نہیں ہوا۔ الٹا ہمیں علاج معالجے کی سہولت فراہم کی گئی اور ہم چلنے پھرنے کے قابل ہو گئے۔

ہم دونوں بھائیوں نے وہ سب دیکھا اور جھیلا تھا کہ اب ایک دوسرے سے آنکھ ملاتے ہوئے بھی حیا آتی تھی۔ ہم چپ چاپ بیٹھے رہتے اور سوچتے رہتے کہ ہمارا انجام کیا ہوگا۔

میں نے اپنے کچھ دوستوں سے رابطہ کیا۔ میرے دوستوں میں سے کوئی ملنے بھی نہ آیا۔ بھائی کے کچھ دوست آئے اور انہوں نے ہماری ضمانت پر رہائی کا وعدہ کیا۔ مجھے بڑی حیرانی ہوئی جب ایک دن ہم دونوں کو ملاقات کے لیے بلوایا گیا۔ ملاقاتی کمرے میں کالے کوٹ والا ایک نوجوان وکیل بیٹھا تھا۔

”میں آصف قریشی ہوں۔ سہروردی صاحب کے ایک معاون کا ماتحت۔ مجھے آپ دونوں کی ضمانت پر رہائی کی درخواست دائر کرنے کے لیے کہا گیا ہے۔“

”کس نے کہا ہے؟ سہروردی صاحب نے؟“ میں نے ایک خوشگوار حیرت کے ساتھ کہا۔

”ظاہر ہے میں آپ کو نہیں جانتا۔“

بھائی نے پوچھا۔ ”ہم دونوں بھائیوں کا کیس لڑنے کی فیس آپ کیا لیں گے؟“

”جو فیس آپ دیں گے، مجھے منظور ہوگی۔“ وہ بولا۔

”ابھی میں آپ کو ایک لاکھ دے سکتا ہوں زیادہ سے زیادہ۔“ بھائی نے کہا۔ ”سیشن کورٹ میں پیش ہونے کی۔“

”مجھے منظور ہے۔“

ہم نے کیس سے متعلق تمام تفصیلات اس کے گوش گزار کر دیں۔

میں نے یہ پوچھنا مناسب نہ سمجھا کہ کیا اس کیس میں سہروردی صاحب بھی اسے گائیڈ کریں گے۔ وہ پہلے صاف انکار کر چکے تھے۔ اب ان کا کسی ماتحت کو بھیجنا بھی اس بات کی نشاندہی کرتا تھا کہ بعد میں خدا ترسی یا حقائق کا علم ہونے سے انہوں نے ایک جونیئر کو نامزد کر دیا۔ اس نے ساری بات سنی اور ہم نے بعد میں اسے ایک لاکھ کا چیک دے دیا۔ اس نے ہماری پیروی بڑی محنت اور ذہانت سے کی۔ شاید یہ سہروردی ایسوسی ایٹس کے نام کے حوالے کا اثر بھی ہوگا کہ پانچ پانچ لاکھ میں ہماری ضمانت پر رہائی ہو گئی۔ ہم نے اسی مکان کے کاغذات جمع کرائے جو بھائی کے نام پر تھا۔

ایک ہفتے بعد ہم اپنے گھر میں تھے۔ گرفتاری سے رہائی تک ایک ماہ سے زائد کا عرصہ ہو گیا تھا۔ اپنے گھر میں آ کے ہم دونوں ایک دوسرے سے لپٹ کے ماں کی تصویر کے سامنے بہت روئے۔ بھائی کی نوکری نہیں رہی تھی اور میرا اور حال تھا کہ اڑنے نہ پائے تھے کہ گرفتار ہم ہوئے۔

کیس کا فیصلہ جلد ہوتا نظر نہ آتا تھا۔ لیکن یہ امید تھی کہ ثبوت اور شہادت کی عدم موجودگی میں پولیس کیس یہاں ختم نہ ہوا تو ہائی کورٹ ہمیں بری کر دے گی۔ بھائی اس خیال سے بھی پریشان تھا کہ ابھی تک نادر شاہ کی بیوی کی طرف سے پچاس لاکھ کے زیورات کی گمشدگی پر کوئی سوال نہیں ہوا تھا۔ نہ اس کا فون آیا تھا اور نہ اس نے بھائی کو طلب کیا تھا۔ اس کی وجہ صرف یہ تھی کہ ابھی تک اسے نقصان کی خبر ہی نہ تھی۔

ایک ہفتے بعد میرے کہنے سے وہ نادر شاہ کے گھر گیا۔ وہ شیری کو خود بتانا چاہتا تھا کہ اس کی کرتاہی یا بدقسمتی سے پچاس لاکھ کے زیورات کھو گئے ہیں جن کے بارے میں وہ مطمئن ہوگی کہ بینک کے لاکر میں رکھے ہوں گے۔ اس میں ہمت نہ تھی کہ وہ نادر شاہ کی بیوی کا سامنا کرے اور ایسی خبر سنائے جس پر اعتبار نہ کیا جا سکتا ہو۔ گرفتاری اور تفتیش کے دوران ہمیں اندازہ ہو گیا تھا کہ اب ہم اور ہماری کوئی بھی بات کسی کے لیے قابلِ قبول نہیں۔ ہم پر بے ایمان، لالچی اور جوئے باز ہونے کا لیبل لگ چکا تھا۔ شیری بھی شاید لحاظ نہ کرے اور منہ پر اس کو فراڈ اور بے ضمیر کہہ

رہے۔ وہ کیا قانونی قدم اٹھاتی ہے یہ بعد کی بات ہے۔

بھائی واپس آیا تو زیادہ پریشان تھا۔

''اس نے ملنے سے بھی انکار کر دیا۔'' وہ دکھی لہجے میں بولا۔

''کیا اسے معلوم ہو چکا تھا؟'' میں نے کہا۔

''یہی وجہ ہو گی۔ اس نے بعد میں لاکر کھولا ہو گا تو وہ خالی ملا ہو گا۔ مگر اسے مجھ سے پوچھنا تو چاہیے تھا۔ کیا پتا مجھے زیورات لاکر میں رکھنے کا موقع نہ ملا ہو اور وہ میرے پاس محفوظ ہوں۔''

''آپ کی اس سے فون پر بھی بات نہیں ہوئی؟''

اس نے نفی میں سر ہلایا۔ ''میں نے کئی بار کوشش کی۔ ہر بار کسی نے کہہ دیا کہ وہ گھر میں نہیں ہیں۔ دراصل دنیا کی طرح اب میں اس کی نظر میں بھی اعتبار کھو چکا ہوں۔''

بینک کی نوکری نہیں رہی تھی لیکن بینک میں بھائی کے ہمدرد تھے جو اَب بھی سمجھتے تھے کہ بھائی بے قصور ہے۔ ان میں سے ایک نے تصدیق کر دی کہ مسز نادر شاہ کے لاکر میں تمام زیورات موجود ہیں۔ یہ بڑی ناقابلِ یقین بات تھی۔ زیورات خود بھائی نے گاڑی میں رکھے تھے اور تھانے میں کسی نے نکال لیے تھے۔ وہ واپس لاکر میں کیسے پہنچ گئے؟ بھائی کو یہ بھی معلوم ہوا کہ زیورات لاکر میں رکھوانے کے لیے شبری خود اپنے شوہر کے ساتھ آئی تھی۔ اس کا مطلب یہ تھا اس نے خود اپنے شوہر سے کہہ دیا ہو گا کہ اس نے زیورات بینک منیجر کو لاکر میں رکھوانے کے لیے دیے تھے۔ اسی دن جب ڈاکو اس کی گاڑی سے پچاس لاکھ نقد لے گئے اور اس کی گاڑی پر فائرنگ بھی ہوئی اور حادثہ بھی پیش آیا۔ شاید اس نے بھی پولیس کی کہانی پر یقین کر لیا ہو گا کہ ڈاکوؤں کی فائرنگ اور حادثہ سب ڈراما تھا جو دونوں بھائیوں نے مل کے کیا تھا۔ اگر ایسا تھا اور بدنیت کی خرابی تھی تو پھر زیورات کہاں محفوظ رہے ہوں گے۔ بینک کی رقم کا تو ریکارڈ تھا۔ زیورات اعتبار میں اس کے حوالے کر دیے گئے تھے۔ کسی رسید ثبوت یا گواہ کے بغیر۔

اسی روز رات کے وقت کسی نے کال بیل بجائی اور میں نے دروازہ کھولا تو نادر شاہ کو اپنے سامنے دیکھ کے بھونچکا رہ گیا۔ وہ سیدھا اندر آیا اور ہمارے چھوٹے سے ڈرائنگ روم میں بیٹھ گیا۔ میں نے بھائی کو اطلاع دی تو وہ بھی کچھ بدحواس سا اندر آیا اور میرے ساتھ ہی نادر شاہ کے سامنے بیٹھ گیا۔

''شاہ جی! آپ نے تو اچانک آ کے مجھے پریشان کر دیا۔'' بھائی نے کہا۔

وہ خاموش اور بے نیاز سا بیٹھا سگریٹ پیتا رہا۔

''میں نے سوچا تمہاری خیریت ہی دریافت کر لوں۔''

''خیریت کہاں شاہ جی۔ بدقسمتی نے ایسا گھیرا ہے کہ...''

اس نے بھائی کی بات کاٹ دی۔ ''جس دن یہ سانحہ پیش آیا تمہارے ساتھ... تم کو ہیڈ آفس جانا تھا۔''

''جی... انٹرویو تھا میرا۔ پروموشن کا کیس تھا۔''

''میرا گھر تمہارے راستے میں تو نہیں پڑتا۔'' وہ بولا۔

''نہیں جی۔''

''بلکہ الٹا راستہ ہے۔ تم کو میکلوڈ روڈ جانا تھا۔ میرا گھر گلفشن پر ہے۔ پھر تم ادھر سے ہو کے کیوں گئے تھے؟''

بھائی کا رنگ فق ہو گیا۔ ''وہ... دراصل... آپ کی بیگم نے کہا تھا۔''

''کب کہا تھا؟''

''اسی دن صبح... فون کیا تھا۔'' بھائی نے تھوک نگلا۔

''اور تم کس وقت گئے تھے؟ میں تو اس دن یہاں نہیں تھا؟''

بھائی اعترافِ جرم کے انداز میں بولا۔ ''تقریباً ساڑھے دس بجے۔''

''تم پہلے بھی میری عدم موجودگی میں میرے گھر جاتے رہے ہو؟''

بھائی نے اقرار میں سر ہلایا۔ ''جی، کبھی آپ کی بیگم کوئی کام بتا دیتی تھیں۔''

''جو صرف تم کر سکتے تھے۔ اور کوئی اس کے اعتبار پر پورا نہیں اترتا تھا۔ ورنہ زیورات لاکر سے لانے لے جانے کا یہ کام تو ڈرائیور بھی کر دیتا۔ خیر، اس دن تم شبری کا زیور لے گئے تھے اور وہ گاڑی میں تھا۔''

''جی، میں نے ڈکی میں ڈبے چھپا دیا تھا کہ...''

''تم نے آج معلوم کیا تو زیور اسی لاکر میں موجود تھا؟'' اس نے بات کاٹ کے سگریٹ کو پیر سے مسل دیا۔

بھائی کی حالت غیر ہو گئی۔ ''جی، آپ میری بات سن لیں۔ زیورات ڈاکو نہیں لے گئے تھے۔''

وہ سفاکی سے مسکرایا۔ ''نادر شاہ کا مال ڈاکو بھی نہیں لے جا سکتے۔''

''وہ تھانے والوں نے نکال لیا تھا شاہ جی۔''

اس نے جیسے یہ بات سنی ہی نہیں۔ ”تم اور شہری کلاس فیلو تھے؟“

اب بھائی اس کی آمد کا مطلب سمجھ چکا تھا۔ ”دیکھیے شاہ جی... کلاس میں تو اور بھی بہت تھے۔“

”اب کیا سوچا ہے تم نے۔ کیا کرو گے؟“ اس نے دوسری سگریٹ جلائی۔

”اب میں کیا کر سکتا ہوں جناب۔“ وہ بولا۔

”میں نے تم سے نہیں پوچھا۔“ شاہ جی گرج کے بولا۔

اب میں چونکا۔ ”میں... میں... کچھ نہیں۔“

”تم میرے لیے کام کرو گے۔ تم نے کہا تھا۔ معاہدہ ہے تمہارے اور میرے درمیان۔“

میں نے کہا۔ ”جی، لیکن اب میں نے ارادہ بدل دیا ہے شاہ جی۔“

وہ کچھ دیر کی خاموشی کے بعد بولا۔ ”یک طرفہ طور پر؟ معاہدہ میرے اور تمہارے درمیان تھا۔“

”میں نے بعد میں محسوس کیا کہ میں آپ کے لیے کام نہیں کر سکتا۔“ میں نے اسے ٹالنے کی کوشش کی۔

”فرید! آدمی کی پہچان اس کی زبان سے ہوتی ہے۔ مجھے معلوم ہے کہ تمہارا بھائی غلط نہیں کہہ رہا ہے۔ اس نے پچاس لاکھ کا غبن نہیں کیا۔ بینک والے بھی جانتے ہیں۔ یہ جھوٹ نہیں بولتا اور ایماندار ہے۔ اسی لیے میں نے تمہیں اور تمہارے بھائی کو اس جرم کی سزا سے بچایا جو اس نے کیا ہی نہیں تھا۔ ورنہ پولیس راہ چلتے کو کسی کے کیس میں ڈالنا چاہے تو ڈال سکتی ہے۔“

”اور آپ کی وائف کے زیورات؟“

”جب تھانے والوں کو پتا چلا کہ وہ میرے ہیں تو انہوں نے خود ہی لا کر میرے حوالے کر دیے تھے۔“ وہ اٹھ کھڑا ہوا۔ ”لیکن تمہارا بھائی بالکل بے قصور بھی نہیں۔“

”جب اس نے بینک کی رقم اور آپ کا زیور نہیں لیا تو پھر اس کا قصور کیا رہ گیا؟“

اس نے میرے سوال کا جواب نہیں دیا۔ ”بدعہدی، وعدہ خلافی، اعتماد کو دھوکا دینا۔ سب میرے نزدیک ایک جیسے ناقابلِ معافی جرائم ہیں۔“ وہ بولا اور تیزی سے باہر نکل گیا۔

ہم دونوں کچھ دیر سکتے میں بیٹھے رہے۔ پھر میں نے کہا۔ ”اس بات کا مطلب کیا تھا بھائی؟“

”اسے شک ہو گیا ہے۔ مجھ پر اور اپنی بیوی پر۔“ بھائی نے تشویش سے کہا۔ ”اور اس شک کو میں کیسے دور کر سکتا ہوں۔“

”اس نے مجھے اور تمہیں قانون کے شکنجے سے بچالیا ہے۔ اس کا بھی کہنا تھا اور شاید ایسا ہی ہوا۔ ورنہ پولیس کی تیاری پوری تھی۔“

”میں اس کی نظر میں قانون کا مجرم نہ سہی اس کا مجرم ہوں۔ یہ زیادہ خطرناک بات ہے۔ وہ تیرے انکار سے بھی ناخوش ہے۔“

”بھائی! تم نے ہی بتایا تھا کہ اس کے سارے دھندے غیر قانونی ہیں۔“

”ہاں، لیکن یہ بات اس سے کہی نہیں جا سکتی اور تیرے انکار کی وجہ نہیں بن سکتی۔ تو ایسا کر صبح اس سے مل کر کہہ دے کہ تو نے ارادہ بدل دیا ہے۔“

”یعنی ارادہ جو بدلا تھا، اسے پھر بدل دیا ہے۔“ میں نے خفگی سے کہا۔

”ابھی یہی بہتر ہے۔ کیا فائدہ ایسے شخص سے دشمنی مول لینے کا۔ بعد میں جب موقع ملے چھوڑ دینا اس کا کام۔“

”بعد میں بھی یہی ہوگا بھائی، میں پھنس جاؤں گا۔ اب میں نے انکار کر دیا ہے تو مجھے مجبور مت کرو۔ ہاں، میں ایک شرط پر مان سکتا ہوں آپ کی بات۔“

”کیسی شرط؟“

”آپ کہیں چلے جائیں۔ غائب ہو جائیں۔ آپ بھی محفوظ نہیں ہیں یہاں۔“

”دیکھ منا! ابھی تو ہم ضمانت پر رہا ہیں۔ میں بھاگ کے کہیں نہیں جا سکتا اور میں جاؤں گا بھی کہاں تجھے چھوڑ کے۔“

میں نے کہا۔ ”میری فکر نہ کریں۔ اپنا سوچیں۔“

”کل میں ملوں گا شاہ جی سے۔ اسے یقین دلاؤں گا کہ میں نے اس کے اعتماد کو دھوکا نہیں دیا۔ اگر اسے اپنی بیوی پر شک ہے یا مجھ پر تو بے بنیاد ہے۔ میں ایسا آدمی نہیں ہوں اور نہ اس کی بیوی کا کردار ایسا ہے۔ مجھے یقین ہے کہ میں اسے قائل کرنے کامیاب ہو جاؤں گا۔ تو بھی اس سے مل کے دیکھ۔ وہ کیا کہتا ہے، کیا کام تیرے سپرد کرتا ہے۔ بلاوجہ اس کی ناراضی مول مت لے۔“

رات ہم دیر تک باتیں کرتے رہے۔

رات کو نہ جانے کس وقت میں نے محسوس کیا کہ فون کی گھنٹی بج رہی ہے۔ فون لاؤنج میں تھا اور عام طور پر مجھ سے پہلے بھائی اٹینڈ کرتا تھا۔ وہ شاید گہری نیند میں تھا۔ میں

نے ریسیور اٹھا کے کہا۔ ”ہیلو۔“

دوسری طرف سے کسی عورت نے کہا۔ ”تم فرید بول رہے ہو، شباب کے بھائی۔“

میں نے کہا۔ ”جی... آپ کون؟“

”دیکھو فرید، اپنے بھائی سے کہو بھاگ جائے۔ اس کی جان خطرے میں ہے۔“

”میں نے بھی کہا تھا اس سے مگر وہ نہیں مانتا... آپ...“

”شباب سے کہو غائب ہو جائے۔ باہر چلا جائے یا روپوش ہو جائے۔ اور تم شاہ جی کے ساتھ رہو۔ فائدے میں رہو گے۔ خود کو بھی بچا لو گے اور بھائی کو بھی۔“

”اپنا فائدہ نقصان میں خود سمجھ سکتا ہوں، آپ شیری ہیں، مسز نادر شاہ؟“

لائن کٹ گئی۔ میں ریسیور ہاتھ میں پکڑے کھڑا رہ گیا۔ پھر اپنے کمرے میں آ کے بیڈ پر بیٹھا سوچتا رہا کہ کیا بھائی کو ابھی جگا کے اس فون کے بارے میں بتاؤں۔ وہ گہری نیند میں تھا۔ اسے ڈسٹرب کرنا مجھے اچھا نہیں لگا۔ وہ کون سا ابھی بیگ اٹھا کے چل پڑے گا۔ یہ بات اسے صبح بھی بتائی جا سکتی ہے۔ مجھے ذرا بھی شک نہیں تھا کہ فون کرنے والی نادر شاہ کی دوسری بیوی تھی۔ اس نے واپس گھر پہنچ کے اپنے اشتعال کا مظاہرہ کیا ہوگا اور اپنے شک کا بھی۔ پھر بھی یہ بات عجیب تھی کہ اس عورت نے بھائی کے بجائے مجھ سے بات کی۔ میں نے گھڑی دیکھی تو رات کے دو بجے تھے۔ تھوڑی سی کوشش کے بعد میں پھر سونے میں کامیاب ہو گیا۔

یکلخت مجھے یوں لگا جیسے گرمی بڑھ گئی ہے۔ میرے جسم پر آنچ یوں آ رہی تھی جیسے میں شعلوں میں گھرا ہوا ہوں اور یہ خواب و خیال کی بات نہیں تھی، آنکھ کھلتے ہی میں نے خود کو ایک بھٹی میں محسوس کیا۔ آگ نے ہمارے گھر کو ہر طرف سے اپنی لپیٹ میں لے رکھا تھا۔ میں باہر نکلا تو مجھے اندازہ ہو گیا کہ آگ لگائی گئی ہے۔ وہ رفتہ رفتہ نہیں پھیلی تھی۔ ایک دم ہر جگہ بھڑک اٹھی تھی۔ جیسے کسی نے تیل یا پیٹرول چھڑک کے دیا سلائی دکھائی ہو۔ میں بھائی کو پکارتا اس کے کمرے میں گیا مگر وہ وہاں نہیں تھا شاید وہ پہلے ہی نکل گیا تھا۔ اسٹور کے باہر کھلنے والے دروازے سے نکلنے میں مجھے چند منٹ لگے۔ اس وقت تک آگ یہاں نہیں پہنچی تھی۔ میں گلی میں نکلا تو آگ نے دوسروں کو بھی جگا رکھا تھا۔ لوگ اپنے بیوی بچوں کو نکال رہے تھے۔ یہ خطرہ تھا کہ ساتھ ساتھ بنے ہوئے گھر اس کی لپیٹ میں نہ آ جائیں۔ میں نے گلی میں چلا چلا کے بھائی کو آواز دی۔ ایک بار پھر اندر جانا چاہا لیکن لوگوں نے مجھے پکڑ لیا پھر میں بے ہوش ہو گیا۔

لوگوں کی کوشش سے مجھے تھوڑی دیر بعد ہی ہوش آ گیا۔ میں نے بھائی کو پکارنا شروع کیا۔ کسی نے مجھے بتایا کہ فائر بریگیڈ کا عملہ پہنچ گیا ہے اور وہ آگ بجھانے میں مصروف ہے۔

فائر بریگیڈ کے فوراً آ جانے سے آگ نے ساتھ والے گھروں کو لپیٹ میں نہیں لیا اور صبح کا اجالا پھیلنے تک آگ پر قابو پا لیا گیا تھا۔

میری نظروں کے سامنے ایک جلی ہوئی لاش نکال کے ایمبولینس میں رکھی گئی۔ یہ ایک کوئلہ سا بن چکا جو انسانی شباہت رکھتا تھا۔ اس کا سر تھا، ہاتھ پاؤں تھے اور وہ ناک بھی مڑی تڑی سی سیاہ لاش کو انسانی ہیولا ثابت کر رہی تھیں۔ وہاں ایک بڑی بھیانک بو تھی۔ جیسے تیز کوئلوں کی آنچ پر گوشت جل رہا ہو۔ یہ بو ناقابلِ برداشت اور پُر آسیب تھی۔ مجھے یقین نہ تھا کہ میرے سامنے وہ مسخ شدہ سیاہ شبیہ میرے بھائی کے سوا کوئی نہیں۔ بہت سے لوگ محض تماشائی تھے اور ایمبولینس کو گھیرے کھڑے تھے۔ مجھے اپنا ہوش نہ تھا گھر کی طرف دیکھا لیکن آگ بجھانے والا عملہ اندر سے دوسری لاش کے ساتھ نکلا اور یہ بھی پہلے انسانی شباہت رکھنے والے کوئلے جیسا جسم تھا۔ انہوں نے اسے بھی میرے بھائی کے ساتھ رکھ دیا۔ میں پھٹی پھٹی آنکھوں سے دیکھتا رہا۔

”یہ دوسری لاش کس کی ہے؟“ میں نے پوچھا۔

فائر بریگیڈ کے عملے میں سے ایک نے کہا۔ ”یہ کوئی عورت تھی۔ تمہاری بھابی ہو گی۔“

”عورت...!“ میرے دماغ کو جھٹکا لگا۔ ”میری تو کوئی بھابی نہیں۔ بھائی کی شادی کہاں ہوئی تھی۔“

”لیکن یہ ہم بتا سکتے ہیں کہ ان میں مرد کون ہے عورت کون۔“

”عورت کہاں سے آ گئی۔ اندر ہم دو بھائی تھے اور کوئی نہیں۔“ میں نے چلا کے کہا۔

اس نے مجھے کوئی جواب نہیں دیا اور ڈرائیور کی جگہ بیٹھ گیا۔ مجھے لگتا تھا کہ میں پاگل ہو جاؤں گا۔ بھائی کی وہ شبیہ میری نظر میں تھی جو میں نے آخری بار دیکھی تھی۔ میں نے اسے اپنے بیڈ پر گہری نیند میں دیکھا تھا اور حیران ہوا تھا کہ آج روز ان کی گھنٹی بج کے جاگا کیوں نہیں۔ اس نامعلوم

کال کرنے والی عورت نے جو کہا تھا سچ ہو گیا تھا۔ پولیس دونوں لاشوں کو پوسٹ مارٹم کے لیے اسپتال لے جا رہی تھی لیکن میں کچھ نہیں دیکھ رہا تھا۔ اب سورج نکل آیا تھا اور سڑک پر ٹریفک تھا۔ میرے خیالات کی رو ایک نکتے پر مرکوز ہو گئی۔ کیا یہ لاش جو ریکھنے میں فائر بریگیڈ والوں کو عورت لگی تھی، تہمینہ کی تھی؟ ہمارے گھر میں آگ نادر شاہ نے لگوائی تھی؟ اگر ایسا تھا تو بھائی اور یہ عورت جان بچانے کے لیے اٹھ کر بھاگے کیوں نہیں تھے۔ جیسے میں بھاگا تھا۔ بھائی اپنے کمرے میں نہیں تھا جہاں میں نے اسے سوتا ہوا دیکھا تھا اگر وہ اس عورت کے ساتھ تھا تو کہاں تھا؟ گھر میں دو بیڈ روم تھے اور تیسرا ڈرائنگ روم۔ کیا ان دونوں کو بے ہوش کر کے یا باندھ کے وہاں ڈال دیا گیا تھا۔ پھر آگ لگانے والوں نے گھر میں گھوم پھر کے تیل یا پیٹرول چھڑکا تھا اور تیلی دکھا کے نکل گئے تھے۔ بھائی اور یہ نامعلوم عورت بھاگ نہیں سکے تھے اور آگ نے پورے گھر کو ایک دم اپنی لپیٹ میں لے لیا تھا۔ کیا انہیں ناک آؤٹ کر دیا گیا تھا یا جلنے سے پہلے ہی وہ مر چکے تھے۔ یہ عورت تہمینہ تھی تو پھر فون پر مجھے خبردار کرنے والی کون تھی؟

اگلے دو دن عجیب بے سروسامانی کے تھے۔ میں اسپتال میں سرگرداں رہا۔ کبھی برآمدے سے مردہ خانے... پھر کینٹین یا پارک اور پھر کسی برآمدے کی بینچ پر۔ پولیس میرا بیان لے چکی تھی اور میں نے اس حد تک اپنے شک کا اظہار ضرور کر دیا تھا کہ میرے گھر کو جلایا گیا ہے۔ قدرتی طور پر پولیس نے سوال کیا۔ تمہیں کس پر شک ہے؟ آگ کس نے لگائی؟

میں نے نادر شاہ کا نام لینے سے گریز کیا۔ ”مجھے نہیں معلوم۔“

پولیس والوں نے متعدد سوالات کیے مگر ان کی تمام تفتیش لاحاصل رہی۔

میں خاموش ہو گیا۔ میرے دل میں دکھ کا سیلاب آیا ہوا تھا اور غم کی آندھی تھی۔ یکلخت وہ سب چھن گیا تھا جو دنیا میں میرا رہ گیا تھا۔ بھائی میرے باپ کی جگہ بھی تھا اور ماں کی جگہ بھی۔ وہ زندہ جیتے جاگتے انسان کے بجائے مڑی تڑی جلے ہوئے کوئلے کی لکڑی بن گیا تھا۔ میرا ایک گھر تھا۔ وہ راکھ اور ملبے کا ڈھیر ہو گیا تھا۔ شاید میں دنیا میں واحد زندہ انسان تھا جس کا کوئی نہ تھا۔ بھائی کی لاش میرے حوالے کرنے تک میں موت کے گھر جانے کی ہمت بھی نہ کر سکا تھا۔ مجھے معلوم تھا کہ وہاں اب کچھ نہیں بچا۔ بچا ہوتا تب بھی میں اس کھنڈر میں اکیلا کیسے رہ سکتا تھا۔ بالآخر جب ایک بھیانک انداز میں مڑے تڑے سیاہ وجود کو میرا بھائی کہہ کے میرے حوالے کیا گیا تو میں سوچتا رہا کہ اب اس کا کیا کروں؟

پھر اسپتال کے عملے میں سے کسی نے ایدھی والوں کو بلا لیا اور انہوں نے کفن دفن کی ذمے داری لے لی۔ میں ان کے ساتھ گیا اور بھائی کو مٹی کے ڈھیر میں غائب ہوتا یوں دیکھتا رہا جیسے اس کے بعد مجھے دفن ہونا ہے۔ رضا کار چلے گئے اور میں وہیں بیٹھا رہا۔ دوپہر سے شام اور پھر رات ہو گئی۔ کسی نے دوسری لاش کی بابت نہ مجھ سے کوئی اور سوال کیا اور نہ مجھے اس کے بارے میں کچھ بتایا تھا لیکن میری نظریں ایک چہرے پر ٹھہر گئی تھیں جسے میں نے صرف ایک بار ہوٹل میں بھائی کے ساتھ کھانا کھاتے ہوئے بہت قریب سے دیکھا تھا۔ پیکر حسن و شباب دلکشی و رعنائی... اس کی دہ ایک ادا، ایک مسکراہٹ اور ایک شبیہ میرے خیالوں میں بسی ہوئی تھی۔ اب میرا شک یقین میں بدل گیا تھا کہ میرے بھائی اور اپنی بیوی کو شک میں یہ عبرت ناک سزا دینے والا نادر شاہ کے سوا کوئی نہیں ہو سکتا۔

میں رات بھر قبرستان میں بیٹھا رہا۔ میرا اب لوٹ کر اپنے گھر جانے کا کوئی خیال نہ تھا۔ وہاں کی آگ تو بجھا دی گئی تھی مگر ایک انتقام کی آگ میرے دل کے اندر بھڑک اٹھی تھی اور پھیلتی جا رہی تھی۔ صبح تک میں فیصلہ بھی کر چکا تھا اور نادر شاہ کی مکمل تباہی کا پلان بھی بنا چکا تھا۔ میں اسے ہی نہیں اس کے وارثوں کو بھی اتنا ہی بے سہارا اور دربدر کر دینا چاہتا تھا جتنا میں خود تھا۔ میں نے مجھے ایک خیال نے مضطرب کر لیا تھا۔ انتقام کی خواہش سے۔ میں سارا دن شہر کی سڑکوں پر سرگرداں رہتا تھا۔ گرد و پیش سے بے خبر لیکن ایسا نہیں کہ گاڑی کے نیچے آ جاؤں۔ مجھے بھوک لگتی تھی تو کہیں سے بھی کچھ کھا لیتا تھا اور کسی محفوظ اور خفیہ جگہ پر پڑ کے سو جاتا تھا۔ مجھ میں ہمت نہ تھی کہ اپنے جلے ہوئے گھر کے کھنڈر کی طرف جاؤں۔

ایک دن میں نے خود کو لاہور میں پایا۔ میں ایک پارک میں تھا اور نہ جانے کب سے تھا۔ اس زمانے میں میرے دماغ میں وقت رک گیا تھا اور احساس نہیں رہا تھا۔ مجھے جگانے والے دو تومند آدمی تھے۔

”اوئے تو فرید ہے۔ فرید الدین؟“ ایک نے سوال کیا۔

میں نے بغیر یقین کے انداز سے اقرار میں سر ہلا

دیا۔

دوسرے نے کہا۔ ”اس پاگل سے پھر سے کیا پوچھنا۔“ اور ہاتھ پکڑ کے مجھے کھڑا کر دیا۔ میں ان دونوں کے درمیان کسی قیدی کی طرح چلا گیا۔ انہوں نے میری ظاہری حالت پر افسوس ناک تبصرہ کیا۔ میرے گندے کپڑے، بڑھے ہوئے خاک آلود بال، جھاڑ جھنکاڑ داڑھی، سب کراہیت پیدا کرنے تھے۔ وہ مجھے کار میں ڈال کے لے گئے اور نادر شاہ کے سامنے پیش کر دیا۔ وہ بھی اس کی محل نما کوٹھی تھی جس میں وہ اپنی روایتی شان و شوکت کے ساتھ مقیم تھا۔ نوکر چاکر، خوب صورت کنیز نما، سیکریٹری۔

مجھے اس صوفے کے سامنے قالین پر ڈال دیا گیا جس پر نادر شاہ براجمان تھا۔ وہ مجھے حیرانی اور افسوس سے دیکھتا رہا۔ پھر بولا۔ ”فرید! یہ اپنی کیا حالت بنا رکھی ہے تو نے؟“

نادر شاہ کو دیکھتے ہی میرا دماغ یوں ٹھکانے پر آ گیا جیسے گھپ اندھیرے کمرے میں لائٹ آنے سے ایک دم سب واضح ہو جائے۔ میں نے کہا۔ ”میں نے بنا رکھی ہے؟“ اور ایک قہقہہ مارا۔ ”یا تو نے بنائی ہے؟“

اس نے افسوس سے سر ہلایا۔ ”اسے لے جاؤ۔ نہلا دھلا کے صاف کرو اور بندے دا پتر بنا کے ڈاکٹر شاہی کو بلاؤ۔“

”ڈاکٹر شاہی تو جناب باہر ہے۔“

”تجھے مجھ سے زیادہ پتا ہے؟“ نادر شاہ نے آخر میں ایک گالی فٹ کی۔

وہ مجھے اٹھا کے لے گئے اور حکم کے مطابق میری سروس کی۔ صرف دو گھنٹے بعد میں پھر وہی فرید تھا۔ ہیئر کٹ، شیو، باتھ اور نئے کپڑوں نے مجھے پرانی شخصیت عطا کی۔ اور صرف ظاہری حلیے کی بات نہیں اس تبدیلی کے ساتھ میرا دماغ بھی جیسے ایک دم الرٹ ہو گیا۔ اسی طرح جیسے کوئی حویلی بالکل کھنڈر ہو مگر مرمت اور آرائش کے بعد رہنے کے قابل ہو جائے۔ مجھے سب یاد آ گیا تھا۔ وہ بھی جو میرے ساتھ ہو چکا تھا اور وہ بھی جو مجھے اب کرنا تھا۔

ڈاکٹر شاہی نے مجھے کسی اسپتال لے جا کے اندر باہر سے چیک کیا اور فٹنس سرٹیفکیٹ جاری کر دیا۔ ”ابھی تو معمولی جسمانی تھکن یا کمزوری کے اور کچھ نہیں۔ دو چار دن کا ریسٹ، اچھی خوراک اور یہ دوائیں۔“ اس نے ایک کاغذ مجھے ساتھ لے جانے والوں کے حوالے کیا۔ دوائیں کسی بیماری کے لیے نہیں تھیں۔ بس سکون آور تھیں۔ اگلے دو چار دن عیاشی کے تھے۔ میں ایک سو ایک فیصد فٹ تھا اور چاہتا تو بہ آسانی بھاگ جاتا۔ لیکن اب مجھے یاد آ چکا تھا کہ مجھے خود کو نہیں نادر شاہ کو تباہ کرنا تھا جس نے مجھ سے میرا گھر میرا بھائی اور میری عزت نفس... سب کچھ چھین لیا تھا۔

چار دن بعد میری پھر نادر شاہ سے ناشتے پر ملاقات ہوئی۔ میں اکیلا میز پر لگے ناشتے کا آغاز کر چکا تھا کہ وہ آ گیا۔ ”کیا حال ہے فرید؟“ وہ بولا اور میرے ساتھ بیٹھ کے ناشتا کرنے لگا۔ بیس بائیس سال کی کالج گرل نظر آنے والی ملازمہ نے اس کے لیے چائے بنا دی اور اس کے کہنے پر دفع ہو گئی۔ حالانکہ وہ دن رات میرے ساتھ رہتی تھی۔

”تو نے کیا سوچا ہے فرید؟“ وہ بولا۔

”میں کیا سوچوں اور کیوں سوچوں۔ جب فیصلے تم کرتے ہو۔ میں تمہاری دنیا سے ہی نکل گیا تھا کیونکہ اس دنیا میں تم (نعوذ باللہ) خدا تھے۔ اور میں تم سے لڑ نہیں سکتا تھا۔ تم نے مجھے کیوں بلوا لیا واپس... مزید ذلیل کر کے مارنے کے لیے؟“

وہ پُرسکون خاموشی سے سنتا رہا اور ناشتا کرتا رہا۔

”بس کر، اور کچھ کہنا ہے، دیکھ فرید! تو میرا قیدی نہیں ہے نہ میرا دشمن۔“

”مگر میں تمہارا دوست یا عزیز بھی نہیں ہوں۔ میرے ساتھ یہ مہربانی کا برتاؤ کیوں؟“

”یہی بتانا تھا تجھے۔ سمجھ لے تو اچھا ہے ورنہ تیری مرضی۔ میرا اپنا انصاف کا ایک طریقہ ہے۔ بلاوجہ میں کسی کو نقصان نہیں پہنچاتا اور دشمن نہیں بناتا۔ لیکن کوئی مجھے نقصان پہنچائے تو اسے معاف نہیں کرتا۔ سزا بھی دنیا کی عدالت کے مطابق نہیں اپنی مرضی سے دیتا ہوں۔“

”میرے بھائی کا جرم کیا تھا؟“

”دو جرم کیے تھے اس نے۔ ایک ثابت نہیں ہوا کہ وہ پچاس لاکھ کا غبن کرنا چاہتا تھا اور تیرے ساتھ مل کر اس نے ڈکیتی کا ڈراما کیا تھا۔ زیور بھی پولیس نے واپس کر دیے لیکن دوسرا جرم ثابت تھا۔“

”وہ کیا جرم تھا؟“

”اس نے میری بیوی سے ناجائز مراسم رکھے۔ کالج میں دونوں ایک دوسرے کو چاہتے تھے۔ یہ کوئی جرم نہیں، وہ عمر اور ماحول ایسا تھا لیکن اب وہ میری بیوی تھی۔ وہ میری آنکھوں میں دھول جھونک کے ملتے رہے۔ دونوں سزا کے مستحق تھے۔“

''وہ جو عورت کی جلی ہوئی لاش... ؟''

اس نے کہا۔ ''ہاں، وہ میری بیوی تھی۔''

''کتنی آسانی سے تم نے اسے جلا دیا۔ جیسے وہ بے جا پڑی تھی تمہاری، فرنیچر کی طرح، کوئی محبت نہیں تھی تمہیں۔''

وہ کچھ دیر چپ رہا۔ ''محبت ہو جاتی ہے۔ اگر کوئی عورت شادی کے بعد اپنی ظاہری اور باطنی صفات سے خود کو اس لائق ثابت کرے۔ دل جیت لے مرد کا۔ اسے یا اس کی دولت کو استعمال نہ کرے۔ اس کا مجھے کوئی افسوس نہیں لیکن تمہارا ہے۔''

''کیوں؟ میرا بھائی نہیں، باپ تھا وہ جسے تم نے مار دیا۔''

''دیکھو جب قانون کی مرضی سے کسی کو پھانسی دی جاتی ہے تو اس کے بیوی بچے، ماں باپ سب کے دل پر کیا گزرتی ہے۔ لیکن قانون ہے۔ تم پر بھی وہی بیت رہی ہے۔ میں جانتا ہوں وہ مجرم تھا۔ اسے سزا ہوئی۔ تم نے کچھ نہیں کیا مگر سزا بھگت رہے ہو۔ میں تمہاری مدد کرنا چاہتا ہوں۔ تمہیں سمجھانا چاہتا ہوں کہ اپنی زندگی جیو۔ نہیں جینا چاہتے تو مر جاؤ، خودکشی کر لو۔ خود کو عذاب دے کر جینے کی ضرورت نہیں۔ تم میرے ساتھ کام کرنا چاہتے تھے پھر انکار کر دیا۔ ظاہر ہے تم کو غصہ تھا۔ میں تمہیں یہی سمجھا رہا ہوں کہ یہ غصہ فضول ہے۔ ویسا ہی ہے جیسا پھانسی پانے والے کی ماں کو ہوتا ہے یا بیوی اور بہن کو۔ اگر تم وفاداری سے اچھا کام کرو گے تو فائدے میں رہو گے۔''

میں اس کی صورت دیکھتا رہا۔ وہ بہت گہری سوچ رکھنے والا آدمی تھا۔ بے حد سفاک، بے حس اور مغرور۔ مگر اندر سے عام آدمی۔ جس کا دل پتھر بھی تھا اور شیشہ بھی۔ وہ بزنس کرتا تھا اور دولت کماتا تھا۔ جائز ناجائز کے چکر میں پڑے بغیر اور جو اس کے لیے اچھا کرتے تھے ان کے ساتھ اچھا تھا لیکن میں اسے معاف نہیں کر سکتا تھا۔ میری دلی خواہش تھی کہ بھی اسی طرح میں آگ لگاؤں اور وہ اندر اپنے بیوی بچوں کے ساتھ جل مرے۔ یہ کام آسان نہ تھا مگر ناممکن بھی نہیں تھا۔

بالآخر میں نے کہا۔ ''مجھے سوچنے کے لیے وقت دو۔''

وہ اٹھ کھڑا ہوا۔ ''کتنا وقت چاہیے تمہیں۔''

میں نے کہا۔ ''زیادہ سے زیادہ... ایک ہفتہ۔''

''ایک ہفتہ کوئی مسئلہ نہیں۔ آرام سے یہاں رہو۔ کھاؤ پیو سوچ کرو۔ آٹھویں دن خود ہی چلے جانا اگر نامنظور ہو۔ آیندہ کے لیے تعلق ختم۔ نہ دوستی نہ دشمنی۔''

مجھے سوچنے کی ضرورت نہ تھی۔ جو مجھے کرنا تھا میں پہلے ہی طے کر چکا تھا۔ ایک ہفتے بعد اس نے مجھے کام بتا دیا۔ کام کی نوعیت تمام غیر قانونی تھی، خطرناک حد تک۔ لیکن تمام بحرانی پیشوں میں مافیا کو کسی کی سرپرستی حاصل رہتی ہے۔ ملک میں اسلحے کی مانگ تھی اور اس حد تک بڑھ چکی تھی کہ لوگ کلاشنکوف مانگتے تھے۔ اس سے ڈکیتی، قتل اور اغوا برائے تاوان جیسے جرائم بڑھ گئے تھے۔

میں نے نادر شاہ کا اعتماد حاصل کرنے اور اسے یہ یقین دلانے میں کئی ماہ صرف کر دیے کہ میں بھائی کے قتل کو فراموش کر چکا ہوں۔ رفتہ رفتہ مجھے خفیہ رابطوں کا علم ہونے لگا۔ سال بھر بعد میں نے اس کے پورے انڈر گراؤنڈ نیٹ ورک کو سمجھ لیا تھا۔ پھر بڑی ہوشیاری سے میں نے ایک مخبری کی۔ ایک کرائم رپورٹر نے اپنی بریکنگ نیوز یا ''اسکوپ'' کے لیے نادر شاہ کی پوری کھیپ پکڑوا دی۔ اس میں اٹھارہ لڑکے تھے اور سات لڑکیاں۔ سب جوان تھے جن کو آگے جا کے اپنے جسم کی کمائی سے دوسروں کا پیٹ بھرنا تھا۔ اخبارات نے غل غپاڑا کیا تو ایف آئی اے حرکت میں آگئی۔ ایک ریکروٹنگ ایجنٹ پکڑا گیا۔ نادر شاہ کو بھی روپوشی اختیار کرنا پڑی اور اس کا لاکھوں کا نقصان ہوا۔ تین مہینے تک سر توڑ کوشش کے باوجود وہ کسی غدار کا سراغ نہ لگا سکا جس نے مخبری کی تھی۔ ابھی وہ اس صدمے سے سنبھل نہ پایا تھا کہ اس کے ایک گودام میں آگ لگی اور لاکھوں کا مال خاکستر ہو گیا۔ اس میں اسلحہ بھی تھا اور منشیات بھی۔ تصویریں اخبارات میں آئیں تو سارے ملک میں شور مچ گیا۔ کیونکہ گودام میں سے کچھ جلی ہوئی لاشیں بھی ملی تھیں۔

اس مرتبہ نادر شاہ کا نام بھی اخباروں کی زینت بنا اور پولیس نے اسے گرفتار بھی کیا۔ ظاہر ہے پولیس ہی اس کی معاون اور محافظ بھی۔ وہ ضمانت پر رہا ہوا اور چند ماہ میں سارے معاملات دبا دیے گئے۔ لیکن ان دو حادثات نے نادر شاہ کی ساکھ کو نقصان پہنچایا۔ اس پر باہر کے گروہوں کا دباؤ بڑھا کہ وہ غدار مخبر کا پتا چلائے کیونکہ ایسے تو خود ان کے بزنس کی گڈ وِل بھی تباہ ہو گی۔ نادر شاہ نے سب کا نقصان پورا کیا اور تقریباً ایک کروڑ کے پھیر میں آگیا۔ وہ غصے میں پاگل ہو رہا تھا۔ اس نے دن رات ایک کر دیے۔ جن پر شک ہو سکتا تھا ان کے پیچھے ایسے جاسوس چھوڑ دیے جن پر کوئی شک نہ کرتا۔ کالج کی لڑکیاں یہاں تک کہ یونیورسٹی کی ایک لیکچرر... وہ مشکوک افراد کے ساتھ دن رات رہیں مگر

کچھ معلوم نہ کر پائیں۔ میں معصوم اور بے گناہ بنا رہا۔

آج میں سوچتا ہوں کہ انتقام کے کھیل کو اس حد تک طول دینا بے وقوفی تھی۔ میں نادر شاہ کے ہر نقصان کو نا قابلِ تلافی سمجھ رہا تھا اور اس سے تسکین اور خوشی حاصل کر رہا تھا۔ میرا خیال تھا کہ اب اس کی تباہی اور بربادی دور نہیں۔ یہ سراسر میری احمقانہ غلط فہمی تھی۔ بڑے جہاز طوفانوں کا مقابلہ کر لیتے ہیں۔ چھوٹی کشتی ایک تھپیڑے میں ڈوب جاتی ہے۔ ایسے مواقع آئے جب میں اسے قتل کرتا اور بھاگ جاتا۔ لیکن میں اسے تڑپا تڑپا کے مارنا چاہتا تھا۔ یہی مہلت میرے گلے پڑ گئی۔ ہر مجرم کی طرح میں بھی سمجھتا تھا کہ کبھی پکڑا نہیں جاؤں گا لیکن نادر شاہ کے سراغ لگانے والے کتنے ہوشیار تھے کب مجھ تک پہنچے مجھے معلوم ہی نہیں ہوا۔ میں اس چوہے کی طرح تھا جو گھر کے کونوں کھدروں میں ہر چیز کو کترتا رہے اور سمجھنے لگے کہ میں سارا گھر کھا جاؤں گا یا گھر والے اس ڈر سے گھر چھوڑ کے بھاگ جائیں گے۔ وہ ایسی جگہ چوہے دان لگا دیتے ہیں کہ چوہا خود اس میں گردن پھنسا کے مرے۔

وہ ایک ایکسائز ڈپارٹمنٹ کا افسر تھا جسے نادر شاہ نے اینٹی نارکوٹکس سیل میں پوسٹ کرا دیا تھا۔ مجھے پتا چلا کہ اس کی بیوی مددگار ثابت ہو سکتی ہے۔ مجھ سے اس کا مطلب سمجھنے میں غلطی ہوئی۔ میں نے فرض کر لیا کہ ایک شریف عورت اپنے شوہر کو غلط اور خطرناک کمائی کے راستے سے ہٹانا چاہتی ہے۔ کسی طرح سے اسے معلوم ہوا ہے کہ شوہر کام کرتا ہے نادر شاہ کے لیے تو شوہر سے اپنی بات منوانا مشکل ہے۔ نادر شاہ کو ہی ختم کر دیا جائے۔ نہ رہے گا بانس نہ بجے گی بانسری۔ ناقص العقل عورت ذات یہ نہیں سمجھتی کہ یہاں ایک نادر شاہ نہیں نہ جانے کتنے اور ہیں۔ شوہر دوسرا نادر شاہ تلاش کر لے گا۔ بہرحال بے وقوفی میری ثابت ہوئی۔ میں نے نہیں اس عورت نے مجھے استعمال کیا۔

اس سے رابطہ مشکل نہ تھا۔ میں لاکھوں میں کھیل رہا تھا اور سچ تو یہ ہے کہ دولت سے حاصل ہونے والی عیاشی کے نتیجے میں رفتہ رفتہ اپنے اصل مقصد سے دور ہو رہا تھا۔ میرے دن رات عیاشی میں گزر رہے تھے اور کبھی کبھی یہ خیال میرے دل کے چور دروازے پر دستک دینے لگا تھا کہ چھوڑ فرید یہ انتقام کا خیال۔ تیرا بھائی اب واپس آنے سے رہا۔ یہ نہ ہو کہ تو بھی اس کے پاس پہنچ جائے۔ اس کا معاملہ خدا پر چھوڑ دے اور اپنی زندگی سے مت کھیل۔ میں اس خیال کو جھٹک دیتا تھا اور ہو سکتا ہے کہ کچھ عرصے بعد میں

واقعی سب بھول جاتا۔ وقت ہر زخم بھر دیتا ہے اور جب اس پر دولت کا مرہم لگا دیا جائے تو نظر بھی نہیں آتا۔

میں نے اس عورت کی... اصل نام شہینہ سے پہلے ایک فائیو اسٹار ہوٹل کے روف ٹاپ ریسٹورنٹ میں ملاقات کی۔ یہ اتفاقیہ تھی۔ اس رات پورا چاند تھا۔ ہر میز پر رفاقت کا انجوائے کرنے والے جوڑے موجود تھے لیکن وہ اکیلی بیٹھی کوفت اور خفت سے دوچار تھی جس کا اسے انتظار تھا وہ نہیں آیا تھا۔ بچھو ایسا ہی میرے ساتھ ہوا تھا لیکن مرد تو کسی اور کی تلاش شروع کر دیتا ہے مگر عورت سخت بے عزتی اور شرمندگی کے احساس میں مبتلا ہو جاتی ہے۔ میں نے کسی کو دیکھا تو سب سمجھ گیا کہ وہ کس اذیت سے دوچار ہے اور بہت جلد منہ چھپا کے بھاگنے کو ترجیح دے گی تو میں نے دیر نہیں کی۔ یہ کہنا غیر ضروری ہے کہ وہ خوب صورت بھی تھی یا جوان بھی۔ ایسی نہ ہوتی تو میں اس کی طرف متوجہ کیوں ہوتا۔

جب میں نے اس کے ساتھ بیٹھنے کی اجازت طلب کی تو اس نے بھی سکون کا سانس لیا۔ اب اسے اکیلا دیکھنے والے جان گئے تھے کہ اس کا پارٹنر یا محبوب دیر سے آیا مگر آ گیا۔ دیر ہو جاتی ہے کبھی نہ کبھی سب کو۔

اس نے مصنوعی ناگواری سے کہا۔ ''اگر یہی جگہ دو گئی ہے تو بیٹھیے۔''

میں نے معذرت کی۔ ''میری ٹیبل ریزرو تھی۔''

وہ مسکرائی۔ ''آئی سی... لیکن وہ چھوڑ دے گئی؟'' اور پھر ہنسی۔

میں نے خفت کا اظہار کیا۔ ''چلیے چھوڑیے یہ قصہ۔ دو اکیلے مل کر اکیلے نہیں رہتے۔ بتائیے کیا لیں گی؟''

اس نے پھر شیری طلب کی حالانکہ اس وقت بھی وہ ہلکے سے سرور میں تھی۔ جب ڈنر کے بعد چاند سر پر آیا اور آرکسٹرا نے وائلن پر ''یہ رات یہ چاندنی پھر کہاں... سن جا دل کی داستاں'' بجانی شروع کی تو ہم ڈانس فلور پر چلے گئے اور اس نے اپنے شوہر کو گالیاں دینی شروع کیں کہ باسٹرڈ... مجھے چیٹ کرتا ہے۔ ہر روز نئی سیکریٹری آ جاتی ہے اور وہ بزنس ٹور تو نہیں کہہ سکتا۔ سیکرٹ آپریشن کرنے چلا جاتا ہے۔ سیکرٹ آپریشن۔ مائی فٹ!''

''کیسا سیکرٹ آپریشن۔''

''وہ اینٹی نارکوٹکس میں ہے نا۔ چھاپا مار کارروائی کی نگرانی کرتا ہے رات کو مگر مجھے معلوم ہے سب... کارروائی کہاں ہوتی ہے۔ اس نے مجھے خرید کے سونے کے پنجرے میں قید کر دیا ہے۔''

''تم اس سے قانونی طور پر چھٹکارا حاصل کر سکتی ہو۔''

وہ ہنسی۔ ''یو آر این ایڈیٹ۔ یہ اتنا آسان ہوتا تو میں کب کا چھٹکارا حاصل کر لیتی۔ لیکن وہ بے غیرت مند۔'' وہ پھر ہنسی۔ ''بے غیرت انسان... آ کے دیکھے اپنی بیوی کو... کاش میں اسے قتل کر سکتی یا کوئی میری خاطر اسے قتل کر دیتا۔''

اس رات تو بات آگے نہیں بڑھی۔ موون لائٹ ڈنر اور ڈانس کے بعد ہم اپنے کمرے میں چلے گئے جو میں نے یا پھر یں طور پر لے لیا تھا۔ بعد میں اس سے ملاقاتیں ہوئیں تو میں نے کہا مجھے اپنے شوہر سے ملوائے۔ میں جھوٹی ٹپ دے کر اسے کہیں بلاؤں گا جہاں اس کا کام تمام ہو جائے گا۔ اس نے مجھے ملوا دیا لیکن میرے ساتھ دہرا دھوکا ہوا۔ اس کا شوہر خود بادشاہ کے لیے کام کرتا تھا اور اس کی بیوی اپنے شوہر سے اس لیے چھٹکارا حاصل کرنا نہیں چاہتی تھی کہ وہ میری محبت میں گرفتار ہو گئی تھی بلکہ وہ کسی اور کو چاہتی تھی اور بالا فرائے ایک الو کا پٹھا مل گیا تھا جو اس کے کہنے پر شوہر کو قتل کرنے پر تیار تھا۔

اس کا شوہر بھی احمق نہیں تھا۔ بے حد ذہین آدمی تھا۔ اس کو شک ہوا کہ میری بیوی ایک ایجنٹ کے ذریعے مجھے کیوں ٹپ دلا رہی ہے۔ میں خود بھی یہ کام کر سکتا تھا بلکہ اس کا اچھا خاصا معاوضہ بھی وصول کر سکتا تھا۔ کہہ سکتا تھا کہ آپ کا چھاپا کامیاب رہا تو پروموشن ہو جائے گی۔ اس نے جب معلومات حاصل کیں تو اسے سب معلوم ہو گیا۔ اس نے مجھ سے ٹپ لی مگر خاموش بیٹھا رہا۔ رات کو مجھے کسی نے فون کیا اور کہا کہ آج پھر چودھویں شب ہے کلفٹن پر آ جاؤ۔ میں رنج ریسٹورنٹ سے آگے ملوں گی۔ اس چٹان سے بھی آگے جہاں لہریں سوفٹ اوپر بیٹھے جوڑوں کو بھگو دیتی ہیں۔ میری گاڑی تو پہچانتے ہو تم... اسی میں منتظر ملوں گی میں۔

عورت کبھی میری کمزوری پہلے کبھی نہیں رہی تھی لیکن میں تسلیم کرتا ہوں کہ اس رات میری عقل پر پتھر پڑ گئے تھے اور کسی کے سوا میں کچھ اور دیکھ ہی نہیں سکتا تھا۔ اس نے میری کمزوری کو تاڑ لیا اور اپنے حسن کی ساری طاقت مجھے اپنا غلام بنانے میں صرف کی۔ جب میں وہاں پہنچا تو میری نظر میں نہ سمندر تھا جس کی طوفانی لہریں چٹانوں سے ٹکرا کر بکھر رہی تھیں اور نہ اوپر آسمان کی وسعت میں گھرا ہوا چاند۔ میری نگاہ میں صرف کسی کا مسلم وجود تھا اور ایک تلاطم

خبرزادت۔ میں نے دور سے ہی اس کی کار دیکھ لی۔ وہاں ہر سو قدم کے فاصلے پر خلوت کے متلاشی کسی نہ کسی گاڑی میں آئے تھے۔

میں نے اپنی کار کچھ فاصلے پر روکی اور اس کی کار کا دروازہ کھول کے اندر گھس گیا۔ وہ ڈرائیونگ سیٹ پر اپنا سر اسٹیئرنگ وہیل پر رکھے سو رہی تھی اور اس کے جسم پر لباس نام کی کوئی چیز نہ تھی۔ یہ میرے لیے حیران کن تھا۔ میں نے اسے پکارا۔ ''سبی! میری جان... میں آگیا۔'' اور اسے اپنی آغوش میں کھینچا۔ تب مجھ پر جیسے بجلی گری یا آتش فشاں پھٹ گیا۔ وہ بے جان تھی۔ اس کا اسٹیئرنگ پر رکھا ہوا سر میری گود میں لڑھک گیا۔ کسی نے اس کی نازک گردن کو کاٹ دیا تھا۔ ایک سرے سے دوسرے سرے تک۔ خون بہہ رہا تھا اور اب میرے ہاتھوں، کپڑوں اور میری گود میں اس کے داغ تھے۔ میرے ہاتھ لہو میں بھرے ہوئے تھے اور اندر اس کے خون کی پاگل کر دینے والی مہک تھی جس نے وقتی طور پر مجھے مفلوج کر رکھا تھا۔ اس سے پہلے کہ میں باہر نکلتا ایک ہاتھ اندر آیا اور اس نے میرے منہ پر بھیگا ہوا رومال رکھ دیا۔ میرے دماغ کو ایک جھٹکا سا لگا اور بس۔

جب میں ہوش میں آیا، حوالات میں تھا۔ مجھ پر سبی کو چھری سے گردن کاٹ کر ہلاک کرنے کا الزام تھا۔ آلۂ قتل وہیں لاش کے ساتھ موجود تھا، چشم دید گواہ تھے۔ یہ قتل عمد کا کیس تھا۔ میں نے سبی کو وہاں بلایا ہی قتل کرنے کے لیے تھا کیونکہ وہ میرے بچے کی ماں بننے والی تھی اور مجھے اس سے چھٹکارا حاصل کرنا تھا۔ یہ سب پوسٹ مارٹم رپورٹ میں لکھا گیا تھا۔ جیسے کو تیسا۔ سبی مجھے ذلیل گیم کے لیے استعمال کر رہی تھی۔ چالاک شوہر نے اس کے ساتھ ذلیل گیم کھیلا۔ نہ جانے کس سے مجھے فون کرایا اور نہ جانے کیسے سبی کو وہاں پہنچایا۔ زبردستی لے جا کے قتل کرایا اور قاتل چلے گئے۔ میں الزام لینے کے لیے پہنچ گیا۔ بے وفا بیوی کا عبرت ناک انجام۔ دوسری طرف اس نے نادر شاہ کو رپورٹ دی کہ یہ آپ کا نمک حرام مخبر تھا۔ مجھے بچانے کی تب دینے آیا تھا جس کو میں نے اپنی بیوی کا قاتل بنا دیا ہے۔ ایک تیر سے دو شکار کیے ہیں کیونکہ وہ بھی اسی سزا کی مستحق تھی۔ نادر شاہ کو معلوم ہو گیا کہ اس کی جڑیں کون کاٹ رہا تھا۔ نازین اس کی مٹھی میں تھا۔ مجھے اس نے آسانی سے پھانسی کے تختے تک پہنچا دیا۔ لیکن افسوس کرتا رہا کہ وہ خود بچا جاتا تو مجھے سب کے درمیان جلا کے راکھ کرتا۔ پھانسی تو کوئی سزا ہی نہیں۔ دوست میں چند فارغ... مجھے زندہ ہاتھ پاؤں کاٹ کے مارتا۔

نوبوں میں پھانسی کے تختے تک پہنچا۔ پھر وہاں سے ڈاکو گاماں رستم کے ساتھ فرار ہوا۔ نورین سے ملا۔ مجرم ہے... لیکن ابھی تک نہ انتقام کی آگ بجھی ہے نہ نورین کی محبت میں کمی آئی ہے۔

☆☆☆

جب آپ بیتی ریشم نے قسط وار چار راتوں میں سنی۔ میرا مسلسل بولنا اور اس کا سننا باعث تھکن تھا۔ اچانک اسے دوسرے کمرے سے آواز آجاتی تھی۔ ''ریشم! پانی تو پلا دے۔ ابھی تک کیوں جاگ رہی ہے تو، بھائی سے باتیں کرنے کے لیے دن کم ہے؟'' پھر وہ چلی جاتی تھی اور بات اگلی رات پر ٹل جاتی تھی۔ ریشم کا اب زیادہ اصرار تھا کہ میں نورین کی تلاش ضرور کروں لیکن نادر شاہ سے انتقام کے خیال کو دل سے نکال دوں۔ مجھ پر دوہری ذمے داری جو آگئی ہے۔ ایک بہن کی اور ایک نورین کی جسے میں شریک حیات بنانا چاہتا ہوں۔ کیا اس لیے کہ جلد از جلد اسے بیوی عطا کر دوں؟

چند روز بعد ایک ایسا واقعہ پیش آیا جس نے میرے اوسان خطا کر دیے۔ میں کسی کام سے بازار گیا ہوا تھا اور گاڑی میں بیٹھ چکا تھا جب میں نے سلونی کو دیکھا اور اپنی جگہ جیسے منجمد ہو کے رہ گیا۔ کیونکہ وہ اکیلی نہیں تھی۔ وہ ایک عورت کے ساتھ مجھ سے پچاس قدم کے فاصلے پر دوسری گاڑی میں بیٹھ رہی تھی۔ وہ عورت شاہینہ تھی اور اس گاڑی کو سلونی کا شوہر چلا رہا تھا۔ رنگیلا سر گھما کے شاہینہ سے کوئی بات بھی کر رہا تھا۔ اپنی گاڑی کے بند شیشوں سے میں نے شاہینہ کو نظر بچا کے دیکھا۔ غلط فہمی کا سوال ہی نہ تھا۔ پہلے میں نے سوچا کہ گاڑی سے اتر کے بھاگ جاؤں مگر اسی وقت رنگیلا نے گاڑی کو ریورس کیا اور وہ مخالف سمت میں چلی گئی۔ اگر وہ میری طرف آتی تو کچھ بعید نہ تھا کہ سلونی یا رنگیلا کی نظر مجھ پر پڑ جاتی یا وہ کار کا نمبر دیکھ لیتے۔ اگر قتل کے ساتھ آج لاج اور ضمیر فروشی میں دشمن کے ساتھ شریک ہو گئے تھے تو میرے لیے خطرہ سر پر منڈلا رہا تھا۔ پہلے سلونی اور اب شاہینہ۔ میں یہ فرض نہیں کر سکتا تھا کہ شاہینہ نے اتفاق سے سلونی کو دیکھ لیا ہوگا۔ شاہینہ ملتان آتی رہتی تھی۔ مجھے یقین ہو چلا تھا کہ سلونی نے مجھے دیکھا اور انجان بن کے نکل گئی۔ وہ خود میری مجرم تھی۔ مگر اس نے شاہینہ کو مطلع کر دیا کہ تمہارا مجرم یہاں ہے۔ وہ یقیناً میری تلاش اور گرفتاری کے لیے آئی تھی۔

کچھ دیر بعد میں وہاں سے فرار ہو کے سیدھا گھر پہنچا

تو میری صورت دیکھ کے ریشم نے کہا۔ ''بھائی! تمہاری طبیعت تو ٹھیک ہے؟''

اس وقت تک میں طے کر چکا تھا کہ مجھے اب کیا کرنا ہوگا۔ میں نے کہا۔ ''مجھے کیا ہوا ہے۔ دھوپ تیز تھی آج۔ پانی پلادو بے۔''

پانی پی کے میں نے ذہن کو پُرسکون کیا۔ اب یہاں میرا مزید قیام خطرناک ہو گیا تھا۔ سلوٹی مجھے دوبارہ اتفاقیہ نظر آئی تھی میرا خیال تھا کہ میں نے ہی اسے دیکھا ہے' اس نے مجھے نہیں دیکھا مگر یہ غلط تھا۔ اب وہ شاہینہ کے ساتھ مل کر میری تلاش میں شامل تھی۔ نو لاکھ اسے ہم سے مل گئے تھے۔ شاہینہ بآسانی اسے ایک لاکھ کا انعام بخش دے گی۔ وہ ایک ملین کی مالک ہو جائے گی۔ مشہور ہے کہ پہلا ملین کمانا مشکل ہوتا ہے۔ دوسرا خود آتا ہے۔ روپے کو روپیا کھینچتا ہے۔ یہ خود غرضی تھی یا لالچ مگر سلوٹی نے اب اپنی زندگی کو مالِ غنیمت کی طرح لٹانے کا راستہ بند کر دیا تھا۔ وہ اپنی زندگی اپنی خوشی کے لیے جینا چاہتی تھی، شاہینہ کی طرح۔ اس کے ہاتھوں نقصان اٹھانے کے باوجود میں اس کی ذہانت کا معترف تھا۔

اب مجھے اندر سے اٹھنے والی خوف کی لہر نے مغلوب کر لیا تھا۔ مجھے یوں لگتا تھا کہ کسی لمحے بھی دروازے پر دستک ہوگی اور شاہینہ اندر آجائے گی۔ سلوٹی اسے میرے ٹھکانے تک پہنچا کے غائب ہو چکی ہوگی اور شاہینہ دعویٰ کرے گی کہ میں نے خود تلاش کیا ہے تمہیں۔ یہ محض خوف تھا۔ حقیقت ہوتی تو اب تک شاہینہ مجھے گرفتار کر کے لے جا چکی ہوتی۔ وہ اسی شہر میں تھی اور ابھی تک میری تلاش میں سرگرداں تھی۔ اسے معلوم ہوگا کہ میں شناخت بدلنے کا ماہر ہوں۔ نام لے کر وہ مجھے تلاش نہیں کر سکتی تھی۔ وہ ایک اتفاق پر انحصار کر رہی تھی کہ کبھی نہ کبھی کہیں نہ کہیں میں نظر آجاؤں گا۔ کیا پتا اس نے میرا حلیہ بتا کے پولیس کو بھی میری تلاش پر مامور کر دیا ہو۔ اس کا پیسا سب کچھ کر سکتا تھا۔

سوال یہ تھا کہ اب مجھے اپنی حفاظت کے لیے کیا راستہ اختیار کرنا چاہیے۔ ریشم کو میں نے اپنی ذمے داری بنا لیا تھا لیکن وقتی طور پر وہ بیگم صاحب کے ساتھ محفوظ تھی۔ کیا میں اسے بتائے بغیر بھاگ جاؤں؟ اس کو ساتھ لے کر پھرنے میں خطرہ اور ذمے داری دونوں بڑھ جاتے تھے۔ شاید یہی ٹھیک تھا۔ وہ دکھی اور پریشان ہوگی۔ روئے دھوئے گی کہ میں بھی دھوکا دے گیا لیکن کچھ دن بعد میں اسے کہیں سے بھی رابطہ کر کے یہ بتا سکتا ہوں کہ فکر نہ کرے۔ سکون سے اس گھر میں رہے جہاں وہ محفوظ ہے۔ حالات جیسے ہی سازگار ہوں گے میں واپس آؤں گا۔

لیکن حالات کیسے سازگار ہوں گے؟ میرے سامنے دو مخالف سمتوں کے راستے تھے۔ ایک راستہ نورین کی طرف جاتا تھا۔ اس کی تلاش کامیاب ہو تو میں بھی اپنا گھر بسا کے سکون و عافیت کے ساتھ بیٹھوں۔ وہ بھی بھول جائے کہ ماضی نے اس کے ساتھ کیا ظلم کیا تھا اور میں بھی۔ ہم صرف اپنے خوش و خرم مستقبل پر نظر رکھیں۔ دوسرا راستہ نادر شاہ کی طرف جاتا تھا جس میں محبت نہیں انتقام کی آگ تھی اور موت چھپی تھی، میری یا نادر شاہ کی۔ خیر یہ بعد کی بات تھی۔ ابھی تو ضروری تھا کہ میں شاہینہ کے جال میں گرفتار ہونے سے بچوں۔ اس شہر سے بھی غائب ہو جاؤں اور اسے جھک مارنے دوں۔ جب تک کہ وہ خود مایوس ہو کے نہ لوٹ جائے۔

اس خیال نے مجھے رات کے وقت سونے نہ دیا۔ پہلے میں نے ریشم کے نام خط چھوڑنے کا سوچا۔ پھر یہ ارادہ بھی ترک کر دیا۔ چند روز بعد میں کہیں سے بھی کسی بھی پبلک کال آفس سے اس کو فون کر سکتا ہوں یا خط لکھ سکتا ہوں۔ میں نے گھڑی دیکھی۔ رات کے دو بج رہے تھے۔ صبح کم سے کم چار گھنٹے کی مسافت پر تھی۔ تین گھنٹے کا سفر مجھے ملتان سے دو سو کلومیٹر دور پہنچا سکتا تھا۔ میں نے جلدی جلدی ایک بیگ میں اپنے سارے کپڑے رکھے۔ جو تنخواہ میں یہاں ملی تھی وہ جوں کی توں ایک صندوق میں پڑی تھی۔ ہمارا سارا خرچہ تو بیگم صاحب اٹھاتی تھیں۔ نوٹ گننے کا وقت نہ تھا۔ میرے اندازے سے یہ پچاس ہزار کے لگ بھگ تھے۔ یہ کوئی بہت بڑی رقم تو نہ تھی لیکن اتنی کم بھی نہ تھی۔

جذبات کا تقاضا تھا کہ کنڈی کھول کے باہر نکلنے سے پہلے ایک نظر ریشم کو دیکھ لوں جو بیگم صاحب کے کمرے میں سوئی ہوئی تھی۔ پھر میں نے جذبات کو دبا دیا اور خاموشی سے نکل کے گلی میں آگیا۔ گلی سنسان اور تاریک تھی۔ کسی کسی دروازے پر کوئی بلب ٹمٹما رہا تھا۔ مجھے دو افراد سامنے سے آتے ہوئے ملے۔ ایک نے مجھے سلام کیا اور میں نے جواب دیا۔ گلی کے آخر میں چوکیدار مل گیا جو سیٹی بجاتا پھر رہا تھا۔ یہ چوکیداری کا عجیب انداز تھا۔ لوگ کہتے تھے کہ سیٹی بجا کے وہ ڈاکوؤں کو اطلاع دیتا تھا کہ وہ بہت دور ہے اور ڈاکو بے فکری سے اپنا کام کریں۔ وہ بوڑھا آدمی تھا۔ میں نے سلام کے بعد پوچھا۔ ''کیسے ہو چاچا؟'' اور اس نے کہا شکر ہے اللہ کا۔

مجھے کچھ کچھ اندازہ تھا کہ بس کا اڈا کدھر ہوگا۔ میں چلتا رہا۔ اس وقت کسی رکشا کا ملنا مشکل تھا۔ مجھے فیصلہ یہ کرنا تھا کہ مشرق کی طرف جاؤں یا مغرب کی طرف۔ کراچی جاؤں یا لاہور۔ دونوں ہی شہر اتنے بڑے تھے کہ ایک اجنبی کو اپنے سمو سکتے تھے جیسے سمندر بارش کی ایک بوند کو۔ نسبتاً قریب ہونے کی وجہ سے لاہور ٹھیک تھا۔ ورنہ زندگی بھر کی روپوشی کے لیے میں سوات چلا جاتا یا کوئٹہ۔ پھر ایک خیال یوں آیا کہ فیصلہ خود ہوگیا۔ مجھے نورین کی طرف جانا چاہیے۔ مگر کہاں؟ کس طرف؟ اور دماغ نے جواب وہی دیا جو منطقی تھا۔ نقطۂ آغاز وہی ہے جہاں وہ فاطمہ بن کر رہی تھی۔

لیکن یہ فیصلہ مقدر نے پل بھر میں الٹ دیا۔ سڑک خالی تھی اور میں اپنے خیالوں میں ایسا گم تھا کہ مجھے بائیں جانب سے آنے والی ایک گاڑی نظر ہی نہیں آئی۔ ایک وجہ یہ بھی تھی کہ گاڑی کی ہیڈلائٹس آف تھیں۔ ظاہر ہے اس کی وجہ خرابی ہی ہوسکتی تھی۔ اس نے مجھے بچانے کے لیے بریک بھی لگائے اور رخ بھی بدلا لیکن میں اس کی زد میں آگیا۔ تصادم نے مجھے کئی فٹ اوپر اچھال دیا اور میں لڑھک کر سڑک پر آگیا۔

مجھے اسپتال میں ہوش آیا۔ میں ایک بیڈ پر تھا اور میرے ہاتھوں پیروں پر پٹیاں تھیں۔ دائیں بائیں دوسرے بیڈز پر مریض دیکھ کر مجھے اندازہ ہوا کہ میں جنرل وارڈ میں ہوں لیکن یہ آرتھوپیڈک وارڈ نہیں ہے۔ یعنی میری ہڈیاں نہیں ٹوٹی تھیں۔ سب سے پہلے مجھے اپنے بیگ کا خیال آیا۔ بیگ کو سائڈ ٹیبل پر دیکھ کر مجھے اطمینان ہوا۔ میں نے اسے دیکھنے کی کوشش کی تو مجھے اندازہ ہوا کہ شانوں میں شدید درد کے باعث نہ میں ہاتھ ہلا سکتا ہوں اور نہ اٹھ سکتا ہوں۔ ایک نرس کو قریب سے گزرتا دیکھ کے میں نے روکنے کی کوشش کی مگر وہ جلدی میں تھی۔ مجھ پر ایک نظر ڈال کے گزر گئی۔

کچھ دیر بعد ایک ڈاکٹر اور ایک نرس میرے پاس آئے تو میں نے پوچھا۔ ”ڈاکٹر صاحب! یہ کون سا اسپتال ہے۔ مجھے یہاں کون لایا؟“

اس نے نفی میں سر ہلایا۔ ”میں ابھی ڈیوٹی پر آیا ہوں۔ کیا تمہیں یاد ہے، کیا ہوا تھا؟“

”مجھے کسی گاڑی نے ٹکر ماری تھی۔“

”گڈ۔ اس کا مطلب ہے تمہاری میموری ٹھیک ہے۔ چوٹیں ہیں مگر فکر کی بات نہیں ہے۔ دو چار دن میں تم ٹھیک ہوجاؤ گے۔“ وہ میرے جسم کے مختلف حصوں کا معائنہ کرتا رہا اور پھر اور چارٹ دیکھا جس پر میری ہسٹری تھی۔ بلڈ پریشر، ٹمپریچر۔ ”اس پر نام نہیں ہے تمہارا۔“ اس نے نرس کی طرف سوالیہ نظر سے دیکھا۔

”کوئی لایا تھا اسے سڑک پر سے اٹھا کے۔ مگر کچھ بتائے بغیر اسے چھوڑ کے چلا گیا۔“

”شاید وہی گاڑی والا ہوگا۔ قانونی کارروائی کے خوف سے بھاگ گیا۔ پولیس کہاں تھی۔ خیر، مجھے کیا۔“

اتنی دیر میں ساتھ والے بیڈ کا مریض حلق سے عجیب و غریب آوازیں نکالنے لگا۔ اس کے بیڈ کے ساتھ گلوکوز اور خون کی تھیلیاں لگی ہوئی تھیں۔ ڈاکٹر ایک دم ان کی طرف لپکا۔ وہ کوئی جونیئر میڈیکل افسر تھا۔

میرے نام کی بات درمیان میں رہ گئی۔ ساتھ والے مریض کی حالت ایک دم بگڑ گئی تھی۔ دو ڈاکٹرز اور نرسوں نے اسے بچانے کی پوری کوشش کی مگر اس کا آخری وقت آگیا تھا۔ بیڈ کی چادر میں لپیٹ کر اس کا مردہ جسم کچھ دیر بعد وہاں سے ہٹا دیا گیا۔ اگر میں اٹھ کے چل سکتا تو ضرور وارڈ سے نکل کے بھاگ جاتا۔ فی الحال وہاں لیٹے رہنا میری مجبوری تھی۔ نام کی ضرورت کے ساتھ ہی مجھے یاد آیا کہ اب مجھے حوالوں کی ضرورت پڑے گی۔ کس کو اطلاع دی جائے؟ کون ہے یہاں؟ کوئی نہیں تو کہاں سے آسکے مجھے؟ عام طور پر حادثات کے کیس ایم ایل او کے نوٹس میں ہوتے ہیں اور وہ قانونی کارروائی بھی کرتے ہیں مگر میرے کیس میں ایسا لگتا تھا کہ ٹکر مارنے والا یا تو مجھے گیٹ کے پاس ڈال کے بھاگ گیا یا وارڈ تک لے آیا اور پولیس سے ٹک مکا کر کے چلا گیا۔ وہ آدمی بے حس نہیں تھا اور غلطی بھی اس کی نہیں تھی مگر بلاوجہ قانونی چکر میں کون پڑنا چاہتا ہے۔

رسمی کارروائی پوری کرنے کے لیے ایک حوالدار نے دلی سے میرے پاس آیا۔ میں نے بتایا کہ میرا نام غلام نبی ہے۔ ولد حاکم علی۔ میں لاہور سے آیا تھا لیکن جس بندے سے ملنا تھا وہ نہیں ملا تو اب واپس جاؤں گا۔ خاندان رشتے دار کوئی نہیں۔ ایک بھائی باہر نکل گیا۔ بہن بیاہی گئی وہ مر گئی۔ اس نے لکھنا موقوف کیا اور چلا گیا۔ ایک لاوارث شخص پر کیا وقت ضائع کرنا۔ مجھے وہاں کھانا بھی ملا اور یہ معلوم ہوگیا کہ میں سرکاری اسپتال میں ہوں۔ دس گیارہ بجے میڈیکل وارڈ کا نگراں پروفیسر اپنے جونیئر ڈاکٹرز اور نرسوں کے ساتھ آیا تو میں نے پوچھ لیا۔ ”ڈاکٹر صاحب! کب تک ٹھیک ہوجاؤں گا میں؟“

وہ مسکرایا۔ ”جانا چاہتے ہو تو میری طرف سے

اجازت ہے۔ جاؤ، ہم کیوں تمہیں بلاوجہ خدمت کے لیے لٹکا کر رکھیں گے۔"

میں نے پورا دن لیٹ کر گزار دیا اور سوچتا رہا کہ جاتا کہاں تھا اور پہنچا کہاں۔ مر جاتا تو بھی کسی کو پتا نہ چلتا۔ غنیمت ہے کہ شناخت پر ابھی تک پردہ پڑا ہوا ہے۔ بیگ میں میری رقم اس لیے بھی محفوظ رہی کہ میلے کپڑوں میں چھپی ہوئی تھی۔ رات تک درد میں اضافہ ہوا۔ یہ دواؤں کا اثر تھا۔ میرا دماغ ایک شیطانی کارخانہ بنا ہوا تھا۔ ریشم، نورین، شاہینہ۔ کبھی ایک کا خیال آتا کبھی دوسری کا۔ پھر وہی خیال کہ منزل ہے کہاں تیری اے لالۂ صحرائی۔ رات کو ایک عمر رسیدہ مہربان نرس نے میری یہ درخواست قبول کرلی کہ رات بھر سکون سے سونے کے لیے مجھے نیند کی گولی دی جائے۔

اس سے فائدہ ہوا اور میں پوری رات بے سدھ پڑا رہا۔ جاگا تو رفتہ رفتہ اپنی حالت میں بہتری کا احساس ہونے لگا۔ میں سہارے سے واش روم گیا اور سہارے کے بغیر واپس آیا۔ ٹانگوں اور کمر میں چلنے سے درد ہوتا تھا جو قابل برداشت تھا۔ درد کا احساس مٹانے والی دوا کھا کے میں دوپہر کے بعد جا سکتا تھا۔ ناشتے میں چائے کا ایک کپ اور ایک سوکھا ہوا بند ملا۔ میں نے وارڈ بوائے کو پچاس روپے دیے تو اس نے مجھے کینٹین سے بند مکھن اور گرم چائے اور ایک ابلا ہوا انڈا بھی لا دیا۔ ناشتے کے بعد میری جسمانی توانائی بہت بہتر ہوئی اور میں نے سوچا کہ ڈاکٹر کی اجازت سے مجھے نکل جانا چاہیے۔ یہ اجازت سینئر ڈاکٹر دے سکتا تھا جو گیارہ بجے راؤنڈ کرتا تھا۔

گیارہ سے کچھ پہلے میری آنکھوں نے ایک ناقابل یقین منظر دیکھا۔ میری نظریں آنے والوں پر ساکت ہو گئیں۔ گزشتہ روز میرا بیان ریکارڈ کرنے والا حوالدار اپنی توند سنبھالتا مسکراتا میری طرف بڑھتا چلا آ رہا تھا اور اس کے ساتھ شاہینہ تھی۔ یہ نہ خواب تھا نہ سراب نہ نظر کا دھوکا۔ وہ مجسم پیکر رعنائی بنی پورے اعتماد کے ساتھ مسکراتی میری طرف چلی آ رہی تھی۔

"لو جی، یہ تو اپنا نام بتاتا ہے غلام علی ولد حاکم علی۔" حوالدار نے شاہینہ سے کہا۔

"شاید دماغ پر اثر ہو گا چوٹ کا حوالدار صاحب، نام یاد نہیں رہا۔" شاہینہ نے متانت سے کہا اور اپنے قیمتی ہینڈ بیگ میں سے کچھ نوٹ نکال کے حوالدار کو پکڑا دیے۔

"شکریہ۔"

حوالدار نے ایک کاغذ اسے دیا اور کسی شرم یا جھجک اور خوف کے بغیر نوٹ لے کر جیب میں ٹھونس لیے پھر وہ پلٹ کر دروازے کی طرف چل پڑا۔ شاہینہ میرے بیڈ کے ساتھ مجھ سے ایک فٹ دور آ کھڑی ہوئی۔ ہم ایک دوسرے کو خاموشی سے دیکھتے رہے۔ اس کی نظر اور مسکراہٹ کا پیغام واضح تھا۔ وہ جو چاہنے والے ہیں تیرے صنم، تجھے ڈھونڈ ہی لیں گے کہیں نہ کہیں۔

وارڈ کے سب مریض شاہینہ کی طرف متوجہ ہو گئے مگر وہ سب سے بے نیاز تھی۔ اس نے اپنا ملائم ریشمی ہاتھ میرے ماتھے پر رکھا۔ "کیسے ہو؟"

"زندہ ہوں۔" میں نے تلخی سے کہا۔ "اور پھر تمہارا قیدی ہوں۔"

اس نے مجھے وہ کاغذ دکھایا جو حوالدار اسے دے گیا تھا۔ اس پر میری صورت کا نقشہ تھا۔ "بے شک تمہارا چہرہ اس سے نہیں ملتا مگر اس حوالدار کی نظر تاڑ گئی۔ مجھے پتا چلا تھا کہ تم ملتان میں ہو۔"

"اس فاحشہ بے ایمان سلونی نے اطلاع دی ہو گی۔"

وہ جواب گول کر گئی۔ "میں نے تصویری خاکہ بنوا کے ملتان کے سب تھانوں کو فوٹو اسٹیٹ کاپیاں فراہم کر دیں اور کہا کہ مزید بنوا کے سب کو دے دیں۔ جو پہلے اطلاع دے گا اسے انعام ملے گا۔ یہ حوالدار پانچ ہزار لے گیا۔ تمہاری جان کا صدقہ۔"

وہ خطرناک حد تک ذہین عورت میری تلاش کو کامیاب کرنے کے لیے کیا طریقے اختیار کرے گی اور کس انتہا تک جائے گی میں اس کا صحیح اندازہ نہ کر پایا تھا۔ "اب کیا کرو گی تم میرے ساتھ؟"

وہ ہنسی۔ "اس سوال کا جواب جانتے ہو تم۔ میرے جذبات بدلے نہیں ہیں۔"

"اور میں تمہارے ساتھ نہ جانا چاہوں تو؟"

"جان من، یہ تمہاری نہیں میری مرضی کی بات ہے۔ تم باعزت طریقے سے میرے ساتھ چلو جیسے تمہیں چلنا چاہیے۔ میری جان و دل کے مالک کی طرح۔ میرے شریک زندگی کی طرح۔"

"تم مجھے زبردستی کیسے لے جا سکتی ہو؟"

"چھوڑو یہ سب باتیں۔ یہ بتاؤ طبیعت کیسی ہے تمہاری؟ یہاں آنے تو مجھے بھی شرم آئی۔ یہ اسپتال تمہارے لائق نہیں ہے۔"

اس کی بات ایک نرس کے آجانے سے ادھوری رہ

گئی۔ ڈرٹمن کے مطابق اس نے ٹمپریچر اور بلڈ پریشر لینے کے بعد مجھے ایک انجکشن لگایا جو اینٹی بائیوٹک تھا اور زخموں کو انفیکشن سے بچانے کے لیے دن میں تین بار دیا جاتا تھا لیکن مجھ سے ذرا سی بھول ہوگئی۔ میں بھول گیا کہ اب میں لاوارث نہیں شاہینہ کا مریض ہوں۔ میرے پاس آنے سے پہلے اس نے مجھے لے جانے کے انتظامات بھی کرلیے تھے۔ اسے معلوم تھا کہ میں انکار کروں گا اور وارڈ میں زبردستی پر مزاحمت بھی۔ اس نے نرس یا کسی ڈاکٹر کو رشوت دے کر یہ امکان بھی ختم کردیا تھا۔ مجھے خواب آور انجکشن لگا دیا تھا۔ چند منٹ میں اس کے اثرات ظاہر ہوئے۔ اب ہنگامہ بھی لاحاصل تھا۔ مجھے اپنی بے بسی سے زیادہ بے وقوفی کا احساس ہوا۔ میں یہ بھی معلوم نہ کرسکا کہ اس نے صرف میرا سراغ لگایا تھا یا ریشم کو بھی تلاش کرلیا تھا۔

پھر ہوش آیا تو مجھے ماحول کچھ جانا پہچانا سا لگا۔ حواس بحال ہونے پر مجھے یاد آگیا کہ یہ تو وہی جگہ ہے جہاں میں نے چھت سے کود کر فرار ہونے کی ناکام کوشش کی تھی اور ایک محافظ کو اینٹ مار کے زخمی کرنے کے بعد میری ٹانگ میں گولی لگی تھی تو پکڑا گیا تھا۔ یہ شاہینہ کے شوہر کا خفیہ عشرت کدہ تھا جس کو اس کی بیوہ نے بھی اسی مقصد کے لیے استعمال کیا تھا۔ فرق یہ تھا کہ اکبر کو کسی سے محبت نہیں تھی۔ اس کے لیے عورت صرف عورت تھی جو کپڑوں کی طرح استعمال کے بعد بدلی یا کسی کو بخشی جاسکتی تھی۔ اس کے اسی چلن نے شاہینہ کو بغاوت پر اکسایا تھا اور اس نے موقع پاتے ہی بیوی سے بیوہ ہونے کو ترجیح دی تھی۔ اکبر کو کہاں اندازہ ہوگا کہ بیوی کیا چیز ہے۔ زخم خوردہ ناگن کیا چیز ہوتی ہے۔

یہاں رہتے ہوئے چار دن گزر گئے۔ اب میرا کھانا پینا یا جینا نہ جینا سب کسی اور کے اختیار کی بات تھی لیکن اس حالت میں بھی مجھے خود سے زیادہ ریشم کی فکر تھی۔ اگر وہ پکڑی گئی تو پھر یہاں لائی جائے گی اور پیر صاحب کی دوسری بیوی بنے گی۔ وہ چانس اس نے خود گنوا دیا تھا جب وہ پیر سائیں کے دل پر اور ان کی حویلی پر راج کرسکتی تھی۔ اب اس کی حیثیت ایک کنیز جیسی ہوگی۔ آخر ریشم کو کیسے محفوظ کیا جائے۔ کیسے خبردار کیا جائے۔

اچانک میرے دل میں دوسرا خیال آیا۔ اگر شاہینہ کے علم میں ہوتا کہ ریشم کہاں ہے تو کیا وہ اسے چھوڑ آتی؟ نہیں، وہ اسے بھی ساتھ ہی لاتی۔ اس خیال نے مجھے بڑا سکون اور اطمینان دیا کہ شاہینہ نے میرا علاج عام کیا تھا۔ اسے یہ علم ہوتا کہ میں کہاں چھپا ہوا ہوں تو وہ سیدھی وہاں آتی اور مجھے اٹھا لے جاتی۔ یہ تو بدقسمتی نے مجھے اسپتال پہنچایا جہاں ایک حوالدار کو شبہ ہوا اور اس نے شاہینہ کو خبردار کردیا۔

اب میں نے شاہینہ کے ساتھ ایک گیم کھیلنے کا فیصلہ کیا۔ وہ پانچویں دن شام کو آئی تو اس کی تیاری مکمل تھی۔ اس کا لباس زیادہ ہیجان خیز تھا اور جو خوشبو اس نے لگائی تھی جذبات میں آگ لگانے والی تھی۔ اس کے ساتھ ایک ڈاکٹر تھا۔ معمول کے مطابق اس نے میرا چیک اپ کیا اور مجھے سو فیصد فٹ قرار دیا۔ وہ درمیانی عمر کا خوش مزاج آدمی تھا۔ اس نے میرے کندھے پر تھپکی دے کر کہا کہ اب تم چاہو تو ماؤنٹ ایورسٹ بھی سر کرسکتے ہو۔ "یہ آخری انجکشن ہے۔"

وہ آخری انجکشن ماؤنٹ ایورسٹ سر کرنے کے لیے ہی تھا جو اس رات میں نے سر کی۔ اب میں ایک غلام تھا۔ اشاروں پر چلنے والا روبوٹ تھا۔ ہار کچھ نہیں ہوتی اگر زندگی میں جیت کا حوصلہ باقی رہے اور میں یہ محسوس کرتا تھا کہ میرے دل و دماغ نے اپنی آخری شکست قبول کرلی ہے۔ میرے اندر وہ اعتماد کہیں نہ تھا جو حوصلہ دیتا تھا کہ ایک ناکامی سے کیا ہوتا ہے اگلی کوشش کامیاب ہوگی۔ لیکن اب ایسا نہیں تھا۔ میں ہار گیا تھا اور اس رات میں جو گزر چکی تھی، شاہینہ سے کہہ چکا تھا کہ میں اس سے شادی کے لیے تیار ہوں۔

ظاہر ہے کہ وہ خوش تھی، اپنی کامیابی پر۔ بے وقوف ضدی عورت جو زبردستی ایک مرد کو اپنا بنانے پر تل گئی تھی لیکن اسے میرے وعدے پر بھروسا نہ تھا۔ باتھ روب میں ملبوس وہ آئینے کے سامنے کھڑی اپنے بال ہیئر ڈرائر سے سکھا رہی تھی اور جیسے میں دیکھ رہا تھا ایسے ہی اس کی نظر مجھ پر تھی۔ میں ابھی تک کاہلی سے ٹانگ پر ٹانگ رکھے لیٹا تھا۔

"مجھے اب اعتبار نہیں رہا تم پر۔" اس نے سامنے دیکھتے ہوئے کہا۔

میں چونکا۔ "کیوں؟"

"یہ مجھ سے پوچھتے ہو کیوں؟ مجھے کیا معلوم کہ اس وقت تمہارے دل میں کیا تھا جب تم نے مجھ سے شادی پر رضامندی ظاہر کی تھی۔ ہر مرد کسی بھی عورت کو مجبور کرنے کا اختیار رکھتا ہے۔ قانونی بھی اور شرعی بھی۔ میں بھی کیسے روک سکتی ہوں تمہیں۔"

"ایک دن یقین آجائے گا تمہیں۔ میں ہار گیا ہوں۔ تمہاری محبت جیت گئی ہے۔"

وہ ہنسی۔ "اور نور بی؟"

"ایسے تو آرڈر کی مثال ہے جو ضرورت کے لیے

تمہاری بہن سے شادی کررہا تھا اور محبت کے لیے رشم سے۔ مگر نورین کی طرف سے میں مایوس ہو چکا ہوں۔ اتنا عرصہ میں نے دن رات ایک کردیے مگر وہ نہیں ملی۔"

وہ میری طرف آئی اور مجھے ہاتھ پکڑ کے کھینچا۔ "اٹھو کاہل آدمی! بھوک لگ رہی ہے مجھے۔ ذرا دیکھو کیا وقت ہورہا ہے۔"

میں نے اٹھتے ہوئے کہا۔ "وقت کو میں کیوں دیکھوں۔ جب میں وقت کو نہیں گزار رہا۔ وقت مجھے گزار رہا ہے۔"

ناشتا کرتے ہوئے اس نے پھر پوچھا۔ "اتنا عرصہ... اب شاید تین مہینے ہوگئے۔ کہاں کہاں گئے تم نورین کی تلاش میں؟"

میں نے ایک کہانی سنائی۔ اس کے قابل یقین ہونے نہ ہونے سے کسی کو فرق نہیں پڑتا تھا اس نے سننے کے بعد پوچھا۔ "رشم تمہارے ساتھ رہی؟"

"رشم؟" میں نے چونک کر کہا۔ "وہ میرے ساتھ کیسے ہوسکتی تھی؟"

"کیوں گئی تو تمہارے ساتھ تھی؟"

"ہاں، مگر اسے روز بینہ اور مراد اپنے ساتھ لے گئے تھے۔ تمہارا اپنی بہن سے کوئی رابطہ نہیں؟"

"صرف ایک بار اس نے فون کیا تھا۔ معلوم نہیں کہاں سے۔ ابا جی اب ہر فون خود سنتے ہیں۔ وہ آگ بگولا ہوگئے۔ انہوں نے کال کا پتا چلایا مگر حاصل کچھ نہیں ہوا۔ میں نے سنا ہے..." وہ رک گئی۔

"کیا سنا ہے؟ وہ بیرون ملک چلے گئے۔"

"بیرون ملک جانے والوں کا سراغ مل جاتا ہے۔ ویزا اور سفری دستاویزات سے۔ وہ یہیں ہیں۔"

میں نے چونکنے کی اداکاری کی۔ "یہیں کیا مطلب؟ ورثا کے کسی قید خانے میں؟"

اس نے نفی میں سر ہلایا۔ "مراد کے ٹھیکے دار باپ کی حفاظتی تحویل میں۔ اس نے ایک بلٹ پروف گاڑی خریدی ہے اپنے لیے۔ اس میں وہ بھی آتے جاتے ہوں گے۔ گارڈ آگے پیچھے چلتے ہیں۔"

"مراد کا باپ تو ایک ٹھیکے دار ہے۔"

"مگر کروڑ پتی بلکہ ارب پتی اور اس کے تعلقات آرمی اور بیوروکریسی میں بہت اوپر تک ہیں۔ ایک جنرل صاحب کی بیگم جب تو اولاد کے لیے دعا کرانے آتی تھیں۔"

"جنرل تو جوانی میں تو نہیں بن جاتا کوئی۔ خاصی عمر کی ہوں گی یا سیکنڈ وائف۔"

"وہ سیکنڈ وائف نہیں تھی۔ شادی کو چوبیس سال گزر گئے۔ بس اللہ نے نہیں دی اولاد۔ لیکن مجھے شک ہے کہ وہ کسی کا پیغام لائی تھی کہ اب انہیں معاف کردیا جائے۔ روز بینہ اور مراد کو۔ وہ شادی کرچکے ہیں شرعی طور پر۔"

"کیا تم نے سنا؟"

"ہاں، پیر سائیں بعد میں برہم ہورہے تھے۔ اب حکومت خاندانی معاملات میں بھی ہمیں حکم دے گی کہ ہم کیا کریں کیا نہ کریں۔"

"پھر نور رشم بھی انہی کے ساتھ ہوگی۔"

"اب تم نے بتایا ہے تو معلوم کرنا پڑے گا۔ انور بہت پریشان ہے اس کے لیے... کیا تمہیں معلوم ہے کہ چاچا جی فوت ہوگئے؟"

"بڑے چودھری صاحب، کب؟"

"چالیسواں گزشتہ جمعرات کو ہوا تھا۔ انور اب چودھری ہے۔ ساری جاگیر کا مالک۔"

"نہ خدا ہی ملا نہ وصال صنم۔ روز بینہ گئی لالچ میں اور رشم چھوڑ گئی۔"

"اسے واقعی محبت ہے رشم سے۔"

میں نے کہا۔ "کمال ہے، اکبر، انور جیسے بھی محبت کی بات کرتے ہیں جو زمین کی محبت پر رشتے قربان کرتے ہیں۔" میں نے نرمی سے کہا۔ "ایک بات پوچھوں؟"

وہ ہنسی۔ "مجھ سے اجازت؟"

"اس نے روز بینہ کے جانے کے بعد... تم سے شادی کی خواہش ظاہر نہیں کی؟"

"یہ کیسے ہوسکتا تھا؟"

"پروانہ ہے۔ چادر ڈالنے کا۔ اور اس کی ضرورت بھی تھی۔ روز بینہ کے ساتھ پیر سائیں کی جائداد بھی جو پہلے آدھی ملتی۔ اب پوری اگر تم سے شادی کرلیتا۔ اور یہ بھی سچ ہے کہ پہلے تم اس سے منسوب تھیں۔ اسے چاہتی تھیں۔ اکبر ہمیشہ اس کا طعنہ دیتا رہا کہ انور نے ٹھکرایا تو تمہاری شادی اکبر سے ہوئی۔"

شاہینہ کا چہرہ دھواں دھواں ہوگیا۔ "ہاں، یہ سب سچ ہے لیکن وہ وقت تو بہت پیچھے رہ گیا۔ انور نے خود اپنے ہاتھوں سے اس تعلق کو ختم کیا۔ اب اس لیے کہ میرے ساتھ ساری جائداد ملے گی وہ مجھ سے مجھے مانگے؟ میں تھوک دیتی اس کے منہ پر اگر وہ ایسا کرتا۔ اب دن رات بدل گئے

ہیں۔ جتنا میں تمہیں جانتی ہوں، وہ جانتا ہے اور جتنا وہ رستم کو جانتا ہے میں جانتی ہوں۔"

میں نے کہا۔ "جس طرح تم نے میری تصویر سے میرا سراغ لگایا۔"

"تصویر کہاں تھی۔ ایک پولیس افسر اباجی کا مرید ہے۔ اس نے کسی کو بھیجا تھا۔ وہ پنسل سے اسکیچ بناتا رہا اور میری مرضی کے مطابق اس میں تبدیلی کرتا رہا۔ دو دن لگے اسے۔ وہ تنگ پڑ گیا تھا کیونکہ میں کسی طرح مطمئن نہیں ہوتی تھی۔ افسر انجی کا ڈر نہ ہوتا تو وہ بھاگ جاتا۔ اس نے بالآخر تمہارا خاکہ بنا دیا۔ خاکہ کیا تمہاری تصویر ہے بالکل۔"

"پھر انور نے ایسا کیوں نہیں کیا؟"

"معاملہ ایک عورت کا تھا۔ اس گھر کی عورتوں کی اخبار میں تصویر شائع ہونا ناممکن۔ کہنے کو ہم پردہ دار ہیں۔ پہروں میں رہتی ہیں اور آگے پیچھے محافظ چلتے ہیں۔ ہماری طرف کوئی میلی نظر سے دیکھے تو مارا جائے۔"

"انور ولایت سے پڑھا ہوا..."

وہ ہنسی۔ "یہ سب ولایت کے پڑھے ہوئے ہیں۔ جانتے بوجھتے یہ اپنی دنیا کو جاہل رکھتے ہیں اور اپنا قدم بوسی پر مجبور کرتے ہیں مگر انور سے کچھ بعید بھی نہیں۔"

"تم مجھے اسی طرح یہاں قید میں رکھو گی؟"

وہ کچھ دیر مجھے دیکھتی رہی۔ "اچھا ہے اگر تم راضی خوشی پیر سائیں کی فرزندی قبول کر لو۔ ساری جائداد ایک دن تمہاری ہوگی اور یہ گدی بھی۔ تم چلا سکتے ہو۔ میں تمہاری مدد کروں گی۔ یہ سونے کی کان ہے اور بڑے اثر و رسوخ والی جگہ ہے اور پھر میں... محبت کو چھوڑ دو۔ میری طرف ایک مرد کی نظر سے دیکھو۔ کیا کمی ہے مجھ میں؟"

میں نے اعتراف کیا۔ "اس سے کون انکار کر سکتا ہے کہ تمہارا حسن و شباب تباہ کن ہے۔ بے مثل ہے۔"

"اب اباجی ہر طرف سے مجبور ہیں۔ ایک ہی بیٹا دیا تھا خدا نے جس پر ساری آس تھی کہ مستقبل میں ان کا جانشین بنے گا۔ وہ چلا گیا۔ ایسا گیا کہ پھر نہ ملا۔ دو بیٹیاں رہ گئی تھیں۔ ایک کی شادی ہوئی تو وہ بیوہ ہو کے گھر آ بیٹھی۔ دوسری ان کی عزت کا جنازہ نکال کے بھاگ گئی۔ اب ان میں ہمت ہی نہیں رہی مجھے انکار کرنے کی ورنہ میں بھی بھاگ جاؤں گی۔ ان کو ڈر ہے۔ تم سے بڑی امیدیں وابستہ کرلی ہیں انہوں نے۔ داماد نہیں تم حقیقی بیٹے سے زیادہ اہم ہو گئے ہو۔ وہ خود تمہیں سب کچھ سونپ دیں گے، اپنی گدی،

زمین، جاگیر اور گدی... اور ہے کون اب؟"

"ان کے مرید ایک سے ایک عالی نسب اور بااثر لوگ ہیں۔ ان کے بیٹے۔"

"وہ جانتے ہیں کہ اب مرضی ان کی نہیں، میری چلے گی اور انہوں نے ہتھیار ڈال دیے ہیں میرے سامنے۔"

"تم انہیں بتاؤ گی کہ میں پکڑ لائی ہوں شوہر کو؟"

وہ کچھ دیر خاموش رہی۔ "سب سے اچھا ہے کہ تم خود ان کی قدم بوسی کے لیے حاضر ہو جاؤ اور کہو کہ میں لوٹ آیا ہوں۔ مجھے اپنی فرزندی میں قبول فرمائیں۔ ڈراما ہے تو ڈراما سہی۔ وہ فراخ دلی کے ساتھ تمہیں معاف کر کے گلے سے لگا لیں گے۔"

"اور میں ایسا نہ کروں... تو؟"

"پھر چارہ کار ہے تم کو ان کے سامنے دست و پا بستہ ڈال دیں گے کہ یہ ہے آپ کا مجرم۔"

وہ کچھ دیر بعد چلی گئی۔ فیصلہ اب مجھے کرنا تھا۔ وہی فیصلہ جو تقدیر کر چکی تھی۔ شاہینہ سنا چکی تھی۔ میں رات بھر سوچتا رہا۔ پھر میں نے خود کو قائل کر لیا کہ شاہینہ سے شادی کوئی نقصان کا سودا نہیں۔ لالچ کی بات الگ کہ شاہینہ اس تمام جائداد کی مالک ہوگی جو آج پیر سائیں کی ہے۔ پیسا بہرحال دنیا کی سب سے بڑی حقیقت ہے۔ وہ آج مجھے کسی مدفون خزانے کی طرح مل سکتا ہے۔ گدی پر بیٹھنا میرے عقیدے کے خلاف ہے مگر پیر سائیں بھی تو اسے کاروبار سمجھ کے چلا رہے ہیں۔ یہ ہو سکتا ہے کہ بعد میں شاہینہ میری ہم خیال ہو جائے۔ ہم گدی کسی سینئر مرید کے حوالے کریں، جائداد کو ٹھکانے لگائیں اور ولایت چلے جائیں۔ ہمیشہ کے لیے یہ ملک چھوڑ جائیں۔

اور یہ سب ایک دن میں نہیں ہوگا۔ مجھے بہت مہلت ملے گی۔ تمام وسائل میری دسترس میں ہوں گے کہ میں نورین کو تلاش کر سکوں۔ اسے حاصل کر لوں یا یہ یقین کہ اب وہ دوسری دنیا میں میری منتظر ہے۔

زندگی جیسے ایک معمول پر آ کے ٹھہر گئی۔ ڈاکٹر ہر روز آتا تھا پھر ایک نرس آ گئی جس نے پرانی بڑھیا کی جگہ لے لی۔ وہ گھر کا سارا کام، کھانا پکانا اور مجھے کھلانا، وقت پر دوا دینا سب کرتی تھی۔ وہ بے حد کم گو تنگی اور قدرے فربہ بدن، سانولے رنگ کی عورت تھی جو پولیس کی نوکری کر چکی تھی۔ اس کی ظاہری خوش اخلاقی میں بھی بڑی کرختگی تھی اور شرم و حیا نام کی کوئی چیز نہ تھی۔ یہ شاہینہ کا بندوبست تھا۔ وہ اب کوئی رسک لینے کو تیار نہ تھی۔ میں جوڑ توڑ کرانے جانتا

ہوں تو وہ لاہور کے پولیس ٹریننگ اسکول کی انسٹرکٹر رہی ہے۔

مجھے یوں لگا جیسے وہ مجھے چیلنج کر رہی ہے۔ میں نے کہا۔ ''اچھا دیکھتے ہیں تم نے پولیس کو کیا سکھایا، میں بہت دن سے آؤٹ آف پریکٹس ہوں مگر بھولا نہیں ہوں کچھ بھی۔''

مجھے حیرانی سے زیادہ شرمندگی ہوئی جب ایک عورت نے تین منٹ میں مجھے ناک آؤٹ کر دیا۔ میرے داؤ ابتدا میں خطرناک نہیں تھے لیکن حریف کی مہارت کا اندازہ ہونے ہی میرے اندر ایک انتقامی نوعیت کی بے رحمی جاگ اٹھی۔ مجھے محسوس ہوا کہ رعایت دی تو وہ مجھے مار ڈالے گی اور اس کے پاس جواز ہوگا۔ وہ ایک سفاک انداز میں حملے کر رہی تھی۔ چند سیکنڈ میں میرا دماغ ایک وحشیانہ جارحیت میں بدل گیا جو زندگی کا مکمل سبق ہے۔ جارحیت سب سے مؤثر دفاع ہے۔ مار ڈالو اس سے پہلے کہ مارے جاؤ۔ مگر وہ عورت نہیں ایک خونخوار گوریلا تھی۔ اس کا دفاع اور جوابی حملے بھی شدت اختیار کر گئے۔ صرف تین منٹ کے بعد میں ناک آؤٹ ہو چکا تھا۔

اس نے پھولی ہوئی سانس کے ساتھ کہا۔ ''آزمالیا تم نے۔ دوبارہ یہ غلطی مت کرنا۔''

مجھے شکست کی ذلت سے ایک عورت نے دوچار کیا تھا۔ یہ صرف جسمانی نہیں ذہنی شکست بھی تھی۔ میں خاموش رہا۔ اس وقت اگر میں اپنی ہار کا کوئی جواز پیش کرتا تو عذر گناہ بدتر از گناہ والی بات ہوتی۔ لیکن میں اپنی ہار کی وجہ جان گیا تھا۔ بے شک یہ پروفیشنل مقابلہ نہیں تھا۔ نہ کوئی ریکھنے والا تھا نہ ریفری۔ بارش سارا رخل میرے رونے کا تھا۔ میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ میرے مقابل کبھی کوئی عورت ہوگی۔ ایسا دنیا میں نہیں ہوتا۔ نہ باکسنگ میں نہ کشتی میں نہ جوڈو میں کہ مرد کا مقابلہ عورت کرے۔ ایک ذہنی جھجک نے مجھے مروایا۔ میں ایک عورت کے جسم کو اس طرح نہ ہینڈل کر سکا جیسے کسی مرد کو کرتا۔

میری مخافظ اگر صرف وہ عورت ہوتی تو میں بہ آسانی نکل جاتا لیکن ایک تو باڑ کا پہرا بہت کڑا تھا، دوسرے میں فرار کے ارادے سے دور تھا۔ میں ایسا سوچ بھی نہیں رہا تھا۔ میں نے شکست کو تسلیم کر لیا تھا کہ اب نورین نہیں ملے گی اور اس کے خیال کے پیچھے بھاگنا عبث ہے۔ اس کے ساتھ ہی شاہینہ کا خیال مجھے سوتے جاگتے رہنے لگا۔ وہ بلاشبہ ایک حسین اور بھرپور عورت تھی۔ اس نے میرے اندر کے مرد کو مغلوب کر لیا تھا۔

وہ دوسری بار آئی تو میں نے کہا۔ ''کہاں تھیں اتنے روز سے؟''

میرے لہجے نے اسے حیران کر دیا۔ ''ابھی چار دن تو گزرے ہیں۔''

''چار دن... مجھے تو ایسا لگا کہ چار ہفتے گزر گئے تمہیں دیکھے۔''

اس نے مجھے غور سے دیکھا۔ ''تیا ڈراما کر رہے ہو؟''

''ڈراما کیسا۔ میں مسلسل یاد کرتا رہا تمہیں مگر بلاتا تو کیسے؟''

وہ مکمل یقین نہ کرنے کے باوجود خوش ہوئی۔ ''بلاتے تو میں کیا فوراً آ جاتی۔ ماما کے ابا جی ہمارے نکاح کے لیے راضی ہیں۔ مجبوری ہے ان کی۔ لیکن وہ اس طرح ہمارے ملنے کو کیسے برداشت کر سکتے ہیں۔ میں کیسے بتا سکتی ہوں انہیں کہ تمہیں میں نے کیسے جیتا ہے اپنے لیے۔ مجھے بڑا رسک لینا پڑتا ہے۔''

''مگر ایسے کب تک چلے گا۔ میں... ہر وقت تمہیں سامنے چاہتا ہوں۔''

وہ اٹھ بیٹھی۔ ''اتنا جھوٹ۔''

''بتاؤ کس کی قسم کھا کے تمہیں یقین دلاؤں۔ اب میں تم سے دور نہیں رہ سکتا۔''

اس نے مجھ پر جھک کے میری آنکھوں میں جھانکا۔ ''اور نورین؟''

''تم نے اس کے خیال کو بھی دل سے نکال دیا ہے۔'' میں نے کہا۔

اس کا چہرہ گلنار ہو گیا۔ ''کیا میں نے اچھا نہیں کیا۔ تم سراب کے پیچھے دوڑ رہے تھے۔''

''تم نے مجھے پاگل ہونے سے بچا لیا۔ اپنی پناہ میں لے لیا۔ میں تو بڑا خوش قسمت ہوں۔ تم جیسی حسین لڑکی...''

ایسے ہی الفاظ اور جملے ہر لڑکی سننا چاہتی ہے۔ خواہ اسے معلوم ہو کہ یہ جھوٹ ہیں۔ میں نے شاہینہ پر اپنا اعتبار قائم کر لیا تھا۔ یہ میری نئی زندگی کا پلان تھا جس کی کامیابی میرے اپنے حق میں تھی۔ میں نے انور کی تقلید کی تھی۔ ایک کی دولت، دوسری کی محبت۔ خوش قسمتی یہ کہ جو عورت مجھے دولت دے سکتی تھی وہ محبت بھی کر رہی تھی۔ کیونکہ وہ موجود تھی اور سامنے تھی۔ محبت پہ حق رکھنے والی صرف ایک یاد تھی۔ ایک خیال تھی اور تخیل تھی۔ میں نے طے کر لیا تھا کہ اس کی تلاش جاری رکھوں گا۔ وہ جب بھی جہاں بھی ملے گی اسے اپنا لوں

گا۔ میں آج کے دن کا فیصلہ کرسکتا تھا۔ کل نورین نے کہا کہ صرف میرے ہوجاؤ تو میں اس کا ہوجاؤں گا لیکن آنے والا کل غیر یقینی ہے۔ آنے والے کل کے بارے میں میرا دعویٰ یقینی کیسے ہوسکتا ہے۔

ایک بار پھر پہلے والا سین پیش آیا۔ مجھے پیر سائیں کے ڈیرے پر منتقل کر دیا گیا۔ دوسری صبح وہ بزرگی فقیری اور امیری کی پوری شان کے ساتھ جلوہ نما ہوئے۔ انہوں نے مجھے گلے سے لگا کے میرے سر پہ ہاتھ رکھا اور زیر لب کچھ پڑھ کے پھونکنے کے بعد کہا۔ ''کیسے ہو؟''

میں نے مکمل سعادت مندی اختیار کی۔ ''آپ کی دعاؤں کے طفیل خیریت سے ہوں اور جو کچھ میں نے پہلے کیا اس پر بہت شرمندہ بھی ہوں۔''

وہ میرے سامنے بیٹھ گئے۔ ''اللہ معاف کرنے والا ہے۔ اب کیا سوچا ہے تم نے؟ کیا چاہتے ہو؟''

میں نے وہ بات کر دی جو سننے کے لیے وہ تشریف لائے تھے۔ ''یہی... کہ آپ مجھے معاف کر دیں اور اپنی فرزندی میں قبول فرمالیں۔ میرا تو دنیا میں کوئی نہیں جو یہ درخواست کرتا۔''

''دیکھو، اس وقت اور کوئی نہیں۔ تم ہو اور میں۔ ہم صاف بات کریں گے۔ مجھے معلوم ہے کہ میری بیٹی تمہیں پسند کرتی ہے۔ تم یقیناً ہر لحاظ سے کسی بھی لڑکی کے آئیڈیل ثابت ہوسکتے ہو لیکن یہ شاہینہ کے لیے بھی زندگی اور موت کا سودا ہے۔ اکبر ہمارا بھتیجا تھا۔ لیکن اس سے شادی کر کے ہم نے بیٹی پر بڑا ظلم کیا۔ ہم بھی اس کی تلافی چاہتے ہیں۔ اگر تم نے بھی اسے دھوکا دیا تو... معلوم ہے کیا ہوگا؟''

میں نے ادھر ادھر دیکھ کر کسی مناسب ڈائیلاگ کے لیے الفاظ تلاش کیے۔ ''جی۔''

''قیامت آجائے گی۔ کوئی زندہ نہیں بچے گا۔'' انہوں نے پیروں کے انداز میں اعلان کیا۔ ''وہ مرجائے گی۔ پھر ہم زندہ رہ کر کیا کریں گے مگر یہ بات یقینی ہے کہ تمہیں مار کے مریں گے۔''

میں نے کہا۔ ''اس کی نوبت کبھی نہیں آئے گی۔''

''ہم بہت رسوائی جھیل چکے۔'' انہوں نے افسردگی سے سر جھکا لیا۔

''آج ہم نے تم کو اپنانے کا فیصلہ کرلیا ہے تو اس امید پر کہ شاید رہی سہی عزت بچ جائے لیکن تم کو ہم نے ہر لحاظ سے اس قابل بھی پایا۔ بے شک تمہارے نام نسب کا کچھ پتا نہیں لیکن اصل چیز کردار ہے۔ یہ ہمیں وقت نے سمجھایا ہے۔ ہمارا مرحوم بھائی تمہاری بہت تعریف کرتا تھا اور ہماری بھابی جو اب بیوہ ہے کہتے تھے کہ ہماری کوئی بیٹی ہوتی تو اس لڑکے کو اپنا لیتے۔ تم نے اتنا عرصہ اس گھر میں گزارہ جو ہمارا بھی گھر تھا کہ اب اجنبی نہیں رہے۔''

انہوں نے اپنے حصے کی جائداد کی تفصیل بتائی۔ اس سے سالانہ آمدنی کثیر تھی لیکن اس سے کہیں زیادہ عزت اور فائدہ مجھے ان کا جانشین بن کے مل سکتا ہے اگر میں ان کے بعد سجادہ نشین بن جاؤں۔ یہ سب میرے لیے غیر متوقع نہ تھا اور میں پہلے سے جانتا تھا لیکن یہ وقت نہ تھا کہ میں تردید کرتا اور کہتا کہ میں ان کی پیری فقیری والا فراڈ نہیں کر سکتا اور یہ مصنوعی عزت کا کھیل بھی میں جاری نہیں رکھ سکتا۔

پیر صاحب کو اچانک میری ذہنی غیر حاضری کا احساس ہوا۔ ''تم نے سنا میں نے کیا کہا؟''

''جی، سب سنا میں نے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ میں نے ان سب کے بارے میں نہیں سوچا۔ میں یہ شادی صرف شاہینہ کے لیے کر رہا ہوں۔''

ہم دونوں بڑی خوش اسلوبی سے جھوٹ بول کر ایک دوسرے کا بھرم رکھ رہے تھے۔ ''اللہ بہتری کرے گا۔''

مجھے صرف ایک بات پر حیرت تھی کہ ابھی تک انور مجھ سے ملنے نہیں آیا۔ کیا اسے میری واپسی کا علم نہیں؟ یا اب وہ ریشم کے بارے میں معلوم بھی کرنا نہیں چاہتا کہ وہ کہاں ہے اور کس حال میں ہے؟ یہ صرف ایک ہی صورت میں ممکن تھا جواب بدل گئی تھی۔ پہلے اسے پیر سائیں نے قید کر رکھا تھا اور جب انور نے ان کی اسکیم کے مطابق شاہینہ سے شادی کرنے پر رضامندی ظاہر کی تھی تو پیر صاحب نے ریشم کو اپنے نکاح ثانی میں لینے کا اعلان کر دیا تھا۔ اس طرح شاہینہ کے مستقبل کو خطرہ نہیں رہا تھا کہ انور بعد میں ریشم کو بھی اپنا لے۔

مگر اسی شام انور آگیا۔ وہ بڑی محبت سے گلے ملا مگر کچھ بجھا بجھا تھا۔ ''مجھے تیرے آنے کا پتا چلا تھا۔''

''اور یہ پتا چلا تھا کہ میرے ساتھ ریشم نہیں آئی؟''

اس نے اقرار میں سر ہلایا۔ ہم برآمدے میں آبیٹھے جہاں خلوت تھی۔ ''کہاں ہے وہ؟''

''مجھے نہیں معلوم۔'' میں نے کہا۔

''وہ تیرے ساتھ گئی تھی۔'' انور بولا۔

''لیکن میں اس کو ساتھ لے کر کہاں جاتا۔ وہ روزینہ اور مراد کے ساتھ چلی گئی تھی۔ ان کے بارے میں سنا ہے کہ باپ نے واپس بلا لیا ہے اور ان کو فول پروف

سکیورٹی لگی ہوئی ہے۔ پرندہ پر نہیں مار سکتا۔“

”سب کہنے کی بات ہے۔ مجھے نہیں یقین کہ وہ یہاں ہوں گے۔“

”پھر کہاں ہوں گے؟“

”کہیں بھی۔ پاکستان میں۔ پاکستان سے باہر۔ دنیا بہت بڑی ہے جہاں ابھی تک پیرسائیں کے مرید اور کارندے بھی نہیں پہنچے۔ یہ مشکل ہے، ناممکن نہیں۔“

”خود تو نے بالکل کوشش نہیں کی رنجم کا پتا چلانے کی؟“

”نہیں۔“ وہ خلا میں دیکھتا رہا۔ ”وہ چاہتی تو مجھے سر یک واڈ کر لیتی۔ نکل کے میرے پاس آجاتی اور میں اسی دن اسی وقت نکاح کر لیتا اس سے۔“

”مگر تو شاہینہ سے شادی کر رہا تھا۔“ میں نے تلخی سے کہا۔

”شاید اسی لیے اس نے مجھے چھوڑ دیا۔ حالانکہ پہلے وہ میری مجبوری کو سمجھ کے مان گئی تھی۔“

”رونے کی بات اور تھی۔ اس سے تیری منگنی تھی پہلے سے۔ شاہینہ سے تو لالچ میں شادی کر رہا تھا۔“

وہ خاموش اور مجرم بنا بیٹھا رہا۔ ”شاید یہ اسی لالچ کی سزا تھی۔“

”تو بھی جانتا تھا اچھی طرح کہ شاہینہ تجھ سے شادی نہیں کرے گی۔“

”ہاں، وہ پاگل تھی... بے غیرے لیے۔“

”اب اس کے ساتھ وہ بد دی ناممکن ہے۔“ میں نے کہا۔

”اس نے اکبر کو بھی قتل کر دیا تھا۔ کیونکہ وہ نفرت کرتی تھی اس سے۔“

”تو جانتا ہے یہ بات؟“ میں نے حیرانی سے کہا۔

”اتنا بھولا نہ بن۔ تو بھی جانتا ہے۔ سب جانتے تھے۔“

میں نے کہا۔ ”انور! میں شادی کر رہا ہوں اس سے۔“

”اچھا ہے۔“ اس نے مختصر تبصرہ کیا۔

میں نے محسوس کیا کہ انور کے اور میرے درمیان عدم اعتماد کی خلیج حائل ہو گئی ہے۔ میں نے اس کو نہیں بتایا تھا کہ میں نے حالات کی مجبوری سے مفاہمت کر لی ہے جو وقتی ہے۔ کل کا خود مجھے یقین نہیں کہ میں کیا کروں گا۔ ایسا لگتا تھا کہ میرے شاہینہ سے شادی کے فیصلے پر وہ خوش نہیں ہے لیکن یہ فیصلہ میرا کب تھا۔ فیصلہ کرنے اور مجھے قبول کرنے پر مجبور کرنے والی شاہینہ تھی۔

شاہینہ کو ایک بار پہلے وہ ٹھکرا کے چلا گیا تھا اور مجبوراً اس کو اکبر کے پلے باندھ دیا گیا تھا کیونکہ خاندان میں دوسرا کوئی تھا ہی نہیں۔ آج پھر ویسی ہی صورت حال تھی۔ وہ صرف اور صرف تمام جائداد کا مالک بننے کے لیے شاہینہ پر قبضہ کرنا چاہتا تھا کیونکہ رنجم بھی اسے ٹھکرا کے جا چکی تھی، اب شاہینہ نہیں اس کی نظر جائداد پر تھی۔ ادھر شاہینہ وہ عورت تھی جس نے غلامی کی اور ذلت کی زنجیر توڑنے کے لیے اپنے شوہر کو قتل کر دیا تھا۔ شاید وہ جانتی تھی کہ خاندان کے لوگ اس قتل کو چھپانے پر مجبور ہوں گے۔ سب سے بڑی بات یہ تھی کہ شاہینہ دیوانگی کی حد تک مجھ پر فریفتہ تھی۔ دل ہی دل میں انور مجھے اپنا رقیب فرض کرنے لگا ہوگا۔ میں نہ ہوتا تو اسے شاہینہ اور اس کی جائداد دونوں مل جاتے۔

ایک طرح سے مجھے انور کی ذلت پر خوشی ہوئی جس کا ذہن کے لیے لالچ اس کے علم پر غالب آگیا تھا۔ کہاں وہ انور جو انقلابی نظریات رکھتا تھا۔ دنیا گھوم آیا تھا۔ تعمیرات کی ڈگری رکھتا تھا اور زمین کو تقسیم کر دینے کی بات کرتا تھا۔ حکومت ہاتھ میں آئی تو وہ سب بھول گیا۔ سوائے اس کے کہ اب وہ ساری جائداد کا وارث ہے۔ اپنے باپ کی اور اس کے بھائی کی بھی۔ وہ صرف ایک جاگیردار بن گیا۔

میرے خیالات میں بھی وہ انقلاب آ گیا تھا جس کی مجھے توقع نہ تھی، میں صرف نور بی کو بھلانے کی کوشش میں مصروف نہیں تھا، اس میں کسی حد تک کامیاب بھی ہو چکا تھا۔ اب مجھے شاہینہ اچھی لگتی تھی۔ یہ اس کے حسن کا جادو تھا یا اس کی بے پناہ محبت۔ وہ مجھ سے کرتی تھی یا اس نے ذہن کو بدلنے والی دوائیں دے کر میرے خیالات کا رخ موڑ دیا تھا۔

میرے خیالات کے انقلاب نے مجھے ایک نئی شخصیت میں ڈھال دیا تھا۔ آخر ایسا کیوں ہو رہا ہے؟ کبھی کبھی میں سوچتا پھر میرے سامنے انور کی مثال آ جاتی تھی جس کے خیالات اور نظریات سب وقت کے ساتھ الٹ گئے تھے۔ مجھے شاہینہ کا خیال بھی آتا تھا جس نے بڑے دعوے سے کہا تھا کہ وہ مجھے بدل دے گی۔ میرا دل جیت لے گی اور اس نے بتایا تھا کہ انسان کے ذہن اور شخصیت کو بدلنا تو ایک سائنس ہے۔ برین واشنگ کی سائنس جس کا استعمال پہلے روس، امریکا کے جاسوس خفیہ ادارے کرتے تھے مگر اب ہر ملک کے جاسوس ادارے ایسا کرتے ہیں۔

کچھ دوائیں درگاہ پر استعمال کی جا رہی تھیں جو صرف سکون آور نہیں تھیں، انسان کی سوچ بدلنے کے لیے موثر تھیں۔ شاہینہ نے مجھ پر وہی دوائیں آزمائی تھیں۔ نورین کے عشق کا جن اتر گیا تھا اور میں شاہینہ کو چاہنے لگا تھا۔

دوسرے یا تیسرے دن شاہینہ رات کو آئی تو اکیلی نہیں تھی۔ ''امی تم سے کچھ کہنا چاہتی ہیں۔''

پیر سائیں کی زوجہ بھی چھپ کر مجھ سے ملنے آئی تھیں۔ وہ کچھ دیر میرے سامنے بیٹھ کے مجھے دیکھتی رہیں پھر بولیں۔ ''تم واقعی شاہینہ سے شادی کے خواہش مند ہو؟''

میں نے مودبانہ عرض کی۔ ''اس میں شک کی کون سی بات ہے؟''

''مجھے شک ہے کہ تم اس کی جائداد کے لیے...''

میں نے ان کی بات کاٹ دی۔ ''آپ کا شک غلط نہیں۔ یقیناً ایسے بہت ہوں گے۔''

''ہاں، بہت ہیں اس کے خواہش مند۔ سب لالچی... انور تک ان میں شامل ہو گیا لیکن تم مجھے ایسے نہیں لگتے۔ یہ شاہینہ بھی کہتی ہے۔''

''وہ ٹھیک کہتی ہے۔ آپ کہیں تو میں قانونی کچے کاغذ پر عدالت میں حاضر ہو کے بیان دے سکتا ہوں کہ شاہینہ مجھے مل جائے تو میں انور کے حق میں تمام جائداد سے دستبردار ہونے کے لیے تیار ہوں۔ میں اسے لے کے چلا جاؤں گا کہیں۔''

اس وقت اندر کی خوشی اور جذبات کی جو چمک مجھے شاہینہ کی مسکراہٹ اور اس کے چہرے کی لالی میں نظر آئی وہ ناقابلِ بیان ہے۔ وہ ماں کے ساتھ بیٹھی مجھے پلک جھپکے بغیر دیکھتی رہی۔

''بہت دکھ اٹھائے ہیں اس نے۔ بڑی ذلت برداشت کی ہے۔ یہ سچ مچ بہت چاہتی ہے تمہیں۔ اس کی قدر کرنا۔ یہ تمہارے گھر کو جنت بنا دے گی۔'' وہ رونے لگیں۔

میں نے کہا۔ ''آپ مطمئن رہیں۔ شاہینہ اور میں بہت خوش رہیں گے۔''

''باپ نے تو دوسری کو بھی خاندان کی روایات پر قربان کر دیا تھا۔ اچھا کیا جو وہ چلی گئی۔ مر مر کے جینے سے تو اچھا تھا کہ ایک بار مر جاتی۔ دن رات خدا سے دعا کرتی ہوں وہ جہاں رہے خوش رہے اور محفوظ رہے۔ اب تو میرا سب کچھ تم ہو اور شاہینہ۔ شاید اس عمر میں خدا نے ایک بیٹا دے دیا ہے۔ باپ تو کہتا ہے کہ وہ مر گیا مگر میرا بیٹا زندہ ہوگا۔

میرا دل کہتا ہے کہ وہ زندہ ہوگا اور کسی دن لوٹ کے ماں سے ملنے ضرور آئے گا۔ ابھی تک مجھے حسرت ہی ہے کہ کوئی مجھے نانی دادی کہے۔ میں بہت بدنصیب عورت ہوں۔ مرد کا بس ایک حقیقی خدا ہوتا ہے۔ عورت مجازی خدا کا حکم ماننے کی پابند بھی ہے۔ اس عمر میں وہ سوت لا رہا تھا مجھ پر... میرا شوہر جس کی میں نے دن رات خدمت کی۔''

اب شاہینہ نے ماں کو سنبھالا۔ انہیں پانی پلایا اور کہا۔ ''بس اب چلیں۔''

انہوں نے میرا ہاتھ پکڑ لیا۔ ''وعدہ کرو، شاہینہ کو چھوڑ دو گے نہیں، کبھی نہیں۔''

اس سے پہلے کہ میں زبانی وعدہ کرتا انہوں نے قرآن مجید کا چھوٹا سا نسخہ نکال کے مجھے تھما دیا۔ انکار کیا یا تذبذب کی گنجائش کہاں رہ گئی تھی۔ میں نے حلف اٹھا کے وہی الفاظ دہرا دیے جو وہ مجھ سے سننا چاہتی تھیں۔ انہوں نے سکون کی گہری سانس لی اور میرے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے زیرِ لب کچھ پڑھتی رہیں۔ پھر میرے چہرے پر پھونک مار کے انہوں نے واپس دروازے کا رخ کیا۔

ان چند سیکنڈ میں جو شاہینہ کو ملے اس نے میری آنکھوں کا سوال پڑھ لیا اور انکار میں سر ہلا کے مسکرائی۔ ''اب شبِ عروسی سے پہلے نہیں ملوں گی۔'' وہ شوخ سرگوشی میں بولی اور ماں کے پیچھے نکل گئی۔

میں رات بھر جاگتا اور سوچتا رہا کہ جو کچھ میرے ساتھ کسی خواہش یا ارادے کے بغیر ہو رہا ہے وہ خدا کی مرضی نہیں تو پھر کیا ہے؟ کہاں وہ لاوارث مفلس جو سکھر جیل میں زندگی کی آخری گھڑیاں گن رہا تھا اور کہاں میں جو اب کروڑوں کی جائداد کا مالک بننے والا ہوں اور انتہائی حسین عورت کا شوہر۔ اب مجھے نادر شاہ سے انتقام لینے کی خواہش بھی پاگل پن لگی اور نورین کا خیال ایک دیوانگی محسوس ہوا۔ حقائق کہیں زیادہ پرکشش تھے اور اپنی خوش قسمتی کی دلیل۔

میں اپنی آنے والی زندگی کے خوش آئند تصورات میں اتنا گم تھا کہ مجھے وقت کے گزرنے کا احساس تک نہ تھا پھر جیسے ہیروشیما پر ایٹم بم گرا۔ فائر کی پہلی آواز پر میں اچھل پڑا۔ شاید کسی محافظ نے فائر کیا ہوگا۔ میں نے سوچا۔ شک کی بنا پر یا کسی خطرے کو دیکھ کر۔ اسی وقت دوسرا دھماکا ہوا پھر تیسرا۔ اس کے بعد تو جیسے جنگ عظیم چھڑ گئی۔ ہر طرف ہر سمت میں دھماکے ہونے لگے اور لوگوں کی چیخ و پکار نے رات کے سکوت کو درہم برہم کر دیا۔

میں نے دروازہ کھول کے باہر جھانکا تو شورِ قیامت

میں اضافہ ہو گیا۔ لگتا تھا دو فوجیں ایک دوسرے کے خلاف صف آرا ہیں۔ میں سیدھا شاہینہ کے کمرے کی طرف گیا۔ برآمدے میں کچھ لوگ دوڑ رہے تھے۔ دو افراد تو میں اس کے کمرے کے سامنے مرے پڑے تھے۔ گولیاں نہ جانے کس کس طرف سے آرہی تھیں۔ حملہ آور نہ جانے کون لوگ تھے۔ پیر اذہن مراد کے باپ کی طرف گیا مگر اسے حملہ کر کے اتنی قتل و غارت گری مچانے کی کیا ضرورت تھی۔ وہ ایک نہتے وار تھا۔

نہ جانے کہاں سے کسی نے چلاّ کے کہا۔ ”ڈاکو۔۔۔!“ پھر وہی آواز ایک چیخ میں بدل گئی۔

میں نے شاہینہ کے دروازے پر دستک دی مگر وہ کھلا ہوا تھا اور اندر اندھیرا تھا۔ میں نے اسے آواز دی اور اس کے ساتھ ہی میرا ہاتھ بے اختیار سوئچ بورڈ کی طرف گیا۔ لائٹ نہیں جلی۔ ڈاکوؤں نے لائن کاٹ دی تھی۔

اس کے ساتھ ہی شاہینہ کی خوف سے لرزتی آواز آئی۔ ”میں یہاں ہوں۔“

میں نے اسے جھک کر بیڈ کے نیچے سے نکالا۔ ”آؤ میرے ساتھ۔“

”باہر ڈاکو ہیں۔ تم بھی چھپ جاؤ یہاں۔“ اس نے کہا۔

”پاگل مت بنو۔ وہ ہمیں تلاش کر لیں گے۔ چلو ہم بھاگ جاتے ہیں کسی راستے سے۔۔۔ آؤ۔“

وہ میرے کھینچنے سے نکل تو کانپ رہی تھی۔ میں نے کھلے دروازے سے دیکھا۔ سامنے کی طرف آگ بھڑک اٹھی۔ دو افراد مخالف سمتوں میں دوڑتے ہوئے فائر کر رہے تھے اور آگ لگا رہے تھے۔ ان کے ہاتھ میں جلتی ہوئی مشعل تھی۔ میں شاہینہ کا ہاتھ تھامے باہر نکلا تو اس نے مجھے دوسری طرف کھینچا۔ ”ہم ادھر سے نکل سکتے ہیں کچن میں سے۔“

فائرنگ اور دھماکے اب بھی جاری تھے۔ باہر دھواں ہم بھر رہی تھی جیسے کوئی دیوار توڑ رہا ہو۔ میں اس کے ساتھ اندھیرے میں دوڑتا رہا۔ ہم کچن کی ایک کھڑکی سے باہر کودے۔ آگے گلی تھی۔ میں نے جست لگا کے آٹھ فٹ اونچی دیوار کا کنارا پکڑا اور اوپر چڑھ گیا۔ پھر میں نے اپنا ہاتھ بڑھا کے شاہینہ کا ہاتھ پکڑا۔ وہ ایک جھٹکے میں اوپر آگئی۔ میں باہر کی طرف کودا ہی تھا کہ شاہینہ کی چیخ فائر کے ساتھ سنائی دی۔ میں نے دیکھا تو وہ دیوار پر نہیں تھی۔ وہ واپس نیچے گر گئی تھی۔ میں پھر دیوار پر چڑھا۔ ”شاہینہ!“ میں نے چلاّ کے کہا۔

دوسری طرف سے منہ پر سیاہ نقاب ڈالے کوئی شخص دوڑتا آرہا تھا۔ اس کے ایک ہاتھ میں ریوالور تھا۔ دوسرے میں بھڑکتی مشعل تھی۔ اس کی روشنی میں صرف ایک لمحے کے لیے میری نگاہ نے شاہینہ کے جسم کو موت کے کرب میں پھڑکتا دیکھا۔ یہ اس کا اپنا لہو تھا جس میں وہ تڑپ رہی تھی۔ خون اس کی پیشانی کے سوراخ سے ابل رہا تھا۔ مشعل بردار ڈاکو نے میرا نشانہ لیا اور چلاّ کے کہا۔ ”بھاگنے نہ پائے۔“

اس کے ساتھ ہی گولی کا دھماکا ہوا اور میں باہر گر گیا۔ لیکن گولی مجھے لگی نہیں تھی۔ ابھی میں اٹھ ہی رہا تھا کہ سب سے بڑا دھماکا ہوا جس سے زمین لرز گئی۔ میں نے درگاہ کے آخری حصے کو گنبد سمیت مسمار ہوتا دیکھا۔ گرد اور دھوئیں کا ایک بادل سا اٹھا مگر اس کے بعد اچانک خاموشی چھا گئی۔ یوں جیسے آخری دھماکے کے ساتھ ہی جنگ ختم ہو گئی۔ آگ کے شعلے ابھی تک جگہ جگہ دکھائی دے رہے تھے۔

مجھے سمت کا اندازہ تھا نہ یہ ہوش تھا کہ میں کہاں جا رہا ہوں۔ میرے تصور میں شاہینہ تھی۔ خاک و خون میں غلطاں۔ دم توڑتی ہوئی۔ معلوم نہیں اس نے میری آخری پکار سنی یا نہیں۔ مجھے دیکھا یا نہیں۔ میں نے آموں کے مختصر سے باغ میں سے نکل کر بھاگتے ہوئے سوچا۔ یہ کون لوگ تھے جنہوں نے درگاہ کو تباہ کر دیا۔ کسی کو زندہ نہیں چھوڑا۔ اس بھرپور حملے سے پیر سائیں یا ان کی بیوی کا بچ نکلنا ناممکن لگتا تھا۔ درگاہ پر موجود محافظ اور مرید بھی مسلح تھے لیکن ڈاکو زیادہ تیاری کے ساتھ آئے تھے اور تعداد میں زیادہ تھے۔

اچانک میں نے ایک گاڑی کے اسٹارٹ ہونے کی آواز سنی۔ یہ ڈیزل انجن کی آواز تھی۔ پھر ویسی ہی دوسری گاڑی اسٹارٹ ہوئی۔ نہ جانے کس نے چلاّ کے کہا۔ ”کوئی رہ گیا؟“

جواب تو میں نے نہیں سنا لیکن اس آواز نے میرے ذہن کو جھنجوڑ کے رکھ دیا۔ اتنا عرصہ گزر جانے کے بعد بھی یہ آواز میری یادداشت میں محفوظ تھی۔ میں نے ایک دوڑ لگائی اور چلاّیا۔ ”استاد گامار ستم۔“

پہلی گاڑی جو ابھی چند فٹ ہی چلی تھی رک گئی۔ اس کے پیچھے چار گاڑیاں اور تھیں۔ وہ سب ٹویوٹا کی پائی تھیں۔ صرف ایک ڈبل کیبن تھی جو دوسرے نمبر پر تھی۔ اس میں سے کسی دوسرے افراد ”کون ہے؟ رک جاؤ یہیں۔“ میں نے رستم کی آواز پہچانی۔

''استاد! میں ہوں۔ فرید الدین... سکھر جیل والا۔''
میں نے چلا کے کہا۔

استاد آہستہ آہستہ آگے آیا۔ میرے پیچھے درگاہ کا الاؤ بھڑک رہا تھا۔ اس کی روشنی میں استاد کا چہرہ نمایاں ہوا۔ یہ حقیقت ہے کہ وہ میرے سامنے آتا تو میں اسے پہچاننے میں ناکام رہتا لیکن اس کی آواز وہی تھی۔ استاد کے ساتھ دائیں بائیں دو افراد ڈھاٹے باندھے چل رہے تھے۔ ان کی بندوقوں کا رخ میری طرف تھا۔

استاد گامارستم مجھ سے چار قدم دور ٹھہر گیا۔ ''تو فرید الدین ہے؟''

اس کے ساتھ آنے والے دونوں ڈاکو میرے دائیں بائیں ہو گئے۔ انہوں نے مجھے تیسری گاڑی میں چڑھا کے میری آنکھوں پر پٹی باندھ دی۔ گاڑی کا انجن غرایا اور گاڑی ایک جھٹکے سے آگے بڑھی۔ میرے دائیں بائیں وہی دونوں موت کے فرشتے موجود تھے اور گاڑی نہ جانے کہاں جا رہی تھی۔ گاڑی پرانی تھی اور خراب راستے پر ہچکولوں نے میرا حال خراب کر دیا تھا۔ لیکن مجھے کسی بات کا ہوش نہ تھا۔ میرے کانوں میں شاہینہ کی آخری چیخ گونج رہی تھی۔ میری نظر اب بھی اسے موت کے عذاب میں پھڑ پھڑاتا دیکھ رہی تھی۔ اس کا وہ حسن بے مثال ایک عبرت کی تصویر بن گیا تھا۔ پھر مجھے اس کی ماں کی آواز سنائی دینے لگی۔ وعدہ کرو اسے کبھی نہیں چھوڑو گے اور خدا کی مقدس کتاب پر حلف اٹھا کر وعدہ کرنے کے باوجود میں اسے اکیلا چھوڑ آیا تھا۔

گاڑی ایک دم رکی۔ ''چلو اترو۔'' کسی نے کہا اور مجھے دھکیلا۔ باہر اب صبح کا اجالا تھا۔

میری پٹی کھولی گئی تو میں ایک کمرے میں تھا جس میں دو چارپائیاں بچھی ہوئی تھیں اور دونوں پر ایک ایک تکیے کے سوا کچھ نہ تھا۔ میں ایک پر بیٹھ گیا۔ ''استاد گامارستم کہاں ہے؟'' میں نے کہا۔

''آ جائے گا وہ بھی تم آرام کرو۔'' ایک نے نرمی سے کہا۔

''استاد کہاں ہے؟'' میں نے خفگی سے کہا۔ ''مجھے فوراً اس سے ملنا ہے۔''

مجھے ساتھ لانے والے کا رویہ میری خفگی کے باوجود خراب نہیں ہوا۔ ''ابھی ہم کیا بتائیں کہ وہ کہاں ہے۔ کچھ دیر میں معلوم ہو جائے گا۔ کسی چیز کی ضرورت ہے تو ہمیں بتاؤ۔''

''استاد گامارستم ساتھ ہی تھا۔'' میں نے بے بسی سے کہا۔

''ہاں، لیکن ہم سب الگ ہو گئے تھے۔ یہ میرا گھر ہے۔ فکر کی کوئی بات نہیں۔ یہاں تم بالکل محفوظ ہو، میں آتا ہوں۔''

یہ کسی نچلے متوسط طبقے کی آبادی تھی یا کوئی گاؤں تھا جہاں عام گھر ایسے ہی ہوں گے۔ باہر سے کوئی آواز نہیں آ رہی تھی۔ نہ کسی گاڑی یا موٹر سائیکل کی، نہ انسانوں کی اور نہ وہ آوازیں جو صبح ہر گھر سے سنائی دیتی ہیں۔ میرا دماغ صدمے سے ماؤف تھا۔ ابھی تک میرے تصور میں دھماکے گونج رہے تھے اور مٹی کے تیل سے جلنے والے شعلوں کے دھوئیں کی بو تھی۔ آگ لگانے والوں نے پیر سائیں کے آستانے کو شاید بم یا بارود سے اڑایا تھا جو اس کی نچلی منزل پر رکھا گیا ہوگا۔ اس عمارت کے منہدم ہونے کی گڑگڑاہٹ میرے کانوں میں تھی۔ ڈاکو پوری تیاری سے آئے تھے۔ ان کو معلوم تھا کہ عمارت کو کیسے ملبے کے ڈھیر میں بدلنا ہے۔ وہ صرف لوٹ مار کرنے نہیں آئے تھے۔ مال غنیمت ان کا حق محنت تھا۔ وہ عمارت کو ملبے کا ڈھیر نہ بناتے تب بھی لے جاتے لیکن انہوں نے ایک جعلی پیر کو اس کے محافظوں سمیت مار دیا تھا۔ اس کی لوٹ مار، تشدد اور عصمت دری کے اڈے کو تباہ کر دیا تھا۔

عام حالات میں مجھے ایسی کوئی خبر ذہنی پریشانی میں مبتلا نہ کرتی۔ لیکن ایک سال میں میرا اس گھر کے لوگوں سے ذاتی تعلق تھا اور کم سے کم دو افراد میرے نزدیک اس سزا کے مستحق نہ تھے جو درحقیقت پیر سائیں کے اعمال کی سزا تھی۔ ایک اس کی بیوی اور دوسری اس کی وہ بیٹی جس نے بڑی ہمت، ذہانت اور سخت حالات کا مقابلہ کر کے اپنے مستقبل کے لیے خوشی خریدی تھی۔ قسمت کی خرابی دیکھیے ٹوٹی کہاں کمند، دو چار ہاتھ جبکہ لبِ بام رہ گیا۔

ایک دیہاتی انداز کی ماڈرن عورت اندر آئی جس کی عمر تیس کے قریب تھی۔ اس کے ہاتھ میں ایک چنگیر تھی اور ایک تھالی۔ چنگیر سے گرم گرم پراٹھے کی خوشبو اٹھ رہی تھی اور تھالی میں خالص مکھن کے ساتھ اچار تھا۔

اس کا شوہر اندر آیا۔ اس نے اب ہاتھ اور منہ دھو کے کپڑے بدل لیے تھے اور کہیں سے بھی ایک ڈاکو نہیں لگ رہا تھا۔ ''لو جی آپ نے شروع نہیں کیا ابھی تک؟''

میں نے کہا۔ ''مجھے صرف چائے چاہیے۔ ابھی بھوک نہیں ہے۔''

''ہائے میں مر گئی۔'' عورت نے بڑی ادا سے جنے

پر ہاتھ رکھ کے کہا اور پلٹ کے بھاگی۔ ''چائے رکھی تھی چولھے پر۔''

اس کے شوہر نے کہا۔ ''دو نوالے کھا کے دیکھو جی۔ بھوک لگے گی۔ چلو جی بسم اللہ کرو۔''

میں نے اس کے اصرار سے مجبور ہو کے ایک نوالہ توڑا۔ ''تمہارا نام کیا ہے؟''

''رفیق۔'' وہ بولا۔ ''آپ کیسے جانتے ہو استاد کو؟''

''ہم پہلے ایک ساتھ تھے سکھر جیل میں۔'' میں نے کہا۔

وہ حیران ہوا۔ ''تو کیا آپ بھی... مگر آپ صورت سے شریف آدمی لگتے ہو۔''

''وہ تو تم بھی لگتے ہو۔''

وہ ہنس پڑا۔ ''یہ میری گھر والی ہے کلثوم۔'' اسے ہاتھ پکڑ کے کھینچا اور اپنے ساتھ بٹھا لیا۔

''کون سی جگہ ہے؟'' میں نے کہا۔ ''اور استاد کہاں ہے اس وقت؟''

''دیکھو جی، ساری باتیں آپ اسی سے پوچھنا، میں نہیں بتا سکتا۔ یہ جگہ رحیم یار خان کے نزدیک ہے۔ ایک چھوٹا سا گاؤں ہے۔ سڑک یہاں سے بے کوئی دو ڈھائی کلو میٹر دور۔ ہر کارروائی کے بعد میں یہاں آ جاتا ہوں اور پھر جب تک بلاوا نہ آئے کچھ نہیں کرتا۔ بس عیش کرتا ہوں کلثوم کے ساتھ۔'' اس نے کلثوم کے چٹکی لی۔

اس نے چیخ ماری۔ ''بے شرم بے محل وقت ہو۔'' اور اٹھ کے چلی گئی۔

''یہ بڑی محفوظ جگہ ہے۔ وہ ڈھائی سو گھر ہوں گے۔ اس کا باپ یہاں کی مسجد میں پیش امام ہے۔''

''اسے معلوم ہے کہ تم کیا کرتے ہو؟''

اس نے اقرار میں سر ہلایا۔ ''کیا کرتا ہوں؟ ادھر زمین ہے اپنی۔ شادی کے بعد خریدی ہے۔ اس میں ہل چلاتا ہوں، فصل اگاتا ہوں۔''

اس سے پوچھنا لاحاصل تھا کہ اس نے ڈاکے ڈالنے کب اور کیوں شروع کیے تھے۔ ایک کہانی سب کے پاس ہوتی ہے سنانے کے لیے۔ سچ جھوٹ کا مکسچر۔ میں نے یہ پوچھنے سے بھی گریز کیا کہ فصل کی آمدنی کافی ہوتی تو وہ ڈاکے کیوں ڈالتا۔

ابھی تک اس نے حلیہ اور لباس بدلا نہیں تھا۔ اس کے الجھے ہوئے گھنگریالے بالوں میں گرد تھی اور چہرے پر

گھن۔ اس کا لباس بھی ویسا ہی تھا بس اس نے منہ چھپانے والا ڈھاٹا اتار دیا تھا۔ اس نے عقیدت مندی سے دونوں ہاتھوں سے میرا ہاتھ تھاما اور بولا۔ ''جناب فریدالدین صاحب! آپ کو استاد نے یاد کیا ہے۔''

میں جواب دیے بغیر اس کے ساتھ چل پڑا۔ میں نے رفیق اور اس کی جنتی بیوی کو خدا حافظ کہنے کی زحمت بھی نہیں کی۔ میں یہاں اپنی مرضی سے نہیں آیا تھا اور زندگی سے سخت بیزار تھا۔ اب میری نظر میں اس جگہ کے مناظر گھوم رہے تھے جہاں سب کچھ تباہ و برباد ہو گیا تھا۔

اب وہاں کیا ہو گا ملبے کا ڈھیر جس سے دھواں اٹھ رہا ہو گا۔ اردگرد کے دیہات سے آنے والے سیکڑوں عقیدت مند سینہ کوبی کر رہے ہوں گے اور پولیس نے علاقے کو گھیرے میں لے کے تفتیش شروع کر دی ہو گی۔ میں نے اس گاڑی میں بیٹھنے کے بعد سوچا جو بطور خاص مجھے لینے آئی تھی۔ یہ نئے ماڈل کی کرولا تھی۔ ایئرکنڈیشنڈ اور سیاہ شیشوں والی۔ باہر کے مناظر سائے کی طرح لگتے تھے۔ میں غور ہی نہیں کر رہا تھا کہ مجھے کہاں لے جایا جا رہا ہے۔

ایک گھنٹے بعد گاڑی کسی شہر کے مضافات سے گزری جہاں کسی نئی آبادی کے خدوخال تشکیل پا رہے تھے اور جدید طرز کی کوٹھیاں تعمیر ہو رہی تھیں۔ استاد گامارستم کی شاہانہ رہائش ایسی ہی کسی جگہ ہو سکتی تھی۔ میرا خیال اس وقت درست ثابت ہوا جب کار ایک گیٹ کے سامنے رکی اور گیٹ ازخود کھل گیا۔ کار کے اندر جاتے ہی دونوں پٹ پھر مل گئے۔ ظاہر ہے یہ خودکار نظام تھا جو سیکیورٹی کیمروں کی مدد سے کنٹرول ہو رہا تھا۔

استاد خود باہر موجود تھا۔ اس نے کار سے اترتے ہی مجھے جھپٹ کر گلے لگا لیا۔ ''اوئے فرید! تو زندہ ہے۔ قسم اللہ کی بہت خیال آتا تھا تیرا۔''

میں نے کہا۔ ''بس استاد، اللہ کا حکم نہیں ہوا، پہلے پھانسی چڑھنے سے بچ گیا۔ اور کل بھی...''

وہ مجھے کھینچ کے اندر لے گیا۔ ''مجھے تو یقین نہیں آیا پہلے، جب تو نے میرا نام لے کر کہا کہ میں فریدالدین ہوں سکھر جیل والا۔''

''میرے لیے بھی یقین کرنا مشکل تھا۔ اتنے لوگ مارے گئے میں پھر بچ گیا۔''

اس نے مجھے ایک شاندار طریقے پر آراستہ ڈرائنگ روم کے صوفے پر دھکیل دیا اور خود میرے ساتھ بیٹھ گیا۔ ''قسم اللہ کی میرے سامنے آتا تو مارا جاتا۔ اس حلیے میں تجھے پہچاننا مشکل تھا۔ بس آواز تیری تھی۔''

''میں نے بھی آواز سن لی تھی تمہاری۔''

''اب تک پکڑے جانے سے ڈرتا ہے۔ یہ کیا حلیہ بنائے پھر رہا ہے۔ صحت بھی خراب ہو رہی ہے تیری۔ کیا کرتا رہا اتنے دن؟''

میں نے کہا۔ ''ایک ساتھ اتنے سوال۔ بتاؤں گا سب بتاؤں گا۔''

''ہاں، ہاں، ہم تو عادی ہیں مگر تو ابھی تک ڈرا ہوا ہے۔'' اس نے ہنس کے میری پیٹھ پر دھپ مارا۔ ''اوئے بےغم ہو جا موج کر۔''

''بےغم کیسے ہو جاؤں استاد! یہ سب کیوں کیا تم نے؟''

''اسے کیا تو جانتا نہیں؟''

میں نے کہا۔ ''جانتا ہوں استاد، سب جانتا ہوں مگر یہ صرف ڈاکا تو نہیں تھا۔ اتنا قتل و خونریزی، تباہی اور بربادی، یہ سب کس لیے؟''

''دیکھ فرید! وہاں بہت اسلحہ تھا اور محافظ تھے۔ ان کو نہ مارتے تو وہ ہمیں مار دیتے۔''

''وہ ٹھیک ہے لیکن اندر عورتیں تھیں۔''

''اب یہ تو ہوتا ہے فرید، گیہوں کے ساتھ گھن بھی پس جاتے ہیں۔ بم گرے یا زلزلہ آئے، معصوم بچے، عورتیں مرتے ہیں کہ نہیں؟''

میں نے کہا۔ ''نہیں استاد! تم چھپا رہے ہو مجھ سے۔ تم نے اس آستانے کو اڑا دیا۔ اس کو ملبے کا ڈھیر بنا دیا۔ ڈائنامائٹ لگا کے یا بارود سے۔''

وہ کچھ دیر بعد بولا۔ ''ہاں، یہ کرنا پڑا۔''

''کیوں کرنا پڑا؟'' میں نے کہا۔ ''یہی تو جاننا چاہتا ہوں میں۔''

''ہم سے کہا گیا تھا۔ تو وہاں کیا کر رہا تھا۔ کب سے تھا؟ پڑھا لکھا آدمی ہے تو۔''

میں نے کہا۔ ''میں ایک سال سے وہاں تھا۔ لمبی کہانی ہے پھر سناؤں گا۔ ایک عورت کو کسی نے گولی مار دی۔ وہ میرے ساتھ فرار ہو رہی تھی۔''

''کون تھی وہ عورت؟ تیری بیوی؟'' اس نے مجھے غور سے دیکھا۔

''بیوی ابھی نہیں بنی تھی۔ بن جاتی اگر وہ زندہ رہتی۔''

''اوہ! تو محبت کرتا تھا اس سے۔ پھر تو بڑی زیادتی ہو

گئی تیرے ساتھ۔" وہ سنجیدہ ہو گیا۔ "اسے وہاں کیوں لے گیا تھا؟ اولاد کے لیے پیر کی قدم بوسی کے لیے شادی سے پہلے ہی۔"

"استاد! اسی پیر کی بڑی بیٹی تھی وہ اور میں محبت نہیں کرتا تھا اس سے مگر وہ بہت محبت کرتی تھی مجھ سے۔ اتنی کہ میرے ساتھ مر گئی۔ مجھے بہت دکھ ہے اس کے مرنے کا۔ تم نہیں سمجھ سکتے۔"

اس نے شفقت سے میرے کندھے پر ہاتھ رکھا۔ "یار! مجھے افسوس ہے لیکن مجھے کیا پتا تھا۔ میں کبھی سوچ سکتا تھا کہ تجھ سے پھر وہاں ملنا ہوگا۔ یہ سب مقدر کے کھیل ہیں فرید۔"

میں نے کچھ دیر بعد کہا۔ "یہ گھر تمہارا ہے؟"

اس نے اقرار میں سر ہلایا۔ "لیکن یہاں پاس پڑوس کے لوگ مجھے اس نام سے نہیں جانتے جس نام سے تو جانتا ہے۔"

میں نے سمجھنے کے انداز میں سر ہلایا۔ "میں نے بھی کئی بار نام اور حلیہ بدلا۔ آج کل ملک سلیم اختر ہوں۔"

"یہاں لوگ مجھے بڑی عزت سے ملک غلام محمد کہتے ہیں۔ زیادہ عرصہ نہیں ہوا ہے مجھے یہاں آئے۔ تو نے دیکھا ہوگا کہ یہ نئی آبادی ہے۔ میں نے پہلا کام تو یہ کیا کہ یہاں ایک مسجد بنوا دی۔ اس کے لیے زمین ایک اور بندے نے دی تھی۔"

"تو بھی اپنے چھوٹے گناہوں کو بڑے ثواب کی مٹی ڈال کے دفن کرنا چاہتا ہوگا۔"

وہ ہنسا۔ "یہ دنیا ایسی ہی ہے جناب۔ وہ جو نیک نام ہیں یا کامیاب نظر آتے ہیں، جن کی عزت ہے یا کوئی حیثیت ہے، وہ سب رزق حلال سے اور سو فیصد ایمانداری کے راستے پر چلنے والے نہیں ہیں۔ دنیاداری اور دین داری میں اب مشرق اور مغرب کا فرق پڑ گیا ہے۔"

"یہ تو ہے۔" میں نے اس سے اتفاق کیا۔

"یہاں کے لوگ سمجھتے ہیں میں ٹھیکے دار ہوں۔ اب کون نہیں جانتا کہ ٹھیکے کیسے ملتے ہیں اور اس میں کمائی کیسے ہوتی ہے مگر بڑے بھولے اور بے خبر ہیں لوگ۔"

"یہاں اپنے ساتھیوں کے ساتھ رہتے ہو ملک صاحب؟"

"ابے پاگل ہوا ہے۔ میں بیوی بچوں والا آدمی ہوں اور بیٹا فرید! اپنے کچھ اصول ہیں جینے کے۔ ایک تو نے بھی دیکھا ہوگا کہ جس سے ملو اخلاق سے ملو۔ خواہ تم ضرورت مند ہو یا وہ۔ آدمی اخلاق سے دل جیت سکتا ہے غرور سے نہیں اور جس کا بھی کام کر سکتے ہو کر دو۔ پھر دیکھو تمہارے کام کیسے ہوتے ہیں۔"

میں اسے دیکھتا رہا۔ "تم تو فلسفی ہو استاد۔"

"ابے کہاں کا فلسفہ۔ ہم ان پڑھ لوگ ہیں مگر زندگی کا سبق پڑھا ہے۔ دوسری بات تیرے مطلب کی ہے اور بہت کام آئے گی۔ عورت کو خدا نے مرد کے لیے ہی بنایا ہے۔ استعمال کی جو چیز خرید سکتے ہو ضرور خریدو، مگر زبردستی کسی کی دکان سے اٹھاؤ نہیں۔ قیمت دو، طاقت سے۔ جو خود آ جائے اسے ٹھکراؤ نہیں۔ مگر زندگی ایک ہے تو شریک زندگی بھی ایک رکھو۔ آدمی دس بچوں سے ایک سی محبت کر سکتا ہے مگر دو عورتوں سے نہیں اپنی ساری محبت اور توجہ اسے دے دو۔ ایسے کہ وہ ناز کرے تم پر کہ میرا شوہر صرف میرا ہے۔ تو بیوی میری دس ایک ہے پندرہ سال سے۔ میرے چار بچوں کی ماں۔

"یہاں ابھی آیا ہوں بس سال بھر پہلے۔ اس سے پہلے اس کے باپ کا پرانا مکان تھا وہیں رہتی تھی۔ یہ جو تجھے لے کر آیا میرا خاص آدمی ہے۔ ڈرائیور بھی ہے، محافظ بھی۔ میری عدم موجودگی میں گھر کا خیال رکھتا ہے۔ بیٹوں کی طرح ہے میرے لیے۔ اچھا اب تو رات بھر کا تھکا ہوا ہے۔ نہا دھو کے کھانا کھا میرے ساتھ۔ پھر سو جا۔ مجھے جانا ہے۔ رات کو آؤں گا۔ میرے ساتھی انتظار میں ہوں گے۔ مال غنیمت تقسیم کرنا ہوگا۔" وہ ایک دم اٹھا اور اندر چلا گیا۔

استاد کچھ جلدی میں تھا۔ وہ دوپہر کا کھانا کھائے بغیر ہی چلا گیا اور کہہ گیا کہ تکلف کی ضرورت نہیں یہ تیرا اپنا گھر ہے۔ مجھے اپنائیت کا یہ احساس تھوڑی دیر بعد ہوا جب میں نہا دھو کر نکلا۔ میں ان کے کپڑوں میں فرار ہوا تھا۔ اس ایڈونچر میں دو کپڑے بے کار ہو گئے تھے۔ استاد ذرا بھاری بدن کا تھا لیکن مجبوری میں مجھے اسی کے کپڑوں میں گزارہ کرنا پڑا۔ کھانے کی میز سجی ڈرائنگ روم کے آخری حصے میں لگی ہوئی تھی۔ آرائش کے انداز سے کوئی مکین کے بارے میں اندازہ نہیں کر سکتا تھا کہ وہ تاجر ہے یا ودکریٹ یا ڈاکو۔ فرنیچر، پردے، قالین اور فانوس سب جدید تھے۔ سامان آرائش کا انتخاب بھی خوش ذوقی کا مظہر تھا۔

میں اس پر غور کر ہی رہا تھا کہ آخری دروازے سے ایک عورت اندر آئی۔ کسی تعارف کے بغیر میں نے جان لیا کہ وہ مسز غلام علی ہے۔ وہ پینتیس سال کی عمر میں پچیس کی نظر آتی تھی۔ دبلی پتلی اور نازک سی دراز قد عورت جس کے

ساڑھے پن میں بڑی کشش تھی۔ اس نے بڑی خوب صورتی سے ہلکے زرد رنگ کی ساڑی کو سنبھال رکھا تھا۔ استاد کی گھر والی کا جو نقشہ میں نے اپنے خیال میں قائم کیا تھا وہ اس سے بالکل مختلف تھی۔ اس کی تعلیم کہاں تک تھی یہ مجھے معلوم نہ تھا مگر اندازہ کیا جا سکتا تھا کہ وہ اچھے گھر کی تھی۔ دولت مند باپ کی بیٹی نہ ہوتی تو استاد کا گروہ ان کے گھر میں ڈاکا ڈالنے کیوں جاتا۔

میں نے اسے سلام کیا تو وہ مسکرائی۔ ”کیسے ہیں آپ بھائی صاحب! مجھے انہوں نے بتایا کہ لندن سے آتے ہوئے آپ کا سارا سامان کہیں اور چلا گیا۔“

میں نے چونکنے سے گریز کیا۔ ”جی، ہو جاتا ہے کبھی کبھی۔“

”یہ کپڑے آپ کے سائز کے مطابق نہیں۔ میں نے ان سے کہا تھا کہ ذرا محمود کو بازار سے ریڈی میڈ لانے کا کہہ دیں مگر انہوں نے کہا کہ ایک دن میرے کپڑے پہن لے گا تو آفت نہیں آجائے گی۔ یہ خود تو بے پروا ہیں لباس کے معاملے میں۔“

میں نے کہا۔ ”ایسی کوئی جلدی نہیں۔ آپ کا ذکر تو اکثر کرتا تھا وہ لیکن اب میں دیکھ رہا ہوں کہ وہ ٹھیک ہی کہتا تھا۔ اس گھر کو سجانے میں آپ ہی کا ذوق نظر آتا ہے۔“

وہ خوش ہوئی۔ ”انہیں تو کسی چیز کا شوق نہیں۔ باہر جاتے ہیں تو مجال ہے کچھ لے آئیں گھر کے لیے۔ سب میں ہی خریدتی پھرتی ہوں یہاں سے۔ کھانا لگوا دوں آپ کے لیے؟“

کھانا ایک ملازمہ نے لگایا اور وہ میرے ساتھ شریک ہوئی۔ اس کے اعتماد نے مجھے بے حد متاثر کیا۔ شاید ایسی ہی عورت استاد گو مار رستم کو بھی غلام بنا کے رکھ سکتی تھی۔ اس کی زندگی کا یہ تضاد حیران کن تھا۔ کہاں وہ خطرناک ڈاکوؤں کے گروہ کا سردار جو جیل کاٹ چکا تھا اور تختۂ دار تک پہنچ جاتا اگر ساتھی اسے چھڑا کے نہ لے جاتے۔ کہاں یہ طبقہ اشراف کی نظر آنے والی بیگم صاحب تا اپ شائستہ عورت... لیکن جوڑے آسمانوں پر بنتے ہیں۔ کسی رومانس کے مقابلے میں استاد کی کہانی کتنی مختلف اور عجیب تھی۔ اب اسے اور کیا کہا جائے گا کہ حوالات میں بند ڈاکو ایک خودکشی کرنے والی لڑکی پر مر مٹا اور اسپتال جا کر اس کے قدموں میں سر رکھ دیا۔

میرا دماغ انتشار کا شکار تھا۔ تصور میں بار بار وہی مناظر گھوم رہے تھے جو میں نے فرار کے وقت دیکھے تھے۔

اس میں میرا نقصان ہوا تھا تو دستے دار استاد نہیں تھا۔ وہ تو مجھے وہاں سے نکال لایا تھا ورنہ اس تمام تباہی و خونریزی کے بعد اگر میں بچ جاتا تو وہاں کیسے ٹھہرتا۔ مجھے ہر صورت اسی طرح فرار ہونا پڑتا ورنہ پولیس کے ہتھے چڑھ جاتا۔ سارا دکھ مجھے شاہینہ کا تھا۔ وہ شوہر کی قاتل تھی اور خطرناک حد تک ذہین تھی۔ بالکل اپنے باپ کی طرح... لیکن میرے لیے تو اس نے اپنا سب کچھ قربان کر دیا تھا۔ اپنی انا، اپنا غرور، اپنا حسن و شباب اور مجھے حاصل کرتے کرتے وہ خود نہ رہی تھی۔ صرف اس کا تصور رہ گیا تھا۔ ایک البم تھا جس میں اس کے ساتھ گزر جانے والے وقت کے ان گنت لمحوں کی جیتی جاگتی تصویریں تھیں۔ اب دل کو سمجھانے بنا چارہ نہ تھا کہ اپنا اپنا نوشتۂ تقدیر قبول کرنا پڑتا ہے۔ جو ہو رہا تھا اچھا تھا۔ جو نہ ہو سکا شاید اس میں بھی بہتری تھی۔

میں جاگا تو رات ہو چکی تھی۔ چھ گھنٹے کی نیند نے مجھے ذہنی و جسمانی طور پر تازہ دم کر دیا تھا۔ میں اس بیڈروم سے نکلا جو مجھے دے دیا گیا تھا تو استاد اور اس کی بیوی کے ہنسنے کی آواز آرہی تھی۔ میں ناک کر کے اندر چلا گیا۔

وہ دونوں صوفے پر بیٹھے شام کی چائے پی رہے تھے۔ ”آ بھئی، کچھ فرق پڑا سونے سے؟“

اس کی بیوی نے پوچھا۔ ”چائے پئیں گے آپ یا کافی؟“

”کافی نہیں پی عرصے سے۔“ میں نے کہا اور وہ اٹھ کے اندر چلی گئی۔

”میری بیوی بہت اچھی کافی بناتی ہے۔“ وہ بولا۔

”اور تم اسے بہت اچھا بے وقوف بناتے ہو۔ میں تو یہ سمجھنے سے قاصر ہوں کہ وہ تمہارے جھوٹ کو سچ کیسے مان لیتی ہے۔ ذہین اور سمجھدار عورت ہے۔“ میں نے کہا۔

”شاید اسی لیے مان لیتی ہے کہ... سمجھدار ہے۔ نہیں مانے گی تو کیا ہوگا؟ گھر خراب ہوگا۔ ہر وقت لڑائی جھگڑے سے۔ مرد تو سالا کتے کی دم ہوتا ہے۔ اسے عورت کیا سیدھا کرے گی۔ اچھا ہے اسے جیسا ہے جو ہے کی بنیاد پر قبول کرلے اور محبت میں یہی ہوتا ہے۔“

میں نے اسے غور سے دیکھا۔ ”یعنی تمہیں بھی شک ہے۔ وہی جو مجھے ہوا کہ حقیقت جانتی ہے وہ۔ مگر کیا کرے اگر یقین نہ کرے۔ اسے بدل تو نہیں سکتی۔“

اس نے موضوع بدل دیا۔ ”وہاں تو قیامت مچی ہوئی ہے۔ سیکڑوں لوگ آس پاس کے دیہات اور شہروں سے پہنچ گئے ہیں اور پولیس پر دباؤ ہے۔“

’’یہ کوئی عام رہزنی کی واردات نہیں تھی۔۔۔
’’پولیس جانتی ہے مگر وہ خود بھی یہ مشہور کر رہے ہیں کہ اس کے ذمے دار نامعلوم ہیں۔‘‘
’’اور جو مرے وہاں، ان کا کیا ہوا؟‘‘
’’کیا ہونا تھا۔ دوپہر تک لاشوں کا پوسٹ مارٹم ہو گیا جو ایک قانونی کارروائی تھی۔ مجھے ایک مخبر نے اطلاع دی ہے کہ پولیس لاشیں بھی نہیں لے گئی تھی۔ اسپتال سے رپورٹیں آ گئیں۔ عصر کے بعد وہیں نماز جنازہ ہوئی۔‘‘
’’کتنے تھے مرنے والے؟‘‘
’’سترہ۔۔۔ آٹھ عورتیں، نو مرد۔ ایک تو ہوگی پیر سائیں کی بیوی اور دوسری بیٹی۔‘‘
’’باقی ملازمائیں ہوں گی۔ تہ خانے میں خطرناک مریض بھی رکھے جاتے ہیں۔ ان کے جن سرکش ہوتے ہیں اور انہیں تشدد سے بھگانا پڑتا ہے بھوتنی دے کر۔‘‘
’’وہاں تو اتنا سونا چاندی تھا کہ میں سوچ نہیں سکتا تھا۔ گن گن، تقریباً دو سیر سونا اور پانچ سیر چاندی ہر ایک کو ملی۔ میرا حصہ ہمیشہ دگنا رکھا جاتا ہے۔‘‘
’’یعنی چار سیر سونا اور دس سیر چاندی۔۔۔ جس کے لیے تم نے سترہ بندے مار دیے۔‘‘
’’دیکھو فرید! ہمارا اصول ہے کہ مال کی خاطر جان مت لو۔ اس سے پہلے درجنوں وارداتوں میں دو یا تین بندے مرے تھے اپنی بے وقوفی سے۔ بہادر بننے کے چکر میں اور فرار ہو کے پولیس کو بلانے کے چکر میں۔ ورنہ لوگ مسلح بھی ہوں تو مزاحمت نہیں کرتے۔ مالک کی خاطر جان صرف بے وقوف دیتے ہیں۔ ہم محصور کر لیتے ہیں اور بتا دیتے ہیں کہ کسی کی جان لینا ہمارا مقصد نہیں۔‘‘
’’پھر یہاں کیا ہوا؟‘‘
’’بتایا تھا کہ یہاں مسلح محافظ رات بھر گشت کرتے تھے اور ان کے پاس خطرناک اسلحہ تھا۔ ان کو پہلے مارنا پڑا۔‘‘
میں نے کہا۔ ’’چلو ایک پیر سائیں کے علاوہ آٹھ محافظ تھے جو تم نے مار دیے۔ عورتوں سے تو کوئی خطرہ نہیں تھا اور آگ لگانا یا پیر سائیں کے آستانے کو دھماکے سے اڑا کر زمیں بوس کرنا۔ کیوں ضروری تھا؟‘‘
’’نہیں سمجھے گا فرید۔‘‘ وہ کچھ دیر بعد بولا۔
’’میں اتنا کم عقل ہوں میں، صاف کہو تم بتانا نہیں چاہتے۔ تمہاری کوئی ذاتی وجہ تھی۔‘‘
اس نے نفی میں سر ہلایا۔ ’’ذاتی وجہ کیا ہو سکتی ہے۔ انہیں کہا گیا تھا۔‘‘
میں نے بے چینی سے پوچھا۔ ’’کہا گیا تھا؟‘‘
’’ہاں، حکم تھا۔ ہم نہ مانتے تو کوئی اور یہ کام کرتا لیکن پھر ہم نہ رہتے۔ ایک ایک کر کے سب کو مار دیا جاتا۔ پولیس مقابلے میں یا جیسے مجھے مارا جا رہا تھا پھانسی دے کر۔‘‘
’’کس کی حکم عدولی کی تھی تم نے؟‘‘
وہ بولا۔ ’’ہیں فرید، جو ہم سے زیادہ طاقتور ہیں۔ اثر رسوخ رکھتے ہیں۔ ہم اور ہم جیسے بہت سے شریف زادگان اپنا دھندا جاری نہیں رکھ سکتے اگر ان کی سرپرستی نہ ہو۔ کچھ فیوڈل لارڈز ہیں۔ کچھ سیاسی وڈیرے جو پولیس کو ایسے استعمال کرتے ہیں جیسے شطرنج میں پیادے ہوتے ہیں۔‘‘
میں حیرانی سے ستارہا۔ ’’انہوں نے کیوں کہا تھا کہ آستانے کو مٹا دو؟‘‘
اس نے نفی میں سر ہلایا۔ ’’مجھے تو ایک مجھے دارنے بلا کے کہا تھا سکندر نام ہے اس کا۔‘‘
میں اچھل پڑا۔ ’’سکندر۔۔۔ مجھے وار سکندر نے کہا تھا۔ میں سمجھ گیا۔‘‘
’’کیا سمجھ گیا؟‘‘ استاد نے حیرانی سے پوچھا۔
’’وہ پیر سائیں کا دشمن نمبر ون تھا۔ سالا بھی تھا۔ جہاں یہ آستانہ ہے وہ پہلے ایک ہی شخص کی ساری زمین تھی۔ نہر کے ادھر بھی اور دوسری طرف بھی۔ اس کے دو بیٹے تھے۔ جب وہ مر گیا تو نہر کے ایک طرف کی زمین بڑے بھائی یعنی اس نے دبا لی۔ دوسری طرف کی زمین اس کے بھائی کو۔ بڑا پرو دھری کہلاتا تھا۔ ابھی کچھ دن قبل فوت ہوا ہے۔ چھوٹے کے گھر میں تھیں دو بیٹیاں۔۔۔ چودھری کے گھر میں دو بیٹے۔ چنانچہ آپس میں ان کے رشتے ہو گئے کہ اپنی زمین اپنے پاس رہے۔ بڑی بڑی لڑکی شاہینہ کا بڑے بھائی انور سے۔۔۔ روزینہ کا چھوٹے اکبر سے۔ لیکن انور نکل گیا ملک سے باہر پڑھنے کے بہانے اور سات سال بعد واپس آیا۔ اس نے شادی سے پہلے ہی انکار کر دیا تھا۔ نتیجہ یہ کہ بڑی بچی زبردستی بیاہ دی گئی چھوٹے کزن سے جس کا نام اکبر تھا۔ وہ عیاش اور بدچلن آدمی تھا۔ اس نے بیوی پر بڑا ظلم کیا۔ ایک تو یہ طعنہ تھا کہ جس سے تیری منگنی ہوئی تھی وہ تجھ پر تھوک کے بھاگ گیا اور تو میرے پلے باندھ دی گئی ٹھکرائی ہوئی عورت، دوسرے وہ بدقماش آدمی تھا۔ بالآخر بیوی نے ہی اسے قتل کر دیا۔‘‘
’’قتل کر دیا؟ شوہر کو؟‘‘
’’ہاں، اور کوئی طریقہ نہیں تھا اس کے پاس گلو خلاصی کا۔ ایک وجہ میں بھی بتا دوں، مجھ پر فریفتہ ہو گئی تھی۔‘‘

"وہی جو کل رات تیرے ساتھ فرار ہوتے ہوئے ماری گئی؟"

میں نے اقرار میں سر ہلایا۔ "اس کی چھوٹی بہن تھی روزینہ۔ اب اس کو بڑے بھائی کے پلے باندھنا ضروری ہو گیا جو سات سال تک باہر سے اعلیٰ تعلیم لے کر آیا تھا۔ مگر رہا وہی جدی پشتی وڈیرا ذہنی طور پر۔ روزینہ اسے زبردستی قبول کرنے پر تیار نہ تھی کیونکہ وہ بڑی بہن کا انجام دیکھ چکی تھی اور وہ سکندر کے بیٹے مراد سے محبت کرتی تھی۔"

استاد بھونچکا رہ گیا۔ "اسی سکندر کے بیٹے سے؟"

میں نے اقرار میں سر ہلایا۔ "یہ دشمنی کا چکر تھا استاد۔ سکندر نے پہلے رشتہ مانگا بیٹے کو۔ بہن کی بیٹی تھی لیکن بہنوئی نے انکار کر دیا۔ اس خیال سے کہ آدھی زمین نکل جائے گی۔ وہ انور کے سوا کسی کو قبول کر ہی نہیں سکتا تھا۔ سکندر نے بیٹے کی ضد پر کئی بار کوشش کی اور ذلت اٹھائی۔ سالے بہنوئی دشمن ہو گئے۔ مراد نے ایک بار روزینہ کو اغوا کر کے لے جانے کی کوشش کی۔ اس کے کچھ دوست تھے اور کچھ محافظ۔ مراد بچ گیا مگر ایک دوست کسی طرح اسپتال پہنچ کے مرا۔ اس نے اپنے قتل کا الزام پیر سائیں پر لگا دیا۔ یہ بیان مجسٹریٹ نے ریکارڈ کیا تھا اور قانون میں مرنے والے کے بیان کو سچ تسلیم کیا جاتا ہے۔"

"پھر... پیر گرفتار ہوا؟"

"کہاں استاد، اس نے ضمانت کرالی۔ مگر سکندر بہت چالاک ہے۔ اس نے بیٹے کو غائب کر رکھا اور نہ جانے کس کی لاش کو بیٹے کی لاش بنا کے خود پیر سائیں پر مراد کے قتل کا دوسرا مقدمہ بنا دیا۔ مراد کو روپوش کر دیا۔ پیر نے جوابی چال چلی۔ پچھلی تاریخ میں بیٹی کا نکاح نامہ بنوا کے سکندر کے الزام کو جھوٹا ثابت کر دیا۔ ایک ہفتہ پہلے نکاح کے بعد اس کی رخصتی ہو چکی تھی۔ دھوم دھام سے شادی اس لیے نہیں ہوئی تھی کہ میری بیٹی کا سسر بستر مرگ پر تھا اور یہ سچ ہے۔"

"بڑی عجیب کہانی ہے۔"

"آگے بھی سنو استاد۔ دوسری کوشش میں مراد اپنی محبوبہ روزینہ کو لے گیا۔ وہ خود فرار ہو گئی اس کے ساتھ اور اب سنا ہے وہ روپوش ہیں کہ پیر سائیں غیرت میں قتل نہ کرا دیں انہیں مگر درحقیقت ان کو سکندر نے چھپا رکھا ہے۔ تم بتاؤ کہ تمہیں سکندر نے کہا اور تم نے کہا کہ ٹھیک ہے۔ سترہ آدمی مار دیے۔"

"دیکھ فرید! بار بار مارنے کی بات نہ کر۔ ہم نے انہیں سامنے کھڑا کر کے گولی نہیں ماری۔ وہ مقابلے میں مارے گئے۔ ہم آس پاس چھپے ہوئے تھے۔ وہ سامنے تھے۔"

"اور باقی آٹھ؟"

"میرا خیال تھا کہ باقی نکل جائیں گے۔ پیر کو زندہ نہیں چھوڑنا تھا۔ عورتوں کا مجھے بھی پتا نہیں تھا۔ آگ لگانا ضروری تھا وہاں کیمرے لگے ہوئے تھے۔ وہ سب تباہ ہو گئے ہوں گے۔ پھر یہ کہ اسے ڈکیتی کی واردات نہیں بنایا جائے گا۔ یہ کہا گیا تھا ہم سے۔ پولیس کہے گی کہ مخالف لوگ تھے۔ نامعلوم افراد۔ آگے وہی تحقیقات اور تفتیشی افسر۔ ٹریبونل۔ نتیجہ بھی وہی صفر۔ کچھ عرصے بعد کسی کو واردات یاد بھی نہیں رہے گی۔ اخبارات میں اور ٹی وی پر مخالفین کا پروپیگنڈا ہوگا۔ سب مذمت کریں گے۔"

"سکندر کیا اوپر والوں کا آلۂ کار ہے؟"

"اس کے بغیر اتنا بڑا ٹھیکے دار کیسے بنتا۔ کسی کا ہاتھ تو ہوتا ہے سر پر۔"

"کوئی آدمی دشمنی میں اس انتہا تک جا سکتا ہے۔ سترہ آدمی مروا دیے سکندر نے۔"

"اسے کیا اندازہ ہوگا کہ سترہ مارے جائیں گے۔ وہ تو پیر کو ختم کرانا چاہتا تھا۔ وجہ اب معلوم ہو گئی۔ وہ اپنے بیٹے اور بہو کو محفوظ کرنا چاہتا تھا۔ انہیں کب تک چھپا کے رکھتا۔"

"اب تو کوئی بدلہ لینے والا بھی نہیں رہا۔" میں نے کہا۔ "مگر استاد آخر کب تک جاری رکھو گے تم اس لوٹ مار کے خطرناک کھیل کو۔ تمہارا دل نہیں بھرا۔ خزانے تو بھر گئے۔ تمہیں اپنی بیوی اور بچوں کا سوچنا چاہیے۔"

استاد کا چہرہ تاریک ہو گیا لیکن اس کے جواب سے پہلے نادرہ نے میز پر رات کا کھانا چن دیا تھا۔ اس کی بیوی کے بلانے پر ہم باتوں کو ادھورا چھوڑ کے اٹھ گئے۔ میرا خیال تھا کہ رات کو استاد سے پھر ملاقات ہوگی اس لیے میں کھانے پر ادھر ادھر کی باتیں کرتا رہا۔

میں نے کہا۔ "بھابی! بچے کہاں ہیں؟"

وہ بولی۔ "بچے ہیں ایبٹ آباد میں۔ برن ہال میں پڑھتے ہیں۔ ہوسٹل میں رہتے ہیں۔ سردی کی چھٹیاں ہوتی ہیں دسمبر جنوری میں تو آتے ہیں یا سال میں ایک بار ہم چلے جاتے ہیں۔ عام طور پر جون جولائی میں مری اور کاغان کا چکر بھی لگا لیتے ہیں۔"

"باقی سال آپ دونوں اکیلے رہتے ہو یہاں؟"

وہ ہنسا۔ "اسے دونوں اور اکیلے؟"

اس کی بیوی بولی۔ "کیا کریں بھائی، یہ نہیں مانتے

کہ کسی اور اسکول میں پڑھا لیں۔ مجھے تو یہ سب سے اچھا رہی ہے اور شاید غلط بھی نہیں۔ پہلے یہ بڑی تنگی میں تھا۔ تقسیم کے بعد یہاں قائم ہوا۔ تربیت اچھی ہوتی ہے وہاں۔ بچے بھی عادی ہو گئے ہیں۔"

میں نے استاد کی طرف دیکھا تو وہ سر جھکائے کھانے میں مصروف تھا۔ میں سمجھ گیا کہ اس نے بچوں کو گھر سے اور ماں سے کیوں دور رکھا ہے۔ اس طرح بچوں کو باپ کے دور رہنے کا زیادہ احساس نہیں ہوتا اور خود استاد ان کے ممکنہ سوالات سے بچا رہتا ہے۔ ہر دور کے بچے ماں باپ کی توقعات سے کہیں زیادہ ہوشیار ہوتے ہیں اور وہ سمجھ لیتے ہیں جو والدین کا خیال ہوتا ہے کہ وہ سمجھ ہی نہیں سکتے۔

رات کو اکیلے میں دوبارہ نئے زخموں کی ٹیس جاگ اٹھی۔ دن میں میرا تصور مجھے سرکاری اسپتال کا مردہ خانہ دکھاتا رہا جہاں شاہینہ کی سردا کڑی ہوئی لاش دوسری بہت سی لاشوں کے درمیان پڑی ہو گی۔ اب میں نے قبرستان کا منظر دیکھا جہاں وہ مٹی کے ایک ڈھیر کے بہت نیچے کفن اوڑھے سو رہی تھی۔ حشرات الارض کا رزق بننے اور خاک میں ملنے کے لیے۔ انسان کے خواب اسے کہاں لے جاتے ہیں اور قدر کہاں پہنچاتی ہے۔ زر، زن، زمین کا قولی تکمیل بالآخر ختم ہوا۔

ابھی میں سونے کا ارادہ ہی کر رہا تھا کہ استاد آ گیا۔

"جاگ رہا ہے فرید؟"

"تجھے بھی نیند نہیں آ رہی ہے؟"

"سونا چاہتا تھا، نیند نہیں آئی۔ اسے سوتا چھوڑ کے آ گیا۔" وہ میرے سامنے بیٹھ گیا۔ "چائے پیے گا؟"

"ضرور۔"

باہر بیٹھ کر چائے پیتے ہوئے اس نے وہی سوال کیا جس کی مجھے توقع تھی۔ "تو ان معاملات میں کیسے ملوث ہو گیا۔ اس وقت سے بتا جب میں نے تجھے چھوڑا تھا۔"

میں نے اسے بتایا کہ اس کی ہدایات کے مطابق میں آسیب زدہ حویلی میں چلا گیا۔ پھر وہاں نورین کیسے ملی۔ کیسے میں نے سلطان خان کی لاش دریافت کی۔ اس وقت سے لے کر نورین سے بچھڑنے تک۔ پھر مردان والی میں رستم کے ہاتھوں بچائے جانے سے چودھری اکبر کی حویلی میں پہنچنے سے اس رات تک کے سارے واقعات استاد کے گوش گزار کر دیے جب میں شاہینہ کو بچا کر نکالنے کی کوشش کر رہا تھا اور وہ ماری گئی تھی۔

ہمیں پتا ہی نہیں چلا اور صبح ہو گئی۔ کہیں قریب کی مسجد سے اذان کی آواز نے فضا کے سکوت کو توڑا تو ہمیں خیال آیا

کہ رات ساری گزر گئی ہے۔ ہم دیر سے سوئے تھے تو دیر سے اٹھے۔ میں پہلے جاگا اور گھڑی دیکھی تو دس بجے تھے۔ غسل کر کے باہر نکلا تو استاد کی بیوی لاؤنج میں ایک ملازمہ سے صفائی کروا رہی تھی۔

"آپ پہلے چائے پئیں گے پھر ناشتا کریں گے؟"

وہ بولی۔

میں نے کہا۔ "استاد گامارستم بھی جاگ جائے تو ناشتا اکٹھے کریں گے۔"

"گامارستم؟" وہ کچھ حیران ہوئی۔ "تم ملک صاحب کو اس نام سے پکارتے ہو، وہ تو دوپہر کے بعد اٹھیں گے۔"

استاد کا نام بے خیالی میں زبان پر آ گیا تھا۔ میں نے کہا۔ "بے خیالی میں منہ سے نکل گیا۔ دراصل اس کو پہلوان بننے کا بڑا شوق تھا۔ ہم مذاق کرتے تھے اس کے ساتھ۔"

"گر گاما بھی اور رستم بھی۔ اور اگر بے تکلف دوست ہو تو استاد کیوں کہتے ہو؟" وہ بظاہر میری طرف دیکھے بغیر بات کرتی رہی اور ملازمہ کو دیکھتی رہی کہ وہ حرام خوری تو نہیں کر رہی پھر میرا جواب سنے بغیر کچن کی طرف چلی گئی۔

"میں ناشتے کا کہہ دوں۔"

میں نے لاؤنج میں خاموش رکھے ٹی وی کو آن کر دیا۔ میں گزشتہ روز کی واردات کی خبر دیکھنا چاہتا تھا۔ میں نے سارے چینل دیکھے مگر مایوسی ہوئی۔ خبروں کے مجھے دو چینل ہی ملے۔ ایک امریکی سی این این اور دوسرا بی بی سی۔ ایسے بین الاقوامی چینل پاکستان میں ہونے والی ایک واردات کی کیا خبر دیتے۔ پی ٹی وی کے قومی خبرنامے میں بھی کچھ نہ تھا اس کی رپورٹ اخبار سے مل سکتی تھی۔

استاد کی بیوی پھر نمودار ہوئی۔ "آئیں ناشتا کر لیں۔"

میں نے ابھی نہیں کیا۔

میں نے پوچھا۔ "آپ کے گھر میں کون سا اخبار آتا ہے؟"

"کوئی سا بھی نہیں۔ کیا کرنا ہے اخبار پڑھ کے۔ وہی سیاست دانوں کے بیانات اور سرکاری تیج۔ سچ بات یہ ہے کہ مجھے دلچسپی نہیں۔ یہ بھی ہوں تو بازار سے آ جاتا ہے۔ پڑھنے پہ بھی نہیں۔"

میں نے کہا۔ "مجھے عادت ہے۔ یہاں اخبار کہاں سے ملے گا؟"

"میں ابھی بھیجتی ہوں ڈرائیور کو، جہاں سے بھی ملے گا لے آئے گا۔ آپ کب سے جانتے ہیں ملک صاحب کو؟"

میں اب جھوٹ بولنے کے لیے مستعد ہو گیا۔ "دس

بارہ سال سے۔"

"انہوں نے کبھی ذکر نہیں کیا آپ کا یا کسی بے تکلف دوست کا۔ آپ لوگوں کو دیکھا کہ ساری رات باتیں کرتے رہے۔"

"اچھا؟ آپ کو معلوم ہو گیا تھا؟"

وہ مسکرائی۔ "لگتا ہے شادی نہیں ہوئی ابھی تک آپ کی۔"

"بالکل صحیح اندازہ ہے آپ کا۔"

"آپ کے دوست اور آپ کی عمر میں کافی فرق ہے۔ ملک صاحب سے میری شادی کو پندرہ سال ہو گئے۔ آپ ابھی تک ایسے ہی پھر رہے ہیں؟"

میں نے کہا۔ "فرق تو ہے پر زیادہ نہیں۔ میں تیس کا ہوں۔"

"وہ پینتالیس کے۔ پندرہ سال کا... فرق کم ہوتا ہے؟ آپ لوگ کلاس فیلو تو ہو نہیں سکتے۔ کالج کی صورت انہوں نے دیکھی نہیں۔ آپ کے بارے میں بتا رہے تھے کہ ایم اے پاس ہیں۔"

"تھا سب پرائیویٹ کیا میں نے۔ دوستی میں عمر تو نہیں دیکھی جاتی۔ دراصل والدین بچپن میں فوت ہو گئے تھے۔ بڑے بھائی نے پالا۔ وہ بھی ایک حادثے میں مارے گئے تو پھر ملک صاحب نے میری بہت مدد کی تھی۔ میں بڑے بھائی کی جگہ سمجھتا ہوں انہیں۔"

"مجھے یہ سب انہوں نے نہیں بتایا۔ اور میرا خیال ہے کہ آپ کے سوا کوئی دوست میں نے دیکھا بھی نہیں۔ آتے ہیں ملنے والے پرانے محلے دار اور اب تھے۔ یا وہ جن کے ساتھ یہ کاروبار کرتے ہیں۔ کہتے ہیں کہ میں نے منع کر رکھا ہے اور ٹھیک بھی ہے۔ بزنس کی بات باہر۔ ویسے بہت سوشل ہیں لیکن دوستی ان کی کسی سے نہیں دیکھی میں نے جیسی آپ سے ہے۔ آپ نے شادی کیوں نہیں کی؟"

میں ہنس پڑا۔ "اتنی دیر تو نہیں ہوئی ابھی۔ آپ تو اتنی پریشان ہیں جیسے مائیں ہوتی ہیں۔ کیا کوئی لڑکی ہے نظر میں؟"

"نہیں، یہ بات نہیں۔ میں نے سوچا کہ اس کی وجہ کوئی لڑکی تو نہیں؟" اس نے بے نیازی سے کہا۔

لیکن میرے کان کھڑے ہو گئے۔ ایک اندرونی آواز نے مجھے خبردار کیا کہ انجان بننے والی یہ عورت بہت کچھ جانتی ہے۔ چور میرے دل میں تھا۔ استاد اور میں رات کو جہاں بیٹھ کے بے فکری سے بات کر رہے تھے وہ ان کے بیڈروم کی کھڑکی سے زیادہ دور نہیں تھی۔ میں دیکھ چکا تھا کہ پردے ہٹا کے شیشے سے باغ کا منظر دکھائی دیتا ہے۔ بے خیالی میں ہم قریب ہی کرسیاں کھینچ کے بیٹھ گئے تھے۔ استاد کو یقین تھا تو مجھے بھی کہ اس کی بیوی محو خواب ہے۔ لیکن شاید ایسا نہیں تھا۔ شوہر کے اٹھنے سے وہ بھی جاگی ہو گی اور پھر اس نے دیکھ لیا ہو گا کہ ہم دونوں کہاں ہیں۔ فطری تجسس سے مجبور ہو کے اس نے کھڑکی کھولی اور پھر سب سنتی رہی۔

"نہیں بتانا چاہتے تو نہ بتاؤ۔" وہ مجھے خاموش دیکھ کر بولی۔

"یہ بات نہیں۔ آپ کا اندازہ کمال کا ہے۔ ایک لڑکی ہے جو گم گئی ہے۔ اسے تلاش کر رہا ہوں میں۔"

لیکن اب اس کی دلچسپی جیسے ختم ہو گئی تھی کیونکہ وہ تفصیل سے سب سن چکی تھی اور اس لڑکی کا نام تک جانتی تھی۔ اس نے ڈرائیور کو آواز دی اور اسے اخبار لانے بھیج دیا۔ پھر وہ ضروری کام کا بہانہ کر کے اٹھ گئی۔ میں سوچتا رہا کہ گزشتہ رات کی گفتگو میں کہاں ایسا حوالہ تھا جس سے استاد کے اصل کام کا پتا چلے۔ میرے خیال میں ایسی کوئی بات نہیں تھی۔ ہاں اپنے نام اور شناخت بدلنے کا ذکر میں نے ضرور کیا تھا۔ شاید جیل کی بات بھی کی ہو کہ مجھے پھر پکڑے جانے کا خوف تھا۔ اس نے اندازہ کر لیا ہو گا کہ میں ایک مفرور مجرم تھا۔ استاد کا ذکر کہیں نہیں آیا تھا کہ ساتھیوں نے اسے جیل توڑ کے چھڑایا تو میں بھی نکل بھاگا تھا ورنہ پھانسی لگ جاتی۔ میری تو کہانی ہی استاد سے الگ ہونے کے بعد کے ایام کی تھی۔ مگر یہ راز اب راز نہیں رہا تھا کہ استاد کا یہ دوست جو اس کے پاس ہے کوئی مجرم بھی ہے۔ اس انکشاف سے اس کے رویے میں فرق نہیں آیا تھا۔

ڈرائیور نہ جانے کہاں سے اخبارات تلاش کر کے لایا۔ اس کے دماغ میں "جنگ" کا نام بھی آیا ہو گا۔ وہ لاہور سے شائع ہونے والا ایڈیشن لے آیا۔ لاہور کے جنگ ایڈیشن میں ڈسٹرکٹ پیج پر ایک حادثے کی خبر تھی جس میں سترہ افراد کے ایک مقامی پیر کے آستانے پر جل کے مر جانے کی خبر تھی۔ نام صرف پیر سائیں کا تھا۔ تفصیل بہت مختصر تھی۔ آگ لگ جانے کی وجہ شارٹ سرکٹ بتائی گئی تھی لیکن رپورٹر نے یہ خیال ظاہر کیا تھا کہ وہاں خاصی مقدار میں دھماکا خیز مواد موجود تھا۔ تفتیش جاری ہے۔

ڈان اخبار کراچی میں چند سطروں کی خبر تھی کہ ایک مذہبی درگاہ میں دھماکا خیز مواد سے دھماکے میں متولی سمیت سترہ افراد ہلاک ہوئے۔ سنسنی خیز انکشافات کی توقع ہے۔ یہ جملہ سب نے لکھا تھا۔ استاد نے ٹھیک کہا تھا کہ اصل

حقیقت بھی سامنے نہیں آئے گی۔

گویا قصہ تمام ہوا۔ نہ مدعی نہ شہادت۔ حساب پاک ہوا۔

استاد گامارستم کو دوپہر کے کھانے سے کچھ دیر پہلے اٹھایا گیا اور کھانا سہ پہر کے وقت کھایا گیا۔

”معاف کرنا یار۔ ایک تو ویسے ہی نیند بہت آتی ہے۔ دیر سے اٹھنے کا عادی ہوں۔ پھر کل رات بھر باتیں کرتے رہے ہم۔“

میں نے کہا۔ ”آج کے اخبارات منگوائے تھے میں نے۔“

اس کا چہرہ ایک سوالیہ نشان بن گیا۔ ”کوئی خاص خبر؟“

میں نے نفی میں سر ہلا دیا۔ کیونکہ اس کی بیوی کی نظر ہم پر تھی۔ ”ایسے ہی بس عادت ہے۔“

”میں نہیں پڑتا اس چکر میں۔ ہوتا کیا ہے اخباروں میں۔ سیاسی بیان یا جرائم کی خبریں۔“

میں نے کہا۔ ”یار مجھے کہیں جانا ہے۔ گاڑی چاہیے۔“

”اے تو پوچھنے کی کیا بات ہے۔ دو گاڑیاں ہیں، ایک بڑی ایک چھوٹی۔ کوئی سی بھی لے جا۔ ڈرائیور سے کہہ دے۔“

”نہیں، میں خود چلالوں گا۔“ میں نے کہا۔ ”چھوٹی گاڑی لے جاؤں گا۔“

”جیسی تیری مرضی۔ کوئی خاص ملاقات ہے۔“ وہ آنکھ مار کے ہنسا۔

اس کی بیوی بولی۔ ”کسی لڑکی نورین کو تلاش کررہا ہے تمہارا دوست۔ اس نے مجھے بتایا تھا۔“

استاد چونکا اور میں تردید نہ کرسکا کہ تمہاری بیوی غلط بیانی کررہی ہے۔ میں نے ایک لڑکی کا ذکر کیا تھا مگر نام لینے کی غلطی میں کیسے کرسکتا تھا۔ نام اس نے ہماری گزشتہ رات کی گفتگو میں سنا تھا اور دانستہ مجھ پر واضح کردیا تھا کہ اسے سب معلوم ہے لیکن میرے لیے ایک پرابلم یہ کہ میں استاد کو یہ بھی نہیں بتا سکتا تھا کہ گزشتہ رات کی ساری گفتگو اس کی بیوی نے سنی تھی جس کے بارے میں اس کو یقین تھا کہ سو رہی ہے۔

میں نے آنکھوں میں سوال بھر کے اسے غور سے دیکھا کہ میں نے تمہیں نورین کا نام کب بتایا تھا مگر وہ میری طرف دیکھ ہی نہیں رہی تھی۔ وہ اپنے شوہر کو اور مجھے ایک اچھی میزبان بن کے خوش اخلاقی سے ہر چیز پیش کررہی تھی۔ عورت کو ناقص العقل سمجھنے والے مرد خود سب سے بڑے احمق۔ ایک مثال میرے سامنے شاہینہ کی تھی جس کے شوہر کو مرتے وقت اپنی خوب صورت اور وفاشناس بیوی پر ایک فیصد شک بھی نہ ہوگا کہ بھائی نہیں۔۔۔ اس کی قاتل اس کی شریکِ حیات ہے۔ بعد میں اس نے قاتل کسی اور کو بنا کے سزا بھی دلوا دی تھی اور شک کا ہدف مقتول کے بھائی کو بنا رہا تھا جو بھائی کے بعد ساری جائداد کا مالک ہو گیا تھا۔

دوسری یہ عورت تھی۔ بہت معصوم، وفاشناس، مظلوم، شوہر پرست جس کے بارے میں شوہر صاحب کا یقین محکم تھا کہ وہ تو اللہ میاں کی گائے ہے۔ کچھ بھی نہیں جانتی۔ مگر وہ سب جانتی تھی، سب سمجھتی تھی لیکن وہ رونے پیٹنے اور قسمت کو کوسنے والی عورت نہیں تھی۔ وہ شوہر سے واقعی محبت کرتی تھی لیکن اس نے اپنی زندگی کے سارے فیصلوں کو خدا کی مرضی پر چھوڑ رکھا تھا اور اب پُرسکون تھی کہ جو ہونا ہے وہ ہوگا۔ اسے تقدیر سے لڑنے اور اپنا آج خراب کرنے کی کیا ضرورت ہے۔ کل جو ہونا ہے ضرور ہوگا۔ میرے سامنے شاہینہ کی مثال تھی جو تقدیر سے لڑتے لڑتے زندگی اور موت کی سرحد تک چلی گئی اور ہار گئی۔

میں نے ڈرائیور سے راستہ سمجھا۔ اسے بتانے کے بعد یہ تو طے تھا کہ اب استاد کو بھی معلوم ہو جائے گا کہ میں کہاں گیا ہوں۔ میں نے ڈرائیور سے گھر کا فون نمبر بھی لے لیا تھا اور اپنی طرف سے محتاط اور محفوظ تھا۔ مغرب سے کچھ پہلے میں مراداں والی پہنچ گیا۔ مجھے معلوم تھا کہ تمام تعزیت کرنے والے اب انور کے پاس آئیں گے۔ نہر کے دوسرے کنارے دو سو ایکڑ کی صرف جاگیر رہ گئی تھی۔ ان کا سارا خاندان وہیں پہنچا تھا جہاں آبا و اجداد ان کے منتظر تھے۔ یہ خاندانی قبرستان چودھری انور کی حویلی سے منسلک تھا۔ جہاں پہلے شوہر دفن ہوا تھا وہیں اس کی قاتل بیوی بھی پہنچی ہوگی۔

مجھے گیٹ پر کون روکتا۔ میں نے انور کو درمیانی صحن میں تقریباً دو درجن افراد کے ساتھ دیکھا جو انگریزی حرف یو کی شکل میں باادب بیٹھے تھے۔ انور ان کے مخالف آخری صف کے درمیان اکیلا تھا جیسے محفل کی صدارت کررہا ہو۔ اس نے مجھے دیکھا۔ تعزیت کے رسمی الفاظ کہنے اور سب کے ساتھ دعائے مغفرت کے لیے ہاتھ اٹھانے سے پہلے میں نے غمگساروں کے درمیان کوئی موزوں جگہ تلاش کی۔ میرے بیٹھنے سے پہلے ہی انور نے مجھے بلا کے اپنے ساتھ بٹھا لیا۔ اس سے بہت کچھ واضح ہوا۔ ایک یہ کہ میں اب

گمنام اور بے نام و نسب آدمی نہیں تھا۔ چودھریوں کے مرنے کا اور ان کی کیفیتی میں شامل تھا۔ دوسرے یہ کہ انور مجھ سے بدظن یا خفا نہیں تھا اور تیسرے یہ کہ اب وہ پھر مجھے اپنا دست راست رکھنا چاہتا تھا۔

میں نے افسوس کا اظہار کیا اور اللہ سے معافی مانگ کر جھوٹ بھی بولا کہ مرحوم پیر سائیں بڑے نیک خدا ترس اور پہنچے ہوئے تھے۔ خدا اسے توفیق دے کہ سارے خاندان سے بچھڑ جانے کا صدمہ برداشت کرے وغیرہ وغیرہ۔ لوگ بہ آواز بلند آمین کہتے رہے۔ مغرب تک تعداد سو تک پہنچ گئی تو مجھے اندازہ ہوا کہ یہ سوم کی تقریب تھی اور لوگ مسجد سے چنے پڑھ کے ادھر آ رہے تھے۔ ملازموں نے کھانا مغرب کے کچھ دیر بعد لگایا۔ آخری آدمی کے رخصت ہونے تک عشا کا وقت ہو گیا تھا جو جاتا تھا بڑی عقیدت سے اور بہت مغموم شکل بنا کے رسمی جملے بولتا تھا۔

”اف، میرا تو دماغ ماؤف ہو گیا ہے اور ہاتھ شل ہو گئے ہیں۔“ انور نے ایک گہری سانس لی۔ ”آ جا اندر۔“

میں نے کہا۔ ”مجھے دو دن پہلے ہی بڑے چودھری صاحب کے انتقال کی خبر بھی ملی تھی۔“

”یار! اب تو سب کی طرح رسمی باتیں مت کر۔“ وہ اندر جا کے ایک بیڈ پر ڈھیر ہو گیا۔ ”آخر کب تک جیتے وہ۔ وسائل نہ ہوتے تو کب کے مر چکے ہوتے۔“

”انور! آخر وہ تیرے والد تھے۔“ میں قریب پڑے صوفے پر بیٹھ گیا۔

”تو کیا باپ نہیں مرتے؟ اور کون کہے گا کہ حسرت ان غنچوں پہ ہے... چو ہتر سال عمر ہو گئی تھی۔ پچھلے چار سال تو مر مر کے جیتے گزرے۔ اور تجھے مزے کی بات بتاؤں، وہ ڈاکٹر پہلے مر گیا جو ان کو زندہ رکھنے میں مصروف تھا۔“

انور کے رونے نے مجھے حیران کر دیا۔ وہ ڈاکٹر کی موت کو مزے کی بات کہہ رہا تھا۔ ہم انسانی رویوں میں کتنے بھی حقیقت پسند بن جائیں، رنج یا خوشی کے جذبات سے کیسے دور رہ سکتے ہیں۔ ماں باپ یا بہن بھائی ہی نہیں اچھا دوست مر جائے تب بھی احساس زیادہ دکھی کرتا ہے۔ شادی کے بعد اولاد کی خوشی سب کو ملتی ہے۔ کوئی یہ کہہ کے نہیں بیٹھ جاتا کہ موت برحق ہے اور شادی کی تھی تو بچہ ہونا لازمی تھا اس میں حیران یا خوش ہونے والی کیا بات ہے۔

اس نے کسی کو آواز دے کر کافی کے لیے کہا اور پھر بیڈ پر تکیہ بغل میں دبا کے بیٹھ گیا۔ ”تو کیسے نکل گیا وہاں سے بروقت؟“

”بروقت کیا مطلب؟ جب ڈاکوؤں نے حملہ کیا۔“

”وہ ڈاکو تھے؟ تو نے دیکھا؟“

میں نے بے رخی سے کہا۔ ”یار! وہ سونا چاندی نقد لے گئے۔ مسلح آئے تھے اور محافظوں کو مار دیا۔ چور تو نہیں کہہ سکتا انہیں۔“

”مگر وہ آستانے کو بھی تو تباہ کر گئے۔ ایک نیک کام بھی تو کیا انہوں نے، اس ڈبا پیر کے فراڈ سے بچا لیا لوگوں کو۔“

میں نے کہا۔ ”انور! وہ سلسلہ ختم ہونے والا نہیں۔ کوئی مرید اسے آمدنی کا ذریعہ بنا لے گا اور ایسے تو نہ جانے کتنے ڈبا پیر، عامل اور تقدیریں بدلنے والے سارے پاکستان میں لوگوں کو لوٹ رہے ہیں۔ مگر وہ تیرے تایا بھی تھے۔ شاہینہ تیری بھابی تھی۔“

وہ ایک دم گرم ہو گیا۔ ”بھابی؟ کیسا پیار کا رشتہ ہوتا ہے سلیم۔ بڑی بہن اور ماں جیسی ہوتی ہے بھابی بلکہ اس سے بھی زیادہ۔ وہ فاحشہ جس نے شوہر کو قتل کر کے مجرم مجھے بنا دیا دنیا کی نظر میں... خود تجھ سے کیا پوشیدہ ہے۔ رحیم کو زہر کس نے دیا تھا؟ یونے بتایا تھا مجھے... اور تیرے ساتھ...“

”چل چھوڑ انور، مرنے والے کی نیکی بھی اس کے ساتھ گئی۔“

”یعنی اب میں مرحومہ کو شریف زادی کہہ کے سارے اوصاف اس کی ذات سے منسوب کر دوں؟ یہ میں نہیں کر سکتا ملک۔ کم سے کم تیرے سامنے۔“

”خود اس کے ساتھ کتنا ظلم ہوا تھا، یہ بھی دیکھ۔ تو نے اسے ٹھکرا دیا۔ شوہر نے اسے ٹھکرائی ہوئی عورت کہہ کے خوب ذلیل کیا۔“

وہ تلخی سے بولا۔ ”کمال ہے، یہ تو کہہ رہا ہے۔ اس لیے کہ اب تو شادی کر رہا تھا اس سے۔“

”دیکھ انور! یہ مت کہنا کہ میں جائداد کے لالچ میں اس سے شادی کرنا چاہتا تھا ورنہ میں ابھی چلا جاؤں گا۔ تیرا میرا تعلق ختم۔ اس کی محبت سے میں انکار نہیں کر سکتا جو اس کو مجھ سے تھی۔ میں یہ نہیں کہہ رہا کہ میں بھی محبت کرتا تھا اس سے۔ کہتے ہیں کہ جنگ اور محبت میں سب جائز ہے۔ اس نے بھی جائز سمجھا۔ ایسی جنونی اور پاگل پن کی محبت واقعی میں نے نہیں دیکھی کہیں۔ وہ آوارہ یا بدچلن اور عیاش نہیں تھی اپنے شوہر کی طرح۔ ورنہ میرے جیسے دس اس کے اشارۂ ابرو کے غلام بن جاتے۔“

وہ حیرانی سے مجھے دیکھتا رہا۔ ”تو واقعی محبت کرنے لگا

تھا اس سے نور ین کو بھول کر؟"

"دیکھو انور! یہ میری نہیں اس کی محبت تھی جس نے مجھے ہر طرف سے محصور کرلیا تھا۔ ہتھیار ڈال دیے تھے میں نے بالآخر... مایوس ہو کے۔ یہ نورین جیسی محبت نہیں تھی۔ میں قائل ہو گیا تھا اس کی محبت کا جو صرف میرے لیے تھی۔ مجھے ترس آ گیا تھا اس پر اور ایک مجبوری یہ بھی بن گئی تھی کہ نورین نہیں ملی تھی۔ شاہینہ بری صورت نہیں تھی۔ تو بھی مانے گا کہ وہ کتنی خوب صورت اور پرکشش تھی۔ وہ مجھے ہر سکھ دے سکتی تھی۔ میرے لیے ہر قربانی دے سکتی تھی۔ اس لیے میں اداس ہوں شاہینہ کے لیے۔"

خاموشی کے ایک مختصر وقفے میں ہم نے کافی ختم کی۔

"اب کیا سوچا ہے تو نے؟" انور بولا۔

"ابھی تک تو کچھ نہیں سوچا۔ اگر تیری مراد مستقبل کے پلان سے ہے۔"

"پرسوں سے اب تک کہاں تھا تو؟"

"ادھر ہی تھا اور کہاں؟"

"حملے کے وقت تم اندر تھا؟" وہ متعجب ہوا۔ "قسمت اچھی ہے کہ نکلنے کا موقع مل گیا تجھے۔"

"میں شاہینہ کے ساتھ ہی نکل رہا تھا۔ وہ ماری گئی میری نظروں کے سامنے اور میں کچھ بھی نہ کرسکا۔ ایک جگہ چھپا رہا۔ بعد میں پولیس کے ڈر سے نہیں نکلا۔"

اس نے ایک دم اٹھ کے میرے کندھے پر ہاتھ مارا۔ "چل چھوڑ اب تو محفوظ ہے۔ میں کہہ دوں گا کہ تو میرے ساتھ تھا۔"

میں نے کہا۔ "پہلے میں قبرستان جاؤں گا۔ پھر ماں جی سے تعزیت کروں گا۔"

اس نے سر ہلایا۔ "آجا میرے ساتھ۔"

ہم حویلی کے عقبی حصے کی دیوار میں نصب دروازے سے گزر کے قبرستان پہنچے جو حویلی سے ملحق تھا۔ شاید پہلے زمین ایک ہی تھی۔ پھر آدھے پر انسانوں نے زندگی گزارنے کا اہتمام کرلیا۔ باقی آدھے پر حیات بعد از موت کا۔ اب زندہ انسان دو ہی رہ گئے تھے۔ انور اور اس کی ماں۔ باقی سب قبروں میں جا لیٹے تھے جن کی تعداد پچاس کے لگ بھگ تھی۔ وہ مجھے سیدھا شاہینہ کی قبر پر لے گیا اور ہاتھ باندھ کے کھڑا ہو گیا۔ میں نے خود کو بے وقوف محسوس کیا۔ آخر ایسی کون سی جذباتی مجبوری تھی جو مجھے یہاں لے آئی؟ اب کیا میں اس کی مغفرت کے لیے دعا کروں۔ تعجوں اور دلوں کا حال خدا سے مخفی نہیں۔ کون بخشش کا مستحق ہے اور کون نہیں۔ وہی فیصلہ کرے گا۔ مگر اب یہاں تک آ گیا تھا تو انور کے سامنے تفت سے بچنے کے لیے میں نے ہاتھ اٹھا دیے۔ اس کے لبوں پر ایک طنزیہ سی مسکراہٹ رہی۔

پھر میں ایک دم پلٹ گیا۔ انور میرے ساتھ لوٹ آیا۔ "ماں جی عدت میں ہیں۔"

"کیا مطلب؟ وہ مجھ سے نہیں ملیں گی؟" میں نے کہا۔

"میں پوچھ لیتا ہوں ان سے۔ ان کی دماغی کیفیت بہت عجیب ہو گئی ہے۔ وورہ سا پڑتا ہے انہیں۔ اچانک چیخ جاتی ہیں اس کمرے میں جس کو اباجی نے آفس سی یوں دارڈ بنا رکھا تھا۔ وہ سب کچھ تڑوا دیا ہے میں نے۔ مجھ سے پوچھتی ہیں کہ انور کچھ پتا ہے تیرے اباجی کدھر گئے ہیں؟ گئے ہوں گے اس ڈاکٹر کے ساتھ... کبھی کہتی ہیں کہ انور چل اب چھوڑ تو بڑا ہے۔ اکبر کو بڑی سزا مل گئی اس کو آزاد کروے۔"

میں نے کہا۔ "یہ تو فطری بات ہے۔"

اس وقت جب وہ ماں جی سے پوچھنے گیا ہوا تھا کہ ملک سلیم اختر ملنا چاہتا ہے اسے آنے دوں؟ میں نے محسوس کیا کہ میرا رکنا فضول ہے۔ یہاں آج بھی میں اجنبی ہوں۔ اس گھر کا بیٹا نہیں ہوں انور کی طرح۔ شاید مجھے آنا ہی نہیں چاہیے تھا ادھر۔ میں نے سوچا اور ایک دم پلٹ کے گیٹ سے باہر نکل گیا جہاں میری لائی ہوئی کار کھڑی تھی۔ ابھی تک انور نے اسے نہیں دیکھا تھا۔ میں گاڑی کو موڑ کے جس راستے سے آیا تھا اسی پر بھاگ نکلا۔ انور نے واپس آ کے مجھے غائب دیکھا ہو گا تو پوچھا ہو گا اور گیٹ پر کھڑے گارڈز نے اسے بتا دیا ہو گا کہ وہ تو جس گاڑی میں آئے تھے اسی میں واپس چلے گئے۔ کچھ بتا کے نہیں گئے۔

اس کے بعد انور سمجھ جائے گا کہ اب میں لوٹ کے آنے والا نہیں ہوں۔ وہ اس گمان میں ہے کہ اب ادھر کی اور شہر یار کی ساری جاگیر کا مالک وہ ہے۔ لیکن بالآخر پتا چل جائے گا جب اصل وارث نمودار ہوں گے۔ جس حقیقت سے میں آشنا ہوں اس پر آہستہ آہستہ وقت کے ساتھ آشکار ہو گی۔ ابھی تک تو اس نے مجھ سے ریشم کے بارے میں کوئی سوال نہیں کیا تھا۔ اس کا خیال ہو گا کہ بالآخر وہ مجھ سے پوچھ لے گا۔ شاہینہ سے شادی کے بعد تو میں بھی یہاں اور وہ بھی تو جلدی کیسی۔ بعد میں جب مردہ فرض کرلیا جانے والا مراد زندہ سلامت اپنی بیوی کے ساتھ پورے کروفر اور شان و شوکت کے ساتھ نمودار ہو گا تو اس پر بڑی قیامت گزرے گی۔ ان کے حقِ ملکیت کو تسلیم کرنا پڑے گا۔

رات کے ساڑھے گیارہ بجے میں نے ملک غلام محمد کی کوٹھی میں گاڑی روکی۔ دونوں میاں بیوی چاندنی رات میں لان پر کرسیاں ڈالے بیٹھے تھے۔ میں قریب گیا تو بھابی نے پوچھا۔ ''کہاں سے آرہے ہیں؟ کھانا کھایا ہے کہ نہیں؟''

''میں کھانا کھاؤں گا۔'' میں نے کہا اور اسی کرسی پر گر گیا جس پر سے بھابی اٹھ کے اندر چلی گئی تھی۔

اس نے مجھے غور سے دیکھا۔ ''تو وہاں گیا تھا۔ کوئی بات ہوئی ہے؟''

''نہیں بات کیا ہونی۔ مجھے نہیں جانا چاہیے تھا۔'' میں نے کہا۔ ''انور ضرور مجھے روک لیتا۔ بحث کرتا۔ شاید زبردستی پر اتر آتا۔''

''پھر؟''

''استاد! جو اچھا آدمی نہ ہو کیا وہ اچھا دوست بن سکتا ہے؟ ضرورت کے وقت تو لوگ گدھے کو باپ بنا لیتے ہیں۔ اسے میری ضرورت تھی تو اس نے بھی اور مرحوم چودھری نے بھی بڑی اپنائیت دی تھی۔ تحفظ دیا اور اپنوں کی طرح اعتبار کیا۔ لیکن ہزار اپنائیت کا اظہار ان کی طرف سے ہو میں ان کی خاطر جان دے دوں تب بھی میں غیر ہی رہوں گا۔ خاندانی نہیں ہو جاؤں گا۔ کیونکہ میرے حسب نسب کا پتا نہیں۔ میں حیران ہوں کہ اتنا عرصہ باہر رہ کے اور اتنا پڑھ کے انور وہی رہا۔ اس کی سوچ نہ بدل سکی۔ وہ بالآخر وہی فیوڈل لارڈ رہا۔ خاندانی جاگیردار۔ اپنی نسلی برتری اور حاکمیت پر نازاں۔''

استاد نے سر ہلایا۔ ''اب احساس ہوا تجھے، یہ زندگی کا تجربہ ہے، ڈگری نہیں۔''

''میں محسوس کرتا ہوں کہ وہ فرق پیدا اس نسلی برتری کے خول سے نکل آیا تھا۔ اس نے اپنی بیٹی مجھے دینا قبول کر لیا تھا۔ اچھے کردار اور اچھے حسب نسب کے فرق کو سمجھ لیا تھا۔''

''اب ہوا کیا... اس نے کچھ کہہ دیا؟''

''بات معمولی ہے استاد لیکن اس وقت دل میں چبھ گئی۔ مرحوم بڑے چودھری نے ہمیشہ کہا کہ تو بیٹوں جیسا ہے۔ پڑھا لکھا، سمجھدار، ذہین ہے، بہادر ہے۔ مگر بیٹا تو نہیں ہوں نا۔ یہ تو حقیقت ہے۔ آج میں گیا تھا شاہد کی قبر پر فاتحہ پڑھنے۔ اس نے جان دے دی بالآخر میرے ساتھ، میرے لیے... اور انور سے تعزیت کی رسم بھی پوری کرنی تھی۔ اس کا باپ مر گیا تھا اور تایا بھی۔ ماں بیوہ ہو گئی تھی اور عدت کے دن پورے کر رہی تھی۔ میں نے کہا کہ ان سے بھی مل لوں۔ تو اب میں انور نے کہا کہ عدت کے دنوں میں وہ شاید کسی نامحرم سے نہ ملیں۔ یہ بات میرے دل میں چبھ گئی۔ میں غیر اور نامحرم ہوں۔ بیٹے جیسا ہوں... بیٹا نہیں ہوں۔ ماں جی کہتا تھا ہمیشہ انہیں۔ لیکن وہ میری ماں نہیں ہیں۔ بس میں بتائے بغیر بھاگ آیا۔''

اس کی بیوی ایک ٹرے میں کھانا سجا کے لے آئی۔

''تمہاری کھانا پکانے والی یا خانساماں کے ہاتھ میں بڑا ذائقہ ہے۔''

وہ خوش ہو کے مسکرائی۔ ''کھانا میں خود پکاتی ہوں بھائی، روٹی پکانے والی ہے۔''

استاد بولا۔ ''یار رکھنے کو میں کسی نامی استاد ہوٹل کا شیف ملازم رکھ لوں۔''

''پھر رکھتے کیوں نہیں؟'' وہ بڑے ناز سے بولی۔

''اپنی گھر والی کے ہاتھ میں پیار کا جو گرم مسالا ہوتا ہے، کسی شیف کے ہاتھ میں آ ہی نہیں سکتا۔ مگر تو خاک سمجھے گا یہ بات۔ گھر والی کہاں ہے تیری... تو نے اتفاقاً وہ بات کی...''

''نہیں استاد! میں نے وہ کبھی محسوس کیا۔ ماں کے ہاتھ کا ذائقہ یاد نہیں۔ بہن کوئی نہیں اور بیوی ابھی آئی نہیں۔ ساری عمر خود پکا کے کھایا یا ہوٹلوں میں۔''

''بس تو اب دیر مت کرو، کون ہے وہ مجھے بتاؤ، میں تلاش کر کے لاتی ہوں اسے۔'' استاد کی بیوی نے کہا۔

''کاش یہ اتنا آسان ہوتا بھابی۔ لیکن میں وعدہ کرتا ہوں وہ جب بھی ملی، پہلے اسے یہاں لاؤں گا، آپ کے پاس۔ پتا نہیں سال بھر ایک حویلی میں رہ کے میں نے ایسا محسوس نہیں کیا جو ایک دن میں یہاں محسوس ہوا۔''

''اب اسے اپنا ہی گھر سمجھ۔ بیٹھ آرام سے۔ چل اب تو بھی جا سونے کے لیے۔''

''ہاں یہ رات بھر جاگ کے باتیں کرنے کی کیا ضرورت ہے۔ ایک عمر پڑی ہے باتیں کرنے کو۔'' اس کی بیوی نے کہا۔

اس رات مجھے پھر نورین کا خیال آیا تو میں شرمسار ہوا۔ نگری نگری پھرا مسافر گھر کا راستہ بھول گیا۔ جب زمانے نے دھتکارا تو گھر یاد آیا۔ اور گھر والے پھر گئے کہ کہتے ہیں کہ صبح کا بھولا شام کو لوٹ آئے تو اسے بھولا نہیں کہتے۔ زندگی کی لائن جہاں سے ٹوٹی تھی وہیں سے یہ سفر پھر شروع ہو رہا تھا۔ لگتا تھا کہ ابھی کل کی بات ہے جب میں اور استاد جیل سے فرار ہوئے تھے، ہم کہیں نہیں گئے۔ سیدھے یہاں آ گئے، استاد کے گھر اور نورین میری کوئی کزن یا منگیتر

تھی جو اب تک میرے انتظار میں کہیں بیٹھی ہوئی۔ جیسے ہی
اسے پتا چلے گا سب ویسے ہی ہو جائے گا جیسا میں نے سوچا
تھا لیکن ایسا نہ تھا۔ میں صرف آرزو کے سراب میں مبتلا تھا
لیکن میں اب آزاد تھا اسے تلاش کرسکتا تھا۔

اگلے روز میری آنکھ صبح دس بجے کھلی تو مجھے یقین نہ
آیا۔ ایک زمانہ ہوا میں سکون کی گہری نیند سے محروم تھا، اب
آزادی بھی اور احساس تحفظ تھا کہ میں سوتا رہا۔ مجھے مزید
حیرانی ہوئی جب میں نے لاؤنج میں استاد کو ٹی وی کے
سامنے دیکھا۔

"کیوں استاد! آج صبح صبح جاگے ہوئے ہو؟" میں
نے کہا۔

"چل تو بھی اٹھ گیا۔ اچھا ہوا۔ تیری بھابی خود گرم گرم
پراٹھے تل رہی ہے اور ان کے ساتھ ہیں بکری کے پائے۔
واہ واہ۔"

میں نے کہا۔ "اس نعمت سے تو میں بھی محروم رہا۔
شاید سال بھر سے پائے نہیں کھائے۔ مجھے یاد ہے ایک گانا
گھر کی رونق ہے گھر والی۔"

"ٹھیک کہا تو نے۔" اس نے گہری سانس لی۔

"ایک بات کہوں۔ اپنی بھابی کے سامنے استاد نہ کہا کر
مجھے۔ بڑے بھیا کہہ لے۔"

میں نے طنزیہ پوچھا۔ "کیوں، استاد تو زیادہ محترم
ہوتا ہے بڑے بھیا سے۔"

وہ ادھر اُدھر دیکھنے لگا۔ "یار! وہ دوسرا استاد ہوتا
ہے۔"

"اور تم جس پیشے سے وابستہ ہو۔ اس میں استاد کہلانا
باعث شرم ہے تمہارے لیے۔ پھر چھوڑ کیوں نہیں دیتے یہ
پیشہ۔ میرے بڑے بھیا کہنے سے کیا ہوگا؟"

اس کے کہنے سے پہلے بھابی نے ناشتے کا اعلان کر
دیا۔ ناشتے کے دوران کوئی خاص بات نہیں ہوئی کیونکہ میں
بھی انتہائی مصروف تھا جتنا استاد۔ یہ میرا پسندیدہ ترین ناشتا
تھا اور میں مرا جاتا تھا تو صبح تنہا گلی میں بکنے جانے والے
خستہ پراٹھوں اور پوریوں کی مہک از خود کھینچ لیتی تھی۔ نہ
جانے کیسے وہ گول گپے کی طرح پھولی ہوئی بڑی بڑی
پوریوں کو دھاگے سے یوں لٹکائے رکھتے تھے کہ کسی اور
اشتہار کی ضرورت ہی نہ پڑتی تھی۔ گوجرانوالہ کا ناشتا۔ لاہور
کا ناشتا۔ حلوہ پوری۔ چکڑ چھولے۔ پائے۔"

"ابے بس کر۔" استاد کی آواز نے مجھے چونکایا۔ "ہیضہ
ہوجائے گا، پورے مہینے کا ایک ہی دن میں کھا کے۔"

اس کی بیوی نے ڈانٹا۔ "کیوں ٹوکتے ہو۔ تم کھاتے
ہو بھینس کی طرح۔ وہ بکری کی طرح آہستہ آہستہ۔"

استاد گلا پھاڑ کے ہنسا۔ "لے بھئی، تیری تو پارٹی بن
گئی۔ سالے کے آتے ہی ہم دو کوڑی کے رہ گئے۔"

"اچھا سنو، مجھے ذرا مارکیٹ تک جانا ہے۔ پھر ثریا
کی طرف جاؤں گی۔ ہوسکتا ہے واپسی میں دیر ہو جائے۔ تم
کھانا کھالینا میرا انتظار مت کرنا۔"

میں نے کہا۔ "اب شام تک کی چھٹی۔ لنچ کا اسٹاک
ڈال لیا ہے پیٹ میں۔"

اگر استاد کی بیوی یہ موقع فراہم نہ کرتی تو میں اسے
کسی بہانے سے باہر لے جاتا۔ لیکن ایسا لگتا تھا کہ خود استاد
بھی موقع کی تلاش میں تھا۔ ہم پیٹ بھرے مگرمچھوں کی
طرح اس کے بیڈروم میں دراز تھے اور میں سوچ رہا تھا کہ
ابتدا کیسے کروں کہ وہ خود ہی بولا۔ "یار فرید! میرا مطلب
ہے سلیم۔ ایک بات ہے جو تجھ سے کرنی تھی۔"

"فرماؤ استاد، یہ تکلف کیسا؟"

"وہ بات ہی کچھ ایسی تھی۔ بہت دن سے ہے
میرے دل میں مگر کہتا کس سے؟"

میں نے کہا۔ "کمال کرتے ہو۔ تمہاری بیوی ہے۔
پرانے ساتھی ہیں ملک صاحب۔"

اس نے نفی میں سر ہلایا۔ "ابے نہیں۔ ایسا کوئی نہیں
تھا جس کے سامنے میں دل ہلکا کرتا۔ بھروسا کرتے ہوئے
بات کرتا تو وہ بھی اچھا مشورہ دیتا۔ دراصل۔۔۔ دراصل
میں۔۔۔ یہ کام چھوڑنا چاہتا ہوں۔"

میں بھونچکا رہ گیا۔ کیونکہ یہی بات میں اس کو سمجھانا
چاہتا تھا۔ کچھ دیر بعد میں نے حیرانی پر قابو پا کے کہا۔ "پھر
سوچنے کی کون سی بات ہے استاد، چھوڑ دو۔ نیک کام میں دیر
کیسی؟"

اس نے مجھے دیکھ کے افسوس سے سر ہلایا۔ "عقل
مند آدمی! لوگ سگریٹ نہیں چھوڑ سکتے بیوی کو چھوڑ دیتے
ہیں۔ میرے لیے یہ آسان ہے کیا؟"

"میں بیوی کو چھوڑنے کی بات نہیں کر رہا تھا۔ یہ پیشہ
چھوڑ دے۔"

"یہ بھی تو بتا اُلّو کے پٹھے، کیسے۔ جس دن میں نے یہ
ارادہ ظاہر کیا شاید آخری دن ہوگا میری زندگی کا۔ میں اکیلا
نہیں ہوں۔ گیارہ لوگ تو آج میرے ساتھ ہیں جو مجھے
سردار کہتے ہیں۔ پھر سکندر اور اس جیسے بہت سے۔ ان سب
کو ڈر پیدا ہوجائے گا کہ اب ضمیر صاحب کے جاگنے سے مجھ

پر شرافت اور نیکی کا پردہ پڑا ہے۔ تو ایسا نہ ہو میں ان کے چہرے سے بھی بے نقاب کر دوں۔ آج نہ سہی کل۔ خطرہ تو ہوگا۔ وہ فوراً میری جگہ کسی اور کو دے دیں گے۔"

میں نے سوچ کے سر ہلایا۔ "ہاں، یہ خطرہ تو ہے۔ ہم دونوں مفرور مجرم تو آج بھی ہیں۔"

"جو مفرور ہے، وہ فرار ہو کے کہاں جا سکتا ہے۔ دیکھو، ستاری کر کے بڑی غلطی کی میں نے۔ یہ بڑی ذمے داری ہوتی ہے۔ اس سے کب تک جھوٹ بولوں۔ شرم آتی ہے مجھے اس کے سامنے۔"

"زہرا جانتا ہے لیکن وہ کسی بات کا یقین نہیں کرتی۔ جانتی ہے کہ تو جھوٹ بول رہا ہے۔"

اس کا چہرہ خفت سے زرد پڑ گیا۔ "تجھے کیسے معلوم ہوا؟"

میں نے کہا۔ "کیا یہ غلط ہے؟"

اس نے نفی میں سر ہلایا۔ "وہ مجرم رکھتی ہے میرا کیونکہ محبت کرتی ہے مجھ سے اور بدلے میں کیا دیتا ہوں میں اسے... جھوٹ۔"

"کل رات اس نے ہماری تمام گفتگو سنی۔ ہم لان پر تیرے بیڈروم کی کھڑکی کے بہت قریب بیٹھے تھے۔"

"پرسوں رات... مگر وہ تو سو رہی تھی۔"

میں ہنسا۔ "تیرا خیال ہے۔ وہ کھڑکی سے لگی کھڑی رہی۔"

"اور اس نے تجھے بتایا؟"

"نہیں، کچھ ایسے اشارے دیے کہ میں سمجھ گیا۔ مثلاً اس نے پوچھا کہ میں استاد کیوں کہتا ہوں تمہیں... تم سے بھا کیوں نہیں کہہ سکتا۔ ہم کب سے ساتھ ہیں۔ کبھی ذکر نہیں آیا میرا۔"

"اسے شک ہے، بالکل ہے کہ میں وہی کام کر رہا ہوں۔ تجھے بتایا تھا کہ وہ حوالات میں ملی تھی۔ شادی کے بعد میں نے بڑی جھوٹی قسمیں کھا لیں۔ اللہ معاف کرے۔" اس نے دونوں کانوں کو چھو کر کہا۔ "یہ اتنا آسان نہیں ہے فرید۔"

"میں فرید نہیں منعم ہوں۔ اپنے ساتھ مجھے بھی مرواؤ گے۔"

"اب زبان پر چڑھا ہوا ہے۔ تو بھی استاد کیوں کہتا ہے مجھے اور گا بار سنم... میں ملک غلام محمد ہوں۔"

کچھ دیر کی خاموشی کے بعد میں نے کہا۔ "نا ممکن کچھ نہیں بڑے بھیا۔ میں بھی تو جی رہا ہوں نام بدل بدل کے۔

تم بھی یہی کرو۔ میں تو تہی تھا خالی ہاتھ۔ تمہارے پاس بہت دولت ہوگی۔"

اس نے اقرار میں سر ہلایا۔ "مجھے خود اندازہ نہیں کہ کتنی ہے۔ بینک میں تو چالیس پچاس لاکھ ہیں۔"

"اور باقی کہاں ہے؟"

"پڑی ہے ایک محفوظ جگہ... سونا ہے جو ایک ستار کے پاس رکھا تھا۔ ابھی بتاتا ہوں۔" وہ اٹھ کے گیا اور کہیں سے ایک ڈائری لے آیا۔ "اس میں سب لکھا ہے۔ ہاں" وہ کچھ دیر پڑھتا رہا۔ "بس سمجھ لے۔"

"اف، اتنا سن سو۔ اور تم پھر بھی ڈاکے ڈال رہے ہو۔ کروڑ پتی ہو کے بھی۔"

"میری سمجھ میں تو کچھ آتا نہیں۔ تو ہے پڑھا لکھا۔ بتا میں غائب کیسے ہو سکتا ہوں بیوی بچوں سمیت۔"

"بہت آسان ہے تمہارے لیے۔ کسی دوسرے ملک کی شہریت لے لو۔"

"یہ اتنا آسان ہے سالے۔"

"ہاں، پیسا ہو تو سرحد کوئی نہیں۔ وہ خود بلاتے ہیں کہ آ بے سرمایہ کاری کرو اور شہریت حاضر ہے۔ کینیڈا، آسٹریلیا، امریکا، محفوظ ترین جگہ آسٹریلیا ہے۔ شہر سے دور زمین خرید لو بے حساب۔ لمبے چوڑے فارم ہوں گے۔ وہاں پاکستان جیسا حال نہیں ہے کہ گاؤں یا ویرانے میں زندگی کی کوئی سہولت نہ ملے۔ بجلی، فون، ٹی وی، ٹرانسپورٹ، علاج معالجے کی سہولت، سب شہر جیسی۔ فارمر تو اپنے پرائیویٹ جہاز کو کار کی طرح استعمال کرتے ہیں۔"

اس کو دلچسپی پیدا ہوگئی۔ "یہ کیسے ہوگا۔ مجھے سمجھا۔"

"پہلے تو نام بدلو۔ شناختی کارڈ بنوا لو میری طرح۔ پھر پاسپورٹ۔ اسی نام سے فارن ایکسچینج اکاؤنٹ کھول لو۔ کوئی نہیں پوچھتا کہ ڈالر یا پاؤنڈ کہاں سے آئے۔ اور ویزے کے لیے اپلائی کر دو۔ دو چار مہینے روپوش رہو۔ کسی گاؤں میں یا تہ خانے میں۔ دن کو مت نکلو، رات کو نکلو اور موقع ملتے ہی باہر نکل جاؤ۔ کسی کا باپ تمہارا سراغ نہیں لگا سکتا۔"

اچانک ذرا گھبرا گیا۔ "یہ اخبارات سرخی۔"

میں نے اپنے کیس کی پروگریس دیکھنے کے لیے ایک اخبار اٹھا لیا۔ اس میں جو خالی صفحے کا ایک تصویری اشتہار تھا۔ میری نظر اس پر جم کے رہ گئی۔

ہر محاذ پر ایک نئے داؤ کی منتظر
جواری کی تدبیریں اگلے ماہ پڑھیے

بابر نعیم

کہن سال

جوانی کی نوخیزیاں کب رخصت ہو کے بڑھاپے کو آواز دیتی ہیں... اندازہ ہی نہیں ہو پاتا... زندگی کے سنہرے دنوں کو خیرباد کہہ کے دبے قدموں داخل ہونے والے بڑھاپے کی فتنہ انگیزیاں... دونوں کا نظریہ تھا کہ وہ اپنے بڑھاپے کو عام ڈگر سے جدا اور منفرد انداز میں گزاریں گے...

میاں بیوی کی ذہنی ہم آہنگی کا زبردست کارنامہ

جب وہ بوڑھا کچن میں داخل ہوا تو بڑھیا اس وقت خود میں مگن گنگنا رہی تھی۔ برسوں قبل جب ان کی شادی ہوئی تھی تو ایک عرصے تک اسے اپنی بیوی کا اس طرح گنگنانا بہت اچھا لگتا تھا۔ لیکن اب اس کی گنگناہٹ پر وہ اکثر جھلا جاتا تھا۔ اس وقت بھی وہ چڑچڑے پن کے ساتھ ناشتے کی میز کی جانب بڑھ گیا۔

چولہے کے پاس کھڑی بڑھیا پلٹ کر بولی۔ ''ناشتا تقریباً تیار ہے۔'' ساتھ ہی اس کے ہونٹوں پر مخصوص

مسکراہٹ ابھر آئی۔

وہ اپنی اس کرسی پر بیٹھ گیا جو تقریباً چالیس سال سے اسی ایک جگہ رکھی ہوئی تھی پھر اس کی نظریں ان دواؤں کا جائزہ لینے لگیں جو اس کی بیوی نے معمول کے مطابق میز پر سجا رکھی تھیں۔ بلڈ پریشر کی گولیاں، خون کو پتلا کرنے والی گولیاں، نبض کی حرکت میں باقاعدہ توازن رکھنے والی گولیاں اور نہ جانے کس کس چیز کی گولیاں جو اس وقت یاد نہیں آرہی تھیں۔ اس کی بیوی یہ دوائیں ہمیشہ قرینے سے رکھا کرتی تھی۔ حتیٰ کہ اس نے وہ کیپسول بھی تبدیل کروادیا تھا جسے نگلنے میں اسے گزشتہ چند ماہ سے دشواری پیش آنے لگی تھی کیونکہ اس کے حلق کے مسلز پھول رہے تھے۔ اب اسے وہ دوا نگلنے میں کوئی دشواری پیش نہیں آتی تھی۔

اس نے کھانستے ہوئے بلند آواز سے اپنا حلق صاف کیا اور بلغم اس ٹشو میں تھوک دیا جو وہ ہمیشہ اپنے پاس رکھتا تھا۔ آج صبح سے اس کی طبیعت گری گری سی ہورہی تھی اور اس کا سر چکرا رہا تھا۔

کھنکھارنے کی آواز پر بڑھیا سمٹ سے گئی۔ بوڑھے کی تمام جسمانی آوازوں پر وہ اپنے رانت کرکرے کرنے لگتی تھی۔ تاہم وہ خود بخود مسکرادی۔ اب اسے یہ سب کچھ زیادہ دنوں تک نہیں کرنا پڑے گا۔ اس نے دل ہی دل میں سوچا۔ اور یہ فیصلہ بھی برسوں قبل خود اس کے شوہر ہی نے کیا تھا۔ اس بات پر اس کے منہ سے ہلکا سا قہقہہ نکل گیا۔

”ہنسنے کی کیا بات ہے؟“ بوڑھا بڑبڑایا۔

”اوہ، کچھ نہیں، کچھ نہیں۔ بس یاد آگیا کہ تم کیا کیا کرتے تھے۔“ بڑھیا نے اس کے سامنے ناشتا رکھتے ہوئے کہا۔

بوڑھے نے کانٹے چھری سے انڈے کا ایک حصہ کاٹا اور اسے منہ میں لے جاتے ہوئے بولا۔ ”میں کیا کیا کرتا تھا؟“

انڈے کے کچھ چھوٹے ٹکڑے اس کے منہ سے نکل کر میز پر بکھر گئے۔

بوڑھے نے کھانا بند کردیا اور اپنا ہاتھ.... سینے پر رکھتے ہوئے بولا۔ ”آج طبیعت صحیح محسوس نہیں ہورہی ہے۔“ پھر اپنا سر ہلانے لگا۔ اسے یوں لگ رہا تھا جیسے اس کے چاروں طرف ایک دھند سی چھائی ہوئی ہے۔ ”میں صرف کافی پیوں گا۔“

بوڑھے نے کافی کا مگ اٹھا کر ہونٹوں سے لگایا اور ایک بڑا سا گھونٹ بھرلیا پھر اسے یاد آگیا۔ ”میں کیا کیا کرتا تھا؟“ اس نے اپنی بیوی سے پوچھا۔ ”تم نے بتایا نہیں!“

”جب ہم جوان ہوتے تھے۔“ بڑھیا نے کہا۔ ”اور ایک دوسرے سے بے حد محبت بھی کرتے تھے۔“ اس نے دل ہی دل میں کہا۔ یہ اس سے پہلے کی بات ہے جب ہمارے درمیان نفرت نے جنم نہیں لیا تھا لیکن اس نے یہ بات زبان پر لانے سے گریز کیا۔

”جوانی؟“ بوڑھے نے کہا۔ اب اسے اپنی جوانی کے بارے میں کچھ زیادہ یاد نہیں تھا۔ اس کا ذہن زیادہ تر موجودہ حالات میں الجھا رہتا تھا۔ جیسے کہ کون کون سی دوائیں کھانی ہیں...... اور تاسف، ذہبروں تاسف۔ اس کی نگاہیں اپنی بیوی پر مرکوز تھیں۔

”جب ہماری عمریں بیس تیس اور تیس چالیس کے درمیان ہوا کرتی تھیں، ہور بس! اور جب کوئی بوڑھا قطار میں ہمارے آگے ہوا کرتا تھا...“

”کیسی قطار؟“

”کوئی بھی قطار۔“ بڑھیا نے جھڑک کر کہا پھر اپنی سانسیں درست کرتے ہوئے بولی۔ ”جب ہم کسی سپر مارکیٹ میں ہوتے تھے یا کسی اور جگہ... اور کوئی بوڑھا ہم سے آگے قطار میں بہت زیادہ وقت لے لیتا تھا.... اپنے پاس رقم ٹٹولنے میں یا ایسی ہی کسی بات میں تو تم کہا کرتے تھے۔ ”میری! اگر میں کبھی اس جیسا ہوگیا تو تم بس مجھے مار ڈالنا۔“

”میں نے یہ کہا تھا؟“

”یا جب ہم کسی میکڈونلڈز یا کسی ایسی جگہ قطار میں کسی بوڑھے شخص کے پیچھے کھڑے ہوتے تھے اور وہ بوڑھا مینو نہیں دیکھ سکتا تھا اور کاؤنٹر پر موجود فرد کو ہر بات اسے تفصیل سے سمجھانی پڑتی تھی تو تم مجھ سے کہتے تھے۔ ”میری جب میں اس حالت میں پہنچ جاؤں تو مجھے اس تکلیف سے نجات دلا دینا۔“

”ہوں، مجھے یاد نہیں۔“ اس نے اپنی بیوی کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ اسے اپنی بیوی قدرے دھندلی سی دکھائی دے رہی تھی۔ ’مجھے اپنے لیے نئی عینک بنوانی پڑے گی۔‘ اس نے سوچا۔

”نہیں جانو...... ! تم نے کئی بار یہ بات کہی تھی۔“ میری نے جواب دیا بلکہ برسوں یہ بات کہتے رہے تھے۔ اس نے سوچا۔ وہ ہمیشہ اس کی یہ بات ہنس کر ٹال دیا کرتی تھی۔ البتہ گزشتہ چند برسوں سے بوڑھے نے یہ بات کہنی بند کردی تھی، لیکن میری کو اس کی یہ باتیں اب بھی یاد

گئیں اور وقت کے ساتھ ساتھ جب وہ دونوں ایک دوسرے سے عاجز آنے لگے اور ان کے درمیان بیزاری بڑھنے لگی تو تب بھی میری کو یہ تمام باتیں اچھی طرح یاد رہیں۔

میری کو وہ دن بھی اچھی طرح یاد تھا جب ہورس اس پر چیخ پڑا تھا کہ وہ ایک اچھی بیوی نہیں ہے اور اب فرض شناس بیوی نہیں رہی تھی جیسی کہ ہوا کرتی تھی۔ میری کو یاد تھا کہ وہ ہمیشہ کیا کہا کرتا تھا اور وہ اس کی نظروں میں ایک مستقل مزاج، ثابت قدم، فرض شناس بیوی تھی۔

”ہم اس بارے میں بات کیوں کررہے ہیں؟“ ہورس نے میری سے کہا۔

”یاد ہے گزشتہ ہفتے جب ہم سیونگ مارٹ میں تھے اور تمہیں اپنا کریڈٹ کارڈ نہیں مل رہا تھا اور ہمارے پیچھے لوگوں کی ایک لمبی قطار اپنی باری کا انتظار کررہی تھی۔“

”میں نے اپنا کریڈٹ کارڈ تلاش کرلیا تھا۔ وہ غلط جیب میں رکھا ہوا تھا اور...“

”اور...“ میری اس کی بات کاٹتے ہوئے بولی۔ ”گیس اسٹیشن پر ابھی گیس کا پائپ کار میں لگا ہوا تھا کہ تم نے کار آگے بڑھادی تھی اور ایک حادثہ ہوتے ہوتے رہ گیا تھا۔“

”کیونکہ تم نے اپنی باتوں سے میری توجہ اس طرف سے ہٹادی تھی اور اس وقت میرا ذہن کہیں اور چلا گیا تھا۔ میں جب بھی کچھ کرنے کی کوشش کرتا ہوں تو تم ہمیشہ باتیں کرنا شروع کردیتی ہو۔“

”اور تم ہمیشہ گیراج کا دروازہ بند کرنا بھول جاتے ہو۔“

”تو...“

”اور گزشتہ ماہ ورک شاپ پر جب ہم پکنک منانے کے لیے رکے تھے تو وہاں بے تحاشا بھیڑ تھی اور تم بار بار اپنا ذہن بدل رہے تھے اور وہ بے چاری ویٹرس...“

”مجھے یاد نہیں آرہا تھا کہ میں نے کون سا سینڈوچ لینے کا فیصلہ کیا تھا۔ سو کیا ہوا؟“ ہورس کو اپنے دل کی دھڑکن تیز محسوس ہونے لگی۔ وہ قدرے ہانپ رہا تھا۔ مجھے اپنی سانسوں پر قابو پانا ہوگا، اس نے سوچا۔

”یاد ہے اس وقت تم کس طرح کوس رہے تھے جب تمہاری کار اس بوڑھے کی کار کے پیچھے پھنس گئی تھی جو ہائی وے پر بہت سست رفتاری سے گاڑی چلا رہا تھا؟ تب تم نے

تاش

ایک سنسان سڑک پر ایک راہ گیر نے ایک صاحب کو روکا اور کہا۔ ”کیا آپ ایک روپے کا سکہ عنایت کردیں گے؟“

وہ صاحب بولے۔ ”ضرور ضرور، مگر آپ کو اس وقت اس کی کیا ضرورت پیش آگئی؟“

راہ گیر نے جواب دیا۔ ”بات یہ ہے کہ میں اور میرا ساتھی یہ ایک روپے کا سکہ اچھال کر یہ فیصلہ کرنا چاہتے ہیں کہ ہم میں سے کون آپ کا موبائل لے گا اور کون آپ کا بٹوا لے گا۔“

کہا تھا۔ اگر میں بھی اس طرح کا احمق بوڑھا ہوگیا تو تم بس مجھے مار ڈالنا۔“

”میں نے ایسا کچھ نہیں...“

”اور گزشتہ ماہ جب تمہیں ٹریفک کی روانی میں رکاوٹ ڈالنے پر اس وقت روک لیا گیا تھا جب تم پچاس میل رفتار کے زون میں پچیس کی رفتار سے کار چلا رہے تھے اور تمہارا دایاں ہاتھ کا انڈیکیٹر چھ میل تک مسلسل بلنک کرتا رہا تھا...“ میری نے قہقہہ لگاتے ہوئے کہا۔

”میں بغلی سڑک کو دیکھ رہا تھا اس لیے قدرے ہلکی رفتار سے گاڑی چلا رہا تھا۔ تم اس بات پر بحث برخاست کردو۔“ وہ غصے میں آگیا اور اٹھ کر جانا چاہتا تھا لیکن اس کی ٹانگیں بے جان سی محسوس ہورہی تھیں۔ ”اس میں ایسی کیا بات تھی؟“ وہ بمشکل یہ کہہ سکا۔

”تم ان تمام بوڑھے لوگوں کی طرح ہو جن سے تم اس وقت نفرت کیا کرتے تھے جب تم جوان تھے۔ ان تمام بوڑھوں کی طرح جن کا تم مذاق اڑایا کرتے تھے۔ اب تم بھی انہی میں سے ہو، تم بھی بالکل انہی کی طرح۔“

ہورس کو اپنی سانسیں درست کرنے میں دقت پیش آرہی تھی۔ وہ اپنی بیوی کی صورت تکے جارہا تھا جس کے ہونٹوں پر ایک فاتحانہ مسکراہٹ رقصاں تھی۔ ایک ایسی مسکراہٹ جس سے اس کی نفرت بڑھتی جارہی تھی۔

وہ اپنی بیوی کو دیکھ رہا تھا جو چھوٹے چمچے کی مدد سے

اپنی کافی کے کپ میں چینی ملا رہی تھی۔ وہ کپ میں چمچے کو اس انداز سے ہلا رہی تھی کہ چمچہ بار بار کپ کے کناروں سے ٹکرا رہا تھا اور اس سے ٹکرانے کی جو آواز پیدا ہو رہی تھی وہ ہوریس کو بہت گراں گزر رہی تھی۔ وہ اس آواز سے ہمیشہ نفرت کرتا تھا۔

اور میری کو معلوم تھا کہ اس کا شوہر چمچے کے ٹکرانے کی آواز سے نفرت کرتا ہے۔ اسی لیے وہ جان بوجھ کر یہ آواز پیدا کر رہی تھی۔

''لعنت ہو!'' ہوریس بڑبڑایا۔ ''تم یہ باتیں مجھ سے کیوں کہہ رہی ہو؟'' وہ ہانپ رہا تھا اور اس کے حلق سے خرخراہٹ کی سی آواز نکل رہی تھی۔

''تاکہ تم سمجھ جاؤ۔ تم تسلیم کرلو کہ اب تم بھی انہی لوگوں میں سے ایک ہو جو تمہارے خیال میں بیکار اور بے فائدہ ہوتے ہیں اور راہ میں حائل ہوتے ہیں۔''

''میں...''

''بہرحال، اب اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔'' میری نے کہا۔ ''تم انہی میں سے ہو اور تمہاری فرض شناس بیوی کی حیثیت سے میں وہی کچھ کیا ہے جو تم نے مجھ سے کرنے کو کہا تھا۔'' یہ کہہ کر وہ چمچہ چلانے اور اسے کپ کے کناروں سے ٹکرانے لگی۔

''کیا؟'' وہ بمشکل کہہ پایا۔

''میں تمہارے کیپسولز میں سے کچھ نکال کر اس کی جگہ کچھ ڈالتی رہی ہوں۔''

ہوریس نے اپنی دواؤں کی بوتلوں پر نظریں مرکوز کرنے کی کوشش کی۔ کیپسولز انہی بوتلوں میں بند تھے۔

''مہینوں سے میں ان کیپسولز کو کھول کر ان میں سے تھوڑی سی دوا نکالتی اور اس کی جگہ کچلے کا جوس بھرتی رہی ہوں۔'' میری اس کی جانب دیکھ کر مسکراتے ہوئے بولی۔ ساتھ ہی اپنی کافی کا کپ منہ سے لگالیا۔

ہوریس احمقانہ انداز میں آنکھیں پھاڑے اپنی بیوی کو گھور رہا تھا۔ میری نے کافی ختم کرنے کے بعد دوبارہ اپنا کپ بھرا اور اس میں مزید چینی ڈال کر چمچہ چلانے لگی۔ ہوریس کی احمقانہ نگاہیں میری کے ہاتھ کی حرکت پر مرکوز ہو گئیں۔ وہ چند لمحوں تک اسے کپ میں چمچہ چلاتے دیکھتا رہا۔ پھر تن کر بیٹھ گیا اور اپنی نظریں میری کے چہرے پر جما دیں۔

''تم کیا کہہ رہی ہو؟'' اس نے بھرائی ہوئی آواز میں پوچھا۔

''میں یہ کہہ رہی ہوں احمق بڈھے کھوسٹ کہ میں نے تمہاری خواہشات کی تکمیل کردی ہے۔ تم چاہتے تھے ناکہ جب تم ان جیسے ہو جاؤ تو میں تمہیں مار ڈالوں۔ ویل تم ان جیسے ہو چکے ہو اور میں نے تمہیں مار دیا ہے۔'' میری کے ہونٹوں پر اس کی مخصوص فاتحانہ مسکراہٹ ابھر آئی۔ ''اور تمہاری ان تمام بیماریوں کی بنا پر کون یہ گمان کرسکتا ہے کہ تمہاری موت زہر دینے کی وجہ سے واقع ہوئی ہے؟''

ہوریس ایک دو لمحے تک آنکھیں پھاڑے تکتا رہا، پھر اپنی کرسی پر ڈھے گیا۔ اس کے حلق سے عجیب سی آوازیں نکل رہی تھیں۔

لگتا ہے کہ بڈھے کا کام تقریباً تمام ہو گیا۔ میری نے اپنی کافی میں مزید چینی ڈالنے کے بعد چمچہ چلاتے ہوئے سوچا۔ وہ بے خیالی میں بدستور چمچے کو کپ کے کناروں سے ٹکرا کر آواز پیدا کر رہی تھی۔ اب وہ ذہنی طور پر خود کو قدرے ہلکا محسوس کر رہی تھی۔

ہوریس کی نظریں مسلسل میری کے چہرے پر جمی ہوئی تھیں۔ تب کافی کا گھونٹ بھرنے کے دوران میری کو احساس ہوا کہ ہوریس قہقہے لگا رہا ہے۔

وہ ہانپتے ہوئے بھرائی ہوئی آواز میں بولا۔ ''میں نے کپ بورڈ میں رکھا ہوا کچلے کے جوس کا ڈبا دیکھ لیا تھا۔'' اس نے بے ڈھنگے انداز میں اپنا ہاتھ لہرایا۔ ''اور میں بھی وہ زہر تمہاری چینی میں...'' اس کی آواز غائب ہو گئی البتہ منہ بدستور حرکت کر رہا تھا۔ اب اس کی زبان سے کوئی لفظ ادا نہیں ہو رہا تھا۔

پھر ہوریس کی آنکھیں ساکت ہو گئیں اور وہ اپنی کرسی پر آگے کی جانب اس طرح ڈھلک گیا کہ اس کا سر ناشتے کی میز پر جا کر ٹک گیا۔

میری کے ذہن کا ایک حصہ سوچ رہا تھا کہ یہ بڈھا مرتے مرتے بھی اپنے بے ڈھنگے پن سے باز نہ آیا۔ ساتھ ہی ذہن کا دوسرا حصہ سوچنے لگا کہ بڈھے نے کیا الفاظ کہے تھے۔ پھر ہوریس کے آخری الفاظ کی حقیقت کا احساس ہوتے ہی میری کی آنکھیں خوف و دہشت سے پھیل پڑیں۔

اس نے اپنی نگاہیں احمق بوڑھے کھوسٹ پر مرکوز کرنا چاہیں لیکن وہ تیزی سے دھندلا رہی تھیں۔ پھر دیکھتے ہی دیکھتے اس کی آنکھوں کے سامنے گہرا اندھیرا چھا گیا اور اس کا ذہن تاریکی میں ڈوبتا چلا گیا۔

ڈھونگی

مختار آزاد

مسند نشین کبھی پسند نہیں کرتے کہ ان کی حکمرانی کا سورج غروب ہو... اس کا بھی یہی ارمان تھا کہ اس کی بادشاہی ہمیشہ کے لیے تاباں و درخشاں رہے... مگر اچانک ہی اس کا ایک جانشین سامنے آگیا... اعصاب شکن ماحول میں لمحہ بہ لمحہ ماورائیت کے زینے عبور کرتی دلچسپ و تحیر انگیز مغرب کی فتنہ سازیاں...

طاقت و اقتدار کے ایوانوں کو ہضم کر دینے والی پُراثر کہانی...

ڈاکٹر لیونارڈ آندھی طوفان کی طرح قصبے میں داخل ہوا تھا۔ مقامی اخبارات میں اسی کے چرچے تھے۔ میٹنگ روم سے کنسرٹ ہال تک، اس کی باتیں ہی گپ شپ کا موضوع تھیں۔ لوگوں کے ہجوم میں وہ اس طرح.... لہراتا ہوا چلتا جیسے کوئی ہیرو ہو۔ چمکیلی آنکھیں، طوطے جیسی ناک، لمبا قد.... لیونارڈ نسلاً انگریز تھا۔ خبریں یہی تھیں کہ وہ برطانیہ سے تعلق رکھتا ہے اور روحانی دورے پر امریکا آیا ہے۔ وہ روحانی معالج کہلاتا تھا لیکن اس کا حلیہ اور انداز

خطابت مذہبی مبلغ جیسا تھا۔ البتہ جب نہایت سنجیدگی سے گمبھیر لہجے میں لب کشائی کرتا تو وائس پروفیسر لگتا تھا۔

اسے دیکھ کر نہیں لگتا تھا کہ وہ کبھی مسکرایا بھی ہوگا بالفرض اگر وہ ہفتے میں ایک بار مسکراتا بھی ہو تو وہ بھی تنہائی میں۔ لوگوں نے اس کے چہرے پر ایک بار بھی ہلکی سی مسکراہٹ تک نہیں دیکھی تھی۔ اس کی شخصیت سے بظاہر اعلیٰ دماغی جھلکتی تھی۔ اس نے گھٹیا اخبارات کے ذریعے قصبے والوں کو پیغام دیا کہ وہ ان کی آنکھوں پر پڑے پردے اٹھانے کے واسطے یہاں آیا ہے۔ ان دنوں پورے قصبے میں اس بیان کے چرچے تھے۔ ہر کوئی آنکھوں پر پڑے پردے کی وضاحت چاہتا تھا۔ بہت سارے اپنی اپنی عقل کے مطابق اس کی وضاحتیں کرتے پھر رہے تھے۔ کچھ کے لیے لیونارڈ کا بیان صرف بکواس تو بعض تنگی مزاجوں کے لیے آنے والے طوفان کا پیش خیمہ تھا۔

اس میں قسمت کا کوئی عمل دخل ہے اور نہ ہی میں اس پر کچھ خاص یقین رکھتا ہوں۔ سیدھا سادہ دنیادار نوجوان ہوں اور مجھے دین داری سے کوئی خاص لگاؤ نہیں۔ اگر میں لیونارڈو معاف کیجیے المعروف ڈاکٹر لیونارڈ کی روحانی کفلوں میں شریک تھا تو صرف اس لیے کہ مجھے اس کے ساتھ انصاف کرنے والی نے بھیجا تھا۔ ہال کھچا کھچ بھرا ہوا تھا۔ آرکسٹرا کے قریب رہنے کے واسطے میں نے ایک مناسب کرسی پر قبضہ جمالیا تھا۔ صاف ظاہر ہو رہا تھا کہ وہ اچھا شو پیش کرنے والا فنکار ہے۔

''بب... اس کے ہر ایکشن کو غور سے دیکھنا۔'' میڈم سیلینا نے سرگوشی کی۔ اس کی گود میں اخباروں کا ڈھیر اور چہرے پر پریشانی کے آثار نمایاں تھے۔ وہ ساتھ ساتھ نئے اخبارات اور رسائل پر بھی نظر ڈالتی جا رہی تھی۔ میں نے کن انکھیوں سے دیکھا۔ یقین تھا کہ ان میں ایسی کوئی بھی کام کی بات نہیں ہوگی جس کا میڈم کی ذات سے کچھ لینا دینا ہو۔ کچھ ہی دیر میں اس نے اخبارات ورسائل کا پلندہ اپنے بیگ میں ٹھونسا۔ میڈم کے فارغ بیٹھنے کا یہ نتیجہ نکلا کہ اب اس کی پوری توجہ میری طرف مرکوز ہو چکی تھی۔

چند روز پہلے تک وہ قصبے کی سب سے معروف اور واحد روحانی معالج تھی۔ قسمت کا حال بتانے سے لے کر اخلاقی درس دینے اور بھلائی کے لیے خیرات جمع کرنے تک، ہر موضوع پر وہ سب سے آگے تھی۔ میں اس کا معاون خاص بہ نام ہوں۔ اس کی روحانی شفا گاہ 'پارلر' سے لے کر تمام رد فیصلوں تک، ہر کام وہ میری مدد سے ہی پایۂ تکمیل تک پہنچاتی تھی۔ لوگوں میں مشہور کر چکی تھی کہ اس کے قبضے میں روم کے ایک مقتول شہنشاہ آرلیس کی روح ہے جو حالت مراقبہ میں اسے ہر سوال کا جواب بتا دیتی ہے۔ مراقبے کے لیے درکار 'خاص' کیفیت کے لیے پارلر میں خصوصی طور پر خفیہ انتظامات تھے۔ آرلیس کی روح اور اپنی ذہانت کی بدولت وہ دونوں ہاتھوں سے نوٹ چھاپ رہی تھی۔

یہ دھندا برسوں سے جاری تھا۔ اسٹاک مارکیٹ کے سٹہ بازوں سے لے کر گھڑ دوڑ پر جوا کھیلنے والوں تک، اس قماش کے لوگ جس کی تلاش میں اس کے دروازے کے چکر لگاتے رہتے تھے۔ وہ یہ سب کچھ خدا ترسی میں نہیں کرتی تھی۔ حیرت انگیز طور پر اکثر اس کی پیش گوئیاں درست ثابت ہوتی تھیں اور یوں وہ جیب کے مال میں حصے دار بھی بن جاتی تھی۔ جواری بھی بگاڑنے کے بجائے اسے سونے کا انڈا دینے والی مرغی سمجھ کر مال غنیمت میں سے حصہ خاموشی سے ادا کر جاتے تھے۔

ایک دو بار کچھ اور عاملین نے قصبے میں پاؤں جمانے کی کوشش کی لیکن ان کا وہ حشر ہوا کہ راتوں رات دم دبا کر بھاگ اٹھے۔ میڈم قصبے کی بلا شرکت غیرے روحانی معالج تھی۔ لوگ اس پر یقین کرنے اور اس کے گن گانے بھی تھے لیکن اب ہوا کا رخ بدل رہا تھا۔ چند روز تو اس نے کوئی خاص توجہ نہ دی لیکن جب حالات واضح طور پر بگڑنے لگے تو وہ میدان میں کود پڑی۔ لیونارڈو عام طور پر اخلاقی درس اور 'خاص' لوگوں کو مسائل سے چھٹکارا دلانے میں مصروف تھا۔

اسٹیج پر بدستور پردہ پڑا تھا۔ وقت گزاری کی خاطر میں نے میڈم کو متوجہ کرتے ہوئے کہا ''اس کام میں آرلیس مدد نہیں کر سکتا'' مگر اس نے کوئی توجہ نہ دی۔ جب اس نے کافی دیر تک کوئی جواب نہ دیا تو میں نے دوبارہ کوشش کی لیکن بات ادھوری رہ گئی۔

''سن چکی ہوں۔'' اس نے مجھے گھورا۔ ''وہ اس معاملے میں قطعی کوئی مدد نہیں کر سکتا۔'' یہ کہہ کر اس نے مجھے یوں دیکھا جیسے وارننگ دے رہی ہو۔ ''چھوٹے چھوٹے کاموں کے لیے آرلیس کو تکلیف دینا ٹھیک نہیں۔''

میں اپنا سا منہ لے کر سامنے دیکھنے لگا۔ تھوڑی دیر بعد اس نے پکارا ''بب.....'' اس نے سرگوشی میں کہا۔ ''یورپ کا پورا دھندا بہت خطرناک ہے۔ انسانی دماغ.....'' اس نے بات ادھوری چھوڑی اور کسی کی طرف دیکھ کر ہاتھ ہلایا۔ وہ یقیناً اس کا کوئی منافع بخش روحانی

کانٹ ہوگا۔ اب ایک بار پھر وہ میری طرف متوجہ تھی۔

''دماغ کو تھوڑی بہت مدد کی ضرورت پڑتی ہے لیکن تم یہ کیوں سوچتے ہو کہ قسمت کے داغ دھونے جیسے کاموں پر چرچ کو زیادہ وقت اور دماغی صلاحیتیں صرف کرنی چاہئیں؟''

اس نے جواب طلب نگاہوں سے میری طرف دیکھا۔

میں خاموش رہا۔ ''انسانی دماغ روح کو محسوس کرسکتا ہے لیکن اسے حقیقت کا روپ دینے کی خاطر اسے شکل کی ضرورت پڑتی ہے۔''

مجھے اس کی بات سمجھ میں آئی اور نہ ہی میں نے اسے سمجھنے کی کوشش کی۔

''وہ کچھ چیزوں کی مدد لے کر شعبدے بازی کا ہی مظاہرہ کرے گا۔'' میڈم نے پھر سرگوشی کی۔ میں نے ہاں میں ہاں ملانے کے لیے اثبات میں سر ہلایا۔

لوگوں کی آمد کا سلسلہ جاری تھا۔ خاصی چہل پہل تھی۔ سب کی نگاہیں منتظر تھیں کہ کب اسٹیج پر گرا پردہ اٹھتا ہے۔ لوگ انتظار سے اُکتا کر اپنی بے چینی چھپانے کے لیے بار بار پہلو بدل رہے تھے۔

کچھ لوگ اپنا عقیدہ مزید پختہ کرنے کے لیے یہ سب دیکھنا چاہتا تو کچھ اس خیال کو غلط ثابت کرنے کے لیے یہاں آئے تھے لیکن میڈم سلینا کی بات اور تھی۔ اسے لیونارڈ کی صورت میں کاروباری حریف نظر آرہا تھا۔ وہ مجھ سمیت اپنے کئی ملازمین کو اس لیے یہاں لائی تھی کہ جان سکے کہ آخر اس بندے کی حقیقت کیا ہے۔

''جو کچھ اسٹیج پر ہوگا، وہ تو دیکھو گی ہی لیکن کیا اس کی مدد سے یہ بھی طے کرسکتی ہو کہ آخر یہ ڈاکٹر لیونارڈ ہے کیا بلا۔'' میں نے میڈم کو مخاطب کیا۔

''تم اس کی باتوں اور حرکتوں پر نظر رکھنا۔'' اس نے جواب دینے کے بجائے اُلٹا حکم دے دیا۔ ''سمجھ گئے؟'' اس نے حسبِ عادت گھورا۔

میں نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ یہ لیونارڈ کا چوتھا شو تھا لیکن اس کے بعد بھی لوگوں کا ذوق و شوق کم نہ ہوا۔ اس کے بعد میں نے اس کے مزید تین شو اور اٹینڈ کیے۔

میرا کام یہ تھا کہ لیونارڈ کے شو میں جاؤں اور واپس آکر میڈم کو ساری خبریں دوں کہ آخر وہ کیا کچھ کرتا ہے۔ اس دن بھی میں میڈم کو اس شو سے متعلق بتا رہا تھا جسے اس کے پرستار لیکچر کے معتبر نام سے پکارتے تھے۔

''لگتا ہے کہ وہ یا تو عامل ہے یا پھر کوئی بہت بڑا فنکار۔'' پوری روداد سن کر میڈم نے میری طرف دیکھا۔

''اس شو کی کوئی خاص بات؟''

''کچھ خاص نہیں، سب کچھ وہی تھا۔'' میں نے بیزاری سے کہا۔ ''وہی ماورائی باتیں، روحوں کی طاقت، دماغ کا کردار، ہاتھ کی ہتھیلی میں مقدر کا راز، ماتھے کی شکنوں پر زندگی کی تاریخ اور مستقبل کا قصہ۔'' ماجرا سن کر میڈم نے ہنکارا بھرا۔

''البتہ ایک بات ہے۔''

''وہ کیا؟'' میڈم نے چونک کر مجھے دیکھا۔

''وہ لائٹس، خاص طور پر گھومتی لائٹس کی مدد سے ایسا ماحول طاری کرتا ہے کہ اس پر نگاہیں ٹکانا مشکل ہوجاتا ہے۔ جب وہ حاضرین میں سے لوگوں کو اسٹیج پر بلا کر ان سے متعلق باتیں بیان کرتا ہے تو مجھے یوں لگتا ہے جیسے وہ سب جانا ناٹک رچے ہوں۔''

''میرا بھی کچھ ایسا ہی خیال ہے۔ وہ کوئی پہنچا ہوا شعبدے باز ہے۔'' میڈم نے تائید کی۔ ''مجھے لگتا ہے جس طرح وہ یہاں مشہور ہوچکا ہے ضرور کوئی بڑا ہاتھ دکھانے کے چکر میں ہے۔'' یہ کہہ کر اس نے میری طرف دیکھا۔ ''تم کیا کہتے ہو؟'' اس نے مجھے غور سے دیکھا۔

''ایسا ہوسکتا ہے۔'' یہ کہہ کر لمحہ بھر توقف کیا۔ ''ممکن ہے یہ غلط ہو لیکن فی الحال حتمی رائے قائم کرنا مشکل ہوگا۔''

''یہ ڈھونگی لوگوں کے لیے بہت بڑا خطرہ ہے۔'' اس نے کچھ توقف کے بعد میری طرف دیکھتے ہوئے کہنا شروع کیا۔ ''یہ شخص میرے دھندے پر لات مار کر مجھے میرے ہی شہر سے نکال باہر کرنا چاہتا ہے۔'' اس نے مجھے غور سے دیکھا۔ ''لیکن اب میں اسے سبق سکھا کر ہی رہوں گی۔ اسے جانا ہی ہوگا۔ ہم آرلیس کی مدد سے یہ کام کرلیں گے۔''

مجھے لگا کہ میں نے تفریح کی جو ٹھانی تھی، وہ خواہش تو پوری ہونے سے رہی۔ ''جیسا آپ ٹھیک سمجھیں۔'' میں نے بے دلی سے جواب دیا۔ ایسا پہلے بھی ایک دو بار ہوچکا تھا۔ مجھے یقین تھا کہ لیونارڈ کے معاملے میں بھی میڈم کچھ ویسی ہی چالیں چلے گی۔ وہ ایسی چالوں کی ماہر تھی مگر اس بار پانی کافی گہرا تھا۔ لیونارڈ کے ساتھ بڑی تعداد میں لوگ اپنا جذباتی تعلق قائم کرچکے تھے۔ اس طوفانی دریا کو جھوٹ کی کمزور ناؤ میں بیٹھ کر پار کرنے کے لیے بڑی احتیاط کی ضرورت پڑے گی لیکن یہ سب کچھ میں نے اس سے ہرگز نہیں کہا۔ یہ مشورہ دینا میرا کام نہیں بلکہ اس کی ہدایات پر عمل میرا فرض تھا، سو چپ بیٹھا رہا۔

''ہمیں کیا کرنا چاہیے؟'' آخر میں نے خود خاموشی

تو رُدی۔

"یہ میں طے کر چکی ہوں۔" اس نے کہا۔ "میں! جب میں کہوں، تم ویسا کرنے جانا۔" یہ کہہ کر اس نے سرگزشتی میں سارا منصوبہ میرے گوش گزار کیا۔

"ٹھیک ہے اب سمجھ گیا۔" میں نے پوری بات سننے کے بعد گھڑی پر نظر ڈالی۔ "میں چلتا ہوں۔" اس نے سر ہلا کر اجازت دے دی۔

پروگرام کے مطابق میں اِدھر اُدھر گھومتا گھماتا میڈم کے پسندیدہ رپورٹر جم نامی کے پاس پہنچا۔ اس کی یادداشت غضب کی تھی اور شاطر دماغ بہت تیز چلتا تھا۔ سمجھو کہ وہ اس قصبے کی وائی تھا۔ کوئی ایسی بات نہیں جو اس کی تیز نگاہوں سے اوجھل رہ سکے۔ کوئی ایسا واقعہ نہیں جو اس کی یادداشت میں محفوظ نہ ہو۔ جہاں گرد تھا مگر اب برسوں سے یہیں ٹکا ہوا تھا۔ میڈم کی ترکیب یہ تھی کہ دن کے مناسب وقت پر اس کے پاس پہنچا جائے۔ جلد پہنچنے کا مطلب تھا کہ وہ رات بھر کی مے نوشی کی وجہ سے سر میں ہونے والے درد میں مبتلا ہوگا اور دیر کرنے کا مطلب تھا کہ وہ ایک بار پھر نا و نوش میں غرق ہو چکا ہوگا۔ ان دونوں حالتوں میں اس سے ملنے کا کوئی فائدہ نہ ہوتا۔ میں دوپہر کو وہاں پہنچا اور اس کا انجام بھی پایا۔

"تو تم آگئے؟" اس نے مجھے دیکھتے ہی کہا۔

"لیوبارڈ.... ڈاکٹر لیوبارڈ منقطن۔" یہ کہہ کر وہ ہنسا... "لگتا ہے تمہاری بوڑھی حسینہ اس بار خوب پھنسی۔" اس کا چہرہ چمک رہا تھا۔ ہونٹوں پر شرارتی مسکراہٹ تھی۔

"شاید ٹھیک کہہ رہے ہو۔" میں نے اس کے سامنے رکھی کرسی پر بیٹھتے ہوئے کہا۔

"غلط....." وہ چونک کر بولا۔ "شاید نہیں سو فیصد حقیقت... بالکل یقینی بات ہے کہ اس بار سیر کو سوا سیر پڑا ہے۔"

میں نے کوئی جواب نہیں دیا۔ سپاٹ نگاہوں سے اسے دیکھتا رہا۔

"کیوں آئے ہو؟" چند لمحوں بعد اس نے میڈم کا مذاق اڑانا بند کیا اور سوالیہ نگاہوں سے مجھے دیکھتے ہوئے سنجیدگی سے پوچھا۔

"میڈم نے پوچھا ہے کہ کیا تم اس کے ماضی کے بارے میں کچھ جانتے ہو؟" میں نے کہنا شروع کیا۔ "دراصل میڈم چاہتی ہے کہ اس کے برطانوی پس منظر میں کوئی ایسی خاص بات..."

"سمجھ گیا۔" اس نے میری بات مکمل ہونے سے پہلے ہی کاٹ دی۔

میں مسکرا دیا۔ یہ بھی میڈم کی ایک چال تھی۔ لیوبارڈ کا تعلق برطانیہ سے تھا اور وہ چاہتی تھی کہ اس کے ماضی کے بارے میں جتنا جان سکتی ہے، وہی اس سے مقابلے کے لیے اچھا ثابت ہوگا۔ میڈم کا کہنا تھا کہ ہر شخص میں ایک چھوٹی سی کمزوری پوشیدہ ہوتی ہے۔ یہ ہاتھ لگ جائے تو پھر بندر کو چھڑی کے اشاروں پر نچانا مشکل نہیں پھر یا تو بندر ناچتا ہے یا پوری قوت لگا کر رسی تڑوا کر واپس گھر کی راہ پر روز جاتا ہے۔ لیوبارڈ کے معاملے میں بھی وہ یہی ترکیب آزمانے کی کوشش کر رہی تھی۔ اسی لیے مجھے جم کے پاس بھیجا تھا۔

"بظاہر اس کا ماضی بے داغ نظر آتا ہے۔" کچھ دیر خاموش رہنے کے بعد اس نے کہا اور پھر ایک زوردار قہقہہ لگایا۔ "میں دیکھنا چاہوں گا کہ اس معاملے میں اب ڈرلیس اس کی کیا مدد کرتا ہے۔"

"میں میڈم کو بتا دوں گا۔" یہ کہتے ہوئے دروازے کی طرف بڑھا۔

"یہ مت کہنا اسے۔" جم نے اونچی آواز سے کہا۔ مجھے لگا کہ واقعی یہ بوڑھا میڈم سے بہت پیار کرتا ہے۔ "ایک اور کام کی بات سنتے جاؤ۔ یہاں کے انگریز اخبار نویس اس کے ساتھ ہیں۔ اس لیے بڑھیا سے کہنا کہ ذرا ہوشیاری سے چالیں چلے کہیں الٹا نہ پھنس جائے۔"

میں واپس پلٹا... اور جیب سے وہ نوٹ نکالے جو میڈم نے اس کے لیے دیے تھے۔ ڈالر دیکھ کر جم نے ہاتھ پھیلایا اور میں نے اس کی سرخ ہتھیلی پر نوٹ رکھ دیے۔ "جیتا رہ بھائی۔" اس نے ٹھنڈی سانس بھر کر میری طرف دیکھا اور نوٹ مٹھی میں بھینچ لیے۔

"اب میں چلتا ہوں۔"

"میری طرف سے اس بوڑھی گڑیا کا شکریہ ادا کرنا اور کہہ دینا کہ رابطے میں رہے۔" جم نے حسب عادت ایک زوردار قہقہہ لگانے کے بعد کہا۔

میں میڈم کے گھر پہنچا تو وہ میری ہی منتظر تھی۔ دیکھتے ہی کہنے لگی "کچھ امید ملی یا نہیں؟"

"وہ بچنے کے بارے میں ضرور بڑا امید تھا۔" میں نے اس کے سامنے رکھے صوفے پر بیٹھتے ہوئے کہا۔ "ویسے میں کسی اور شے کے بارے میں کچھ خاص نہیں جان سکا۔"

"لگتا ہے تب...! تم اس کی طرف سے بدگمان

ہو رہے ہو۔ یہ تو تم جانتے ہی ہو کہ جم نے ہمیں کبھی مایوس نہیں کیا، ہمیشہ مدد ہی کی ہے۔"

میں نے اثبات میں سر ہلا کر میڈم کی تائید کی۔

"ہمیں لیونارڈ ڈھونگی کو ناکام بنانے کے لیے دوسرے آپشنز بھی کھلے رکھنے چاہئیں۔" میڈم نے اپنے پالش لگے ناخنوں کی طرف غور سے دیکھتے ہوئے گمبھیر لہجے میں کہا۔

"ڈھونگی....." میں نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے طنزیہ جملہ کسا۔ خوش قسمتی سے وہ میری طرف متوجہ نہ تھی ورنہ شاید کان کھینچتی..... اگر لیونارڈ ڈھونگی تھا تو وہ خود کیا تھی۔ یہی دھندا وہ کر رہی تھی اگر ان کے درمیان کوئی شے وجۂ اختلاف تھی تو یہ صرف 'دھندا' تھا۔ ایک جنگل میں دو شیر، ایک میان میں دو تلواریں اور ایک قصبے میں دو عامل۔ اب ان میں سے کسی ایک کو ہی رہنا تھا۔ وہ یہاں پر راج کرنا چاہتا تھا اور میڈم کا راج پہلے سے ہی چل رہا تھا۔ شراکت دونوں کو قبول نہیں تھی۔

"ٹھیک ہے جم بائی کی باتیں دیکھو۔ میں سوچتی ہوں کہ اور کیا کچھ کیا جاسکتا ہے۔" کافی دیر کی خاموشی کے بعد میڈم نے کہا تو میں وہاں سے جانے کے لیے اٹھ کھڑا ہوا۔

شام ڈھلنے سے پہلے میں گرینڈ سینٹرل ہوٹل جا رہا تھا جہاں آج کل لیونارڈ اور اس کے حواریوں نے ڈیرے ڈال رکھے تھے۔ میڈم کی ہدایت کے مطابق میں نے عمدہ سوٹ پہن رکھا تھا۔ لیونارڈ تیسری منزل پر ٹھہرا تھا۔ ہوٹل استقبالیہ سے اس کا کمرا معلوم کر کے میں لفٹ کی طرف بڑھا۔ اس کا کمرا لابی کے ساتھ تھا۔ وہاں پہلے سے ہی کچھ مقامی اخبار نویس موجود تھے۔ وہیں موٹا ہاکنز بھی بھاگ دوڑ کرتا نظر آیا۔ سرخ گھنگریالے بالوں والا دراز قامت ہاکنز لیونارڈ کے پروگراموں کا منتظم تھا۔ بظاہر بھدا اور لباس کے معاملے میں خاصا شوخ لگ رہا تھا۔ اس وقت بھی وہ ایسے لباس میں ملبوس تھا جیسے کسی تیسرے درجے کے فیشن شو میں شرکت کے لیے آیا ہو۔ اسے قصبے میں آئے کچھ ہی دن ہوئے تھے مگر چرب زبانی اس کی پہچان بن چکی تھی۔ اب تک اس نے جتنے شو کیے اس کی کامیابی کا سہرا دراصل ہاکنز کے ہی سر تھا۔ وہ پبلسٹی اور شہرت کا ماہر لگتا تھا۔ اس وقت بھی وہ اخبار نویسوں کو کچھ ہدایات دے رہا تھا۔

میں ایک کونے میں صوفے پر بیٹھا ساری صورت حال کا مشاہدہ کر رہا تھا۔ اسی دوران لیونارڈ کے کمرے کے سامنے ایک بیل بوائے آیا لیکن اس سے پہلے کہ وہ دستک دیتا لیونارڈ باہر نکلا۔ بیل بوائے نے اسے دیکھ کر احتراماً سر جھکایا اور ایک قدم پیچھے ہٹا۔ لیونارڈ نے اسے کچھ ہدایات دیں اور وہ چلا گیا۔ اخبار نویس بھی اٹھ کر اس کی طرف بڑھے۔ بیل بوائے سے فارغ ہو کر وہ ان سے باتیں کرنے لگا۔ اس کی آواز بھاری لیکن لہجہ نہایت سنجیدہ تھا۔ وہ بردباری کے ساتھ ان سے بات کر رہا تھا۔ میں اس کی شخصیت کے وقار سے لحہ بھر کو ضرور متاثر ہوا۔ ویسے بھی اس کی شخصیت میں ایک خاص قسم کی پوشیدہ کشش محسوس ہو رہی تھی۔

اسی دوران راہداری میں ایک لڑکی نظر آئی۔ میری توجہ اس کی طرف ہو گئی۔ وہ ہاکنز کے پاس آ کر کھڑی ہو گئی۔ لیونارڈ نے مڑ کر ایک نظر لڑکی پر ڈالی اور پھر اخبار نویسوں کی طرف متوجہ ہو گیا۔ عمر کے لحاظ سے وہ ہاکنز کی بیٹی یا اس کی چھوٹی بہن ہو سکتی تھی۔ سنہرے بال، کریم کلر کا لباس، دراز قامت اور نیلی آنکھیں، وہ نہایت حسین لگ رہی تھی۔ میں سوچ رہا تھا کہ ہاکنز کا اس سے ضرور کوئی رشتہ ہے یا پھر وہ لیونارڈ کی کوئی حواری ضرور ہو گی۔

میں اٹھا اور اس طرح اس کے برابر سے گزرنا چاہا جیسے کوریڈور سے ہوتا ہوا زینے کی طرف جانا چاہتا ہوں۔ میرے قدم بہت سستی سے اٹھ رہے تھے۔ "ہائی ٹی کا وقت ہو چکا۔" میں ان کے قریب سے گزرا تو سنا۔ وہ لڑکی ہاکنز سے سرگوشیانہ لہجے میں کہہ رہی تھی۔ "ہمیں ڈائننگ ہال جانا ہوگا۔" لڑکی نے کلائی پر بندھی گھڑی پر نظر ڈالی۔

میں جلدی جلدی سیڑھیاں اترتے ہوئے ڈائننگ ہال کے دروازے پر پہنچا تو طرح طرح کی خوشبوؤں نے میری بھوک بھی بڑھا دی۔ ویسے بھی لنچ نہیں کیا تھا۔ ہال میں داخل ہوا تو وہ اپنے پرستاروں سے مل رہا تھا۔ میں آگے بڑھا اور ٹرے سے ایک پیسٹری نکال کر کھڑا ہو گیا۔ وہ بھی اسی سمت بڑھ رہا تھا۔ یقین تھا کہ وہ پرستار سمجھ کر مجھے اپنی دعاؤں سے نوازے گا لیکن کوئی توجہ دیے بغیر وہ آگے بڑھ گیا۔ سامنے لابی والا بیل بوائے کھڑا تھا۔ وہ لڑکی لیونارڈ سے تھوڑے فاصلے پر کھڑی تھی۔ "نوجوان..... اگر تم گاڑی تک پہنچنے سے پہلے اسے روک کر میرا پیغام پہنچا دو گے تو تمہیں انعام دوں گا۔" اس نے بیل بوائے سے سرگوشی کی۔

"آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں سر!" اس نے ہوٹل ملازمین کے مخصوص کاروباری خادمانہ انداز میں مسکراتے ہوئے دھیمی آواز سے کہا۔ "لیکن بات یہ ہے کہ....."

ٹنل بوائے کی پیش روپیش سن کر میں جھٹ سے آگے بڑھا اور ہنٹ سے لیونارڈ کے سامنے اپنی خدمات پیش کردیں۔ ”یہ کام تو میں بھی کرسکتا ہوں۔“

اُس نے مجھے سر سے پیر تک گھورا۔ وہ میرے کہے پر اعتبار کرنے سے پہلے شاید خود کو یقین دلانے کی کوشش کررہا تھا۔ اسی دوران وہ لڑکی ڈائننگ ہال سے باہر نکلنے لگی۔ لیونارڈ نے ایک نظر اس پر ڈالی اور کہا ”اوکے۔“ اس کے ساتھ ہی اس نے اپنے لبادے کی جیب سے ایک لفافہ نکال کر میری طرف بڑھایا۔ ”یہ اس تک پہنچادو۔“ تب تک وہ باہر جاچکی تھی۔

میں نے لفافہ اُچکا اور تیزی سے آگے بڑھا لیکن میرے قریب پہنچنے سے پہلے وہ باہر نکل چکی تھی۔ اس کی رفتار خاصی تیز تھی۔ اس دوران، چلتے چلتے سربمہر لفافے کو کھولنے کی کئی کوششیں کیں۔ کوئی اور وقت ہوتا تو ایسا ممکن تھا مگر اس وقت جلدی میں تھا۔ میں نے آخری کوشش کی اور چند لمحوں کے لیے رکا مگر بند لفافہ کھولنے میں ناکام رہا۔ محسوس ہوتا تھا کہ اس کے اندر کوئی خط ہے۔ میں باہر نکلا۔ دونوں طرف دیکھا۔ وہ داہنے ہاتھ پر ٹیکسی اسٹینڈ کے قریب پہنچ چکی تھی۔ میں نے تیزی سے قدم بڑھانا شروع کیے اور اس سے پہلے کہ وہ ٹیکسی لیتی، میں اس کے سر پر پہنچ گیا۔

مجھے دیکھ کر اس کا چہرہ بے تاثر رہا۔ وہ ایک اجنبی کو دیکھ کر قطعی حیران محسوس نہیں ہوئی تھی۔ مجھے لگا کہ وہ ہوٹل کے اندر مجھے دیکھ چکی ہے۔ میں نے لفافہ اس کی طرف بڑھایا۔

”مس.....“ میں نے لہجے میں جہاں بھر کی شیرینی سمیٹ کر مسکراتے ہوئے مخاطب کیا۔ ”یہ پیغام آپ کے لیے۔“

اس نے لفافہ لیا اور کندھے سے... پرس کو اتارا۔ میں تذبذب میں تھا۔ توقع کررہا تھا کہ وہ لفافہ کھولے گی۔ میں نے ہچکچاتے ہوئے کہا۔

”اس کا جواب دینا چاہیں گی؟“

”نہیں۔“ اس نے بنا کھولے ہی لفافہ پرس میں ڈال لیا تھا۔ اس کے چہرے پر بڑا سا پیچ دار ہیٹ تھا اور وہ جھک کر لفافہ بیگ میں رکھ رہی تھی۔ میں اس کی آنکھوں اور چہرے کے تاثرات نہ دیکھ سکا۔

”میرا خیال ہے کہ تمہیں ضرور کچھ دینا چاہیے۔“ اس نے پرس کی طرف ہاتھ بڑھایا۔ اس کا لہجہ استفساریہ تھا۔

”جیسا آپ چاہیں۔“ میں نے محسوس کیا کہ اس کے لہجے میں بے اعتنائی لفافہ لینے کے بعد آئی تھی۔ ذرا قریب سے دیکھا تو وہ زیادہ پُرکشش دکھائی نہیں دی۔

”یہ لو.....“ اس نے چند نوٹ میری طرف بڑھائے، جسے میں نے شکریے کے ساتھ قبول کرکے جیب میں ڈالے اور ہوٹل کی طرف دوڑ لگادی۔

لیونارڈ ڈائننگ ہال کے باہر ہی کھڑا نظر آگیا۔ اس وقت وہ تنہا تھا۔ ”سر! پیغام پہنچادیا۔“ میں نے تابعداری سے کہا۔ ”اگر کوئی اور خدمت ہو تو حاضر ہوں۔“

”شکریہ..... فی الحال ایسا تو کوئی خاص کام نہیں۔“ اس نے بڑے پیار سے میری پیشکش مسترد کرتے ہوئے ایک ڈالر کا نوٹ میری طرف بڑھایا۔

جب واپس جاکر میڈم کو یہ ساری روداد سنائی تو وہ بھی اُس کی طرح بہت خوش ہوئی۔ ”یہ بہت اچھا ہوا۔“ اس نے کہنا شروع کیا۔ ”میں سوچ رہی ہوں کہ تمہیں اس کا پیچھا کرتے رہنا چاہیے، اسی طرح اُس کی کمزوری کا پتا چلے گا۔“ میڈم کی سوئی اب تک اسی پر اٹکی ہوئی تھی لیکن آزمودہ حربے پر ہی اٹکی تھی۔ ”ویسے وہ بہت چالاک ہے، ہمیں سوچ سمجھ کر ہی آگے بڑھنا ہوگا۔“

”ہوسکتا ہے کہ وہ لڑکی اگلی بار مجھے پہچان لے۔“

”تم حلیہ بدل لو۔“ اس نے میرے سراپا پر نظر ڈالی۔ ”اس نے تمہیں سوٹ میں دیکھا ہے۔ ذرا عام سے کپڑے پہنو، پھر وہ تمہیں نہیں پہچان سکے گی۔ میں چاہتی ہوں کہ تم اس لڑکی کو تلاش کرو اور ہوٹل ہو یا سڑک اس کا تعاقب کرو۔“ یہ کہہ کر اس نے توقف کیا اور خلا میں دیکھا۔ ”ممکن ہے ہمیں اُسے دھوکے باز ثابت کرنے کے راز کا سراغ مل جائے۔“

”بالکل ٹھیک.....“

”جلدی کرو، ہمارے پاس وقت کم ہے جیب۔“ اس نے تنبیہی لہجے میں ہدایت کی۔

مجھے بالکل حیرت نہ ہوئی۔ میڈم کو خوف تھا کہ کہیں لیونارڈ اینڈ کمپنی یہاں اپنی جڑیں مضبوط نہ کرلے۔

”تمہیں ایک دو دن اس کے قریب گزارنے ہوں گے۔“ میڈم نے اپنے منصوبے کے بارے میں بتایا۔ ”ویسے میں نے بعض اخبارات کو جعلی نام سے خط لکھے ہیں جن میں اس کے کام کی تعریف ہے لیکن ڈھکے چھپے لفظوں میں تنقید بھی کی ہے۔ میں چاہتی ہوں کہ اس کے خلاف راہ ہموار ہونے لگے۔“

”ٹھیک ہے، میں اسے تلاش کرتا ہوں۔“ یہ کہہ کر میں اپنے گھر آیا۔ کپڑے بدلے اور اسے ڈھونڈنے نکل گیا۔ وہ

نوادار تھی۔ ڈھونڈنا مشکل تھا لیکن چھوٹے سے قصبے میں اس کام پر مجھے زیادہ محنت نہیں کرنا پڑی۔ وہ ایک ریستوران میں نظر آگئی۔ اس کے بعد دو روز میں نے اس پر نظر رکھی۔ سچ کہوں تو وہ مجھے پسند آنے لگی تھی۔ اس دوران وہ گرانڈ سینٹرل ہوٹل گئی، لیونارڈ سے اس کے کمرے میں جاکر ملاقات بھی کی۔

میں میڈم کو تمام حالات سے باخبر رکھ رہا تھا لیکن حیرت اس پر تھی کہ جب آدلیس کی روح اس کے قبضے میں تھی تو پھر وہ لیونارڈ کا ماضی جاننے کے لیے اس کی مدد کیوں نہیں لے رہی تھی۔ مجھے خوامخواہ جن چکر بنا رکھا تھا۔

لیونارڈ کے چکر میں گرانڈ سینٹرل ہوٹل کے باہر فضول میں آوارہ گردی کرنے، ہوٹل کے اندر چکر لگاتے، لیونارڈ کے کمرے کے باہر سے گزرتے ہوئے تین دن ہوچکے تھے مگر کوئی کام کی بات پتا نہیں چلی۔ مجھے یہ کام نہایت بور محسوس ہورہا تھا۔ میڈم کا حکم نہ ہوتا تو کبھی یہ بکواس کام نہ کرتا مگر کیا کروں وہ سب سے زیادہ مجھ پر اعتبار کرتی تھی اور یہی بات ہر بار میرے لیے مصیبت کا سبب بنتی۔ جہاں میڈم پر کوئی افتاد پڑی، بھاگ دوڑ میرے نصیب میں آجاتی تھی۔ ہمیشہ یہی سوچتا کہ اگلی بار صاف جواب دے دوں گا لیکن جب وقت آتا تو پھر بندۂ بے دام کی طرح اس کے اشاروں پر ناچنے لگتا۔ اب تو مجھے یہی شبہ ہونے لگا تھا کہیں آدلیس کی روح سے مدد لے کر اس نے میری اپنی روح کو اپنے قبضے میں نہ کرلیا ہو ورنہ شاید میرا رویہ ایسا نہ ہوتا۔

سچ تو یہ ہے کہ شاید میڈم کو اس سے کوئی مدد نہ ملے مگر میں کئی باتیں جان چکا تھا۔ اس کا نام مس ہیگر تھا۔ وہ مسز ہاکنز کے ساتھ ایک موٹل میں رہ رہی تھی۔ اسی کے طفیل قصبے کی تفریح یا ہر سڑک کا طواف میرا مقدر بن چکا تھا۔

ایک عجیب بات تھی۔ روزانہ شام ڈھلے ایڈیسن اسٹریٹ پر واقع موٹل سے نکلتی۔ ٹیکسی لے کر خاص جنجر گارڈن جاتی۔ وسیع و عریض گارڈن میں اس وقت عموماً بہت کم لوگ ہوتے تھے۔ وہ کسی گوشے میں جاکر میری نظروں سے اوجھل ہوجاتی۔ میری اپنی بھی کوشش ... یہی ہوتی کہ اس کی نظروں میں نہ آؤں۔ اس کے پہنچنے کے بعد ایک کار وہاں پہنچتی۔ بڑے سے ہیٹ کے نیچے چہرہ چھپائے ایک مرد وہاں پہنچتا۔ پھر وہ بھی کسی گوشے میں غائب ہوجاتا۔ کافی دیر بعد وہ اجنبی نکلتا۔ اس کے بعد مس ہیگر نمودار ہوتی۔ گارڈن کے سامنے سے وہ ٹیکسی لے کر قصبے کے تجارتی مرکز جاتی۔ وہ تین دکانوں کے چکر لگاتی۔ اس کے ہاتھ میں پکڑے تھیلوں سے صاف نظر آتا تھا کہ وہ کھانے پینے کی چیزیں ہی ہوں گی۔ پھر وہ ٹیکسی لیتی اور موٹل پہنچ جاتی۔

چوتھے دن میں نے اجنبی کا راز جاننا چاہا اور اس کا پیچھا کیا۔ مس ہیگر معمول کے مطابق گارڈن میں پہنچ چکی تھی۔ جب اجنبی نظروں سے اوجھل ہوا تو میں نے تلاش شروع کردی۔ خلاف معمول آج وہ جلدی پلٹ آیا۔ جب وہ گاڑی کی طرف بڑھ رہا تھا تو میں نے پہچان لیا۔ وہ لیونارڈ تھا۔ میری دانست میں یہ بڑی کامیابی تھی۔ اس کے بعد مجھے مس ہیگر کے تعاقب کی ضرورت محسوس نہیں ہوئی۔

میں نے یہ راز پاتے ہی فوراً میڈم کے گھر کا رخ کیا۔

”تمہاری خدمات قابل قدر ہیں ہپ۔“ پھولی سانسوں کے دوران میڈم کو پوری روداد سنا چکا تو اس نے بغور میرا جائزہ لیتے ہوئے کہا اور چند لمحوں کے توقف کے بعد سرد لہجے میں بولی۔ ”مجھے اس طرح کے کام پسند نہیں۔“ یہ کہہ کر اس نے نخوت سے منہ دوسری طرف موڑ لیا۔

جسے میں کامیابی سمجھ رہا تھا، وہی بات مجھے ذلیل کرا گئی تھی۔ جس پر خود کو انعام کا مستحق سمجھا، اب اسی کے باعث سر جھکائے شرمندگی سے بغلیں جھانک رہا تھا۔ اگر کوئی میڈم ملینا کو نہیں جانتا تو اس کے لیے ضرور یہ بات حیرت کی ہوگی لیکن مجھے اس کے رویے پر کوئی حیرت نہیں ہوئی۔ میں اس کے رنگ روپ سے اچھی طرح واقف تھا۔ ملنے والی معلومات پر پہلے تو وہ ایسا ہی رویہ اپناتی اور پھر تمام جمع شدہ معلومات پر نہایت غور و خوض کے بعد لائحہ عمل اپناتی۔ کامیابی ملتی تو سہرا آدلیس کی روح اور میڈم کے نام بندھ جاتا۔ تاکامی کی نوبت آتی پچھلا کا سیشن منعقد کرتی تھی۔ ایسے میں آدلیس کی روح پر میرا اشک اور بھی مضبوط ہوجاتا تھا۔

اس روز میڈم نے ایک اہم پیشگوئی بھی کی تھی۔ ”ڈھونگی لیونارڈ ایک ہفتے کے اندر اندر اس کے پارلر میں آئے گا۔“ مجھے یقین تھا کہ وہ کہہ رہی ہے تو ایسا ہوگا، ضرور اس نے ایسی کوئی اور چال بھی چلی ہوگی جس کا مجھے علم نہیں۔ ویسے بھی میں اس کا صرف ایک مہرہ تھا، جس کا کام بساط پر صرف اپنی سمت میں آگے بڑھتا ہوتا ہے کھلاڑی کے اشارے پر۔

پارلر میڈم کے تمام نہاد روحانی دھندے کا مرکز تھا۔ آخر پیشگوئی کے عین مطابق ہفتے کے اختتام سے قبل ہی لیونارڈ مس ہیگر اور اپنے دیگر حواریوں سمیت میڈم کے پارلر پہنچ گیا۔ اس کے ساتھ ایسے کئی مقامی اخبار نویس بھی

تھے جو اُن روزں لیونارڈ کی مدح سرائی میں ایک دوسرے پر سبقت لے جانے میں جتے ہوئے تھے۔ انہی کے درمیان میڈم کا دوست بوڑھا اخبار نویس جم بھی دکھائی دے رہا تھا۔ اُس وقت میں سوچ رہا تھا کہ اگر مقتول روسی شہنشاہ ازلیس کی روح واقعی یہاں موجود ہے تو وہ بھی سوچ رہا ہوگا کہ روسی سینٹ سے اپنے آخری خطاب کے دوران بھی اس نے ایک ساتھ، ایک ہی چھت تلے اتنے زیادہ سارے مشکوک لوگ نہیں دیکھے تھے۔

سچ کہوں تو یہ سب دیکھ کر میں پریشان بھی تھا۔ میڈم کے پارلر کا یہ چھوٹا سا ہال آڑ نیور یم کی طرح تھا۔ سامنے اسٹیج تھا جس کے لیے لائٹنگ کا خصوصی انتظام کرایا گیا تھا۔ میڈم کے سیشن کے دوران ہال کی بتیاں بجھا دی جاتی تھیں اور ایسے میں اسٹیج پر جلنے والی روشنیوں سے بہت خواب ناک اور پُراسرار ماحول بن جاتا تھا۔ دوسری بات یہ کہ میڈم کا کہنا تھا کہ سیشن میں حاضرین کے مسائل کی نشاندہی اور ان کا حل، اس کی ذہنی توجہ اور سکون پر منحصر ہوتا ہے۔ اگر بھی میڈم کے سیشن کے دوران کسی نے غیر ضروری طور پر بولنے یا چیخنے چلانے کی کوشش کی تو اُسے کان سے پکڑ کر باہر نکال دیا جاتا تھا اور یہ کام اکثر حاضرین ہی سرانجام دیتے۔ بس! میڈم کے بولنے کی دیر ہوتی تھی۔ یہی میری پریشانی کا سبب بھی تھا۔ مجھے یقین نہ تھا کہ یہاں گڑبڑ ہوئے بنا معاملہ نمٹے گا نہیں۔

جس روز لیونارڈ پہنچا، اس صبح میڈم نے ہال کی اچھی طرح صفائی ستھرائی کرائی تھی۔ ہال میں سب پر میری نظر تھی اور یہی ذمے داری میڈم نے میرے سپرد کی تھی۔ مہمانوں کی آمد کے بعد ہال کا داخلی دروازہ بند کر دیا گیا۔

میڈم کا اسٹیج معاون ایڈی مہمانوں کے آگے جھکا جا رہا تھا۔ اس نے مس ہیکٹو کو جس طرح خوش آمدید کہا اور جس طرح بار بار اس کے آگے پیچھے پھر رہا تھا، وہ مجھے بہت برا لگا۔ نہ جانے کیوں مجھے یہ بات پسند نہ آئی کہ مس ہیکٹو کے ساتھ وہ ایسا کرے۔ نہ جانے کیوں میرے دل میں ایک ٹیس اٹھی۔ کاش! سرخ لباس میں ملبوس اور مجنتی شال میں لپٹی مس ہیکٹو کا چہرہ آج سے زیادہ چمک دار ہیٹ تلے چھپا تھا۔ دل میں خیال آیا کہ ایسے میں وہ لہرا کر چلے اور اس کا ہاتھ میرے ہاتھ میں ہو.... کاش!

اگلے ہی لمحے خود پر لعنت بھیجی۔ میڈم نے خود شادی نہیں کی تھی اور نہ ہی اسے کسی لڑکی کا شادی شدہ ہونا پسند تھا۔ یہاں تک بات رہتی تو ٹھیک تھی، اسے تو شادی شدہ مرد بھی زہر لگتے تھے۔ اس کے اسٹاف کے کسی لڑکے کا شادی کرنا تو دور کنار، اگر میڈم کو بھنک بھی پڑ جائے کہ وہ ایسی سوچ رکھتا ہے تو پھر برا حال تھا۔ خواہش اور ملازمت، ایک میان میں یہ دو تلواریں اور وہ بھی میڈم کے پارلر کی چھت تلے، ناممکنات میں سے ایک تھیں۔

میں نے اسٹیج پر نظر ڈالی۔ میڈم وہاں لیونارڈ اور اس کے چند حواریوں کے ساتھ موجود تھی۔ وہ اسے اسٹیج کا اچھی طرح معائنہ کرا رہی تھی۔ میں آگے بڑھا۔ ”اچھی طرح ٹھوک بجا کر دیکھ لیں۔“ وہ مہمانوں سے کہہ رہی تھی۔ اس کی آواز خاصی اونچی تھی۔ شاید وہ یہ سب کو سنانا چاہتی تھی۔ ”یہاں فرش پر کوئی خفیہ چیمبر نہیں جہاں سے دھوئیں کے بادل نمودار ہوں۔“ اس نے فرش پر زور سے ایڑی ماری۔ ”کوئی ایسی شے نہیں کہ جس سے ثابت کیا جا سکے کہ یہاں کوئی شعبدہ دکھایا جاتا ہے یا نظر کا دھوکا دیا جاتا ہو۔ یہاں بس ایک ہی شے ہے اور وہ ہے صرف حقیقت۔“ وہ فخریہ لہجے میں نعرہ بے جا رہی تھی۔ ”اب میں مہمانوں سے گزارش کروں گی کہ اپنی نشستوں پر جا کر بیٹھیں۔“

سارے ایک، ایک کر کے نیچے اُتر آئے۔ اسٹیج پر صرف میڈم کھڑی تھی۔ سب کے جانے کے بعد وہ اسٹیج کے بیچ وسط میں رکھی کرسی پر بیٹھ گئی۔ اس کے سامنے رکھی میز پر پانی کا ایک گلاس اور بڑی سی موم بتی رکھی تھی اور کچھ نہیں۔ ہال کی بتیاں بجھا دی گئی تھیں۔ صرف زیرو واٹ کے چند بلب روشن تھے۔ اسٹیج کی بتیاں بند کر دی گئیں۔ میڈم دودھیا روشنی کے ایک ہالے میں تھی۔ اس کے علاوہ ہر جگہ سرخ اور نارنجی روشنی تھی۔ پورا ہال پُراسرار ماحول کے رنگ میں رنگ چکا تھا۔ فی الحال لوگ خاموش تھے اور میڈم نے بھی اپنا عمل شروع نہیں کیا تھا۔ میرے دل میں یہی دھوسہ تھا کہ کہیں کوئی ہنگامہ نہ کھڑا ہو جائے۔ آج شرکا میں میڈم کے ہمنواؤں کی تعداد نہ ہونے کے برابر تھی۔ غل غپاڑا اٹھا تو ہنگامہ کرنے والے کو کان سے پکڑ کر نکال باہر کون کرتا۔ یہی بات مجھے پریشان کیے جا رہی تھی۔

لیونارڈ آ تو گیا تھا۔ اس کا یہاں تک آنا میڈم کی چال ہو سکتی تھی لیکن اُسے ہلکا سمجھنا بھی غلطی ہو سکتی تھی۔ میڈم کے مطابق روز ہوتی تھا تو کامیابی سے ڈھونگ رچانے والا ایسا بے عقل نہیں ہو سکتا کہ اپنے حریف کی چال کو اپنے مفاد میں چلنے کی صلاحیت نہ رکھتا ہو۔ میں نے ہال پر طائرانہ نظر ڈالی اور اسٹیج کی طرف دیکھا۔ میڈم کی آنکھیں بند تھیں اور چہرہ چھت کی طرف تھا۔ یہ میڈم کا خاص انداز تھا۔ عمل شروع

کرنے سے قبل وہ چند لمحوں تک اسی حالت میں رہی تھی۔ ہال میں مکمل خاموشی تھی۔ سب منتظر تھے کہ اب کیا ہونے والا ہے۔

"ہم اُن میں سے ایک ہیں جو جاننے کی خواہش رکھتے تھے۔" آخر میڈم نے آنکھیں کھولیں اور نرم لہجے میں حاضرین کو مخاطب کیا۔ آرلیس بدستور خاموش تھا۔ تمام حاضرین خاموش تھے۔ "کوئی ہے جو اپنے بارے میں جاننے کی خواہش رکھتا ہو۔" میڈم نے دوبارہ یہ بات دہرائی مگر ہال سے کوئی آواز نہ ابھری۔ اس دوران پہلو بدلنے اور کرسیوں کو ذرا سا اِدھر اُدھر کھسکانے کی آوازوں نے سکوت توڑا مگر بولا کوئی نہیں۔ میڈم کی نگاہیں حاضرین پر تھیں۔ وہ دھیا روشنی کے ہالے میں بیٹھی میڈم کے سامنے، میز پر رکھے شمع دان میں روشن موم بتی کی تاریکی تو بڑھ چکی تھی۔

ہال میں بدستور سکوت طاری تھا۔ اس سے پہلے کہ آرلیس کی بھاری آواز گونجتی ایک بار پھر میڈم نے نرم لہجے میں حاضرین کو مخاطب کیا۔ "کوئی ہے جو اپنے بارے میں جاننے کی چاہ رکھتا ہو؟"

اس بار حاضرین کی صفِ اوّل میں بیٹھا لیونارڈ کھڑا ہوا۔ پہلے اس نے دائیں بائیں دیکھا اور پھر ہچکچاتا ہوا کہنے لگا۔ "میں جاننا چاہتا ہوں۔" اس کا لہجہ چغلی کھا رہا تھا کہ اسے یا تو میڈم کے کہے کا اعتبار نہیں یا پھر وہ ڈر رہا ہے کہ اگر بات سچ نکلی اور اس نے سب کچھ صاف صاف بتا دیا تو پھر ....

میرے لیے صورتِ حال بڑی دلچسپ ہو چکی تھی۔ مجھے یقین نہ تھا کہ میڈم کی پیشگوئی کے جواب میں وہ خود کو پیش کر دے گا۔ میں سمجھتا تھا کہ اس کا کوئی حواری یہ کام کرے گا اور یوں میڈم کو غلط ثابت کرنے کی کوشش کی جائے گی اور اس دوران ہنگامہ مچے گا مگر یہاں تو دونوں دھندے والے ہی ایک دوسرے کے مقابل تھے۔ جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے میں ایسا ہوتا پہلی بار دیکھ رہا تھا ورنہ تو حالات یہاں تک پہنچنے سے پہلے ہی میڈم بڑے سلیقے سے اپنے حریف کا پتا کاٹ دیتی تھی۔

"تم کیا جاننے کی خواہش رکھتے ہو؟" میڈم نے بڑے اعتماد سے پوچھا۔ اس کے لہجے سے قطعی یہ نہیں لگ رہا تھا کہ سامنے وہ ہے جسے نیچے والے خود ایک بہت بڑا روحانی عامل مان چکے ہیں۔

"اپنا مستقبل ....." اس نے لحہ بھر توقف کیا۔ "مجھے اس کے بارے میں جاننے کی خواہش ہے۔" اس نے ٹھہرے ٹھہرے لہجے میں کہا۔ اس کے انداز سے کسی طور یہ نہیں جھلک رہا تھا کہ وہ میڈم کو نیچا دکھانے کی کوشش کر رہا ہو۔

"تو تم اپنا مستقبل جاننے کی خواہش رکھتے ہو۔" میڈم کا لہجہ گمبھیر تھا۔

"ہاں۔" لیونارڈ نے مختصر جواب دیا۔

کافی دیر سکوت طاری رہا، آخر میڈم کی آواز نے خاموشی توڑی۔ "اگر تم اس جگہ سے چلے نہیں جاتے تو تمہارا مستقبل بہت مختصر ہوگا۔"

"کیا انہیں کوئی خطرہ لاحق ہے؟" لیونارڈ کے حواریوں میں شامل موٹے ہاکنز نے مداخلت کی۔ اس کا لہجہ باغیانہ تھا۔

میڈم کی آنکھیں بند تھیں۔ وہ گہری، گہری سانسیں لے رہی تھی۔ مجھے اندازہ ہو گیا کہ اب شاید میڈم نہیں کوئی اور جواب دے گا۔ "تو اپنی زندگی چاہتا ہے۔" میرا خیال درست ثابت ہوا۔ یہ بھاری آواز بظاہر میڈم کے ہی منہ سے نکل رہی تھی لیکن اس کے معتقد جانتے تھے کہ یہ لہجہ اس کا نہیں آرلیس کا تھا۔ اتنی خاموشی تھی کہ حاضرین کی سانسوں کے سوا کچھ سنائی نہیں دے رہا تھا۔ لگتا تھا کہ سب میڈم کے روحانی اثر میں آ چکے تھے۔

"یہ جاننا ہے کہ اسے صرف زندگی کی طلب ہے۔" میڈم کے منہ سے ایک بار پھر وہی بھر بھرائی آواز گونجی۔

بھرائی کے بعد خاموشی نہ رہی، ایک ہنگامہ اٹھ کھڑا ہوا۔ اخبار نویس چیخ، چیخ کر میڈم سے پوچھ رہے تھے کہ لیونارڈ کو کیا خطرات لاحق ہو سکتے ہیں۔ مس ہمفرے میڈم پر چلا رہی تھی۔ وہ طرح طرح کے القابات سے اسے نواز رہی تھی۔ خود میڈم کا مراقبہ ٹوٹ چکا تھا۔ وہ پھٹی، پھٹی نگاہوں سے ہر طرف دیکھ رہی تھی۔ اسی دوران اس کا اسسٹنٹ معاون ایڈی آگے بڑھا، وہ اسے سہارا دینے کی کوشش کر رہا تھا۔ اسی شور شرابے میں میڈم کی آواز گونجی۔ "تمہارے ہنگامے نے میرا مراقبہ توڑ دیا۔ اس وقت میرا ذہن منتشر ہے۔" اس کی آواز لرز رہی تھی لیکن کسی کو کوئی پروا نہیں تھی۔ لیونارڈ کی زندگی کو لاحق خطرات اور مستقبل مختصر ہونے کی پیشگوئی کے بعد کچھ گنجائش ہی باقی نہیں رہی تھی۔

قمار خانے میں سب کی اپنی، اپنی آواز گونج رہی تھی۔ زیادہ ہنگامہ مس ہمفرے نے برپا کیا ہوا تھا۔ ایسا لگ رہا تھا کہ لیونارڈ کو لاحق خطرات کی پیشگوئی نہیں کی ہو بلکہ میڈم کی

زبان سے انہیں نے 'بلڈ بول' کا نعرہ لگا دیا ہو۔

میں ایک کونے میں کھڑا ساری صورت حال کا گہری نگاہوں سے جائزہ لے رہا تھا۔ ''لگتا ہے میڈم کی حالت بہت خراب ہو چکی۔ انہیں ڈاکٹر کی ضرورت ہے۔'' اسٹیج سے ایڈی چلایا مگر کسی کو کوئی پروا نہ تھی۔ اخبار نویس اب بھی چیخ چیخ کر یہی پوچھتے جا رہے تھے کہ لیونارڈ کو کس طرح کے خطرات کا سامنا ہو سکتا ہے مگر بظاہر میڈم کی آنکھیں بند تھیں اور سر ایک طرف ڈھلکا ہوا تھا۔ اسی دوران ایڈی نے مجھے اشارہ کیا۔ ہم دونوں نے میڈم کو سہارا دیا اور اسٹیج کے عقبی دروازے سے گھر کے اندر لے گئے۔ پارلر کے برابر والے کمرے میں میڈم پر اندھا اعتماد کرنے والے بھی موجود تھے۔ ساؤنڈ سسٹم کی مدد سے وہ بھی اندر کی پوری کارروائی سن چکے تھے۔ وہ بھی تحت حیرت میں تھے۔ انہیں لیونارڈ سے زیادہ میڈم کی فکر تھی۔ میڈم کو بیڈ روم میں پہنچا کر میں واپس پارلر لوٹا تو ہنگامہ ختم ہو چکا تھا۔ لیونارڈ اور اس کے حواری جا چکے تھے۔

دوپہر سے پہلے تک معاملہ ٹھنڈا ہو چکا تھا۔ میں بیڈ روم میں گیا۔ وہ چادر اوڑھے لیٹی تھی۔ میرے پکارنے پر آنکھیں کھولیں اور بیڈ کا سہارا لے کر بیٹھتے ہوئے مسکرائی۔ اس کے چہرے پر اب تک زردی چھائی تھی۔ ''سب ٹھیک ہے؟'' اس کا لہجہ سوالیہ تھا۔

''ہاں...''

''مبارک ہو، آپ نے ہنگامہ کھڑا کر ہی دیا۔'' میں نے اپنی دانست میں یہ ظاہر کیا کہ جیسے یہ میڈم کی چال تھی اور اس کے نہ بتانے کے باوجود میں ساری حقیقت سے باخبر تھا۔

یہ سن کر وہ چند لمحوں تک مجھے دیکھتی رہی۔ ''شاید یہ کہنا قبل از وقت ہو مگر یہ... میں نے ٹھیک کہا تھا لیونارڈ کی زندگی کو خطرہ لاحق ہے۔'' اس نے گمبھیر لہجے میں جواب دیا۔

''لیکن میڈم....'' مگر اس نے مجھے بات پوری کرنے کا موقع نہیں دیا۔

''یہ مجھ پر واضح نہیں کہ خطرے کی نوعیت کیا ہو سکتی ہے لیکن اس شہر میں اس کی زندگی ذاتی خطرے سے دوچار ہے اور ہو سکتا ہے کہ....'' بات ادھوری چھوڑ کر میڈم نے گہری سانس لی۔ ''کیا کہہ سکتی ہوں، یہ قصبہ ہے ہی ایسا، چہار سو خوف کی فضا ہے، کچھ بھی ہو سکتا ہے۔'' چند لمحوں کی خاموشی کے بعد اس نے چھت کی طرف دیکھتے ہوئے غور کیا/کی۔

کچھ دیر تک کمرے میں خاموشی طاری رہی۔ صرف پنکھا چلنے کی سرسراہٹ گونج رہی تھی۔ ''وہ موٹا آدمی ہاکنز ہی تھا نا؟'' میڈم نے میری طرف سوالیہ نگاہوں سے دیکھا، میں نے اثبات میں سر ہلا یا تو وہ بولی۔ ''مجھے سمجھ نہیں آ رہا کہ لیونارڈ کے ذکر پر اس نے ہنگامہ کیوں کیا ہے؟''

''مس ہیگر بھی خوب چلا رہی تھی۔ لگتا تھا کہ جیسے اس بات سے سب سے زیادہ تکلیف اُسے ہی پہنچی ہو۔'' میں نے اُسے خاموش ہوتا دیکھ کر لقمہ دیا۔

''تم اُسے لیونارڈ کا ہمدرد سمجھتے ہو لیکن میری رائے ہے کہ وہی اُس کی زندگی تباہ کرنے کا باعث بنے گا۔'' اس کا اشارہ ہاکنز کی طرف تھا۔

''کیا...'' جو تنا حالات کو دیکھتے ہوئے اُسے ہضم کرنا کم از کم میرے لیے مشکل ضرور تھا۔ بظاہر وہ لیونارڈ کا ہمدرد اور اس کے پروگراموں کا منتظم تھا۔

''لیکن وہ تو....'' مگر بات ادھوری رہ گئی۔

''یہ دیکھو۔'' میڈم نے ایک تصویر میرے سامنے کی۔ بلاشبہ وہ مس ہیگر کی تصویر تھی لیکن سنہرے بالوں اور جوان دکھنے والی ہیگر اس تصویر میں بالکل مختلف تھی۔ وہ بڑی عمر کی عورت لگ رہی تھی۔ اس کے سر کے بال سفید تھے۔ ''یہ کیسے ملی۔'' میں نے تصویر کی طرف اشارہ کیا۔

''خوش قسمتی سے۔'' میڈم مسکرائی۔ ''کیا یہ تصویر والی عورت وہ لڑکی لگتی ہے جس کا تم اب تک پیچھا کرتے رہے ہو؟''

''نہیں، ہرگز نہیں....'' میں نے فوراً انکار میں سر ہلا یا۔ ''مجھے یقین نہیں ہو رہا... کہ یہ وہی ہے۔''

''مسٹر ہاکنز اور یہ مس جینیفر ہیگر....'' میڈم نے تصویر کی طرف انگلی سے اشارہ کیا۔ ''دونوں بڑے اُستاد ہیں۔ ہاکنز یہاں خود کو معزز شخص ظاہر کرنے کی کوشش کر رہا ہے مگر حقیقت میں ایسا ہے نہیں۔ وہ پہلے درجے کا لچا، اور فراڈیا ہے۔ دراصل یہ بطور پروموٹرز کام کرتا ہے۔ ناکام اداکاراؤں کے شوز سے لے کر باکسنگ کے گھٹیا مقابلوں تک، وہ سب کے لیے بطور پروموٹر اپنی خدمات پیش کرتا رہا ہے۔ اس کے دور پر وہ اپنا اُلو سیدھا کرتا تھا اور جسے وہ اپنی بیٹی ظاہر کرتا ہے دراصل تمام دو نمبر کاموں میں وہ اس کی ساتھی ہے۔''

''انہوں نے لیونارڈ کو کیسے گھیرا؟'' مجھے تو اب تک یقین نہیں آ رہا تھا کہ نظر آنے والی مس ہیگر سفید بالوں والی

بچی عمر کی عورت تھی۔ اُسے پسند کرنے پر میں اب دل ہی دل میں خود پر لعنت ملامت کر رہا تھا۔

''مجھے شبہ ہے کہ مس ہیگنز نے روپ بدل کر اسے اپنے حُسن کے جال میں پھانسا اور پھر یوں دونوں نے مل کر اسے مجبور کیا۔''

دراصل میں خود بھی یہی سوچ رہا تھا۔ اُسے پیغام پہنچانا، گارڈن میں جا کر تنہائی میں ملنا، مجھے بھی شک ہو رہا تھا مس ہیگنز نے ضرور لیونارڈز کو پھانسنے کے لیے ہی یہ سوانگ رچایا ہوگا۔ ویسے اگر مس ہیگنز صرف مسکرانے پر ہی اکتفا کرتی تو بہت خوبصورت نظر آتی تھی۔ ایک بار میں اس کا قہقہہ سن چکا تھا۔ اُس وقت وہ بڑی خوفناک لگی تھی۔ ''حیرت ہے۔'' میں نے سر اٹھا کر میڈم کو دیکھا۔ ''لگتا ہے کوئی بڑا چکر ہے ورنہ یہ تینوں بڑے اُستاد ہیں۔ لیونارڈز بھی کم نہیں لگتا، چالاک بندہ ہے، اتنی آسانی سے پھنس نہیں سکتا۔'' میں نے اپنے شک کا اظہار کیا۔ مجھے سو فیصد یقین تھا کہ تینوں یہاں کوئی کھیل کھیلنے کے لیے ہی جمع ہوئے تھے۔ کھیل جس میں سو فیصدی منافع اُن کا تھا۔ ہم خواہ مخواہ اس گورکھ دھندے میں پھنس چکے تھے۔

''تم نے مجھے بتایا تھا کہ یہ لیونارڈ کے پاس آتی جاتی رہتی ہے، تم اس کا پیغام بھی اسے پہنچا کر آئے تھے، یہ گارڈن میں بھی چھپ چھپ کر ملتے رہتے ہیں.....''

''بالکل ٹھیک کہا۔'' میں نے میڈم کی بات کاٹی۔ ''یہ دوراں کر آپ نے مجھے اخلاقیات کا درس بھی دیا تھا۔''

''ہاں، ہاں مگر اس بات کو چھوڑو۔'' اس نے مجھے ہاتھ سے روکا۔ ''دراصل یہ بات بالکل سچ تھی نا۔'' اس نے سوالیہ نگاہوں سے مجھے دیکھا۔

''سو فیصد سچ۔'' میں نے فوراً کہا۔

''یہ اسکینڈل بن سکتا تھا۔''

''میں تو یہ سمجھتا تھا کہ یہ خبر اخبار میں شائع ہو جاتی تو پھر ایسا اسکینڈل بنتا کہ لیونارڈز کی ساری ڈاکٹری دھری کی دھری رہ جاتی۔ منہ چھپا کر اسے بھاگنا پڑتا مگر.....'' میں نے شاکی لہجے میں کہا اور بات ادھوری چھوڑ دی۔ میں میڈم کو اُن کی غلطی اور اپنی کارکردگی یاد کرانا چاہتا تھا۔ اس کی خاموشی سے عیاں تھا کہ میری بات اس تک پہنچ چکی۔

''مجھے لگتا ہے کہ لیونارڈز یہاں سے لمبا مال بٹور رہا ہے لیکن یہ دونوں اس سے سب کچھ ہتھیا لیں گے۔'' یہ کہہ کر میڈم نے غور سے مجھے دیکھا۔ ''اگر وہ جان بچا کر ان کے پنجوں میں ان کے چنگل سے بچ نکلنے میں کامیاب ہو رہا تو پھر یہ اس کی خوش نصیبی ہوگی۔ یہ دونوں دھوکے باز ہی نہیں پرلے درجے کے ٹھگ بھی لگتے ہیں۔''

اب مجھے لگ رہا تھا کہ میڈم نے دونے کاروباری حریفوں کے متعلق بہت کچھ جان لیا ہے۔ یقیناً اب اس کی یہ چال کھیل ختم کرنے کے لیے ہوگی۔ ''ویسے تمہیں کیا کرنا چاہیے؟''

''انہیں روکنا ہوگا۔'' میڈم نے کہنا شروع کیا۔ ''کیا تم نہیں چاہتے کہ انہیں بے نقاب کیا جائے، ان کے ساتھ انصاف ہو۔'' یہ کہہ کر وہ لمحہ بھر کے لیے خاموش ہوئی۔ ''تب..... ہم ان پر ہر طرف سے حملہ کریں گے۔'' اس کا لہجہ فیصلہ کُن تھا۔ ''ان کے پاس وقت کی زیادہ مہلت باقی نہیں بچی ہے۔''

مجھے یاد ہے کہ ایک مرتبہ ایک اور عامل نے قصبے میں پاؤں جمانے کی کوشش کی تھی مگر میڈم نے اس کے بھی پاؤں اکھیڑ دیے تھے۔ آخر اُسے راتوں رات منہ چھپا کر بھاگنا پڑا۔ جس روز وہ گیا، اُس شام میڈم نے جم کی شاندار دعوت کا اہتمام کیا اور اسے غیر معمولی دوست قرار دیتے ہوئے نہایت مہنگی 'بوتل' تحفے میں پیش کی تھی۔ فی الحال تو اُس نے نہیں بتایا لیکن میرا اندازہ تھا اس چال کے پیچھے بھی جم کا دماغ ہوگا۔

''مجھے یقین ہے کہ لیونارڈز میں ایک دو روز اور قصبے میں نکلے گا۔ اِدھر ان کے راز سے پردہ اٹھے گا، اُدھر ان کے زوال کا پروگرام بنے گا۔'' مجھے خاموش دیکھ کر میڈم نے نہایت خباثت بھری ہنسی ہنستے ہوئے کہا۔

''اچھا ہوگا۔'' یہ کہہ کر میں نے سوچا کہ خواہ مخواہ کے اس جھنجھٹ نے میرا ابھی سکون غارت کر رکھا ہے۔ ورنہ سچ یہ ہے کہ پچھلے چار دنوں میں اس کا گرویدہ ہو چکا تھا، سوچتا تھا کہ اسی بہانے ہی سہی مگر کسی طرح اُس سے راہ و رسم بڑھانے کا موقع مل جائے لیکن اب سارے ارمانوں پر اوس پڑ چکی تھی۔

میں سمجھتا تھا کہ آرلیس کی روح ہر بار میڈم کی مدد کرتی ہے لیکن وہ جس طرح خباثت سے ہنسی، اس سے بھی اندازہ ہوا کہ اس بار روح نہیں میڈم اور شاید شراب کے رسیا جم کا چالباز دماغ بھی پوری طرح چل رہا ہے۔

اگلے روز ایک اور انہونی ہوئی۔ میں میڈم کے گھر پر تھا کہ مس ہیگنز پہنچ گئی۔ جس طرح وہ کل چلا، چلا کر اُسے جھوٹا اور فریبی کہہ رہی تھی، اس کے بعد یہاں آنا کم از کم میرے لیے کسی معجزے سے کم نہیں تھا۔ میں نے دل ہی دل

میں میڈم کو داد دی۔ سمجھ گیا کہ اس کے وار نے حریفوں کے چھکے چھڑانا شروع کر دیے تھے۔

کچھ دیر وہ میڈم کے گھر پر رہی۔ وہ دونوں اکیلے میں باتیں کر رہی تھیں۔ آخر میڈم نے مجھے اشارے سے بلایا۔ ''جا کر پارلر کی صفائی کرو۔'' میں سمجھ گیا کہ اس کا مطلب کیا ہے۔ کچھ ہی دیر میں تمام انتظامات مکمل ہو چکے تھے۔ گھر سے متصل پارلر کے ایک چھوٹے نیم تاریک کمرے میں مس ہیکٹر اور میڈم تنہا تھیں۔ میں اپنی جگہ تیار تھا۔ میڈم نے مراقبے میں جانے کا ناٹک شروع کیا تو میں نے اپنا کام.... تھوڑی دیر کے اندر کمرے میں دھوئیں کے مرغولے تھے۔ نیم تاریک کمرے کی ہلکی سرخ روشنی میں دھوئیں کے دو مرغولے خوابناک ماحول بنا رہے تھے۔

اسی دوران میڈم بظاہر مراقبے میں جا چکی تھی اور پھر مس ہیکٹر نے جو سوال پوچھا، اس نے میڈم کی تھیوری کو درست ثابت کر دیا۔

''ہاکنز نے میرے حصے کی تمام دولت اپنے قبضے میں کر رکھی ہے، میں کوڑی، کوڑی کی محتاج ہو چکی ہوں، میں اس کی غلام بن چکی ہوں۔ وہ مجھے استعمال کر رہا ہے لیکن مجھے اس کی کوئی قدر نہیں۔'' اس کی آواز بھرا چکی تھی۔ ''میں لیونارڈ کی شکل میں اپنے لیے ایک نجات دہندہ دیکھ رہی ہوں مگر وہ اندر سے اس کے بھی خلاف ہے۔ ہاکنز فراڈ ہے۔ وہ اسے بھی نقصان پہنچائے گا۔'' اس کے گالوں پر دو آنسو بھی ڈھلک چکے تھے۔ بظاہر وہ زخمی ہونے کا تاثر دینے میں سو فیصد کامیاب رہی تھی۔

میں خفیہ طور پر یہ سارا منظر دیکھ رہا تھا۔ مجھے دل سے تو یقین نہیں تھا کہ یہ سچ ہوگا۔ ادھیڑ عمر کی جو عورت جوان لڑکی کا سوانگ بھر سکتی ہے، اس کے لیے یہ ڈراما ہونا تو کوئی بات نہیں۔ سچ کہوں تو ہنسی آ رہی تھی۔ مجھے یقین تھا کہ روم کے محل میں قید ہو جانے والے مقتول آرلیس کی روح بھی اس کی اداکاری پہچان چکی ہو گی۔

پارلر کے اندر خاموشی کا راج تھا۔ میڈم مراقبے میں تھی اور مس ہیکٹر کی نگاہیں اس پر جمی تھیں۔ آخر کمرے میں بھر بھرائی آواز گونجی۔ ''لیونارڈ خطرے میں ہے۔'' یہ آواز میری جانی پہچانی آرلیس کی تھی۔

مس ہیکٹر کی آنکھ سے چند اور آنسو بہے مگر وہ خاموش رہی۔ آخر ہچکچاتے ہوئے بولی۔ ''کیسے بچا جا سکتا ہے؟''

''گارڈن میں جاؤ اور اس سے ملو جیسے پہلے ملتی رہی ہو۔'' یہ سنتے ہی اس کے چہرے کا رنگ فق پڑ گیا۔ اس کا منہ کھلے کا کھلا رہ گیا۔ بظاہر اس بات سے تو کوئی واقف نہ تھا کہ وہ خفیہ طور پر شام میں گارڈن جا کر لیونارڈ سے ملتی ہے۔ میرا دل چاہ رہا تھا کہ قہقہے مار کر ہنسوں مگر اس کے لیے وقت نہ تھا۔

''جاؤ انجلینا زیجلو....'' ایک بار پھر میڈم کی زبان سے آرلیس نے کہا۔

''کیا....'' ایک بار پھر اس کا منہ حیرت سے کھل گیا۔

''حیران مت ہو۔ آرلیس ہر شخص کو اس کے اصل نام سے جانتا ہے۔''

''اوہ میرے خدا....'' اس نے دونوں ہاتھوں سے سر پکڑ لیا۔ میں بھی حیران تھا۔ سمجھ گیا کہ واقعی میڈم بہت سے راز جان چکی تھی۔

''جاؤ، گارڈن میں جاؤ اور اسے بتا کر طے کرو کہ یہاں سے کب جانا ہے۔ یہ تمہاری ہی نہیں اس کی بھی زندگی کے لیے ضروری ہے۔ اگر آرلیس کو یقین نہ ہوتا تو تمہیں وہاں جانے کا نہ کہتا۔'' اس کے بعد لمحہ بھر خاموشی رہی۔ ''تب تمہاری مدد کرے گا۔ تمہارا سامان ہوسٹل سے لے آئے گا۔ تم گرینڈ سینٹرل ہوٹل منتقل ہو جاؤ۔'' لمحہ بھر بعد ہیکٹر سے انجلینا بنی بوڑھی حسینہ نے میڈم کے چہرے کو دیکھا مگر اس کی آنکھیں بند تھیں۔

اس کے بعد گہری خاموشی رہی۔ میں نے دھوئیں کے مرغولے بنانے والی مشین بند کر رکھی تھی۔ کمرے کی دھند چھٹی تو میڈم نے آنکھیں کھولیں۔ اس کے چہرے سے نقاہت ٹپک رہی تھی۔

''میں تھک چکی ہوں۔''

میڈم نے خاموشی سے سر ہلا دیا۔ وہ میرے ساتھ باہر نکلی۔ ''تم میرے ہوسٹل جاؤ اور میرا سامان لے کر ہوٹل پہنچو۔'' یہ کہہ کر اس نے سمجھانا شروع کر دیا۔ میں ہوسٹل دیکھ چکا تھا مگر اسی طرح سر ہلاتا رہا جیسے سمجھنے کی کوشش کر رہا ہوں۔ اس کے بعد وہ ٹیکسی لے کر گارڈن میں چلی گئی۔ میں ہوسٹل کی طرف پیدل چل رہا۔ اس نے آنے جانے کا کرایہ دیا تھا اور بھاری ٹپ بھی مگر مجھے پیسے بچانے تھے۔

دو گھنٹے بعد جب ہوٹل پہنچا تو وہ استقبالیہ پر میری ہی منتظر تھی۔ اس نے تیسرے فلور پر لیونارڈ کے برابر کا کمرا لیا تھا۔ مجھے یقین تھا کہ ان دو کمروں کے بیچ ضرور کوئی خفیہ دروازہ بھی ہوگا۔

میری ذمے داری ختم ہو چکی تھی۔ میں میڈم کے پاس

جانے کے بجائے گھر لوٹ آیا۔ لنچ کے بعد سو کر اٹھا تو شام کے پانچ بج رہے تھے۔

میڈم کے پاس پہنچا تو وہ اکیلی بیٹھی تھی۔ ”دیکھ لیا آرلیس کا کمال۔“ یہ کہہ کر وہ ہنسی۔

میں بھی مسکرا دیا۔ ”دیکھ لیا جی، آرلیس گریٹ ہے۔“

”کل آخری لیکچر دینے کے بعد وہ سپر ہیرو کی زمین سے واپس جا رہا ہے۔“ میڈم فاتحانہ انداز سے مسکرائی۔

”تو کام مکمل ہو گیا۔“ میں نے اس کی طرف دیکھا۔

”ایسا تم سمجھتے ہو؟“

یہ سنتے ہی میں چونک اٹھا۔ میرے خیال میں تو یہ کافی تھا۔ میڈم کا کام بن چکا۔ جو اس کی دوڑی پر لات مار رہا تھا، وہ خود دُم دبا کر اپنی چلمن کے ساتھ بھاگ رہا ہے۔ اس سے زیادہ اور کیا چاہیے تھا۔

”ایک ہجوم اس کا شیدائی ہے لیکن جب انہیں یہ پتا چلے گا کہ انہیں کس طرح بے وقوف بنایا گیا تو پھر آنے کا مزہ۔“ یہ کہہ کر وہ ہنسی۔

میں سمجھ گیا کہ وہ صرف اسے بھگانا نہیں بلکہ اس کے ساتھ کچھ اور بھی چاہتی ہے۔ اگر میں اس کی جگہ ہوتا تو شاید ایسا نہ کرتا لیکن وہ مستقبل پر نظریں رکھتی ہے۔ دوسروں کے مستقبل کو جاننے کا دعویٰ کرنے والی اپنا مستقبل کیسے بھول سکتی ہے۔ مجھے یقین ہو گیا کہ میڈم نے بڑی پیچیدہ بساط بچھائی ہے۔ میں تو ایک مہرہ تھا، کتنے اور مہروں کو بھی وہ اس بازی میں بساط پر چلا رہی ہے، یہ میں کیسے جان سکتا تھا۔ میڈم اتنی اچھی نہیں تھی کہ ہر راز میں شریک کرتی۔

ہال بھرا ہوا تھا۔ پہلی رو میں انجلینا عرف مس ہیکٹر بیٹھی تھی۔ اس کے برابر کی نشست خالی تھی۔ دو اور مہمانوں کے بعد میڈم براجمان تھی۔ ہال کے پچھلے حصے میں کھڑکی کے ساتھ والی نشست پر میں بیٹھا تھا جہاں سے دور کو بذرو پر بآسانی نگاہ رکھ سکتا تھا۔ میڈم نے مجھے داخلی دروازے کے باہر کھڑا رہنے کی ہدایت کی تھی۔ میرے ساتھ دو پولیس کانسٹیبل بھی تھے۔ کیا دو بج کر منٹ پر لیونارڈ اسٹیج پر نمودار ہوا۔

اس نے بولنا شروع کیا تو ہال پر ایسا سناٹا چھایا کہ مجال ہے جو سانس لینے کے سوا کوئی دوسری آواز تو سنائی دے جائے۔ میں نے اندر جھانکا۔ حاضرین دم بخود اس کی طرف متوجہ تھے۔

اسی دوران کو بذرو میں ہاکنز نمودار ہوا۔ اس نے دونوں ہاتھوں میں ایک بڑا باکس اٹھا رکھا تھا۔ میں جانتا تھا کہ اس میں لوٹ کا مال ہے اور وہ یہ باکس مس ہیکٹر کے کمرے سے لے کر آ رہا ہے۔ وہ آگے بڑھا تو میں نے پولیس کانسٹیبل کو آنکھ ماری۔ وہ آگے بڑھے اور اسے بازو سے پکڑ کر روکا۔ ”اس باکس میں کیا ہے؟“

”یہ جاننا تمہارا کام نہیں ہے۔“ وہ تلملایا۔

”ہمیں اپنا کام معلوم ہے۔“ دوسرا کانسٹیبل اس کی طرف بڑھا۔ ”اگر تم نہیں بتاؤ گے کہ اس میں کیا ہے تو خود دیکھ لیں گے۔“ اس نے باکس کی طرف ہاتھ بڑھایا ہی تھا کہ ہاکنز نے اس کانسٹیبل کو اڑنگی دی جس نے بازو پکڑ رکھا تھا۔ وہ زمین پر گرا لیکن لڑکھڑاتے ہوئے ہاکنز نے خود کو سنبھالا اور باکس سمیت باہر کی طرف بھاگا۔ میں اس کے پیچھے دوڑا۔ موٹے ہاکنز سے بھاری باکس لے کر بھاگنا مشکل ہو رہا تھا۔ آخر گیٹ کے قریب اسے جا لیا۔ دونوں ہاتھوں سے آگے بھاگتے ہاکنز کو پکڑنے کی کوشش کی تو وہ بھی گر پڑا۔ گرنے سے باکس کا لاک کھل گیا اور نوٹوں کی کچھ گڈیاں زمین پر بکھر گئیں۔ اسی دوران دونوں کانسٹیبل بھی اس کے سر پر پہنچ چکے تھے۔

جتنی تیزی سے یہ کھیل شروع ہوا تھا، اتنی ہی تیزی سے نمٹ بھی گیا۔ مسٹر ہاکنز کے ہاتھوں میں ہتھکڑی تھی اور وہ پولیس اسٹیشن کی بازا پر روانہ کیے جا چکے تھے۔ نوٹوں کی بکھری گڈیاں واپس باکس میں رکھ کر میں نے بھی قانون کی مدد کی۔ میں سمجھا کہ مسٹر ہاکنز کی گرفتاری کے بعد شاید معاملہ نمٹ گیا۔ اسی لیے واپس ہال کی طرف آیا اور اندر جھانکا۔

لیونارڈ کا پُراثر خطاب جاری تھا۔ ”ہر انسان کے دو روپ ہیں اور چہرے پر چہرہ، ایک ہم دیکھتے ہیں دوسرا کبھی کبھار قدرت دکھا دیتی ہے۔“ لیونارڈ کی یہ بات سن کر میرا دماغ ہاکنز کی طرف چلا گیا لیکن اسی دوران اسٹیج کے عقبی دروازے سے کچھ پولیس کانسٹیبل نمودار ہوئے۔

”کوئی اپنی جگہ سے نہ ہلے۔“ دو پولیس والوں نے لیونارڈ کو گدی سے پکڑا اور اس کے ہاتھ پیچھے کر کے ہتھکڑی لگائی۔ اسی دوران ایک پولیس کانسٹیبل لپک کر اسٹیج سے اترا، دوسرے لمحے وہ انجلینا المعروف مس ہیکٹر کو ہاتھ سے پکڑے اسٹیج پر لا رہا تھا۔

ہال پر سناٹا طاری تھا۔ لوگوں کو سانپ سونگھ چکا تھا۔ اسی دوران ان دونوں کو پولیس والے اسٹیج کے عقبی دروازے سے باہر لے گئے۔ شیرف مائیک پر آیا۔ ”میں شکرگزار ہوں ان نیک دل شہریوں کا جنہوں نے ان

لٹیروں کی گرفتاری میں مدد دی لیکن ان کی حفاظت کے خیال سے نام بتانا مناسب نہیں۔"

میں میڈم کے قریب پہنچا، وہ مسکرا رہی تھی۔ "اچھے شہری ہمیشہ قانون کی مدد کرتے ہیں۔ کبھی کبھار یہ پھل میٹھا بھی نکلتا ہے۔"

"آج میں نے بھی کی ہے۔" یہ کہتے ہوئے میرے انگ انگ سے خوشی پھوٹ رہی تھی۔

"یہ تینوں صرف دھوکا باز نہیں بلکہ بہت بڑے لٹیرے، بہروپیے اور قاتل ہیں۔" شیرف کی بھاری آواز پورے ہال میں گونج رہی تھی۔ "ان تینوں نے چھ ماہ قبل نیویارک کے امریکن ایکسپریس بینک کی ایک برانچ میں دو کروڑ ڈالر کی ڈکیتی کی تھی اور اس دوران دو گارڈز کو بھی گولیاں مار کر ہلاک کر دیا تھا۔" یہ سنتے ہی ایک بار پھر ہال کے اندر آوازیں گونجنے لگیں۔

"خاموش..." شیرف کے یہ کہتے ہی پھر سناٹا چھا گیا۔ "یہ تینوں روپ بدل بدل کر مختلف شہروں میں جاتے، پہلے جھوٹی روحانی طاقت کی دھاک بٹھاتے اور پھر وہاں کے بینکوں میں اکاؤنٹ کھول کر ڈکیتی کا مال جمع کراتے تھے۔ تا فی یہ بیٹے تھے کر رقم غذرانے کی ہے۔"

"لعنت ہو ایسے لٹیروں اور ٹھگوں پر۔" جم نے کھڑے ہو کر اونچی آواز سے کہا اور باہر نکل آیا۔

اسٹیج کا پردہ گرا اور میں میڈم کے ساتھ گھر لوٹ آیا۔ وہ خوش تھی۔ اس کا لڑکھڑاتا مستقبل پھر مستحکم ہو چکا تھا۔ "کیا آرلیس نے ہماری مدد کی ہے؟" میں نے راستے میں میڈم سے سوال کیا تو وہ ہنس دی۔ "قدرت اُن کی مدد کرتی ہے جو اپنی مدد آپ کرتے ہیں۔"

میں لاجواب ہو گیا۔ "خیر!" میں نے دوبارہ بات شروع کی۔ "جب انجلینا ان کی ساتھی تھی تو پھر کل کیا ڈراما کرنے آئی تھی؟"

"وہ یہاں بینک اکاؤنٹ کھول چکے تھے۔" میڈم نے بتانا شروع کیا۔ "کسی ایک کو یہاں دوبارہ آنے کی ضرورت تو پیش آئی۔ اسی لیے وہ ٹھگنے کا ایسا منصوبہ چاہتے تھے کہ کل کلاں کو خاموشی سے یہاں آ سکیں۔ وہ کچھ بھی جائیں تو کوئی مخالفت نہ کر سکے۔"

"اوہ..." میں نے حیرت سے ہونٹ سکیڑے۔ "اگر آرلیس نے بھی مدد نہ کی تو پھر یہ سب کیسے ہوا؟"

"کہا نا کہ اپنی مدد آپ۔" میں سمجھ گیا کہ وہ مزید کچھ بتانے کو تیار نہیں۔

اُسی شام میڈم نے اپنے گھر پر دعوت کا اہتمام کیا۔ تیاری کی ذمے داری مجھ پر تھی لیکن مہمان کون تھا کچھ پتا نہیں۔

شام کے سات بج رہے تھے کہ ایک گاڑی پورچ میں آ کر رکی اور لڑکھڑاتا جم باہر نکلا۔ جیسے ہی وہ کمرے میں داخل ہوا میڈم لپک کر اس کی طرف بڑھی۔ "شکریہ تمہارا۔" یہ کہتے ہوئے وہ اس کے گلے لگ گئی۔

"میری بوڑھی بہن، ڈارلنگ..." جم نے اونچی آواز سے کہا اور میری طرف دیکھتے ہوئے آنکھ ماری۔ "میں اپنی جان کے لیے کچھ بھی کر سکتا ہوں۔" یہ کہتے ہوئے اس نے ہاتھ میں پکڑی بوتل اوپر اٹھائی۔ یہ سنتے ہی جم کی کمر کے گرد میڈم کی باہوں کی گرفت اور مضبوط ہو چکی تھی۔

میں سمجھ گیا کہ یہ سب کچھ جم کا کارنامہ ہے۔ کھانے کے بعد میڈم نے اسے ایک مہنگی بوتل اور بھاری لفافہ دیا۔ "یہ تمہارے لیے۔" وہ مسکرائی۔ "بوتل خریدنے کے لیے کئی مہینوں تک کافی رہیں گے۔"

"بڑی گھٹیا عادل ہو۔" وہ لفافہ جھپٹتے ہوئے بولا۔

"کتنا مال ہاتھ لگا مس ہنگر عرف انجلینا عرف دھوکے باز حسینہ سے۔"

"یہ جاننا تمہارا کام نہیں۔"

"اوکے..."

"ویسے ایک بات ہے۔" میڈم نے کہنا شروع کیا۔ "چالاک بہت تھے، انجلینا کے ذریعے میرا دھندا بند کرانے کی کوشش خوب کی۔"

"لعنت ہو ان سب پر..." جم دروازے کی طرف بڑھا۔ "یونہی حصہ دیا کرو، میں جھنڈے گاڑتا رہوں گا۔"

یہ سن کر میں بھی ہنس دیا۔ کئی بار سوچا تھا کہ میڈم کے توسط سے آرلیس کی روح سے مدد لے کر کسی خفیہ خزانے کا راز جان لوں اور راتوں رات دولت مند بن جاؤں مگر میڈم نے وہ پیرپچ کہا تھا۔ جو اپنی مدد نہیں کرتے اُن کی مدد کوئی روح بھی نہیں کرتی۔ میں نے... سر جھٹکا۔ خیر چھوڑو خزانہ نہ سہی لیکن بھاگتے چور کی لنگوٹی تو ہاتھ آئی۔ میں نے پتلون کی جیب تھپتھپا کر تسلی کی۔ مسز ہاکنز کی گرفتاری کے وقت مچی ہڑبونگ کا فائدہ اٹھا کر میں نے نوٹوں کی ایک موٹی گڈی پار کر لی تھی۔ اب وہ میری جیب میں محفوظ تھی۔ سچ کہا تھا میڈم نے۔ قانون کی مدد کا پھل کبھی کبھار میٹھا بھی نکلتا ہے۔

مجسم رنگ و رعنائی سے مزین فلمی دنیا کی کہکشاں میں جو آج کامران ہے... وہی سکندر ہے... ایک ایسے ہی مقدر کے سکندر کا قصہ... اس کی کامیاب زندگی میں ماضی میں کیے گئے ایک عہد کو نبھانے کا کٹھن وقت آگیا تھا...

ایک اداکار اور لکھاری کے درمیان طے پا جانے والا انوکھا معاہدہ...

مہلت

محمد فاروق انجم

رات کے دس بجے تھے اور بارش مسلسل ہو رہی تھی جس سے سردی کی شدت میں اضافہ ہو گیا تھا۔ پوش علاقے کے چوک پر ایک ٹیکسی رکی اور دروازہ کھلتے ہی ایک شخص باہر نکلا۔ اس نے ہاتھ میں پکڑی چھتری کھولی اور اسے اپنے اوپر تان کر وہ تیز تیز قدموں سے چلنے لگا۔ اس نے اوورکوٹ پہنا ہوا تھا اور اندھیرے میں اس کا چہرہ واضح نہیں تھا۔

اس پوش علاقے میں گل نما بنگلے تھے۔ سڑکیں خاموش اور ویرانی ایسی تھی جیسے یہاں کوئی رہتا ہی نہ ہو... وہ شخص

ایک بنگلے کے آہنی گیٹ کے پاس رکا اور اس نے اپنا ہاتھ بیل پر رکھ دیا۔ اس کے بیل دیتے ہی ایک طرف چھوٹی سی کھڑکی کھلی جس سے اندر موجود شخص کی آنکھیں دکھائی دے رہی تھیں۔ ان آنکھوں میں سوال تھا۔

"کون؟" اندر سے اس نے پوچھا۔

آنے والے شخص نے اپنے اوورکوٹ کی جیب سے ایک کارڈ نکالا اور اس چھوٹی سی کھڑکی سے اندر بڑھا دیا۔ اس نے کارڈ لے کر کھڑکی بند کر دی۔ آنے والا شخص انتظار کرنے لگا۔ وہ جس بنگلے کے سامنے کھڑا تھا، وہ فلم انڈسٹری کے سب سے مقبول اداکار راہول دت کا تھا۔ راہول اپنی پہلی فلم سے پوری انڈسٹری پر راج کر رہا تھا۔ اس کا نام اور کام فلم کی کامیابی کی ضمانت سمجھا تھا۔

دس منٹ کے بعد گیٹ کھلا اور وہ شخص اندر چلا گیا۔ اندر جاتے ہی چوکیدار نے بائیں جانب ایک دروازے کی طرف اشارہ کر دیا۔ وہ شخص اس دروازے کی طرف چل پڑا۔

وہ کمرا کشادہ اور خوبصورت تھا۔ اندر جاتے ہی اس شخص نے جیب سے رومال نکال کر اپنا چہرہ صاف کیا اور صوفے پر ایک طرف بیٹھ گیا۔ اسی اثنا میں دروازہ کھلا اور ایک آدمی داخل ہوا۔ اس کا نام آنند تھا۔ وہ راہول کا سیکریٹری اور اس کی بیوی کا سگا بھائی بھی تھا۔ وہ بڑا تیز طرار شخص تھا۔ راہول کا سیکریٹری بننے سے قبل اس کی زندگی کا ایک حصہ جرائم پیشہ لوگوں کے ساتھ گزرا تھا۔ لیکن اب وہ اس دنیا کو چھوڑ چکا تھا اور پوری توجہ سے راہول کا کام سنبھالے ہوئے تھا۔

آنند اسے دیکھتے ہی خوش دلی سے بولا۔ "آپ آ گئے پرکاش جی۔ ہمارا خیال تھا کہ اس بارش میں شاید آپ نہ آسکیں۔"

"کیسے نہ آتا۔ آکاش سے ملاقات کے سلسلے میں نے وقت لیا تھا۔ اور میں وقت کو ضائع کرنے والا شخص نہیں ہوں۔" پرکاش بولا۔

"ہم بھی کام ختم کر کے سیدھے گھر آ گئے، تاکہ وعدے کے مطابق آپ سے ملاقات ہو سکے۔" وہ مسکراتے ہوئے بولا۔

"مجھے آکاش کی مصروفیت کا احساس ہے۔" پرکاش نے کہا۔

آکاش کا فلمی نام راہول تھا۔

اسی وقت ایک خوبصورت اور پرکشش شخصیت کا مالک، فلم انڈسٹری کا بے تاج بادشاہ راہول کمرے میں داخل ہوا۔ اس نے پہلے پرکاش کے پاؤں چھوئے پھر گلے سے لگ کر خیریت دریافت کی۔

"مجھے آپ کو دیکھ کر بہت خوشی ہوئی ہے۔ میرے دل میں آپ کی عزت پہلے سے بھی زیادہ ہے۔ بے شک میں اسٹار بن گیا ہوں اور آسمان کو چھو رہا ہوں لیکن میں نے یہ بات کبھی نظر انداز نہیں کی کہ میں آج جو کچھ بھی ہوں، آپ کی بدولت ہوں۔" وہ بڑی عاجزی سے بولا۔

"میں جانتا ہوں۔ تمہارے یہ خیالات میں کئی بار تمہارے انٹرویوز میں سن اور پڑھ چکا ہوں۔ فلم انڈسٹری میں تو کامیابی پر بیٹا باپ کو بھول جاتا ہے لیکن مجھے اس بات کی خوشی ہے کہ تم مجھے نہیں بھولے۔" پرکاش نے مسکرا کر کہا۔

"میں آپ کو کیسے بھول سکتا ہوں۔ جب میں اس شہر میں آیا تھا تو میرے پاس کچھ بھی نہیں تھا۔ آپ اس انڈسٹری کے شومین تھے اور ہیں۔ میں آپ کے لیے ہی اپنا جنون لے کر آیا تھا۔ کتنی مشکلوں کے بعد میں آپ سے مل سکا تھا اور آپ کے کہنے پر مجھے اس شہر میں چھت ملی تھی۔ ورنہ میری راتیں فٹ پاتھ پر گزر رہی تھیں۔" وہ اپنے ماضی میں چلا گیا تھا۔

"راہول تمہیں کچھ اور بھی یاد ہے بھلا۔" اس کی باتوں کو غور سے سنتے ہوئے پرکاش نے لقمہ دیا۔

"مجھے سب یاد ہے۔ میں آپ کی کسی فلم میں کام کرنا چاہتا تھا اور آپ فلم انڈسٹری کے سب سے معروف فلمساز اور ہدایت کار تھے۔ آپ نے صاف کہہ دیا تھا کہ ابھی مجھے کاسٹ کرنے کی آپ کے پاس گنجائش نہیں ہے لیکن آپ نے وعدہ کیا تھا کہ میں تمہیں کہیں نہ کہیں کاسٹ کر لوں گا۔" راہول نے بتایا۔

"ہاں ایسا ہی تھا.. کیا میں نے وہ وعدہ نبھایا تھا؟" پرکاش نے اس کی طرف دیکھا۔

"میری ماں جو میرا کل سرمایہ تھیں، وہ بھی میرے پاس آ گئی تھیں۔ میرے پاس کوئی کام نہیں تھا۔ مفلسی کے ڈیرے تھے۔ ماں کی فکر تھی۔ مجھے اپنی ماں سے جان سے بھی زیادہ محبت تھی۔ اس کٹھن حالات میں آپ نے میری سفارش کی۔ مجھے ایک فلم ملا دی اور مجھے معاوضہ بھی دلا دیا۔ میری وہ فلم ایسی سپرہٹ ہوئی کہ دولت، شہرت مجھ پر بارش کی طرح برسنے لگی اور یہ سب کچھ آپ کی مہربانی سے ہوا۔"

"اچھا ہوا کہ تم نے خود ہی ماضی کے ورق الٹ دیے اور مجھے کچھ یاد نہیں دلانا پڑا۔ اچھا تمہیں وہ وعدہ یاد ہے جب تم اسٹار بن گئے تھے اور اپنی ماتا جی کے ساتھ میرے گھر آئے تھے۔" پرکاش نے ماضی کے ایک اور صفحے کی

جانب توجہ دلائی۔

راہول کو وہ دن بھی یاد آ گیا۔ ”میں اپنی ماں جی کے ساتھ آپ کا شکریہ ادا کرنے آیا تھا۔ میں نے کہا تھا کہ آپ جب بھی مجھے اپنی کسی فلم کے لیے بلائیں گے، میں اپنا ہر کام چھوڑ کر آپ کی فلم کے لیے تاریخیں دوں گا۔ میرا کروڑوں کا نقصان ہو جائے اور میں کتنا بھی مصروف ہو جاؤں، آپ کو انکار نہیں کروں گا۔“

”اور یہ بات تم نے اپنی پیاری ماں جی کے سر پہ ہاتھ رکھ کر کی تھی۔“ پرکاش بولا۔

”بالکل میں نے ماں جی کے سر کی قسم کھا کر بات کی تھی۔ مجھے سب یاد ہے۔“

”یہ تو اچھا ہوا کہ تمہیں سب یاد ہے۔ آدھا کام میں بتا دیتا ہوں۔“ پرکاش نے اس کی طرف بغور دیکھتے ہوئے کہا۔

اس کی بات سن کر یکدم راہول کو ایسا لگا جیسے اس نے اپنے ماضی کی کتاب کھول کر کچھ غلطی کر لی ہے۔ اس کے دل میں کچھ کھٹکا۔ آنند بھی پاس ہی بیٹھا تھا۔ پرکاش نے کچھ توقف کے بعد اپنی بات کا آغاز کیا۔

”میں اختصار سے کہوں گا۔ دنیا مجھے شو مین کے نام سے جانتی ہے۔ بدقسمتی سے میری دو فلمیں کے بعد دیگرے بری طرح سے پٹ گئیں۔ آخری فلم تو میرا سب کچھ لے گئی۔ میں مقروض ہو گیا ہوں۔ ان لوگوں سے دو ماہ کی مہلت لی ہے اور وہ لوگ میری بات مان کر دو ماہ کے لیے چپ ہو گئے ہیں، ورنہ میرا بھرم بھی کھل جاتا اور سب کو میری بربادی کا پتا چل جاتا۔ میرے لیے یہ دو ماہ بہت اہم ہیں۔ اسکرپٹ میرے پاس تیار ہے۔ دوسری کاسٹ میرے ساتھ کام کرنے کے لیے تیار ہے۔ میں اپنی نئی فلم چالیس دنوں میں مکمل کرنا چاہتا ہوں۔ تم اپنی اس قسم کو ذہن میں ایک بار پھر لے آؤ اور مجھے دو دن کے بعد اپنے اٹھائیس دن دے دو۔ میں سرعت سے کام کرنا چاہتا ہوں۔ اٹھائیس دن کے بعد تمہارا کام ختم ہو جائے گا۔ باقی کام میں جلد مکمل کر کے فلم کو سینما کی زینت بنا کر اپنی قسمت بدلنا چاہتا ہوں۔ تمہارا نام فلم کی کامیابی کی ضمانت بن چکا ہے اور میرے پاس بس ایک چارہ ہے کہ تم میری فلم میں کام کرو۔ میری فلم میں سرمایہ کاری بھی تم کرو گے اور مجھے انکار بھی نہیں کرو گے کیونکہ تم نے اپنی اس ماں کے سر پہ ہاتھ رکھ کر قسم کھائی تھی جو اب اس دنیا میں نہیں ہے۔“

پرکاش اپنی بات ختم کر چکا تھا۔ راہول اور آنند اس کی بات سن کر دم بخود بیٹھے تھے۔ پرکاش نے ماضی میں کیے گئے وعدے کو یاد دلا کر راہول کو امتحان میں ڈال دیا تھا۔

راہول کو اپنی ماں سے بے انتہا محبت تھی۔ اس نے اس کی زندگی میں قسم کھائی تھی۔ وہ اپنی قسم پوری کرنا چاہتا تھا لیکن قسم پوری کرنے کا خمیازہ کروڑوں روپے کے نقصان کی صورت میں اسے برداشت کرنا پڑتا، کیونکہ اس کی ذاتی فلم کے مہنگے سیٹ لگے ہوئے تھے۔ اگلے ماہ دیوالی تھی اور اس موقع پر وہ اپنی فلم ریلیز کرنا چاہتا تھا۔ وہ دن رات اس فلم کی تکمیل کے لیے لگا ہوا تھا۔ اور اب پرکاش قسم یاد دلا کر انتہائی قیمتی اٹھائیس دن اس سے مانگ رہا تھا۔ راہول کے لیے اٹھائیس دن دینا اور اپنی دی ہوئی قسم کو پورا کرنا ناممکن تھا۔

راہول نے کچھ سوچا اور پھر مسکرا کر بولا۔ ”میں اپنی قسم نہیں توڑوں گا۔ چاہے کتنا ہی نقصان ہو جائے مجھے پروا نہیں، آپ کام شروع کریں، میں اپنے اٹھائیس دن آپ کو دیتا ہوں۔“

راہول کی بات سن کر پرکاش کا چہرہ خوشی سے کھل اٹھا۔ جبکہ آنند کے چہرے پر حیرت برس رہی تھی۔ وہ سوچ رہا تھا کہ راہول نے اپنے اٹھائیس دن نہیں دیے بلکہ اپنی فلم اور کروڑوں کا نقصان کرنے کی ہامی بھری ہے۔

”تم نے مجھے خوش کر دیا راہول۔ تمہاری ماں کو کتنی شانتی ملی ہوگی۔ میرے کام کرنے کا انداز تم جانتے ہو۔ میں اگلے اڑتالیس گھنٹوں میں اسٹوڈیو میں سیٹ لگوانا شروع کر دوں گا اور سات دن کی ہماری آؤٹ ڈور شوٹنگ ہے۔ جب تک اسٹوڈیو میں سیٹ لگے گا، میرے دوست کے فارم ہاؤس میں آؤٹ ڈور شوٹنگ شروع ہو جائے گی۔ میں تمہیں فل اسکرپٹ بھیج دوں گا، تم اپنا کردار پڑھ کر چونک جاؤ گے اور ایسا یادگار فل اسکرپٹ بھی تمہاری زندگی میں پہلی بار آئے گا۔“ پرکاش کی خوشی کا کوئی ٹھکانا نہیں تھا۔

”مجھے آپ پر اعتماد ہے۔ آپ بےفکر ہو کر کام شروع کریں اور کل آنند سے رابطہ کر کے بتا دیں کہ مجھے شوٹنگ کہاں اور کس وقت کرنی ہے۔ آنند میرا تمام شیڈول ختم کر دو اور اٹھائیس دن پرکاش جی کو دے دو۔“ راہول کا حکم سن کر آنند کو کچھ کہنے کی ہمت ہی نہیں ہوئی۔ وہ تو ششدر ان دونوں کی طرف دیکھے جا رہا تھا۔

پرکاش نے اپنے کوٹ کی اندرونی جیب سے ایک دستاویز نکال کر آکاش کے سامنے رکھ دی اور آکاش نے دستخط کر دیے۔ فلم کرنے کا اگریمنٹ ہو گیا تھا۔ پرکاش نے وہ کاغذ اپنی جیب میں رکھا اور اجازت لے کر چلا گیا۔

☆☆☆

پرکاش کے جاتے ہی آنند بولا۔ ''یہ کیا کیا آپ نے راہول! انہوں نے اپنے ہی ہاتھ کاٹ کر اس ہرفن کے فلاپ ہدایت کار کو دے دیے۔ جانتے ہیں آپ کو کتنا نقصان برداشت کرنا پڑے گا۔ آپ کی ساکھ کو کتنا نقصان پہنچے گا؟ آخر آپ کو کیا ضرورت تھی کہ آپ ماضی کو کنگال کر اس کے سامنے رکھ دیں۔''

''سچی بات تو یہ ہے کہ میں احسان فراموش نہیں ہوں۔ جب انہوں نے طویل عرصے کے بعد مجھ سے ملنے کی خواہش کی تو میں نے آج کا وقت دے دیا۔ میرا خیال تھا کہ وہ پریشان اور مایوس ہیں۔ ماضی کی یہ باتیں ان کی دل جوئی کے لیے اچھی ہوں گی.... میں ماضی کی بات ان کے سامنے کہتا گیا۔ لیکن مجھے کیا پتا تھا کہ وہ کچھ اور ہی سوچ کر آئے ہیں۔'' راہول نے کہا۔

''میرے پاس وہ الفاظ نہیں ہیں جن سے میں آپ کو ہونے والے نقصان کے بارے میں بتا سکوں۔'' آنند مضطرب تھا۔

''میں نے وہ قسم اپنی ماں جی کے سر پر ہاتھ رکھ کر کھائی تھی اور میں اس قسم سے انکار نہیں کر سکتا تھا۔ میں نے ہر بات پرکاش سے کہی تھی وہ پوری کر دی۔ انہوں نے تاریخیں مانگیں میں نے دے دیں۔ سرمایہ مانگا میں نے حامی بھر دی۔ میں اپنی قسم سے نہیں پھرا۔'' راہول نے اٹھ کر اس کے قریب ہوتے ہوئے کہا۔ ''ہمارے پاس اڑتالیس گھنٹے ہیں۔ میں وعدہ خلافی نہیں کروں گا اور نہ ہی قسم توڑوں گا۔ ان اڑتالیس گھنٹوں کے گزرنے کے بعد میں پرکاش کی فلم کی شوٹنگ کے لیے سیٹ پر پہنچ جاؤں گا... یا پھر اپنی فلم کی شوٹنگ کرتا رہوں گا۔''

''دوسری بات کیسے ممکن ہے؟'' آنند نے حیرت سے پوچھا۔

راہول نے آنند کی طرف دیکھتے ہوئے معنی خیز لہجے میں کہا۔ ''میں نے وعدے کے مطابق اپنی قسم سے انکار نہیں کیا اور اب تم کچھ ایسا کرو کہ مجھے اڑتالیس گھنٹوں کے بعد پرکاش کی فلم کی شوٹنگ کے لیے جانا نہ پڑے۔'' راہول کا چہرہ اس بات کا غماز تھا کہ وہ دل ہی دل میں کوئی خطرناک فیصلہ کر چکا ہے۔

''میں کیا کروں؟'' آنند کی سمجھ میں کچھ نہیں آرہا تھا۔ وہ ہکا بکا اس کے سامنے کھڑا تھا۔

''سنجے کو تم جانتے ہو۔ وہ تجسس اور مسٹری لکھنے کا بادشاہ ہے۔ اس کا اسکرپٹ میرے پاس ہے۔ تم سارے کام چھوڑ کر اس اسکرپٹ کو پڑھو۔'' راہول نے سنسنی خیز لہجے میں کہا۔

''اس اسکرپٹ میں ہے کیا؟'' آنند نے پوچھا۔

راہول نے پھنکارتی ہوئی آواز میں کہا۔ ''اس اسکرپٹ میں ایک ہوشیاری سے کیے گئے مرڈر کی کہانی ہے۔'' یہ سنتے ہی آنند کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔

☆☆☆

سنجے کے کئی ناول مارکیٹ میں آچکے تھے۔ وہ پُرتجسس اور سنسنی خیز کہانیاں لکھتا تھا۔ حال ہی میں اس نے اپنے ایک ناول پر فلم بنائی تھی جو سپرہٹ گئی تھی۔ پھر وہ ایک ایسا اسکرپٹ لے کر راہول کے پاس گیا جس پر اس نے پہلے ناول نہیں لکھا تھا۔ وہ راہول کے ساتھ کام کرنا چاہتا تھا۔ اسکرپٹ پڑھ کر راہول نے سنجے سے کہا تھا کہ وہ اپنے کام سے فارغ ہو کر اس اسکرپٹ پر ضرور کام کرے گا۔ کیونکہ وہ ایک مضبوط کہانی پر مشتمل اسکرپٹ تھا۔

راہول نے وہ اسکرپٹ آنند کو دے دیا۔ آنند نے سب کام چھوڑ کر اس اسکرپٹ کو پڑھنا شروع کر دیا۔ جب وہ اسکرپٹ پڑھ چکا تو وہ بہت دیر تک گم صم بیٹھا سوچتا رہا۔ لکھنے والے نے کمال کا اسکرپٹ لکھا تھا۔ کہانی ہیرو کے گرد گھومتی ہے جس نے ایک ایسا قتل کیا تھا جس کا اس نے کوئی ثبوت نہیں چھوڑا تھا۔ کہانی کے آخر تک پولیس قاتل کو تلاش ہی نہیں کر پاتی۔

آنند کا ماضی جرائم پیشہ لوگوں کے ساتھ گزرا تھا۔ آنند کو لگا کہ وہ اس پلاٹ پر عمل کرے تو پرکاش کو قتل کرنا مشکل نہیں ہے۔ پرکاش اپنی بیوی کے ساتھ فلیٹ میں رہتا تھا۔ ان کی اولاد نہیں تھی۔ کہانی بہت حد تک پرکاش سے ملتی تھی۔

کچھ دیر بعد آنند نے سوچ لیا کہ وہ اس اسکرپٹ کو سامنے رکھ کر پرکاش کو قتل کر سکتا ہے۔ پرکاش کا قتل ہی انہیں کروڑوں کے نقصان سے بچا سکتا تھا۔

کچھ دیر کے بعد راہول اس کے پاس آکر بولا۔ ''اسکرپٹ پڑھ لیا تم نے؟''

''ہاں پڑھ لیا ہے۔'' اس نے جواب دیا۔

''کیا سوچا ہے؟'' اس نے پوچھا۔

''اس اسکرپٹ اور ہماری زندگی کی کہانی ایک جیسی ہی ہے۔ اڑتالیس گھنٹے سے پہلے میں یہ کام اسی طرح کروں گا جیسے اسکرپٹ میں لکھا ہے۔ اسکرپٹ میں بھی مقتول اپنی بیوی کے ساتھ فلیٹ میں رہتا ہے اور پرکاش کی

زندگی بھی اسی طرح گزر رہی ہے۔"

"یہ کام تم خود کرنا۔ ایک بار پھر اپنے ماضی میں چلے جاؤ اور بھول جاؤ کہ تم بہت بڑے اسٹار کے سیکریٹری ہو۔ کام احتیاط سے کرنا۔ پوری صفائی سے کہ کوئی ثبوت نہ ملے ورنہ سب کچھ ختم ہو جائے گا۔" راہول نے تاکید کی۔

"آپ مطمئن ہو جائیں۔" اس نے تسلی دی۔

"میں معمول کے مطابق اپنی شوٹنگ پر رہوں گا۔ مجھے یقین ہے کہ تم یہ کام آسانی سے کر لو گے۔"

"آپ اطمینان سے کام کریں۔ آپ کو اپنی کھائی ہوئی قسم کی قیمت ادا نہیں کرنی پڑے گی۔" آنند بولا۔

☆☆☆

رات کو ہی آنند فون کر کے پرکاش کے فلیٹ میں چلا گیا۔ پرکاش کا فلیٹ عمارت کے دوسرے فلور پر تھا۔ گیٹ پر تین سیکیورٹی گارڈ بیٹھے ہوتے تھے۔ وہ ہر آنے جانے والے پر نظر رکھتے تھے۔ جن کے چہرے شناسا ہوتے تھے انہیں آنے جانے میں کوئی رکاوٹ نہیں ہوتی تھی۔ آنند کیونکہ اس عمارت میں پہلے بھی آتا جاتا رہا تھا اس لیے اسے کسی نے نہیں روکا، کیونکہ اس عمارت میں فلم انڈسٹری سے تعلق رکھنے والے کچھ دوسرے لوگوں کے بھی فلیٹ تھے۔

آنند اردگرد کا جائزہ لیتا ہوا لفٹ کے ذریعے اوپر پہنچا۔ جہاں پرکاش کا فلیٹ تھا اس سے آگے آنند کے دوست کا بھی فلیٹ تھا۔ آنند نے پرکاش کے فلیٹ کی بیل دی تو دروازہ مسز پرکاش نے کھولا۔ وہ آنند کو دیکھتے ہی مسکرائی اور آنند کے اندر آتے ہی اس نے دروازہ بند کر دیا۔ مسز آنند اپنی عمر کے اس حصے میں بھی بہت خوبصورت اور پرکشش تھی۔

آنند پہلی بار اس فلیٹ میں آیا تھا۔ وہ مسز پرکاش کے ساتھ کمرے کی طرف جاتے ہوئے فلیٹ کا جائزہ لے رہا تھا۔ اس نے دیکھا کہ دو بیڈ روم، ایک ڈرائنگ روم، کچن، اور لاؤنج تھا۔

جب آنند کمرے میں داخل ہوا تو پرکاش کاغذات میں الجھا ہوا تھا۔ وہ اسے دیکھتے ہی اپنے کاغذات سمیٹنے لگا۔

"ارے آؤ، آؤ بیٹھو۔"

"شکریہ۔" آنند نے کرسی سنبھال لی۔

"تم چائے بنا لاؤ۔" پرکاش اپنی بیوی کو کہہ کر آنند کی طرف متوجہ ہوا۔ "دراصل نوکروں کی چھٹی کرا دی ہے۔ اب ہم دونوں میاں بیوی ہی اس فلیٹ میں رہتے ہیں۔"

مسز پرکاش اس کا حکم سن کر کمرے سے چلی گئی۔ "آپ کی بیگم بہت نفیس خاتون ہیں۔" آنند نے تعریف کی۔

"بے چاری کو اب اس گھر کے بھی کام کرنے پڑتے ہیں۔ پہلے ہی وہ تھکی ماندی گھر آتی ہے۔"

"کیا کچھ اور بھی کرتی ہیں؟"

"کالج میں پڑھاتی ہیں۔ صبح آٹھ بجے نکل جاتی ہیں اور میں بارہ بجے کے بعد جاتا ہوں۔ جب شوٹنگ ہو تو پھر میرا کوئی آنے جانے کا ٹائم نہیں ہوتا۔"

"آپ کل کس وقت گھر سے نکل رہے ہیں؟" آنند نے پوچھا۔

"میں اس اسکرپٹ میں کچھ تبدیلی کر رہا ہوں اس لیے میں کل گیارہ بجے تک یہیں ہوں۔ میرے دوست کے فارم ہاؤس پر فلم کا سیٹ لگنا کل سے شروع ہو جائے گا، اس لیے مجھے ٹھیک بارہ بجے وہاں پہنچنا ہے، کچھ دوسرے معاملے دیکھنے ہیں اور پرسوں دو بجے دن کو ہماری فلم کی شوٹنگ شروع ہو جائے گی۔" پرکاش نے بتایا۔

آنند کو جو معلومات درکار تھیں، وہ فوراً مل گئیں۔ اس نے سوچا کہ وہ کل صبح نو بجے سے بارہ بجے کے درمیان اپنا کام کر سکتا ہے، وہ بولا۔ "آپ اپنے کام میں واقعی جنونی

پیانو

ایک شادی شدہ جوڑا ہنی مون کے لیے ہوائی جہاز پر سفر کرنے کے لیے ائرپورٹ پر پہنچا تو دلہن نے اپنے شوہر سے کہا۔ "کاش ہم اپنا پیانو بھی ساتھ لے آتے۔"

"پیانو؟" شوہر نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا۔ "بھلا پیانو ساتھ لانے کی کیا تک ہے؟"

"جہاز کے ٹکٹ پیانو پر رکھے ہوئے تھے۔" دلہن نے جواب دیا۔

مجبوری

"تمہاری دو بیویاں کار کے حادثے میں ہلاک ہوئیں۔" جج نے کٹہرے میں کھڑے ہوئے ملزم سے سوال کیا۔ "دونوں مرتبہ کار کے بریک فیل ہونے کی وجہ سے حادثہ ہوا۔"

"تو کیا میں پوچھ سکتا ہوں۔" جج نے گفتگو آگے بڑھائی۔ "تمہاری تیسری بیوی کی موت زہر خورانی کی وجہ سے واقع ہوئی... اس کی وجہ کیا ہے؟"

"تیسری بیوی!" ملزم نے معصومیت سے جواب دیا۔ "وہ ڈرائیونگ نہیں جانتی تھی۔"

تیں۔"

"ہر کا مبالی جنون سے ہی ملتی ہے۔"

"آپ نے ٹھیک کہا ہے۔ میں دراصل اسکرپٹ لینے آیا تھا۔" آنند نے کہا۔

"مجھے فلم میں کچھ تبدیلی کرنی ہے۔ تم ایسا کرو کہ چائے وغیرہ پیو۔ ایک گھنٹے کا کام ہے، اسکرپٹ لے جانا۔"

اس کی بات سنتے ہی آنند بولا۔ "آپ اطمینان سے کام کرنا۔ میں کل صبح نو بجے آپ کے پاس آجاؤں گا۔"

"یہ اور بھی اچھا ہوگا۔ میں خوب اچھی طرح سے اپنا کام مکمل کرسکوں گا۔" وہ خوش ہوگیا۔ "کل جب تم نو بجے آؤ گے تو تمہیں فلیٹ کا دروازہ کھلا ہی ملے گا کیونکہ میری بیوی جب جاتی ہے تو دروازہ اندر سے لاک کرنا میرے لیے مشکل ہوتا ہے کیونکہ میں اس وقت سو رہا ہوتا ہوں۔"

"کیا آپ کو کسی چور کا ڈر نہیں ہوتا۔" آنند مسکرایا۔

"یہاں کی سیکیورٹی بہت زبردست ہے۔" پرکاش نے کہا۔

"آپ چائے کا منع کردیں۔ مجھے ایک جگہ اور بھی جانا ہے۔ کیا میں آپ کا ٹوائلٹ استعمال کرسکتا ہوں۔" آنند اچانک اپنی جگہ سے اٹھا۔

"ہاں کیوں نہیں۔ آپ ٹوائلٹ چلے جائیں، میں چائے کا منع کردیتا ہوں۔"

آنند اٹھا اور بیڈ روم سے متصل باتھ روم میں چلا گیا۔ اسے لگ رہا تھا جیسے وہ اس فلم کے اسکرپٹ پر کام کررہا ہو۔ وہ حقیقت میں نہیں بلکہ کیمرے کے سامنے کھڑا ہو۔ کیونکہ اسکرپٹ میں اسی طرح ہوتا ہے۔

آنند باتھ روم میں چلا گیا اور جاتے ہی اس نے دائیں بائیں متلاشی نگاہوں سے دیکھنا شروع کردیا۔ سامنے ایک چھوٹا سا کیبن تھا۔ اس نے اس کا پٹ کھولا تو اندر بہت سی شیمپو وغیرہ کی بوتلیں قرینے سے رکھی ہوئی تھیں۔ آنند نے ان بوتلوں کو احتیاط سے ہٹایا تو ان بوتلوں کے پیچھے بھی بوتلیں رکھی ہوئی تھیں۔ دراصل جو بوتلیں خالی ہوچکی تھیں، انہیں نکال کر پھینکا نہیں تھا بلکہ ان کے آگے دوسری بوتلیں رکھ دی گئی تھیں جس سے وہاں انبار سا لگ گیا تھا۔ لیکن بوتلوں کی ترتیب زبردست تھی۔

آنند نے بغیر آواز پیدا کیے بوتلیں باہر نکال کر رکھیں اور پھر اپنے کوٹ کے اندر سے پسلیوں کے ساتھ لگا ایک خنجر نکال کر اسی جگہ رکھا اور اس کے آگے پھر بوتلیں سجادیں۔ فلم کے مسودے میں یہ کام گھر کا ملازم کرتا ہے کیونکہ وہ قاتل کا بھائی ہوتا ہے اور دونوں بھائی قتل ہونے والے سے اپنی ایک زیادتی کا انتقام لیتے ہیں۔ آنند نے خنجر پہلے سے اس لیے چھپا رکھا تھا تاکہ وہ اس طرف سے مطمئن رہے۔ فلم کی کہانی میں ہیرو یہ کام اس لیے کرتا ہے تاکہ وہ آسانی سے اس قاتل میں چلا جائے جہاں اسے قتل کرنا ہوتا ہے۔

آنند اپنا کام مکمل کرنے کے بعد باتھ روم سے باہر نکل آیا۔ "میں چلتا ہوں۔" آنند نے کہا۔

"ٹھیک ہے کل نو بجے میں تمہارا انتظار کروں گا۔" پرکاش جو کاغذات پر جھکا ہوا تھا، اس نے سر اٹھا کر کہا۔

آنند کمرے سے باہر نکلا تو مسز پرکاش اسے چھوڑنے کے لیے دروازے تک آئی۔

☆☆☆

دوسرے دن راہول کو اپنی شوٹنگ کے لیے صبح سویرے ہی نکلنا تھا۔ وہ اپنی فلم کو بڑی سرعت سے مکمل کررہا تھا۔ جانے سے قبل اس نے آنند کی طرف دیکھتے ہوئے آہستہ سے پوچھا۔ "آج کام ہوجائے گا؟"

اس کے جواب میں آنند نے تسلی آمیز لہجے میں کہا۔ "آپ اطمینان سے اپنا کام کریں۔ میرے لیے یہ معمولی کام ہے اور اس اسکرپٹ نے میری مدد کرکے مجھے اور بھی آسانی کردی ہے۔ آج کام ہوجائے گا۔ کل آپ کو پرکاش کی شوٹنگ کے لیے جانا نہیں پڑے گا اور آپ اپنی قسم میں جھوٹے نہیں پڑیں گے۔"

"کام احتیاط سے کرنا۔" راہول نے تاکید کی اور اپنے اسٹاف کے ساتھ شوٹنگ کے لیے نکل گیا۔

ساڑھے آٹھ بجے آنند اپنی کار کو خود ہی ڈرائیو کرتا ہوا اس عمارت میں جا پہنچا جہاں پرکاش کا فلیٹ تھا۔ سیکیورٹی گارڈ نے مسکرا کر آنند کی طرف دیکھا اور آنند بھی اپنے سر کو تھوڑا سا خم دے کر لفٹ کی طرف بڑھ گیا۔ وہ اس فلور پر پہنچا جہاں پرکاش کا فلیٹ تھا۔ راہداری میں کوئی بھی نہیں تھا۔ اس نے دائیں بائیں دیکھا اور پھر اس نے آہستہ سے دروازہ کھولا اور اندر داخل ہوگیا۔

اندر خاموشی تھی۔ وہ پھر چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتا پرکاش کے بیڈروم تک پہنچ گیا۔ اس نے اپنا ہاتھ دروازے کے ہینڈل پر رکھا اور ایک جھٹکے سے دروازہ کھول دیا۔

اس کا خیال تھا کہ وہ پرکاش کو پرجوش انداز میں ہیلو کہے گا اور کچھ دیر اس کے پاس بیٹھنے کے بعد باتھ روم جائے گا اور وہاں پر چھپایا ہوا خنجر نکال کر وہ پرکاش کا کام کردے گا لیکن اس کی سوچ کے برعکس وہاں کا منظر ہی

بکھرا ہوا تھا جس نے اسے ششدر کر دیا۔ اس کی نگاہیں ایک جگہ ہی جم گئیں اور اس کے منہ سے چیخ نکلتے نکلتے رہ گئی۔

بیڈ پر پرکاش کی خون آلود لاش پڑی ہوئی تھی۔ وہی خنجر جو آنند نے باتھ روم میں چھپایا تھا، وہ اس کے سینے میں اترا ہوا تھا اور جس اسکرپٹ پر وہ کام کر رہا تھا اس کے صفحے بیڈ پر دائیں بائیں بکھرے ہوئے تھے۔ ان صفحات پر بھی خون کے چھینٹے نظر آ رہے تھے۔

وہ سب دیکھ کر آنند کی سانس تیز ہو گئی۔ یہ کس نے اور کب کیا تھا؟ یہ سوچنے کا آنند کے پاس وقت نہیں تھا۔ وہ فوراً پلٹا تو اسی اثنا میں کوئی اس فلیٹ سے باہر نکل کر دروازہ بند کر رہا تھا۔ آنند کے دروازے تک پہنچنے سے قبل ہی دروازہ بند ہوا اور باہر سے کسی نے کی ہول میں چابی بھی گھما دی تھی۔

آنند نے دروازے کا ہینڈل پکڑ کر گھمایا لیکن دروازہ باہر سے مقفل تھا۔ آنند کے ماتھے پر پسینا آ گیا۔ اس نے فلیٹ سے نکلنے کے لیے دائیں بائیں دیکھا، اس کے سوا کوئی دروازہ نہیں تھا جس سے وہ باہر نکل سکے۔

آنند ایک کمرے میں گیا۔ کھڑکیوں پر مضبوط گرل تھیں، وہ کسی کھڑکی سے بھی باہر نہیں نکل سکتا تھا۔ وہ فلیٹ میں پھنس گیا تھا۔

آنند نے جلدی سے اپنا موبائل فون نکالا اور برق رفتاری سے راہول کا نمبر ملانے لگا۔ کچھ دیر کے بعد راہول نے فون اٹھایا تو آنند نے ایک ہی سانس میں ساری بات کہہ دی۔ اس کی بات سنتے ہی راہول اپنی سیٹ سے اٹھ کھڑا ہوا۔

”یہ... یہ تم کیا کہہ رہے ہو؟“

”میں وہی کہہ رہا ہوں جو یہاں ہوا ہے۔ مجھے اس جگہ سے نکالیں ورنہ بہت برا ہو جائے گا، ہم پھنس جائیں گے۔“

”میں کسی اور کو بھیج بھی نہیں سکتا۔ ورنہ یہ بات ہم دونوں سے نکل کر تیسرے کے پاس چلی جائے گی۔ مجھے خود ہی آنا پڑے گا۔“ راہول پریشان ہو گیا اور اس پریشانی نے اس کی سوچ کو سلب کر لیا تھا۔

”آپ کیسے آئیں گے۔ رتنا جانتی ہے آپ کو، اس جگہ آپ آ گئے تو گڑبڑ ہو جائے گی۔“ آنند بولا۔

”تم فکر نہیں کرو۔ میں کچھ نہ کچھ کرتا ہوں۔ میں تمہارے پاس ابھی پہنچتا ہوں۔“ راہول حواس باختہ ہو گیا تھا۔ فون بند کرنے کے بعد وہ سوچنے لگا کہ وہ کیا کرے۔ پھر اس نے اپنے میک اپ مین کو بلا لیا۔

☆☆☆

آنند اندر پریشان ایک دیوار کے ساتھ لگا کھڑا تھا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ اگر دروازہ کھلنے سے قبل پولیس اس جگہ آ گئی تو وہ پکڑا جائے گا۔ وہ اسی غم و فکر میں مبتلا تھا اور باہر پرکاش کے برابر والے فلیٹ سے ایک نوجوان باہر نکلا۔ پہلے اس نے دائیں بائیں دیکھا اور پھر پرکاش کے فلیٹ کی طرف بڑھ گیا۔

وہ ایک آوارہ گرد نوجوان تھا۔ کام کاج کچھ نہیں کرتا تھا۔ اس کے علم میں یہ بات تھی کہ مسز پرکاش آٹھ بجے کالج چلی جاتی ہیں اور پرکاش اندر سو رہا ہوتا یا اپنے کمرے میں کام کر رہا ہوتا ہے۔ پرکاش کے فریج سے کھانے پینے کا اس کے پاس یہ بہترین موقع ہوتا تھا۔ اس نے کبھی پرکاش کے فلیٹ سے کوئی دوسری چیز چوری نہیں کی تھی، وہ شخص ان کے فریج میں پڑی چیزوں پر ہاتھ صاف کرتا تھا۔ مسز پرکاش واپسی پر یہی سمجھتی تھی کہ یہ سب پرکاش نے کھایا ہے اور پرکاش کے علم میں بھی نہیں ہوتا تھا کہ کچن اور فریج میں کیا کچھ رکھا ہے۔

نوجوان کی نظر اچانک دروازے کے قفل پر پڑی تو وہ چونکا کیونکہ قفل میں چابی لگی ہوئی تھی۔ اس نے سوچا کہ شاید مسز پرکاش کالج جاتے ہوئے چابی قفل میں ہی بھول گئی ہیں۔ پھر اس کو یہ خیال بھی آیا کہ مسز پرکاش نے تو کبھی دروازہ مقفل کیا ہی نہیں تو پھر یہ چابی؟ نوجوان نے کچھ دیر سوچا۔ وہ ان فضول باتوں کو سوچنا نہیں چاہتا تھا۔ اس نے دروازہ کھول کر اندر جھانکا، پورے فلیٹ میں خاموشی تھی۔

ایک نوجوان کو اندر آتا دیکھ کر آنند جو ایک طرف کھڑا تھا، دیوار کے ساتھ مزید چپک کر کھڑا ہو گیا۔ اس کا دل زور زور سے دھڑک رہا تھا۔

”مسز پرکاش یا تو سو رہے ہوں گے یا پھر چلے گئے ہوں گے۔“ نوجوان نے دل ہی دل میں کہا اور اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ آ گئی۔

”اتنا بڑا رائٹر بکھر اور فریج خالی۔ لگتا ہے اس کے برے حالات آ گئے ہیں۔“ وہ دودھ کے ڈبے کی طرف ہاتھ بڑھاتے ہوئے بڑبڑایا۔

اسی وقت آنند نے محتاط انداز میں کچن میں جھانکا۔ فریج کا دروازہ کھلا ہوا تھا اور وہ نوجوان اس کے پاس کھڑا تھا۔ آنند نے وقت ضائع نہیں کیا اور بے آواز قدم اٹھاتا ہوا دروازے کی طرف بھاگا۔ اس نے دروازہ کھولا اور باہر نکل گیا۔

نوجوان نے دودھ پیا، فریج کا دروازہ بند کیا، مسکرائی

نگاہوں سے کچھ اور کھانے پینے کی چیز تلاش کی اور برا سا منہ بنا کر بڑبڑایا۔ ''آج تو مزہ ہی نہیں آیا۔'' وہ کچن سے نکل کر برکاش کے کمرے کی طرف چلا گیا۔

جونہی اس نے دروازہ کھولا، اس کی نظر برکاش کی لاش پر پڑی۔ اس کے ہاتھوں کے طوطے اڑ گئے۔ اس نے اپنی چیخ کو روکنے کے لیے دونوں ہاتھ اپنے منہ پر رکھ لیے اور تیزی سے باہر نکل کر گھبرائے ہوئے انداز میں دروازہ بند کیا، دائیں بائیں دیکھا اور اپنے فلیٹ کی طرف چلا گیا۔

☆☆☆

آنند نے لفٹ میں سوار ہوتے ہی اپنا موبائل فون نکالا اور راہول کا نمبر ملایا۔ تھوڑی دیر کے بعد ہی رابطہ ہو گیا۔

''آپ اس وقت کہاں ہیں؟''

''میں عمارت کے اندر آ گیا ہوں۔'' اس نے بتایا۔

''آپ فوراً واپس چلے جائیں، میں فلیٹ سے باہر نکل آیا ہوں۔''

''تم اس وقت کہاں ہو اور باہر کیسے نکل آئے ہو؟''

''میں لفٹ سے نیچے آ رہا ہوں۔ آپ کو پل کر سب بتاتا ہوں۔ لیکن آپ کو یہاں سب پہچان گئے ہوں گے۔'' آنند نے کہا۔

''مجھے یہاں کوئی نہیں پہچان رہا ہے۔ میں میک اپ میں ہوں۔'' راہول کی آواز آئی۔

☆☆☆

یہ بات واقعی درست تھی کہ فلم انڈسٹری کا سپر اسٹار، جس کی ایک جھلک دیکھنے کے لیے لوگ مضطرب ہو جاتے تھے، وہ اس عمارت کے اندر کھڑا تھا اور کوئی بھی اسے نہیں پہچان رہا تھا۔ میک اپ مین نے اس کا میک اپ ہی ایسا کیا تھا کہ اس کی شکل ہی بدل گئی تھی اور پھر راہول کی اداکارانہ صلاحیتیں کہ اس کی چال بھی راہول جیسی نہیں رہی تھی۔

جس وقت راہول کو آنند کا فون آیا تھا، وہ اس وقت سیکیورٹی گارڈز کے کیبن سے گزر کر کچھ ہی آگے گیا تھا۔ وہ فون سننے کے لیے رک گیا تھا۔ جب تک وہ فون سنتا رہا، سیکیورٹی گارڈ اس کا جائزہ لیتا رہا۔ اس نے بھی پہلی بار اس شخص کو اس عمارت میں دیکھا تھا۔

اس وقت سیکیورٹی گارڈ کو حیرت کا دھچکا لگا جب وہ شخص اندر جانے کے بجائے فون سن کر واپس پلٹا اور بیرونی دروازے کی طرف چل پڑا۔ راہول اس جگہ تک ٹیکسی میں آیا تھا۔ وہ گیٹ عبور کر کے باہر نکل گیا۔ اور تیزی سے ایک ٹیکسی کی طرف بڑھا اور دروازہ کھول کر اس میں بیٹھ گیا۔ اس ٹیکسی کے جاتے ہی آنند بھی پیچھے ہی اپنی کار میں باہر نکل آیا۔

سیکیورٹی گارڈ پہلے تو اس اجنبی شخص کو دیکھتا رہا اور پھر جس تیزی سے آنند اپنی کار کی طرف گیا اور اس نے کار باہر نکالی، اس سیکیورٹی گارڈ کے لیے یہ سب غیر معمولی تھا۔

☆☆☆

راہول اور آنند اس وقت اپنی فلم کے سیٹ پر موجود تھے۔ راہول نے اپنا میک اپ اتروا لیا تھا اور میک اپ مین کے ساتھ ساتھ سیٹ پر موجود دوسرے لوگ بھی حیران تھے کہ یہ اچانک میک اپ کرنے اور سیٹ سے جانے کی کیا وجہ تھی؟

راہول اور آنند ایک طرف بیٹھے ہوئے تھے۔ آنند نے ساری بات راہول کو بتا دی تھی۔ پوری بات سننے کے بعد راہول نے کہا۔ ''گڑبڑ ہو گئی ہے، مجھے ڈر لگ رہا ہے۔''

''ڈرنے کی کیا بات ہے۔ وہ کام ہم نے نہیں کیا ہے۔ میرے جانے سے پہلے اس کا قتل ہو چکا تھا اور کوئی اندر تھا جس نے میرے آتے ہی فلیٹ کا دروازہ باہر سے بند کر دیا تھا۔''

''یہی تو فکر کی بات ہے آنند۔ اب معلوم نہیں ہے کہ پرکاش کو کس نے قتل کیا ہے لیکن وہاں تمہاری موجودگی اور فلیٹ میں کہیں تمہاری انگلیوں کے نشان موجود ہوں گے، جس سے تفتیش کا رخ اس طرف بھی ہو سکتا ہے۔'' راہول نے اپنا اندیشہ ظاہر کیا۔

''آپ نے پرکاش کی فلم سائن کی تھی۔ قتل سے ایک رات پہلے میں اس کے فلیٹ میں اسکرپٹ لینے گیا تھا، اس لیے میری انگلیوں کے نشان لگ جانا کوئی خطرناک بات نہیں ہے۔'' آنند نے دلیل بیان کی۔

''مجھے تو ڈر لگ رہا ہے، اور میرا دھیان اس وقت اپنی شوٹنگ پر نہیں ہے۔'' راہول فلم اسکرین کا کتنا ہی بڑا ہیرو تھا لیکن وہ ایک عام انسان کی طرح کمزور دل تھا۔ اس کا چہرہ اس بات کا غماز تھا کہ وہ اندر سے بہت خوف زدہ ہے۔

''آپ اطمینان سے کام کریں۔ ایک بات مجھے پریشان کر رہی ہے۔ میں نے جو خنجر باتھ روم میں چھپایا تھا، پرکاش کا قتل اسی خنجر سے ہوا ہے۔ قاتل کو کیسے پتا چلا کہ میں نے اس جگہ خنجر چھپایا تھا؟''

اس کی بات سن کر راہول کے جسم میں خوف سرایت کر گیا اور وہ گھبرائی ہوئی آواز میں بولا۔ ''تم نے خنجر پہلے کیوں چھپایا تھا؟''

''اسکرپٹ میں ہیرو ایسا اپنی آسانی کے لیے کرتا

ہے۔'' آنند نے بتایا۔

''ہم ایک بڑی غلطی کر بیٹھے ہیں۔ مجھے بہت ڈر لگ رہا ہے۔'' راہول کی پریشانی دو چند ہو گئی تھی۔

☆☆☆

مسز پرکاش نے اپنے فلیٹ پر پہنچ کر قفل میں چابی گھمائی تو قفل کھلا ہوا تھا۔ پرکاش جب فلیٹ سے جاتا تھا تو دروازہ مقفل کر جاتا تھا۔ مسز پرکاش کو کچھ حیرت ہوئی۔ پرکاش نے اپنی بیوی کو صبح ناشتے کی میز پر ہی بتا دیا تھا کہ وہ اپنے کام کے لیے کچھ دیر کے بعد نکل جائے گا۔ دروازہ کھلا ہونے کا مطلب یہ تھا کہ پرکاش فلیٹ میں ہی ہے اور وہ کہیں نہیں گیا۔

مسز پرکاش اندر چلی گئی تو اسے عجیب سی خاموشی محسوس ہوئی۔ پھر وہ چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتی پرکاش کے کمرے کی طرف بڑھی۔ جونہی اس نے دروازہ کھولا، اس کی نگاہ پرکاش کی خون میں لت پت لاش پر پڑی اور اس کی چیخ ہی نکل گئی۔

☆☆☆

آدھے گھنٹے میں پولیس اس جگہ پہنچ چکی تھی۔ مسز پرکاش ایک طرف بیٹھی سسکیاں لے رہی تھی۔ اردگرد کے فلیٹ والے بھی اس جگہ موجود تھے۔ میڈیا کو بھی خبر ہو گئی تھی اور ملک کے معروف شومین کے قتل پر میڈیا ایک دوسرے سے سبقت لینے کی کوشش میں اپنی اپنی جگہ خبر دے رہا تھا۔

فلیٹ کے اندر پولیس ایک ایک چیز کا جائزہ لے رہی تھی۔ پولیس انسپکٹر نے کمرے سے ضروری چیزیں اپنے قبضے میں لے لی تھیں، ان میں راہول کے ساتھ کیا ہوا ہوا تھا ایگریمنٹ بھی تھا۔ اس کے بعد پوسٹ مارٹم کے لیے پرکاش کی لاش لے گئے اور پولیس، مسز پرکاش کا بیان ریکارڈ کرنے لگی۔ میڈیا کے کیمرے اس کے اردگرد جمع تھے۔

''میں اپنے وقت پر صبح کالج چلی گئی تھی۔ ہم دونوں نے ایک ساتھ ناشتا کیا تھا۔ انہیں بھی جلدی جانا تھا۔ میں کالج سے واپس آئی تو مجھے ان کی لاش ملی...'' مسز پرکاش بتانے کے بعد رونے لگی۔

پولیس نے ضروری باتیں پوچھنے کے بعد اردگرد کے لوگوں سے کچھ سوالات کیے۔ وہ نوجوان بھی گھبرایا ہوا اس جگہ موجود ان کی باتیں سن رہا تھا۔ اس نے پولیس کے ساتھ کسی طرح کی بات کرنے سے احتراز کیا تھا۔

پولیس نے اس عمارت کی نگرانی کے لیے مامور سیکیورٹی گارڈ کو طلب کر لیا۔ سیکیورٹی گارڈز کا بیان پولیس

کے لیے خاص نقطہ بن گیا جب اس نے اس اجنبی شخص کے بارے میں بتایا جسے اس نے پہلی بار دیکھا تھا اور وہ اندر جاتے ہوئے اچانک فون کال سننے کے لیے رکا اور پھر اسی جگہ سے واپس لوٹ گیا تھا۔

سیکیورٹی گارڈ کے پاس خفیہ کیمرے بھی لگے ہوئے تھے۔ جو آنے جانے والے اپنی نظر میں رکھتے تھے۔ پولیس نے تمام دن کی ویڈیو ریکارڈنگ دیکھی تو ان کی توجہ اس اجنبی پر مرکوز ہوگئی جو سی سی کیمرے کی ویڈیو میں صاف دیکھا جاسکتا تھا۔ اس کا حلیہ عجیب تھا۔

اس کی تصویر کو پولیس نے کئی بار کلوز کرکے دیکھا۔ لیکن کوئی بھی نہیں پہچان سکا کہ یہ معروف اداکار راہول کی میک اپ میں فوٹیج ہیں۔ یہ ویڈیو ٹی وی چینلز نے بھی حاصل کرلی اور مختلف ٹی وی چینلز پر مسلسل چلنے لگی۔ یہ پُراسرار شخص کون ہے؟

☆☆☆

راہول اپنی شوٹنگ ادھوری چھوڑ کر طبیعت کی ناسازی کا بہانہ کرکے واپس گھر آ گیا تھا۔ اس وقت وہ ٹیلی ویژن کے سامنے پریشان تھا اور اپنی اس ویڈیو کو وہ کئی بار مختلف چینلز پر دیکھ کر شدید پریشانی کا شکار ہو گیا تھا۔ اس جگہ جاتے ہوئے اس نے یہ سوچا بھی نہیں تھا کہ اس کی خفیہ کیمرے سے ویڈیو بن جائے گی اور یہی ویڈیو سب کی توجہ کا مرکز ہو جائے گی۔

راہول کی گھبراہٹ اور خوف سے سانس رک رہی تھی۔ وہ اپنی جگہ سے اٹھا تو اس کی بیوی نے چونک کر پوچھا۔ ”کیا ہوا آپ ایک دم کیوں اُٹھ گئے؟“

”میں اپنے کمرے میں جا رہا ہوں۔ میری طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔“

”ڈاکٹر کو فون کردوں؟“

”اس کی ضرورت نہیں ہے۔ مسلسل کام کرنے سے مجھے تھکاوٹ اور ذہنی پریشانی ہے۔ آرام کرنے سے ٹھیک ہو جاؤں گا۔ آنند تم میرے ساتھ ایک منٹ کے لیے آؤ۔“ راہول کہہ کر اپنے کمرے کی طرف چلا گیا اور آنند بھی اس کے پیچھے اٹھ کھڑا ہوا۔

کمرے میں جاتے ہی راہول پریشانی اور خوف سے بولا۔ ”یہ کیا ہو گیا ہے۔ مجھے تو لگ رہا ہے کہ میں پھنس جاؤں گا۔ سارا میڈیا اس فوٹیج کو لے کر چیخ رہا ہے، پولیس اس پراسرار شخص کے بارے میں پوچھ رہی ہے۔“

”مجھے اندازہ نہیں تھا کہ ایسا کچھ ہو جائے گا۔“ آنند بھی پریشان تھا۔ ”لیکن آپ کا میک اپ ایسا ہوا ہے کہ کوئی آپ کو پہچان نہیں پا رہا اور نہ ہی پہچان سکے گا۔ چند دن کے بعد یہ خبر دب جائے گی اور سب ٹھیک ہو جائے گا۔“

”چند دن کے بعد؟“ راہول نے اس کی طرف دیکھا۔ ”تم اندازہ نہیں کر سکتے کہ میں اس وقت کس اذیت میں ہوں۔ جب تک یہ خبر دبے گی، معاملہ ٹھنڈا ہوگا تب تک میرے لیے کام کرنا مشکل ہو جائے گا۔ تم جانتے ہو کہ کتنا کام پڑا ہے اور مجھے ہر حال میں مقررہ تاریخ کو فلم ریلیز کرنی ہے۔ ایک ایک منٹ قیمتی ہے اور کام رک گیا ہے۔“

”آپ بے فکر ہو کر کام کریں، سب ٹھیک ہو جائے گا۔“ آنند کے پاس سوائے تسلی کے اور کچھ نہیں تھا۔

”میں دھیان سے کام نہیں کرسکتا اور نہ ہی میں بے فکر ہو سکتا ہوں۔ کتنا سے... آنند کہیں سے معمولی سی بھنک بھی پڑ گئی تو میں تباہ ہو جاؤں گا۔ ہم نے کچھ نہیں کیا لیکن میرا اس جگہ میک اپ میں جانا، فون سننا اور واپس پلٹ جانا پولیس کو اپنی تفتیش کے لیے بہت مواد دے رہا ہے۔“ راہول کے ہاتھ خوف سے کانپ رہے تھے اور دل زور زور سے دھڑک رہا تھا۔ آنند کے پاس بھی اس بات کا کوئی جواب نہیں تھا۔

☆☆☆

جس میک اپ آرٹسٹ نے راہول کا میک اپ کیا تھا اس کا نام جولی تھا۔ جولی بھی مسلسل ٹیلی ویژن کے آگے بیٹھا وہ فوٹیج دیکھ رہا تھا۔ وہ اپنے ہی ہاتھوں سے میک اپ کیے راہول کو پہچانے میں تذبذب کا شکار تھا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ یہ تو راہول ہے، اس کا میک اپ اس نے خود کیا تھا اور میک اپ کراتے ہی راہول سیٹ سے چلا گیا تھا۔ جب میک اپ ہو رہا تھا تو راہول بار بار بے چینی سے اسے کہے جا رہا تھا۔ ”جلدی کرو... جلدی...“

کچھ سوالات جولی کے دماغ میں بھی ابھرنے لگے تھے۔ ان میں ایک سوال یہ بھی تھا کہ کہیں یہ کام کسی وجہ سے بھیس بدل کر راہول نے تو نہیں کیا، یا کسی سے کرایا ہو؟

جولی نے سوچتے ہوئے اپنی جیب سے موبائل فون نکال کر اپنے اسسٹنٹ کو فون کیا۔ دوسری طرف سے رابطہ ہوتے ہی اس نے دھیمی آواز میں پوچھا۔ ”تم ٹی وی دیکھ رہے ہو؟“

”ہاں میں دیکھ رہا ہوں اور یہ تو اپنے راہول جی ہیں، ان کا یہ میک اپ تو ہم نے کیا تھا۔“ دوسری طرف سے اس نے اونچی آواز میں کہا۔

''تم اس وقت کہاں ہو؟''

''میں چائے کے کھوکھے پر بیٹھا چائے پی رہا ہوں۔ ابھی میں نے سب کو بتایا ہے کہ کوئی اور نہیں بلکہ سپر ہیرو راہول صاحب ہیں۔'' وہ کہہ کر ہنسا۔

''گدھے! تم نے یہ بات کیوں کہہ دی۔'' جونی نے ڈانٹا۔

''اس میں کیا بات ہے سر۔ میں نے غلط تو نہیں کہا۔'' وہ اس کی ڈانٹ سن کر حیران ہو گیا۔

''تم فوراً اس جگہ سے اٹھو اور میرے پاس آجاؤ۔ ہم مل کر راہول کے پاس جا کر پتا کریں گے کہ یہ معاملہ کیا ہے۔''

''یہ کوئی معاملہ نہیں ہے۔ راہول اس جگہ گئے اور ان کی ویڈیو بن گئی اور وہ سب اس ویڈیو کو لے کر پاگل ہوئے جا رہے ہیں۔''

''تم اپنی بکواس بند کر کے فوراً میرے پاس پہنچو۔'' جونی نے درشت لہجے میں کہہ کر فون کاٹ دیا۔

جونی کے اسسٹنٹ کو سمجھ نہیں آرہی تھی کہ جونی اس پر برہم کیوں ہے۔ وہ اپنی جگہ سے اٹھا۔ اس نے چائے کے پیسے دیے اور جانے لگا تو اس کے ساتھ ہی ایک آدمی اور اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ جس وقت خوش ہوتے ہوئے جونی کا اسسٹنٹ سب کو بتا رہا تھا کہ یہ سپر ہیرو راہول ہے اور اس کا میک اپ انہوں نے کیا تھا تو وہ آدمی اس کے برابر میں بیٹھا سب سن رہا تھا۔ اس نے اٹھتے ہی جونی کے اسسٹنٹ کا ہاتھ پکڑ کر آہستہ سے کہا۔

''چپ چاپ میرے ساتھ چلو۔'' یہ کہتے ہی اس آدمی نے اپنا کارڈ نکال کر اس کی آنکھوں کے سامنے کر دیا۔ اس کا کارڈ دیکھتے ہی وہ چونک پڑا کیونکہ اس آدمی کا تعلق پولیس سے تھا۔

☆☆☆

راہول کو جب آنند نے بتایا کہ پولیس آئی ہے تو راہول کے ماتھے پر پسینا آ گیا۔ اس نے خوفزدہ نظروں سے آنند کی طرف دیکھا جیسے وہ یہ پوچھ رہا ہو کہ اب کیا کرنا ہے؟

''پ... پولیس کیوں آئی ہے؟ کیا مجھے کسی نے پہچان لیا ہے؟'' اس کی آواز گھبرائی ہوئی تھی۔

''پولیس کے آنے سے پہلے مجھے جونی کا فون آیا تھا۔ پہلے تو اس نے یہ معاملہ جاننے کی کوشش کی اور پھر بتایا کہ اس کے اسسٹنٹ نے چائے کے کھوکھے پر جب یہ نیوز چل رہی تھی تو سب کو بتا دیا کہ یہ ہمارا سپر اسٹار ہیرو راہول ہے۔''

اس کی بات سن کر راہول کے جسم سے جیسے جان ہی نکل گئی تھی۔ ''اب بتاؤ میں اس کا کیا جواب دوں؟ میں برباد ہو جاؤں گا۔ پولیس کا یہ شک مجھے جانے کس الجھن میں مبتلا کر دے۔''

آنند نے کچھ دیر سوچا پھر وہ بولا۔ ''میں بتاتا ہوں کہ آپ پولیس کو کیا بیان دیں گے۔''

بیس منٹ تک پولیس ڈرائنگ روم میں راہول کا انتظار کرتی رہی۔ راہول کے گھر کے باہر نیوز چینلز کے کیمروں کا انبار لگا ہوا تھا۔ لوگوں کا تانتا بندھا ہوا تھا اور نیوز چینلز کے لیے یہ بڑی گرم خبر تھی۔ ہر چینل نے دیکھنے والوں کو اپنی طرف متوجہ کیا ہوا تھا۔ سب یہ جاننے کے تجسس میں مبتلا تھے کہ وہ پُراسرار شخص کوئی اور نہیں بلکہ راہول تھا تو پھر راہول اس جگہ اس میک اپ میں کیا کر رہا تھا۔ فلم انڈسٹری کے لوگ بھی اپنا اپنا کام چھوڑ کر ٹیلی ویژن کے سامنے نظریں جما کر بیٹھ گئے تھے۔ سب کے لیے یہ بڑی حیران کن بات تھی۔

راہول جب پولیس کے سامنے آیا تو وہ پُراعتماد تھا۔ اس نے سب کے ساتھ گرم جوشی سے مصافحہ کیا اور اس کے بیٹھتے ہی انسپکٹر نے پہلا سوال کیا۔

''ہمیں اس عمارت کے سیکیورٹی کیمرے

سرداری

ایک سردار جی ٹرین پر سفر کر رہے تھے۔ وہ گارڈ کے پاس آئے (وہ بھی سکھ تھا) اور کہا۔ ''سردار جی میں سونے لگا ہوں جب امرتسر آئے تو مجھ کو جگا کر اتار دینا اور یہ بھی یاد رکھنا کہ جب میں نیند سے جاگوں تو مجھ کو کچھ بھی یاد نہیں رہتا۔ ہو سکتا ہے میں آپ کو گالیاں نکالوں کہ میں نے نہیں اترنا آپ زبردستی مجھ کو اتار دینا۔''

سردار نے کہا۔ ''آپ فکر نہ کریں۔ میں اتار دوں گا۔''

گارڈ کی بات سن کر سردار جی جا کر سو گئے۔ جب آنکھ کھلی تو دہلی دور پہنچے ہوئے تھے۔ سردار جی نے غصے میں گارڈ کو گالیاں نکالنی شروع کر دیں کہ مجھے امرتسر اسٹیشن پر کیوں نہیں اتارا۔

لوگوں نے گارڈ سے کہا۔ ''سردار جی وہ آپ کو گالیاں دے رہا ہے۔''

سردار جی ایک ادا سے بے نیازی سے بولے۔ ''اس نے کیا گالیاں نکالنی ہیں۔ اصل گالیاں تو اس نے نکالی تھیں جس کو میں نے امرتسر زبردستی اتارا تھا۔''

سے ملی ہے، کیا یہ آپ کی ہی ہے؟''

''ابھی چند منٹ پہلے میں نے اس کی ریکارڈنگ دیکھی ہے۔ جی یہ میں ہی ہوں۔'' راہول نے جواب دیا۔

''قتل سے قبل آپ وہاں کیا کر رہے تھے اور کس کا فون تھا جسے سنتے ہی آپ واپس چلے گئے تھے؟'' دوسرا سوال ہوا۔

''مسٹر پرکاش میرے محسن تھے۔ یہ بات ساری دنیا جانتی ہے۔ مجھے فلم میں پہلا بریک ان کی سفارش کی وجہ سے ملا تھا۔ وہ ان دنوں مالی بحران کا شکار تھے کیونکہ ان کی پے بعد دیگرے فلمیں بری طرح پٹ گئی تھیں۔ ان مشکل حالات میں، میں نے ان کا ساتھ دینے کا فیصلہ کیا تھا۔ میں ان کو دوبارہ فلم انڈسٹری میں کامیاب دیکھنا چاہتا تھا۔ میں نے ان کی ایک فلم سائن کی، سرمایہ کاری بھی میری تھی اور ہم اس فلم کو تیس دن میں مکمل کرنا چاہتے تھے۔ قتل سے ایک رات پہلے میرا اسکرپٹ رائٹر آنند ان کے فلیٹ میں اسکرپٹ لینے گیا تھا۔ وہ اس میں کچھ تبدیلی کر رہے تھے اس لیے انہوں نے کہا کہ وہ اسکرپٹ کل دے دیں گے۔ آنند کے ذریعے انہوں نے مجھے پیغام بھجوایا تھا کہ میں کل اس میک اپ میں آؤں جو اس فلم میں میرا کیا جائے گا۔ وہ مجھے اس روپ میں دیکھنا چاہتے تھے۔ میں اس میک اپ میں وہاں گیا تھا۔'' راہول نے پراعتماد لہجے میں بات کی۔

''پھر آپ اندر جانے کے بجائے فون سنتے ہی واپس کیوں آگئے؟''

''اچانک مجھے آنند نے فون کیا کہ مسٹر پرکاش کا دروازہ باوجود بیل دینے کے نہیں کھل رہا ہے اور بند ہے۔ کیونکہ مجھے اپنی شوٹنگ پر بھی جانا تھا اس لیے اس کا فون آتے ہی میں اسی جگہ سے پلٹ آیا کہ شاید وہ کہیں چلے گئے تھے۔ یا یہ بھی ممکن ہے کہ وہ ابھی سو رہے ہوں۔ میں نے وقت ضائع کرنے کے بجائے اپنے سیٹ پر جانے کو ترجیح دی کیونکہ میری اپنی ذاتی فلم بھی مکمل ہو رہی ہے۔''

''آنند وہاں کیا کر رہا تھا؟''

''یہ میرا اسکرپٹ رائٹر ہے۔ یہ اپنی کار میں گیا تھا اور میں یہ جاننے کے لیے کہ اس حلیے میں مجھے کون پہچان پاتا ہے میں ٹیکسی میں گیا تھا۔''

''جب یہ فوٹیج ٹیلی ویژن اسکرین پر چل رہی تھی اور بار بار یہ کہا جا رہا تھا کہ یہ پُراسرار شخص کون ہے تو آپ نے سنا یا پھر ہم سے رابطہ کیوں نہیں کیا؟''

''میرا ایک مہنگا سیٹ لگا ہوا ہے۔ اس سیٹ پر ہم مقررہ وقت پر شوٹنگ کرنے میں ناکام رہے اور اب مجھے روپے کے حساب سے اچھا خاصا خرچہ پڑ رہا ہے۔ ہم چاہتے ہیں کہ ان اخراجات سے بچنے کے لیے جلد سے جلد اپنی شوٹنگ مکمل کر لیں۔ ہم دن رات اس شوٹنگ میں لگے ہوئے ہیں۔ مجھے رات اور دن کا بھی پتا نہیں چل رہا ہے، کچھ دیر کے لیے ہم اسی سیٹ پر سو جاتے ہیں اور پھر کام میں لگ جاتے ہیں۔ مجھے ٹیلی ویژن دیکھنا تو دور اپنی بیوی سے بات کرنے کی فرصت نہیں ہے۔ کسی کو یہ علم نہیں تھا کہ یہ میں ہوں اور میں نے ٹیلی ویژن دیکھا ہی نہیں کہ کسی سے رابطہ کر کے بتا سکوں کہ یہ میں ہوں اور اس جگہ کیوں گیا تھا۔''

راہول بے شک اندر سے ڈرا ہوا تھا لیکن وہ ایک اداکار تھا اور اس وقت بھی وہ بڑی اچھی اداکاری کر رہا تھا۔

انسپکٹر نے کچھ اور سوالات کیے اور پھر راہول کے دیے ہوئے جوابات پر غور کرنے لگا۔ اب راہول کی ایسی بھی حیثیت نہیں تھی کہ اس پر شک کیا جاتا۔ انسپکٹر نے جب پرکاش کے کمرے کی تلاشی لی تھی تو ایک فائل میں اسے وہ ایگریمنٹ بھی مل گیا تھا جس پر راہول کے دستخط تھے۔ اس معاہدے سے یہ بات ثابت ہوتی تھی کہ راہول واقعی اس کے ساتھ فلم کر رہا ہے۔

بات چیت ختم ہونے پر راہول اور انسپکٹر ایک ساتھ باہر آئے اور دونوں نے ایک ساتھ پریس کانفرنس کی جس میں وہ باتیں سامنے لائی گئیں جو ابھی راہول نے بتائی تھیں۔ اس کا یہ اثر ہوا کہ راہول کی نیک نامی میں اور بھی اضافہ ہو گیا۔ سب لوگ اس کی تعریف کرنے لگے کہ راہول اس شخص کو پھر سے کامیاب کرنے کے لیے اس کا ساتھ دے رہا تھا اور اپنی ذاتی فلم کو چھوڑ کر اس کی فلم پر اپنا سرمایہ اور وقت لگانے والا تھا۔ سبھی راہول کی اس کوشش کو سراہنے لگے تھے۔ راہول کے لیے یہ سب غیر متوقع تھا۔ اس کی شہرت کو مزید چاند لگ گئے تھے اور ہر جگہ اس کی تعریف ہو رہی تھی۔ راہول اس پر بہت خوش تھا۔

☆☆☆

چند دن گزر گئے۔

پولیس میں یہ معاملہ ٹھنڈا پڑ گیا تھا۔ ایسا لگتا تھا جیسے پرکاش کی فائل بھی دوسری بند فائلوں کے ساتھ اپنی جگہ بنا چکی ہے۔ ایک دن اچانک مسز پرکاش کا فون راہول کو آیا۔

''مسٹر راہول کیا آپ مجھے دس منٹ دے سکتے ہیں؟ مجھے بہت ضروری بات کرنی ہے آپ سے۔''

''ہاں کیوں نہیں۔ لیکن اس وقت میں شوٹنگ میں

مصروف ہوں۔"

"میں جانتی ہوں کہ ابھی آپ سیٹ سے نکل کر میک اپ روم میں گئے ہیں اور وہاں آپ آنند کے ساتھ ہیں۔ جبکہ میں میک اپ روم کے باہر کھڑی ہوں۔" مسز پرکاش بولی۔

راہول نے سن کر دروازہ کھولنے کا اشارہ کیا تو سامنے مسز پرکاش کھڑی تھی۔ وہ مسکراتے ہوئے اندر آ گئی۔

"مجھے صرف دس منٹ درکار ہیں۔ اچھا ہے کہ آپ دونوں ہی ہو۔"

"آپ بیٹھ جائیں۔"

"بیٹھنے کا وقت نہیں ہے۔ میں بس یہ بتانے آئی ہوں کہ اس دن جب آنند ہمارے فلیٹ میں آیا تھا تو اس کے پاس ایک خنجر بھی تھا۔ وہی خنجر جس سے پرکاش کو مارا گیا تھا۔" اس نے وقت ضائع کیے بغیر اپنی بات کی۔

اس کی بات سن کر دونوں کے جسم میں خوف سرایت کر گیا۔ اب جبکہ معاملہ دب چکا تھا تو مسز پرکاش جانے بتا دی میں کیا لے آئی تھی۔

"پرکاش نے ہر جگہ خفیہ کیمرے لگائے ہوئے تھے۔ میں نے دیکھا کہ آنند باتھ روم میں خنجر رکھ رہا ہے، بوتلوں کے پیچھے۔" اس نے کہا۔

"ایک منٹ مسز پرکاش۔" آنند جلدی سے بولا۔ "ہر جگہ اگر کیمرے تھے تو پھر پرکاش کو کس نے قتل کیا۔ اس کی بھی ویڈیو موجود ہو گی؟"

"فی الحال تو آپ اس ویڈیو کی بات کریں جو آپ کے بارے میں ہے۔ جب آپ باتھ روم کی الماری میں بوتلوں کے پیچھے خنجر چھپا رہے تھے۔ اس ویڈیو کو اگر میں پولیس والوں کو دے دوں تو بڑی گڑبڑ ہو جائے گی۔ آنند فلیٹ میں آیا، پرکاش کے پاس بیٹھا اور پھر باتھ روم میں چلا گیا۔ یہ سب کچھ موجود ہے۔ اگر آپ کے ساتھ سودا نہیں ہوتا تو پھر میں یہ ویڈیو پولیس کے حوالے یہ کہہ کر کر دوں گی کہ بیڈروم کا کیمرا خراب تھا اس لیے وہ فلم نہیں بن سکی۔"

مسز پرکاش ان کی سوچ سے بھی زیادہ ہوشیار نکلی۔

"آپ کہنا کیا چاہتی ہیں؟" راہول نے پوچھا۔

"بیوہ عورت ہوں۔ یہ شہر چھوڑ کر دہلی جانا چاہتی ہوں۔ فلیٹ پہلے ہی گروی تھا۔ زندگی گزارنے کے لیے پیسا بہت ضروری ہے۔ آپ کو اگر اپنی ویڈیو چاہیے تو مجھے ایک کروڑ روپے دے دیں۔ ورنہ یہ ویڈیو بڑی بنیادی چیز ہے۔ پولیس کو مل گئی تو پھر آپ کا سب کچھ تباہ ہو جائے گا۔"

"ایک کروڑ بہت زیادہ ہے۔" راہول کسی معاملے میں الجھنا نہیں چاہتا تھا۔

"آپ کے لیے تو یہ کچھ بھی نہیں ہے۔ معمولی رقم ہے۔" اس نے کہا۔ "میں چلتی ہوں۔ سوچ کر مجھے ایک گھنٹے میں بتا دیں پھر مجھے بھی کچھ سوچنا ہے۔" یہ کہہ کر وہ دروازے کی طرف بڑھی۔

"دس لاکھ دوں گا۔"

"پچاس لاکھ لوں گی۔ ایک پیسا بھی کم نہیں۔" اس نے فیصلہ کن انداز میں کہا۔

"منظور ہے۔" راہول نے جان چھڑانے کے لیے فوراً ہامی بھر لی۔ وہ اپنے آپ کو تباہ نہیں کرنا چاہتا تھا۔

☆☆☆

پچاس لاکھ روپے کی رقم مسز پرکاش کے اکاؤنٹ میں منتقل ہو چکی تھی اور ایک ویڈیو سی ڈی آنند کو مل چکی تھی۔ جب راہول اور آنند نے وہ سی ڈی لگائی تو وہ بالکل صاف تھی۔ اس میں کوئی ویڈیو نہیں تھی۔ راہول نے فوراً مسز پرکاش کو فون کیا۔ مسز پرکاش نے اپنے شوہر کا موبائل فون نمبر ہی اسے دیا تھا۔ رابطہ ہوتے ہی مسز پرکاش کی آواز آئی۔

"مجھے آپ کی ہی کال کا انتظار تھا۔ آپ کی کال سننے کے لیے میں بے تاب تھی۔ دراصل میرے پاس کوئی ویڈیو نہیں ہے کیونکہ ہمارے فلیٹ میں کوئی خفیہ کیمرا نہیں لگا ہوا ہے۔ دراصل مجھے اپنی رکھی ہوئی چیزوں کی ترتیب یاد رہتی ہے۔ جب میں باتھ روم میں گئی تو مجھے بوتلوں کی ترتیب اپنی جگہ دکھائی نہیں دی۔ میں نے دیکھا تو مجھے خنجر دکھائی دیا۔ کیونکہ آنند باتھ روم میں گیا تھا اس لیے میں سمجھ گئی کہ یہ آنند نے ہی رکھا ہے، پھر پیسوں کے لیے مجھے یہ چھوٹا سا کھیل کھیلنا پڑا۔"

"آپ بہت چالاک ہیں مسز پرکاش۔"

"مجھے چالاک حالات نے بنایا ہے۔ جب پرکاش خوش حال تھا تو خوش حالی کے نشے میں آپے سے باہر ہو جاتا تھا۔ برباد ہو گیا تو اس غم میں بھی اسے ایسے ہی دورے پڑنے لگے۔ میں تو اس زندگی سے بہت تنگ تھی۔ اور پھر آنند کا رکھا ہوا خنجر میرے کام آ گیا۔" مسز پرکاش نے کہہ کر فون بند کر دیا اور راہول دم بخود فون کو کان سے لگائے کھڑا سوچتا ہی رہ گیا۔

آوارہ گرد

ڈاکٹر عبدالرب بھٹی

قسط: 5

مندر، کلیسا، سینی گاگ، دھرم شالے اور اناتھ آشرم... سب ہی اپنے اپنے عقیدے کے مطابق بہت نیک نیتی سے بنائے جاتے ہیں لیکن جب بانیوں کے بعد نکیل بگڑے ذہن والوں کے ہاتھ آتی ہے تو سب کچھ بدل جاتا ہے... محترم پوپ پال نے کلیسا کے نام نہاد راہبوں کو جیسے گھناؤنے الزامات میں نکالا ہے ان کا ذکر بھی شرمناک ہے مگر یہ ہو رہا ہے... استحصال کی صورت کوئی بھی ہو، قابل نفرت ہے... اسے بھی وقت اور حالات کے دھارے نے ایک فلاحی ادارے کی پناہ میں پہنچا دیا تھا... سکھ رہا مگر کچھ دن، پھر وہ پڑنے لگا جو نہیں ہونا چاہیے تھا... وہ بھی حق کا پتلا نہیں تھا جو ان کا شکار ہو جاتا... وہ اپنی چالیں چلتے رہے، یہ اپنی گھات لگا کر ان کو نیچا دکھاتا رہا... یہ کھیل اسی وقت تک رہا جب اس کے بازو توانا نہ ہو گئے اور پھر اس نے سب کچھ ہی الٹ کر رکھ دیا... اپنی راہ میں آنے والوں کو خاک چٹا کر اس نے دکھا دیا کہ طاقت کے گھمنڈ میں راج کا خواب دیکھنے والوں سے برتر... بہت برتر قوت رہی ہے جو بے آسرا نظر آنے والوں کو غرور کے دماغ کا مجبور بنا دیتی ہے... پل پل رنگ بدلتی، نئے رنگ کی سنسنی خیز اور رنگا رنگ داستان جس میں سطر سطر دلچسپی ہے...

میرے داہنے کاندھے کی ایک ہی زوردار ضرب نے دروازے کی دوسری سمت لگی کنڈی کو اکھاڑ پھینکا تھا، دوسری طرف دو کمروں کے سامنے کھلے پختہ فرش پر بید کی کرسیاں سجائے چار پانچ افراد بری طرح چونک گئے۔ چند ثانیوں تک تو انہیں اندازہ ہی نہ ہو سکا کہ یہ اچانک کیا افتاد آن پڑی تھی۔ ان کے درمیان ایک بڑی سی تپائی پر "لوازمات آوارگی" کا جو سامان پڑا تھا، وہ ان پاجیوں کے ہوش میں آتے ہی یکدم کھڑے ہونے پر ان کی ٹھوکر سے ادھر ادھر بکھر گیا۔ ان میں چار میرے لیے اجنبی تھے۔

پانچواں میرا شناسا... بلکہ زیر پنہ شناسا... میری نظروں میں سب سے زیادہ قابلِ نفرین... اشرف تھا جس بات نے اسے اس سے مجھے مثلِ آتش نشاں کی طرح پھٹ پڑنے پر مجبور کیا تھا وہ عابدہ تھی... جسے وہ ذرا دیر پہلے اپنے ساتھ بٹھائے زبردستی شراب پلانے کی کوشش کر رہا تھا۔ وہ سسکیوں کے ساتھ روئے جارہی تھی، شاید اسے اس ملعون نے تھوڑی بہت زبردستی پلا بھی رکھی تھی۔ جس کے باعث عابدہ نڈھال حواسوں کے دوران خود کو اس کی شیطانی گرفت سے چھڑانے کی... کوشش کر رہی تھی، باقی ساتھی قہقہے لگا رہے تھے۔ اس منظر نے میرے اندر آگ سی لگا دی تھی۔ میں وحشیانہ انداز میں یکدم ہی حرکت میں آگیا۔

مجھے دیکھ کر سب ہی حیران رہ گئے تھے۔ مگر دوسرے ہی لمحے وہ گڑبڑا کر کھڑے ہو گئے۔ اشرف نے تو مجھے دیکھتے ہی عابدہ کو خود سے دور دھکیل دیا تھا جو قریب دھری ایک کری چارپائی پر آدھی نیچے آدھی اوپر پڑی تھی۔ جب تک یہ لوگ سنبھلتے، میں اپنی پینٹ کی بیلٹ میں اڑسے ہوئے میگا رد کو ہاتھ میں لے چکا تھا اور اشرف کی پیشانی کا نشانہ لے کر ٹریگر بھی دبا دیا تھا۔

رات کے دم بخود سناٹے میں میگا رد... آگ اگلنے والے ذریگون کی طرح گرجا۔ اشرف کی پیشانی پر روشن دان بنا اور سر کے پچھلے حصے سے بھیجے کے خوں رنگ لوتھڑے اچھل پڑے۔ وہ تیورا کر گرا۔

''خبردار! کوئی حرکت نہ کرے۔'' مجھے کمیل دادا کی دھاڑتی آواز سنائی دی۔ اس نے بھی اپنا پستول ان چاروں پر تان لیا تھا۔

''بس... شہزی! اتنا کافی ہے۔ عابدہ کو سنبھالو اور نکلو۔'' قدرے قریب آکر کمیل دادا نے مجھ سے کہا۔

''جنگی خان کون ہے ان میں سے؟'' میں نے کمیل دادا سے پوچھا۔

''شہزی...!'' کمیل دادا نے مجھ سے کہنا چاہا مگر میں بدستور زہر بجھے لہجے میں اس کی بات کاٹ کر بولا۔

''ان چاروں میں جنگی خان کون ہے... دادا...؟''

اچانک ایک موٹے شخص نے ایک کری کو لات ماری۔ میں اس کی حرکت کا اندازہ نہ لگا پایا۔ کری اچھلی اور مجھ سے ٹکرائی۔ دوسری حرکت بسرعت اس نے یہ کی کہ اپنے قریب کھڑے ساتھی کو اپنے کاندھے کی ٹکر رسید کی۔ وہ کمیل دادا سے ٹکرایا۔ ٹھگنے آدمی کی اس دہری حرکت کا درمیانی وقفہ صرف دو سیکنڈ پر محیط ہوگا اور تیسرے سیکنڈ میں

اس نے کھلے دروازے کی طرف جست بھری۔ جب تک میں اور کمیل دادا سنبھل پاتے، وہ کسی گیند کی طرح سیڑھیوں سے لڑھکتا ہوا نیچے چلا گیا۔ اب اس میں شک و شبے کی گنجائش نہ ہونے کے برابر تھی کہ عابدہ کو اغوا کرنے کا میرے نزدیک ناقابلِ معافی جرم کا ارتکاب کرنے والا یہی شخص جنگی خان تھا، جس کی بعد میں کمیل دادا نے بھی تصدیق کر دی تھی۔ میں ابھی اسی کشمکش و پیچ میں تھا کہ عابدہ کو بے سدھ چھوڑ کر اس کے تعاقب میں لپک جاؤں یا نہیں کہ کمیل دادا نے میری مشکل آسان کرتے ہوئے کہا۔

''یہی جنگی خان ہے۔ تم عابدہ کو سنبھالو میں اس کے پیچھے جاتا ہوں۔'' یہ کہہ کر وہ اس کے تعاقب میں لپکا۔ باقی تینوں مجرموں کو میں نے دیوار کی طرف منہ کر کے کھڑے ہو جانے کا حکم دیا اور پھر عابدہ کو سنبھال کر کاندھوں پر ڈالا اور سیڑھیوں کی طرف لپکا۔ نیچے اتر کر میں نے دروازے کو بند کر کے کنڈی لگا دی۔ یہ سیڑھیوں کا نچلا دروازہ تھا۔ باہر گلی تاریک تھی۔ ہماری کار ذرا فاصلے پر ایک ویران... گوشے میں کھڑی تھی، میں اس طرف بڑھ گیا۔ ساتھ میری متلاشی نظر تیزی سے اطراف میں گردش بھی کر رہی تھی۔ میں اندھیری گلی سے باہر آگیا اور عابدہ کو اٹھائے جلد ہی کار کے قریب جا پہنچا۔ عقبی سیٹ کا دروازہ کھول کر میں نے نیم بے ہوش سی عابدہ کو اندر لٹا دیا۔ کمیل دادا مجھے کہیں نظر نہیں آ رہا تھا۔ نہ جانے وہ مردود جنگی خان کے تعاقب میں کدھر چلا گیا تھا۔ اشرف کو جہنم واصل کرنے کے باوجود میرے سینے کا آتشیں ابال کم نہ ہوا تھا۔ شدید غیظ و غضب کے عالم میں جس تیزی کے ساتھ میں نے اشرف کا حشر کیا تھا بالکل یہی حالت میں ملعون جنگی خان کی بھی کرنا چاہتا تھا۔ عابدہ کو اغوا کرنے کا ناقابلِ معافی جرم اس نے ہی کیا تھا۔

کمیل دادا کی واپسی تک میں عابدہ کو ہوش میں لانے کی تدبیریں کرنے لگا۔ میری جلتی سلگتی آنکھوں میں وہ منظر گھوم رہا تھا جب وہ اوباش لوگ عابدہ کے ساتھ دست درازی کر رہے تھے۔

جلد ہی کمیل دادا ہانپتا ہوا لوٹ آیا۔

''بیٹھو گاڑی میں، جلدی...'' یہ کہتا ہوا وہ ڈرائیونگ سیٹ پر آن بیٹھا۔ میں نے جنگی خان کے بارے میں دریافت کیا۔

''وہ فرار ہونے میں کامیاب ہو گیا ہے۔'' کار اسٹارٹ کرنے کے دوران وہ جواباً بولا۔ تب تک میں بھی عقبی سیٹ پر عابدہ کا سر گود میں رکھ کر براجمان ہو چکا تھا۔

کھیل وادا کار آگے بڑھاتے ہوئے مجھ سے ناصحانہ انداز میں بولا۔

''شہزی! تم پہلے ہی پولیس کو مطلوب ہو خون خرابے سے تمہیں اجتناب برتنا چاہیے۔''

''ہم کہاں جا رہے ہیں؟'' میں نے اس کا مشورہ نظر انداز کرتے ہوئے پوچھا۔

''بیگم رلا۔''

''نہیں۔'' میں نے انکار کیا۔'' مجھے سرمد بابا کی کوٹھی پہنچا دو۔''

''مگر...'' اس نے کچھ کہنا چاہا۔ میں نے پھنکارتی آواز میں اس کی بات کاٹ دی۔

''تم وہاں نہیں پہنچا سکتے تو مجھے اتار دو۔''

وہ ایک گہری سانس لے کر رہ گیا۔ وہ شاید اب مجھ سے بحث میں کم ہی الجھنے لگا تھا۔ وجہ اس کی یہی رہی ہوگی کہ اس نے میرا یہ روپ پہلی بار دیکھا ہوگا۔ وہ مجھ سے اب خاصا مرعوب سا نظر آتا تھا۔

ہم جلد ہی سرمد بابا کی کوٹھی پہنچ گئے۔ بابا، عابد کو زندہ سلامت دیکھ کر مطمئن ہوئے مگر پھر بھی انہوں نے ایک ڈاکٹر کو بلانے کے لیے فون کر دیا۔ میرا بابا کے پاس رکنا زیادہ مناسب نہ تھا۔ کیونکہ پولیس ابھی میرے پیچھے لگی ہوئی تھی۔ میں کھیل وادا کے ساتھ لوٹنے لگا تو سرمد بابا شفقت سے بولے۔

''میرے بچے! کدھر جا رہا ہے تو؟''

''بابا! ابھی میرے سر پہ بہت امتحان ہیں۔ جن پہ مجھے پورا اترنا ہے۔ آپ بس میرے لیے دعا کرتے رہیں۔'' میں نے حلق میں پھنسے درد کی رقت کو دباتے ہوئے کہا۔'' آپ عابد کا خیال رکھیں، خدا نہ کرے کہ اس پر کوئی قیامت گزر رہی اور پھوڑ دی۔ بعد میں فون کر کے اس کی خیریت پوچھ لوں گا مگر بابا اس کا خیال رکھیے گا۔ یوں سمجھیے، عابد، عابد نہیں... بلکہ آپ کا شہزی ہے۔''

فرطِ جذبات سے سرمد بابا نے مجھے اپنے گلے سے لگا لیا اور اسی لہجے میں بولے۔'' میرے بچے! تم دونوں میرے لیے برابر ہو... عارفہ بچی نے تو عابد کو اپنا بھائی بنا رکھا ہے۔'' عارفہ کے ذکر پر میں نے بابا سے اس کی بھی خیریت معلوم کرنا ضروری سمجھا تو وہ ایک گہری سانس لے کر بولے۔

''بیٹا! دعا کرو۔ آج کل میں اس کا ویزا آنے والا ہے۔ ڈاکٹروں کا یہی کہنا ہے کہ جتنی جلد ممکن ہو سکے عارفہ کے جگر کی پیوندکاری ہو جانی چاہیے۔ اس کا جگر رفتہ رفتہ کمزور ہوتا جا رہا ہے۔''

''اللہ، عارفہ باجی کو شفا دے اور ان کا جلد ویزا لگ جائے۔'' میں نے دعائیہ انداز میں کہا پھر بولا۔'' بابا! کیا عارفہ باجی کے جگر کی پیوندکاری امریکا میں ہونا ضروری ہے... کیا یہ کام یہاں نہیں ہو سکتا؟''

''ہو تو سکتا ہے بیٹا۔'' وہ بولے۔'' لیکن امریکا میں لیور ٹرانسپلانٹیشن کی جدید ٹیکنالوجی ہے پھر عارفہ کی بھی خواہش یہی ہے... زندگی کا معاملہ ہے بیٹا! اور پھر اللہ کا دیا سب کچھ ہے ہمارے پاس تو کیوں نہ باہر سے ہی علاج کروایا جائے؟''

''یقیناً۔'' میں نے مختصراً کہا۔ پھر انہیں خدا حافظ کہہ کر رخصت ہونے لگا تو وہ آخر میں بولے۔'' شہزی بیٹا! ایڈووکیٹ خانم تنار سے ضرور مل لینا۔''

''جی بہتر... بابا!'' میں نے ان سے کہا اور پھر رخصت ہو گیا۔

کھیل وادا کا ارادہ بیگم رلا چلنے کا تھا جبکہ میں نے اسے روک رکھا تھا۔

''کہاں جانا چاہتے ہو تم؟'' اس نے قدرے چونک کر ونڈ اسکرین سے نظریں ہٹا کر میری طرف سوالیہ نظروں سے دیکھا۔

''گرا ہیں گر۔'' میں نے دم بخود سے لہجے میں کہا۔

''گرا ہیں گر...؟'' وہ چونکا۔'' اس وقت... رات اپنے آخری پہر میں ہے مگر وہاں جا کر کیا کرو گے تم؟''

''میں ممتاز خان کو بھی ایک چوٹ دینا چاہتا ہوں... جو اس نے مجھے دی... یقیناً جتنی خان نے بھی بھاگ کر وہیں پناہ لی ہو یا اس سے رابطہ کیا ہو... پھر ریحان کو بھی زبیر خان کی قید سے آزاد کروانا ہے۔''

میری بات سن کر کھیل وادا ایک گہری سانس لے کر رہ گیا۔ وہ جانتا تھا کہ اس وقت میرے سر پر کیا سوار ہے۔ جسے میں اتارے بغیر اب تک سکون سے نہیں بیٹھ سکتا تھا۔

تاہم وہ بولا۔'' مجھے بیگم صاحب سے رابطہ کرنا پڑے گا۔'' یہ کہتے ہوئے وہ... کار میں بیٹھے بیٹھے سیل پر بیگم صاحب سے رابطہ کرنے لگا۔

''تم کچھ بھی کرتے رہو۔ ہمیں سب سے پہلے بیگم رلا جانا ہوگا۔ بیگم صاحب بڑی بے چینی سے ہماری منتظر ہیں۔''

''وہ اس وقت سو رہی ہوں گی۔'' میں نے کہا تو اس نے اپنے سیل پر کسی سے رابطہ کیا۔ اس نے اپنے کسی ساتھی

سے پوچھا تھا۔ جس کا جواب نفی میں پایا تھا۔ یہی سبب تھا کہ وہ میری طرف دیکھ کر بولا۔ ”تمہاری تسلی کے لیے میں نے پوچھا تھا ورنہ مجھے پورا یقین تھا کہ جب تک تم خیریت سے بیگم ولا نہیں لوٹ جاتے، وہ نہیں سوسکتیں۔“ آخری الفاظ ادا کرتے ہوئے اس کے چہرے سے ہی نہیں لہجے سے بھی عجیب سا تاثر ابھرا تھا پھر اس نے مجھ سے اچانک ایک عجیب سوال کیا۔ ”شہزادے! ایک بات تو بتاؤ کیا تم عابدہ سے واقعی محبت کرتے ہو؟ میرا مطلب ہے سچی محبت... بے لوث...؟“

میں اس کے سوال پر چونک گیا۔ تاہم جواباً بولا۔
”کیا تمہیں اب بھی اس کا اندازہ نہیں ہوسکا؟“

”ہاں ہوا تو تھا۔“ اس نے ونڈ اسکرین پر نظریں مرکوز رکھتے ہوئے سر کو اثبات میں جنبش دی۔ ”عابدہ کو دشمنوں کے رحم و کرم پر دیکھ کر تمہاری جو جنونی حالت ہوئی تھی وہ بلاشبہ دیوانہ وار آتشِ نمرود میں کودنے کے مترادف تھی... اور اب تم... جنگی خان کے بھی خون کے پیاسے ہو رہے ہو۔“

”مجھے نیو ملتان کراس پر اتار کر چلے جاؤ۔“ میں نے فوراً اصل موضوع کی طرف آتے ہوئے اپنی بات دہرا دی۔

”میں تمہیں اکیلا نہیں چھوڑ سکتا... ہم پہلے بیگم ولا...“

”مجھے وہیں اتار دو۔“ میں نے فوراً اس کی بات کاٹی۔

”تم خود کو کیا سمجھتے ہو؟ ہر وقت اپنی مرضی کرتے ہو... بیگم صاحب کے حکم کا بھی پاس نہیں ہے تم کو...“ وہ پھر مجھ سے بگڑنے لگا۔

”میں کسی کا غلام نہیں ہوں۔“

”تم شاید واحد شخص ہو جسے بیگم صاحب نے اپنی دوستی کا شرف بخشا ہے۔ تم ہی ناقدرے ہو۔ تمہیں اس خوش نصیبی پر فخر کرنا چاہیے۔“

”میری خوش نصیبی صرف اور صرف میری عابدہ سے وابستہ ہے۔“ میں نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ ”تم مجھے اتار رہے ہو یا نہیں؟“

اچانک رات کے دم بخود سناٹے میں ویران سڑک پر کار کے ٹائر کرخت خراشی آواز میں چرچرائے اور کار ایک جھٹکے سے رک گئی۔

میرا سر ڈیش بورڈ سے ٹکراتے ٹکراتے بچا۔ کیبل دادا نے بریک پر دفعتاً ہی پاؤں رکھا تھا۔ میں سنبھلتے ہی تیز نظروں سے اس کی طرف دیکھنے لگا جبکہ غم و غصے سے اس کی بھی بری حالت ہو رہی تھی۔ اب اس کے ہاتھ اسٹیئرنگ پر نہیں بلکہ مٹھیوں کے ساتھ بھینچے ہوئے تھے اور ہونٹ بھی، جبکہ اس کی جلتی سلگتی نظریں میرے چہرے پر جمی ہوئی تھیں۔ پھر وہ اسی لہجے میں بولا۔ ”شہزادے! تم مسلسل بیگم صاحب کی شان میں گستاخی کر رہے ہو... کاش! تمہیں بیگم صاحب نے دوستی کا رتبہ نہ دیا ہوتا... تو... تو...“ وہ بری طرح مجھ پر جھنجھلا رہا تھا۔ میرے تیور بھی چڑھ گئے۔ میں بھی تیز لہجے میں بولا۔

”میں نے بھی بیگم صاحب سے ایسی دوستی کا دم نہیں بھرا ہے کہ وہ یا ان کا کوئی آدمی مجھ پر حکم چلائے اور سنو۔“ میں نے آخر میں جارحانہ لہجے میں اپنے تیور کے کہا۔ ”اپنی یہ گرمی سنبھال کر رکھو کیونکہ یہ جلتی سلگتی آگ کے سامنے بھاپ بن کر اڑ جائے گی۔“ یہ کہتے ہوئے میں بھی جھنجھلائے ہوئے انداز میں کار سے اتر آیا اور زور سے دروازہ بند کر دیا۔ اس دروازے کو اندر بیٹھے کیبل دادا نے زوردار لات رسید کر کے کھولا تو وہ بڑے زور کے ساتھ مجھ سے ٹکرایا۔ چوٹ پر میرا دماغ الٹ گیا۔ تب تک کیبل دادا وحشیانہ غراہٹ کے ساتھ کار کے اندر سے گویا اچھل کر برآمد ہوا۔ وہ دانت پیستا ہوا میری طرف لپکا۔ اس کے جارحانہ تیور اور بھڑکتے رویے نے مجھے پہلے ہی آگ بنا دیا تھا۔ وہ مجھے دبوچنے یا بری طرح پچھاڑنے کے لیے ہی میری طرف لپکا تھا اور اگلے لمحے ہم دونوں باہم دست و گریباں تھے۔ بے شک کیبل دادا ایک تربیت یافتہ لڑاکا رہا ہوگا۔ قد و قامت میں بھی وہ مجھ سے کم نہ تھا۔ جسم بھی کسرتی تھا لیکن میں نے بھی ایک طرح سے نامساعد حالات میں ہی آنکھ کھولی تھی۔ ایسے انسان کو حالات بھی بہت کچھ سکھا کر استاد بنا دیتے ہیں۔ قد و قامت سے بھی کیبل دادا سے مار نہیں کھاتا تھا۔ میں بھی چوڑی چھاتی اور قد آور قامت کا مالک تھا مگر شاید ایک شے ایسی بھی تھی جو مجھے کیبل دادا جیسے استاد کے مقابلے میں ممتاز کرتی تھی اور وہ تھی میرے سینے میں سلگتی آتشِ جنوں خیزی... جب تک میری یہ وحشت اور ترنگ جنوں خیزی سینے تک محدود رہتی تو کچھ نہیں ہوتا تھا مگر جب سر پہ چڑھ جاتی تھی تو گویا نشے کی طرح میری خرد اور حواسوں پر سوار ہو جاتی تھی، پھر مجھے کچھ نظر نہیں آتا تھا۔ میرے وجود کا رُواں رُواں انگارہ بن کر دہکنے لگتا تھا۔ یہی سبب تھا کہ کیبل دادا نے جیسے ہی مجھ پر حملہ کیا، میں نے بھی پیچھے ہٹنے کے بجائے اسے وہیں لیا۔ ابھی ہم دوسرے سے لگے وہ میرے دھکا دینے

پرکار سے جا ٹکرایا مگر نتا وہ بھی نہیں۔ خوف ناک نظروں سے مجھے گھورتا ہوا دوبارہ مجھ پر پل پڑنے کے لیے دوڑا اور چابک دستی سے اپنے کاندھے کی ٹھوکر مجھے رسید کر دی۔ میں چند قدم پیچھے لڑکھڑایا۔ اس نے اسی پر بس نہ کیا اور دوڑ کر ایک لات میرے سینے پر رسید کر دی۔ میں سڑک کے کنارے فٹ پاتھ پر جا پڑا۔ اس نے مجھ پر چھلانگ بھی لگا دی۔ میں نے تڑپ لگا کر اپنی جگہ چھوڑ دی۔ وہ بھد سے اس جگہ پر گرا۔ میں نے لیٹے لیٹے دوسری چوٹ لگائی۔ میرے دائیں ہاتھ کا گھونسا ہتھوڑے کی طرح اس کی کمر پر شاید ریڑھ کی ہڈی پر لگا تھا۔ ضرب قدرے بے زوردار ثابت ہوئی تھی۔ اس کے حلق سے چیخ ابھری، وہ تکلیف پا گیا۔ لیٹے لیٹے کروٹ کے بل ہو کر میرے پیٹ پر لات رسید کرنے کی کوشش چاہی۔ میں پہلو کے بل۔ تھا فوراً اپنے دونوں گھٹنے پیٹ کی جانب سکیڑ لیے۔ پھر بھی اس کی زوردار لات نے میرے وجود کو ہلا دیا۔ مگر ضرب کاری سے میں خود کو بہرحال بچا گیا تھا۔ دوسرے لمحے ہم دونوں اٹھ کھڑے ہوئے۔ کھیل دادا نے کوئی پیش قدمی نہ کی... بس کھڑا مجھے گھورتا رہا... پھر جیسے بے بسی سے دانت پیس کر اپنے ایک ہاتھ کا گھونسا دوسرے ہاتھ کی ہتھیلی پر مار کر غرایا۔

”مجبور ہوں... میں... بہت مجبور ہوں... میں... ورنہ تیرا برا حشر کرتا۔“ اس کی تہدیدی جھڑک پر میں نے بھی جوابی زبانی کارروائی کی۔

”یاد رکھنا کھیل دادا! میں بھی مجبور ہوں... مگر ایک حد تک... تم تو شاید رک گئے مگر دوبارہ مجھے اس حرکت پر مجبور کیا تو اچھا نہ ہوگا۔“

اس نے مارے طیش کے زمین پر پاؤں پٹخا اور پھر بولا۔ ”تم جاؤ جہنم میں۔ مجھے اب باقاعدہ تمہاری گستاخی کی شکایت بیگم صاحب سے کرنا پڑے گی۔“ یہ کہتے ہوئے وہ اپنی کار کی جانب لپکا۔

میں نے بھی لقمہ اچھال دیا۔ ”بصد شوق اپنی یہ خواہش ضرور پوری کر لینا۔“

وہ بل جھلتا ہوا کار میں جا سوار ہوا اور اگلے چند سیکنڈ... میں وہ کار کو اسٹارٹ کر کے زنانے کے ساتھ ویران سڑک پر دوڑاتا چلا گیا۔

میں اب اندھیری سنسان سڑک پر تنہا کھڑا رہ گیا۔ مجھے کھیل دادا کی اس حرکت پر بے حد حیرت تھی... بلکہ اس جرأت پر سب سے زیادہ کہ اب وہ بیگم صاحب کو جا کر میرے بارے میں کیا بتانے والا تھا اور کیا واقعی وہ بیگم صاحب کو یہ حقیقت بتانے کی ہمت کر سکتا تھا کہ وہ مجھ سے ہاتھا پائی کے بعد مجھے یوں خطرے میں تن تنہا چھوڑ کر بیگم ولا لوٹ آیا تھا!؟ کیا کھیل دادا کو اس بات کا تصور... نہ تھا کہ بیگم صاحب کا کیا ردعمل ہوتا... کیا دادا باغی ہو گیا تھا بیگم صاحب سے... وہ سب جانتا تھا کہ بیگم صاحب کی نگاہوں میں میری کیا اہمیت تھی۔ بیگم صاحب کو مجھے غیر معمولی اہمیت دینا یقیناً کھیل دادا کو گراں گزرتا تھا۔

میں نے سر جھٹک کر ان سوال طلب خیالات سے چھٹکارا حاصل کیا۔

میری مہم ابھی ادھوری تھی۔ جنگی خان مفرور تھا۔ ممتاز خان کو میں عابدہ کے اغوا کرنے کے جواب میں زبردست زک پہنچانے کا فیصلہ کر چکا تھا۔ آسیہ کا منگیتر ریحان بھی ابھی زبیر خان کی قید میں تھا۔ ایک حساب مجھے یاسین ملک سے بھی کرنا تھا جو ممتاز خان اور وزیر خان کے ہاتھوں اپنا نجی اپنی ہی نہیں بلکہ اپنا ضمیر بھی بیچ چکا تھا۔ اس کے باعث ہمارا سارا منصوبہ بری طرح ناکامی سے دوچار ہوا تھا۔ پتا نہیں میری تقدیر میں کیا لکھا تھا مگر جو لکھا تھا، وہ بھگتنا مجھے ہی تھا۔

میں نے اطراف میں نظریں دوڑائیں۔ حالات کے پیش نظر میرا کسی گشتی پولیس پارٹی سے ٹکراؤ ممکن تھا۔ پولیس کو بھی میرے دشمنوں نے یہ انفارمیشن دے دی ہوگی کہ میں

> ## بے عزتی
>
> گھر گھر جا کر اشیا بیچنے والے ایک سیلزمین کی ملاقات ایک نوعمر سیلزمین سے ہوئی۔ پوچھا۔ ”کام کیسا چل رہا ہے؟“
>
> نوعمر سیلزمین یہ سوال سن کر پھٹ پڑا۔ کانوں کو ہاتھ لگاتے ہوئے بولا۔ ”نہیں بھئی یہ کام اپنے بس کا نہیں جہاں جاتا ہوں لوگ بے عزتی کرتے ہیں۔“
>
> بوڑھا سیلزمین زیرلب مسکرایا اور بولا۔ ”بڑی عجیب بات ہے۔ مجھے اس پیشے میں چالیس برس ہو چکے ہیں۔ لوگوں نے میرے سامنے زور سے دروازے بند کیے جو چیزیں فروخت کرنے کے لیے نکالا، انہیں سڑک پر پھینکا گیا۔ مجھے اس طرح ٹھوکریں ماری گئیں کہ سیڑھیوں سے لڑھکتا ہوا نیچے آیا۔ بعض لوگوں نے میری خوب پٹائی کی۔ لیکن بے عزتی... کسی نے آج تک میری بے عزتی نہیں کی۔“

ملاقات ملتی ہی نہیں۔

میں پیدل ہی ایک طرف چل پڑا۔ میں ایک بار پھر بے یار و مددگار تھا۔ میرا خیال تھا کہ کبیل رودا میرا ساتھ دے گا۔ عابد تک اس نے میرا ساتھ دیا تھا۔ اگرچہ اس میں بیگم صاحب کا ہی حکم تھا۔ ایسے میں مجھے اپنا دوست اول خیر یاد آنے لگا جو اب تیزی سے صحت یاب ہو رہا تھا۔ ایک ویران چوراہے پر آ کر میں نے دیکھا۔ یہاں کچھ لوگوں کی آمد و رفت نظر آئی تھی۔ یہ ایک ہوٹل تھا۔ جہاں شبینہ سفر کرنے والے لوڈر ٹرک ستانے کے لیے کھڑے تھے اور شاید یہ شبینہ ہوٹل ان کے لیے ہی مخصوص تھا۔ ایک ٹیکسی بھی نظر آئی جو خالی تھی ڈرائیور غالباً اندر کہیں چائے وغیرہ پینے گیا تھا۔ مجھے رکشے کی تلاش تھی جو مجھے دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ اس ہوٹل کے دوسری جانب ریلوے اسٹیشن تھا۔ میں پیدل پیدل وہاں جا نکلا۔ میرا اندازہ درست ثابت ہوا وہاں اکا دکا ٹیکسی کے علاوہ دو تین رکشے اور کچھ تانگے کھڑے نظر آئے۔ شاید کوئی ٹرین آنے والی تھی یا آ چکی تھی اور مسافر باہر نکل رہے تھے۔ میرا مقصد حل ہونے لگا۔ ظاہر ہے اب مجھے کوئی ٹیکسی یا رکشا نہیں اٹھا سکتا تھا۔ اس کے مقابلے میں اسے رات کے اس وقت ٹرین سے اترنے والے مسافروں سے بھاری اور منہ مانگا کرایہ وصول کرنے کا لالچ ہوتا۔ مسافر اسٹیشن کے گیٹ سے باہر نکل رہے تھے، ان کی تعداد زیادہ نہیں تھی۔ میں نے پھر بھی قسمت آزمائی کی کوشش میں دو ایک رکشے والوں کو چلنے کا کہا مگر انہوں نے انکار میں گردنیں ہلا دیں۔

میں اب ایک رکشے والے کی منت سماجت میں لگا ہوا ہی تھا کہ اس دوران میں اسٹیشن کی بلڈنگ سے نکلنے والا ایک مسافر جس نے ہاتھ میں چھوٹا سفری بیگ تھاما ہوا تھا۔ اس طرف بڑھا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ باقی ٹیکسی اور رکشے اپنی اپنی سواریاں لے جا چکے تھے۔ اب بھی ایک واحد رکشا وہاں کھڑا تھا۔ میں ابھی رکشے والے سے بات کر ہی رہا تھا کہ مسافر نے بھی درمیان میں ٹانگ اڑا دی۔ مجھے غصہ آ گیا۔ پھر ہم دونوں ہی کی نظریں چار ہوئیں اور بیک وقت دونوں ہی ایک دوسرے کو دیکھ کر چونک پڑے۔ ہم دونوں ایک دوسرے کے شناسا تھے اور مزید شناسائی کی تصدیق میں چند سیکنڈوں تک ایک دوسرے کا چہرہ تکتے رہے۔ ایک عجیب بات یہ ہم دونوں میں مشترک تھی وہ چہرہ شناسائی سے گزرا تھا۔ رکشے والا شپٹا کر کبھی مجھے اور کبھی اسے دیکھنے لگا۔

وہ چھنا تھا۔ اول خیر کا پرانا دوست... دبلا پتلا چھریرا اور لیموں سے گورے رنگ والا۔ یہ وہی چھنا تھا جب میں اور اول خیر اپنے ایک اہم شکار گنگل خان کو لے کر گئے تھے اگرچہ بیگم صاحب کے حکم کے مطابق گنگل خان کو ہم نے پرانی باؤلی والے ٹھکانے لے جانا تھا مگر ایک مجبوری کے باعث گنگل خان کو ہم چھنے کے ٹھکانے پر لے آئے تھے اول خیر کے مطابق چھنا اس کا احسان مند تھا۔ وہ بیگم صاحب کے ہی گروہ سے تعلق رکھتا تھا مگر ایک فاش غلطی کے باعث بیگم صاحب نے چھنے کی موت کا پروانہ جاری کر دیا تھا اور اول خیر کو یہ کڑی ذمے داری سونپی گئی کہ چھنے کو خاموشی سے ہلاک کر کے اس کی لاش ٹھکانے لگا دے مگر چھنے نے بھی ماضی میں اول خیر پر ایک احسان کیا تھا۔ لہٰذا اول خیر نے چھنے کو ساری بات بتا کے اس کی جان بخش دی تھی اور بیگم صاحب کو بھی بتا دیا تھا کہ وہ چھنے کو ختم کر چکا ہے۔ بقول اول خیر کے اس نے اپنی زندگی کا یہ سب سے بڑا رسک لیا تھا۔ اگر بیگم صاحب کو پتا چل جاتا تو اول خیر کو اس حکم عدولی کی پاداش میں بڑی بھیانک موت سے گزرنا پڑتا۔ چھنا اپنی بیوی پروین اور دو بچوں کے ساتھ ایک گمنام سے ٹھکانے میں رہنے لگا۔ بہت جلد اس کا ارادہ یہ شہر چھوڑ دینے کا تھا۔ گویا چھنا... اول خیر کے سر پر جھولتی... تلوار تھا مگر ہمارے کام بھی آتا رہتا تھا۔ آج اسے دیکھ کر مجھے حیرت کا جھٹکا سا لگا۔ یہی کیفیت اس کی بھی تھی مگر رکشے والے کے سامنے ہم زیادہ تفصیلی گفتگو نہیں کر سکتے تھے۔ چھنے نے فوراً اسے رخصت کر دیا اور مجھے لے کر دوبارہ اسٹیشن کی عمارت کے اندر داخل ہو گیا۔ آنے والی ٹرین وسل دے رہی تھی، پلیٹ فارم پر زیادہ لوگ نہیں تھے۔ کچھ ٹی اسٹال کھلے پڑے تھے چھنے کا ارادہ اس طرف جانے کا تھا مگر کسی وجہ سے میں نے اسے روک دیا اور ایک نسبتاً ویران گوشے میں سیمنٹ کی بنچ پر آ کر بیٹھ گئے۔

"تم دوبارہ ملتان کیا کرنے آئے ہو؟ تمہیں اول خیر کی نصیحت یاد نہیں۔" میں نے اسے ٹوکا تو وہ بولا۔

"تو جانو الجھ چکا ہوں۔ ایک آخری معاملہ تھا سو وہ نمٹانے آیا تھا۔ اور صبح تڑکے کی ٹرین پکڑ کر نکل جانا تھا مجھے۔" اس نے جواب دیا۔ "مگر تو بتا... تو اس رات گئے اسٹیشن کے باہر کیا کر رہا ہے کیا تو بھی اس ٹرین سے اترا تھا؟ اول خیر کیسا ہے؟ کہاں ہے؟"

میں نے ایک گہری سانس خارج کرتے ہوئے اسے مختصراً اول خیر کے متعلق بتا دیا۔ اول خیر کے زخمی ہونے کا

سن کر وہ بھی تشویش زدہ ہو گیا۔ تاہم اب اس کے رو بہ صحت ہونے کا سن کر قدرے مطمئن بھی ہوا تھا۔ تاہم مجھ سے بولا۔ "تیرا معاملہ کہاں تک پہنچا؟"

اس کے سوال سے مجھے اندازہ ہوا اسے میرے بارے میں کچھ بھی نہیں معلوم تھا۔ اس میں کوئی شک نہ تھا کہ وہ بھروسے کا آدمی تھا تب میں نے اپنے حالات کے بارے میں بھی اسے آگاہ کر دیا اور کمیل دادا کی جیرہ دستی کے بارے میں بھی...

"یہ بہت ظالم اور خطرناک آدمی ہے شہزی! اس سے ہوشیار رہنا۔" چھیمے نے فوراً کہا۔ نہ جانے کیوں اس کے لہجے کو محسوس کر کے مجھے اپنی ریڑھ کی ہڈی میں سرسراہٹ از خود محسوس ہوئی۔

"یہ وہ واحد آدمی ہے جو بیگم صاحبہ کا منہ چڑھا ہی نہیں، سر چڑھا بھی ہے اور ان کا وفادار بھی ہے۔" وہ بولا۔ "اور شاید تم نہیں جانتے کہ... کمیل دادا..." چھیما اچانک کچھ کہتے کہتے خاموش ہو گیا پھر بات بدلنے کی غرض سے ہنسا اور بولا۔ "چل چھوڑ... یہ اندر کی معاملات ہیں، تجھے اس سے کیا لینا دینا۔"

"نہیں چھیمے... مجھ سے کچھ مت چھپاؤ۔" میں نے کمیل دادا سے متعلق فوراً اس کی بات پکڑ لی۔ "تم نہیں جانتے کہ کمیل دادا آج کل مجھ سے بھی نجانے کیوں خار کھائے رہتا ہے، یہ تو بیگم صاحبہ کا میرے ساتھ رویہ کچھ ایسا دوستانہ ہے کہ وہ... حد سے آگے نہیں بڑھتا۔"

"کیا... کیا کہا تم... نے؟" چھیما یک دم چونک کر میری طرف غور سے تکتے ہوئے بولا۔ "بیگم صاحبہ کا رویہ تمہارے ساتھ دوستانہ ہے؟ یہی کہا تھا ابھی تم نے؟" اس کے یوں مستفسر ہونے سے خود میں بھی چونک گیا۔

"ہاں، میں نے یہی کہا ہے کیوں...؟ کیا یقین نہیں آیا تمہیں میری بات پر؟" اس کا چہرہ دم بہ خود سا ہو گیا۔ اس دوران میں پلیٹ فارم پر موجود ٹرین نے آخری وسل دی اور رینگنا شروع کر دیا۔

"یقین کرنا تو دوسری بات ہے۔ بیگم صاحبہ کے بارے میں .... کوئی ایسا ویسا رشتہ جوڑنے کا زعم رکھنا بھی جرم ہے مگر تم کہہ رہے ہو تو مانے لیتا ہوں۔ اگر یہ سچ ہے تو پھر کمیل دادا کی تم سے ذاتی پرخاش کی وجہ بہت واضح ہے کہ اتنے عرصے بیگم صاحبہ کی غلامی کرنے کے باوجود بھی وہ اس مرتبے کو نہیں پہنچ سکا۔ کیونکہ یہ حقیقت صرف اول خیر اور میں نے ہی محسوس کی تھی کہ کمیل دادا بیگم صاحبہ کی غلامی سے زیادہ اس کی دوستی کا خواہاں ہے کیوں؟ اس کے بہت سے معنی نکل سکتے ہیں مگر تمہیں میرا مشورہ ہے شہزی! جتنا ممکن ہو سکے تم خود کو ان لوگوں کے گورکھ دھندوں سے الگ کر دو۔ یہ میرا تمہیں دوستانہ مشورہ ہے اس لیے کہ تم میرے محسن اور اول خیر کے بہت قریبی دوست ہو۔"

"شاید تم ٹھیک کہتے ہو چھیمے... اول خیر بھی بارہا مجھے یہی مشورہ دے چکا ہے۔" میں نے اس کی تائید کرتے ہوئے کہا۔

میں چھیمے کو کلی سوجھ بوجھ رکھنے والا آدمی سمجھتا تھا مگر وہ اپنی غیر معمولی عقل و فراست کے مطابق میرا اور بیگم صاحبہ کے گروہ کے متعلق جو تجزیہ کر رہا تھا، وہ میرے دل کو بھی لگ رہا تھا۔ میں نے کہا۔ "چھیمے! تمہارا مشورہ سچا اور مخلصانہ ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ میں خود بھی ان لوگوں سے دور رہنا... چاہتا ہوں مگر ممتاز خان والے معاملے کے باعث مجھے مجبوراً ان کے ساتھ شامل ہونا پڑا۔ اس کی ایک خاص وجہ اول خیر بھی ہے مگر اول خیر بھی مجھے یہی مشورہ دیتا رہا ہے۔"

چھیمے نے دوستانہ انداز میں میرے کاندھوں پر ہاتھ رکھ کے کہا۔ "دیکھو دوست! میں اور اول خیر یار باش قسم کے انسان ہیں، ایک بار جو ہم سے دوستی کا دم بھر لیتا ہے تو آخر تک اس کا ساتھ نبھاتے ہیں۔ بیگم صاحبہ خود بری نہیں بلکہ وہ تو بے چاری خود ایک مظلوم عورت ہے مگر کمیل دادا بہت خطرناک آدمی ہے۔ تمہیں ان لوگوں سے دور رہنے کا مشورہ میں درحقیقت کمیل دادا کی وجہ سے دے رہا ہوں... اب یہ بات خود تک ہی محدود رکھنا جو میں تمہیں بتانے والا ہوں... کمیل دادا درحقیقت بیگم صاحبہ سے محبت کرتا ہے مگر خاموش محبت... وہ اب تک اس کا اظہار نہیں کر سکا ہے اور نہ ہی ایسی جرأت کر سکتا ہے... اب شاید میں بھی اور تم بھی کمیل دادا کی مخاصمت کی وجہ سمجھ سکتے ہو۔"

میرے لیے یہ ثانوی بات تھی، مجھے اس سے کوئی دلچسپی نہ تھی مگر میں چھیمے کی اس بات پر ضرور چونکا تھا کہ وہ بیگم صاحبہ کو ایک مظلوم عورت کہہ رہا تھا۔ میں نے پوچھا۔

"یار! ویسے یہ بات تو میرے لیے بھی تجسس کا باعث رہی ہے کہ آخر بیگم صاحبہ ایسا کیوں...؟ ان کا پس منظر کیا ہے؟ اور آخر وہ مجھ پر اس قدر کیوں مہربان رہتی ہیں؟"

"بس شہزی! زیادہ جان کاری بھی خطرے سے خالی نہیں ہوتی..." وہ عجیب اسرار بھرے لہجے میں بولا۔ "یہ لمبی کہانی ہے... حقیقتاً مجھے بھی بیگم صاحبہ سے متعلق زیادہ تفصیل معلوم نہیں ہے تم اب بتاؤ... کرنا کیا چاہتے ہو؟"

میں نے اسے اپنے آئندہ کے عزائم سے آگاہ کر دیا۔ وہ سوچ میں پڑ گیا پھر پُرتفکر لہجے میں بولا۔ ''شہزی! تم واقعی ایسے حالات کی دلدل میں دھنس گئے ہو اور نکلنے کے لیے جس قدر ہاتھ پاؤں مارتے ہو... اسی قدر اندر دھنس جاتے ہو۔ اس تناظر میں اگر تمہارے حالات کو دیکھا جائے تو تمہیں واقعی بیگم صاحب جیسی عورت کی مدد کی ضرورت ہے... مسئلہ یہ ہے کہ اول خیر بھی تمہارے ہمراہ نہیں ہے۔ تم کراچی مگر کس مقصد کے لیے شب خون مارنا چاہتے ہو؟'' اس نے آخر میں پوچھا۔ میں نے ایک گہری ہنکاری بھرتے ہوئے کہا۔ ''میں چودھری ممتاز کو بھی وہیں تک پہنچانا چاہتا ہوں جہاں اس نے عابدہ کو اغوا کر کے مجھے دی تھی۔ اس کا ایک ساتھی جنگی خان مجھے مطلوب ہے۔''

وہ بولا۔ ''ایسے میں تم تنہا کچھ نہیں کر سکتے شہزی! تمہارے پیچھے پولیس لگی ہوئی ہے۔ میرا مشورہ تو یہی ہے کہ تم...''

''تم میری ایک مدد کر سکتے ہو؟'' میں نے اچانک اس کی بات کاٹی۔

وہ فوراً بولا۔ ''کیسی مدد چاہیے تمہیں؟''

''میں چودھری ممتاز خان کے کسی گھر کے فرد کو اٹھا کر کچھ روز کے لیے یرغمال بنا کر رکھنا چاہتا ہوں... یہ کام میں تنہا بھی کر لوں گا۔ مجھے بس ٹھکانا چاہیے۔ محفوظ ٹھکانا۔'' چھیتا یہ سُن کر حیرت آمیز تشویش میں پڑ گیا پھر اسی لہجے میں بولا۔

''تم تن تنہا اتنا بڑا خطرناک اور رسکی کام کرو گے؟ چودھری ممتاز کوئی معمولی آدمی نہیں ہے جبکہ کراچی گھر کی عمارت تم نے نہیں دیکھی ہے۔ وہ پورا قلعہ ہے۔ پتا نہیں کتنے گن مین ہر وقت مستعد رہتے ہیں وہاں شکاری اور خونخوار کتوں کی بھی فوج اندر منڈلاتی رہتی ہے۔''

میں نے کہا۔ ''چھیتے! مجھے یہ کام ابھی اور اسی وقت کرنا ہے اور یہ کام میں کروں گا بھی خود ہی۔ تم میرے لیے ٹھکانے کا بندوبست کر سکتے ہو؟''

''ٹھکانا بھی حاضر ہے اور میں بھی... مگر... میں تمہیں اکیلا اتنا بڑا رسک اٹھانے کے لیے کراچی گھر جانے نہیں دوں گا... میں چلوں تمہارے ساتھ۔''

''نہیں چھیتے! تم میری خاطر خود کو خطرے میں نہ ڈالو۔'' میں نے اسے منع کرتے ہوئے اس کی وجہ بھی بتائی۔ ''تم خود بھی تو ایک طرح سے خطرناک حالات سے گزر رہے ہو۔ اگر بیگم صاحب کے کسی آدمی کی نگاہ تم پر پڑ گئی یا انہیں ذرا بھی شبہ ہو گیا کہ تم زندہ ہو تو میرے ساتھ اول خیر کی بھی شامت آ جائے گی۔ نہیں چھیتے... ہرگز نہیں۔ تم جس کام سے قلیل مدت کے لیے یہاں آئے ہو، وہ کر کے فوراً ملتان سے واپس لوٹ جاؤ بلکہ تمہیں تو بہت پہلے لوٹ جانا چاہیے تھا۔''

''میں تم لوگوں کے جانے کے بعد اپنی بیوی اور دونوں بچوں کو لے کر گوجرانوالہ نکل گیا تھا۔'' اس نے بتایا۔ ''کچھ پیسے پھنسے ہوئے تھے یہاں... وہ نکلوانے آیا ہوں۔ پر تمہارے لیے ٹھکانے کا بندوبست کیے دیتا ہوں... چلو اٹھو...'' چھیتا میری بات سمجھ گیا تھا اس لیے اس نے زیادہ اصرار نہیں کیا۔

رات اپنے آخری پہر میں داخل ہو چکی تھی۔ میں سوچ رہا تھا کہ کبیلی دادا نے بیگم ولا پہنچ کر میرے بارے میں بیگم صاحب کو جانے کیا کیا جھوٹ سچ بتایا ہوگا مگر میں نہیں سمجھتا تھا کہ وہ میری غیر موجودگی میں کبیلی دادا کی باتوں کا یقین کر سکتی ہے بلکہ یہ عین ممکن تھا کہ بیگم صاحب نے مجھے تنہا چھوڑ کر لوٹ آنے پر الٹا کبیلی دادا کو بری طرح لتاڑا ہوگا۔ اب یا تو... ان کے آدمی مجھے تلاش کر رہے ہوں گے یا پھر... اچانک مجھے اپنے سیل فون کا خیال آیا۔ میں نے سوچا اگر اب تک ایسی بات تھی تو بیگم ولا سے کسی نہ کسی کا فون آ سکتا تھا۔ مگر اب تک آیا نہیں تھا۔ میں نے فوراً سیل فون نکال کر دیکھا تو بے اختیار ایک گہری سانس لے کر رہ گیا۔ اس کی بیٹری ختم ہو چکی تھی اور وہ آف ہو چکا تھا۔

چھیتا اور میں ایک بار پھر اسٹیشن کی عمارت سے باہر نکلے۔ ایک تانگا ہمیں مل گیا۔ چھیتے نے اسے جگی بستی چلنے کو کہا تو میں ٹھٹک گیا مگر بولا کچھ نہیں۔ ہم تانگے میں سوار ہو گئے۔ تانگا بان نے گھوڑے کو ہانک چابک رسید کیا، وہ ٹپ ٹپ کرتا آگے بڑھ گیا۔ جگی بستی یہاں سے دور تھی یہ وہی بستی تھی جہاں چھیتا کچھ عرصے پہلے اپنے بیوی بچوں کے ساتھ رہتا تھا۔ اس ٹھکانے پر میں اور اول خیر، کنگل خان کو اٹھا کر لے گئے تھے بعد میں وہ جہنم واصل بھی وہیں ہوا تھا۔ مجھے حیرت تھی کہ چھیتا وہاں سے اپنے بیوی بچوں سمیت کوچ کرنے کے بعد بھی اس ٹھکانے سے وابستہ کیوں تھا؟''

بہرحال... تانگے والے کی موجودگی میں ہم دونوں مزید کوئی بات کرنے سے چپ رہے۔ چھیتے نے تانگے والے کو تھوڑا اور دوڑانے کو کہا۔ تھوڑی دیر بعد ہم اسی ٹھکانے پر موجود تھے۔ شہری آبادی کے کنارے اس جگی بستی میں

واقع یہ ٹھکانا مختصر سہی مگر محفوظ تھا۔ یہاں کسی کو بھی کچھ دنوں کے لیے یرغمال بنا کر رکھا جا سکتا تھا مگر چھتے نے یہاں پہنچ کر مجھے بتائے بغیر اپنے سیل فون پر اول خیر سے رابطہ کر لیا تھا۔ وہ اپنا سیل فون میری طرف بڑھاتے ہوئے بولا۔ ''لو... اپنے دوست سے بات کرو۔'' میں نے اپنا سر پکڑ لیا۔ بے شک چھتے نے میرے تحفظ کی خاطر ہی یہ حرکت کی تھی، بہرحال میں نے اس کے ہاتھ سے سیل فون لیا تو کان سے لگاتے ہی، اول خیر کی ہیلو... ہیلو... شہزی!'' کی بے چین سی آواز ابھری۔

''ہاں اول خیر... مجھے بتائے بغیر چھتے نے تم سے رابطہ کر ڈالا۔'' میں نے ایک گہری سانس لے کر کہا تو دوسری طرف سے اول خیر جیسے پھٹ پڑا۔

''او خیر... کاکے... یہ تو کیا کرتا پھر رہا ہے... کمیل دادا تیرے ساتھ تھا... وہ کدھر ہے...؟''

میں نے اسے کمیل دادا سے ہونے والے جھگڑے کے بارے میں بتا دیا۔ آخر میں حیرت سے بولا۔ ''کمال ہے کیا وہ ابھی تک بیگم ولا نہیں پہنچا؟... اسے تو تجھے چھوڑ کر گئے ہوئے آدھا گھنٹا ہو چکا ہے۔''

دوسری جانب یکلخت سناٹا طاری ہو گیا پھر اس کی دبی دبی آواز ابھری۔ ''ایک بات سن کاکے... تو جہاں ہے وہاں سے ایک انچ بھی نہیں ہلے گا۔ میں بس منٹ کے اندر اندر پہنچ رہا ہوں... میں نے کچھ کہنا چاہا مگر اول خیر نے مجھے بولنے نہ دیا۔

''دیکھ کاکے! یہ میرا تجھے دوستانہ حکم ہے۔ تو ایک انچ بھی وہاں سے نہیں ہلے گا۔'' یہ کہہ کر اس نے رابطہ منقطع کر دیا۔

میں نے سیل فون چھتے کو لوٹاتے ہوئے شکایتی لہجے میں اس سے کہا۔ ''تم نے مجھے بتائے بغیر... اول خیر سے کیوں رابطہ کر لیا؟''

وہ مسکرا کر بولا۔ ''اس لیے کہ تم صرف ایک ہی آدمی کی بات مانتے ہو اور وہ ہے اول خیر... میں تمہیں... تن تنہا کسی آگ میں جھونک کر نہیں جا سکتا۔''

بیس منٹ کے اندر اندر اول خیر ایک سی جیپ میں وہاں آن پہنچا تھا۔ اس کے ہمراہ ارشد بھی تھا۔ اول خیر کو سخت مند اور فٹ دیکھ کر میرا دل خوشی سے بھر گیا۔ اس کی ہمراہی میرے لیے بہت اہم ہوتی ہے۔ اس کا یہ ساتھ میرا حوصلہ دگنا کر دیتا تھا۔ وہ مجھے بڑے بھائی کی طرح ہی لگتا تھا۔ سچا دوست اور ساتھی بھی... غرضیکہ مجھے اس کی شخصیت میں ایک تحفظ دلانے والا بڑا اپنا محسوس ہوتا تھا۔ ایک وہی تھا جو میرے اندر کے دکھ کو سمجھتا تھا اور میرا ساتھ دینے سے کبھی پیچھے نہیں ہٹا تھا۔ میں نے اس کی سنگت میں بہت سیکھا ہے۔ وہ آتے ہی میرے گلے سے لپٹ گیا۔ ارشد بھی مجھ سے ملا۔ اول خیر نے سب سے پہلے چھتے کا شکریہ ادا کیا کہ اس نے میرے بارے میں اسے پہلے اطلاع دی۔

''کاکا! جب سے میں نے عابدہ بہن کے اغوا کا سنا تھا، مجھے چین نہیں مل رہا تھا مگر بیگم صاحبہ کا حکم ہے اور پھر کمیل دادا تیرے ساتھ ساتھ تھا تو مجھے کچھ تسلی تھی مگر اب... خیر... کمیل دادا اپنا منہ چھپا رہا ہوگا اس حرکت کے بعد بلکہ کوئی شبہ نہیں، وہ اپنے کیے پر پشیمان بھی ہو اور تجھے ڈھونڈتا پھر رہا ہو۔ خیر... اس کی جو درگت بننے والی ہے، اس سے یہ نہیں بچ سکتا۔ پہلے تو مجھے عابدہ بہن کے بارے میں بتا...'' وہ بولا۔

میں نے اسے اب تک کی مہم کے بارے میں بتا دیا۔ عابدہ کی خیریت پاتے ہی اسے قدرے اطمینان ہوا جبکہ میرے آئندہ کے عزائم وہ چھتے کی زبانی جان چکا تھا۔ اس کے لیے پوری تیاری کے ساتھ آیا تھا۔ البتہ چھتے سے بولا۔

''چھتے... یوں سمجھ تو آخری بار ملتان آیا ہے۔ اب دوبارہ ادھر کا رخ مت کرنا۔ یہاں تیرے لیے خطرہ ہی خطرہ ہے۔ اپنے ساتھ تو مجھے بھی چھوڑ دے گا یار! بھائی بچے کیسے ہیں؟'' چھتے نے اسے اطمینان دلایا اور فوراً لوٹنے کا بھی بتا دیا۔

''بس تو اپنا کام کر کے تڑکے والی گاڑی میں نکل جا، حیاتی رہی تو ملتے رہیں گے۔ ہم یہاں سے جا رہے ہیں رب راکھا۔''

ہم باری باری چھتے سے گلے ملے۔ اول خیر کی موجودگی میں مجھے بڑا حوصلہ مل رہا تھا۔ بلاشبہ وہ یاروں کا یار تھا۔ میرے عزائم جان لینے کے باوجود اس نے ذرا بھی چوں و چرا نہیں کی تھی۔

چھتے کے گھر سے نکل کر ہم کراچی کو روانہ ہو گئے۔

اول خیر ڈرائیونگ سیٹ پر موجود تھا اور میں اس کے برابر والی سیٹ پر تھا۔ ارشد عقبی سیٹ پر بیٹھا تھا۔

''او کاکے... تیرے کول ہتھیار شتھیار ہے؟''

اس نے مجھ سے پوچھا۔ وہ جب مار دھاڑ کے فل موڈ میں ہوتا تو اپنی مخصوص اور ٹھیٹ روایتی زبان استعمال کرتا۔ میں نے اثبات میں سر ہلایا اور کہا۔ ''اول خیر! تیری طبیعت تو

ٹھیک ہے نا؟ میرا مطلب تھا... میں اور ارشد...‘‘

’’او خیر... کاکا۔‘‘ وہ یک دم میری بات کاٹ کر اپنے مخصوص لہجے میں بولا۔ ’’او میں بالکل چنگا ہوں۔ بھرا آرام کرلیا۔ اب ذرا ہتھ پاؤں چلانے کو جی کرتا اے... تو فکر نہ کر...‘‘

میں خاموش رہا۔ تاہم میں نے اپنے منصوبے سے اسے آگاہ کرتے ہوئے بتایا تھا کہ میں چودھری ممتاز کے گھر کی کسی عورت کو عابدہ کے اغوا کے جواب میں اٹھانا چاہتا ہوں تو وہ سنجیدگی سے بولا۔

’’دیکھ کاکے! تیری مرضی لیکن عورت واپس لوٹنے کے بعد مصیبت میں پڑ جاتی ہے۔ بدلے اور انتقام کی آگ میں بھی بھی ایسا قدم اٹھانا کی مت سوچا کر کاکے! جس میں بے گناہ عورت ذات کو نقصان پہنچے... یہ زنانیاں تو کچا گھڑا ہوتی ہیں اگر ممتاز خان نے اپنا منہ کالا کیا ہے تو تو کیوں ایسا کرتا ہے؟ اس کے جوان بیٹے فرخ کو اغوا کرلیتے ہیں، بات اس کو جھکانے کی اور جوابی کارروائی کی ہے نا... پر یار... عورت کو نشانہ نہ بنا... چاہے وہ دشمن کی بہن بیٹی کیوں نہ ہو۔‘‘

اول خیر کی یہی معیارِ انسانیت اس کے اچھے آدمی ہونے کی غمازی کرتا تھا جو مجھے دل سے متاثر کرتا تھا۔ میں نے بھی سوچا تھا کہ اگر ممتاز خان نے میری عابدہ کو اغوا کیا تھا تو میں بھی اس کے خاندان کی کسی عورت کو اٹھا کر اسے ذہنی اذیت سے دوچار کروں... لیکن اب اول خیر کی نصیحت نے مجھے واقعی اپنا ارادہ بدلنے پر مجبور کردیا اور مجھے خود بھی کافی ندامت سی محسوس ہوئی۔ لہٰذا بولا۔

’’اول خیر! تو ٹھیک کہتا ہے یار! یہی بات کہوں میرا اپنا دل بھی اسی طرح سوچ رہا تھا۔ ٹھیک ہے ہم اس کے بیٹے فرخ کو اٹھا لیتے ہیں...‘‘

’’او خیر... کاکا! میں بھی تجھے جانتا ہوں۔ یقیناً تیرے دل میں بھی یہی بات تھی تو تو نے میری بات سے اتفاق کیا ہے۔‘‘

’’یار! یہ بتا... فرخ کو اٹھا کر کہاں لے کر جانا ہے؟ کیا پتے کے گھر...؟‘‘

’’نہیں! کبڈی باؤلی والے ٹھکانے پر... وہاں ارشد، یاور اس کی نگرانی کریں گے اور ہم دونوں بیگم والا چل کر بڑے استاد کمیل دادا کی شکایت کریں گے۔‘‘

میں کمیل دادا کی کوئی شکایت نہیں کرنا چاہتا تھا بیگم صاحبہ سے مگر سرِ دست میں نے اول خیر سے اس موضوع پر مزید کوئی بات نہ کی۔

جیپ پوش علاقے میں داخل ہوچکی تھی، تب تک میں اول خیر کو اپنا سارا منصوبہ بتاچکا تھا۔ میں آسیہ کے منگیتر ریحان ملک کو زبیر خان کی قید سے چھڑانا چاہتا تھا۔ ریحان کی آزادی بھی ضروری تھی کیونکہ اس کے اغوا کے باعث ہم بلیک میل ہوئے تھے اور ہمارا الانجو پروگرام نشر ہونے سے رہ گیا تھا جبکہ یاسین ملک بھی آسیہ کے خلاف کمربستہ ہوگیا تھا اور زبیر خان سے جاملا تھا۔ لہٰذا ریحان کو آزاد کروانا معمولی کام نہ تھا نہ ہی آسان۔ اس لیے براہِ راست اسے نکر کی چوٹ لگا کر خاطر خواہ کامیابی حاصل کرنا تھی اس کے لیے ضروری تھا کہ چوٹ برابر کی ہو اس لیے میں نے چودھری ممتاز خان کی رہائش پر نقب لگانے کا حتمی ارادہ کر رکھا تھا۔ اول خیر کو ان ساری باتوں اور منصوبے کی افادیت کا خوب اچھی طرح ادراک و اندازہ ہوگیا تھا۔ گراہیں نکر کی پرشکوہ عمارت کو دیکھ کر ہی میں دنگ رہ گیا... یہ قول سچے کے... گراہیں نکر کوئی کوٹھی بنگلہ نہ تھا... قلعہ تھا اور قلعے کو توڑنے کے لیے ہاتھی جیسی طاقت درکار ہوتی ہے۔

عمارت کے اردگرد بھی کوئی بنگلا یا کوٹھی کے آثار تھے تو وہ قدرے فاصلے پر تھے۔ ہم جیپ کو نسبتاً ویران جگہ پر چھوڑ کے پیدل ہی یہاں تک آئے تھے۔ ارشد کو جیپ میں ہی چھوڑ آئے تھے۔ میں اور اول خیر ایک خالی پلاٹ میں چھپے ہوئے تھے یہاں خودرو جھاڑیاں اگ آئی تھیں اور کچھ کاریں اور ایک بس کھڑی تھی کہ ہم ان کی آڑ میں کھڑے گراہیں نکر کی اس قلعہ نما عمارت کا جائزہ لے رہے تھے۔

اول خیر نے مجھے یہ بتا کر حیران بھی کیا تھا کہ وہ ایک دو بار اس عمارت میں داخل ہوچکا تھا۔ ایک بار بیگم صاحبہ کے ساتھ آچکا تھا مگر چوروں کی طرح نہیں۔ چودھری ممتاز اور اس کے باپ الف خان سے بات چیت کرنے کے لیے... دوسری بار وہ کمیل دادا کی سرکردگی میں نقب لگا کر داخل ہوا تھا۔

’’دیکھ رہا ہے کاکا! کیسا مضبوط قلعہ ہے یہ...؟‘‘ اول خیر نے میرے کان میں سرگوشی کی۔ ’’مگر تیرے یار کے سامنے یہ ریت کا ڈھیر ثابت ہوگی۔‘‘ میں اس کی بات پر محض سر ہلا کر رہ گیا۔

عمارت سرخ اور اسٹائلش تراشے ہوئے پتھروں کی بنی ہوئی تھی۔ عمارت دو منزلہ تھی اور خاصے وسیع وعریض رقبے پر پھیلی ہوئی نظر آتی تھی۔ عمارت کی دیواریں بلند تھیں جن کی منڈیروں پر خم دار آہنی بریکٹ نصب تھے اور ان

بڑے گیٹ کے ساتھ تین رو میں خاردار فولادی تاروں سے کریا چہار دیواری کا احاطہ کر رکھا تھا۔ سیاہ رنگ کا لوہے کا گیٹ قبضی قفل گزار نظر آتا تھا۔ عمارت کے اندر سے بھی ناریل اور یوکلپٹس کے درخت دکھائی دے رہے تھے۔ اصل رہائشی عمارت چہار دیواری کے وسط میں تھی اور اس کی بلندی پہ جس پر فیٹ لکڑی اور شیشے کا استعمال نظر آتا تھا۔ دیواروں پہ کہیں کسی جگہ ایک سیاسی پارٹی کے بینر اور رہنماؤں کی بڑی بڑی تصویریں بھی آویزاں تھیں۔ اول خیر نے مجھے بتایا کہ اوپری منزل کے شمال اور جنوبی گوشوں میں دو خفیہ کیبن بنے ہوئے ہیں جن پر سیاہ شیشے لگے ہوئے ہیں یہاں خفیہ کیمرے نصب ہیں اور ایک ایک گن مین بھی وہاں تعینات ہے۔ جبکہ گیٹ کے باہر دو گن مین اور اس سے زائد اندر بنے گیٹ سائیڈ میں ہر رنگ ہتھیاروں سے لیس موجود تھے۔ اوپری منزل میں مذکورہ دو خفیہ کیبن میں نصب کیمرے چاروں طرف گردش کرتے تھے۔

”بڑے سخت انتظامات کر رکھے ہیں۔ یہ رہائش گاہ ہے یا کوئی جیل...؟“ میں نے ایک لمبی سانس بھرتے ہوئے اول خیر سے سرگوشی میں کہا۔

وہ مدھم ہنسی کے ساتھ بولا۔ ”کاکا! یہ لوگ اس کو اپنی شان سمجھتے ہیں مگر حقیقت کی نگاہ سے دیکھا جائے تو یہ سب ان کے لیے ایک عذاب سے کم نہیں۔ انسان کی اصل راحت اور سکون نارمل زندگی گزارنے میں ہی ہے۔ چل... آ اس طرف...“ ہم دونوں رات کی تاریکی میں ایک طرف کو ہو لیے۔ چھپتے چھپاتے ایک لمبا چکر کاٹ کر جنوب تک آئے۔ رات کے آخری پہر میں یہ فائدہ تھا کہ ہماری یہ کارروائی نظروں میں آئے بغیر پایہ تکمیل کو پہنچ سکتی تھی مگر مشنیں بھی آسانی سے فرار دے جا سکتے تھے۔

”ادھر ایک گلی کمیونیکیشن والوں کا پول ہوا کرتا تھا مگر اب نہیں ہے۔“ مجھے اول خیر کی سرگوشی سنائی دی۔

میں نے ہولے سے استفسار یہ کہا۔ ”تو اب...؟ کیا کیا جانا چاہیے؟“

”آگے آؤ۔“ کہتے ہوئے اس نے قدم بڑھائے۔ اس کی کوشش تھی کہ وہ عمارت کے بالائی گوشے کی جنوبی سمت والے سیاہ شیشوں کے کیبن کی زد میں نہ آنے پائے۔

جنوبی دیوار سے ہم ایک گلی نما راستے میں آ گئے۔ اب عمارت اور ہمارے درمیان کسی اور کوٹھی کی آڑ تھی۔ یہاں سے ایک لمبا چکر کاٹ کر عمارت کی عقبی سمت میں آ گئے۔ عقبی سمت میں بھی ایک لگ بھگ کوئی دو کنال کا پلاٹ خالی پڑا تھا۔ یہاں مرمتی کام میں استعمال ہونے والا سامان پھیلا ہوا تھا۔

”کام بن گیا کاکا۔“ معا اول خیر نے کہا۔ ”لیکن بڑی ہوشیاری کے ساتھ ہمیں اس حصے کی طرف پہنچنا ہوگا۔“

”اصل مرحلہ تو یہی ہے۔ اوپر کیمرے کی اندھی آنکھ سارا منظر دیکھ رہی ہے۔ کس طرح وہاں پہنچا جائے؟“ میں نے فکرمندی سے کہا۔

”سینے کے بل لیٹ کر... یہ مختصر فاصلہ طے کرنا پڑے گا۔“ وہ بولا۔ ”اب یہ قسمت پر منحصر ہوگا کہ عمارت سے باہر گرد و پیش میں کوئی شب گشت کرنے اور سیٹی بجانے والا چوکیدار ہمیں دیکھ کر اندر لے جائے۔“

”مجھے تو اپنے اطراف میں کوئی نظر نہیں آ رہا سوائے تاریک سناٹے کے۔“ میں نے کہا۔

ہم دونوں زمین پر سینے کے بل لیٹ گئے، اب اس طرح ہماری مقررہ جگہ تک ہونے والی پیش قدمی اوپری منزل کے کیبن میں نصب بلند و متوقع کیمرے کی خفیہ آنکھ کے دائرے میں نہیں آ سکتی تھی۔ ٹانگوں سے چلنے کی بہ نسبت رینگتے ہوئے یہ مختصر سا فاصلہ بھی طویل ثابت ہوا۔ دیوار کے قریب پہنچ کر بھی ہم سیدھے کھڑے نہیں ہوئے تھے، اس کا اشارہ اول خیر مجھے کر چکا تھا۔ وہ اب عقبی دیوار کا لیٹے لیٹے ہی تھوڑی دیر تک جائزہ لیتا رہا۔ ایک سیوریج کا دیوار گیر پائپ اوپر تک جا رہا تھا۔ لوہے کا نہیں بلکہ ایک خاص قسم کے مسالے کا موٹا پائپ تھا جس میں سیمنٹ استعمال کیا جاتا ہے۔ اور اس پر دیوار جیسا ہی رنگ کیا ہوا تھا۔ دو دو فٹ کے فاصلے پر پائپ میں فولادی پتریاں لگی ہوئی تھیں۔ پائپ نصف سے زیادہ دیوار کے اندر دھنسا ہوا تھا اور میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اول خیر اور ہم اس کے ذریعے کس طرح اندر داخل ہو سکتے ہیں؟

مگر دوسرے ہی لمحے مجھے اس کی ذہانت کا اعتراف کرنا پڑا۔ اول خیر نے اپنی جیب سے ایک پلاس کی طرح کا اوزار نکالا اور مجھ سے بولا۔ ”کاکا! میں اوپر جا رہا ہوں۔ جس طرح میں اس پائپ کے ذریعے اوپر دیوار تک پہنچوں گا تو بھی یہی طریقہ آزمانا۔“

میں نے فوراً اثبات میں سر ہلا دیا۔ اس کے بعد وہ اٹھا اور جھکے جھکے انداز میں پائپ کی جانب بڑھا پھر جیسے اس کے ہاتھ پاؤں مشین ہو گئے۔ اوزار نما آلے کی مدد سے وہ دو دو فٹ کے فاصلے پر لگی لوہے کی پتریوں کو نصف حد تک اکھیڑتا اور اس پر پاؤں رکھ کر اوپر بڑھتا چلا گیا۔ اس طرح

پائپ بھی جھول کر دیوار سے قدرے باہر کو نکل آیا تھا اور اوپر چڑھنے میں مزید آسانی ہو رہی تھی، نسبتاً زیادہ آسانی مجھے ہوئی تھی۔ میرے لیے منڈیر پر نصب آہنی بر چھیوں اور خاردار تاروں کو پھاند کر دوسری طرف کودنا چنداں دشوار ثابت نہ ہوا۔

جہاں ہم کودے تھے، وہ رہائشی کمروں کی عقبی جگہ تھی جسے عام فہم میں گلیاری کہتے ہیں۔ گلیاری نے ایک طرح سے تقریباً سارے ہی کمروں کا احاطہ سا کر رکھا تھا۔

ہمیں اس حقیقت کی خطرناکی کا پورا احساس تھا کہ ہم نے دشمنوں کی کچھار میں قدم رکھ دیا ہے۔ ممتاز خان یا چوہدری الف خان جیسی ملتان کی نمایاں بارسوخ اور بھاری بھرکم سیاسی شخصیت کی رہائش گاہ میں نقب لگانا معمولی کام نہ تھا مگر ممتاز خان نے میری عزت پر ہاتھ ڈال کر ایسا ناقابل معافی جرم کیا تھا جس سے میرے دل و دماغ سے اس کا رعب و دبدبہ، اثر و رسوخ، طاقت سب ماند پڑ چکا تھا۔ میں اس وقت مثل آتش فشاں کی طرح تھا میرے سینے میں لاوا دہک رہا تھا اور میں نے تہیہ کر رکھا تھا صورت حال بگڑی تو میں کم از کم کرائیں گرتانی کے قلعے کو آگ میں جھونک دوں گا میں گویا ہر صورت حال کے لیے تیار تھا۔

اول خیر نے سرگوشی میں کہا۔ ”کاکے! یہ گلیاری جدھر ختم ہوتی ہے وہاں ایک زینہ آئے گا وہ سیدھا اوپری منزل کو جاتا ہے خود ممتاز خان نیچے کی منزل میں ہوتا ہے۔ بیوی بچے اوپر سوتے ہیں۔ مجھے یقین تو ہے کہ فرخ ہمیں اوپر ہی ملے گا۔“

”آگے بڑھو پھر...“ میں نے بے چینی سے کہا۔ ہم گلیاری کی دیوار سے لگے مذکورہ مقام پر طلوع ہوئے، آڑ سے ابھر کر سامنے کا بیرونی حصہ ہماری ٹکٹکی بنی نظروں کے سامنے تھا۔ وہاں گیٹ کا اندرونی سائڈ کیبن نظر آ رہا تھا۔ وہ گن مین ادھر ادھر گشت کرنے کے بعد اندر جا چکے تھے، مگر سب سے زیادہ تشویش ناک چیز وہ چار خونخوار جبڑوں اور شکاری دانتوں والے کتے تھے۔ ہوا رکی ہوئی تھی شاید اسی لیے ابھی تک وہ ہماری بو نہیں سونگھ سکے تھے یا پھر وہ خود بھی نیند کے باعث الجھے ہوئے تھے۔

”کاکے! جلد بازی مت کرنا... زینہ میرے دائیں جانب ہے جس کا دروازہ کھلا رہتا ہے۔ یہ اوپر سیدھا چھت تک جاتا ہے۔ وہاں پہنچنے کے بعد ہمارا کام آسان ہو جائے گا۔ بس! یہ مرحلہ طے ہو جائے۔“

”بے فکر رہو مگر یہ کم بخت کتے۔ یار مجھے ان سے خطرہ محسوس ہو رہا ہے۔ یہ کسی وقت بھی ہماری بو سونگھ کر ہماری طرف بھونکتے ہوئے لپک سکتے ہیں۔“ میں نے سرگوشی میں کہا تو وہ بھی اسی آواز میں بولا۔ ”معلوم ہوتا ہے کہ تمہارا ارادہ گرائیں گھر میں نقب لگانے کا ہے تو میں ان کتوں کا بھی بندوبست کر کے آتا۔ گوشت کے پارچوں میں نیند کے انجکشن اس مشکل کا حل ہو سکتے تھے۔“

اچانک دو کتے وسیع و عریض باغ کی طرف لوٹ گئے، جبکہ تیسرا کتا وہیں گارڈز کیبن کی دیوار سے لگ کر تھوتھنی اپنے اگلے پیروں میں ڈال کر لیٹ گیا جبکہ چوتھا کتا اپنے منہ سے خوں خوں کی آواز خارج کرتا ہوا بیرونی محرابی دروازے کی فینسی اور اسٹائلش تند بچوں کے قریب آ کر بیٹھ گیا۔ اور اپنا منہ بارطل کے بچھلے فرش پر ڈال دیا۔

”کم بخت کو ادھر ہی بیٹھنا تھا۔“ اول خیر کی بہت مدھم آواز ابھری۔ میں بھی اس کے عقب سے قدرے ابھر کر گلیاری کی دیواری آڑ سے مذکورہ سمت کا دیکھ رہا تھا۔ ”یہ تو واقعی میرے دارین کر بیٹھ گیا، اب کیسے اوپر پہنچیں گے؟“

میرے لہجے میں پریشانی در آئی۔ اول خیر نے اس کا کوئی جواب نہ دیا۔ وہ کچھ سوچنے میں محو تھا۔

کتا ہمارے بہت قریب تھا۔ اس خطرے کا بھی احتمال تھا کہ ہماری بو کسی بھی لمحے اس کے بوگیر نتھنوں سے ٹکرا سکتی تھی۔ بہت قوی امکان تھا اس خدشے کا جسے میں نے ہی نہیں، اول خیر نے بھی محسوس کر لیا تھا اسی باعث جب اول خیر مجھے لیے کئی قدم پیچھے ہٹ گیا۔ گلیاری میں مدھم روشنی تھی۔ دوسرے ہی لمحے ہم دونوں بری طرح ٹھٹکے۔ ہمارے عقب سے شاید دوسرے سرے سے گھوم کر نجانے کیسے ایک کتا گلیاری کے اندر آ گیا اور ہمارے پیچھے کھڑا مدھم روشنی میں ہم دونوں کو گھور رہا تھا۔ ہمیں یوں لگا جیسے ہم ایٹم بم کے سامنے ہوں جو کسی بھی وقت پھٹنے کے قریب تھا۔

☆☆☆

ایسے نازک ترین وقت میں میرا جی چاہا تھا کہ میری رگوں میں یکلخت پارا دوڑ جائے اور میں لپک کر کتے کا خونخوار منہ دبوچ لوں تاکہ وہ بھونکنے نہ پائے۔ اگر یہ بھونکنا شروع کر دیتا تو مسلح گارڈز بھی ہماری طرف متوجہ ہو جاتے، اس کتے کے باقی تین ساتھی اپنے ساتھی کی آواز پر تیر کی طرح دوڑتے ہوئے ادھر آ جاتے۔

”کاکے! ہلنا بالکل مت... سانس بھی مت لینا۔“

مجھے اول خیر کی سرسراتی سرگوشی سنائی دی۔ میں نے دم بخود کھڑے کھڑے اپنے ڈیلوں کو نصف دائرے کی حرکت پر اول خیر کا چہرہ دیکھا۔ اس کی آنکھیں سامنے گھورتے اور

بولے ہوئے انداز میں غر... غر... کرنے کتے پر جمی ہوئی تھیں۔ نہ جانے اول خیر کون سا جادو کرنا چاہتا تھا کہ میں نے دیکھا کتا بھی اول خیر کی طرف کھنچے جا رہا تھا۔ اس کے کھلے جبڑوں سے نکیلے شکاری دانتوں کی جھلک صاف نظر آ رہی تھی۔ حلق سے ہولے ہولے غراہٹ اس کی خونخواری کا مزید بھیانک تصور پیش کر رہی تھی۔ غنیمت ہی تھا اب تک کتے نے بھونکنا نہیں شروع کیا کہ اس میں شاید اول خیر کا کمال تھا اول خیر کے ہونٹوں نے عجیب سی ساخت بنائی... اور بہت ہلکے پچکارنے جیسی آواز پیدا کرنے لگا... کتا ہولے ہولے غر غر کرتا اس کے قریب آ گیا اور پھر دوسرے ہی لمحے جیسے اول خیر کی رگوں میں پارا دوڑ گیا۔ اس نے کمال پھرتی اور دیدہ دلیری و جرأت سے لپک کر کتے کا شکاری تھوتھنا اپنے دونوں ہاتھوں میں دبوچ لیا اور ایک زور دار جھٹکا دیا کہ کتا آواز نکالے بغیر وہیں ڈھیر ہو گیا۔ میری آنکھیں بھی کی پھٹی رہ گئیں۔ سینے میں اٹکی ہوئی سانس گویا رک رک کر جاری ہونے لگی تھی۔

''کاکا! اس کی لاش کو باہر اچھالنا پڑے گا۔ ورنہ اس کے دوسرے ساتھی بھی ادھر آ جائیں گے۔'' یہ کہتے ہوئے اول خیر نے کتے کی لاش کو اٹھایا اور پھر ہم دونوں تیز تیز قدموں سے چلتے ہوئے اسی سمت میں آ گئے جہاں ہم کودے تھے۔ ہم دونوں نے کتے کی لاش ہاتھوں میں پکڑی، پھر ایک، دو، تین تک گنتے ہوئے اسے جھلایا اور اوپر اچھال دیا۔ کتے کی لاش دیوار کے اوپر پہلے آہنی برجیوں اور خاردار تاروں سے الجھ کر جھول گئی۔ ہماری کوشش تو یہی تھی کہ اسے اس قدر اوپر تک ضرور اچھالتے کہ وہ دوسری طرف جا گرتا مگر بدقسمتی سے وہ وہیں پھنس کر جھول گیا۔

''کام خراب ہو گیا۔'' اول خیر زیرلب بڑبڑایا۔ ''ہمیں جلد اپنا کام نمٹانا ہو گا کاکے، چل آ۔'' ہم دونوں بیرونی دروازے والے حصے پر پہنچے تو پہرے دار کتا وہاں نہیں تھا ہم وہیں لپک کر زینے پر آ گئے یہاں آ کر ہم نے قدرے سکون کا سانس لیا۔

ہم اوپر آ گئے۔ ایک موٹا چوبی دروازہ دھکیل کر دوسری طرف جھانکا۔ راہداری سنسان پڑی تھی۔ کہیں چھت کے کونے میں نصب ہلکے پاور کا گلوب روشن تھا۔ ہم دونوں راہداری میں آ گئے۔ یہاں گہری خاموشی تھی۔ ہمیں دائیں جانب چار پانچ بیڈ رومز کے دروازے دکھائی دیے جو ایک دوسرے سے کافی فاصلے پر تھے۔ جس سے کمروں کی کشادگی کا اندازہ ہوتا تھا۔ اب ہمیں یہ نہیں معلوم تھا کہ کس کمرے میں کون ہے؟ فرخ کا بیڈ روم کون سا تھا؟ کسی ایک کمرے میں گھس کر اور اندر موجود کسی فرد کو گن پوائنٹ پر لے کر ہی فرخ کے بارے میں اگلوایا جا سکتا تھا۔ چنانچہ پہلے ایک کمرا چھوڑ کر دوسرے پر اول خیر ''طبع آزمائی'' کے لیے جھک گیا۔ لاک والے دروازے بھی خاصے بھاری بھرکم اور بیش قیمت عمارتی لکڑی کے تھے۔ اول خیر نے اپنی جیب سے بظاہر ایک عام سی چابی نکالی۔ مجھے حیرت ہوئی مگر پھر چونکا بھی۔ چابی مخصوص قسم کی تھی جسے ایک سے ڈھائی انچ تک لمبا کیا جا سکتا تھا۔ اسی تناسب سے اس کے دندانے بھی بدلے جا سکتے تھے، اول خیر کے مطابق یہ ماسٹر کی تھی۔ چابی لاک میں داخل کر کے وہ لاک کے ساتھ چھیڑ چھاڑ کرتا رہا۔ ساتھ ہی لٹو نما ہینڈل کو بھی گھماتا رہا۔ تھوڑی دیر بعد دروازہ کھل گیا۔ چابی نکال کر اس نے اپنی جیب میں ڈالی اور مجھے اشارہ کرتا ہوا بہ آہستگی دروازہ کھول کر اندر داخل ہو گیا۔

بیڈ روم بلاشبہ پرسکون اور آرام دہ تھا۔ اے سی چل رہا تھا۔ جہازی سائز کے ہیجری بیڈ پر ایک جواں سال لڑکی سو رہی تھی۔ اس کا ریشمی لحاف نصف سرکا ہوا تھا۔ بلاشبہ وہ ایک پری رخ صورت لڑکی تھی۔ اس کے ریشمی گھنے سیاہ بال غلافی تکیے پر پھیلے ہوئے تھے۔ لمحے بھر کو یوں لگا جیسے سیاہ بدلیوں کے درمیان چاند کا رخ روشن دمک رہا ہو...

''یہ ممتاز خان کی لاڈلی بیٹی نوشابہ ہے۔ فرخ کی بڑی بہن۔'' اول خیر نے میرے کان میں دھیرے سے سرگوشی کی پھر مجھے چلنے کا اشارہ کیا۔ اس کے پیچھے کمرے سے باہر نکلتے ہوئے میرے پرسوچ ذہن میں کئی سوالات تھے۔ اول خیر یہ سب کیسے جانتا تھا؟ اس نے مجھے ابھی تھوڑی دیر پہلے بتایا تھا کہ وہ یہاں دو بار آ چکا تھا مگر مجھے حیرت تھی کہ وہ ہر جگہ سے کس طرح واقفیت رکھتا تھا؟

بہرحال دوسرا کمرا خالی ملا۔ تیسرے میں فرخ موجود تھا۔ وہ بھی اسی طرح کہ جاگتی ہوئی حالت میں۔ وہ رات کے آخری پہر اپنا لیپ ٹاپ کھولے ہوئے تھا۔ کمرے کی لائٹ جل رہی تھی ہمیں پتا نہیں چل سکا کہ وہ جاگ رہا ہے۔ دروازہ کھول کر اندر داخل ہوئے تھے کہ وہ بیڈ پر ایک بڑے گاؤ تکیے سے پشت ٹکائے نیم دراز تھا۔ اس طرح کہ لیپ ٹاپ اس کے سینے پر کھلا ہوا تھا اور وہ خود جمائیاں لے رہا تھا۔ شکر تھا کہ اول خیر نے دروازہ بے آواز کھولا تھا۔ یہی سبب تھا کہ جب تک وہ سنبھلتا، اول خیر چیتے کی سی لپک کے ساتھ اس پر جھپٹ پڑا۔ میں نے بھی اس کے بیڈ کے قریب

آکر اپنا خوف ناک میگارووڈ کی نال اس پر تان لیا۔ کمرے میں جلتے پاور کے بلب کی روشنی کے باوجود فرخ، اول خیر کو پہچان چکا تھا۔ فرخ پر شکل سولہ سترہ سال کا ایک ٹین ایج لڑکا تھا۔ شکل وصورت میں خوبرو تھا۔ وہ بُری طرح خوف زدہ تھا۔ اور پھٹی پھٹی آنکھوں سے ہمیں تکے جا رہا تھا۔ اول خیر نے اس کا منہ اور گردن بیک وقت دبوچ رکھا تھا پھر اس نے خونخوار غراہٹ سے فرخ سے کہا۔

"اوئے کاکے! شور نہ مچائیں۔ ورنہ... ادھر میں تیری گردن دبا دوں گا... بے حرکت پڑا رہ سے۔" فرخ سے مارے دہشت کے ویسے ہی نہیں بولا جا رہا تھا پھر میں بھی اس پر اپنا پستول تانے... کھڑا تھا۔ اول خیر نے سنسناتی سرگوشی میں فرخ سے کہا۔ "اوئے منڈے! تجھے خاموشی سے ہمارے ساتھ چلنا ہوگا... ڈرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ ہم بس تجھے یرغمال بنا کر تیرے باپ کے شکنجے سے اپنا ساتھی چھڑانا چاہتے ہیں۔" اس کی بات پر فرخ کی گھگھی بندھ گئی۔ اول خیر نے اب اس کے منہ سے ہاتھ ہٹا لیا تھا۔ وہ لرزتی آواز میں بولا۔

"م... میں کہیں نہیں جاؤں گا۔" اول خیر کو غصہ آ گیا۔ اچانک کمرے کی دم بخود فضا میں گولی چلنے کا دھماکا ہوا۔ میں اور اول خیر اپنی جگہ سن ہو کر رہ گئے بلکہ میں تو گھبرا کر چند قدم پیچھے بھی ہو گیا تھا۔ میرے ہاتھ سے میگارووڈ نکل چکا تھا گولی چلانے والے کا نشانہ بڑا اچھا تھا۔ گولی میرے ہاتھ میں دبے میگارووڈ کی نال سے ٹکرائی تھی اور گولی چلانے والا... بلکہ والی... دروازے پر کھڑی ہماری طرف گھور رہی تھی جبکہ میں اور اول خیر اس کی طرف یوں تکے جا رہے تھے جیسے وہ دوسری دنیا کی مخلوق ہو۔ یہ وہی دلکش چہرے والی لڑکی تھی جسے ہم پہلے والے کمرے میں سوتا چھوڑ آئے تھے۔ اب نجانے وہ کس طرح بعد میں ہماری شاید واپسی کی آہٹ پر چونک کر بیدار ہو گئی تھی یا پھر پہلے سے ہی خوابیدگی کا ڈراما کر رہی تھی مگر طے شدہ امر تو یہ تھا کہ اس کی غیر متوقع مداخلت نے ہماری ساری محنت اکارت کر ڈالی تھی بلکہ بازی پلٹ کر ہمیں بھی خطرے سے دوچار کر دیا تھا۔ ایک سوتے ہوئے گھر کے آخری خاموش پہر میں گولی کی آواز دھماکے سے کم ثابت نہ ہوئی تھی جو مکینوں سمیت مسلح گارڈز کو بھی متوجہ کرنے کے لیے کافی تھی۔

"خبردار! کوئی غلط حرکت کرنے کا سوچنا بھی مت۔" دفعتاً وہ لڑکی جرأت کے ساتھ اپنی مترنم آواز کو رعب دار بناتے ہوئے بولی۔ "میرا نشانہ تو تم نے دیکھ ہی لیا ہے نوشابہ نام ہے میرا... اور میں معمولی لڑکی نہیں ہوں... چودھری الف خان کی پوتی ہوں ممتاز خان کی بیٹی... شوٹنگ کلب کی ٹاپ ممبر رہ چکی ہوں میں... بس کافی ہے میرا تعارف... یا...؟"

نوشابہ نے ابھی اتنا ہی کہا تھا کہ اول خیر نے بجلی کی سی پھرتی کے ساتھ فرخ کے سینے پر کھلے پڑے لیپ ٹاپ پر زور کا ہاتھ مارا... مقصد نوشابہ کے ہاتھ میں چمکتے ہوئے پستول کی دوسری متوقع گولی کا راستہ روکنا تھا یا کچھ اور... کیونکہ جیسے ہی لیپ ٹاپ فرخ کے سینے سے اچھل کر نوشابہ کی طرف لپکا... اول خیر نے پستول کے نشانے سے بچنے کی کوشش کی۔ دوسری گولی چلنے کا دھماکا ہوا اور میرے چہرے پر خون کے چھینٹے پڑے۔ بیڈ پر نیم دراز جواں سال فرخ کے چہرے پر گولی پیوست ہو گئی تھی اور اس کا خوبرو چہرہ زخم ناک ہو کر بگڑ گیا۔ گولی شاید دماغ کو چاٹ گئی تھی اور وہ ڈھیر ہو گیا تھا بلاشبہ نوشابہ کا دوسری بار گولی چلانے کا عمل بے اختیاری تھا جس نے اس کے ہاتھوں اس کے بھائی کی موت کا سامان کر ڈالا تھا۔ نوشابہ سکتے میں آ گئی۔ اپنے ہاتھوں اپنے بھائی کا خون ہوتے دیکھ کر اس جیسی جرأت خیز لڑکی کے حواس بھی لمحے بھر کو مختل پڑ گئے۔ اب کچھ بعید نہ تھا کہ وہ اپنے بھائی کی موت کا ہمیں ذمے دار ٹھہراتی۔ اور ایسا کچھ غلط بھی نہ تھا۔ وہ ہم پر جوش غیظ و جنوں کے باعث گولی جھونک سکتی تھی لہٰذا میں نے اس خطرے کے پیش نظر بجلی کی سی تیزی کے ساتھ اپنی جگہ چھوڑی میرا اور نوشابہ کا فاصلہ زیادہ نہ تھا میں سیدھا اس پر جا پڑا۔ باہر شور اور دوڑتے قدموں کی آواز بدستور سنائی دے رہی تھی۔ صورت حال خطرناک بلکہ جان لیوا حد تک بگڑ چکی تھی۔

میں نوشابہ سے ٹکرایا۔ وہ چیخ مار کر گری۔ میں نے لپک کر اس کا پستول اٹھا لیا۔ اول خیر چیخا۔ "کاکے! بھاگ۔"

یہ کہتا ہوا وہ دروازے کی طرف لپکا۔ میں نے بھی اس کی تقلید کی مگر جاتے جاتے اپنا میگارووڈ اٹھانا نہیں بھولا۔ ہم دونوں راہداری کے آخری سرے تک دوڑتے چلے گئے۔ عقب میں شور اور دوڑتے قدموں کی آوازیں قریب آتی جا رہی تھیں۔ سیدھے ہاتھ کی طرف مغربی راہداری کے سامنے ایک دروازے والا زینہ نظر آیا۔ اول خیر آگے تھا اور میں اس کے پیچھے۔ یہ زینہ مختصر ثابت ہوا۔ دس بارہ قدمچے ہی طے کرنا پڑے تھے کہ ہم ایک ویران اندھیرے ہال میں کھڑے تھے۔

''اس طرف۔'' اول خیر نے ہانپتے ہوئے اشارہ کیا۔ یہاں ایک شٹر نما دروازہ تھا جسے عام فہم میں ڈور اسپرنگ کہا جاتا ہے۔

''میرا خیال ہے ہم ابھی عمارت سے باہر نہیں نکل سکتے۔ ادھر ہی کسی گوشے میں چھپ جاتے ہیں۔'' وہ میرے بچکانا سوال پر بولا۔

''نہیں کالے یہی موقع ہے نکلنے کا۔ اس وقت افراتفری کا عالم ہے۔ سب بالائی منزل کی طرف متوجہ ہوں گے۔ صورتِ حال واضح ہوتے ہی یہی عمارت ہمارے لیے بند ہے واں ثابت ہو جائے گی آؤ۔''

اس کا خیال سو فیصد درست تھا۔ وہ شٹر ذرا سے باہر جھانکنے کے بعد مجھے اشارہ کرتے ہوئے آگے بڑھ گیا۔ یہ پائیں باغ کا حصہ تھا۔ اس سے آگے کار پورچ میں دو بڑی اور ایک چھوٹی گاڑی کھڑی نظر آئیں۔ باہر پو پھٹنے لگی تھی اور صبح کی سحر خیزی روشنی کی صورت میں نمودار ہونے لگی تھی۔ یہاں سے بڑا مین گیٹ نظر آتا تھا۔ اول خیر کا خیال صحیح ثابت ہوا۔ اس ہڑبونگ میں گارڈز گیٹ کو چھوڑ کر غائب ہو چکے تھے مگر یہ ممکن تھا کہ باہر وہ مسلح محافظ موجود ہوں مگر اول خیر نے اس طرف پیش قدمی نہیں کی وہ ایک بغلی سمت میں نظر آنے والی گیلری کی طرف دوڑا۔ ہم دونوں کے ہاتھوں میں پستول تھے۔ احاطہ اور بائیں عمارت کے بیچ اس گلی میں کوئی نہ تھا۔ بلاشبہ اول خیر اس عمارت کے چپے چپے سے واقف تھا۔

دفعتاً کسی کے چیخ چیخ کر بولنے کی آوازیں آنے لگیں۔ آواز کا آہنگ سمجھ میں آتا تھا۔ مفہوم نہیں، تاہم لگتا تھا کوئی محافظوں کو خبردار رہنے کی تاکید کر رہا تھا۔ میرا دل سائیں سائیں کرتا کنپٹیوں میں دھڑک رہا تھا۔ اس گلیاری میں ایک سنگل پٹ والا دروازہ تھا جس کے قریب پہنچ کر اول خیر رکا۔ اس پر تالا پڑا ہوا تھا۔ اول خیر نے ایک لمحہ... ضائع کیے بغیر دروازے کے تالے پر اپنے پستول سے دو فائر کیے۔ تالا ٹوٹ گیا، دروازہ کھول کر ہم باہر نکلے... اور پھر اندھا دھند دوڑتے چلے گئے۔ اس دروازے کے عقب میں کتوں کے بھونکنے کی آوازیں سنائی دیں۔ ہم عمارت کی جنوبی دیوار سے باہر نکلے تھے اور اب ہمارا رخ اس طرف تھا جہاں ارشد جیپ میں ہمارا انتظار کر رہا تھا۔

وہاں پہنچے تو اس کے چہرے پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں۔

جیپ میں سوار ہوتے ہی ارشد نے بغیر دوسرا سانس لیے جیپ اسٹارٹ کر کے ایک طوفانی جھٹکے سے آگے بڑھا دی۔

''کیا ہوا چھوٹے استاد؟'' بالآخر ایک موڑ کاٹتے ہی... مین شاہراہ کی طرف تیز رفتاری سے جیپ دوڑاتے ہوئے ارشد نے اول خیر سے پوچھا۔

''معاملہ سنگین حد تک بگڑ گیا تھا۔ زندگی تھی جو بچ کر نکل آئے۔'' اول خیر نے جواب دیا مگر میری تفتیشی نظروں نے ارشد کے چہرے سے کچھ اور بھی بھانپ لیا تھا۔ اب پتا نہیں یہ میری حد سے بڑھی ہوئی صلاحیت تھی یا حالات کی ستم ظریفی تھی ارشد کے چہرے کا اڑا اڑا رنگ... کسی بھی طور موجودہ صورتِ حال کی خطرناکی کے باعث نہیں محسوس ہو رہا تھا اور بالآخر میرا اندازہ درست ثابت ہوا۔ اول خیر کے جواب میں وہ سرسراتے.... لہجے میں بولا۔

''چھوٹے استاد! ایک معاملہ یہاں بھی سنگین ہو چکا ہے۔'' اس کے انکشاف کرنے والے سنسنی خیز انداز نے اول خیر سے زیادہ مجھے چونکنے پر مجبور کیا۔

''کیا بات ہے، کیا کہنا چاہ رہے ہو ارشد؟'' اول خیر نے بظاہر سرسری لہجے میں پوچھا جبکہ وہ خود بھی متفکر اور پریشان سا نظر آ رہا تھا۔ مقصد کی ناکامی اپنی جگہ مگر چودھری ممتاز کے جواں سال بیٹے کی حادثاتی موت... یقیناً معمولی واقعہ نہ تھا اگرچہ بدنصیب فرخ اپنی ہی بہن نوشابہ کی گولی سے ہلاک ہوا تھا جو اس کے غیر معمولی جوش اور غیر ارادی حرکت کا شاخسانہ ہی تھا۔ مگر ظاہر ہے اس کی وجہ ہم ہی تھے اور یقیناً ہلاکت بھی میرے کھاتے میں ڈالی جانے والی تھی۔ اول خیر کا بدستور پرتشویش نظر آتا چہرہ بھی اس بات کا غماز تھا مگر ارشد بیچارے نے ہمیں ایک نئی فکر میں ڈال دیا تھا، وہ بولا۔

''چھوٹے استاد! تم دونوں کا اب یہیں رہنا خطرے سے خالی نہ ہوگا۔'' اس نے جیسے دھماکا کیا۔

اول خیر کے چہرے پر یکلخت سناٹا طاری ہو گیا۔ وہ بغور اس کے چہرے کی طرف دیکھ کر بولا۔ ''کیا مطلب؟ خیریت ہے؟''

''یارو کا فون آیا تھا۔'' ارشد بولا۔ ''پچھلے والا راز... اب راز نہیں رہا چھوٹے استاد؟''

میرے دل کی دھڑکنیں جیسے یکلخت تھم گئیں۔ اول خیر کا چہرہ تو یکدم تاریک پڑتا چلا گیا... کئی ثانیے تو اس کے منہ سے کوئی آواز ہی نہ برآمد ہو سکی۔ جب وہ بولا تو مجھے اس کی آواز تک بدلی ہوئی اور گویا کہیں بہت دور سے آتی محسوس ہوئی۔

"یہ... یہ... کیا کہہ رہا ہے تو... ارشد؟"

"میں ٹھیک کہہ رہا ہوں چھوٹے استاد۔" ارشد نے بیک ویو مرر پر ایک نظر ڈالی اور پھر سامنے دیکھتے ہوئے بولا۔

"پتا نہیں کس طرح ابھی ایک گھنٹا پہلے بڑے استاد کھیل دادا کی اچانک جنجتے سے مڈبھیڑ ہوگئی تھی۔ اس نے اسے قابو کرنے کی کوشش کی تھی، دونوں کے درمیان زبردست مارا ماری بھی ہوئی مگر جنجتا بڑے استاد کو جل دے کر فرار ہونے میں کامیاب ہو گیا۔ چھوٹے استاد! تیرے تجھ پر بہت احسانات ہیں تو اب یہاں سے کہیں دور چلا جا... تجھ پر بیگم صاحبہ سے غداری کرنے کا راز افشاں ہو چکا ہے... کوئی شک نہیں، بڑا استاد (کھیل دادا) بیگم صاحبہ کے حکم پر تیری تلاش میں نکل بھی چکا ہو۔"

یہ سب سن کر اول خیر پر عجیب سا دورہ پڑ گیا۔ وہ ارشد کے برابر والی سیٹ پر موجود تھا۔ اچانک اس نے ڈیش بورڈ پر اپنا سر مارنا شروع کر دیا۔ ارشد نے گھبرا کر جیپ کو بریک لگا دیے اور مجھ سے چلا کر بولا۔ "چھوٹے استاد کو سنبھالو... شہزی...!"

میں خود سناٹے کی کیفیت میں تھا اور عقبی سیٹ پر موجود تھا۔ فوراً اٹھ کر اول خیر کو سنبھالا دینے لگا۔ "حوصلہ کر میرے یار! تو تو بڑا دل گردے والا آدمی ہے یار۔" میں نے کہا اور ساتھ ہی ارشد سے بولا۔

"جیپ آگے بڑھاؤ، رکو مت۔" اس نے فوراً جیپ آگے بڑھا دی۔ اب پتا نہیں وہ کہاں جا رہا تھا۔ یہ میں نے اس کی صوابدید پر چھوڑ دیا تھا۔ مجھے ایک نئی پریشانی لاحق ہو گئی تھی۔ پریشانیوں اور مصیبتوں کے انبار میں چھپنے والی پریشانی سب پر حاوی تھی۔ یہ سنگین نوعیت کا راز بھی ایسے وقت میں آشکار ہوا تھا جبکہ میں اور اول خیر ایک ناکام مہم سے واپس لوٹ رہے تھے جہیں فوراً بیگم صاحب کی پناہ درکار تھی۔

اول خیر کو میں نے بڑی مشکل سے سنبھالا تھا۔ ڈیش بورڈ سے سر ٹکرانے سے اس کی پیشانی متورم اور سرخ نظر آ رہی تھی۔ ارشد جیپ دوڑاتا ہوا ملتان کے کہیں نواح میں آ گیا تھا اور ایک نیم ویرانے کی طرف جانے والے کچے نشیبی راستے پر ہو لیا تھا پھر ایک ویرانے میں نظر آنے والی کھنڈر نما عمارت کے پاس پہنچ کر اس نے جیپ روک دی۔

"یہ اچھا نہیں ہوا... کاکے... یہ بالکل بھی اچھا نہیں ہوا کاکے یار..." اول خیر بار بار غشی میں اپنا سر ہلاتے ہوئے بھی گردان کرتا جا رہا تھا۔ میں نے ارشد کو گرد و پیش پر نظر رکھنے کی تاکید کی اور ایک بار پھر اول خیر کی طرف متوجہ ہو کر بولا۔

"یار اول خیر! تجھے کیا ہو گیا ہے؟ تو تو خود جینے کا حوصلہ دینے والوں میں سے تھا۔ مشکل اور نازک ترین لمحات میں بھی... تو مسکرانے والا آدمی تھا۔ حوصلہ کر یار! ہم اس کا کچھ نہ کچھ حل سوچ لیتے ہیں۔ تو اتنی سی بات پر پریشان ہو گیا ہے۔ مجھے دیکھ... میں تو خطرناک معاملات میں بے گناہ ہی پھنستا چلا جا رہا ہوں، دگرگوں حالات کی دلدل سے باہر نکلنے کی جتنی کوشش کرتا ہوں اتنا ہی اندر دھنستا چلا جاتا ہوں۔ مگر پھر بھی میں نے ہمت نہیں ہاری ہے۔ سینہ سپر کیے ہوئے ہوں... حالات کے سامنے ڈٹا ہوا ہوں اور پھر یار... یہ سب میں نے تجھ سے ہی تو سیکھا ہے۔" میرا لب و لہجہ کچھ جذباتی سا ہونے لگا تھا جس کی اثر پذیری نے اول خیر کو بھی رقت زدہ سا کر دیا، وہ بے اختیار میرے گلے لگ کر بولا۔

"او خیر... کاکے! جیتا رہے... پر میں بھی موت سے نہیں ڈرتا۔ اور تجھے کی زندگی بچا کر مجھے کوئی پچھتاوا نہیں... میرا ضمیر بھی مطمئن ہے۔ پر یار! غداری کا ٹھپہ مجھے قبول نہیں ہے۔ میں نے بیگم صاحب سے وفاداری کا دم بھرا تھا۔ ان کا حکم تھا کہ تجھے کو کالی باڑی میں لے جا کر خاموشی سے ہلاک کر دیا جائے۔ مگر یہ میرے لیے کڑا امتحان تھا۔ ایک طرف بیگم صاحب کا حکم اور دوسری طرف محسن تھا میرا۔ تجھے نے ایک موقع پر اپنی جان خطرے میں ڈال کر میری جان بچائی تھی۔ میں اسے اپنے ہاتھوں سے کیسے مار سکتا تھا۔ اسے تو پتا بھی نہ تھا کہ میں اسے کالی باڑی کیوں لایا ہوں... نہیں... یار! کاکے! اب مجھے خود کو بیگم صاحب کے سامنے ایک مجرم اور غدار کی حیثیت سے پیش ہونا پڑے گا اور اس کی سزا بھگتنا ہوگی۔"

میں نے پھر اسے حوصلہ دیتے ہوئے کہا۔ "یار! مجھے نہیں لگتا کہ بیگم صاحب تیرے اس جرم میں کوئی بڑی سزا دے سکتی ہیں۔ میں خود انہیں سمجھانے کی کوشش کروں گا کہ تیرے اور تجھے کے درمیان احسان مندی اور محسن والا معاملہ تھا۔ یہ ایک بڑا امتحان ہوتا ہے اول خیر! اپنے محسن کو ہلاک کرنے والا تو انسان بھی کہلانے کے لائق نہیں ہوتا۔ تجھے کو بچا کر تو نے ایک لائق تحسین کام کیا تھا۔ مجھے پوری امید ہے اگر بیگم صاحب کو اصل حقیقت کا علم ہو گیا تو وہ تجھے معاف کر دیں گی۔ وہ میری بات نہیں ٹالیں گی۔"

میں نے دیکھا اب اس کے ستے اور پژمردہ چہرے پر کچھ رونق اور طمانیت بھرے تاثرات ابھرے تھے۔ مگر ارشد مطمئن نظر نہیں آرہا تھا۔ "یار شہزی! تو کہیں چھوٹے استاد کو مروا نہ دینا۔ بیگم صاحب کے مزاج کو تجھ سے بہتر ہم جانتے ہیں... اپنے حکم سے سرتابی کرنے والا چاہے ان کا جتنا قریبی ساتھی ہو... وہ اسے کسی صورت میں بھی معاف نہیں کرتی ہیں۔" پھر وہ اول خیر کے پُرسوچ چہرے کی طرف دیکھتے ہوئے بولا...... "تم کیا بڑے استاد گھیل دادا کا وہ حشر بھول گئے، جب ایک ذرا سی غلطی پر بیگم صاحب نے انہیں دھنک کر رکھ دیا تھا تو پھر یہ اتنی بڑی بات وہ کیسے درگزر کرسکتی ہیں۔ نہیں چھوٹے استاد، نہیں... میں تمہیں واپس بیگم ولا نہیں جانے دوں گا۔ تم ایسا کرو... یہ صوبہ ہی چھوڑ دو۔ سندھ چلے جاؤ وہ کشمور میں میرا ایک دوست ہے زندگی رہی تو ملتے رہیں گے۔"

ارشد کی اس بات پر کہ بیگم صاحب نے گھیل دادا جیسے گرانڈیل آدمی کو ایک ذرا سی غلطی پر دھنک کر رکھ دیا تھا، میں حیران ہوا تھا۔ یہ بات غلط بھی نہیں ہوسکتی تھی ظاہر ہے اول خیر کو یہ معلوم ہوگا مگر مجھے حیرت اس بات پر ہوئی تھی کہ ایک بظاہر نازک سی نرم نظر آنے والی بیگم صاحب... اتنی جابر صفت فطرت کی مالک کیسے ہوسکتی تھیں؟

اول خیر نے ارشد کی طرف دیکھ کر کہا۔ "جانے کو تو میں کہیں بھی چلا جاؤں گا مگر تم یاروں سے کٹ کر زندگی گزارنا بھی میرے لیے موت ہی کے برابر ہے اور پھر یہ کاکا بھی تو ہے... یہ تو بے چارہ حالات کی دلدل میں دھنسا ہوا ہے۔ نہیں... یار نہیں، تو چل بیگم ولا... جو ہوگا دیکھا جائے گا۔"

ارشد دوبارہ فکرمند ہوگیا پھر اس نے ایک الجھی ہوئی نظر میرے چہرے پر ڈالی۔ یوں لگتا تھا جیسا وہ کوئی بات کہنے سے کترا رہا ہو۔ بالآخر اس نے اول خیر سے اشلوک میں جو بات کہی اس نے مجھے ایک بار پھر چونکنے پر مجبور کردیا۔ وہ اول خیر کو مخاطب کر کے بولا۔

"چودھری ممتاز خان کا بیٹا بھی قتل ہوگیا ہے چاہے ہمارے ہاتھوں نہ سہی... مگر اس کے ذمے دار بہرحال آپ ٹھہرائے جائیں گے۔ جانتے ہو... فرخ... کا بیگم صاحب سے کیا رشتہ ہے؟ بیگم صاحب نے چودھری ممتاز کے ساتھ دشمنی میں اب تک کیوں کسی خون خرابے کی نوبت نہیں آنے دی تھی اس کی وجہ بھی تم جانتے ہو۔ میں سمجھتا ہوں اس کا بھی تمہیں بیگم صاحب کے سامنے جواب دہ ہونا پڑے گا۔ آخر ہم ان سے کن کن مسائل اور باتوں کی صفائیاں اور تاویلیں پیش کرتے رہیں گے؟"

"بیگم صاحب کا فرخ سے کیا رشتہ تھا؟" میں نے فوراً ارشد کی بات اچک کر پوچھا۔ ارشد نے جواب دینے کے بجائے اپنا منہ دوسری طرف پھیر لیا۔ مگر اول خیر نے ایک گہری ہنکاری خارج کرتے ہوئے مجھ سے کہا۔

"کاکے... شاید اب ضروری ہوگیا ہے کہ تجھے بیگم صاحب کے بارے میں زیادہ نہیں تو تھوڑی بہت آگاہی دے دی جائے۔"

وہ ذرا رکا۔ میں دھڑکتی نظروں سے اس کے چہرے کی طرف دیکھتا رہا۔ بیگم صاحب سے متعلق جانکاری کا تو میں خود بھی بے چینی سے منتظر تھا۔ پھر اول خیر میری طرف دیکھ کر انکشاف کرنے کے انداز میں بولا۔

"کاکا! مقتول فرخ... بیگم صاحب کا بھتیجا تھا۔ بھتیجا۔"

یہ سن کر میں کئی ثانیے دم بخود سا رہ گیا۔ یہی بات تھی مجھے اپنے کانوں پر یقین نہ آیا کہ اول خیر نے یہ کیسا ناقابل یقین انکشاف کیا تھا۔

"کک... کیا تمہارا مطلب ہے... چودھری ممتاز... بیگم صاحب کا بھائی ہے؟"

"ہاں کاکے۔" اول خیر نے بولنے سے سر کو اثباتی جنبش دی۔

"یہ بڑی لمبی اور لرزہ خیز کہانی ہے۔ اب تو بتا... تیرا ذہن کیا کہتا ہے؟ اس بار تو یار ہم دونوں ہی بُرے پھنسے ہیں۔ لگتا ہے حالات کی تیز دھار کا یہ آخری وار ہے... آر یا پار۔"

مجھے خود چپ سی لگ گئی تھی۔ بیگم صاحب کی شخصیت اب تک میرے لیے اسرار بھری ہی تو تھی۔ تاہم میں نے حوصلہ افزا لہجے میں کہا۔

"فرخ کی موت کا ہمیں بھی دکھ ہے۔ وہ ایک معصوم، بے گناہ لڑکا تھا مگر تقدیر کے کھیل بھی نرالے ہوتے ہیں۔ گیہوں کے ساتھ گھن بھی پسنے والی مثالیں ایسے ہی تو نہیں رائج ہوجاتی ہیں مگر فرخ بہرحال ہمارے ہاتھوں قتل نہیں ہوا، اس کی بہن تو شاہدہ نے امارت بچنے کی کوشش کی تھی۔ یوں بھی ہمارا ارادہ کسی کو ہلاک کرنے کا نہ تھا۔ وقت بہت ضائع ہوگیا ہے۔ ہمیں اب تک بیگم ولا پہنچ جانا چاہیے تھا۔ اگر ہم بیگم صاحب سے دور رہے تو وہ بھی یہی سمجھیں گی کہ فرخ کا قتل واقعی ہمارے ہاتھوں ہوا ہے۔"

اول خیر کو میری بات سمجھ میں آ گئی مگر ارشد مطمئن نہیں تھا۔ تاہم اول خیر نے اسے بھی اپنے حتمی فیصلے سے آگاہ کر دیا۔ ہم نے اللہ کا نام لیا اور وحشت کی سوچوں اور وسوسوں کے ساتھ بیگم ولا کی طرف روانہ ہو گئے۔

☆☆☆

ابھی ہم ملتان کے قدرے مضافات میں ہی تھے کہ ہمیں ایک ناکے پر پولیس کی خاصی تعداد نظر آ گئی۔ وہ ہر آنے جانے والی گاڑیوں کو سختی کے ساتھ چیک کر رہے تھے۔ ارشد نے فوراً جیپ روکے بغیر یوٹرن لے کر واپسی کے لیے موڑ دی۔

''لگتا ہے پورے شہر کی ناکا بندی کر دی گئی ہے۔ شہر میں اسی طرح کی چیکنگ ہو رہی ہو گی۔'' ارشد نے کہا۔ اول خیر بولا۔

''تم ایسا کرو... کالی باڑی والے ٹھکانے کی طرف نکل چلو... سردست وہی محفوظ جائے پناہ ہو سکتی ہے ہمارے لیے۔'' جواباً ارشد بولا۔

''کالی باڑی جانے کے لیے سیدھے راستے پر جانا خطرناک ہو گا ہمارے لیے... ایک لمبا اور نسبتاً محفوظ راستہ اختیار کرنے پڑے گا جبکہ گاڑی میں فیول بھی ختم ہونے والا ہے۔''

''کسی روڈ سائڈ پمپ سے فیول بھروا لیتے ہیں۔ ہم دوسرا راستہ ہی اختیار کریں گے۔'' میں نے کہا۔ اول خیر نے میری بات سے اتفاق کیا تو ارشد نے جیپ کی رفتار یک دم بڑھا دی۔

بدنصیب فرخ کسی معمولی شخصیت کا بیٹا نہ تھا۔ چودھری ممتاز کی اپنے جواں سال بیٹے کی موت پر کیا حالت ہو رہی ہو گی اس کا ہمیں بھی اندازہ تھا اور اس بات کا بھی کہ... یہ میرے سوا اور کسی کی حرکت نہیں ہو سکتی۔ وہ اس بات کو بھی خاطر میں نہیں لائے گا کہ ہم صرف عابدہ اور ریحان ملک کے اغوا کے جواب میں اس کے بیٹے کو ہرگز قتل کرنا نہیں چاہتے تھے بلکہ اسے صرف اغوا کرنا چاہتے تھے۔ اس بات کا بھی اسے اپنی بیٹی فوشابہ کے ذریعے علم ہو چکا ہوگا کہ اس کے بھائی فرخ کی موت اسی کے پستول سے چلنے والی گولی سے ہوئی ہے۔ جو غلطی سے فرخ کو لگ گئی تھی چودھری ممتاز اس کا ذمے دار بھی مجھے ہی ٹھہرائے گا۔ اس نے پورے شہر کی انتظامیہ کو میری تلاش میں چپے چپے پر چوکس کھڑا کر دیا ہو گا۔ جبکہ یہ انکشاف ہونے ہی کہ مقتول فرخ بیگم کا بھتیجا ہے عین ممکن تھا چودھری ممتاز... اپنی بہن

بیگم صاحبہ کے خلاف بھی فوری طور پر قانونی ایکشن لے لے۔ جس کا مسئلہ الگ گلے کو آن اٹکا تھا۔ ادھر مجھے عابدہ کی بھی فکر لاحق تھی جو اب انتقام میں چودھری ممتاز اسے دوبارہ اپنے گھناؤنے انتقام کا نشانہ بنا سکتا تھا اور آسیہ کا منگیتر ریحان ملک کی زندگی سے بھی مجھے مایوسی ہونے لگی۔ حالات کی اس چوکھی میں کون میری اس فریاد پر کان دھرنے کے لیے تیار ہوتا کہ... اس میں سارا قصور... چودھری ممتاز خان کا ہی تھا۔ عابدہ کا اغوا اور پھر اسے اپنے اوباش غنڈوں کے حوالے کرنا... جنگ کی ابتدا اسی نے کی تھی۔

جس سڑک پر ہم رواں تھے وہ ڈبل ہائی وے روڈ تھی، گاڑی میں پیٹرول ڈلوانے کے لیے ہمیں چند کلومیٹر پر ڈبل روڈ پر آنا پڑتا مگر وہاں جانے سے ہم کترا رہے تھے، ممکن تھا پولیس ملتان کے نواح میں بھی ہماری تلاش میں لگی ہو۔ ارشد کا خیال یہی تھا کہ اس ذیلی سڑک پر تھوڑا آگے جا کر دیکھ لینا چاہیے... اس کے مطابق بے رونق سائڈ پر کوئی پیٹرول پمپ نہیں تو کسی آٹو مکینک کے گیراج سے بھی ایرانی ساختہ پیٹرول مل سکتا تھا۔

اس کا خیال صحیح ثابت ہوا، چند کلومیٹر کے فاصلے پر بالآخر ہمیں ایسے آٹو مکینک کا گیراج نظر آ گیا مگر وہاں پہنچتے پہنچتے ہماری جیپ کا انجن بھی کھڑکھڑا کر بند ہو گیا۔ وہاں بڑے بڑے مختلف آئل کے ڈرم رکھے ہوئے تھے۔ گیراج کا مالک پکی عمر کا آدمی تھا۔ اس سے معاملہ طے کیا گیا۔ ایک بڑے ڈرم کے سوراخ میں اس نے چند پمپ نما نکا ڈال کر ڈرم سے ہماری جیپ کی ٹنکی میں پیٹرول منتقل کیا۔ یہ خودکار نہیں بلکہ مینوئل طریقہ تھا پیٹرول بھرنے کا اس لیے نصف گھنٹے سے زائد کا وقت صرف ہو گیا۔

کام ہو گیا اور ہم روانہ ہو گئے۔ آگے جا کر ہمیں یہ ذیلی سڑک بھی چھوڑ کر بنجر زمینوں اور اجاڑ ویرانوں سے راستہ بناتے ہوئے کالی باڑی کے ٹھکانے پر جا پہنچے۔ یہاں میں آج پہلی بار آیا تھا۔ بظاہر یہ جگہ پولٹری فارم کی مستطیل نما عمارت سے مشابہ تھی۔ یہ پولٹری فارم تھا۔ مرغیوں کی کٹ کٹ اس ویرانے میں عجیب آہنگ پیدا کر رہی تھی۔ مرغیوں کو دی جانے والی فیڈ اور ان کے پروں کی مخصوص بو میرے نتھنوں سے ٹکرائی۔ دو آدمی بھی وہاں موجود تھے، یہ اول خیر کے ساتھی ہی تھے جو بظاہر چوکیدار نظر آتے تھے مگر اصل میں تربیت یافتہ تھے۔ اول خیر نے ان سے کچھ کہا۔ انہوں نے ہاتھ کے اشارے سے ہمیں

ایک کیراج نما راستے پر مڑ کر رکا جس کا کوئی گیٹ نظر نہیں آ رہا تھا۔ یہ جگہ اندر تک گہری تھی جیپ اگر یہاں کھڑی ہوتی تو بیرونی سمت سے کسی کو نظر نہ آتی۔ جیپ کو روک کر ہم سب نیچے اتر آئے۔

ایک آدمی غائب ہو گیا جبکہ دوسرا فوراً ہماری طرف بڑھا۔ دوسرے آدمی کے اچانک چلے جانے پر اول خیر ہی نہیں ارشد کو بھی میں نے چونکتے دیکھا تھا۔ میں اس کی وجہ سمجھنے سے قاصر تھا۔

"یہ ماجا کدھر غائب ہو گیا؟" اول خیر نے موجود کارندے سے شاید اس کے بارے میں دریافت کیا تھا۔ وہ جواباً ایک عجیب سی نظر مجھ پر ڈالنے کے بعد بولا۔

"وہ بڑے استاد کو تمہاری آمد کی اطلاع دینے گیا ہے۔ بڑے استاد کا یہی حکم ہے۔ اس کا اندازہ تھا کہ تم لوگ ادھر کا ہی رخ کرو گے۔" اس کی بات پر ہم تینوں یکلخت سناٹے میں آ گئے۔ گویا ہمیں اپنے لوگوں سے بھی انجانا سا خطرہ محسوس ہونے لگا... کھبل دادا کی ہم سے پہلے یہاں غیر متوقع آمد خالی از علت نہ تھی۔

"تم ادھر ہی رکو اول خیر... میں پہلے جا کر کھبل دادا سے بات کرتا ہوں۔" میں نے ان دونوں کو پریشان دیکھ کر کہا۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ یہ دونوں کھبل دادا جیسے اکھڑ مزاج اور رعونت پرور آدمی سے الجھیں۔

"او... خیر... کا کے..." اول خیر نے میرا کاندھا تھپک کر کہا۔ "اول خیر ابھی اتنا کمزور نہیں ہوا کہ اپنے ہی لوگوں سے چھپتا پھرے... آؤ۔" اس نے قدم بڑھا کر موجود آدمی سے پوچھا۔ "کدھر ہے وہ...؟"

"آؤ میرے ساتھ۔" اس نے ایک طرف چلنے کا اشارہ کیا۔ جانے کیوں میرا دل تیزی سے دھڑکنا شروع ہو گیا تھا مگر میں نے بھی تہیہ کر رکھا تھا اگر کھبل دادا نے استادی دکھانے کی کوشش چاہی تو... میں بھی اسے نہیں چھوڑوں گا۔"

وہ ہمیں ایک سیلن زدہ خالی کمرے سے گزار کر... پھر ایک دوسرے دروازے سے اندر داخل ہوئے تو ہم چونک پڑے۔ مختصر سے کمرے میں کھبل دادا کیا اکیلا نہیں تھا۔ اس کے ہمراہ تین اور ساتھی بھی موجود تھے۔ یقیناً وہ مسلح بھی تھے اور کھبل دادا سمیت وہ ہماری طرف گھور گھور کر دیکھے جا رہے تھے۔ کھبل دادا کا چہرہ سرخ ہو رہا تھا اور اندر کو دھنسی ہوئی آنکھوں میں غضب کا کینہ بھرا ہوا نظر آتا تھا۔ ہماری آمد کا سن کر وہ کھڑے ہو گئے۔ وہ آدمی بھی موجود تھا

جس نے اسے ہمارے بارے میں مطلع کیا تھا۔ کمرے میں دو کھڑکیاں تھیں۔ ایک روشن دان تھا۔ فرنیچر کے نام پر فقط ایک چارپائی، تین کرسیاں اور چوبی بینچ تھی۔

کھبل دادا آگے بڑھا اور اپنے بدہیئت ہونٹوں کو دانتوں تلے دبا کر ایک زوردار تھپڑ میرے ساتھ کھڑے اول خیر کے چہرے پر جڑ دیا۔ دوسرا تھپڑ مجھے رسید کرنے کے لیے ہاتھ اٹھایا ہی تھا کہ اول خیر نے فوراً سنبھلتے ہی اس کا ہاتھ پکڑ لیا اور سناٹے دار لہجے میں بولا۔

"نہیں استاد! تجھ پر ہاتھ اٹھا لیا... یہ کوئی بے گر کا کے پر تو ہاتھ نہیں اٹھانے گا۔"

اول خیر کی اس جسارت پر کھبل دادا کے حلق سے خونخوار غراہٹ ابھری اور اس نے دانت کچکچا کر اول خیر کو دور دھکیل دیا۔ میں نے کھبل دادا کی طرف پیش قدمی کی تو اس کے تینوں ساتھیوں نے یکلخت پستول نکال لیے۔

"میں بیگم صاحب سے بات کرنا چاہتا ہوں... ابھی۔" یہ کہتے ہوئے میں نے اپنی جیب میں سیل فون نکالنے کے لیے ہاتھ بڑھایا جو میں نے دانستہ آف رکھا تھا۔

"خبردار! کوئی حرکت مت کرنا ورنہ گولی چلا دوں گا۔" تینوں میں سے ایک ساتھی نے غرا کر کہا تو ارشد، کھبل دادا کو تنبیہ کرتے ہوئے بولا۔

"بڑے استاد! خود پر قابو رکھو۔ ہمارے خود یہاں آنے کا مقصد یہی تھا کہ ہم پہلے بیگم صاحب سے فون پر رابطہ کر کے انہیں ساری صورت حال سے آگاہ کر دیں۔ اور تمہاری یہاں پہلے سے موجودگی ہماری سچائی کا ثبوت ہے، کیونکہ تمہیں یقین تھا ہم ادھر ہی آئیں گے۔" ارشد نے دو ٹوک لہجے میں اچھا بات کی۔

"بکواس بند کرو ابھی۔" وہ سانپ کی طرح ارشد کو گھور کر پھنکارا۔ "بیگم صاحب کو سب علم ہے اور انہی کے حکم پر میں یہاں آیا ہوں۔ تم نے اس لونڈے کے کہنے پر چودھری ممتاز کے جوان سال بیٹے کو قتل کر ڈالا۔ کیا تم نہیں جانتے تھے کہ... فرخ... بیگم صاحب... کا..."

"ہم جانتے تھے یہ حقیقت۔" اس بار اول خیر نے کھبل دادا کی طرف دیکھ کر کہا تو کھبل دادا نے ایک وحشیانہ جنبش سے حرکت کی اور قریب کھڑے اول خیر کی گردن اپنے آہنی ہاتھ کے شکنجے میں دبوچ لی۔

"تم غدار... آدمی... تمہیں بولنے کا کوئی حق نہیں ہے۔"

میں نے سنگین نظروں سے دیکھا اول خیر کے چہرے

پر سنسنی خیز سناٹے پھیلتے چلے گئے۔ جن کے پیچھے ایک طوفان بلاخیز امڈ پڑنے کو کروٹیں لیتا محسوس ہو رہا تھا۔ خود میری اپنی حالت اس سے مختلف نہیں تھی۔ بے شک کبیل دادا میری طرح قدآور اور گرانڈیل سہی... اور مقابلتاً اول خیر اس کی قامت سا مار کھاتا تھا مگر اول خیر کا جسم بھی کسی گینڈے کی طرح گٹھا ہوا اور مضبوط تھا مگر شاید کسی تنظیمی مصلحت اور موجودہ حالات کی حساس اور نازک گھڑیوں کا ادراک اول خیر کو کسی جوابی کارروائی سے روکے ہوئے تھا۔

"کبیل دادا! اگر یہ بات ہے تو تم نے بھی عین وقت پر میرا ساتھ چھوڑ کر بیگم صاحب کی حکم عدولی کی تھی۔" میں نے کبیل دادا کی طرف جلتی نظروں سے گھورتے ہوئے کہا۔ "اور دوسری حقیقت یہی ہے کہ... ہم نے فرخ کا قتل نہیں کیا... ہم صرف اسے یرغمال بنانا چاہتے تھے۔ اس کی بہن نوشابہ کی اچانک مداخلت نے سارا کھیل بگاڑ دیا۔ اس نے اپنے پستول سے ہم پر فائر بھی کر ڈالا تھا مگر اس کی چلائی ہوئی گولی غلطی سے اس کے اپنے بھائی کو جا لگی اور وہ موقع پر ہی ختم ہو گیا۔ اس بات کا ہمیں بھی افسوس ہے۔"

اس کے ہاتھوں اول خیر کی بار بار تذلیل مجھ سے برداشت نہیں ہو رہی تھی۔ میں جانتا تھا اول خیر صبر و برداشت کا مظاہرہ کر رہا تھا۔ وہ یقیناً بیگم صاحب کی اور کچھ چھتے کے حوالے سے اپنی کمزوری کے باعث خاموش تھا۔ ورنہ وہ کبیل دادا سے کم نہ تھا۔ تنظیم میں کبیل دادا "بڑا استاذ" کہلاتا تھا تو اول خیر کو "چھوٹا استاذ" کا درجہ حاصل تھا۔

میری بات پر کبیل دادا کے چہرے پر ایک رنگ سا ابھر کے غائب ہوا۔ اس نے اول خیر کو چھوڑ دیا۔ میں نے فوراً گرم ہو کر دوسری چوٹ کی۔

"دیکھا جائے تو اس ساری صورت حال کے ذمے دار تم ہو۔ جب بیگم صاحب نے تمہیں میرے ساتھ بہ تاکید کر کے جنگی خان کے اڈے پر روانہ کیا تھا کہ مجھے کسی صورت میں بھی تنہا نہیں چھوڑنا تو تم کیوں مجھے سنسان سڑک پر اکیلا چھوڑ کر چلے گئے تھے؟ نہ صرف یہ بلکہ تم نے میرے ساتھ باقاعدہ ہاتھا پائی بھی کی تھی... اس لیے بہتر یہی ہے کہ یہ سارے معاملات بیگم صاحب کے سامنے پیش کیے جائیں... تمہاری اس حرکت سے مجھے ذاتی مخاصمت کی بو آ رہی ہے۔"

میری دھواں دھار جوابی کارروائی نے وہاں چند ثانیوں کے لیے پرسوچ سناٹا سا طاری کر دیا۔ میں چاہتا تھا

معلومات عامہ

سردار دیوان سنگھ مفتون غلطی کا اعتراف فراخدلی سے کر لیتے تھے اور ان کے بعض تصرف بہت مزیدار ہوتے تھے۔ ایک مرتبہ انہوں نے اپنے ایک نوٹ میں لکھا کہ مصر براعظم ایشیا کا سب سے بڑا ملک ہے۔ اس قسم کے معاملات میں وہ اکثر مجھ سے مشورہ کر لیتے تھے۔ میں اتفاق سے موجود نہ تھا اور کاپی پریس میں چلی گئی۔

اخبار چھپ کر آیا۔ میں نے سردار صاحب کی اس غلطی کی طرف توجہ دلائی کہ مصر براعظم ایشیا کا سب سے بڑا ملک نہیں بلکہ براعظم افریقہ کا ایک ملک ہے۔ اس پر خوب قہقہے لگائے اور بولے۔ "کاکا، کوئی مضائقہ نہیں۔ جو بات مجھے نہ معلوم ہو وہ پبلک کو کیا معلوم ہوگی۔"

(سردار علی صابری)

ماخوذ از روزنامہ جنگ کراچی۔ مورخہ 3 فروری 75ء

کبیل دادا کے ساتھ آئے وہ تینوں ساتھی بھی یہ حقیقت جان لیں کہ کبیل دادا، اول خیر اور بالخصوص میرے لیے اپنے دل میں کیسے مخاصمانہ جذبات رکھتا تھا۔ آخر کو وہ تینوں پہلے بیگم صاحبہ ہی کے نمک خوار اور وفادار تھے۔ کبیل دادا میری بات کو خاطر میں لائے بغیر تیز لہجے میں بولا۔

"تم اپنی بکواس بند کرو۔ میں اس وقت یہاں بیگم صاحب کے حکم پر ہی ہوں اور میں بیگم صاحب کے سامنے اپنی صفائی اس سلسلے میں پیش کر چکا ہوں کہ تم میری مدد سے عابدہ کو دشمنوں کے چنگل سے چھڑانے کے بعد ہٹ دھرمی کا مظاہرہ کر رہے تھے۔ میری بات نہ ماننے پر تم نے اس کا نتیجہ دیکھ ہی لیا۔ لہٰذا اب تم بھی بیگم صاحب کے سامنے جواب دہ ہو۔ مگر تمہاری باری بعد میں آئے گی، پہلے مجھے اس غدار سے جواب طلب کرنے کا حکم ملا ہے۔" یہ کہتے ہوئے وہ غصیلی نظروں سے اول خیر کی طرف دیکھ کر بولا۔

"تم مجھے بتاؤ گے کہ... چھتے کے سلسلے میں تم نے بیگم صاحب کے ساتھ کیوں جھوٹ بولا تھا؟ یاد رکھو تمہارے غیر تسلی بخش جواب پر مجھے بیگم صاحب کی طرف سے یہ اختیار مل چکا ہے کہ میں خود تمہیں اس جرم کی پاداش میں اسی وقت سزا سے دوچار کر سکتا ہوں۔" اس کی بات نے میرے وجود میں سنسنی کی لہر دوڑا دی۔ کبیل دادا کو اول خیر سے اگر کوئی ذاتی پرخاش تھی بھی تو اس کی وجہ میں ہی تھا کیونکہ سب سے

پہلے اس نے مجھے بیگم صاحبہ سے متعارف کرایا تھا۔ اب اسے اول خیر سے دشمنی نکالنے کا موقع ہاتھ آ گیا تھا۔

''اس سلسلے میں، میں صرف بیگم صاحبہ کے سامنے ہی اس کا جواب دے سکتا ہوں۔'' اول خیر نے کمیل دادا کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ''کیونکہ مجھے تم سے ذاتی عناد کی بو آرہی ہے۔''

اس کی بات پر کمیل دادا نے فوراً اپنی پتلون کی بیلٹ میں اڑسا ہوا پستول نکال لیا اور اس کی نال کا رخ اول خیر کی طرف کر دیا۔ یکلخت میری کنپٹیاں سائیں سائیں کرنے لگیں۔ وہ اس پر پستول تانے ہوئے زہرخند لہجے میں بولا۔

''اول خیر! مجھے جواب دو۔ چھتے کو تم نے کیوں زندہ چھوڑا تھا جبکہ بیگم صاحبہ سے تم نے یہ جھوٹ بولا تھا کہ تم ان کے حکم کے مطابق اسے ہلاک کر چکے ہو؟''

''چھتے کا مجھ پر ایک بڑا احسان تھا۔ وہ میرا محسن تھا۔'' اول خیر نے بالآخر صاف گوئی کے ساتھ بلاخوف جواب دیا۔

''تمہیں یہ حقیقت بیگم صاحبہ کو بتانا چاہیے تھی۔'' کمیل دادا نے اسے گھورا۔

''مجھ میں اس کی ہمت نہیں ہوئی تھی مگر میں سمجھتا تھا محسن کشی کو بیگم صاحبہ بھی پسند نہیں کرتی ہیں اور چھتا میرا محسن تھا۔ دشمنوں کے ساتھ ایک معرکے میں اس نے اپنی جان خطرے میں ڈال کر میری جان بچائی تھی، وہ میرا محسن تھا۔''

''تمہارا جواب غیر تسلی بخش ہے اور سن لو اچھی طرح سے۔'' کمیل دادا کے لہجے سے خوفناک سرسراہٹ مترشح تھی۔ اس کے چہرے سے مجھے خطرناک عزائم کی جھلک صاف نمایاں ہوتی محسوس ہو رہی تھی۔ وہ بولا۔

''مجھے بیگم صاحبہ نے تمہیں فوری گولی مارنے کا حکم دیا ہے اور اس حکم کی تکمیل میں کسی نے بھی آنے کی جرأت کی تو میں بے دریغ اسے بھی گولی مار دوں گا۔'' اس کا اشارہ میری طرف تھا۔

یکلخت میری رگوں میں خون پارے کے مانند گردش کرنے لگا۔ اول خیر کو موت کے منہ میں دیکھ کر میرا روآں روآں جوش سے کانپنے لگا۔ میں اپنی جان کی پروا کیے بغیر اس کے اور اول خیر کے درمیان آ گیا۔ میرا غیر معمولی فراخ سینہ اول خیر کے لیے ڈھال بن گیا اور میں کمیل دادا کے سامنے پورے قد کے ساتھ تن کر کھڑا ہو گیا۔ ہم دونوں کا قد کاٹھ برابر ہی تھا۔ دونوں کے درمیان آنے کے باعث میرا فاصلہ بھی کمیل دادا سے کافی حد تک قریب ہو گیا تھا۔ ہماری پیشانیاں ملنے لگیں بلکہ ناک کی پھنگیاں بھی ایک دوسرے سے ٹکرانے کے قریب ہو گئیں۔ کمیل دادا کی آنکھوں میں مجھے لہو کی جھلک صاف ابھرتی محسوس ہو رہی تھی جبکہ خود میری آنکھوں میں بھی خوفناک عزائم کی جھلک نمایاں تھی۔

''آگے سے ہٹ جاؤ… تم…'' دفعتاً کمیل دادا نے مجھے بدستور سنسناتی ہوئی نظروں سے گھورتے ہوئے ایک ایک لفظ گویا دانتوں تلے چبا کر کہا۔ اس کی اندر کو دھنسی ہوئی آنکھوں میں مجھے اپنے لیے غضب کا کینہ بھرا ہوا دکھائی دیا تھا۔ میں نے بھی تن کر کہا۔

''کمیل دادا! میں خود بھی تم لوگوں کے درمیان نہیں آنا چاہتا ہوں مگر اب یہ معاملہ اور بن چکا ہے۔ مجھے بیگم صاحبہ سے بات کرنے دو۔ وہ شخص تمہارے یک طرفہ بیان پر بھی اتنا بڑا اور کڑا حکم صادر نہیں کر سکتیں۔''

''بہت زعم ہے تمہیں خود پر…'' کمیل دادا زہرخند مسکراہٹ سے بولا۔ ''خاطر جمع رکھو، بعض حساس نوعیت کے معاملات میں بیگم صاحبہ کسی کو بھی خاطر میں نہیں لاتی ہیں، اور تم نے تو ان کے بھتیجے کا قتل بھی کر ڈالا ہے ہٹ جاؤ… ورنہ…''

اس نے یہ کہتے ہوئے تہدیدی انداز میں اپنا جملہ ادھورا چھوڑا اور ادھر میں نے بہ یک جنبش حرکت کرتے ہوئے اس کے پستول والے ہاتھ پر زوردار جھپٹا مارا، مجھ سے اچانک اور اتنی جرأت کی شاید اسے توقع نہ تھی۔ ادھر پستول اس کے ہاتھ سے نکلا اور دوسرے ہی لمحے میرے ہاتھ میں میگا رول آ چکا تھا جس کی نال میں نے اس کی پیشانی سے لگا دی۔

''خبردار! کوئی غلط حرکت مت کرنا دادا… میں بے دریغ گولی چلا دوں گا۔'' میرے لہجے کی زہرناک غراہٹ پر وہ دم بخود سا ہو گیا۔ وہ میری سفاکی کی ایک جھلک جتی خان کے اڈے پر اشرف کے میرے ہاتھوں بے رحمی سے موت کے گھاٹ اترنے کی صورت میں دیکھ چکا تھا۔ اسے معلوم تھا کہ میں پہلے ہی گن بدوشی کی راہ پر گامزن ہو چکا ہوں۔

اس کے عقب میں کھڑے تینوں ساتھی، جارحانہ نظروں سے پستولیں تانے مجھے گھورنے لگے مگر حرکت کرنے کی جرأت کسی نے نہ کی تھی۔ یہ گھڑیاں اچانک ہی نازک اور خطرناک صورت اختیار کر گئی تھیں۔ کسی بھی وقت یہاں خون خرابا ہو سکتا تھا۔ اول خیر اور ارشد کو عجیب سی چپ

لگ گئی تھی۔

تاہم محض چند ثانیوں کی دم بہ خود خاموشی کے بعد میری شکل ہوئی سماعتوں سے اول خیر کی سپاٹ آواز ٹکرائی۔ وہ مجھ سے مخاطب تھا۔

”شہزادے... پستول ہٹا دو۔“

”یہ ہماری جان کا دشمن ہو رہا ہے اول خیر...“ میں نے عقب میں اس کی طرف دیکھے بغیر اور کمیل دادا کے جلتے سلگتے چہرے پر نظریں جمائے ہوئے کہا۔ ”ذاتی عناد نے اسے اندھا کر دیا ہے۔“

”میں کہتا ہوں پستول ہٹا دو اور ایک طرف کھڑے ہو جاؤ۔“ اول خیر اس بار مجھ سے عجیب تحکمانہ لہجے میں بولا۔ ... میں نے بے اختیار ایک گہری سانس خارج کر کے اپنا پستول والا ہاتھ گرا دیا اور ایک طرف کھڑا ہو گیا۔ اول خیر نے کمیل دادا کو مخاطب کر کے کہا۔

”کمیل دادا! یہ وقت ہم سب کے لیے خطرے کا باعث بن سکتا ہے۔ پولیس کی گشتی پارٹیاں ہمیں تلاش کر رہی ہیں۔ ہماری لڑائی سے وہ اس طرف متوجہ ہو سکتی ہیں اور یہ اڈا بھی ان کی نظروں میں آجائے گا۔ میرے سلسلے میں تمہارا فیصلہ کرنے کی عجلت ہم سب کو شبہے میں ڈال رہی ہے۔ بہتر ہوگا بیگم صاحب سے فون پر رابطہ کرا دو۔“

کمیل دادا بھی ایک ہٹ دھرم انسان تھا، وہ دانت بھینچ کر اول خیر سے کوئی سخت جملہ کہنا چاہتا تھا مگر اچانک اس کے عقب میں کھڑے ایک ساتھی نے تو اپنا ایک ہاتھ کمیل دادا کے کندھے پر رکھ دیا اور ساتھ ہی مؤدبانہ جرأت سے بولا۔

”دادا! میرا خیال ہے بیگم صاحب سے بات کر لی جائے۔“ اپنے ساتھی کے معترض ہونے پر ہی کمیل دادا کچھ سوچنے پر مجبور ہوا تھا۔

”ٹھیک ہے، میں خود بات کر لوں گا۔“ یہ کہتے ہوئے اس نے اپنی جیب سے سیل فون نکالا... نمبر پنچ کرنے لگا۔ میری اور اول خیر کی دھڑکتی نظریں اس کے چہرے پر جمی ہوئی تھیں۔

”ہیلو، بیگم صاحب!“ رابطہ ہوتے ہی دم بہ خود سناٹے میں اس کی مؤدبانہ آواز ابھری۔ ”وہ تینوں یہاں کالی پاڑی والے ٹھکانے میں موجود ہیں اور اپنی صفائی میں کچھ کہنا چاہتے ہیں۔“ اس نے کہا پھر دوسری طرف سے وہ کچھ سنتا رہا۔ میرا دل سائیں سائیں کرنے لگا، کنپٹیوں پر دھڑک رہا تھا کہ نجانے اب بیگم صاحبہ اپنے مقرب خاص کا یہ رویہ دیکھ کر دادا کو کون سا حکم صادر کرنے والی تھیں؟

”اس سلسلے میں ان کا کہنا ہے کہ یہ قتل انہوں نے نہیں کیا... ان کا مقصد صرف فرخ کو اغوا کرنا تھا مگر اس کی بہن نوشابہ کی مداخلت اور اس کی چلائی ہوئی گولی سے فرخ کی موت واقع ہوئی ہے... جی... بیگم صاحب... بہت بہتر... دیکھیے بات...“

کمیل دادا نے فون کان سے لگائے ہوئے میری طرف ترچھی نظروں کے ساتھ گھور کر آخر میں کہا اور پھر سیل فون میری طرف بڑھا دیا۔ میں نے دھڑکتے دل سے فون لیا اور اپنے کان سے لگا لیا۔ ”جی بیگم صاحبہ! مجھے بے حد دکھ ہے کہ...“

”شہزادے!“ دفعتاً دوسری جانب سے بیگم صاحب کی آواز نے میری بات کاٹ دی۔ ان کی آواز میں آج بجلی

حل

ہارون رشید درباریوں میں گھرا بیٹھا تھا، حاضرین کی شربت سے تواضع کی جا رہی تھی۔ شراب سے پُر جام سونے کے تھے، ایک پریشان حال درباری کی نیت میں فتور آ گیا اور اس نے سونے کا جام اپنی ڈھیلی ڈھالی آستین میں چھپا لیا۔ لیکن ہارون رشید کی تیز نظروں نے اس چوری کو دیکھ لیا۔

جب محفل برخاست ہونے لگی تو ساقی نے بآواز بلند حاضرین محفل کو مطلع کیا۔ ”صاحبان! ایک جام چوری ہو گیا ہے، کوئی درباری باہر نہ جائے۔ فرداً فرداً تلاشی لی جائے گی۔“

جس نے جام چرایا تھا، اس کی حالت بری ہونے لگی، ہارون رشید نے زیرِ لب نظروں سے اس کی قابل رحم حالت کا احساس کر دیا تھا۔ تھوڑی سی اندرونی کشمکش میں مبتلا رہنے کے بعد ہارون کھڑا ہو گیا۔ اس نے حکم دیا۔ ”سب کو تلاشی لیے بغیر جانے دیا جائے۔“

ساقی نے دبی آواز میں کہا۔ ”لیکن امیرالمومنین! وہ سونے کا جام۔“

ہارون نے جواب دیا۔ ”ہاں، میں بھی جانتا ہوں کہ سونے کا ایک جام چوری ہو گیا ہے لیکن اس میں دشواری یہ ہے کہ جس نے چرایا ہے، وہ ماننے کا نہیں اور جس نے دیکھا ہے وہ بتانے کا نہیں اس لیے اس کا بہترین حل یہی ہے کہ اس پر پردہ پڑا رہنے دیا جائے۔“

بجگر سے دانش نواز کا ذوق

بار میں نے اپنے لیے درشتی کی لہر اور تحکمانہ پن محسوس کیا مگر مرعوب میں کبھی نہیں ہوا تھا۔ تاہم ان کی آواز ابھرتے ہی میں خاموش ضرور ہو گیا تھا۔

"یہ سب تمہاری جلد بازی اور میرے مشوروں سے انحراف کرنے کا نتیجہ ہے۔ جب تمہارا عابدہ کو چھڑانے کا مقصد پورا ہو چکا تھا تو تمہیں کبیلی کا مشورہ مان لینا چاہیے تھا مگر تم خود کو میس مار خان سمجھتے ہو ہر وقت... تم نے میرے اہم آدمی کے ساتھ ہاتھا پائی تک کر ڈالی۔"

"بیگم صاحب..." میں نے کچھ کہنا چاہا مگر وہ بدستور درشت لہجے میں میری بات کاٹ کر کہتی رہیں۔ "میں نے تمہیں کبھی اپنے ایک ادنیٰ کارکن کی حیثیت نہیں دی بلکہ دوست کا رتبہ دیا اور تم ہو کہ اتنے منہ چڑھ گئے ہو کہ میری کسی بات کو خاطر میں ہی نہیں لاتے... آج مجھے یہ دن بھی دیکھنا پڑا... جانتے ہو فرخ کون تھا... وہ میرا پیارا بھتیجا ہے... سیدھا سادہ... میری گودوں میں کھیلا ہوا تھا وہ..."

ان کا دھواں دھار لہجہ رقت کے غبار میں لپٹنے لگا۔ میں نے درمیان میں کہا۔

"مگر یہ ہم نے نہیں کیا۔"

"اس صفائی کے لیے مجھے ثبوت چاہیے۔" وہ بولیں۔ "فرض کرو اگر یہ بات مان بھی لی جائے تو پھر بھی ذمے داری تم پر اور اول خیر پر ہی آتی ہے اس قتل کی... اور اول خیر... اس غدار سے تو کبیلی دادا ابھی نمٹ لے گا۔ کبیلی دادا کو فون دو... اس نے ابھی تک اول خیر کو زندہ کیوں چھوڑ رکھا ہے... فون دو... کبیلی دادا کو..."

"بیگم صاحب...! پلیز ہم پہلے ہی خطرے میں گھرے ہوئے ہیں۔ اول خیر آپ سے کچھ کہنا چاہتا ہے۔ اس کی بات تو سن لیں تم۔"

"میں کہتی ہوں کبیلی دادا کو فون دو شہزاد... احمد خان۔" بیگم صاحبہ پر وحشیانہ جنون سا طاری تھا۔ وہ میری بھی کوئی بات... کوئی تاویل سننے کو تیار نہ تھیں۔ شاید اپنے بھتیجے کے قتل کے باعث شدید غم سے ان کی یہ حالت ہو رہی تھی۔ میں فون کبیلی دادا کو دینا نہیں چاہتا تھا کیونکہ اب کی بار کبیلی دادا... اول خیر کو ہرگز زندہ چھوڑنے کا موقع نہ دیتا اور بیگم صاحبہ کا حکم سنتے ہی فوراً اول خیر کو گولی مار دیتا۔ صورتِ حال بہت عجیب طرح سے ایک دائرے میں پھنس کر رہ گئی تھی مجھے کوئی راہ سجھائی نہیں دے رہی تھی۔ میں سمجھ رہا تھا کہ ان نازک ترین حالات اور معاملات میں بیگم صاحبہ کی ناراضی کا میں متحمل نہیں ہو سکتا۔ یہ میرے لیے نہیں تو اول خیر کے لیے ضرور جان لیوا حد تک خطرناک ثابت ہو سکتی تھی۔ اس وقت جوش نہیں معاملہ فہمی سے کام نکالنے کی ضرورت تھی۔ میں نے اپنے اور بیگم صاحبہ کے اس ناقابلِ فہم اور پُراسرار تعلق کو ہوا دینے کی خاطر جس کے باعث انہوں نے مجھے ایک دوست کا درجہ دیا تھا، بروئے کار لاتے ہوئے... دل کی گہرائیوں کو اپنے لہجے میں سمو کے کہا۔

"بیگم صاحبہ! مجھے آپ کی دوستی پر ہمیشہ فخر رہے گا... میں بھی اس کا اظہار تو نہ کر سکا تھا مگر اس کا ایک عجیب سا احساس ضرور اپنے اندر رکھتا تھا اور اندر ہی اندر مسرور بھی رہتا تھا پلیز... پلیز... بیگم صاحبہ! آپ کی مجھ ناچیز کو عنایت کردہ اس دوستی کا واسطہ دیتا ہوں... صرف ایک بار مجھے آپ اپنا شرف دیدار بخش دیں۔ میں آپ کے سامنے اپنی اور اول خیر کی صفائی پیش کرنا چاہتا ہوں۔ وعدہ کرتا ہوں آپ کو مطمئن کرنے کی کوشش کروں گا اور اگر نہ کر سکا تو آپ کا ہاتھ ہوگا اور میری گردن..."

یہ الفاظ میں نے بہت ملائمت آمیز لجاجت اور نرماہٹ کے ساتھ ادا کیے تھے اور ان کی اثر پذیری کا مجھے پورا یقین بھی تھا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ میں نے خود کو بیگم صاحبہ کی دوستی کی خاطر نہیں بلکہ اپنے یار... اول خیر... کاکا... جیسے محبت سے اپنائیت بھرے انداز میں مجھے پکارنے والے... اول خیر کی بے لوث اور بے مثال دوستی کی خاطر... اس کی جان بچانے کی خاطر... میں نے خود کو بیگم صاحبہ کے سامنے جھکایا تھا۔ دوسری سمت یکلخت خاموشی چھا گئی۔ لہجے کی گھن گرج... طوفان کا پہاڑی آواز کی سائیں سائیں... جیسے عنقا ہوتی چلی گئی۔ کیونکہ کچھ چند ثانیوں کی بیہودہ بھری چپ کے بعد دوسری جانب سے بیگم صاحبہ کی ایک نرماہٹ میں گندھی آواز ابھری جس میں مخصوص گہری نسائیت ہی نہیں بلکہ گم گشتہ محبت کی جھلک بھی محسوس ہوئی تھی۔

"شہزی! تم جتنے پتھر ہو اتنے ہی نرم خو بھی... تمہاری ذات کی بیک وقت سخت گیری اور نرم خوئی سے میں غیر آشنا نہیں ہوں۔ تم میں اور اس میں ذرا بھی فرق نہیں... وہی ایک طرف جن گرجتا شعلہ بار لہجہ اور پھر پل کے پل شبنم کی نرم پھوار برساتا آہنگ۔ میں نے تمہاری اور "اس کی ذات" میں ایک ذرا فرق بھی تو محسوس نہیں کیا اب تک... سچ بتاؤ... شہزی! کیا تم وہی ہو... کیا کیا یہ میری ذو محبت کا شاخسانہ ہے جو تمہیں... نہیں... دوبارہ..." پھر یکلخت ان کی آواز رقت آمیزی کے غبار سے بوجھل ہونے لگی۔ اور

مجھے ایک بار پھر بیگم صاحب سے متعلق اس پُراسرار تھی نے الجھا کر رکھ دیا کہ آخر وہ کون تھا جس کے روپ میں وہ مجھے دیکھا کرتی تھیں یاد کچھنے کی کوشش کرتی تھیں؟ مگر یہ بھی ایک عجیب الجھن آمیز اتفاق ہی ہوتا کہ میں ان سے اس بارے میں کچھ مستفسر ہونے کا یارا نہ رکھ پاتا۔ صورت حال ہی کچھ ایسی ہوتی تھی۔ تاہم میں فقط اتنا ہی کہہ سکا۔

''بیگم صاحب! آپ کے سامنے پیش ہو کر اپنی کچھ صفائی پیش کرنا چاہتا ہوں۔ ایک موقع کی عنایت چاہیے تھی آپ سے۔''

''فون کبیل دادا کو دو۔'' یکلخت دوسری جانب سے بیگم صاحب کی جیسے سنبھلی ہوئی آواز ابھری۔ میں ذرا جھجکا۔ فوراً گداز لہجے میں بولیں۔ ''شہزی! مجھ پر بھروسا رکھو... فون کبیل کو دو۔'' مجھے کچھ تسلی ہوئی۔ میں نے فون کبیل دادا کی طرف بڑھا یا جو بدستور میری طرف پُرخار نظروں سے گھورے جا رہا تھا مگر اب اس کے چہرے کی درشتی میں الجھن کی لکیریں بھی نمایاں تھیں۔

''جی بیگم صاحب...!'' اس نے فوراً فون میرے ہاتھ سے لے کر اپنے کان سے لگا کر مؤدبانہ کہا۔ میری بھانپتی ہوئی نظریں اس کے بشرے پر جم کر رہ گئی تھیں۔ کچھ امید تو تھی کہ بیگم صاحب... کبیل دادا کو ہمارے بارے میں اب کوئی سخت حکم نہیں دیں گی۔

''لل... لیکن... بیگم صاحب...؟''

تھوڑی دیر تک کان سے فون لگائے دوسری جانب سے بیگم صاحب کی بات سننے کے بعد کبیل دادا نے یک دم ان سے کچھ کہنا چاہا تھا مگر شاید دوسری جانب سے اس کی بات سختی کے ساتھ کاٹ دی گئی تھی کیونکہ وہ اب اپنے ہونٹ کاٹنے لگا تھا۔ البتہ لہجہ مؤدبانہ ہی تھا، وہ کہہ رہا تھا۔

''جی... بہتر... بیگم صاحبہ! جیسا آپ کا حکم... لیجیے بات کریں...'' کہتے ہوئے کبیل دادا نے چڑے ہوئے منہ کے ساتھ مجھے دوبارہ فون تھماتے ہوئے بولا۔ ''بات کرو۔''

میں نے ایک بار پھر دھڑکتے دل کے ساتھ فون اس کے ہاتھ سے لیا اور اپنے کان سے لگا لیا۔ ''جی... بیگم صاحب...؟''

''شہزی! کبیل دادا تم سب کو بحفاظت... میرے پاس پہنچا دے گا... لیکن اگر خطرہ محسوس ہوا تو وہ تمہیں کسی اور محفوظ ٹھکانے پر پہنچا دے گا۔ بعد میں مناسب سمجھوں گی تو میں بھی ادھر پہنچ جاؤں گی۔''

میں نے محتاط لہجے میں کہا۔ ''بیگم صاحب! سردست ہمارا ادھر ہی رہنا مناسب رہے گا کیونکہ ہم نے آپ کی طرف لوٹنے کی کوشش چاہی تھی لیکن پولیس کی سخت ناکا بندی کے باعث اول خیر ہمیں یہ سوچ کر کالی باؤلی والے نسبتاً محفوظ ٹھکانے پر لے آیا کہ یہاں پہنچ کر آپ سے ٹیلی فونک واسطہ کر کے صورت حال گوش گزار کر دی جائے گی۔ بیگم ولا کی طرف رخ کرنے کی صورت میں ممکن ہے پولیس انتظامیہ یا چوہدری ممتاز کے آدمیوں کی نظروں میں آ جانے کا احتمال ہو کیونکہ نوشابہ، اول خیر کو پہچان چکی تھی اور ممکن ہے آپ کی رہائش گاہ کی بھی نگرانی کی جا رہی ہو۔''

بیگم صاحب نے میری بات پہ صاد کرتے ہوئے کہا۔ ''ٹھیک ہے، لیکن شہزی! ایک بات مجھے سچ سچ بتانا۔''

''جی... جی... بیگم صاحب! میں آپ سے جھوٹ نہیں بولوں گا۔'' میں نے یک دم کہا۔

تو وہ بولیں۔ ''کیا واقعی فرخ... نوشابہ کے پستول کی گولی سے ہی ہلاک ہوا ہے؟''

''میں قسم کھا کر کہتا ہوں بیگم صاحبہ یہ بات...'' میں نے مستحکم لہجے میں جواب دیا۔

''اچھا ٹھیک ہے پھر... میں کسی وقت خود کالی باؤلی والے ٹھکانے پر پہنچنے کی کوشش کروں گی۔ حالات خراب ہو گئے ہیں، ہمیں مل بیٹھ کر کچھ سوچنا پڑے گا۔ اور اول خیر والا معاملہ بھی نمٹانا ضروری ہے۔'' یہ کہہ کر انہوں نے مجھے فون کبیل دادا کو دینے کا کہا۔ میں نے پُرسوچ انداز میں اپنے ہونٹ بھینچ کر فون کبیل دادا کی طرف بڑھا دیا۔ وہ فون کان سے لگائے چند ثانیوں تک دوسری جانب سے بیگم صاحبہ کی ہدایت لیتا رہا پھر مؤدبانہ انداز میں جی اچھا کہہ کر رابطہ منقطع کر دیا۔

خرانٹ زدہ نظر اس نے اول خیر اور مجھ پر ڈالی اس کے بعد اپنے تینوں ساتھیوں سے مخاطب ہو کے تحکمانہ بولا۔

''تم تینوں ادھر ہی موجود رہو گے۔ یہ خیال رہے، یہ تینوں یہاں سے جانے نہ پائیں۔'' اس کا اشارہ ہماری طرف تھا۔

بیگم صاحب سے خیر سگالی کے انداز میں گفتگو کے باوجود کبیل دادا اپنی پرانی ہٹ پر قائم تھا۔ وہ آگے بولا۔ ''میں بیگم ولا جا رہا ہوں... شاید بیگم صاحبہ کو میرے ساتھ آنا پڑے۔''

اس کے تینوں ساتھیوں نے ہولے سے سر ہلا دیا۔ کبیل دادا... کے رخصت ہونے سے ایک بار پھر ہم پر

ایک نگاہ غلط انداز ڈالی اور رخصت ہو گیا۔

☆☆☆

وقت کو یاد رکھو تو گزر نہیں پاتا، بھولے رہو تو اس کے گزرنے کا پتا نہیں چلتا۔ مگر اس وقت کی ایک ایک گھڑی جیسے ہماری سانسوں کے ساتھ بہت رہی تھی۔ کبیل داوا کے جانے کے بعد کمرے میں چند تانیوں تک گمبھیر سی خاموشی طاری رہی۔ سامنے کھڑے کبیل داوا کے ساتھیوں نے ایک نگاہ ہم پر ڈالنے کے بعد خاموشی سے اپنی کرسیاں سنبھال لی تھیں۔ کبیل داوا کے بعد تنظیم میں چھوٹے استاد کی حیثیت اول خیر کو حاصل تھی مگر جب سے چھپنے والا راز آشکار ہوا تھا، اول خیر کی حیثیت مجرموں کی سی ہو گئی تھی۔ یہی سبب تھا کہ اس کے دو تین تنظیمی ساتھیوں کی نظروں میں اپنے چھوٹے استاد کی اہمیت ختم ہو کر رہ گئی تھی۔ میں اول خیر اور دار شند چرلی کھینچ کر ایک طرف کھسک کر اس پر براجمان ہو گئے۔ ان تینوں سے ہمارا فاصلہ اتنا ضرور تھا کہ اگر ہم دھیمی آواز میں گفتگو کرتے تو وہاں تک نہیں پہنچ سکتی تھی۔

میں نے اول خیر کو بیگم صاحب کے ساتھ ہونے والی گفتگو کے بارے میں بتا دیا تھا۔ مجھے اب اصل فکر... آسیہ کے بجھیتر... ریحان ملک کی طرف سے ہو رہی تھی۔ اس کی زندگی کو خطرہ تھا۔ میرا چہرہ اس فکر میں بجھا بجھا دیکھ کر اول خیر نے مجھے ٹھوکا دیا۔

”کیا ہوا کاکے؟ تیرا چہرہ کیوں یک دم اتر گیا ہے؟“

میں نے اسے اپنی پریشانی کی وجہ بتائی۔ وہ کچھ سوچنے کے بعد تشفی آمیز لہجے میں مجھ سے بولا۔ ”کاکے! اگر ریحان ملک... زبیر خان کا قیدی ہے تو میرا نہیں خیال کہ اس کی زندگی کو خطرہ ہو سکتا ہے بشرطیکہ وہ چودھری ممتاز خان کے پاس یرغمال نہ ہو۔“

اچانک مجھے اپنے سیل فون کا خیال آیا۔ جو اب تک آف پڑا تھا۔ بوجہ حالات، ہم نے اپنے سیل فونز آف کر رکھے تھے۔ میں نے فوراً اپنی جیب سے سیل نکال کر آن کیا۔

سیل آن ہوتے ہی کمپنی کی طرف سے کیے گئے پیغامات موصول ہوئے، ساتھ ہی سرمد بابا، آسیہ اور ایڈووکیٹ خانم شاہ کے علاوہ ایک نامعلوم نمبر کی مس کال بھی تھی جو میرے لیے اجنبی تھا۔ میں نے سب سے پہلے سرمد بابا کا نمبر ملایا۔ رابطہ ہوتے ہی ان کی پریشانی سے لبریز آواز سنائی دی۔

”شہزی بیٹا... تت... تم کہاں ہو؟ ٹھیک تو ہو نا؟ تم... تمہارا موبائل کیوں آف تھا؟ تم کیا کر رہے ہو...؟ اور یہ میں کیا سن رہا ہوں... تت... تت تم نے چودھری ممتاز کے بیٹے کا مرڈر کیا ہے؟“

میں نے ایک سرد آہ لی اور بولا۔ ”بابا! میں بالکل ٹھیک ہوں اور اس وقت حالات کو موافق کرنے کی تگ و دو میں مصروف ہوں لیکن یہ جھوٹ ہے، میں نے کوئی قتل نہیں کیا ہے۔ کیا آپ میری اس بات کا یقین کریں گے؟ عابدہ کیسی ہے؟“

”میرے بچے... مجھ سے زیادہ تمہیں کون جانتا ہے...“ ان کی فوراً تشفی آواز ابھری مگر لہجے میں دکھ سا سمٹا ہوا تھا۔ ”مگر تم پر یہ الزام کیسے آگیا؟ عابدہ کے سلسلے میں مجھے تم سے ایک ضروری بات کرنی تھی۔ وہ بھی تم سے ملنے اور بات کرنے کے لیے بے چین تھی۔“

”مجھے صرف عابدہ کے بارے میں بتائیں۔“ میں نے بے چینی سے کہا۔ ”باقی باتیں وقت آنے پر آپ کو معلوم ہوتی رہیں گی۔ عابدہ سے بات ہو سکتی ہے میری اس وقت...؟“

”ہاں... مگر میں اس وقت باہر ہوں گھر سے... تم گھر کے نمبر پر اس سے بات کر لو... لیکن میں تم سے ایک ضروری بات کرنا چاہتا ہوں۔“

”بابا! کیا بات ہے؟ میں سن رہا ہوں۔ کہیے...؟“ میں نے کہا۔ جانے کیوں میرا دل انجانے اور اندیشناک وسوسوں سے تیزی سے دھڑکنے لگا۔

وہ بولے۔ ”شہزادی بیٹا! تم سے ایک بھیک مانگنا تھی۔“ یہ کہتے ہوئے وہ جیسے رو پڑے۔

میں چونک کر پریشانی سے بولا۔ ”یہ آپ کیسی باتیں کر رہے ہیں بابا... آپ جانتے ہیں اچھی طرح کہ آپ میری اور عابدہ کی نظروں میں کیا حیثیت رکھتے ہیں؟“

”جانتا ہوں بیٹا...“

”پھر بھی آپ نے بھیک جیسا لفظ استعمال کر کے مجھے اس قدر شرمندہ کیا؟“ میں نے شکوہ کیا۔

”بات ہی کچھ ایسی ہے بیٹا۔“ وہ رندھے ہوئے لہجے میں بولے۔ ”عارفہ بیٹی کی طبیعت بہت زیادہ خراب رہنے لگی ہے۔ ڈاکٹروں نے کہا ہے کہ اگر عارفہ کے جگر کی پیوندکاری بروقت نہ کی گئی تو اس کا جگر پھٹ جائے گا اور پھر سارا زہر اس کے جسم کو ہی نہیں، اس کی جان بھی چاٹ لے گا۔“

"تو پھر...؟" میں نے حلق میں اٹکے ہوئے گولے کو نگلتے ہوئے پوچھا۔

"کل رات کی فلائٹ سے عارف کو امریکا بھیجا جا رہا ہے۔ میں چاہتا ہوں اس کے ہمراہ... عابدہ بھی... ساتھ جائے دیکھ بھال کے لیے... صرف ایک ماہ کی بات ہے بیٹا! بعض ضروری وجوہات کے باعث میرا عارف بیٹی کے ساتھ جانا ممکن نہیں ہے۔ تمہارا اور عابدہ کا مجھ پر بہت بڑا احسان..."

"عابدہ سے بات کی ہے آپ نے؟" میں نے اپنے سینے میں اٹکی سانسوں کے درمیان بہ مشکل کہا۔

"ہاں... عارف نے تو عابدہ کو بہنوں کی طرح رکھا ہے۔ عابدہ کو کوئی اعتراض نہیں ہے مگر جانے سے پہلے وہ تم سے ملنا چاہتی ہے۔" سرمد بابا نے بتایا اور میرے نزدیک لہجے میں ہی نہیں میرے چہرے پر بھی سناٹا طاری ہو گیا۔ کافی دیر تک تو مجھ سے کچھ بولا بھی نہ گیا۔ دوسری جانب سے سرمد بابا کی بے چین سی آواز ابھری۔ "کیا ہوا بیٹا! تم خاموش کیوں ہو گئے؟"

میں نے بے اختیار ایک گہری سانس کو جیسے لبنے... سینہ سوزاں سے آزاد کیا اور بولا۔ "بابا! آپ کسی بات کی فکر نہ کریں... میں ابھی عابدہ سے بات کرتا ہوں۔ اس کے بعد آپ سے دوبارہ رابطہ کروں گا۔" میری بات سن کر وہ مجھے دعائیں دینے لگے اور اس بات کا بھی اعتراف کرنے لگے میں اور عابدہ ہمیشہ ان کے آڑے وقتوں میں کام آتے رہے ہیں مگر حقیقت یہ تھی کہ سرمد بابا کے ہم پر احسانات تھے، انہوں نے مجھے اور عابدہ کو اپنے بچوں جیسی اہمیت دی تھی۔ یہ اب کی بات نہ تھی۔ جب وہ سرمد بابا سے سید منظور رزاق نہیں بنے تھے اور اطفال گھر کے اولڈ ہوم میں رہتے تھے تب سے ان کا رویہ میرے ساتھ بزرگانہ اور شفقت آمیز رہتا تھا جب میں بچہ تھا اور اپنے باپ کو یاد کر کے رویا کرتا۔ جب میں اس کی بے حسی کا گلہ کرتا تھا تو یہ بابا ہی تھے جو مجھے سہارے ہوئے تھے۔ میرے اندر جینے کی امنگ، خوش رہنے اور ہر قسم کے حالات میں مسرور و مطمئن ہونے کا گر انہوں نے ہی مجھے سکھایا تھا۔

ان سے رابطہ منقطع کرنے کے بعد میں نے ان کے گھر پر فون کیا۔ فون عابدہ نے ہی اٹھایا۔ اس کی آواز سن کر مجھے یوں لگا جیسے صدیوں بعد میں اس کی آواز سن رہا ہوں۔ میں نے مختصراً پہلے اسے ساری صورت حال سے آگاہ کیا تو وہ رو پڑی۔ وہ روتی ہوئی سسکتے لہجے میں بولی۔

"شہزی! اس سے تو اچھے ہم اطفال گھر میں تھے۔ مگر جب سے وہ اطفال گھر ایک قید خانہ بنا تو بڑی مشکل سے ہم نے اس امید کے ساتھ یہاں چھڑائی کہ بعد میں ہم اکٹھے ہنسی خوشی زندگی گزاریں گے مگر..." وہ سسک پڑی۔ گلے میں اٹک جانے والی رقت نے اسے جملہ بھی پورا نہیں کرنے دیا۔ اس کے ٹوٹے، مایوس اور افسردہ لہجے نے میرے وجود کو ٹکڑے ٹکڑے کر ڈالا۔ میں نے اپنے لہجے کی لرزش پر بہ مشکل قابو پاتے ہوئے عابدہ سے کہا۔

"عابدہ! شاید زندگی اسی کا نام ہے... انسان سوچتا کچھ ہے اور ہوتا کچھ ہے مگر خوشی انہیں ملتی ہے جو تقدیر پر شاکر رہتے ہیں اور اسے اپنے حق میں بدلنے کے لیے اللہ تعالیٰ سے دعا کرتے ہیں۔ تم نے نہیں سنا ہے کہ دعاؤں سے تقدیریں بدل جاتی ہیں۔ قدرت نے ایسے انسانوں کے سپرد کچھ کام کیے... ہوتے ہیں جو انہوں نے انجام دینا ہوتے ہیں۔ یہ بھی ایک نیک مقصد ہے۔ سرمد بابا سے ہمارا رشتہ ازل سے جو بے شک خونی رشتوں کا نہیں مگر اب وہ ان سے بھی بڑھ کر ہے۔ عارف کا علاج بھی ضروری ہے اور تمہارا اس کے ساتھ جانا بھی مگر میں تمہیں مجبور نہیں کروں گا۔ ہیں اتنا ضرور کہوں گا کہ اس میں بھی شاید تائید ایزدی کارفرما ہو... شاید کسی دکھی انسان کی مدد کرنے کی ہماری ادا اللہ کو بھا جائے اور پھر ہمارے سارے کٹھن راستے یک دم آسان ہوتے چلے جائیں... اللہ پر بھروسا کرو، اب تم کیا کہتی ہو... میری طرف سے تو اجازت ہے۔ مجھے سرمد بابا کو جواب دینا ہے۔"

وہ بولی۔ "شہزی! اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ بابا نے مجھے ہمیشہ اپنی بیٹی سمجھا اور عارف تو میری باجی ہیں۔ مجھے کوئی اعتراض نہیں مگر امریکا جانے سے پہلے میں تم سے ملنا چاہتی تھی... پھر پتا نہیں کب ملاقات ہو..." اس کے لہجے اس کی بات پر جیسے جی جان سے لرز اٹھا۔

"یہ کیا کہہ رہی ہو عابدہ! ہم ضرور ملیں گے۔ تم ایک نیک مقصد کی خاطر جا رہی ہو۔ اللہ تمہارا حامی و ناصر ہوگا۔ ایسی... مایوس کن باتیں نہ کرو۔ جی تو میرا بھی نہیں چاہتا تمہیں خود سے دور کرنے کو... اس لیے میں تم سے اس سلسلے میں زبردستی نہیں کرنا چاہ رہا۔ مگر ایک ماہ کی بات ہے۔ عارف کو نئی زندگی مل جائے گی تم ان کا خیال رکھو گی۔ اس کا اجر اللہ سے مانگنا صرف... پھر دیکھنا خوشیاں ہم سے سنبھالی نہ جائیں گی۔"

"میں تم سے ملنا چاہتی ہوں۔" وہ تڑپ کر بولی۔

میں نے اسے اپنی موجودہ پوزیشن بتائی تو وہ دہل گئی۔ میں نے کہا۔ "تم کہو تو میں آگ کے دریا عبور کر کے تم سے ملنے آجاؤں... ایسے حالات کو میں کبھی بھی خاطر میں نہ لاؤں مگر... بات صرف میری نہیں ہے، میرے ساتھ اور لوگ بھی مصیبت میں پڑ جائیں گے۔"

"نہیں، نہیں... شہزی! تم سے بات اور رابطہ ہوتا رہے گا، تم بےفکر رہو... مگر مجھے تمہاری فکر ستانے لگی ہے۔" وہ پریشان ہو کے بولی۔

"میری فکر نہ کرو... ہو سکتا ہے تمہاری اس نیکی کا صلہ اللہ مجھے اس طرح دے دے کہ یہاں سارے حالات تمہارے اور میرے حق میں موافق ہو جائیں۔ بس اللہ کا نام لے کر بابا، میری فکر نہ کرو، میں اکیلا نہیں ہوں۔ میرے بہی خواہ میرے ساتھ ہیں جو حالات کو موافق کرنے کے لیے میری طرح تگ و دو میں لگے ہوئے ہیں۔"

"بس جانے سے تم سے بات کروں گی۔ شاید ائرپورٹ سے... مگر پلیز... شہزی! تم اپنا فون آف مت رکھنا۔ اپنا خیال رکھنا شہزی! کیونکہ میری دنیا... میرا جینا مرنا صرف تم ہو... اور تم ہی میرا سب کچھ ہو۔" عابدہ کے منہ سے ادا کیے یہ الفاظ گویا آبِ حیات کی شکل میرے دل شکستہ وجود کو ایک عجیب سی توانائی عطا کر گئے۔

"عابدہ! تمہارے ان سچے لفظوں کا امرت میں نے پی لیا... اب دنیا کی کوئی طاقت مجھے تم سے جدا نہیں کر سکتی۔ اپنا خیال رکھنا، خدا حافظ۔"

عابدہ سے بات کرنے کے بعد میرے دل کو کچھ ڈھارس ہوئی۔ اس کے بعد مرید بابا کو فون کر کے عابدہ کی طرف سے جانے کی تسلی دے دی۔ وہ بےچارے خوشی سے دوہرے ہو گئے اور مجھے ڈھیروں دعائیں دینے لگے۔ مجھے ہر طرح کی تسلی دینے لگے۔ مثلاً عابدہ کو وہاں کوئی تکلیف نہ ہوگی۔ انہوں نے سارے انتظامات کر رکھے ہیں۔ مزید یہ کہ ان سے رابطے میں رہوں گا اور بات بھی ہوتی رہے گی۔

میں نے یہ ساری باتیں اپنے ساتھ بیٹھے اول خیر سے گوش گزار کر دیں، وہ بولا۔ "او خیر... کاکے... تمہاری اور عابدہ بھابی کی عظمت کو میں سلام کرتا ہوں۔ جب تم بھابی سے بات کر رہے تھے میں بھی سن رہا تھا۔ اور میں خود پر فخر کر رہا تھا کاکے! کہ ایک نیک سیرت دوست میرا یار ہے۔ شاید تیری صحبت مجھے بھی سدھار دے۔ پر یار کاکے! میں سوچ رہا تھا، اس میں ضرور اللہ کی مصلحت ہوگی کہ ان حالات میں عابدہ بھابی کو ایک ماہ کے لیے سہی... یہ ملک چھوڑ کر جانا پڑ رہا ہے۔ کب کی فلائٹ ہے؟"

"آج یا کل تک چلی جائے گی۔" میں نے بوجھل پن سے کہا پھر اچانک مجھے آسیہ کا خیال آیا۔ سیل آف تھا میرا۔ ابھی میں آسیہ کا نمبر ملانے ہی والا تھا کہ اس کی کال آ گئی۔ فون کان سے لگاتے ہی آسیہ کی تڑپتی ہوئی بے چین آواز ابھری۔ نجانے کیوں مجھے ایک لمحے کو ہولا کر رکھ دیا۔

"شہزی! تت... تم... کہاں ہو... کیسے ہو؟ خیریت سے تو ہو نا؟ تم نے فون بند کر رکھا تھا اور مجھے طرح طرح کے وسوسے پریشان کیے ہوئے تھے۔"

"میں بالکل ٹھیک ہوں مگر تقدیر کے الجھائے ہوئے جال سے خود کو آزاد کرانے کی تگ و دو میں مصروف ہوں۔"

"میں نے ٹی وی پر سب سن لیا اور دیکھ لیا ہے۔ تم سے چوہدری ممتاز کے بیٹے کا قتل کس طرح ہو گیا؟" وہ بولی۔

میں نے محسوس کیا کہ اس کی باتوں اور لہجے سے صرف میرے لیے تشویش اور پریشانی ظاہر ہو رہی تھی جس پر مجھے حیرت تھی۔ میں تو اس کے منگیتر ریحان کی خیریت کے بارے میں پریشان ہو رہا تھا۔ لہٰذا میں نے دھڑکتے دل کے ساتھ پوچھا۔

"ریحان کی کچھ خیر خبر...؟"

دوسری جانب سے آسیہ کی چپ نے مجھے دہلا کر رکھ دیا۔ نجانے وہ کیوں ریحان کے ذکر پر یک دم خاموش ہو گئی تھی۔ کیا وہ مجھے اس سے متعلق خدانخواستہ کوئی بری خبر سنانے والی تھی۔

"یہی بات میں تمہیں بتانا چاہ رہی تھی شہزی۔" معاً اس کی عجیب سی آواز ابھری۔

"ریحان دشمنوں کی قید میں تھا اور چوہدری ممتاز کے بیٹے کے قتل نے مجھے ریحان کی زندگی کی طرف سے مایوس کر دیا تھا... ممتاز خان اپنے بیٹے کے قتل کا الزام تم پر ہی عائد کر رہا تھا لیکن شہزی! ایک عجیب سی انہونی ہو گئی ہے۔ مجھے یقین نہیں آ رہا کہ کیا تقدیر اس طرح بھی پلٹا کھا سکتی ہے مگر شاید اس الٹ پھیر کا نام ہی تقدیر ہے... اب دیکھو... ہم سب حالات موافق کرنے اور تمہارے حق میں کرنے کے لیے پورا ہوم ورک کر رہے تھے مگر اچانک سب الٹ ہو گیا۔ ہم میڈیا کے ذریعے سچائی اور صفائی کو ٹھوس شواہد ہونے کے باوجود عین وقت پر منظر عام پر نہ لا سکے اور پھر یک دم حالات بگڑنے چلے گئے۔ اس قدر بگڑ گئے ہم مایوس ہو گئے مگر اچانک ہی مایوسیوں اور اندھیروں میں

اسبہ کی جرأت جاگ پڑی۔"

"مجھے ریحان کی خیریت سے مطلع کرو آسبہ! میرے پاس وقت نہیں ہے۔ مجھے اس کی طرف سے تشویش ہو رہی ہے۔ باقی باتیں بعد میں تمہیں تفصیل سے بتاؤں گا۔"

وہ بولی۔ "ریحان بالکل ٹھیک ہے اور زبیر خان نے اس شرط کے ساتھ اسے آزاد بھی کر دیا ہے کہ وہ اس معاملے کو دبا رہنے دے۔" آسبہ کا یہ انکشاف میرے لیے ناقابلِ یقین تھا۔ اگر یقین کر بھی لیا جائے تو کئی سوالوں کی یلغار ذہن کے حیرت کدہ میں کو نجنے کا سبب بن رہی تھی آخر کیوں؟ زبیر خان اس کے بیٹے شفقت راجا کے قتل کا الزام ہمارے سر پر تھا۔ اس نے مجھے جھکانے کے لیے ریحان کو یرغمال بنایا اور پھر بغیر کوئی گزند پہنچائے اسے آسانی سے چھوڑ بھی دیا۔ وہ بھی ان حالات میں جب دشمنی کی آگ عروج پر پہنچ چکی تھی۔

"یہ... یہ... اگر یہ... سچ ہے تو... یقین جانو آسبہ... اس سے بڑھ کر میرے لیے خوشی کی اور کیا بات ہو سکتی ہے مگر یہ سب ہوا کیسے؟" بالآخر میں نے اٹکتے ہوئے لہجے میں کہا تو وہ بولی۔

"جب ریحان نے مجھ سے فون پر بات کر کے یہ خوش خبری سنائی تھی تو پہلے تو مجھے بھی یقین نہیں آیا تھا۔ بلاشبہ یہ میرے لیے بہت بڑی خوشی کی خبر تھی مگر اس کے ساتھ ایک اور اہم بات پر مجھے حیرت ہو رہی ہے۔"

"اہم بات؟ کیسی اہم بات؟" میں نے سوال کیا تو وہ جواب دینے کے بجائے الٹا مجھ سے مستفسر ہوئی۔

"پہلے تم بتاؤ شہزی! کہ زبیر خان کا تمہارے پاس فون تو نہیں آیا تھا؟"

اس کا استفسار مجھے چونکا گیا۔ بے اختیار میں نے نفی میں جواب دیا۔ "نہیں تو یا پھر ممکن ہے کیونکہ میرا سیل کافی دیر سے آف تھا۔" میں نے سوچتے ذہن سے کہا تو اچانک مجھے یاد آیا کہ ایک نامعلوم نمبر میرے سیل پر آیا ہوا تھا۔ تاہم میں نے خود ہی پوچھ لیا۔

"زبیر خان مجھے کیوں فون کرے گا؟ نہ ہی اس کے پاس میرا سیل نمبر ہے۔ تمہاری بات میں سمجھ نہیں پایا۔" میری پیشانی پر پرسوچ شکنوں کا جال سا بن گیا۔

دوسری جانب سے مجھے آسبہ کی گہری سانس لینے کی آواز ابھری اور بولی۔ "زبیر خان تم سے بات کرنا چاہتا ہے کیا... یہ مجھے نہیں معلوم... ریحان نے ہی یہ بات مجھے بتائی تھی۔ ریحان سے اس نے تمہارا نمبر بھی لیا تھا۔"

انگلینڈ میں کئی سال گزارنے کے بعد جب غزالہ رحمٰن واپس آئی تو اپنی استانی سے ملنے کے لیے بھی گئی۔ استانی نے پیار سے گلے لگاتے ہوئے پوچھا۔ "کہو بیٹی! خوش تو رہیں؟ تعلیم مکمل کر لی؟ نوکری ملی یا نہیں؟ پردیس میں کوئی پریشانی تو نہیں ہوئی؟ اب یہیں رہو گی یا دوبارہ واپس چلی جاؤ گی؟"

غزالہ نے کہا۔ "آپ نے تو ایک ہی وقت میں اتنے بہت سے سوال پوچھ لیے کہ سمجھ میں نہیں آتا کہ کس سوال کا جواب دوں؟"

"کوئی بات نہیں بیٹی۔" استانی نے فوراً کہا۔ "کوئی سے بھی دو سوالوں کے جوابات دے دو۔"

رحیم یار خان سے حلیم کا انتخاب

"کیا ریحان کو کچھ اندازہ ہے کہ زبیر خان مجھ سے کس سلسلے میں بات کرنا چاہتا ہے۔ اس نے ریحان کو اس طرح اچانک چھوڑنے کی کیا وجہ بتائی؟"

"اس کا ریحان کو تو اندازہ نہیں ہو سکا لیکن میں تھوڑا بہت اندازہ قائم کر چکی ہوں۔" وہ بولی۔ "شہزی! مجھے کچھ ایسا لگتا ہے یہ زبیر خان یا چودھری ممتاز کی کوئی نئی چال ہے۔ ریحان کو رہا کرنے کی صورت میں انہوں نے ایک ترپ کا پتا پھینکنے کی کوشش کی ہوگی۔ تاکہ تمہیں قابو کیا جا سکے۔"

میں آسبہ کی اس بات سے متفق نہ تھا۔ مجھے یہ کچھ اور ہی معاملہ لگ رہا تھا۔ اسی دوران میں آنے والی کسی کال کی ٹون وقفے وقفے سے سنائی دینے لگی میں نے بات ختم کرنے کی غرض سے کہا۔

"اچھا ٹھیک ہے بعد میں تفصیل سے بات کرتے ہیں۔ ابھی ایک کال آ رہی ہے۔ بہرحال مجھے تمہارے منگیتر کی رہائی کی خبر سن کر خوشی ہوئی۔" یہ کہتے ہوئے میں نے رابطہ منقطع کیا ہی تھا کہ میرا سیل دوبارہ گنگنایا۔ میں نے اپنی بھویں سکیڑ کر اسکرین پر دیکھا۔ نمبر اجنبی تھا۔ یہ وہی مذکورہ نامعلوم نمبر تھا۔ خیال تھا کہ یہ کال زبیر خان کی طرف سے ہوگی۔ میں نے کال آن کر کے دھڑکتے دل سے سیل کان سے لگا کر ہیلو کہا تو دوسری طرف سے ایک بھاری اور

کھرکھراتی آواز ابھری۔

''شہزاد احمد خان؟''

''آپ کون...؟'' میں نے دانستہ اثباتی جواب سے گریز کیا۔

''میں زبیر خان بات کر رہا ہوں۔ شفقت راجا میرا ہی بیٹا تھا۔ تمہیں علم تو ہو گیا ہوگا کہ میں نے ریحان کو چھوڑ دیا ہے؟'' اس کی آواز نارمل تھی۔ مجھے اس پر حیرت بھی تھی۔ تاہم میں نے بھی ہموار لہجے میں کہا۔

''اس عنایت کا میں مشکور ہوں تہہ دل سے... آپ کچھ کہنا چاہتے تھے مجھ سے؟'' میں نے آخر میں کہا۔

''ہاں... ہاں۔'' وہ ایک گہری سانس چھوڑتے ہوئے بولا۔ ''بات اہم تھی۔ مجھ پر اگر بھروسا کر سکتے ہو تو روبرو ملاقات پر بات کرنا زیادہ مناسب ہوگا۔''

''مجھے اس بات کی بھی خوشی ہوگی اور میں خود بھی اس بات کا متمنی تھا کہ آپ سے مل کر آپ کی ساری غلط فہمی دور کر دوں۔'' میں نے کہا۔

''اب اس کی ضرورت نہیں رہی۔''

''کیا مطلب؟ میں سمجھا نہیں زبیر صاحب۔'' میں نے الجھن آمیز لہجے میں کہا تو اس کی آواز ابھری۔

''غلط فہمی خود ہی دور ہو چکی ہے۔ جس کا ثبوت ریحان کی رہائی ہے۔''

''مجھے خوشی ہوئی یہ سن کر... مگر زیادہ بہتر ہوتا کہ میں بھی آپ کو اس روز والے افسوسناک واقعے کے بارے میں بتا سکتا بہرحال، پوچھ سکتا ہوں... یہ معاملہ کیا ہے؟'' بالآخر میں نے تجسس سے پُر لہجے میں پوچھا تو وہ بولا۔

''ہمیں اپنے ذرائع سے یہ حقیقت معلوم ہو چکی ہے کہ ہمارے بیٹے کے قاتل تم نہیں کوئی اور لوگ تھے۔'' اس نے ایک چونکا دینے والا انکشاف کیا۔ مجھے اس کے لہجے میں کہیں سے بھی کسی چال یا دروغ گوئی یا مصلحت کی بو آتی محسوس نہیں ہو رہی تھی۔ میں نے جیسے میں اٹکی ہوئی حبس زدہ سانس خارج کی اور بولا۔

''اگر یہ سچ ہے تو مجھے بھی آپ کے تعاون کی ضرورت ہوگی... کیونکہ میں ابھی تک آپ کے لگائے گئے الزام کی وجہ سے پولیس سے چھپتا پھر رہا ہوں۔''

''ہم اس معاملے میں ہی تم سے ایک اہم ڈیل کرنا چاہتے ہیں مگر ہم تک یہ خبریں پہنچی ہیں کہ چودھری ممتاز کے بیٹے فرخ کا قتل تمہارے ہاتھوں ہو گیا ہے؟'' زبیر خان نے گمبھیر لہجے میں کہا تو میں بے اختیار ایک گہری سانس لے کر رہ گیا۔ چودھری ممتاز ایک اہم شخصیت تھا جبکہ ہمارا میڈیا اتنا فاسٹ ہو چکا تھا کہ ملک کے شمالی کونے میں بھی کوئی معمولی واقعہ ظہور پذیر ہوتا تو وہ جنوبی کونے تک اس کی تشہیر سیکنڈوں میں ہو جاتی۔ میں نے کہا۔

''وہ قتل میرے ہاتھوں نہیں ہوا۔ میں نے مختصراً کہنا ہی مناسب جانا۔

''مجھے اس سے کوئی غرض نہیں۔'' زبیر خان بولا۔ ''دراصل ریحان کی رہائی کے معاملے پر ہماری بھی چودھری ممتاز سے کچھ ان بن ہو گئی ہے۔ بہرحال، فون پر ساری تفصیل نہیں ہو سکتی۔ ہمیں تمہارے تعاون کی ضرورت ہے۔''

زبیر خان کی باتوں کے تناظر میں میرا ذہن تیزی سے کام کر رہا تھا اور اس کی عداوت سے مفاہمت اور تعاون کی طرف پیش قدمی میرے حق اور مفادات میں جا سکتی تھی۔ سوچ کر جانتے ہوئے میں نے بھی فوراً کہہ دیا۔

''چودھری ممتاز نے میری دشمنی میں آپ کو استعمال کرنا چاہا تھا۔ میں آپ سے تعاون کے لیے تیار ہوں مگر پولیس...''

''اس کی تم فکر نہ کرو۔'' زبیر خان نے میری بات کاٹتے ہوئے کہا۔ ''ہم اپنی طرف سے بات ختم کر دیں گے۔ تم بھی اپنا بندوبست کرو... اور جتنی جلد ممکن ہو سکے مجھ سے بلاخوف بالمشافہ ملاقات کرنے کا موقع نکالو۔'' اس کے بعد دوسری جانب سے رابطہ منقطع ہو گیا۔

اول خیر اور ارشد بغور میری طرف تکے جا رہے تھے پھر جب میں نے اول خیر سے یہ بات کی تو وہ بولا۔ ''ار خیر... کاکے! یہ معاملہ تو آپ ہی نمٹ گیا... پر لگتا ہے ایک نئی لمبی کھیڈ شروع ہونے والی ہے۔''

اچانک میرے تیزی سے سوچتے ہوئے ذہن میں ایک خیال بجلی کی سی تیزی سے ابھرا۔ شفقت راجا کے قتل کا کیس ختم کرنے کے لیے زبیر خان نے مجھے بھی یہ اشارہ دیا تھا کہ میں بھی اس سلسلے میں اپنا بندوبست کرنے کی کوشش کروں... لہٰذا آسیہ اور خانم شاہ کو اس کی اطلاع دینا ضروری تھا۔ میں نے فوراً آسیہ سے رابطہ کر کے اسے ساری بات بتائی۔

اس دوران میں عمارت سے باہر تعینات چوکیدار محافظ نے ہمیں بیگم صاحبہ کی آمد کی اطلاع دی۔

تھوڑی دیر بعد میری سماعتوں سے باہر کسی گاڑی کے رکنے اور پھر دروازہ کھلنے اور بند ہونے کی آوازیں

ٹکرائیں۔ ہم سنبھل کر بیٹھ گئے۔

بس کچھ ہی سیکنڈ گزرے ہوں گے کہ بیگم صاحبہ اندر داخل ہوئیں۔ ان کے ہمراہ کفیل دادا اور ایک ساتھی بھی تھا دونوں مسلح تھے۔ میں اور اول خیر وغیرہ... یک دم احتراماً اپنی جگہ سے اٹھ کھڑے ہوئے اور بیگم صاحبہ کو سلام بھی پیش کر دیا۔

ایک ساتھی نے فوراً کرسی اٹھا کر بیگم صاحبہ کے قریب رکھ دی اور نہایت مؤدبانہ انداز میں چند قدم پیچھے کی طرف ہٹ گیا۔ بیگم صاحبہ کرسی پر نہیں بیٹھی تھیں۔ ان کی نگاہیں میرے چہرے پر جم سی گئی تھیں۔ میں بھی انہی کی طرف تکے جا رہا تھا۔ وہ آج بھی ہمیشہ کی طرح پرکشش اور دلکش نظر آ رہی تھیں۔ حالانکہ لباس سادہ سا ہی زیب تن کیا ہوا تھا۔ میک اپ میں بھی میں نے کبھی نہیں دیکھا تھا مگر اس کے باوجود ان کی شخصیت میں عجیب سی دلکشی اور کشش سی بھی محسوس ہوتی تھی۔ بلاشبہ اس میں رعب بھی تھا اور دبدبہ بھی۔

”مجھے مختصر لفظوں میں بتاؤ ہوا کیا تھا؟“ انہوں نے گہری نگاہوں سے میرے چہرے کی طرف تکتے ہوئے بظاہر بے تاثر سے لہجے میں پوچھا۔ میں نے انہیں ساری بات بتا دی۔

”ایک بار پھر سوچ لو۔ کوئی بات بھول تو نہیں رہے کیونکہ میں نے اس سلسلے میں پولیس سے مدد لینے کی کوشش کی ہے۔“ وہ بولیں۔

میں نے مضبوط اور پورے اعتماد سے کہا۔ ”بیگم صاحبہ! میں نے جو بتایا ہے، اس میں ذرا بھی بھول چوک نہیں ہے۔ اول خیر میرے ساتھ تھا۔“

مگر بیگم صاحبہ نے اول خیر سے بات کرنا تو کجا اس کی طرف دیکھنا بھی گوارا نہ کیا جبکہ میں چاہ رہا تھا کہ وہ اگر خود بہ نفس نفیس یہاں آ ہی گئی تھیں تو وہ میرے سامنے اول خیر کا بھی فیصلہ صادر کر دیتیں۔ مگر اس کے ساتھ ہی میں نے بیگم صاحبہ سے ریحان اور زبیر خان سے متعلق ہونے والی گفتگو کے بارے میں بھی انہیں فوراً آگاہ کرنا ضروری سمجھا۔ حسب توقع انہیں اس بات کا یقین ہی نہ آیا مگر ظاہر ہے اتنی بڑی اور اہم بات میں یونہی منہ سے نہیں نکال سکتا تھا مگر میں نے دیکھا... یہ سن کر بیگم صاحبہ کے چہرے پر یک دم حیران کن خوشی اور قدرے طمانیت چھا گئی اور وہ بولیں۔

”اگر یہ حقیقت ہے تو میں سمجھتی ہوں... یہ بات سو فیصد تمہارے حق میں جائے گی۔ مجھے بھی تمہارے سلسلے میں بعض قانونی پیچیدگیوں کو سلجھانے میں خاصی مدد ملے گی۔“

میں ابھی بیگم صاحبہ سے اول خیر کے سلسلے میں بھی بات چھیڑنے کا ارادہ کیے ہوئے تھا کہ اچانک ایک آواز پر وہاں موجود، ہم سب بری طرح ٹھٹک گئے۔

☆☆☆

باہر ایک سے زائد گاڑیوں کی سخت آوازیں آئی تھیں۔ اسی اثنا میں ایک ساتھی نے بھی اندر آ کر بتایا کہ باہر پولیس آئی ہے۔

یکلخت جیسے سب کو سانپ سونگھ گیا۔ میرا اور اول خیر کا چہرہ تو جیسے دھواں دھواں ہو گیا۔ کفیل دادا کے چہرے پر بھی تشویش ابھر آئی تھی جبکہ فقط بیگم صاحبہ کا چہرہ محض ہلکے تفکر کی غمازی کر رہا تھا۔

معاً باہر میگافون پر ایک سخت... آواز ابھری۔ ”پولیس نے عمارت کو چاروں طرف سے گھیر لیا ہے۔ خبردار! مقابلے کی صورت میں سب کو گولیوں سے بھون دیا جائے گا۔ اس لیے حکم دیا جاتا ہے جتنے افراد بھی اندر موجود ہیں، ہاتھ کھڑے کر کے باہر آ جائیں، صرف چند سیکنڈ دیے جاتے ہیں۔“ اس کے ساتھ ہی میگافون میں ہی گنتی گننے کا عمل شروع ہو گیا۔

میرا پورا وجود جل اٹھا۔ کنپٹیاں چیخ گئیں۔ اعصاب یک دم تن گئے۔ خون کی گردش بڑھتے ہی جیسے رگیں پھٹنے لگیں۔ وہاں موجود تقریباً سب کو ہی پل کے پل یہ عام سا اندازہ لگانے میں چنداں دیر نہ لگی ہوگی کہ پولیس یقیناً بیگم صاحبہ کا خفیہ تعاقب کرتے ہوئے ہی یہاں تک پہنچی تھی۔

”فکر کی ضرورت نہیں... سب ٹھیک ہو جائے گا۔ میں جا کر بات کرتی ہوں۔“ بیگم صاحبہ نے کہا۔ میں فوراً حرکت میں آیا اور کھڑکی سے باہر جھانکا۔ پولیس کا پورا اسکواڈ موجود تھا مگر جس نے میرے وجود کو چٹخا کر رکھ دیا تھا وہ پولیس کی معیت میں کھڑا انسپکٹر روشن خان تھا۔ اسے دیکھتے ہی میں کسی طوفانی بگولے کی طرح پلٹا اور بولا۔

”بیگم صاحبہ! باہر انسپکٹر روشن خان کھڑا ہے۔ مجھے اس سے کسی خیر کی توقع نہیں۔“ بیگم صاحبہ نے میری بات کا کوئی نوٹس نہ لیا مگر اول خیر فقط وہ شخص تھا جو میری یہ بات سمجھ سکتا تھا... وہ بولا۔

”یہ تشویش کی بات ہے۔ سب جانتے ہیں انسپکٹر روشن خان ودیرو کسی کو تحفظ دینے کے لیے کام کرتا ہے،

اس سے کسی خیر کی توقع نہیں کی جا سکتی۔"

کسی نے بھی اس کی بات پر کان نہ دھرا۔ بیگم صاحبہ نے اول خیر کو بدستور نظر انداز کرتے ہوئے قریب کھڑے کبیل والا سے تحکمانہ انداز میں کہا۔

"تم میرے ساتھ چلو... پہلے میں بات کرتی ہوں باہر جا کر پولیس سے۔" کبیل والا نے فوراً اثبات میں اپنا سر ہلا دیا۔

بیگم صاحبہ پھر مجھ سے مخاطب ہو کر بولیں۔ "فکر کی ضرورت نہیں۔ بہتر یہی ہے کہ تم اپنی گرفتاری دے دو... میرا وعدہ ہے میں تمہیں بہت جلد چھڑوا لوں گی۔"

"ہرگز نہیں بیگم صاحبہ۔" مجھ سے پہلے اول خیر نے میرے قریب آتے ہوئے یک دم اٹل آواز میں بیگم صاحبہ سے کہا اور دوا سے تیز اور متغصمانہ نگاہوں سے گھورنے لگیں۔ وہ اول خیر سے بات کرنا گوارا نہیں کر رہی تھیں اور بیگم صاحبہ کا اول خیر سے بے مروت اور نفرت آمیز رویہ مجھے بری طرح کھل رہا تھا مگر اول خیر بھی شاید میری طرح اس نازک موقع کی سنگینی کا احساس کر چکا تھا۔ بیگم صاحبہ نے دوبارہ مجھے ہی مخاطب کر کے کہا۔

"شہزی! تمہارا اس طرح پولیس سے بھاگتے رہنا تمہیں قانون کی نظروں میں مزید مجرم بناتا رہے گا۔ میں سب سنبھال لوں گی تم اپنی گرفتاری دے دو۔"

اس بار میں نے بیگم صاحبہ سے کہا۔ "مگر بیگم صاحبہ! بات صرف پولیس کی نہیں ہے۔ انسپکٹر روشن خان کی ہے جو دراصل خانہ چوہدری ممتاز کے لیے کام کرتا ہے پھر میرا ازخود وارنٹ نکلا ہوا ہے اور مجھے دیکھتے ہی گولیوں کا نشانہ بنا ڈالے گا۔"

اول خیر نے بھی تقریباً چیخنے کے انداز میں یہی کہا تھا۔ "شہزی! اس خطرناک صورت حال میں ہرگز اپنی گرفتاری مت دینا۔" پھر وہ بیگم صاحبہ سے ملتجیانہ انداز میں مخاطب ہو کر بولا۔ "بیگم صاحبہ! خدا کے لیے شہزی کو راستہ موت کی اندھی کھائی کی نذر نہ کریں... میں اسے یہاں سے بخیر و خوبی نکال کر لے جاؤں گا۔"

اس پہ کبیل والا نے غراہٹ سے مشابہ آواز میں اول خیر سے کہا۔ "باہر پولیس کھڑی ہے ہم مقابلہ کرنے کی پوزیشن میں نہیں ہیں۔ تمہاری یہ حرکت ہم سب بیگم صاحبہ کو بھی خطرے سے دوچار کر سکتی ہے۔"

"پولیس کو یہ معلوم ہی کب ہے کہ اندر شہزی موجود ہے۔ وہ صرف تمہارا تعاقب کرتی ہوئی یہاں تک پہنچی ہو گی۔ اس عمارت میں ایک خفیہ تہ خانے سے نکلنے والا راستہ موجود ہے۔ میں شہزی کو اسی راستے سے نکالنے کی کوشش کروں گا مگر خدا کے لیے شہزی کو انسپکٹر روشن خان جیسے قبیح اور بدطینت آدمی کے حوالے نہ کرو۔" اول خیر نے کہا۔

اس دوران میں گھنٹی ختم ہو چکی تھی۔ باہر میگا فون سے دوبارہ آواز ابھری۔ "گھنٹی ختم ہو چکی۔ آخری موقع دے رہے ہیں جتنے افراد اندر موجود ہیں، باہر آ جائیں ورنہ پولیس اندر دھاوا بول دے گی۔ قانون سے ٹکرانے کا مطلب صرف موت ہو گا۔" یہ پولیس کی طرف سے واضح دھمکی تھی۔ بالآخر بیگم صاحبہ کو اول خیر کی بات سے ہی متفق ہونا پڑا۔ وقت بھی نہ رہا تھا بحث مباحثہ کا۔

اول خیر مجھے لیے فوراً ایک دوسرے دروازے کی طرف لپکا جو کسی اندرونی گوشے میں کھلتا تھا۔ اب باقی سب لوگ بیگم صاحبہ کی معیت میں عمارت سے باہر نکلنے کی تیاری کرنے لگے۔ اول خیر مجھے لے ایک نسبتاً چھوٹے کمرے میں آ گیا۔ یہاں صرف ایک روشن دان تھا۔ کھڑکی کوئی نہ تھی۔ روشن دان سے ہی دن کی روشنی اندر آ رہی تھی جو کمرے کے حجم کو مقدور بھر حد تک ہی روشن کیے ہوئے تھی۔ یہاں مجھے دیوار کے ساتھ ساتھ نصب لوہے کی جالیوں والے پنجرے دکھائی دیے۔ یہاں بڑی عجیب سی بو پھیلی ہوئی تھی۔ ایک ایسے ہی پنجرے کا دروازہ کھول کر گھٹنوں کے بل ہم اندر داخل ہو گئے۔ ایک کونے پر پہنچ کر اول خیر جلدی جلدی زمین صاف کرنے لگا اور پھر جلد ہی اس کے ہاتھ ایک آہنی زنگ آلود کنڈا لگ گیا۔ جسے اس نے اپنے دونوں ہاتھوں کی طاقت صرف کر کے اوپر اٹھا دیا۔ نیچے گھپ تاریکی تھی۔ اس نے اپنی جیب سے سیل نکالا اسے سائلنٹ پر کیا اور اس کی ٹارچ روشن کر کے منہ میں دبا لیا۔ مجھے بھی اس نے اشارے سے یہی کرنے کو کہا۔ اس کے بعد وہ نیچے رینگ گیا۔ میں اس کے پیچھے تھا۔ زنگ آلود سیڑھیاں نیچے جا رہی تھیں جو زیادہ طویل نہ تھیں۔

اب ہم اس خفیہ تہ خانے کے فرش پر کھڑے تھے یہاں بڑی سخت گھٹن تھی۔ سیل فون کی ٹارچ لائٹ میں، میں نے تہ خانے کا جائزہ لینے کی کوشش کی۔ یہ ایک چھوٹے کمرے کے برابر تھا۔ اول خیر نے سرگوشی میں کہا۔ اس کا لہجہ قدرے الجھا ہوا سا تھا۔

"کاکے! یہاں ایک خفیہ سرنگ بنی ہوئی ہے۔ جو باہر تقریباً نصف کلومیٹر کے بعد ایک اجاڑ ویرانے کی مخفری

کھوہ میں نکلتی ہے۔ مگر مسئلہ یہ ہے کہ آج تک اسے مجھے استعمال کرنے کی ضرورت نہیں پڑی۔ اب پتا نہیں وہ کھوہ جہاں یہ سرنگ نکلتی ہے، وقت کی دھول سے اٹ کر بند ہو چکی ہے یا نہیں، یہ مجھے نہیں پتا... قسمت آزمائی کی جائے یا ادھر ہی چھپ کر پولیس کے نکلنے کا انتظار کیا جائے؟''

اس کی بات پر میں خود الجھ سا گیا۔ ویسے میں اس کی بات کا مطلب سمجھ چکا تھا مگر مجھ سے بھی فیصلہ نہیں ہو پا رہا تھا کہ اسے کیا جواب دوں۔ بہر حال میں نے کچھ سوچ کر اول خیر سے کہا۔

''یار! میرا تو خیال ہے یہ تہ خانہ... عارضی طور پر محفوظ پناہ گاہ ہے۔ نہ جانے اس طویل سرنگ کا اختتام کسی بند قبر پر نہ ہو۔ ہمیں ادھر ہی دبکے رہنا چاہیے۔ لیکن کاکے یہ گا ہے اوپر جا کر حالات کا جائزہ بھی لینا پڑے گا۔''

''تیری بات بھی ٹھیک ہے۔'' وہ بولا۔ ''بیگم صاحبہ پولیس سے مذاکرات کر رہی ہوں گی۔ ممکن ہے اب تک پولیس کو ہماری یہاں موجودگی کے شبہے کی بنا پر تلاشی بھی لینی پڑ جائے۔ تم ان کے ہتھے چڑھ گئے تو معاملہ خود ہی صاف ہو جائے گا۔''

میں نے مطمئن ہونے کے انداز میں کہا۔ ''ویسے یار! تم نے بروقت ٹھیک فیصلہ کیا تھا۔ حیرت ہے یہ خدشہ بیگم صاحبہ کے ذہن میں کیوں نہیں آیا۔ وہ تو مجھے انسپکٹر روشن کے حوالے کرنے پر تیار بھی ہو گئی تھیں۔''

''کاکے! شاید بیگم صاحبہ کو حالات کا پوری طرح اندازہ نہیں ہے لیکن شکر ہے کہ انہیں میری بات پر اعتراض نہ ہوا۔ میرے مشورے پر عمل پیرا ہونے کی اجازت دینے ہی پڑی تھی انہیں۔''

آپس میں حالات پر تبادلۂ خیال کرنے کے بعد میں نے کہا۔ ''کافی دیر ہو چکی ہے ہمیں دیکھنا چاہیے۔ پولیس ہے یا جا چکی ہے۔''

''ہاں! تو ادھر ہی ٹھہر میں اوپر جا کر صورتِ حال کا جائزہ لے کر آتا ہوں۔'' وہ آگے سرکا۔

''میں بھی ساتھ چلوں گا۔'' وہ کچھ نہ بولا۔

ہم دونوں ابھی آہنی سیڑھیوں کی جانب بڑھے ہی تھے کہ دفعتاً ہمیں اپنے سروں کے اوپر دھمک سی سنائی دی۔ ہم جہاں کے تہاں رک گئے اور میں کی ٹارچ لائٹ یک دم بجھا دی۔

''شاید اوپر پولیس سرچنگ کر رہی ہے۔'' اول خیر نے میرے کان میں سرگوشی کی۔ میرا دل تیزی سے دھڑکنے لگا۔ پھر ایک ممکنہ خدشے کے پیشِ نظر دبی آواز میں بولا۔

''تہ خانے کا ڈھکن نما دروازہ پولیس کی نظروں میں آسکتا ہے۔ کیا خیال ہے ہمیں سرنگ کے اندر سرک جانا چاہیے۔''

''شا... ں... ں... میں یہی آواز سننے کی کوشش کر رہا ہوں۔'' اس نے ہولے سے کہا۔ میں چپ ہو رہا۔ تہ خانے میں گھور تاریکی تھی، ہاتھ کو ہاتھ سجھائی نہ دیتا تھا۔ میں یہی دعائیں مانگ رہا تھا کہ پولیس اس خفیہ تہ خانے کا سراغ نہ لگا سکے۔ ورنہ ہمیں تہ خانے کی اندھی قبر نما سرنگ میں داخل ہونا پڑ جاتا۔ تھوڑی دیر گزر گئی۔ اوپر دھمک کی آواز دم توڑ گئی۔ میں نے سکون کا سانس لیا مگر ابھی خطرہ نہیں ٹلا تھا۔ ہم مزید کچھ منٹوں تک اسی طرح تہ خانے کی کالی بھجنگ تاریکی میں دم بخود سے کھڑے رہے۔ اس کے بعد اول خیر نے میرے کان میں سرگوشی کی۔

''تو ادھر رک، میں اوپر جا کر دیکھتا ہوں۔ پھر تجھے اشارہ کرتا ہوں لیکن ابھی لائٹ آن مت کرنا۔'' میں نے سرگوشی میں اثباتی جواب دیا۔ وہ آگے بڑھا۔

''کیا ہوا؟ خیریت... پولیس گئی؟'' اول خیر نے پوچھا۔ میری وحشت زدہ نظریں اس کے چہرے پر جم سی گئیں۔ وہ خاصا بدحواس سا نظر آ رہا تھا۔

''پولیس نے عمارت کو سیل کر دیا ہے اور ایک موبائل اور چند پولیس والے باہر موجود ہیں۔ باقی سب جا چکے ہیں۔'' اس کی بات پر ہم تشویش زدہ سے ہو گئے۔ اول خیر نے پوچھا۔

''بیگم صاحبہ اور دوسرے لوگ جا چکے ہیں؟''

''انسپکٹر روشن خان... بیگم صاحبہ اور بڑے استاد سمیت سارے ساتھیوں کو اپنے ہمراہ لے جا چکا ہے۔''

''چل کاکے! ادھر ہی چلتے ہیں جدھر سے آئے تھے۔ یہاں کھڑے رہنا مناسب نہیں... کوئی پولیس والا ادھر آسکتا ہے۔''

میں نے پُرسوچ انداز میں اپنے ہونٹ بھینچ رکھے تھے، بولا۔ ''اول خیر میں یہاں زیادہ دیر رکنا نہیں چاہتا۔ ہمیں کسی طرح بھی یہاں سے نکلنا ہوگا۔'' وہ میری بات پر غور کرنے کے انداز میں بولا۔

"کاکے! تیری بات سے تو میں بھی متفق ہوں مگر..." ذرا کہتے کہتے رکا پھر بولا۔ "اس کے لیے ہمیں پہلے باہر کا جائزہ لینا ہوگا۔ پولیس کی پوزیشن کا اندازہ لگانا ضروری ہے۔ آ، آ ذرا۔" کہتے ہوئے وہ دروازے کی طرف بڑھا۔

"ہمیں چھت پر جا کر دیکھنا ہوگا۔ باقی تین پولیس والے کس طرف سے پوزیشن سنبھالے ہوئے ہیں۔" اول خیر خودکلامی کے انداز میں بڑبڑایا۔ پھر ہم زینے عبور کرتے ہوئے چھت پر آگئے اور فوراً سینے کے بل لیٹ گئے اور پھر ہم دونوں ہی دو مخالف سمتوں کی طرف سینوں اور کہنیوں کے بل رینگ گئے۔ میں نے چھت کی دو فٹ اونچی منڈیر سے بڑی احتیاط کے ساتھ نیچے جھانکا اور چونک پڑا۔ وہ پولیس والے یہاں بھی موجود تھے۔ میں واپس سرک گیا۔ اول خیر نے بھی رینگ کر بتایا کہ تین پولیس والے اس جانب سرگشت کر رہے ہیں۔ ہم دونوں نیچے آگئے۔ تہ خانے والے کمرے میں آکر رکے۔ ہم نے اندر سے کسی بھی کمرے کو کنڈی نہیں لگائی تھی۔ ممکن تھا کہ پولیس والا اندر داخل ہوسکتا تھا اگر وہ اندر سے دروازہ بند محسوس کرتا تو ٹھٹک سکتا تھا کہ اندر کوئی موجود ہے۔

ہم دونوں دوبارہ مرغیوں کے پنجرے میں داخل ہوئے اور تہ خانے میں اتر آئے۔

نجانے کیوں میرا دل بے چینی سی محسوس کر رہا ہے۔ باہر ٹلنے والا طوفان یوں محسوس ہوتا تھا جیسے وہ پوری طرح ٹلا نہ ہو۔ گھات لگائے یا چھپا بیٹھا ہو۔ شاید یہ میری غیر معمولی بیدار مغز چھٹی حس تھی کہ مجھے بار بار خطرے کا احساس دلا رہی تھی اور کوئی میرے اندر چیخ چیخ کر کہہ رہا تھا کہ "شہزی! بھاگ جا یہاں سے... بھاگ جا جلدی... یہاں تیری موت کا سامان کیا جا رہا ہے۔"

بے اختیار میں نے مضطربانہ لہجے میں اول خیر سے کہا۔ "یار! اول خیر جانے کیوں میرا دل بہت بے چینی محسوس کر رہا ہے لگتا ہے خطرہ ٹلا نہیں۔ کسی بھیانک عفریت کی طرح چھپا بیٹھا ہے اور موقع ملتے ہی لپکنے کو اٹھ کھڑا ہوگا۔"

"او خیر... کاکے! تیرے اندر لگتا ہے خطرہ بتانے والا کوئی الارم فٹ ہے۔" اس عالم میں بھی جانے کیوں اسے مذاق سوجھ رہا تھا۔ مگر وہ تھا زندہ دل آدمی۔ میں نے بدستور سنجیدہ لہجے میں کہا۔

"اول خیر! جس طرح... جانوروں اور پرندوں میں وقت سے پہلے خطرہ محسوس کرنے کی حس ہوتی ہے اسی طرح انسانوں کے اندر بھی قدرتی طور پر یہ حس ہوتی ہے جسے چھٹی حس کا نام دیا جاتا ہے۔ یہی میری بے کلی کا باعث ہو رہی ہے۔"

"او خیر... کاکے! میں تیرے ساتھ ہوں۔ اگر نکلنا چاہتا ہے تو آج رات ہی کوشش کر لیتے ہیں۔" وہ بولا۔

میں نے کہا۔ "نہیں اول خیر! رات نہیں رات سے پہلے۔ شام اترنے تک... ہمیں ہر صورت میں یہاں سے نکلنا ہوگا۔" میرے مضطربانہ اور حتمی لب و لہجے نے اس بار اول خیر کو بھی گمبھیر بنا دیا۔ بولا۔

"کاکے! تیرا دل کیا محسوس کر رہا ہے؟ کوئی تو وجہ ہوگی کہ تیرا ذہن کوئی انجانا خطرہ محسوس کر رہا ہے؟"

تہ خانے کی خاموشی اور محدود فضا میں ہم دونوں کی اسرار بھری سرگوشیاں ہمیں اپنے گھٹے گھٹے سینوں پر محسوس ہو رہی تھیں۔ میں نے جواباً گمبھیر سے لہجے میں کہا۔

"اول خیر! انسپکٹر روشن خان کا یہاں پولیس کے آدمی چھوڑ جانا آخر کیا معنی رکھتا ہے۔ یقیناً اسے یقین کی حد تک شبہ ہوگا ہم پر... کہ میں یہاں موجود ہوں۔ کہیں خفیہ گوشے میں چھپا بیٹھا ہوں۔"

"مگر یار کاکے!" وہ کچھ کہتے کہتے رکا۔ میں نے اپنی آواز کی سرسراہٹ جاری رکھی۔ بولا۔ "روشن خان ایک انتہائی چالاک اور مکار انسان ہے۔ اس نے پہلے چالاکی اور ہوشیاری کے ساتھ بیگم صاحبہ وغیرہ کا تعاقب کیا اور یہاں تک آن پہنچا۔ دیکھو اول خیر! ہر جگہ ہر حرکت جوش اور طاقت سے نہیں چلتا... جوش اور طاقت کے پیچھے اگر عقل و خرد کا انجن کارفرما ہو تو کامیابی یقینی ہوتی ہے۔ ممتاز خان اچھی طرح جانتا ہے کہ بیگم صاحبہ ہی درپردہ میری سپورٹ اور پشت پناہی کر رہی ہیں۔ رات والے واقعے کے بعد سے ہی اس نے بیگم والا کی نگرانی پر اپنی توجہ مرکوز کر رکھی۔ کیونکہ اسے یقین ہوگا کہ میری مدد کے لیے بیگم صاحبہ فوراً حرکت میں آئیں گی اور وہی ہوا۔ وہ جیسے ہی حرکت میں آئیں ان کا چوہدری ممتاز نے اپنے دائیں خود انسپکٹر روشن خان کو حرکت میں لے آیا۔ اول خیر! بات قانونی دائرے سے اوپر تک جا چکی ہے۔ اب صرف گولیاں چلیں گی جس کا نشانہ مجھے بنایا جاسکتا ہے۔ دال میں کالا ہے... اول خیر! مجھے یہاں سے نکلنا ہوگا۔"

میری اسرار بھری گفتگو پر اول خیر دم بخود سا رہ گیا۔ میں نے حالات کا اس کے سامنے جو تجزیہ سامنے پیش کیا ہے، اس نے اسے بھی چند... ثانیے کے لیے گوگو میں

دیا ہے یکایک اس کے چہرے پر پریشانی تشویش اور اندیشہ تک وسوسوں کے آثار نمایاں ہو کے جم سے گئے۔ اسی لہجے میں بولا۔

''اوخیر... کاکے بات تو تیری بھی پوری سولہ آنے ٹھیک لگتی ہے۔''

''ہاں اول خیر! بات ٹھیک سے بھی آگے جینا تنگ کی ہے۔'' میں نے پُرزور سے لہجے میں کہا۔ ''ہمیں یہاں سے نکلنا ہوگا فوراً سے بھی پیشتر...''

''تو اب فکر نہ کر کاکا۔ نکلنا ہے تو بس نکلنا ہے۔'' وہ یک دم جوش میں آ گیا۔ ''یہ پنج ست (پانچ سات) پولیس والے ہمارا کچھ نہیں بگاڑ سکتے۔ رات اور شام کی بات چھوڑ سہ پہر تو ہو ہی چکی ہے۔ ابھی نکلنے کی بات کر... اسلحہ تو ہمارے پاس بھی ہے۔''

''اسلحے کا استعمال ہمیں مزید خطرے میں ڈال دے گا اول خیر۔'' میں نے پُرسوچ لہجے میں کہا۔ ''ہمیں ان پولیس والوں کی ناک بچا کے نکلنا ہوگا جیسے انہیں معلوم ہی نہ ہو کہ ہم یہاں تھے بھی، لیکن ابھی نہیں ذرا شام کا گھیرا پھیلنے دے۔ اب مجھے ایک مشورہ دے۔'' آخر میں اس کی طرف دیکھ کر مستفسر ہوا۔ ''کہ... اپنے ان دونوں ساتھیوں کو بتا کر نکلیں یا...''

''انہیں بتانے کی ضرورت نہیں۔'' اول خیر نے فوراً کہا۔ ''شام ہوتے ہی نکلنے کی کوشش کریں گے۔ اس سے پہلے کہ بیگم صاحبہ کی کوئی نئی ہدایت آجائے۔'' بیگم صاحبہ کے ذکر پر اچانک میرے ذہن میں وہی دلچسپی ہوئی کرید بھی جاگ پڑی۔ لہٰذا میں نے بھی برملا پوچھ ہی لیا۔

''یار اول خیر! آخر یہ بیگم صاحبہ کا معاملہ کیا ہے؟ جب سے مجھے یہ پتا چلا ہے کہ وہ چودھری الف خان کی بیٹی اور ممتاز خان کی بڑی بہن ہے... میرے ذہن میں ان سے متعلق عجیب و غریب خیالات پروان چڑھنے لگے ہیں۔ بھلا سگے بہن بھائی کے درمیان ایسی سنگین دشمنی بھی ہو سکتی ہے۔ مجھے یقین نہیں آتا یار۔''

میری بات پر اول خیر کے چہرے کا رنگ بدلنے لگا۔ میری بھانپتی ہوئی نظروں نے فوراً تاڑ لیا کہ وہ پھر پہلو تہی اور گریز سے کام لینے والا ہے۔ فوراً آگے بولا۔ ''اول خیر! تو نے پہلے بھی مجھے یہ کہہ کر ٹال دیا تھا کہ تو بعد میں کسی اچھے وقت میں مجھے بیگم صاحبہ سے متعلق ساری تفصیل بتائے گا۔ اور یاد ہے تجھے... تو نے مجھے کھلاں والی... میں واضح طور پر یہ اشارہ بھی دیا تھا کہ آخر بیگم صاحبہ کو مجھ سے ایسی کیا دلچسپی ہے کہ وہ میری ضد اور غلطیوں کو معاف بھی کر دیتی ہے اور مجھے ایک اچھے دوست کا درجہ دیتی ہے۔ میرے سلسلے میں اس کا سخت گیر اور حاکمانہ رویہ یک دم کیوں ایک نامعلوم سی ملائمت میں بدلنے لگتا ہے... رہی بات کبل داد کے مجھ سے خار کھانے کی اس سے متعلق پہلے تو نے مجھے اشاروں کنایوں میں آگاہ تو کیا تھا مگر وہ بھی قیاس آرائیوں پر مبنی تھا مگر میں سچ اور حقیقت آج تیری زبان سے سننا چاہتا ہوں۔ بتا یار! آخر یہ بیگم صاحبہ کیا چیز ہیں؟ اور میں ان کے سامنے کیا حیثیت رکھتا ہوں؟ دیکھ اول خیر! ایک سوال پہلے ہی کسی دودھاری خنجر کی طرح میرے سینے میں پیوست رہتا ہے جسے میں نکال کر نہیں پھینک سکتا۔ اس کے زخم سے میرا خون اندر ہی اندر رستا ہے... پتا ہے... وہ خنجر جیسا سوال کیا ہے؟ وہ ہے میرا باپ... میں اسے تلاش کرنا چاہتا ہوں اس سے فقط اتنا سوال پوچھنا چاہتا ہوں کہ... اس نے مجھے خود سے کیوں دور کیا تھا؟ دو اپنی اولاد کو... جو ماں باپ کی آنکھوں کی ٹھنڈک اور دل کی راحت ہوتی ہے۔ جب وہ مجھے بچپن میں انتقال گھر چھوڑ کے گیا تھا تاں تو وہ بھی رویا تھا... مجھ سے جدائی کا دکھ اور اپنی سنگ دلی کا احساس سے بھی ہوتا تھا مگر میں اس سے یہ پوچھنا چاہتا ہوں کہ میری محبت کرنے والی حقیقی ماں کے بعد وہ جسے بیاہ کر گھر لایا تھا کیا ایسا اس نے اس کی خوشنودی حاصل کرنے کے لیے کیا تھا؟ اور اب میں دیکھنا چاہتا ہوں کہ اس عورت نے میرے باپ سے اتنا کٹھن اور جاں گسل قدم اٹھوانے کے بعد میرے باپ کو اس نے کیا دیا ہے؟''

کہتے کہتے میری آواز رندھ گئی۔ جذبات کے سوتے آنکھوں سے بہ نکلے... باپ جب بھی یاد آتا۔ پتا نہیں اس کی محبت میں میرے آنسو بہ نکلتے تھے۔ یا پھر اس کی سنگ دلی پر... مجھے پتا نہ چلتا۔ اول خیر نے بے اختیار مجھے اپنے گلے سے لگا لیا اور بھرپور لہجے میں بولا۔

''اوخیر... کاکے! تیرے دکھ کا مجھے بھی اندازہ ہے۔ پوچھے تو بتاؤں جب میرا باپ مرا تھا تاں... میں بہت رویا تھا۔ حالانکہ باپ کو مجھ سے بس واجبی سی محبت تھی مگر میں اپنے باپ سے بہت زیادہ محبت کرتا تھا یار کاکے ایہ باپ بیٹے کے درمیان بھی ایک عجیب سی رشتہ ہوتا ہے حالانکہ بیٹے کو ماں سے زیادہ پیار ملتا ہے مگر پتا نہیں کیوں یہ سالا بیٹا! اپنے باپ کو ہی کیوں زیادہ محسوس کرتا ہے۔ پتا نہیں بیٹا اپنے باپ کو کیا سمجھنے لگتا ہے۔ باپ کی واجبی محبت بھی بہت لگتی ہے مگر یار کاکے یہ بھی حقیقت ہی ہے باپ بھی

اپنے بیٹے سے کم محبت نہیں کرتا۔ پر پتا نہیں کیوں وہ اپنی محبت کو چھپاتا ہے مگر شفقت ظاہر کرتا ہے مجھے یاد ہے ایک بار میں بہت بیمار پڑ گیا تھا۔ میرے باپ کو غش آ گیا تھا۔ ماں نے ہی مجھے سنبھالا تھا۔"

ہم دونوں اپنے پھپھولے پھوڑ چکے تو اول خیر نے اپنے لہجے کی رقت پر قابو پاتے ہوئے بیگم صاحبہ والے موضوع کی طرف آتے ہوئے کہا۔

"یار اب بچی بات تو یہ ہے کہ بیگم صاحبہ کے حلیے میں، میں نے تجھے جو اشارہ دیا ہے وہ محض میری قیاس آرائی تھی، علم مجھے بھی نہیں ہے اس بات کا کہ بیگم صاحبہ اپنے دل میں تیرے لیے کس قسم کا پراسرار نرم گوشہ رکھتی ہے رہی بات یہ کہ وہ کون ہے... کیا ہے؟ اپنے باپ اور بھائی سے اس کی دشمنی کی وجہ کیا ہے، یہ میرا وعدہ ہے میں تجھے ضرور بتاؤں گا۔ یہ بہت ہی اور دردناک کہانی ہے۔ وعدہ رہا یہاں سے نکلتے ہی میرا دوسرا کام اس داستان سے تجھے پوری طرح آگاہ کرنا ہوگا ابھی ہمیں یہاں سے نکلنے کے منصوبے پر غور کرنے کی زیادہ ضرورت ہے۔"

میں نے پھر گہرے اور پرخیال لہجے میں اول خیر سے کہا۔ "یار اول خیر! پتا نہیں کیوں مجھے لگتا ہے بیگم صاحبہ کے ماضی کی دردناک داستان سننے کے بعد یہ گتھی بھی آپ ہی سلجھ جائے گی کہ وہ میرے لیے اس قدر نرم گوشہ کیوں رکھتی ہیں کوئی ایسی بات ضرور ہے۔ کبھی کبھی تو میں یہ سوچ کر بھی ڈر سا جاتا ہوں کہ کہیں... کہیں... کسی نہ کسی واسطے سے... میرا بھی تو بیگم صاحبہ کے دردناک ماضی سے تعلق تو نہیں؟"

"او خیر... کاکے!" اول خیر یک دم بولا۔ اس کے لہجے میں تشویش مترشح تھی۔ "رب سے خیر مانگ... ایسا سوچ بھی نہیں، چل چھوڑ اب اس خشک موضوع کو... پھر کبھی سہی... یہ بتا ادھر سے نکلنے کا تیرے دل میں کیا منصوبہ آتا ہے؟"

میں نے ایک گہری ہنکاری خارج کر کے خود کو اپنے شکستہ و ریختہ پڑتے اعصاب کو پرسکون کرنے کی کوشش چاہی... پھر بولا۔ "آؤ پہلے اس تہہ خانے سے تو باہر نکلو... کمرے کی کھڑکی سے ذرا باہر جھانک کر آسمان کا نظارہ کریں کہ سہ پہر کی کس کروٹ کے پیچھے شام چھپی ہوئی ہے۔"

"او خیر کاکے! تیرا مزاج بڑا شاعرانہ ہو گیا ہے۔" وہ ہنسا ہم دونوں تہہ خانے سے باہر کمرے میں آ گئے۔

اچانک ایک آواز پر ہماری سماعتیں ٹھٹک گئیں۔ ہم فوراً کھڑکی کی طرف لپکے۔ اور دوسرے ہی لمحے ہمیں ایک عجیب سی حیرت کا زبردست جھٹکا لگا۔ کیا دیکھتے ہیں کہ عمارت کی نگرانی پر مامور... وہ پانچ سات پولیس والے اپنی موبائل گاڑی میں سوار ہو کر رخصت ہو رہے تھے۔

"خیر... کاکے! اے کی گھمبیر ہے؟" (یہ کیا چکر ہے)۔

کھڑکی کے ساتھ میری طرح چپکے ہوئے اول خیر کے منہ سے بے اختیار نکلا۔ میں بغور پولیس موبائل کو کچے راستے پر غائب ہوتے دیکھ رہا تھا اور میری سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا کہ یہ کیا چکر تھا۔ یہ پولیس والے کیوں واپس لوٹ رہے تھے۔ کیا انسپکٹر روشن خان کی طرف سے انہیں فقط اتنی ہی ہدایات ملی تھیں کہ وہ اس وقت واپس لوٹ جائیں... گویا میرے سارے بدترین خدشات و شبہات محض میرا واہمہ تھے... میرا ذہن بدستور سوچ میں گم رہا کہ ایسے میں دفعتاً مجھے اول خیر کی خودکلامیہ اور سرسراتی ہوئی آواز سنائی دی۔

"او خیر... کاکے... وہ دیکھ..." اس نے کھڑکی سے دوسری سمت کی طرف اشارہ کرنے کے انداز میں کہا۔ میں نے چونک کر غیر معمولی طور پر پہلے اول خیر کے چہرے کی طرف دیکھا جو دھواں دھواں ہو رہا تھا۔ پھر میں نے دھڑکتے دل کے ساتھ اس کی نظروں کی سیدھ میں دیکھا اور سرتاپا مجھے میرے پورے وجود میں لاتعداد چیونٹیاں رینگنے لگیں۔ کچی سڑک سے عمارت کی طرف آتے ہوئے کچے راستے پر تین عدد بھاری گاڑیاں انتہائی تیز رفتاری کے ساتھ آگے پیچھے دوڑی چلی آ رہی تھیں۔ ایک لینڈ کروزر تھی دو بھاری جیپیں تھیں میں اور اول خیر سکتے کی کیفیات سے دوچار تھے۔ کچھ قریب آنے پر مجھے گاڑیوں کے اندر اندر چہروں پہ موت کی خونخواری لیے آدمیوں سمیت ان کی گنوں کی جھلک بھی صاف دکھائی دینے لگی تھی۔

عمارت کے سائیں سائیں کرتے ماحول میں چھپتے ہوئے آسیبی سناٹے میرے بدترین اور اندیشناک خدشات کی تصدیق کر رہے تھے۔

خونی رشتوں کی خودغرضی اور پرائے بن جانے والے اپنوں کی بے غرض محبت میں پرورش پانے والے نوجوان کی سنسنی خیز سرگزشت کے مزید واقعات آئندہ ماہ

مرگ و حیات... سود و زیاں اور بزم ہستی کا ہنگامہ انسان کے تخیلات میں ایک جال سا بُن دیتے ہیں... تضادات و اختلافات کا ازدحام اس کے اندر ایک طوفان سا بپا کر دیتا ہے... اور اس کے اندر کا انسان باہر کے انسان سے متصادم ہو جاتا ہے... دو مختلف آدمیوں کی ایک ایسی ہی کہانی... ایک کامیاب تھا اور ایک ناکام... ایک گناہ گار تھا... دوسرا بے گناہ... رگِ جاں کو مجروح کر دینے والی مختصر بیانی...

اعتراف گناہ کی ذیل میں [illegible]

دُہرا اعتراف

امجد رئیس

دروازہ کھلنے سے قبل میں ایک لمحے کے لیے ساکت کھڑا رہا۔ میں ہچکچاہٹ کا شکار تھا۔ ''ہم پہنچ گئے ہیں۔'' خاتون... جسے مجھے لینے کے لیے بھیجا گیا تھا، دوسری بار گویا ہوئی اور میں نے اندر قدم رکھ دیا۔

پہلی نظر میں مجھے کچھ دکھائی نہیں دیا۔ لیمپ میں کم طاقت کا بلب لگا ہوا تھا۔ لیمپ کے شیڈ سے روشنی کم ہی باہر آ رہی تھی۔ اسی روشنی نے ماحول کو مکمل تاریکی سے بچایا ہوا تھا۔

کچھ دیر میں، میری آنکھیں اس نیم تاریک ماحول کی عادی ہوگئیں۔ دیوار کے ساتھ ایک مسہری رکھی تھی۔ میں بمشکل اندازہ لگا پایا کہ مسہری خالی نہیں ہے۔ وہاں ایک نحیف و نزار شخص لیٹا تھا جو کمزوری کے باعث بستر کا ہی حصہ معلوم ہو رہا تھا۔

چھت پر برسات کی ٹپ ٹپ جاری تھی۔ وقتاً فوقتاً تیز ہوا کا جھکڑ شائیں شائیں کرتا۔ تاہم یہ آواز خالی چمنی کے ذریعے گزر کر اندر آتی تو ایک ڈراؤنی کراہ میں بدل جاتی۔

ان دونوں آوازوں کے علاوہ تیسری آواز ”خاموشی“ کی تھی۔ سکوت...... سناٹا۔ یہ سکوت مرگ آسا تھا۔

”جناب۔“ خاتون بستر کے قریب جھک کر بولی۔

”آپ نے جس معزز آدمی کو بلوایا تھا، وہ حاضر ہے۔“

لاغر شخص نے کہنیوں کی مدد سے اٹھنے کی کوشش کی۔ خاتون نے سہارا دے کر اس کی کمر کے پیچھے تکیہ لگا دیا۔ وہ کسی شبیہ کی طرح دکھائی دے رہا تھا، جس کے نقوش واضح نہیں تھے۔

”میڈم ہمیں تنہا چھوڑ دیں، میں آپ کا مشکور ہوں۔“ ایک نقاہت زدہ آواز ابھری۔ خاتون نے کمرے سے نکل کر دروازہ بند کر دیا۔ میں اس پُراسرار صورتِ حال کو سمجھنے کی کوشش کر رہا تھا۔

”میرے قریب آجاؤ مسٹر ساجد! میری بینائی تقریباً رخصت ہو چکی ہے۔“ نیم جان شخص کی نحیف آواز سنائی دی۔ میں اپنا نام سن کر حیرت زدہ رہ گیا۔ اگرچہ یہ زیادہ تعجب کی بات نہیں تھی۔ کیونکہ وہ خاتون ظاہر ہے کہ مجھے ساجد کے نام سے ہی تلاش کرتی ہوئی میرے دفتر پہنچی تھی۔ یقیناً نام بستر پر موجود شخص نے ہی بتایا ہوگا۔

میں کرسی گھسیٹ کر اس کے قریب بیٹھ گیا۔

”میں تکلیف کے لیے معذرت خواہ ہوں لیکن یہ ایک سنجیدہ اور حساس معاملہ ہے۔ شکر ہے کہ آپ آ گئے۔ میری زندگی کے دن قریب الختم ہیں اور میں اس دارِ فانی سے کوچ کرنے سے قبل آپ کو کچھ بتانا چاہتا ہوں۔“

میں نے اسے پہچاننے کی کوشش کی۔ تاہم ناکام رہا۔ میں شاید پہچان بھی لیتا لیکن اس کے مرض اور لاغری نے اس کے چہرے کا حلیہ اور نقوش یکسر تبدیل کر دیے تھے۔

”پہلے مجھے بتاؤ کہ تم ساجد ہی ہو؟“ اس نے سوال کرتے ہوئے آنکھیں مزید کھولنے کی کوشش کی۔ میں نے اسے اطمینان دلایا۔

اس نے مطمئن انداز میں سانس خارج کی۔

”او، آخر مجھے اعترافِ گناہ کا موقع مل گیا۔ شاید تم مجھے پہچانے نہیں ہو۔“

میں نے اس کے اندازے کی تصدیق کی۔

بوڑھے نے کہنا شروع کیا۔ ”یہ برسوں پرانی بات ہے۔ میں ان دنوں ایک نوجوان وکیل ہوا کرتا تھا۔ لوگوں کی میرے بارے میں رائے تھی کہ میرا مستقبل تابناک ہے۔ میں نے اس رائے کو صحیح ثابت کرنے کے لیے مقدمات کی میرٹ کو نظرانداز کرنا شروع کر دیا۔ میں نے وہ مقدمے بھی جیتے جو مجھے ہارنے چاہیے تھے یا لڑنے ہی نہیں چاہیے تھے لیکن میں فتح مندی کے نشے میں سرشار تھا۔“

اس نے آرام کے لیے وقفہ لیا۔ میں آواز کے ذریعے بھی اسے پہچان نہیں پایا تھا۔

”میرا تجربہ اور داؤ پیچ نکھرتے جا رہے تھے۔ مانگ کے ساتھ معاوضے میں بھی اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔ پھر ایک ہائی پروفائل مقدمہ میرے ہاتھ آیا۔ یہ دہرے قتل کا مقدمہ تھا اور خاصا دشوار تھا۔ اگر میں یہ مقدمہ جیت جاتا تو شہرت و ساکھ کے زینے پر کافی اونچا چلا جاتا۔

”شروع میں، میں نے ہاتھ ڈالنے سے انکار کے بارے میں سوچا تھا لیکن ایسے مواقع بار بار نہیں آتے۔ مجھے کافی بھاری معاوضہ مل رہا تھا۔ مجھے اس کیس میں ہزیمت کا خطرہ بھی نظر آ رہا تھا۔ پھر مجھے کسی انگریزی ناول کا مکالمہ یاد آیا۔ ("No guts no glery") یوں کہا جا سکتا ہے کہ جو لوگ خطرات مول نہیں لے سکتے، وہ زندگی میں کوئی بڑی کامیابی... حاصل نہیں کر پاتے۔“

وہ پھر سانس بحال کرنے کے لیے رکا۔ میں نے اس کی حالت کے پیشِ نظر خاموشی سے کہانی سننے پر اکتفا کیا۔

”بالآخر میں نے ایک بڑا فیصلہ کیا۔“ وہ پھر گویا ہوا۔ ”میں نے کیس میں ہاتھ ڈال دیا۔ میں تن من دھن سے کیس لڑ رہا تھا۔ سارا تجربہ میں نے اس کیس میں جھونک دیا۔ حتیٰ کہ انڈر گراؤنڈ کا ایک گر گا بھی سراغ رسانی کے لیے ہائر کر لیا۔

”مسٹر ساجد! کیس جیتنے کے لیے میں نے چند ناجائز داؤ پیچ بھی استعمال کیے۔ مجھ پر جنون طاری تھا۔ ملزم کے وفاقی وکیل نے سرتوڑ کوشش کی۔ مجھے اپنے کیریئر کی بہترین فائٹ کا مظاہرہ کرنا پڑا۔ میری بے پناہ کوششوں کے نتیجے میں کچھ نکات ایسے بھی سامنے آئے کہ مجھے محسوس ہونے لگا کہ ملزم واقعی قاتل ہے۔ اس امر نے میرے ضمیر کی مبہم خلش کو بھی مٹا دیا۔

"میرا اعتماد اور دلائل عروج پر تھے پھر فیصلے کا دن آن پہنچا۔ میڈیا نے اس کیس کو اچھی خاصی کوریج دی تھی۔"

وہ پھر سانس بحال کرنے میں لگ گیا۔

"اور اسے موت کی سزا سنا دی گئی۔ مجھے یہ کہنے میں کوئی عار نہیں کہ وکیل دفاع نے بہترین مزاحمت پیش کی تھی۔ پھانسی والے روز اس نے صرف اپنے وکیل اور مولوی صاحب سے بات کی۔ مجرم نے مجھے دیکھا، لیکن کوئی بات نہیں کی۔" نہ اس نے اپنی آخری خواہش بیان کی۔ وہ جب مجھے دیکھ رہا تھا تو میں نے اس کی آنکھوں میں گہرا سکون دیکھا۔ ساکن سمندر کے مانند۔ میں اس تاثر کو بھلا نہ سکا۔

میراز الجھ گیا۔

"جب فیصلہ سنایا گیا تھا اس وقت میں نے اس کے لیے ہمدردی کی لہر محسوس کی تھی مگر احساسِ فتح فوراً ہی ہمدردی پر غالب آ گیا تھا۔"

مجھے اچانک بے چینی کا احساس ہوا۔

"کیا تم مجھے اس کا نام نہیں بتاؤ گے؟" میں نے تمام کہانی میں پہلا سوال کیا۔

"کیوں نہیں، بتاؤں گا، بتاؤں گا۔ آنے والوں دنوں میں، میں الجھتا ہی چلا گیا۔ میں اس کی موت کو نہ بھلا سکا۔ اس کی موت اور اس کی آنکھوں کا آخری ناقابلِ برداشت تاثر میرے دل و دماغ کو جکڑتا جا رہا تھا۔ میری خلش بڑھتی رہی۔

"میرے احباب کا کہنا تھا کہ میرے لیے یہ اپنی نوعیت کا پہلا کیس تھا۔ اس لیے میں پریشان ہو رہا ہوں۔ کچھ عرصے بعد یہ زائل ہو جائے گا۔

"تاہم ایسا کچھ بھی نہیں ہوا۔ مجھے ڈراؤنے خواب آنے لگے۔ بارہا میں نے خواب میں اسے پھانسی پر جھولتے ہوئے ہنستے دیکھا۔

"بالآخر میرے ضمیر کی متواتر چبھن نے مجھے مجبور کر دیا کہ میں کچھ کروں، کیا وہ بے قصور تھا؟ یہ سوال کسی زہریلی کیل کی طرح مستقل میرے دماغ میں پیوست تھا۔"

☆☆☆

"بالآخر میں نے تمام ریکارڈ دوبارہ نکالا اور نہایت باریک بینی سے دوبارہ تفتیش شروع کر دی۔ میں یہ کام اکیلا ہی خاموشی سے کر رہا تھا۔

"چونکہ یہ ریکارڈ میرے نقطۂ نظر کا عکاس تھا۔ اس لیے میں نے دفاع کے ریکارڈ کی کاپی بھی حاصل کی۔ حتیٰ کہ میں جائے واردات پر بھی کئی بار گیا۔

"اپنی فتح کو غلط ثابت کرنا، یہ کوئی آسان کام نہ تھا۔ غالباً غیر ضروری بھی تھا لیکن میں جس کرب سے گزر رہا تھا، مجھے کوئی واضح جواب حاصل کرنا ہی تھا۔"

وہ رک گیا۔ اس کی سانس پھول گئی تھی۔ میں نے قریبی میز پر رکھے جگ سے گلاس میں پانی لے کر اسے پلایا۔

وہ خلا میں گھور رہا تھا۔ مجھے محسوس ہوا کہ اس کی آنکھوں کی روشنی کچھ اور مدھم ہو گئی تھی۔

تجت والی میز پر دواؤں کا ڈھیر لگا تھا۔ جن میں زیادہ تر سکون آور ادویات، لورازے پام، ڈایازا پام، سیپرا کس۔ ٹیگریٹول، ڈوجکس، وغیرہ وغیرہ۔ میں حیران تھا کہ وہ اس قسم کی دوائیاں کس ڈاکٹر کے تحت استعمال کرتا رہا ہے اور ڈاکٹر کون ہے؟

پانچ منٹ گزر گئے۔ اس نے پھر بولنا شروع کیا۔

"ایک وقت آیا کہ تمام تر کارروائی میں، میں نے پہلا سقم تلاش کرلیا۔ اگرچہ یہ ایک چھوٹا کلیو تھا۔ تاہم اس نے میرے آگے بڑھنے کی رفتار میں اضافہ کر دیا۔ شکوک و شبہات نے میرے ذہن میں گھر کر لیا تھا۔" اس کی آواز میں اذیت تھی۔

"میں زیادہ دور تو نہ جا سکا لیکن بحیثیت ایک وکیل کے مجھے احساس ہو گیا کہ قاتل وہ نہیں تھا بلکہ قاتل میں تھا جس نے اس کو سزا دلوائی...... اس کی پیشانی پر موٹی موٹی رگیں ابھر آئیں۔ "لیکن اب میں کچھ نہیں کر سکتا تھا۔ وہ ایک بار پھانسی پر لٹک چکا تھا۔ میرا ضمیر روز مجھے موت کی سزا دیتا تھا۔ میرے پاس کوئی حل نہیں تھا۔ میرا ذہن ماؤف ہو گیا۔ زندگی کا ہر رنگ پھیکا پڑ گیا۔

"مجھے خیال آیا کہ میں اعتراف کرلوں۔ لیکن میں بزدل تھا۔ مجھ میں ہمت نہیں تھی۔ میں تضحیک اور ملامت کا نشانہ بن جاتا۔" اس کی آواز لرزنے لگی۔

"میں کسی ڈاکٹر کو بلاتا ہوں۔" میں اٹھنے لگا۔

"نہیں۔ ڈاکٹر کا وقت گزر چکا ہے۔ میں صرف اعتراف کرنے کے لیے زندہ ہوں۔" وہ کھانسنے لگا۔

پھر کچھ دیر بعد بولا۔ "میں نے وکالت چھوڑ دی۔ میں نے زندگی کی رعنائیوں سے منہ موڑ لیا۔ میں نے اپنی دولت ضرورت مندوں میں تقسیم کرنی شروع کر دی لیکن میں سکون کی دولت حاصل کرنے میں ناکام رہا۔

"میں نے علاقہ چھوڑ دیا۔ خود ساختہ قید تنہائی اپنالی۔ بالآخر جان لیوا بیماری نے مجھے دبوچ لیا۔ کاش میں نے مرنے والے کی آخری نظر نہ دیکھی ہوتی۔" اس کے کمزور چہرے پر پسینا نمودار ہو گیا۔ اس کی آواز نحیف سے نحیف تر ہوتی جا رہی تھی۔

میری چھٹی حس کہہ رہی تھی کہ وہ کسی وقت بھی آخری سانس لے سکتا ہے۔ ساتھ ہی مجھے احساس ہوا کہ جس کیس کی وہ بات کر رہا ہے، میں اس کے قریب پہنچ گیا ہوں۔

لیکن میں ابھی اظہار نہیں کرنا چاہتا تھا۔ جیسے ہی وہ مذکورہ بے گناہ مجرم کا نام لیتا، میرے اندازے کی تصدیق ہو جاتی۔

"میں اس کہانی کو اپنے ساتھ قبر میں لے جانا نہیں چاہتا۔ میرے پاس جو رقم بچی ہے، اسے تقسیم کرنے کی سکت نہیں ہے۔ یہ کام تم نہیں کرو گے؟" اس نے گویا سوال کیا۔

"میں وعدہ کرتا ہوں۔" میں نے اسے یقین دلایا۔

میں آگے کی جانب جھک گیا۔ اس کے ہونٹ لرز رہے تھے۔ "تم یہ رقم ضرورت مندوں کو میرے نام سے تقسیم نہیں کرو گے۔" اس نے کہا۔ "بلکہ تم یہ رقم شہراز کے نام پر تقسیم کرو گے۔"

"میں ایسا ہی کروں گا۔" میرے اندازے کی تصدیق ہو گئی تھی۔ "تم شہراز امین کی بات کر رہے ہو؟" تمام وقت میں یہ میرا دوسرا سوال تھا۔

"ہاں، اور تمہارا پورا نام ساجد رحیم ہے۔ تم شہراز کا دفاع کر رہے تھے۔ اس کیس میں...... میں جانتا ہوں کہ تم ساری بات سمجھ گئے ہو۔" اس کی آواز اٹکنے لگی۔ "میں تمہارے سامنے...... اعتراف کرنا چاہتا تھا۔ اس...... لیے میں نے تمہیں بلایا۔"

میری گدی کے بال کھڑے ہو گئے۔ وہ سرکاری وکیل فیصل کرمانی تھا۔

میں شدید کشمکش کا شکار تھا۔ ساتھ ہی رنج کی شدت نے مجھے ہلا کر رکھ دیا تھا۔

وہ ہاتھ چھت کی جانب اٹھا کر شہراز کو آواز دے رہا تھا۔ اس کی آواز سرگوشی میں ڈھل گئی تھی۔

کیا میں اسے بتا دوں؟ کیا وہ اب بھی بچ سکتا ہے؟ میرا دماغ چیخنے لگا۔ "فیصل...... فیصل......" میں گویا چلانے لگا۔ "فیصل تم نے ٹھیک کیا تھا۔ پھانسی والے روز شہراز نے مجھ سے اعتراف کیا تھا کہ وہ دونوں قتل اسی نے کیے تھے۔" میری بات ادھوری رہ گئی۔ میں آنکھیں پھاڑے فیصل کرمانی کو دیکھ رہا تھا۔ اس کا ہاتھ بستر سے نیچے لٹک رہا تھا اور سر ایک جانب ڈھلک گیا تھا۔

میں نے اس کی نبض پر ہاتھ رکھا۔ ماضی نے مجھے اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ قاتل نے بھی آخری وقت میں اعتراف کے لیے مجھے چنا اور بے گناہ وکیل نے بھی آخری وقت میں اعتراف کے لیے مجھے منتخب کیا۔

میں ہمیشہ غور کر کے یقین دلانے کی کوشش کرتا رہا کہ فیصل کرمانی نے جان دینے سے قبل میرا انکشاف ضرور سنا تھا۔

صندوق

منظر امام

انسان کی اوقات و طاقت کچھ بھی نہیں ہوتی... یا بہت ہی کم ہوتی ہے... لیکن اس کا تکبر اس کی ہار کی وجہ بن جاتا ہے... معمولاتِ زندگی میں ایسے بہت سے مقامات آتے ہیں... جب وہ شکست کو قبول نہیں کرتا... اور غرور و تکبر... احسان فراموشی کی قبا میں چھپتا چلا جاتا ہے...

رویوں اور سوچوں کی یلغار... قابلِ گرفت حقائق کی للکار... منظر امام کے قلم کی پکار

میں نے چور نگاہوں سے اس کمرے کی طرف دیکھا۔

مضبوط جسم کا وہ ورکر اپنے کام میں مصروف تھا۔ وہ پیکنگ کرنے والوں کو اپنے اکھڑ اور سخت لہجے میں ہدایات دینے میں مصروف تھا۔

اس کا نام حامد تھا۔ اس کے بارے میں بتایا گیا تھا کہ وہ پابندی سے ورزش کرتا ہے۔ جم جاتا ہے۔ اس کے مضبوط جسم کی ساخت بھی یہی بتاتی تھی کہ وہ ایک طاقت ور

انسان ہے۔

میں نے اسے مزدوروں کو کنٹرول کرنے پر لگا دیا تھا۔

یہ بہت پرانی فیکٹری تھی اور میری ملازمت بھی بہت پرانی ہو چکی تھی۔ میں نے جب یہاں ملازمت شروع کی تو میرا کام بھی پیکنگ ہی تھا۔۔۔ اس وقت مجھے ایسا محسوس ہوتا جیسے ڈبوں کے ساتھ ساتھ میں خود بھی کسی ڈبے میں پیک ہو گیا ہوں۔ اس وقت سپروائزر رشید تھا۔ انتہائی سخت گیر انسان۔ وہ ہم مزدوروں کو آٹھ گھنٹے کے لیے جیسے ڈبے میں بند کر کے رکھ دیا کرتا تھا۔

مجھے ایسا لگتا۔۔۔ جیسے وہ خاص طور پر میرے ہی پیچھے پڑا ہو۔ میں جب بھی ذرا سی دیر کے لیے کمر سیدھی کرنے لگتا تو وہ کسی بلا کی طرح نازل ہو جاتا۔

”کیا ہو رہا ہے یہ۔ ابھی تم نے کام ہی کیا کیا ہے جو کمر سیدھی کرنے لگے۔ یہ تمہارے باپ کا گھر نہیں ہے جہاں تم آرام کر سکو۔ یہاں کام ہوتا ہے کام۔“

”سر! میں کام ہی تو کر رہا ہوں۔“ میں دھیرے سے کہتا۔

”اس طرح کام ہوتا ہے؟“ وہ دہاڑتا۔ ”کام پوری توجہ چاہتا ہے، سمجھے۔“

ایک بار تو اس نے حد ہی کر دی۔۔۔ میں ذرا سی دیر کے لیے کھڑکی سے باہر جھانک کر دیکھ رہا تھا کہ وہ پھر نازل ہو گیا۔ ”یہ کیا کر رہے تھے تم؟“

”سر! میں ذرا کھڑکی سے باہر دیکھ رہا تھا۔“

”لیکن کیوں؟“

”بہت گھٹن سی ہو رہی تھی۔“ میں نے بتایا۔ ”میں نے سوچا دو چار گہری گہری سانسیں لے لوں۔“

”یہاں کوئی آکسیجن کا پلانٹ نہیں لگا ہوا ہے کہ تم گہری گہری سانسیں لو گے۔“ وہ غرایا۔ ”ایک تم ہی انوکھے نہیں ہو اور بھی لوگ یہاں کام کر رہے ہیں۔ اگر سب تمہاری طرح سانسیں لینے لگے تو ہو چکا کام۔ چل چکی فیکٹری۔“

کبھی کبھی تو اس کی باتوں سے میری آنکھوں میں آنسو بھی آ جاتے تھے۔ پتا نہیں کیسا آدمی تھا جو صرف میرے ہی پیچھے پڑا رہتا۔۔۔ اسے کوئی دوسرا دکھائی نہیں دیتا تھا۔

اگر مجبوریاں نہ ہوتیں تو میں بہت پہلے ہی اس فیکٹری کی ملازمت پر لعنت بھیج کر یہاں سے جا چکا ہوتا۔

یہاں تو زندگی عذاب ہو گئی تھی لیکن مسئلہ وہی بے روزگاری کا تھا۔ اگر ملازمت چھوڑ دیتا تو کہاں جاتا، کیا کرتا؟

میرے دو چھوٹے بچے تھے۔ ایک بیوی تھی۔ کرائے کا گھر تھا۔ دنیا بھر کے اخراجات تھے۔ یہ سب کہاں سے پورے ہوتے۔ کوئی ساتھ دینے والا نہیں تھا۔

نہ جانے کیوں کچھ لوگوں کے لیے زندگی اتنی بے رحم اور دشوار کیوں ہو جاتی ہے کہ وہ خوشیوں کا کوئی لمحہ دیکھ ہی نہیں پاتے۔ اور کچھ لوگ ایسے بھی ہوتے ہیں جن کی طرف خوشیوں کے سمندر کا بہاؤ جاری رہتا ہے۔

لاکھ محنت کرتے رہو۔ کچھ بھی نہیں ہوتا۔

میں کبھی کبھی جھلا کر پیسے کمانے کے لیے الٹے سیدھے طریقے بھی سوچنے لگتا لیکن ہر پلاننگ ناکام ہوتی ہوئی محسوس ہوتی۔ مجھ میں اتنا حوصلہ ہی نہیں تھا۔

ایک سیدھی سادی بے ضرری زندگی گزاری تھی میں نے۔ ایک خوف زدہ رہنے والا شخص تھا جس کس طرح کوئی جرم کر سکتا تھا۔ اسی لیے فیکٹری میں جو ملازمت ملی وہ فوراً قبول کر لی۔ کیونکہ میرے پاس اور کوئی راستہ بھی تو نہیں تھا۔

لیکن مجھے کیا پتا تھا کہ میں یہاں ایک بے رحم اور سخت مزاج شخص کے حوالے کر دیا جاؤں گا۔ رشید شاید اپنی فطرت ہی میں ایک سخت دل انسان تھا۔

اسے دو منٹ کے لیے بھی کسی کی خوشی برداشت نہیں ہوتی۔ ہم ورکرز ذرا سی دیر کے لیے بھی آپس میں کچھ ہنسنے بولنے لگتے تو وہ نہ جانے کہاں سے آ ٹپکتا۔

”کیا ہو رہا ہے یہ؟“ وہ غرا کر پوچھتا۔

”کچھ نہیں سر، بس یونہی باتیں کر رہے تھے۔“ میں کہتا۔

پورے شعبے میں صرف میں واحد شخص تھا جو رشید کی کسی بات کا جواب دے پاتا تھا ورنہ دوسرے تو سہم کر رہ جاتے۔ یہ اور بات ہے کہ وہ دل ہی دل میں اسے ہزاروں گالیاں دیتے ہوں۔

ڈپارٹمنٹ کے دوسرے ورکرز نے رشید کو جواب دینے کے لیے مجھ ہی کو مقرر کر رکھا تھا اسی لیے رشید سے میں ہی بات کیا کرتا تھا۔

شاید رشید اسی لیے میرے پیچھے پڑا رہتا تھا کیونکہ دوسرے تو سر جھکا لیتے تھے لیکن میں کچھ نہ کچھ بول دیتا تھا۔ اس کے بارے بھی وہ سب کرتا ہے جو رشید کہتا۔

فیکٹری سے باہر نکلنے کے بعد ایسا... محسوس ہوتا جیسے خدا مجھے ایک بند صندوق سے نکال کر کھلی فضا میں لے آیا ہو۔ تازہ ہوا میں بدن کو خوش گوار احساسات دینے لگتیں۔ بے پناہ آزادی محسوس ہوتی۔ زندگی ہمیشہ کی طرح خوب صورت لگنے لگتی...

لیکن یہ سب فیکٹری سے نکلنے کے بعد یا اس سے پہلے کے احساسات ہوتے۔ فیکٹری میں داخل ہوتے ہی ایک ایسے صندوق میں بند ہو جاتا جس میں ہوا کا گزر بھی نہیں ہوتا تھا۔

ایسی گھٹن ہوتی کہ موت کے قریب پہنچ جاتا۔ اوپر سے رشید کی مکروہ آواز۔ اس کا بے رحم رویہ..... خودکشی کروانے کے لیے کافی تھا۔ لیکن پھر وہی مجبوری اور ہی پریشانیاں دل پر پتھر رکھ کر خاموش رہ جاتا۔

پھر ایک دن اس نے سفاکی کی انتہا کر دی۔

اس نے مجھے بہت ہی توہین آمیز انداز میں مخاطب کیا۔ "تم یہ کیا بار بار کام سے ہاتھ روک کر بیٹھ جاتے ہو۔ کیا تم نے اس فیکٹری کو اپنے باپ کی فیکٹری سمجھ رکھا ہے؟"

یہ انتہا تھی۔ اس نے مجھے آگ بگولا کر کے رکھ دیا تھا۔ اس کے باوجود میں صرف اتنا کہہ سکا۔ "رشید صاحب! ایسا لگتا ہے جیسے یہ فیکٹری نہیں بلکہ کوئی صندوق ہے جس میں مجھے بند کر دیا گیا ہو؟"

"اگر صندوق میں بند ہو گیا ہے تو جا نکل جا صندوق سے باہر۔" اس نے کہا۔

میں خون کے گھونٹ پی کر رہ گیا۔

اس رات میں نے زندگی میں پہلی بار کسی کے لیے بہت سنجیدگی سے سوچا۔ اسے مار ڈالنے کے لیے۔ اس کا خون کرنے کے لیے۔ کیونکہ اب بات میری ذات تک تھی۔ وہ آدمی مسلسل میری توہین کیے جا رہا تھا۔ اس نے مجھے فیکٹری کا ملازم نہیں بلکہ اپنا غلام سمجھ رکھا تھا۔

اب نوکری جائے جہنم میں۔ اب ایک ہی دھن سر پر سوار ہو چکی تھی اور وہ تھی رشید کو راستے سے ہٹا دینے کی۔ میں اس کے منحوس سائے کو بھی خود سے قریب نہیں رکھنا چاہتا تھا۔

میری زندگی کا مقصد صرف یہی رہ گیا تھا کہ اس کمینے کا پتا صاف کر دیا جائے۔ لیکن کس طرح۔ میں نے تو اپنی پوری زندگی میں کسی بلی کے بچے کو بھی نہیں مارا پھر یہ تو انسان تھا۔ جیتا جاگتا۔ چنگھاڑتا ہوا انسان۔ جو جسمانی طور پر مجھ سے کہیں زیادہ مضبوط تھا۔ میں اس سے لڑتا تو بھی اس کو نہیں

..... اور ہاں سنو۔ اس کے بعد تمہیں باورچی خانے کی پلیٹیں بھی صاف کرنی ہیں۔

مار سکتا تھا۔

اس کو مارنے کے کئی طریقے میرے ذہن میں آ رہے تھے۔ جیسے زہر۔ لیکن سوال یہ تھا کہ اسے زہر کیسے دیا جائے۔ ہمارے درمیان کبھی ایسی بے تکلفی نہیں رہی کہ میں اسے کھانے پینے کی کوئی چیز پیش کر سکتا۔

دوسرا حربہ تھا گولی۔ لیکن اول تو اس قسم کا کوئی اسلحہ میرے پاس نہیں تھا اور اگر بندوبست ہو بھی جاتا تو ایسا قتل آسان نہیں ہوتا۔ اس کے لیے بہت حوصلے کی ضرورت ہوتی ہے۔ پھر یہ بھی ہوتا ہے کہ اس قسم کے اسلحے استعمال کرنے والے پکڑے بھی جاتے ہیں۔

تو پھر کیا کیا جائے۔ اس شخص کی بدتمیزیاں بڑھتی جا رہی تھیں۔ اس کو کس طرح ٹھکانے لگاتا۔ پھر ایک دن ایک ترکیب سمجھ میں آ ہی گئی۔

ایسا کبھی نہیں ہوا ہوگا۔ لیکن اس دن ہو ہی گیا۔

پکنک پر جانے کا پروگرام بن گیا تھا۔ یہ پروگرام پکنک والوں نے بنایا تھا۔ یعنی اس ڈپارٹمنٹ نے جہاں میں کام کرتا تھا اور یہ بھی اتفاق تھا کہ رشید جیسے سخت دل اور اکھڑ

مزاج انسان نے بھی نہ صرف اجازت دے رکھی تھی بلکہ وہ بھی ساتھ چل رہا تھا۔

اتفاق نہیں بلکہ اس نے فیکٹری کے مالکان کو کسی طرح اس بات پر راضی کر لیا تھا کہ وہ ہمارے شعبے کو ایک دن کی چھٹی دے دے۔

پہلے تو میرا ارادہ جانے کا نہیں تھا لیکن جب یہ پتا چلا کہ یہ پکنک گڈانی کے ساحل پر ہو رہی ہے تو میں فوراً تیار ہو گیا۔

وہاں کوئی نہ کوئی چانس مل سکتا تھا۔

وہ ساحل میرا دیکھا ہوا تھا۔ اونچی پہاڑیاں تھیں جن کے نیچے سمندر کا پانی پرشور آواز میں پتھروں سے ٹکرایا کرتا۔

عام طور پر بہت سے لوگ اونچی ٹیلوں پر بیٹھ کر سمندر کا نظارہ کرتے تھے۔ رشید کا مزاج بھی ایسا ہی تھا۔ میرے اندازے کے مطابق وہ سمندر میں جا کر نہانے کے بجائے کسی ٹیلے پر بیٹھ کر سمندر کو دیکھتا رہے گا۔ تاکہ وہاں سے اپنے اسٹاف پر نظر رکھ سکے۔

اگر ایسا ہوا تو پھر کام بہت آسان تھا۔ میں کسی طرح اپنے ساتھیوں سے الگ ہو کر ٹیلے کی طرف آ جاتا۔ رشید کی نگاہیں تو سامنے سمندر کی طرف ہوتیں۔ اسے احساس بھی نہیں ہوتا... کہ اس کی موت اس کے قریب آ چکی ہے۔ بس ایک ہلکا سا دھکا اسے نیچے پتھروں پر لے جا کر پٹخ دیتا اور کام ختم۔

اس کی چیخ دوسروں کو متوجہ تو ضرور کر لیتی۔ لیکن کوئی مجھے نہیں دیکھ پاتا۔ میں فوراً لیٹ جاتا اور اس طرح اس کی موت کو ایک سانحہ یا حادثہ سمجھا جاتا اور کہانی ختم ہو جاتی۔

میرا خیال تھا کہ ڈپارٹمنٹ کے ہر شخص کو اس کی موت سے خوشی ہوتی۔ بظاہر سب ہی افسوس کرتے۔ وہ چونکہ فیکٹری کا پرانا ملازم تھا۔ اس لیے ممکن تھا کہ اس کے سوگ میں ایک دن کے لیے پیکنگ کے شعبے میں چھٹی بھی کر دی جاتی۔

اس کے بعد فیکٹری کے حالات اپنے معمول پر آ جاتے۔ زندگی کی وہی رفتار ہو جاتی جو ہمیشہ ہوا کرتی ہے۔

پکنک پر جانے والی صبح کی رات میں نے بہت سوچتے ہوئے گزاری۔ ہر پہلو سے اس امکان کا جائزہ لیا کہ کہیں ڈائریکٹ مجھ ہی پر شک نہ کیا جائے۔

لیکن اس پلاننگ میں بظاہر کوئی جھول نظر نہیں آ رہا تھا۔ اس لیے میں نے سوچ لیا کہ جو ہو گا دیکھا جائے گا۔

دوسری صبح ہمارا شعبہ فیکٹری کے گیٹ پر جمع ہو گیا۔ اس میں کچھ خواتین بھی تھیں۔ سب ہی خوش تھے۔ شاید پہلی بار ایسا ہوا تھا کہ فیکٹری میں آنے کے باوجود صندوق میں بند نہیں ہوئے بلکہ صندوق سے باہر تھے۔

رشید بھی اپنے پورے کروفر کے ساتھ موجود تھا۔ شاید وہ شخص پیدا ہی غصے کی حالت میں ہوا ہو گا۔ اس وقت بھی اس کے ماتھے پر شکنیں پڑی ہوئی تھیں۔

ہم اپنے ساتھ کھانے پینے کی بہت سی چیزیں لے جا رہے تھے اور حیرت کی بات یہ تھی کہ یہ پورے اخراجات فیکٹری نے اٹھائے تھے۔

ہم لوگ گڈانی پہنچ گئے۔

دور تک پھیلا ہوا سمندر... اونچی چٹانیں اور سمندر کی طرف سے آتی ہوئی سرد اور نمکین ہوائیں۔ یہ سب مل کر یہ احساس دلا رہے تھے کہ زندگی ابھی بھی بہت خوب صورت ہے۔ اگر رشید جیسا آدمی درمیان میں نہ ہو تو زندگی اور بھی حسین ہو سکتی ہے۔

سب لوگ چاروں طرف پھیل گئے کہ سمندر کا پانی ہم سب کو اپنی طرف بلا رہا تھا۔ کچھ ایک طرف بیٹھ کر تاش کھیلنے لگے۔

میرے اندازے کے عین مطابق رشید ایک اونچے سے ٹیلے کے کنارے پر جا کر بیٹھ گیا۔ اس کا چہرہ سمندر کی طرف تھا۔ اس ٹیلے کے نیچے بڑے خوفناک قسم کے پتھر تھے۔ جن سے سمندر کی لہریں پوری قوت سے ٹکرا رہی تھیں۔ اس کام کے لیے بہت آئیڈیل پوزیشن تھی۔

میں اپنی پلاننگ کے مطابق دوسروں سے کٹ کر آہستہ آہستہ اس ٹیلے کی طرف بڑھنے لگا۔ کسی نے میرا نوٹس بھی نہیں لیا ہو گا۔ سب ہی اپنی اپنی مستیوں میں مگن تھے۔

ٹیلے کی پشت سے میں ٹیلے پر چڑھنے لگا۔ اس احتیاط کے ساتھ کہ میرا پیر کسی پتھر سے ٹکرا نہ جائے۔ رشید بدستور سمندر کی طرف دیکھ رہا تھا۔ میں آہستہ آہستہ اس کی طرف بڑھنے لگا اور اچانک اس نے پیچھے مڑ کر دیکھ لیا۔

میں ٹھٹک کر رہ گیا۔ میری ساری ہمت جواب دے گئی۔ اب میں کچھ بھی نہیں کر سکتا تھا۔ مجھے دیکھ کر اس کے

کوہان کا زوال... سرجری کا کمال

ہونٹوں پر مسکراہٹ آگئی۔ اس نے بلند آواز میں کہا۔

"آؤ، آؤ، دیکھو۔ یہاں سے سمندر کتنا اچھا لگ رہا ہے۔"

"یس سر! میں بھی یہی دیکھنے کے لیے آیا تھا۔" میں اس کے پاس ہی جا کر بیٹھ گیا۔

کچھ دیر بعد اس نے مجھے مخاطب کیا۔ "اچھا ہوا تم خود آگئے، میں تم کو بلانے ہی والا تھا تاکہ تم کو دو خبریں سنا سکوں۔"

"کیسی خبریں جناب؟" میں نے پوچھا۔

"کیا تم کو اندازہ ہے کہ آج کی یہ پکنک کیوں رکھی گئی ہے؟" اس نے پوچھا۔

"یونہی تفریح کے لیے۔" میں نے کہا۔

"ہاں تفریح تو ہے لیکن اس کے ساتھ ہی دو اور باتیں بھی ہیں۔ ایک بات تو یہ ہے کہ میں کل فیکٹری سے جا رہا ہوں۔" اس نے بتایا۔

"فیکٹری سے جا رہے ہیں؟" میں نے حیران ہو کر اس کی طرف دیکھا۔

"ہاں، آج میرا آخری دن ہے۔" اس نے کہا۔ "مجھے میرے بھائی نے لاہور بلوا لیا ہے۔ اس کا وہاں بہت اچھا کاروبار چل رہا ہے۔ وہ یہ چاہتا ہے کہ میں اس کا ہاتھ بٹاؤں اس لیے میں کل ہی جا رہا ہوں۔ میں نے فیکٹری والوں کو بھی بتا دیا ہے۔ انہوں نے کل ہی میرا حساب کر دیا تھا۔"

"اوہ!" میں ایک گہری سانس لے کر رہ گیا۔ خدا نے مجھے قاتل بننے سے بال بال بچا لیا تھا۔ صرف ایک لمحے کی بات تھی۔ وہ اگر مڑ کر نہیں دیکھتا تو میں اسے دھکا دے چکا ہوتا۔ لیکن اب ساری دھند صاف ہو گئی تھی۔ اب وہ خود ہی یہاں سے جا رہا تھا۔

"آپ کی کمی محسوس ہو گی جناب۔" میں دھیرے سے بولا۔

وہ مسکرا دیا۔ "خیر، اب ایسا بھی نہیں ہو گا۔ میں جانتا ہوں کہ بہت سے لوگ مجھے ناپسند کرتے ہیں لیکن میں جو کچھ بھی کرتا رہا ہوں، اس میں میرا کوئی ذاتی فائدہ نہیں تھا۔ صرف فیکٹری کی بھلائی کے لیے یہ سب کرتا تھا۔ میں پندرہ برسوں سے اس فیکٹری میں ہوں۔ لیکن میں نے اپنی طرف سے ایک چھٹی بھی نہیں کی۔ ہمیشہ وقت پر آیا ہوں۔" میں اس کی باتیں غور سے سن رہا تھا۔ "کیونکہ جب کوئی ذمے داری مل جائے تو اسے ہر حال میں پورا کرنا چاہیے۔ رزق حلال اسی کو کہتے ہیں۔ میں اپنے خدا کے سامنے سرخرو ہوں کہ میں نے رزق کے لیے زندگی نہیں ماری۔ میری سختیاں بھی اپنے فائدے کے لیے نہیں تھیں، فیکٹری کے لیے تھیں اور تم لوگوں کے لیے تھیں کہ تمہیں اپنی ذمے داریوں کا احساس ہو جائے، کیوں کیا میں غلط کہہ رہا ہوں؟"

"نہیں سر! آپ بالکل ٹھیک کہہ رہے ہیں۔" میں نے کہا۔ اب میرے دل میں اس کے لیے احترام پیدا ہونے لگا تھا۔

"اور جانتے ہو دوسری خبر کیا ہے؟"

"نہیں سر، یہ تو آپ ہی بتائیں گے۔"

"دوسری خبر یہ ہے کہ کل سے میری جگہ تم سنبھالو گے۔" اس نے بتایا۔

"کیا!" میں حیرت زدہ رہ گیا۔ "یہ آپ کیا کہہ

رہے ہیں سر؟"

"ہاں، میں نے مالکان سے بات کر لی ہے۔ وہ بھی تمہارے لیے راضی ہیں۔" اس نے بتایا۔ "کل سے پیکنگ کے تم سپروائزر ہو۔ تمہاری تنخواہ ایک ساتھ دو ہزار بڑھ جائے گی۔"

میرے خدا! میں نے اس آدمی کو کیا سمجھا اور یہ کیا نکلا... یہ میرے لیے کتنا اچھا سوچ رہا تھا اور میں نے اس کے لیے کیسی پلاننگ کی تھی۔

میں خدا کا شکر ادا کرنے لگا۔ اس نے مجھے کتنے بڑے جرم سے بچا لیا تھا۔

بہرحال پکنک ختم ہوئی۔ ہم سب واپس آنے لگے۔ رشید نے راستے ہی میں بتا دیا کہ وہ کل سے فیکٹری چھوڑ کر جا رہا ہے اور اس کی جگہ اجمل کام کرے گا۔

سب لوگوں نے حیرت سے اس خبر کو سنا۔ کچھ نے اس کے جانے پر افسوس کا اظہار کیا۔ کچھ نے میرے لیے تالیاں بجا دیں۔ یعنی وہی سب کچھ ہوا جو عام طور پر ایسے مواقع پر ہوا کرتا ہے۔

دوسرے دن میں نے سپروائزر کا عہدہ سنبھال لیا۔ رشید نے جو کچھ کہا تھا۔ منیجر نے باقاعدہ طور پر مجھے بلا کر پیکنگ کے شعبے کا انچارج بنا دیا تھا۔ اس کے ساتھ ہی اس نے کہا۔ "اجمل مجھے امید ہے کہ تم بھی رشید کی طرح ایمانداری اور پوری محنت کے ساتھ اپنے ڈپارٹمنٹ کو چلاؤ گے۔"

"جی سر۔" میں نے کہا۔ "میری پوری کوشش ہو گی کہ شکایت کا موقع نہ ملے۔"

"تم کو تھوڑی سختی کرنی ہو گی۔" اس نے مزید کہا۔ "بہت سے ورکرز کام چور ہوتے ہیں۔ اپنا اور فیکٹری کا وقت ضائع کرتے ہیں۔"

"آپ فکر نہ کریں سر۔ میں سب کو سنبھال لوں گا۔"

اس کے بعد میں بھی وہی سب کچھ کرنے لگا جو رشید کیا کرتا تھا۔ فیکٹری کی بھلائی کے لیے۔ ورکرز واقعی کام چور تھے۔

اس کا اندازہ اب ہو رہا تھا۔ پہلے تو میں ان کے ساتھ ہی شامل ہوا کرتا اس لیے ان کی کام چوری دکھائی نہیں دیتی لیکن اب الگ رہ کر محسوس ہو رہی تھی۔ چونکہ مجھ پر پوری ذمے داری آ گئی تھی اس لیے میں وقت سے کچھ پہلے ہی فیکٹری پہنچ جاتا۔ ان ورکرز پر غصہ آیا کرتا جو دیر سے آتے تھے۔

ویسے تو وہ میرے ساتھی تھے لیکن اب یہ میری فرض شناسی کا مسئلہ تھا۔ میں انہیں چھوٹ نہیں دے سکتا تھا اس لیے میں نے فیکٹری کی بھلائی میں ان پر اسی طرح کی سختیاں شروع کر دیں جس طرح رشید کیا کرتا تھا۔ میرے مزاج میں جھلاہٹ شامل ہوتی جا رہی تھی۔

سب کے سب ہی کام چور تھے۔ اب مجھے احساس ہو رہا تھا کہ رشید کتنا حق بجانب تھا۔ یہ ورکرز ایسے ہی ہوتے ہیں۔

ذرا سا موقع ملا اور گپ شپ کرنے لگے۔ واش روم کے بہانے گئے اور ایک گھنٹا لگا کر واپس آئے۔ اگر ان پر سختی نہ کی جائے تو فیکٹری ٹھپ ہو کر رہ جائے۔

اسی لیے میں نے سختیاں شروع کر دیں۔ میرا لہجہ درشت ہوتا چلا گیا۔ "کیا کر رہے ہو تم؟ شرم نہیں آتی۔ حرام کے پیسے لیتے ہو۔ فیکٹری کا خیال نہیں کرتے۔ وغیرہ وغیرہ۔"

اور ایک دن وہ مضبوط جسم کا ورکر حامد میرے سامنے سینہ تان کر کھڑا ہو گیا۔ "کیا مصیبت ہے سر؟ ایسا لگتا ہے جیسے ہم کسی صندوق میں آ کر بند ہو گئے ہیں۔"

میں نے بڑی بے بسی اور خوف سے اس کی طرف دیکھا۔ صندوق میں بند ہو گئے ہیں۔ میں نے بھی تو اپنے سپروائزر سے بالکل یہی بات کی تھی کہ ہم صندوق میں بند ہو گئے ہیں۔

تو کیا تاریخ اپنے آپ کو دہرا رہی ہے؟

میرے خدا، کہیں اس کے ذہن میں بھی ویسی ہی کوئی پلاننگ نہیں ہو، ان چند دنوں جیسی میرے ذہن میں تھی۔

لیکن میرا معاملہ تو کچھ اور ہو گیا تھا۔ رشید تو فیکٹری چھوڑ کر چلا گیا تھا لیکن میں، میں تو کہیں نہیں جا رہا تھا۔ تو پھر کیا ہونے والا تھا؟

مجھ میں اتنی ہمت اور طاقت نہیں تھی کہ میں جسمانی طور پر رشید کا مقابلہ کر کے اسے مار سکتا۔ لیکن یہ... یہ بہت مضبوط اور خطرناک انسان تھا۔ یہ تو بہت کچھ کر سکتا تھا۔

تو پھر، مجھے کیا کرنا چاہیے۔

مجھے ایسا لگا کہ سپروائزر بن جانے کے باوجود میں ابھی تک اسی صندوق میں بند ہوں اور صندوق میں ہوا کم ہوتی جا رہی ہے۔ کم بہت ہی کم...

اسکرپٹ

بشریٰ افضل

بچے کلیوں کی طرح تروتازہ اور کھلے کھلے ہوتے ہیں... ان کی سنگت چھوٹوں کے ساتھ بڑوں کو بھی حیرت زدہ اور مسرور کردیتی ہے... ایک معصوم بچی کی ہمراہی میں گزرے لمحوں کی دلچسپ کتھا...

خیال نو کے ساتھ ایک مختصر چلبلی... شگفتہ تحریر

جہاز کے فضا میں بلند ہوتے ہی مسافروں نے اپنی اپنی دلچسپیاں تلاش کرلیں۔ کوئی مووی دیکھ رہا تھا۔ کوئی میگزین یا اخبار میں گمن تھا... کوئی کتاب اور کوئی ناول پڑھنے میں مگن تھا۔ بعض افراد اہم ترین مشغلے یعنی اونگھنے میں مصروف تھے۔

فرسٹ کلاس کیبن میں لاہور کی ایک فلمی اداکارہ نے بیگ سے فلم اسکرپٹ نکالا اور ورق گردانی میں مصروف ہو گئی۔ دو بوڑھے مسافر شطرنج لگا کر بیٹھ گئے۔

پروفیسر صوفی اسلم کو اکانومی کلاس میں کھڑکی کے قریب نشست ملی تھی۔ خوش قسمتی سے اس کے ساتھ والی نشست خالی تھی۔ اس نے اپنی نامکمل کتاب نکالی اور اس پر توجہ مرکوز کر دی۔ وہ تاریخ کا پروفیسر تھا۔ اس کا تازہ مسودہ یورپ کے تاریک دور سے متعلق تھا جو ہر زیاں کے اختتامی مراحل سے گزر کر ایک نئے روشن دور میں داخل ہونے جارہا تھا۔

صوفی نے جو موضوع اختیار کیا تھا وہ یورپ کے نئے دور پر اسلام کے اثرات سے متعلق تھا۔ صوفی کے خیالات مجتمع ہو چکے تھے تب ہی اسے نگاہ اٹھانی پڑی۔ اس نے محسوس کیا کہ کوئی اس کے قریب کھڑا ہے۔ صوفی نے دیکھا

کہ وہ ایک سات آٹھ سال کی بڑی پیاری سی بچی تھی اور اپنی بڑی بڑی آنکھوں سے صوفی کو تک رہی تھی۔ اس کے بال دو چوٹیوں کی شکل میں گندھے ہوئے تھے۔ اس کا حلیہ بتا رہا تھا کہ وہ کسی ماڈرن گھرانے سے تعلق رکھتی ہے۔ بچی نے پتلون اور قمیص زیب تن کی ہوئی تھی۔

"السلام علیکم۔" وہ بولی۔ "میرا نام کنول ہے۔ کیا آپ پڑھنے میں مصروف ہیں؟"

صوفی کا اوڑھنا بچھونا ہی لکھنا پڑھنا تھا۔

"شاید نہیں۔" اس نے جواب دیا۔ "میں کچھ لکھ رہا ہوں۔"

بچی کی آنکھوں میں چمک نظر آئی۔ "ونڈرفل۔" اس نے کہا۔ "میں بھی بڑی ہو کر لکھوں گی۔ کیا آپ فلموں کے لیے لکھتے ہیں؟"

"شاید وہ میرے لیے مشکل ہے۔" صوفی نے مسکرا کر جواب دیا۔ "میں ہسٹری پر لکھتا ہوں۔"

کنول اس کے برابر میں بیٹھ گئی۔ "میں یہاں بیٹھ جاؤں، جب آپ تھک گئے تو میں چلی جاؤں گی؟" بچی نے کہا۔

"ٹھیک ہے۔" صوفی نے نیم دلی سے کہا۔ "تمہاری امی پریشان ہو جائیں گی۔"

"مما؟" کنول کچھ سوچتی رہی پھر بولی۔ "مما کا انتقال ہو چکا ہے۔ مما اور ڈیڈی دونوں... وہ ایک کار ایکسیڈنٹ تھا۔ میں انکل کے پاس رہتی ہوں۔"

صوفی نے اظہار افسوس کیا۔ وہ خود غیر شادی شدہ تھا۔ کنول شائستگی اور خود اعتمادی سے باتیں کر رہی تھی۔

"میرا بڑا بھائی بھی کار ایکسیڈنٹ میں... میں پتا نہیں کیسے بچ گئی؟ میں اس وقت پچھلی نشست پر تھی۔ بھائی کی پیسوں پر ڈیڈی سے لڑائی ہو گئی تھی۔"

"ویری سوری۔" صوفی نے کنول کو ہاتھ اٹھا کر روکا۔ "تم بہت بہادر بچی ہو۔ تمہارے انکل کہاں بیٹھے تھا؟" صوفی نے سوال کیا۔

"وہ بہت مصروف آدمی ہیں۔ میں اکیلی ہوں۔ انہوں نے مجھے جہاز پر سوار کروا دیا۔ ان کا خیال تھا کہ میں اسٹیوارڈ کی مدد سے سفر کر سکتی ہوں۔"

"یعنی تم تنہا سفر کر رہی ہو؟" صوفی کو حیرت ہوئی۔

کنول نے سر ہلایا۔ "عجیب سا لگ رہا ہے۔ میں نے پہلے اکیلے ہوائی سفر نہیں کیا۔"

اس اثنا میں ایک میزبان ان کے قریب آئی۔

"آپ مصروف ہیں تو میں بچی کو اس کی نشست پر بھیج دیتی ہوں؟" وہ بولی۔

"نہیں، کوئی بات نہیں۔ یہ مجھے پریشان نہیں کر رہی۔" صوفی نے جواب دیا۔

میزبان، کنول کا رخسار تھپتھپا کر چلی گئی۔

"تم کہاں جا رہی ہو؟"

"برطانیہ... انکل نے کہا ہے کہ وہاں دوسرے انکل مجھے اپنے گھر لے جائیں گے اور بڑے اسکول میں تعلیم دلوائیں گے۔ ان کی بیٹی بھی اسی اسکول میں پڑھتی ہے۔" کنول نے بتایا۔

"کیا نام ہے تمہارے انکل کا؟" صوفی نے دلچسپی لی۔

"انکل لوفر۔"

"کیا...؟" صوفی بوکھلا گیا۔

"ہاں، میں ان کو ایسا ہی بولتی ہوں۔ میں جانتی ہوں کہ وہ اچھے آدمی نہیں ہیں۔"

"نہیں، پیاری بچی... بڑوں کو ایسا نہیں کہتے۔" صوفی نے کنول کے سر پر ہاتھ پھیرا۔

"آپ کو پتا نہیں ہے نا، اس لیے آپ ایسا کہہ رہے ہیں۔" کنول نے اپنا دفاع کیا۔

"مجھے کیا نہیں معلوم؟"

"آپ کو نہیں پتا کہ میری مما اور ڈیڈی کے پاس بہت پیسے تھے۔ انکل لوفر چاہتے ہیں کہ میں کہیں دور چلی جاؤں یا مر جاؤں، تا کہ سارے پیسے ان کو مل جائیں۔ ائرپورٹ پر کوئی مجھے لینے نہیں آئے گا۔ وہ خوب شراب پیتے ہیں اور نشے میں مجھے سب کچھ بتا دیتے ہیں۔"

صوفی کی سمجھ میں نہیں آیا کہ وہ کیا کہے۔

"وہ سارا پیسا میرا ہے۔ جب میں بڑی ہو جاؤں گی تو سارے پیسے مجھے مل جائیں گے۔ ابھی انکل لوفر میری دیکھ بھال کے لیے صرف تھوڑے سے پیسے لے سکتے ہیں۔ اس لیے وہ مجھے مار دیں گے۔"

"کیا وہ بہت غریب ہیں؟"

"وہ گندے کام کر کے غریب ہو گئے ہیں۔ وہ مقروض ہیں اور لوگ ان کو پریشان کرتے ہیں... پیسوں کے لیے۔"

"تمہیں کیسے پتا چلا کہ گندے کام کون سے ہوتے ہیں؟"

"وہ گھر پر شراب پیتے ہیں اور جُوا کھیلتے ہیں۔ کیا یہ اچھی بات ہے؟ مجھے ملازمہ کے حوالے کر کے راتوں کو پھرتے رہتے ہیں۔" کنول نے بتایا۔

”اور تمہاری آنٹی؟“ صوفی نے الجھن محسوس کی۔

”مجھے نہیں پتا کہ میری کتنی آنٹیاں ہیں؟“

صوفی اس بظاہر سادہ سے جملے کا مفہوم پا کر سناٹے میں رہ گیا۔ ایسے مجرمانہ ذہنیت والے لوگ ہر جگہ پائے جاتے ہیں۔ صوفی کو معصوم بچی پر ترس آیا لیکن وہ کچھ نہیں کر سکتا تھا۔

اس کے گمان میں بھی نہیں تھا کہ اس بار سفر کے دوران ایسا کوئی کردار آن ٹکرائے گا۔ اس کو کچھ اور نہیں سوجھا تو وہ اپنے مسودے کی جانب متوجہ ہو گیا۔ اس نے سوچا کہ کنول ذہین ہے، اشارہ سمجھ جائے گی۔ لیکن جب وہ اپنی جگہ سے نہیں اٹھی تو وہ پریشانی محسوس کرنے لگا۔

”کاش میری گڑیا میرے پاس ہوتی۔ وہ مجھ سے باتیں کرتی ہے۔“ کنول نے اداسی سے کہا۔

صوفی کو موقع مل گیا۔

”اور تو تمہیں چاہیے کہ اپنی گڑیا کے پاس چلی جاؤ، تمہیں اچھا لگے گا۔“

”ہاں، میں بھی جانا چاہتی ہوں۔“ کنول نے آزردگی سے کہا۔

”پھر کیا رکاوٹ ہے؟“

”انکل لوفر نے گڑیا کو سوٹ کیس میں بند کر دیا ہے اس میں اور بھی چیزیں رکھی ہیں۔ ایک کلاک بھی ہے۔“

”کلاک؟“

”ہاں، عجیب سا ہے۔ میں نے ٹک ٹک سنی تھی اور انکل کو بتایا تھا لیکن انہوں نے مجھ سے بدتمیزی کی اور سوٹ کیس لاک کر دیا۔“

معاً صوفی کی گدی کے بال کھڑے ہو گئے اور پیشانی پر نمی آگئی۔

”ڈیئر کنول! مجھے بتاؤ سوٹ کیس کہاں رکھا ہے؟“

صوفی نے جیب سے رومال نکال کر پیشانی پر پھیرا۔

کنول نے مایوسانہ انداز میں جواب دیا۔ ”انکل لوفر نے وہ ایک آدمی کو ائرپورٹ پر دے دیا تھا۔ اس نے اس پر ٹیگ لگا کر کہا تھا کہ وہ مجھے انگلینڈ پہنچنے پر مل جائے گا۔“

صوفی پر گھبراہٹ طاری ہو گئی۔ اس نے اطراف میں دیکھا۔ بے گناہ مسافر حقیقت سے بے خبر اپنے اپنے شغل میں مگن تھے۔ تاریخ کا مسودہ صوفی کے ذہن سے نکل چکا تھا۔ اس نے خود پر قابو پانے کی کوشش کی۔ اب بھی کچھ نہ کچھ کیا جا سکتا ہے۔ اس نے سوچا۔ بچی کی کہانی سن کر اسے یقین ہو گیا تھا کہ کنول کے انکل لوفر نے اس کے سوٹ کیس میں کوئی ٹائم بم چھپا رکھا ہے جو کسی بھی لمحے اپنے مقررہ وقت پر پھٹے گا اور فضا میں جہاز کے ساتھ بدنصیب مسافروں کے چیتھڑے اڑ جائیں گے۔

رفتار کے فاصلے پر اس نے اسٹیوارڈ کو دیکھا۔ پھر کنول پر نظر ڈالی اور نشست سے کھڑا ہو گیا۔ اس کا رخ اسٹیوارڈ کی جانب تھا۔ پھر وہ ٹھٹکا اور پلٹ کر کنول کا ہاتھ پکڑ لیا۔ ”آؤ میرے ساتھ۔“

کنول کچھ دور اس کے ساتھ چلی۔ پھر اچانک ہاتھ چھڑا کر فرسٹ کلاس کیبن میں چلی گئی۔

”میں یہاں بیٹھوں گی۔“ وہ بولی۔

صوفی بوکھلا کر اس کے پیچھے گیا اور دوبارہ اس کا ہاتھ پکڑنے کی کوشش کی۔ لیکن کنول سمٹ کر دوسری نشست پر لاہور کی معروف اداکارہ کے ساتھ لپٹ گئی۔

”کیا بات ہے بچی؟“ اداکارہ نے کہا۔ ”میں نے کہا تھا کہ کچھ دیر کے لیے مجھے اکیلا چھوڑ دو۔ میں اپنی مووی کے نئے اسکرپٹ انکل لوفر پر توجہ دینا چاہتی ہوں۔ جاؤ مما کو کچھ دیر کے لیے اکیلا چھوڑ دو۔“

ایک صاحب اپنی بیمار بیوی کے قریب بیٹھے تھے دس سال تک وہ دونوں ایک دوسرے کے جیون ساتھی رہ چکے تھے اور اب یہ معلوم ہو رہا تھا کہ یہ دائمی بندھن ٹوٹ جائے گا۔ بیوی نے آنسو بھری نگاہ سے شوہر کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ”پیارے! میں تم سے صرف ایک وعدہ لینا چاہتی ہوں۔ اگر میں مر جاؤں تو تم دوسری بیوی کو میرے کپڑے مت پہننے دینا۔ میرا کہنا مانو گے نا؟“

شوہر نے جواب دیا۔ ”میں وعدہ کرتا ہوں کہ میری دوسری بیوی یہ کپڑے نہیں چھوئے گی۔ ویسے بھی یہ کپڑے مارتھا کے جسم پر فٹ نہیں آئیں گے۔“

☆☆☆

سوال: اس شخص کی کیا سزا ہے جو دو شادیاں کرے؟

جواب: دو عدد خوشدامنیں!

☆☆☆

خاتون (دکان دار سے): ”صبح آپ نے صابن کی جو ٹکیہ دی تھی وہ بہت خراب نکلی۔“

دکان دار: ”لیکن میں نے تو آپ کو پنیر کی ٹکیہ دی تھی، صابن کی نہیں۔“

خاتون: ”اوہ! جب ہی میں حیران تھی، ناشتے میں میرا شوہر اسے مزے لے لے کر کیسے کھا گیا۔“

سلیم انور

کتوں کے بارے میں کتنی طرح کی قیاس آرائیاں گردش میں رہتی ہیں... مثلاً جو بھونکتے ہیں... وہ کاٹتے نہیں... جو کاٹتے پر آجائیں... وہ بھونکتے نہیں... بہرحال کتے کسی بھی قسم کے ہوں... ان سے خوف زدہ ضرور محسوس ہوتا ہے... ایک ایسی ہی کہانی جس میں سگ پرستی اپنے عروج پر تھی...

محبتوں کی تلاش میں کتوں سے دوستی نبھانے کا قصہ...

مجھے آدمی سے زیادہ خوف اس کتے سے لگ رہا تھا جو زنجیر سے بندھے ہونے کے باوجود مجھ پر لپکنے کے لیے خطرناک انداز میں زور لگا رہا تھا۔ اگر کتے کی زنجیر پر اس آدمی کی گرفت مضبوط نہ ہوتی تو مجھے یقین تھا کہ وہ مجھ پر حملہ کر دیتا۔ اس کتے کی غراہٹ سے غصہ عیاں تھا جس سے میرے خوف میں اضافہ ہو رہا تھا۔

اس شخص نے زنجیر کھینچ کر جب اس کتے کو راستے سے ایک طرف ہٹایا تو کتے نے ایک جھرجھری سی لی۔ ''اب تم گزر سکتی ہو۔'' اس شخص نے مجھ سے کہا۔

اس جرمن شیپرڈ میں کسی بھیڑیے کی سی طاقت دکھائی دے رہی تھی۔ اسی ڈر کے باعث میں کوئی قدم اٹھانے سے ہچکچا رہی تھی۔ اس شخص نے میرے تذبذب کو بھانپ لیا۔

''لوسی تمہیں کوئی نقصان نہیں پہنچائے گی۔'' اس شخص نے کہا۔

تب مجھے اندازہ ہوا کہ وہ جرمن شیپرڈ ایک کتیا ہے۔

''یہ تو تم کہہ رہے ہو۔'' میں نے کہا اور بدستور اپنی جگہ کھڑی رہی۔

''یہ ایک اچھی کتیا ہے لیکن اس کے ساتھ برا برتاؤ کیا گیا ہے جس کی وجہ سے یہ بدکنے لگی ہے۔'' اس شخص نے کہا۔

مجھے یوں محسوس ہوا جیسے یہ شخص میرا حال بیان کر رہا ہے۔

''تم نے اسے اس وقت دیکھا ہوتا جب یہ میرے پاس آئی تھی۔ یہ کسی پر بھی بھروسا نہیں کرتی۔''

میں نے ایک بار پھر لوسی کی طرف دیکھا۔ مجھے اس کی آنکھوں میں تکلیف کے آثار دکھائی دیے۔ ''بے چاری۔'' میں نے کہا۔ پھر میں نے اس کی چپٹھ سہلانے کے ارادے سے ہاتھ بڑھایا ہی تھا کہ اس شخص نے مجھے ٹوک دیا۔

''اسے مت چھونا۔'' اس کا لہجہ تنبیہی تھا۔ ''لوسی ابھی تم سے شناسا نہیں ہوئی ہے۔''

میں نے فوراً اپنا ہاتھ نیچے گرا دیا۔

اس شخص نے اپنے خالی ہاتھ سے کتیا کی پشت تھپتھپائی تو وہ ایک طرف دبک گئی۔ ''تم دیکھ سکتی ہو کہ لوسی کو اب بھی ہاتھ لگانے سے چڑ ہے۔''

بالکل میری طرح۔ میں نے سوچا۔

''میں نے اس کو بے گھر کتوں کی پناہ گاہ سے نجات دلائی تھی۔'' اس شخص نے کہا۔ ''ان لوگوں نے مجھ سے کہا تھا کہ اگر میں صبر سے کام لوں گا تو وہ جلد مجھ سے مانوس ہو جائے گی۔''

''تم کتنے ہمدرد اور مہربان شخص ہو۔'' میں نے کہا۔

میں سوچنے لگی کہ کاش کسی نے مجھے بھی میرے سابقہ شوہر ایلن کے ظلم و ستم سے نجات دلائی ہوتی۔

''تم خود بھی ایک ہمدرد اور شفیق عورت ہو۔'' اس شخص نے کہا۔ ''میں دیکھ رہا ہوں کہ تم لوسی پر خصوصی توجہ دے رہی ہو۔''

اس سے قبل کہ میں کوئی جواب دیتی، اس کی گفتگو کا موضوع بدل دیا۔ ''کیا تم اس ساحلی پگڈنڈی پر اکثر چہل قدمی کرتی ہو؟''

''صرف اس وقت جب میں تعطیلات پر ہوتی ہوں۔'' میں نے جواب دیا۔ ''کیوں؟''

''اس لیے کہ میں اور لوسی ہر سہ پہر یہاں ٹہلنے کے لیے آتے ہیں۔'' اس نے لبوں پر ایک دوستانہ مسکراہٹ

بکھیرتے ہوئے کہا۔ ''کیا آج ہمارے ساتھ اس چہل قدمی میں شامل ہونا پسند کرو گی؟''

''اگر لوسی کو میری شمولیت پسند نہیں آئی تو پھر؟''

''اسے ایک موقع تو دو۔ یہ تمہاری عادی ہو جائے گی۔'' اس شخص نے کہا۔

میں لوسی کو تکنے لگی۔ میں ابھی اس پیشکش کو ٹھکرانے جا رہی تھی کہ لوسی گھٹی گھٹی آواز میں رونے لگی۔ اس کی درد بھری آواز نے میرے انکار کو زنگا دیا۔

''آل رائٹ۔'' میں نے کہا۔ ''میں اسے ایک موقع دے رہی ہوں لیکن صرف ایک موقع۔''

''صرف ایک؟'' وہ شخص قہقہہ لگاتے ہوئے بولا۔

ہم نے سفر کا آغاز کر دیا۔ لوسی ہمارے آگے چل رہی تھی۔ پگڈنڈی کا ایک حصہ ان چٹانوں سے تقریباً مل کر چل رہا تھا جو بحر اکاہل کی سرحد کی طرح دور تک پھیلی ہوئی تھیں۔ اڈنی اور ساحل سے ٹکرا کر واپس جاتی ہوئی لہریں، ہوا میں ہلکا سا نمکین ذائقہ اور عقب میں سورج کی تمازت نے مل کر ایک شخص اور اس کی کتیا کے ساتھ سیر کرنے کا ایک خوب صورت دن بنا دیا تھا۔ اور میں تھی کہ اس سیر کی پیشکش کو ٹھکرانے جا رہی تھی۔

''میرا نام پال ہے۔'' اس شخص نے اپنا تعارف کراتے ہوئے کہا۔

پھر ہمارے درمیان اِدھر اُدھر کی باتیں ہوتی رہیں۔

''اب تم اپنے بارے میں بتاؤ۔'' اس نے اچانک کہا۔

میں کچھ دیر ہچکچائی پھر آخر کار بول پڑی۔ ''چھ ماہ قبل مجھے طلاق ہو چکی ہے۔ میری کوئی اولاد نہیں ہے۔ خوش قسمتی سے۔''

''میری بیوی سینڈی کا انتقال بھی چھ ماہ قبل ہوا تھا۔ میرے بھی کوئی بچے نہیں ہیں۔'' یہ کہہ کر پال نے اپنی دھوپ کی عینک آنکھوں پر سے اوپر اٹھا دی۔ اس نے اپنی آنکھوں کو اس طرح پونچھا جیسے بہتے ہوئے آنسوؤں کو روکنا چاہ رہا ہو۔

''آئی ایم سوری۔'' میں نے کہا۔

''مجھے بھی تم سے ہمدردی ہے۔'' پال نے اپنی دھوپ کی عینک دوبارہ آنکھوں پر کھسکاتے ہوئے کہا۔ ''یہ عینک مجھے ڈاکٹر نے تجویز کی ہے۔ مجھے سورج کی کرنوں سے الرجی ہو جاتی ہے۔''

پھر یہ سیر ہمارا روز کا معمول بن گئی۔

میری مزاحمت کی کوششوں کے باوجود لوسی کا رویہ مجھ سے بدستور جارحانہ سا رہا۔ جبکہ دوسری جانب پال کھل گیا تھا۔

اس کی گفتگو اب ہیجان خیز ہوتی جارہی تھی۔ اس کی بظاہر بھدی شخصیت کے برعکس اس کا رویہ نفیس اور شائستہ تھا۔ اس بات نے مجھے متاثر کیا تھا۔

اپنی آنجہانی بیوی سینڈی کے لیے وہ جن خیالات کا اظہار کیا کرتا تھا اور اسے سراہتا، اس کی تعظیم کرتا تھا تو اس بات سے بھی میں بے حد متاثر ہوئی تھی۔ وجہ یہ تھی کہ میرا سابقہ شوہر ایلن نہ تو میری عزت کرتا تھا اور نہ ہی میری تعریف و توصیف کیا کرتا تھا جس کی خواہش ہر عورت کو اپنے خاوند سے ہوتی ہے۔

اس کے باوجود پال کے اپنی بیوی کے متعلق چند تبصروں نے مجھے چونکا سا دیا۔ ”سینڈی قدرے ہٹ دھرم تھی۔“ ایک روز پال نے مجھے بتایا۔ ”مجھ سے باتیں بنانا پسند نہیں کرتی تھی۔“

”مثال کے طور پر؟“ میں نے پوچھا۔

”وہ جیسے کہ فرنیچر کو کس طرح سیٹ کرنا ہے۔ مجھے ڈنر کرنا کس وقت پسند ہے۔“

ایک اور مرتبہ پال نے سینڈی کی بے پروائی کا ذکر یوں کیا۔ ”سینڈی سے توشی کی رسیا تھی۔۔۔ یہ اس کے معمولات میں شامل تھا اس لیے میں زیادہ شکوہ بھی نہیں کرتا تھا۔“

میرا سابقہ شوہر ایلن بھی ہمارے فرنیچر کی سیٹنگ کے بارے میں اپنی پسند کی جگہوں پر اصرار کیا کرتا تھا۔ اس نے اس بات کو اپنے ذہن پر مسلط کیا ہوا تھا کہ ڈنر اسے ٹھیک چھے بجے مل جانا چاہیے۔ اور اگر مجھ سے کوئی چیز گر جاتی تھی تو وہ آپے سے باہر ہو جاتا تھا۔

میرے سائیکولوجسٹ نے تمام مردوں کو میرے سابقہ شوہر سے مماثل کرنے سے مجھے ہوشیار کر دیا تھا۔ اس کا کہنا تھا کہ مجھے اس بارے میں احتیاط سے کام لینا ہوگا۔

کیا میں پال کے ساتھ یہ رویہ اس لیے اختیار کر رہی تھی کہ اس نے اپنی آنجہانی بیوی کے بارے میں تین منفی تبصرے کیے تھے؟

پھر میری تعطیلات کا آخری دن آ گیا۔

ہماری شام کی آخری سیر شروع ہونے سے پیشتر لوسی نے میری بند مٹھی کو چاہے بغیر سونگھ لیا۔ پال یہ دیکھ کر بولا۔ ”ارے، لوسی کے ساتھ تمہارے تعلقات میں بہتری آ رہی ہے۔“

”آخر کار۔“ میں نے کہا۔۔۔ تب مجھے احساس ہوا کہ میں قدرے مایوس سی تھی کیونکہ آج کے بعد میں ان دونوں سے پھر نہیں مل سکتی تھی اور میری یہ مایوسی بجا تھی۔

شاید یہی وجہ تھی کہ اس بات کے چند منٹ بعد ہی پال کی ڈنر کی پیشکش نے مجھے ورغلا دیا۔ کہ دن کے اوقات میں ایک شخص اور اس کی کتیا کے ہمراہ چہل قدمی ایک الگ بات تھی لیکن وہ افراد کا بے تکلفی کے ماحول میں ڈنر کرنا......

مجھے اپنے سائیکولوجسٹ کی تنبیہ یاد آ گئی۔

”آئی ایم سوری۔“ میں نے کہا۔ ”میں نہیں جا سکوں گی۔“

پال نے اپنی آنکھوں پر لگی سیاہ عینک کو درست کیا اور بولا۔ ”کیوں؟“

”میں ابھی کسی کے ساتھ بھی ڈنر پر جانے کے لیے ذہنی طور پر تیار نہیں ہوں۔“ میں نے جواب دیا۔

”لیکن لوسی نے کسی مقصد کی خاطر ہم دونوں کو آپس میں ملوایا ہے۔“ پال نے مسکراتے ہوئے کہا۔

میں بھی جواباً مسکرا دی اور پوچھا۔ ”لوسی کا وہ مقصد کیا ہے؟“

”تمہیں پتا چل جائے گا۔“

پال نے اپنی ڈنر کی دعوت پر مزید کوئی اصرار نہیں کیا اور نہ ہی لوسی کے مقصد کی وضاحت کی۔ اس کے بجائے اس نے یہ تجویز دی۔ ”آؤ، آج لائٹ ہاؤس کی طرف چلتے ہیں۔ لوسی بھی اسے پسند کرے گی۔ کیوں لوسی؟“ یہ کہتے ہوئے اس نے لوسی کی زنجیر کو ایک جھٹکا دیا تو وہ بھونکنے لگی۔

لائٹ ہاؤس ایک میل کے فاصلے پر تھا۔ اس طرف کوئی بھی آتا جاتا دکھائی نہیں دے رہا تھا۔

”مت جانا۔“ میرے ذہن میں ایک آواز نے سرگوشی کی۔ میں نے اس سرگوشی کو نظرانداز کرتے ہوئے پال سے کہا۔ ”کیوں نہیں؟“

ہم تینوں چل پڑے۔

ہم نے لائٹ ہاؤس جانے والے راستے پر زگ زیگ چلتے ہوئے ابھی آدھا میل کا فاصلہ ہی طے کیا تھا کہ آسمان پر سیاہ بادلوں نے کسی شال کی طرح ہمیں ڈھک لیا اور ہمارے چاروں طرف تیز ہوائیں چلنے لگیں۔

”بہتر ہوگا کہ ہم واپس لوٹ چلیں، پال۔“ میں نے کہا۔

وہ رک گیا۔ لوسی کی زنجیر بدستور اس کے ہاتھ میں تھی۔ ”ابھی نہیں۔“ اس نے جواب دیا۔

میں مرغابیوں کے ان غولوں کو دیکھنے لگی جو چیخیں مارتے ہوئے چٹانوں کی درزوں اور گوشوں میں پناہ لینے کے لیے پرواز کر رہے تھے۔ ”یہ طوفانوں کے بارے میں ہم سے زیادہ جانتے ہیں۔“ میں نے ان اڑتے ہوئے پرندوں کی جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ”میں واپس

جارہی ہوں۔"

پال نے بےچور بال چڑھالیں۔

"تم جیت گئیں۔" اس نے غصے سے کہا پھر اس نے لوسی کی زنجیر کو جھٹکے سے اپنی طرف کھینچا اور واپسی کے لیے پلٹ گیا۔

میں بھی اس کے پیچھے واپس چل پڑی لیکن جلد ہی ہمارے درمیان فاصلہ بڑھتا گیا۔ وہ کافی آگے نکل چکا تھا۔ جب میں پہاڑی راستے کے ایک بل کھاتے ہوئے موڑ پر پہنچی تو پال کو چٹان کے کنارے پر ایک بڑے ہموار چٹانی پتھر پر بیٹھے ہوئے پایا۔ وہ ایک ہاتھ سے اپنا سر سہلا رہا تھا جبکہ دوسرے ہاتھ میں بدستور لوسی کی زنجیر تھامی ہوئی تھی۔

"کیا ہوا؟" میں دوڑتے ہوئے اس کے پاس پہنچی اور پوچھا۔

"میں ٹھوکر کھا کر گر گیا تھا اور میرا سر اس چٹانی پتھر سے ٹکرا گیا تھا۔" اس نے منہ بناتے ہوئے کہا جیسے تکلیف میں ہو۔ "بہت شدید درد ہو رہا ہے۔"

"میں مدد کے لیے فون کرتی ہوں۔"

"نہیں، یہ مت کرنا۔" اس نے یہ کہتے ہوئے اٹھنے کی کوشش کی لیکن چکرا کے دوبارہ پتھر پر بیٹھ گیا۔ "میں اب بہتر محسوس کر رہا ہوں۔"

"میں 911 کو فون کر رہی ہوں۔" میں نے اپنی جیکٹ کے پاکٹ میں سے اپنا سیل فون نکالتے ہوئے کہا۔

ابھی میں نے بمشکل نمبر ملائے تھے کہ پال اچانک مجھ پر جھپٹ پڑا اور سیل فون میرے ہاتھ سے چھین لیا۔ پھر دوسرے لمحے اس سیل فون کو ہوا میں اچھال رہا۔ تیز ہوا کے جھونکے اس سیل فون کو ہم سے دور سمندر کے کنارے بنی ہوئی چٹان سے دور لے گئے۔

میں سراسیمہ ہو گئی پھر میں نے چیختے ہوئے کہا۔ "تم نے ایسا کیوں کیا؟"

"معلوم نہیں کیوں۔" اس نے جواب دیا۔

"ذہن کو صاف کرو پال اور دھیان سے بتاؤ۔ اگر یہ کال مدد کے لیے ان تک نہ پہنچ سکی تو پھر کیا ہوگا؟ تمہیں چوٹ آئی ہے اور تمہیں مدد کی ضرورت ہے۔ کیا تم اس وقت تک خود کو ہوش میں رکھ سکتے ہو جب تک میں مدد نہ لے آؤں؟"

"شاید میں تمہارا سہارا لے کر چل سکوں۔"

"آؤ کوشش کر لیتے ہیں۔" میں نے پال کی جانب اپنے دونوں ہاتھ بڑھاتے ہوئے کہا۔

رہا تھا اور میرا ایک ہاتھ پکڑ لیا۔ دوسرے ہاتھ سے اس نے بدستور لوسی کی زنجیر تھامی ہوئی تھی۔ گو اس نے اپنے جسم کا بوجھ مجھ پر ڈالا ہوا تھا لیکن اس نے پہاڑی راستے پر میری راہنمائی میں آگے بڑھنے سے انکار کر دیا۔ جبکہ میں اسے گائیڈ کر کے لے جانا چاہ رہی تھی کہ کہیں وہ چکرا کر دوبارہ گر نہ جائے۔

اچانک پال نے ایک جھٹکے سے میرے ہاتھ سے اپنا ہاتھ چھڑا لیا اور لوسی کی زنجیر بھی گرا دی۔ دوسرے لمحے اس نے اپنے ہاتھ میرے شانوں میں گاڑ دیے اور ہمارے جسموں کو یکجا کرنے کے لیے زور لگانے لگا۔

"یہ تم کیا کر رہے ہو، پال؟" میں نے چیختے ہوئے کہا۔

"میں تمہیں مقصد بتانا چاہ رہا ہوں۔"

"کون سا مقصد؟"

"وہ مقصد جس کی خاطر لوسی نے ہم دونوں کو آپس میں ملوایا ہے۔"

"وہ مقصد کیا ہے، پال؟"

"لوسی کا مقصد..." اس نے کہنا شروع کیا لیکن جملہ مکمل نہیں کیا۔ اس کے بجائے اس نے مجھے اور سختی سے جکڑ لیا۔ اس کی گرفت اتنی مضبوط تھی کہ میرا دم گھٹنے لگا۔ میں خوف و دہشت سے بوکھلا گئی۔

"مجھے چھوڑ دو۔" میں اس کے سینے پر اپنی مٹھیاں مارتے ہوئے چیخی۔

پال نے میری چیخ و پکار کو نظرانداز کر دیا اور مجھ پر اپنی شکنجے جیسی گرفت برقرار رکھی۔ میں کسی نہ کسی طرح اپنے دونوں ہاتھ بلند کرنے اور اس کے چہرے تک لے جانے میں کامیاب ہو گئی۔ پھر کسی زخمی بلی کی طرح اس کے چہرے کو اپنے ناخنوں سے نوچنے اور اس پر خراشیں ڈالنے لگی۔ حتیٰ کہ میں نے اس کی دھوپ کی عینک کو بھی اس کی آنکھوں سے نوچ پھینکا۔

جب میری نگاہ اس کی آنکھوں پر پڑی تو میرا منہ حیرت سے کھلا رہ گیا۔ اس کی آنکھوں کی کیفیت نے مجھے میرے سابقہ شوہر ایلن کی یاد دلا دی۔ اس کی آنکھوں کی بھی بالکل یہی کیفیت ہوتی تھی جب وہ مجھے کوئی ضرر پہنچانا چاہتا تھا۔ اس کے ارادے اس کی آنکھوں کے تاثرات سے عیاں ہو جاتے تھے۔

اتنے میں لوسی کی وحشیانہ غراہٹ نے میری یادوں کے سلسلے کو توڑ دیا۔ اس سے قبل کہ پال اسے کوئی حکم دیتا، لوسی نے لپک کر اپنے خونخوار نکیلے دانت پال کی ٹانگ میں گاڑ دیے۔

پال درد کی شدت سے چلّانے لگا۔ ساتھ ہی تیزی سے گھوما اور لڑکھڑاتا ہوا پیچھے چلا گیا۔

’’سنبھل کر۔‘‘ میں چیخی۔

لیکن پال خود کو سنبھال نہ پایا۔ لوسی اس پر جھپٹ رہی تھی حتیٰ کہ اپنی رفتار سے اکھڑے ہوئے کسی بچے کی طرح وہ چٹان کے کنارے سے نیچے لڑھک گیا۔ زنانے دار ہواؤں نے پال کی ہولناک چیخوں کو دبا دیا تھا۔

مجھ پر سکتے کی سی کیفیت طاری ہوگئی۔ صدمے کی اس کیفیت سے سنبھلنے کے بعد میں گرتی پڑتی اس ہموار پہاڑی پتھر کی جانب پہنچ گئی جس پر کچھ دیر پہلے پال بیٹھا ہوا تھا۔

میں کچھ دیر پتھر پر ساکت بیٹھی رہی۔ میں سوچ رہی تھی کہ کیا میں نے ایک زخمی اور بدحواس شخص کی حرکات و سکنات سے غلط نتیجہ اخذ کیا تھا؟ کیا اس کے ساتھ ابھی جو کچھ ہوا تھا، اس کا الزام مجھ پر عائد ہوتا ہے؟

پھر میں نے اپنی توجہ لوسی کی جانب مبذول کرلی۔

اس نے یہ ہولناک حرکت کیوں کی کہ اپنے راتب والے کی ٹانگ میں گاڑ دیے؟ جیسا کہ میں نے پہلی نگاہ میں اس کے بارے میں رائے قائم کی تھی، وہ یقیناً ایک ناقابلِ گرفت اور خطرناک جانور تھی۔ اس پر بھروسا نہیں کیا جاسکتا تھا۔

بالآخر وہ چٹان کے کنارے سے پلٹ کر میری جانب بڑھنے لگی۔ میں خوف زدہ ہوگئی کہ کہیں اب وہ مجھ پر حملہ نہ کردے۔ میں اپنے بچاؤ کی کیا تدبیر کروں؟ شاید میرا ماضی لوسی کے ساتھ ڈیل کرنے میں میری راہنمائی کرسکے۔

جورلا سادے رائی آرازیں اور زبان میں اپنے سابقہ شوہر کو اشتعال سے باز رکھنے کے لیے اکثر استعمال کیا کرتی تھی جب وہ مجھ پر تشدد کا ارادہ رکھتا تھا۔ میں نے سوچا کہ شاید یہ تدبیر لوسی پر بھی کارگر ثابت ہوجائے۔

’’تم پال کو کوئی نقصان نہیں پہنچانا چاہتی تھیں، ہے نا؟‘‘ میں نے اپنی جانب بڑھتی ہوئی لوسی سے کہا۔

لوسی نے اپنے کان نیچے گرالیے۔

’’تم ایک اچھی کتیا ہو، ہے نا؟‘‘

لوسی اپنے چاروں پیروں کے بل بیٹھ گئی اور ادھر رینگنے لگی جدھر میں بیٹھی ہوئی تھی۔ میرے قدموں کے پاس پہنچ کر وہ سعادت مندی سے رک گئی۔ میں محتاط انداز میں نیچے جھکی اور اس کی گردن اور سر کے بالوں کو سہلانے لگی۔

جب میری انگلیاں اتفاق سے لوہے کے ان بٹنوں سے ٹکرائیں جو اس کی گردن میں پڑے ہوئے چمڑے کے پٹے میں لگے ہوئے تھے تو لوسی سراسیمہ سی ہوگئی اور مچلنے لگی۔

’’یہ تو بہت زیادہ تائٹ ہے نا، لوسی؟‘‘ میں نے کہا۔

’’کیا میں اسے اتار دوں؟‘‘

لوسی میرا ہاتھ چاٹنے لگی۔

میں نے اس کی گردن میں پڑا ہوا پٹا کھول دیا۔ جب میں نے پٹے کو پلٹ کر دیکھا تو میری نگاہ انچ بھر لمبی ان میخوں پر پڑی جو پٹے پر لگے ہوئے لوہے کے بٹنوں سے جڑی ہوئی تھیں۔ میں نے احتیاط اور پیار کے ساتھ لوسی کی گردن کے اس حصے پر ہاتھ پھیرا جہاں وہ نوکدار کیلیں چبھا کرتی تھیں۔

جلد ہی میرا ہاتھ سرخ لہو میں نہا گیا۔ میں نے گھبرا کر وہ پٹا اور اس کے ساتھ بندھی ہوئی زنجیر نیچے زمین پر پھینک دی جہاں وہ ایک ٹوٹے ہوئے پھندے کی طرح دکھائی دینے لگی۔

☆☆☆

تیس منٹ بعد وہ لوگ میری مدد کو پہنچ گئے۔ انہوں نے 911 پر میری مدد کی کال کو ٹریس کرلیا تھا۔

میں بدستور اس ہموار چٹانی پتھر پر بیٹھی ہوئی تھی اور لوسی میرے ساتھ تھی۔

پال کی لاش انہیں نیچے پانی کی سطح سے اوپر ایک چھجے پر پڑی ہوئی مل گئی۔

اس کے ایک ہفتے بعد ایک پولیس سراغ رساں اپنے ابتدائی انٹرویو کے لیے مجھے اپنے ہمراہ جائے حادثہ پر لے گیا۔

’’ابتدا میں ہمارے پاس یہی معلومات تھیں کہ وہ ایک قاتل ہے جو تنہا عورتوں کو اپنا شکار بناتا ہے۔ ہمیں اس بارے میں بہت سی گمشدہ کڑیاں نہیں مل پا رہی تھیں۔ پھر تم نے آکر تمام خالی جگہوں کو پُر کردیا۔‘‘ سراغ رساں کے چہرے پر تنفر کے آثار نمایاں ہوگئے۔ ’’ذرا سوچو کہ وہ اپنے مذموم ارادوں کے لیے اپنی مردہ بیوی اور برا سلوک کیے جانے والی ایک کتیا کو بطور چارا استعمال کرتا تھا!‘‘

’’سراغ رساں، کتیا کے ساتھ واقعی برا سلوک ہوا ہے۔‘‘

’’ہاں، ہمیں معلوم ہے۔ یہ بات میری رپورٹ میں شامل ہے۔‘‘ اس نے میرے قدموں میں بیٹھی ہوئی لوسی کی جانب اشارہ کیا۔ ’’سو تم اسے اپنے پاس رکھ رہی ہو؟‘‘

’’ہاں، لوسی اب میری ہے۔‘‘ میں نے کہا۔ ’’مجھے آدمی سے ڈرنا چاہیے تھا، کتیا سے نہیں۔‘‘

کھلاڑی اناڑی

مریم کے خان

کسی بھی کام کا آغاز کتنا ہی شاندار ہو... اس سے یہ نہیں سمجھا جا سکتا کہ اس کا اختتام بھی اتنا ہی مستحکم اور منشا کے عین مطابق ہو گا... ایک شاطر کھلاڑی کی کامیابیوں سے بھرپور اننگز... اس نے اپنے کھیل کے دوران میں کبھی کسی ناکامی کا منہ نہیں دیکھا تھا... ہر اننگز اس نے اپنے زورِ بازو سے بھرپور کھیلی تھی... کھیل تو کھیل ہوتا ہے... غیر یقینی... جو کبھی نہ پسپا ہوا ہو... اس کو بھی ناک آؤٹ ہونا پڑ جاتا ہے... ایک ایسی ہی تیز رفتار اننگز کے داؤ پیچ... کھلاڑی کی تمام تر خوداعتمادی کے باوجود کامیابی اس سے دور ہوتی جا رہی تھی...

سرورق کی دلچسپ اور ... کہانی... ایک ماہر کھلاڑی کا ایک اناڑی سے ...

''ماما میں ٹھیک ہوں۔'' حماد نے ڈرائیو کرتے ہوئے کہا۔ وہ عجلت میں لگ رہا تھا۔ ''ہاں کھانا بھی ٹھیک سے کھا رہا ہوں... نہیں ماما باہر کم کھاتا ہوں آپ جانتی ہیں، مجھے اچھا پکانا آتا ہے... ہفتے میں ایک بار سارہ کے گھر جاتا ہوں... ایک بار شارق کے پاس جاتا ہوں... باقی رہے پانچ دن تو ان میں گھر میں خود بنا لیتا ہوں... میری صحت بالکل ٹھیک ہے... آپ سب بہت یاد آتے ہیں... نہیں سچ کہہ رہا ہوں... میں آفس کے پاس ہوں ماما... آئی لو یو ماما... بائے۔''

حماد نے آئی فون کوٹ کی جیب میں رکھا، پارکنگ میں کار روکی اور باہر نکلا تو لو کے تھپیڑے نے استقبال کیا۔ حالانکہ صبح کے آٹھ بج رہے تھے اور سورج زیادہ بلند نہیں ہوا تھا مگر گرمی غضب کی تھی۔ وہ تیز قدموں سے الغریب کی شاندار عمارت کی طرف لپکا۔ تیزی کی وجہ گرمی نہیں بلکہ تاخیر تھی۔ اسے آٹھ بجے اپنی میز پر ہونا چاہیے تھا۔ آٹھ بج کر دو منٹ پر وہ داخلی دروازے سے لابی میں داخل ہوا تو ملازمین کا ایک جمِ غفیر اس کے آس پاس موجود تھا۔ دودھیا شیشوں سے ڈھلی یہ پندرہ منزلہ عمارت مکمل طور پر الغریب کی ملکیت تھی۔ الغریب ایک لمٹی جنرل کمپنی تھی جس کا ہیڈ کوارٹر ایک یورپی ملک

میں تھا۔ لیب کچھ خاص دوائیں تیار کرنے میں مہارت رکھتی تھی خاص طور سے جان لیوا وائرس کی ویکسین اور توڑ اس کا خاص شعبہ تھا۔ مڈل ایسٹ کے اس ملک میں یہ اس کا ایک اہم دفتر تھا۔ یہاں سے اس پورے ریجن کو دیکھا جاتا تھا۔ صرف بزنس ہی نہیں بلکہ ادویات کی تیاری اور پیکنگ بھی یہیں ہوتی تھی۔ عمارت کی آخری پانچ منزلیں تحقیق اور ادویات کی تیاری کے لیے مخصوص تھیں جبکہ باقی عمارت عام دفاتر پر مشتمل تھی۔

حماد کمپنی کے مقامی سربراہ احمد اباد کے ساتھ کام کرتا تھا۔ اس کا شعبہ میڈیا تھا اور وہ کمپنی کی تحقیقاتی رپورٹس کو عام فہم زبان میں لکھ کر میڈیا کو مہیا کرتا تھا اس کے ساتھ ہی وہ اباد کے لیے ایک طرح سے رابطہ کار کا کام بھی کرتا تھا۔ اباد ایک مقامی عرب تھا جو آئل کنگ کا سوتیلا بیٹا تھا۔ اس نے امریکا سے بزنس کی اعلیٰ ڈگری لی اور کنسٹرکشن کے کاروبار سے منسلک ہو گیا۔ یہ عمارت اسی کی کمپنی نے بنائی تھی پھر جب کنسٹرکشن کا کاروبار دھیما پڑا تو اباد نے انفریو لیب سے شراکت کر لی اور مڈل ایسٹ میں کمپنی کا سربراہ بن گیا۔ اب انفریو لیب کی تمام ادویات اسی کے توسط سے ڈسٹری بیوٹ ہوتی تھیں۔ ان میں سے کئی ایک ادویات یہیں تیاری کے مراحل سے گزرتی تھیں۔ باقی کی پیکنگ یہاں ہوتی تھی۔

حماد کی ذمے داری میں اباد اور لیب میں کام کرنے والے سائنس دانوں کے درمیان رابطہ کرنا بھی شامل تھا۔ اباد کو سائنس کی معمولی سوجھ بوجھ تھی اور یہ حماد کا کام تھا کہ مشکل سائنسی اصطلاحات اور باتوں کو اس کے لیے عام فہم انداز میں پیش کرے اس لیے حماد تمام میٹنگز میں شامل ہوتا تھا۔

حماد کام کے معاملے میں بہت محتاط تھا۔ خاص طور سے وہ وقت کو بہت اہمیت دیتا تھا۔ دو سال پہلے تک اس کی رہائش اور آفس کے درمیان ہائی وے پر صبح کے وقت بے انتہا رش ہوتا تھا اور دس منٹ کی ڈرائیو گھنٹے بھر میں ہوتی تھی اس لیے وہ صبح ساڑھے چھ بجے گھر سے نکلتا تھا تاکہ وقت پر دفتر پہنچ سکے۔ شام کے وقت اسے پھر ڈیڑھ گھنٹے کی ڈرائیو کرنا پڑتی تھی اور وہ ساڑھے سات بجے واپس گھر پہنچتا تھا۔ پھر ہائی وے کی مزید توسیع اور فلائی اوورز کی تعمیر کے بعد یہی فاصلہ دس منٹ میں طے ہونے لگا مگر اب بھی کبھی کبھی ٹریفک جام ہو جاتا تھا۔ داخلی لابی میں کارڈ چیک کرنے والوں کی تعداد بہت زیادہ تھی اور چھ لائنیں ان کے لیے ناکافی ثابت ہو رہی تھیں۔ چار فٹ اونچی دیواروں کے درمیان سے گزر کر اندر جانا ممکن تھا۔ ہر لائن میں جدید ترین اسکینر اور کمپیوٹرائزڈ

آلات لگے تھے جو آنے والے ہر فرد کو مکمل چیک کرتے تھے۔ آٹھ بج کر دس منٹ پر اس کا نمبر آیا اور اس نے کارڈ ٹائم مشین کے آگے کیا تو اسکرین پر کارڈ ایکسپائرڈ کے الفاظ روشن ہوئے۔ لائن کے آگے کھڑے گارڈ نے اسے خبردار کیا۔ ”آج کارڈ ایکسپائر ہونے کا آخری دن ہے اسے شام تک ری نیو کرا لینا۔“

”ٹھیک ہے۔“ حماد نے کہا اسے معلوم تھا کہ اسے اس کی ضرورت نہیں پڑے گی کہ آج تکنیکی طور پر اس ملازمت میں اس کا آخری دن تھا۔ یہاں ملازمین کو جدید قسم کے ڈیجیٹل کارڈز دیے ہوئے تھے ان پر ملازم کی تصویر کے ساتھ اس کی جاب اور دوسری تفصیلات درج ہوتی تھیں۔ اسے مشین میں ڈالنا نہیں پڑتا تھا صرف مشین کے آگے کرنا ہوتا تھا اور وہ خود لیزر کی مدد سے اس پر درج معلومات پڑھ کر اس کی تصدیق کر دیتی تھی۔ ملازمین کو ہر مہینے کی آخری تاریخ کو کارڈ ری نیو کرانا ہوتا تھا۔ آج مہینے کی آخری تاریخ تھی۔ حماد لائن سے نکل کر لفٹ والی لابی کی طرف بڑھا تو اس کے آغاز میں سیکیورٹی کاؤنٹر پر سیکیورٹی آفیسر عمر نے اس کی طرف دیکھا۔

”کیا حال ہیں حماد؟“

”میں ٹھیک ہوں تم کیسے ہو؟“ حماد نے جواب دیا۔

عمر... اردو جانتا تھا کیونکہ اس نے پاکستان ملٹری اکیڈمی سے گریجویٹ کیا تھا اور اپنے ملک کی فوج میں بیس سال تک کام کرنے کے بعد وہ ریٹائر ہو گیا تھا اب یہاں سیکیورٹی آفیسر کے طور پر کام کر رہا تھا۔ نیچے کی تمام سیکیورٹی اس کی ذمے داری تھی۔ وہ اور اس کا عملہ صبح ملازمین کے آنے سے پہلے آتا تھا اور آخری ملازم کے جانے کے بعد وہ چھٹی کرتے تھے۔ صبح اور شام کے اوقات میں ان کی ڈیوٹی سخت تھی مگر اس کے درمیان وہ زیادہ تر آرام ہی کرتے تھے۔ البتہ عمر کو ہر وقت چوکنا رہنا پڑتا تھا۔ حماد سے اس کی اچھی سلام دعا ہو گئی تھی۔ عمر نے سن لیا تھا۔ اس نے حماد سے کہا۔

”میں بھی ٹھیک ہوں اپنا کارڈ لازمی ری نیو کرا لینا ورنہ کل مشکل میں پڑ جاؤ گے۔“

حماد نے صرف سر ہلایا۔ یہاں کسی کو علم نہیں تھا کہ آج اسے فارغ کر دیا جائے گا۔ ویسے بھی یہ یہاں کا رواج نہیں تھا۔ ہر شخص اپنے کام سے کام رکھتا تھا۔ دفتر میں افواہیں کم پھیلتی تھیں اور عام ملازمین کو کمپنی کے اقدامات کا علم عمل سے ہوتا تھا۔ پہلے سے خبریں لیک آؤٹ ہونے کا رواج نہیں تھا۔ خوشامد اور سیاست کو پسند نہیں کیا جاتا اور کام کو اہمیت دی جاتی تھی۔ اسی کی بنیاد پر ملازمین کی ترقی تنزلی

اور برخاست کے فیصلے ہونے تھے اس لیے ملازمین بھی فضول کی باتوں میں الجھنے کے بجائے اپنے کام پر توجہ دیتے تھے۔ حماد چار سال سے یہاں کام کر رہا تھا اور اس سے پہلے اسے بہت کم مشکل پیش آئی تھی۔ عام طور سے وہ اپنی ذمے داریاں خوش اسلوبی سے پوری کرتا تھا۔

حماد کی کم بختی کا آغاز ایک ہفتہ پہلے ہوا جب اس نے مڈل ایسٹ میں پھیلنے والے ایک جان لیوا وائرس کے لیے بنائی گئی ایفریو لیب کی ایک نئی ویکسین کی تجزیاتی رپورٹ میڈیا کو ریلیز کر دی۔ رپورٹ کے مطابق ویکسین مطلوبہ نتائج دینے میں ناکام رہی تھی۔ جن لوگوں کو یہ ویکسین استعمال کرائی گئی، ان میں سے بہت سارے اس جان لیوا وائرس کا شکار بنے اور ان میں سے کم سے کم سو افراد ہلاک ہو گئے۔ خطے کے تمام ممالک نے فوری طور پر اس ویکسین پر پابندی لگا دی تھی۔ یہ اتنی اہم بات نہیں تھی کیونکہ تجرباتی دوائیں اور ویکسین ناکام ہوتی رہتی ہیں۔ مسئلہ یہ ہوا کہ ایفریو لیب کے ماہرین کو ویکسین کی اس ناکامی کا علم تھا۔ یورپ اور امریکا میں اسے ناکام قرار دے دیا گیا تھا۔ اس کے باوجود تقریباً دو ارب ڈالرز مالیت کی ویکسین مقامی طور پر فروخت کر دی گئی۔ میڈیا میں رپورٹ آتے ہی مقامی حکام ایفریو لیب پر چڑھ دوڑے اور اس پر نہ صرف کیس بلکہ رقم کی واپسی کے ساتھ ہرجانے کے دعوے کی تیاریاں بھی کی جانے لگیں۔

صورت حال گمبھیر ہو گئی تھی۔ مرکزی کمپنی نے اس نقصان کی ذمے داری قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ اس نے ساری ذمے داری ایفریو لیب پر ڈال دی۔ نقصان بھی اسے بھرنا تھا۔ ہرجانے اور سزا کا سامنا بھی وہی کرتا۔ میڈیا ریلیز کی تیاری حماد سمیت پانچ افراد نے کی تھی۔ ان میں تین لیب سے تعلق رکھتے تھے اور پانچواں فرد حماد کا بھارتی نژاد ساتھی اجیت شرما تھا۔ وہ کمپیوٹر اینالسٹ تھا۔ لیب ماہرین نے رپورٹ کا مواد مہیا کیا تھا۔ گزشتہ روز ایلا نے حماد کو اپنے دفتر میں طلب کیا اور میڈیا ریلیز پر اسے قصوروار ٹھہرایا۔ حماد نے اپنی صفائی پیش کی کہ اس نے رپورٹ کمپنی کی گائیڈ لائن کے مطابق تیار کی ہے مگر ایلا ماننے کو تیار نہیں تھا۔ اس کا کہنا تھا کہ اسے معلوم ہونا چاہیے تھا کہ رپورٹ کے اس حصے کی اشاعت سے کمپنی پر کیا اثرات مرتب ہوں گے۔ اسے اس حصے کو ایڈٹ کرنا چاہیے تھا۔ حماد نے اسے آگاہ کیا کہ اسے رپورٹ ایڈٹ کرنے کا اختیار نہیں ہے۔ وہ صرف اسے عام فہم انداز میں ترتیب دے سکتا ہے۔ یہ حقیقت اس کی ذمے داری کے ہینڈ بک میں شامل تھی اور ایلا اس سے اچھی طرح واقف تھا۔ اس کے باوجود اس کا موڈ ٹھیک نہیں ہوا تھا۔ اس نے بہت رکھائی سے اسے رفع ہو جانے کا حکم دیا اور آخر میں بولا۔

”تمہارے بارے میں کل فیصلہ ہو گا۔“

یہ فیصلہ نوشتۂ دیوار کی طرح حماد کے سامنے تھا۔ وہ اس معاملے میں سب سے کمزور فریق تھا اور سزا اسے ہی ملتی۔ باقی تین اعلیٰ درجے کے سائنسی ماہرین تھے اور اجیت اس کا ماتحت تھا اس لیے وہ ذمے داری سے بچ جاتا۔ وہ گزشتہ چار سال سے اس کمپنی میں کام کر رہا تھا مگر اسے ایک دن کے لیے بھی اپنی جاب پر بھروسا نہیں ہوا تھا۔ اسے معلوم تھا یہاں برسوں کام کرنے والوں کو ایک منٹ میں فائر کر دیا جاتا ہے اور کوئی اس پر احتجاج بھی نہیں کر سکتا تھا۔ کوئی کرتا بھی نہیں تھا کیونکہ جو عام حالات میں نکالے جاتے تھے، انہیں کہیں نہ کہیں اس جیسی یا اس سے بہتر جاب مل جاتی تھی اور جو خاص حالات میں نکالے جاتے تھے وہ سیدھے اپنے ملکوں کو واپس جاتے تھے۔ پھر انہیں یہاں کام یا ملازمت کرنے کا موقع نہیں ملتا تھا۔ حماد نہیں جانتا تھا کہ اسے فائر کرنے کے بعد اس کے ساتھ کیا ہو گا۔ اگر کمپنی نے اس کے خلاف رپورٹ کر دی تو اسے ڈی پورٹ کر دیا جائے گا اور وہ سارہ سے دور ہو جائے گا۔

سارہ اس کی محبت تھی۔ چھ سال پہلے جب وہ یہاں آیا تو یونیورسٹی میں اس کی ملاقات سارہ سے ہوئی تھی۔ حماد نے پاکستان کی ایک یونیورسٹی سے بہت اعزاز کے ساتھ بائیولوجی میں ایم ایس سی کیا تھا۔ اسے فرسٹ کلاس فرسٹ پوزیشن لینے پر گولڈ میڈل ملا تھا۔ پھر اسے مڈل ایسٹ کی ایک یونیورسٹی نے ایم فل کے لیے اسکالرشپ دی۔ مگر یہ خالص اسکالرشپ نہیں تھی بلکہ اسے یہاں پڑھانا بھی تھا اس لیے دو سال میں جا کر اس کا ایم فل مکمل ہوا تھا۔ اس نے پی ایچ ڈی کے لیے درخواست دی تھی مگر اس کی درخواست قبول نہیں ہوئی اور اس نے ایفریو لیب میں جاب کر لی۔ ایم فل کے دوران میں مقامی اخبارات اور رسائل میں مضامین لکھتا رہا تھا اور ان مضامین کی وجہ سے اسے ملازمت ملی تھی۔ سارہ اسی یونیورسٹی میں ماسٹر کے آخری سال میں تھی۔ جب حماد سے اس کی پہلی ملاقات ہوئی تو وہ آنرز کر رہی تھی۔ اس نے اپلائیڈ کیمسٹری لی تھی۔

سارہ تقریباً چوبیس برس کی خوش شکل اور خوش اطوار لڑکی تھی۔ اتنے عرصے تک حماد سے ملاقات رہی اور وہ بہت

بارا کیبنے میں بھی لے نگران کا تعلق ایک حد سے آگے نہیں بڑھا تھا۔ دونوں ہی شادی کے بعد تعلق کے قائل تھے۔ اس نے حماد پر واضح کر دیا تھا کہ وہ ماسٹر مکمل کرے گی اور اس کے بعد ہی وہ شادی کا سوچے۔ سارہ کا ارادہ بھی جاب کرنے کا تھا۔ حالانکہ اسے جاب کی ضرورت نہیں تھی۔ سارہ کا باپ عدنان علی ایک متوسط درجے کا بزنس مین تھا۔ اس پورے ملک میں اس کے کوئی دو درجن کار واش اور ورکشاپ تھے۔ وہ خود آٹو موبائل انجینئر تھا۔ اس کی رہائش ایک عالی شان پینٹ ہاؤس میں تھی اور اس کے علاوہ بھی اس کی یہاں خاصی جائیداد تھی۔ سارہ اپنے بہن بھائیوں میں پانچویں نمبر پر تھی۔ اس کے دو بڑے بھائی تھے جو عدنان کے ساتھ کام کرتے تھے۔ سارہ سے دو بڑی بہنوں کی شادیاں ہو چکی تھیں، البتہ سارہ پڑھ رہی تھی۔ اس سے چھوٹے دو بھائی اور تھے وہ بھی زیر تعلیم تھے۔ سارہ کے گھر والوں کو علم تھا کہ وہ حماد کو پسند کرتی ہے اور انہیں کوئی اعتراض نہیں تھا۔

حماد کا ارادہ تھا کہ جیسے ہی سارہ ماسٹر مکمل کرے گی، وہ اپنے ماں باپ کو بلوائے گا تاکہ وہ رشتے کی بات کریں مگر اس سے پہلے یہ مسئلہ کھڑا ہو گیا اور اسے نہیں معلوم تھا کہ وہ اب جاب پر اور اس ملک میں رہ سکے گا یا نہیں۔ اس نے گزشتہ رات ہی سارہ کو صورت حال سے آگاہ کر دیا تھا۔ عام طور سے ہر روز شام یا رات کے وقت ان کی فون پر بات ہوتی تھی اور وہ ایک دوسرے کو سارے دن کی روداد سناتے تھے۔ اس کے بغیر انہیں چین نہیں آتا تھا۔ حماد کی بات سن کر سارہ نے بے پروائی سے کہا۔ ”کوئی بات نہیں، مجھے تو تمہارے ساتھ رہنا ہے چاہے تم کہیں بھی رہو۔“

حماد خفا ہو گیا۔ ”تمہیں ساتھ رہنے کی پڑی ہے اور یہاں میرا کیریئر داؤ پر لگا ہے۔“

”مسٹر حماد.... “ سارہ نے چبا کر کہا۔ ”میں نے تم سے محبت کی ہے، تمہارے کیریئر سے نہیں۔“

”سمجھنے کی کوشش کرو اگر میرے پاس یہ جاب نہ رہی تو کیا تمہارے ماں باپ میرا رشتہ قبول کر لیں گے؟“

”یہ میرا دردِ سر ہے۔ تم اس کی فکر مت کرو۔ تم پاپا کو جانتے ہو وہ پیسے کو نہیں، انسان کو اہمیت دینے والے ہیں اور وہ تمہارے بارے میں اچھی طرح جانتے ہیں۔“ سارہ نے کہا تو اسے تسلی ہو گئی اور وہ رات میں سکون کی نیند سویا اسی وجہ سے اسے اٹھنے میں ذرا تاخیر ہوئی۔ اب وہ بھاگم بھاگ یہاں پہنچا تھا۔ راستے میں ماما کا فون آ گیا اور اس وجہ سے اسے ذرا سست ڈرائیو کرنا پڑی ورنہ وہ وقت پر پہنچ جاتا۔ حماد لفٹس کی طرف جا رہا تھا کہ اس کے سیل فون کی گھنٹی بجی اور اس نے جیب سے نکال کر دیکھا۔ اسکرین پر سارہ کی مسکراتی تصویر آ رہی تھی اور نیچے لکھا تھا ”سارہ کالنگ“ اس نے کال ریسیو کی۔

”ہیلو کیا حال ہے؟“

”میں یونیورسٹی کے لیے نکل رہی ہوں۔“ سارہ بولی۔ ”کل رات میں نے پاپا سے بات کی ہے، وہ کہہ رہے ہیں کوئی مسئلہ نہیں ہے اگر تم کو جاب سے نکال دیا تو وہ تمہیں ریزرو رکھیں گے جب تک تم نئی جاب تلاش نہیں کر لیتے۔“

”مسئلہ صرف ویزے کا نہیں ہے۔“ حماد نے ایک لفٹ کی طرف بڑھتے ہوئے کہا۔ ”مسئلہ یہ ہے اگر کمپنی نے نیگیٹو رپورٹ کی تو میں بین ہو جاؤں گا۔“

سارہ سے گفتگو کے دوران حماد ایک لمحے کو رکا تھا۔ اس دوران میں لفٹ پوری طرح بھر گئی اور اس کے دروازے بند ہو گئے۔ وہ گہری سانس لے کر دوسری لفٹ کی طرف بڑھا۔ سارہ کہہ رہی تھی۔ ”پاپا نے کہا ہے یہ بھی کوئی مسئلہ نہیں ہے۔ تم جانتے ہو ان کا مقامی پارٹنر راؤ لاسینڈرو ہے وہ کچھ نہ کچھ کر لے گا۔“

”اوکے۔“ حماد نے لفٹ میں داخل ہوتے ہوئے کہا۔ ”میں شام کو تم سے بات کروں گا۔“

یہ لفٹ بھی بھر گئی تھی اور وہ بروقت پہنچا تھا۔ ایسا لگ رہا تھا کسی ٹریفک جام کی وجہ سے بیشتر ملازمین دیر سے پہنچے تھے۔ ورنہ اس وقت تک سب اپنے اپنے فلورز پر جا چکے ہوتے ہیں۔ حماد نے اپنا آفس کارڈ لفٹ کی مشین کے آگے کیا اور اس نے تصدیق کے لیے گرین لائٹ روشن کی۔ حماد نے دسویں فلور کا بٹن دبایا تھا۔ اس کا دفتر دسویں فلور پر تھا۔ ہر فرد کو جو لفٹ میں داخل ہوتا تھا، اپنے فلور پر لفٹ رکوانے کے لیے کارڈ مشین سے لگا کر فلور بٹن دبانا پڑتا تھا اگر ایک ہی فلور کے کئی ملازمین ہوتے تو کسی کا ایک کارڈ استعمال کرنا بھی کافی ہوتا تھا کیونکہ لفٹ پھر اسی فلور پر رکتی تھی۔ اتفاق سے لفٹ میں دسویں فلور کا وہ واحد فرد تھا اس لیے اسے کارڈ مشین سے لگانا پڑا۔ دسویں فلور پر انگریز بگلوز کے دفاتر تھے اور ان کا عملہ ہوتا تھا۔

لفٹس جس لابی میں کھلتی تھی، اس میں سامنے ہی سیکیورٹی آفیسر کا کیبن تھا۔ سیکیورٹی آفیسر راشد بن کرم کیبن میں موجود تھا۔ لمبے تڑنگے اور کرخت خدوخال والے راشد کی عام طور سے.... تا نت شفقت ہوتی تھی مگر آج وہ وزے میں

تھا۔ وہ صبح سات سے شام سات بجے تک یہاں ہوتا پھر رات کا سیکیورٹی آفیسر آجاتا۔ لابی سے تین راستے نکل رہے تھے۔ ایک جنرل ورکرز ہال کی طرف جاتا تھا۔ دوسرا حماد کے سیکشن کی طرف جاتا تھا اور تیسرا ایگزیکٹو ایریا کی طرف جاتا تھا۔ تمام ملازمین راشد کے سامنے سے گزر کر ہی اپنے دفتروں میں جاتے تھے۔ اس کے سامنے بھی ایک مشین لگی تھی جس پر کارڈ لگانا پڑتا اور وہ تصدیق کرتی تھی۔ حماد نے اپنا کارڈ لگایا تو بجائے سبز کے سرخ روشنی جلی۔ حماد نے دوبارہ اپنا کارڈ مشین سے لگایا۔ اس بار بھی سرخ روشنی جلی تھی اور مخصوص بزر کی آواز آئی تھی۔ یعنی مشین نے کارڈ قبول نہیں کیا تھا۔ راشد دیکھ رہا تھا۔ اس نے کہا۔

"کارڈ ایکسپائر ہو گیا ہے۔"

"ابھی تو کام کر رہا تھا، میں نے لفٹ استعمال کی ہے۔"

"آخری ویلڈ ہے، تم نے شاید جلدی ری نیو کرالیا ہو گا اسی رات کے لحاظ سے ایکسپائر ہو گیا۔" راشد نے کہا۔

"لاؤ مجھے دو میں عارضی طور پر ری نیو کر دیتا ہوں شام کو پھر لے آنا۔ میں اسے مہینے کے لیے ری نیو کر دوں گا۔"

حماد کو یاد آیا پچھلے مہینے کی آخری تاریخ کو اسے اباد کے ساتھ ایک سیمینار میں جانا تھا اور پھر اسے دفتر آنے کا موقع نہیں ملتا اس لیے اس نے صبح سویرے اپنا کارڈ ری نیو کرا لیا تھا اور وہ اسی وقت کے لحاظ سے ایکسپائر ہو گیا۔ اس نے کارڈ راشد کے حوالے کیا جس نے اسے کمپیوٹر سے منسلک ایک چھوٹی سی ڈیوائس میں ڈالا اور اسے ری نیو کرنے لگا۔ اس پروسیس میں مشکل سے ایک منٹ لگا۔ اس نے کارڈ نکال کر حماد کو دیا۔ "شام کو یاد سے ری نیو کرا لینا۔ ورنہ کل دفتر نہیں آسکو گے۔"

"شاید اسے کل دفتر آنے کی ضرورت ہی نہ پڑے۔" اس نے اندر جاتے ہوئے سوچا۔ حماد کے سیکشن میں کل پانچ افراد تھے اور حماد ان کا انچارج تھا۔ اجیت اس کا نائب تھا اور وہ آچکا تھا۔ حماد نے اندر آنے کے لیے گلاس ڈور کے ساتھ لگی مشین سے کارڈ لگایا اور لاک کھل گیا۔ اس پوری عمارت میں کسی بھی جگہ جانے کے لیے یہ کارڈ لازمی تھا کیونکہ دروازے اسی سے کھلتے اور بند ہوتے تھے۔ اندر آکر اس نے اپنا کوٹ اتار کر ہینگر پر لٹکایا اور مشین سے کپ میں چائے نکالتا ہوا اپنے کیبن میں آیا۔ آج اسے ناشتے کا موقع بھی نہیں ملا تھا۔ اس نے دیوار کے پار بیٹھے اجیت سے پوچھا۔ "کوئی نئی تازی؟"

"گھر میں ہے۔" اجیت بولا۔ "سریتا نے خوش خبری سنائی ہے۔"

"تیسرا بچہ؟"

اجیت نے سر ہلایا تو حماد نے سر پر ہاتھ مارا۔ "اگر تم اسی طرح ہر سال ایک بچہ پیدا کرتے رہے تو جلد انڈیا کی آبادی ڈبل ہو جائے گی۔"

"اس میں صرف میرا حصہ نہیں ہوگا۔"

"اپنی بیوی پر رحم کرو۔" حماد نے کمپیوٹر آن کیا۔

"یہ اس کی خواہش ہے۔" اجیت ہنسا۔ "اچھا ہے بچوں کے ساتھ لگی رہتی ہے میرا دماغ کم کھاتی ہے۔" اجیت تقریباً چالیس برس کا کسی قدر صحت مند اور گول چہرے والا شخص تھا۔ وہ حماد سے پہلے یہاں جاب کر رہا تھا۔ اپنے کام سے کام رکھنے والا غیر متعصب اور خوش دل شخص تھا اس لیے حماد سمیت سب سے اس کی بنتی تھی۔ "تمہاری رپورٹ کا کیا بنا؟"

"کیا بنتا تھا، کل پیش ہو گئی۔" حماد نے اسے آگاہ کیا۔ "آج فیصلہ سنایا جائے گا۔"

اجیت سنجیدہ ہو گیا۔ "یہ زیادتی ہے، تم نے اپنی طرف سے کچھ شامل نہیں کیا جو میٹر اوپر سے آیا اسے ہی آگے کیا تھا۔ اگر میٹر آگے نہیں کرنا تھا تو اسے دینا ہی نہیں چاہیے تھا۔"

"ہاں لیکن یہ سب کون دیکھتا ہے وہ ایک محاورہ ہے نا کہ نزلہ کمزور عضو پر گرتا ہے۔ یہ لیب والوں کو تو نکال نہیں سکتے اس لیے قربانی کا بکرا میں ہی بنوں گا۔"

اجیت دوبارہ مسکرانے لگا۔ "تمہارے لیے کیا مسئلہ بنتا ہے ہو سکتا ہے فری لانسر کر رہی ہے اپنی کمپنی یا ورکشاپ یا کاروبار میں قسمت آزمائے گا۔ بزنس میں شامل ہو گئے تو یہاں سے زیادہ ہی کماؤ گے۔"

"سارہ نے بھی یہی کہا ہے۔" حماد بولا اور اپنے کام میں لگ گیا۔ اگرچہ اب اسے کام کی پروا نہیں ہونی چاہیے تھی مگر وہ عادت سے مجبور تھا۔ کام معمول میں شامل تھا اور اس کے لیے کسی ہدایت کی ضرورت نہیں تھی اس لیے وہ مصروف رہا۔ اس نے رپورٹس تیار کیں۔ کیونکہ فی الحال وہ فائر کے خطرے سے دوچار تھا اس لیے اس نے رپورٹس میڈیا سیکشن کو مکمل نہیں کیں جو اسے آگے اخبارات و رسائل اور الیکٹرونک میڈیا کو فراہم کرتا تھا۔ یہ کام اس نے اگلے دن یا اپنے بعد آنے والے فرد کے لیے چھوڑ دیا تھا۔ لنچ کے لیے وہ نیچے کیفے ٹیریا میں آئے۔ اجیت اس کے ساتھ تھا۔ دفتر میں وہ کھل کر بات نہیں کر سکتے تھے کیونکہ وہاں دوسرے بھی ہوتے تھے اور اس سے حماد کا تعلق صرف باس اور

ماتحت والا تھا جبکہ اجیت سے وہ ہر بات کر لیتا تھا۔ کیفے ٹیریا میں وہ کھل کر بات کر لیتے تھے۔ دونوں ایک ایک دن لنچ لاتے تھے۔ آج اجیت کی باری تھی۔ اس نے حماد کی ٹرے میز پر اس کے سامنے رکھی اور بیٹھتا ہوا بولا۔

''جن تین ماہرین نے رپورٹ دی تھی، سنا ہے وہ بھی زیرِ عتاب آنے والے ہیں۔''

''غلطی ہیڈ آفس کی ہے۔ ویکسین ان کی طرف سے آئی تھی، یہاں صرف اس کا تجزیہ ہوا اور رپورٹ تیار ہوئی ہے۔''

''اسی بات پر تو گھیرا جائے گا۔'' اجیت نے آہستہ سے کہا۔ ''مجھ سے ان کا ریکارڈ طلب کیا گیا ہے۔ بڑا لمبا کام ہے، اوپر سے حکم آیا ہے کہ میں کام کر کے ہی گھر جاؤں۔''

حماد چونکا۔ اگر اس کے بجائے اجیت سے ریکارڈ طلب کیا گیا تھا تو اس کا مطلب تھا کہ اسے فائر کرنے کا فیصلہ کر لیا گیا ہے۔ ورنہ اس سے کہا جاتا۔ ''یعنی آج تم آفس ٹائم کے بعد بھی رکو گے؟''

اجیت نے شانے اچکائے۔ ''مجبوری ہے۔''

حماد ایک طرح سے ریکارڈ کیپر بھی تھا اور اس کے پاس کمپیوٹرز اور مین سرور تک میں تمام معلومات ہوتی تھیں۔ لنچ کے بعد کام نہیں تھا اس لیے حماد آرام اور اپنی طلبی کا انتظار کرتا رہا۔ بالآخر چار بجے ایاد نے اسے بلایا۔ اس کی سیکریٹری مس ایوری تھنگ نے کال کی تھی۔ ''مسٹر حماد تمہیں باس نے طلب کیا ہے۔''

حسبِ توقع ایاد کے دفتر میں مس شیلا عرف مس ایوری تھنگ موجود تھی۔ ایوری تھنگ کا لقب اسے دفتر والوں نے دیا ہوا تھا کیونکہ وہ ایاد کی سیکریٹری، محبوبہ، مشیر اور ایک افواہ کے مطابق باڈی گارڈ بھی تھی۔ وہ ہر وقت اس کے ساتھ پائی جاتی تھی۔ تقریباً چالیس سالہ شیلا کارٹر کا تعلق فلپائن سے تھا مگر اس کی رگوں میں امریکی خون بھی شامل تھا۔ اس کا باپ ایک امریکی میرین تھا جو اس کی ماں کو اس کی صورت میں تحفہ دے کر ایسا غائب ہوا کہ پھر اس نے صورت نہیں دکھائی۔ شیلا کو اس کی ماں نے پالا تھا۔ اس نے برتری جیسی میں اعلیٰ تعلیم حاصل کی تھی اور وہ گزشتہ دس سال سے ایاد کے ساتھ تھی۔ وہ ایک طرف چرمی صوفے پر بیٹھی اپنے آئی پیڈ پر مصروف تھی۔ تورا انوکھے میک اپ کے ساتھ۔ بظاہر شیلا بے نیاز لگ رہی تھی لیکن حماد جانتا تھا اس کی توجہ مکمل طور پر ان پر مرکوز تھی۔ شیلا کا ایک لقب جاسوس بھی تھا کیونکہ وہ اپنے آس پاس کی خبر رکھنے کی ہر ممکن کوشش کرتی تھی۔ خاص طور سے ایاد سے متعلق خبروں سے اسے بہت دلچسپی تھی۔

''یس سر!'' حماد نے ایاد سے کہا۔ یہ تنا پر وہ بھی اپنے لیپ ٹاپ میں کھویا ہوا تھا۔ وہ چونکا اور اسے اشارے سے بیٹھنے کو کہا۔

''مسٹر حماد ناصر۔'' ایاد نے نرم لہجے میں کہا تو حماد بھانپ گیا کہ اس کے بارے میں کیا فیصلہ ہوا ہے۔ ویسے وہ ذہنی طور پر تیار ہو کر آیا تھا۔ ''تم نے چار سال اس کمپنی میں گزارے اور تمہاری کارکردگی شاندار رہی۔ تم یقیناً اس فیصلے کے حق دار نہیں ہو لیکن انسان کو بعض اوقات ناگوار فیصلے کرنے ہی پڑتے ہیں۔''

''میں سمجھتا ہوں سر۔'' حماد نے متانت سے کہا تو شیلا نے سر اٹھا کر اسے دیکھا۔

''تمہارے سروس ریکارڈ کے پیشِ نظر تمہیں صرف فائر کیا جا رہا ہے اور تم پر کسی قسم کا چارج نہیں لگایا گیا ہے۔'' حماد نے اطمینان کا سانس لیا۔ ''میں شکر گزار ہوں سر۔''

''تم کمپنی کا ویزا مزید دو مہینے استعمال کر سکتے ہو۔ تمہیں تمہارے واجبات کے ساتھ ان دو مہینوں کی تنخواہ بھی دی جائے گی۔''

''تھینک یو سر۔'' اس بار حماد سچ مچ خوش ہو گیا کیونکہ دو مہینے میں وہ کوئی دوسری ملازمت تلاش کر سکتا تھا اور چارج نہ لگانے سے وہ یہ بھی کر سکتا کہ اپنا ویزا خود حاصل کر سکے۔ وہ سوچ رہا تھا کہ اس پر اتنی مہربانی کیوں کی جا رہی ہے اور جلد ہی تجسّس سے باہر آ گئی۔ ایاد نے اپنے سامنے رکھی ایک فائل اٹھا کر اس کے آگے کی۔

''اس پر سائن کر دو۔''

''یہ کیا ہے سر؟''

''اس میں ایک حلف نامہ ہے جس کے مطابق تم نے تجزیاتی رپورٹ میں غلطی سے وہ حصہ شامل کیا جس میں ویکسین کو غیر موثر قرار دیا گیا ہے۔ یہ مواد کا حصہ نہیں تھا۔''

حماد نے نفی میں سر ہلایا۔ ''سر! میں نے ایسا غلطی سے نہیں کیا کیونکہ مجھے رپورٹ کا یہ حصہ باقاعدہ مہیا کیا گیا تھا۔''

ایاد کا چہرہ بدلا، اس کے چہرے سے نرمی تاغائب ہو گئی۔ مگر لہجہ بدستور نرم رہا۔ ''تم سمجھنے کی کوشش کرو اگر تم یہ حلف نامہ سائن کر دو گے تو کمپنی بہت بڑی مشکل سے نکل آئے گی۔''

یہ سراسر اس کے کندھے پر رکھ کر بندوق چلانے والی بات تھی۔ اسے غصہ آنے لگا۔ ''سر جب میرے ایک سائن سے کمپنی مشکل سے نکل سکتی ہے تو پھر مجھے فائر کرنے کی کیا وضاحت پیش کی جائے گی؟''

''کسی وضاحت کی ضرورت نہیں ہے۔'' اباد کے بجائے شیلا نے کہا۔ اس نے منی اسکرٹ پہن رکھا تھا اور بیٹھنے کا انداز ایسا تھا کہ اس کی پُرکشش سڈول ٹانگیں نمایاں ہو رہی تھیں۔ وہ حماد کی طرف دیکھنے کے بجائے اپنے ناخنوں کا معائنہ کر رہی تھی۔ ''ہم سے کوئی نہیں پوچھے گا۔''

حماد نے ٹھہرے لہجے میں کہا۔ ''فرض کریں میں پوچھ رہا ہوں جب میں ایک سائن کر کے کمپنی کو مشکل سے نکال سکتا ہوں تو پھر مجھے کیوں فائر کیا جا رہا ہے؟''

اباد ذرا آگے جھکا۔ ''میں نے کہا نا آدمی کو بعض اوقات مشکل فیصلے کرنے پڑتے ہیں۔ تمہارے لیے ہیڈ آفس سے حکم آیا ہے۔''

''اگر تم سائن نہیں کرو گے تو تمہیں چارج کے ساتھ فائر کیا جائے گا۔'' اس بار شیلا نے کہا۔ وہ دونوں باری باری بول رہے تھے۔ ''تم سمجھ سکتے ہو اس کے بعد تمہارے لیے یہاں یا مڈل ایسٹ کے کسی بھی ملک کا ویزا حاصل کرنا ناممکن ہو جائے گا۔''

''حماد تم ذہین اور باصلاحیت نوجوان ہو، تمہیں آسانی سے جاب مل جائے گی۔'' اباد نے اپنی باری پر رسانیت سے کہا۔

''باوجود اس کے کہ مجھے یہاں سے فائر کیا جائے گا۔'' حماد نے کسی قدر تلخی سے کہا۔ وہ جانتا تھا اس کے پاس اس کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا۔ اگر اسے چارج کے ساتھ فارغ کیا جاتا تو اس کا ویزا فوری کینسل ہو جاتا اور اسے فوری ڈی پورٹ کر دیا جاتا۔ دوسری صورت میں اسے مہلت مل رہی تھی۔ اس نے فائل اٹھائی، اس کے مندرجات دیکھے اور اس پر مطلوبہ جگہ سائن کر دیے۔ اس نے فائل بند کر کے اباد کے سامنے رکھی۔ ''ٹھیک ہو سر۔''

اباد نے ایک لفافہ اس کی طرف بڑھایا۔ ''اس میں دو مہینے کی اضافی سیلری کیش کی صورت میں ہے باقی واجبات تمہارے اکاؤنٹ میں منتقل کر دیے جائیں گے۔ دو دن بعد تم اپنے ڈاکومنٹس اور پاسپورٹ لے جا سکتے ہو۔''

حماد اباد کے دفتر سے نکلا تو اسے دکھ ہو رہا تھا۔ وہ چار سال سے اس جگہ کام کر رہا تھا اور اسے یہاں سے انسیت ہو گئی تھی۔ درحقیقت یہاں کا ماحول بہت اچھا تھا۔ اباد سمیت ہونے کے باوجود ماتحتوں کے لیے اچھا باس تھا۔ وہ ان کے مسائل سنتا تھا اور انہیں حل کرنے کی کوشش بھی کرتا تھا۔ تنخواہیں اچھی تھیں اور دوسری مراعات بھی ٹھیک تھیں۔ تنخواہوں میں سال بہ سال اضافہ ہوتا تھا۔ وہ نصف سے زیادہ رقم بچا لیتا تھا جبکہ وہ اپنے اوپر خرچ کرتا تھا اور گھر بھی بھیجتا تھا۔ ان چار سالوں میں اس کے پاس اچھی خاصی رقم جمع ہو گئی تھی۔ وہ نہ صرف ادھار بڑا لے سکتا تھا بلکہ ان ہی اخراجات کے ساتھ دو سال بیٹھ کر کھا بھی سکتا تھا۔ مگر اسے امید تھی کہ وہ دو مہینے میں کوئی معقول یا گزارے لائق جاب تلاش کرنے میں کامیاب ہو جائے گا اور اسے اپنی جمع پونجی خرچ کرنے کی ضرورت نہیں پڑے گی۔

☆☆☆

لفتھنسا کی جدید ائربس 380 مڈل ایسٹ کے اس معروف ترین ائرپورٹ پر اترنے والی تھی۔ اس کی بزنس کلاس میں ایک سوٹ پوش شخص کھڑکی سے باہر جھانکتے ہوئے طیارے میں اپنی آخری ڈرنک سے لطف اندوز ہو رہا تھا۔ وہ نظر بظاہر لمبا اور چھریرے لیکن مضبوط جسم کا مہذب اور اپنے انداز سے بزنس مین دکھائی دینے والا شخص تھا۔ عمر چالیس سے اوپر تھی مگر اپنے بے داغ اور بے شکن چہرے کی وجہ سے وہ تیس پینتیس سے زیادہ کا نہیں لگتا تھا۔ مگر وہ بزنس مین نہیں تھا کم سے کم عام معنوں میں نہیں تھا۔ اگر اسے بزنس مین کہا جا سکتا تو اس کا دوسرا بزنس موت کا فرشتہ تھا۔ کیونکہ وہ کرائے کا قاتل تھا۔ پاسپورٹ کے مطابق اس کا نام ولیم کرز تھا مگر اپنے مخصوص حلقے میں وہ وی ہنٹر کے نام سے مشہور تھا۔ وہ یورپ اور دنیا کی چھ زبانیں روانی سے اہل زبان کی طرح بول سکتا تھا۔ اس کے پاس ایک درجن پاسپورٹ تھے اور وہ ویزے کے لیے کسی ملک کے سفارت خانے سے رجوع کرنے کا قائل نہیں تھا۔ اس قسم کے چھوٹے موٹے کام وہ خود کر لیتا تھا۔

ہنٹر کا تعلق اصل میں آئرلینڈ سے تھا۔ سولہ سال کی عمر میں وہ آئرش ری پبلکن آرمی میں شامل ہوا۔ جلد ہنٹر نے ثابت کر دیا کہ وہ فطری قاتل تھا اور کسی کی جان لینا اس کے لیے اتنا ہی آسان تھا جتنا کہ عام آدمی کے لیے ہاتھ دھونا۔ اس کی صلاحیتوں کی وجہ سے اسے مخصوص شعبے میں بھیج دیا گیا اور اس نے برطانوی افسران اور ان کے اہل خانہ کو لے جانے والی ایک بس کو اڑا کر شہرت حاصل کی تھی مگر اس وقت بھی برطانوی خفیہ ایجنسیاں اس کے بارے میں کچھ نہیں جانتی تھیں اور ان کے پاس اس کی صرف ایک مبہم سی تصویر

تھی۔ برطانوی پریس نے اسے ریڈ ہنٹر کا خطاب دیا۔ برطانیہ کا ہر جاسوس اور ہر پولیس مین اس کی تلاش میں تھا مگر وہ اس کی ایک جھلک بھی نہ پا سکے۔

ایک حملے کے دوران میں اپنے ساتھیوں سے اختلافات کے بعد آئرش ری پبلکن کو خیر باد کہہ دیا اور ان سے بچنے کے لیے وہ جرمنی چلا گیا۔ وہ سات سال وہاں رہا اور وہیں سے اس نے اپنا موجودہ کیریئر شروع کیا۔ جلد اس کا شمار دنیا کے بہترین اجرتی قاتلوں میں ہونے لگا۔

ایک ہفتہ پہلے اسے جینوا میں ایک لفافہ ملا جس میں اس کے لیے ہدایات تھیں اور ایک ملین ڈالرز کا ایک بینک ڈرافٹ تھا۔ وہ رقم پوری اور پیشگی لیتا تھا۔ کام نہ ہونے کی صورت میں وہ دس فیصد رقم کاٹ کر بقیہ واپس کر دیتا تھا مگر اب تک صرف دو بار ہی ایسا ہوا تھا کہ اسے رقم واپس کرنی پڑی تھی۔ ان دو ناکامیوں سے قطع نظر اس کی کامیابیوں کی فہرست طویل تھی۔ شاید اسی وجہ سے اسے موت کا فرشتہ بھی کہا جاتا تھا۔ اس کے گاہک اس پر اعتماد کرتے تھے۔ ائر ہوسٹس سیٹ بیلٹ کی یاد دہانی کرا رہی تھی۔ وہ اس کے پاس آئی اور اس نے مسکرا کر اس کے حسن کو نظروں میں سراہا تھا۔

وہ ہنٹر کے سامنے موجود ٹرے واپس دیوار میں سیٹ کر رہی تھی کہ اس نے آہستہ سے کہا۔ ”تم اس فلائٹ کے بعد واپس چلی جاؤ گی؟“

ائر ہوسٹس کا رنگ گلابی ہو گیا۔ وہ بائیس سال کی بہت خوب صورت لڑکی تھی۔ ہنٹر کا لہجہ ٹھیٹھ جرمن تھا اس لیے وہ اسے جرمن سمجھ رہی تھی۔ اس نے سرگوشی میں کہا۔ ”نہیں، دو دن کا آف ہے۔“

”تم کہاں رکو گی؟“ ائر ہوسٹس نے ایک فائیو اسٹار ہوٹل کا نام لیا۔

”لیکن آج میں آرام کروں گی، دو دن سے فلائٹ پر ہوں۔“

”مجھے بھی آج کام ہے۔“ ہنٹر نے نظروں میں اسے تولتے ہوئے کہا۔ ”کل میں تم سے رابطہ کروں گا۔“

اس نے ائر ہوسٹس کا نام نہیں پوچھا کیونکہ وہ اس کے یونیفارم پر ٹنگا تھا۔ ائر ہوسٹس بھی اس کا نام جانتی تھی کیونکہ اسی نے اس کا بورڈنگ کارڈ وصول کیا تھا۔ بہت خاموشی سے ان میں معاملات طے پا گئے اور ہنٹر آنے والے پُرلطف لمحات کا سوچ کر مسکرانے لگا۔ ویسے تو کام بھی اس کے لیے تفریح تھا اور وہ اس کے ایک ایک لمحے سے لطف اندوز ہوتا تھا بلکہ کام جتنا مشکل ہوتا، اسے اتنا ہی زیادہ مزہ آتا تھا۔ وہ چیلنج قبول کرنے سے کبھی نہیں ہچکچاتا تھا۔ یہ کام بھی اس کے لیے چیلنج تھا مگر اسے اعتماد تھا کہ وہ اسے بہ آسانی نمٹا لے گا۔ طیارے نے لینڈ کیا تو اس نے ائرپورٹ کے ساتھ دور تک پھیلے صحرا کو دیکھا۔ اسے لینڈ اسکیپ اچھی لگتی تھیں۔ جب وہ فارغ ہوتا تو ٹریک پر چلا جاتا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ یہ چیز اسے فطرت سے قریب کرتی تھی۔ وہ اپنے کام کو بھی فطرت کا ایک حصہ سمجھتا تھا۔ فطرت میں کچھ بھی غیر ضروری نہیں ہے اور وہ بھی غیر ضروری افراد کو اس دنیا سے رخصت کرتا تھا۔

کسٹم اور امیگریشن سے نمٹ کر وہ ایک ٹیکسی میں ائرپورٹ سے روانہ ہوا تو اس کے پاس ایک چھوٹے سے ہینڈ بیگ کے سوا کچھ نہیں تھا۔ ٹیکسی نے اسے ایک عمارت کے سامنے اتارا۔ اس کئی منزلہ عمارت میں بینک تھے اور پرائیویٹ لاکرز تھے۔ وہ ایک لاکرز کے دفتر میں داخل ہوا اور کاؤنٹر پر ایک لفافہ پیش کیا۔ لفافے میں سلپ تھی۔ جواب میں کاؤنٹر گرل نے اسے ایک سیل لفافہ پیش کیا۔ وہ لفافہ لے کر لاکرز روم میں آیا۔ یہاں قطاروں میں الماری نما فولادی لاکرز بنے تھے۔ اس نے لفافے کی سیل کھول کر اس میں موجود کاغذ کو دیکھا اور لاکر نمبر بارہ بی ڈبلیو تک آیا۔ اس نے لاکر کے ڈیجیٹل کی پیڈ پر کاغذ پہ لکھا نمبر ملایا اور لاکر کھل گیا۔ اس کے اندر ایک بڑے سائز کا مگر مچھ کی کھال کا بنا ہوا چرمی بریف کیس تھا۔ ہنٹر نے بریف کیس باہر نکالا اور اپنا بیگ اندر رکھ دیا۔ اس میں اس کا پاسپورٹ اور تمام دوسری دستاویزات تھیں۔ وہ باہر آیا تو شام کے چار بج کر تیس منٹ ہو رہے تھے۔ اس نے ایک ٹیکسی روکی اور اس میں بیٹھ کر ڈرائیور سے کہا۔

”البرٹو لیب بلڈنگ۔“

ٹیکسی آگے بڑھی تو اس نے بریف کیس کھول کر دیکھا، اس میں سامنے کھانچے میں ایک عدد پستول، اس کا سائلنسر اور دو عدد اضافی میگزین تھے۔ اس کے علاوہ ایک البرٹو لیب ورکر کا کارڈ تھا جس پر کسی جوزف کا تیکر کی تصویر لگی تھی۔ وہ نسلاً فلپائنی تھا۔ ایک پلاسٹک کا بنا ہوا باکس تھا۔ اس نے باکس کھول کر دیکھا اور مطمئن ہو کر اسے بند کر دیا۔ آخری چیز پلاسٹک کا ایک سیل بند لفافہ تھا پھر بریف کیس بھی بند کر دیا۔ اس نے باہر گزرتی شاندار عمارتوں کو دیکھا۔ یہ پہلا موقع تھا کہ اس کا اصل مشن کسی فرد کو قتل کرنا نہیں تھا۔ مگر اسے امید تھی اس دوران میں اسے تفریح کا موقع ضرور ملے گا۔ پانچ بجنے میں دو منٹ پر ٹیکسی البرٹو لیب کی عمارت کے

سامنے رکی۔ جنٹر بریف کیس سنبھالتا ہوا نیچے اترا اور کرایہ دے کر تیز تیز قدموں سے بلڈنگ کی طرف بڑھا مگر وہ فوری اندر داخل نہیں ہوا بلکہ جب ملازمین کا ایک ہجوم نیچے پہنچا تو وہ اندر داخل ہوا۔

☆☆☆

حماد کے والد ناصر رحمان ایک ٹیکسٹائل مل میں ڈائنگ ماسٹر تھے۔ اچھی تنخواہ تھی اور حماد نے بچپن سے پُرآسائش زندگی دیکھی تھی۔ ان سب بہن بھائیوں نے اعلیٰ تعلیم حاصل کی تھی۔ ان میں سے کوئی ماسٹر لیول سے کم نہیں تھا۔ اس کے تینوں بڑے بھائی بھی اچھی کمپنیوں میں اچھے عہدوں پر کام کر رہے تھے۔ دو بہنوں کی شادی ہو چکی تھی اور انہوں نے بھی مختلف مضامین میں ماسٹرز کیا تھا۔ حماد سے بڑے دو بھائیوں کی بھی شادی ہو گئی تھی اور حماد کی والدہ کا ارادہ تھا کہ باقی دو بھائیوں کی شادی بھی ایک ساتھ کر دی جائے۔ ایک اچھے علاقے میں ان کا بڑا گھر تھا اور اوپری پورشن دو شادی شدہ بھائیوں کے پاس تھا جبکہ اس سے اوپر والے پورشن کی تعمیر کا کام وقفے وقفے سے جاری رہتا تھا۔ وہ مکمل ہو جاتا تو یہاں حماد اور دوسرا بھائی اپنی بیوی بچوں کے ساتھ رہتے۔ مگر حماد کا ارادہ ملک میں رہنے کا نہیں تھا اس نے پہلے ہی بتا دیا تھا کہ وہ باہر ہی رہے گا اگر اسے مڈل ایسٹ میں جاب نہ ملی تو وہ یورپ یا شمالی امریکا میں کوشش کرے گا۔

انتیس سالہ حماد دیکھنے میں اپنی عمر سے کم لگتا تھا۔ سرخ و سفید رنگت اور لڑکیوں جیسے نقوش کی وجہ سے دیکھنے والے اسے بائیس سے زیادہ کا نہیں سمجھتے تھے۔ قد پانچ فٹ سات انچ اور جسامت چھریری تھی مگر اس میں شبہ نہیں تھا کہ وہ اسمارٹ اور چست نظر آتا تھا۔ دفتر میں کام کرنے والی جینٹر لڑکیاں اور خواتین اسے پسند کرتی تھیں اور اس کی ایک وجہ یہ تھی کہ وہ بنا کسی فلرٹ کے ان کے ساتھ ہنسی مذاق کرتا تھا اور ساتھ ہی بہت شائستہ بھی تھا۔ صرف خواتین ہی نہیں دفتر میں جن سے اس کا تعلق تھا، ان سب سے حماد کے تعلقات بہت اچھے تھے شاید ہی کوئی ایسا فرد ہو جو اسے ناپسند کرتا ہو۔ ایاد سے مل کر واپس آیا تو اجیت اس کی صورت دیکھ کر سمجھ گیا۔ اس نے اٹھ کر حماد کو گلے لگایا۔ اس کی پشت تھپکی۔

"فکر مت کرو، مجھے یقین ہے تمہیں اس سے بہتر جاب ملے گی۔"

"مجھے بھی یقین ہے لیکن تم لوگ تو نہیں ہو گے۔ مجھے یہ جگہ پسند ہے۔" اس نے چاروں طرف دیکھا۔ "اچھی دے، آدمی کا مقدر اسے جہاں لے جائے..."

"تم پر چارج..."

"نہیں صرف فارغ کیا گیا ہے۔ مجھے دو مہینے تک نیا ویزا لینے کی مہلت بھی ملی ہے۔ دو دن میں واجبات، ڈاکومنٹس اور پاسپورٹ مل جائے گا۔"

"یہ تو اچھا ہوا۔" اجیت نے کہا۔ "اب تم آرام سے دوسری جاب تلاش کر سکتے ہو بلکہ تم آگے پی ایچ ڈی کے لیے کیوں اپلائی نہیں کرتے؟"

حماد کو اجیت کا خیال اچھا لگا۔ جب اس نے پی ایچ ڈی کے لیے اپلائی کیا تھا تو یونیورسٹی میں اس کے لیے مخصوص اسکالرشپس ختم ہو چکی تھیں۔ اگر وہ اپنی درخواست پھر دیتا تو اسے منتخب کیا جا سکتا تھا۔ اس نے ایم فل بہت اعزاز کے ساتھ کیا تھا مگر جاب پر آنے کے بعد اس نے اس طرف دھیان نہیں دیا۔ اجیت نے کہا تو اس نے سوچا کہ وہ پھر کوشش کر سکتا ہے۔ پی ایچ ڈی کرنے کے بعد اسے نہ صرف کہیں بہتر جاب مل سکتی تھی بلکہ وہ دنیا کے کسی بھی ملک میں بہ آسانی جا سکتا تھا۔ جب اس نے پی ایچ ڈی کے لیے درخواست دی تھی تب اس نے عنوان بھی سوچ لیا تھا اور اس پر بہت سارا کام بھی کیا تھا۔ اسے یقین تھا کہ اسے اسکالرشپ مل گئی تو وہ بہت جلد اپنا پی ایچ ڈی مکمل کر لے گا۔ مالی مسئلہ نہیں تھا اور یہ کام وہ شادی کے بعد بھی کر سکتا تھا۔

آفس کے دوسرے ساتھیوں نے بھی آ کر اس سے افسوس کیا پھر وہ سامان سمیٹنے میں لگ گیا۔ وہ اپنا ذاتی سامان سمیٹ کر اپنے بیگ میں ڈالنے لگا جو مختلف درازوں اور میز پر تھا۔ کچھ تصویریں بھی جو اس نے ماسٹر کے ساتھ کارڈ بورڈ کی دیوار پر لگا رکھی تھیں۔ ان میں ایک سارے گھر والوں کا گروپ فوٹو تھا۔ ایک تصویر ماما پاپا کی تھی اور ایک میں وہ اپنے یونیورسٹی کے دوستوں کے ساتھ تھا۔ سارہ کی کوئی تصویر اس نے نہیں لگائی تھی۔ وہ اس کے دل پر نقش تھی اور پھر اس کے آئی فون میں بھی تھی۔ اسے اپنی محبت کی تشہیر کرنا پسند نہیں تھا۔ سامان سمیٹنے اور الوداعی ملاقاتوں میں ہی پانچ بج گئے۔ پانچ بجتے ہی ملازمین نے اپنا کام ختم کیا اور رخصت ہونے لگے۔ حماد نے سب سے الوداعی مصافحے کیے اور پھر اجیت کے علاوہ باقی سب ملازمین باہر نکل گئے۔

لفٹس کے سامنے والی راہداری میں اس طور پر صفائی پر مامور سیاہ فام روبن بلڈنگ انچارج ربیعہ عزائی سے جھاڑ کھا رہا تھا کہ وہ آج کل صفائی ٹھیک سے نہیں کر رہا تھا۔ روبن کا تعلق ایتھوپیا سے تھا۔ اسے فارغ کرنے کی خبر خاص

خاص افراد کو ہو گئی تھی اس لیے ربیعہ اس کی طرف آئی۔ اس نے اس سے ہاتھ ملایا اور بولی۔ ”مجھے افسوس ہے۔“

”افسوس کی ضرورت نہیں ہے، میں نے یہاں آپ سب کے ساتھ بہت اچھا وقت گزارا ہے۔“

”وش یو گڈ لک۔“ ربیعہ نے خلوص سے کہا۔

”تھینک یو۔“ حماد نے کہا اور راشد کی طرف دیکھا۔

”میرا خیال ہے اب کارڈ ری نیو کی ضرورت نہیں ہے۔ میں اسے نشانی کے طور پر رکھ لیتا ہوں۔“

”مجھے بھی افسوس ہے۔“ راشد نے نرم لہجے میں کہا۔

”مجھے امید ہے تم جلد کسی بہتر جاب پر ہو گے۔“

”نیک تمناؤں کا شکریہ۔“ حماد نے کہا اور اپنا بیگ سنبھالتا ہوا لفٹ کی طرف آیا۔ اندر داخل ہو کر حماد نے اپنا کارڈ عادت کے مطابق مشین سے لگایا تو گرین کے بجائے ریڈ لائٹ آن ہوئی۔ لفٹ میں موجود ایک آدمی نے کہا۔

”میں کرتا ہوں۔“

اس نے اپنا کارڈ مشین سے لگا کر گراؤنڈ فلور کا بٹن دبایا۔ ہر فلور پر لفٹ بھرتی رہی اور پھر وہ نیچے پہنچے جہاں لابی میں نکلنے والوں کا ہجوم تھا۔ سیکیورٹی لائنوں پر بہت سے لوگ جمع تھے۔ حماد انتظار میں ایک طرف بنچ پر بیٹھ گیا۔ لفٹیں مسلسل آ رہی تھیں اور ملازمین ان سے نکل کر لابی میں جمع ہو رہے تھے۔ حماد کو صحیح تعداد کا علم نہیں تھا مگر اس کا اندازہ تھا کہ اس عمارت میں کوئی ایک ہزار افراد ضرور کام کرتے تھے۔ عام ورکرز صبح آٹھ سے شام پانچ بجے تک کام کرتے تھے مگر لیب میں چوبیس گھنٹے کام ہوتا تھا البتہ وہاں ایک وقت میں مشکل سے کوئی ایک درجن افراد ہوتے تھے کیونکہ ادویات کی تیاری سے لے کر ان کی پیکنگ تک کا سارا کام مشینوں سے کیا جاتا تھا۔ حد یہ کہ دواؤں کے بڑے کارٹن بھی مشینیں تیار کر کے انہیں ایک خودکار سسٹم کے تحت عمارت کے تہ خانے میں پہنچا دیا جاتا تھا جہاں ان کارٹنوں کو رکھا جاتا اور بہ وقت ضرورت روانہ کیا جاتا تھا اسی طرح لیب کے لیے جو خام مال آتا تھا، وہ اسی طرح خودکار نظام کے تحت اوپر جاتا تھا۔

حماد کے سامنے سب لابی کی طرف جا رہے تھے اور بیشتر ملازمین آ چکے تھے کیونکہ اب لفٹیں زیادہ مصروف نہیں تھیں۔ تب اس نے ایک ادھیڑ لیکن سرد آنکھوں والے سفید فام آدمی کو لفٹ میں جاتے دیکھا۔ حماد اس لیے بھی متوجہ ہوا کہ وہ واحد فرد تھا جو اوپر جا رہا تھا ورنہ باقی سب نیچے آنے والے تھے۔ اس نے مگرمچھ کی کھال کے جوتے پہن رکھے تھے اور اس سے میچ کرتی کھال کا بریف کیس اٹھا رکھا تھا۔ حماد کو یہ دیکھ کر تعجب ہوا کہ اس نے اپنے کوٹ سے ایک آفس کارڈ نکال کر لفٹ کی مشین سے لگایا اور فورلیتھ کی مخصوص فون کے بجنے اوپر جانے کے لیے کوئی بٹن دبایا کیونکہ اس وقت کوئی اوپر نہیں جا رہا تھا اس لیے وہ لفٹ میں اکیلا تھا۔

حماد یہاں کام کرنے والے تقریباً تمام سفید فام افراد سے واقف تھا اور اس نے اس شخص کو کبھی نہیں دیکھا تھا۔ جب دروازہ بند ہو رہا تھا تو اس نے حماد کو دیکھا اور خفیف سے انداز میں مسکرایا مگر اس کی آنکھوں کی سرد مہری برقرار رہی تھی۔ حماد سوچ رہا تھا کہ وہ اسے دیکھ کر کیوں مسکرایا تھا؟ اس کی نظریں لفٹ کے اوپری پینل پر تھیں جس پر ہندسے بدل رہے تھے۔ لفٹ دسویں فلور پر رکی تھی اور پینل بجھ گیا۔ وہ وہاں کیا کرنے گیا تھا؟ سیکیورٹی لائنوں پر رش کم ہوا تو وہ اٹھ کر اس طرف بڑھا۔ یہاں اس کا کارڈ کام نہیں کرتا تو اسے ضبط کر لیا جاتا۔ طریقہ کار یہی تھا پھر اسے کارڈ حاصل کرنے کے لیے خصوصی پروسیس سے گزرنا پڑتا مگر اب اسے اس کارڈ کی ضرورت نہیں تھی۔ اور پھر راشد نے کوئی اعتراض نہیں کیا تھا مگر یہاں لائن سیکیورٹی والے اعتراض کر سکتے تھے اور اس سے کارڈ واپس لے لیتے۔ اس نے عمر سے بات کرنے کا سوچا مگر پھر ارادہ ملتوی کر دیا۔

☆☆☆

ہنٹر نے اس نوجوان کو دیکھا۔ اس کا کارڈ اس کے کوٹ کے ساتھ پن نہیں تھا مگر وہ حلیے اور انداز سے یہاں کا ملازم لگ رہا تھا۔ کارڈ نہ ہونے کی ایک ہی وجہ ہو سکتی تھی کہ اسے فائر کر دیا گیا تھا۔ لفٹ کا دروازہ بند ہونے لگا تو ہنٹر کو خیال آیا کہ اگر اسے اس نوجوان کو قتل کرنا پڑے تو؟ وہ بے اختیار مسکرایا تھا اور اسی لمحے لفٹ کا دروازہ بند ہو گیا۔ اس کے ساتھ ہی ہنٹر حرکت میں آیا۔ اس نے نیچے رکھ کر بریف کیس کھولا اور اس میں سے پستول نکال کر اس پر سائلنسر فٹ کیا۔ یہ اس کا آزمودہ اور پرانا ہتھیار تھا جو اس نے ایک خاص ذریعے سے یہاں اسمگل کیا تھا۔ اسے کوٹ کی جیب میں رکھ کر اس نے بریف کیس بند کیا اور کھڑا ہو گیا۔ اسی لمحے لفٹ رکی اور اس کا دروازہ کھلا۔ وہ کھڑا ہوا باہر لابی میں آیا تو سامنے سیکیورٹی روم سے راشد نے اسے دیکھا اور کھڑا ہوا... ہنٹر اچانک نیچے گرا اور اس نے ہاتھ آگے کیا۔

”پلیز ہیلپ می۔“

راشد کھڑا رہا۔ ”کون ہو تم؟“

"میں مسٹرا…… سے ملنے آیا ہوں۔" بشیر نے نحیف لہجے میں کہا۔ "مجھے ہارٹ پرابلم ہے۔"

راشد نے گھوم کر فون کا ریسیور اٹھایا اور کال کرنے لگا۔ بشیر پھرتی سے اٹھا اور اس نے گلاس ڈور کے ساتھ لگی مشین سے کارڈ لگایا۔ راشد جو نمبر ملا کر بات کرنے جا رہا تھا مشینی آواز پر مڑا۔ بشیر اندر آ رہا تھا۔ "ارے باہر……"

راشد کو اس سے زیادہ کہنے کا موقع نہیں ملا اس نے بشیر کے ہاتھ میں دبا پسٹول دیکھ لیا اور بچنے کے لیے جھکا مگر پسٹول سے شعلہ نکل کر اس کی بائیں کنپٹی میں اتر گیا۔ وہ جھولا کر نیچے گرا۔

☆☆☆

حماد سیکیورٹی لائن کی طرف بڑھ رہا تھا کہ اچانک اسے خیال آیا اور اس نے جیب پر ہاتھ مارا۔ اس کا سیل فون جیب میں نہیں تھا وہ اس نے میز پر رکھا تھا اور اٹھتے ہوئے اٹھانا بھول گیا تھا۔ اب اسے واپس جانا تھا اور اس کے لیے لازمی تھا کہ اس کا کارڈ وری فائی ہو ورنہ لفٹ کام نہیں کرتی۔ یہاں نو بجے تھے مگر ان کے دروازے بھی اسی کارڈ کی مدد سے کھلتے تھے۔ اس نے سوچا اور عمر کی طرف بڑھا۔ وہ ایک مخصوص واٹر نما کاؤنٹر کے پیچھے تھا۔ اس کے سامنے کرسی نصف درجن مانیٹرز تھے جن سے وہ لابی اور اس کے آس پاس کی نگرانی کرتا تھا۔ "ہیلو کیا ہو رہا ہے؟"

عمر نے شانے اچکائے۔ "چھٹی کی تیاری۔"

جب تمام ملازمین چھٹی کر جاتے تھے تب عمر یہاں سے نکلتا تھا۔ اس کے بعد سیکیورٹی آفیسر بیسویں فلور سے اپنے سیکیورٹی روم میں بیٹھ کر پوری بلڈنگ کی نگرانی کرتا تھا۔ مین انٹرنس کا دروازہ، سیکیورٹی لائن اور لفٹس کھولنا اور بند کرنا اس کی ذمے داری ہوتی تھی۔ نو بجے تک لابی اور تمام دوسری جگہیں لاک کر دی جاتی تھیں۔ اس کے بعد سیکیورٹی آفیسر کی اجازت کے بغیر نہ کوئی اندر آ سکتا تھا اور نہ باہر جا سکتا تھا۔ جب ایجنٹ اپنا کام نمٹا لیتا تو وہ بھی نائٹ شفٹ کے سیکیورٹی آفیسر سے کہتا اور وہ اس کے لیے راستے کھولتا۔

حماد نے کہا۔ "شکر ہے مجھے یاد آ گیا میں اپنا سیل فون اوپر بھول آیا ہوں۔ میرا کارڈ انجیکٹ ہو گیا ہے، کیا تم میرے لیے لفٹ مینول کر سکتے ہو؟"

یہ کہتے ہوئے حماد کا دل دھڑک رہا تھا۔ اگر مرکزی سسٹم میں اس کے فائر ہونے کی اطلاع آ جاتی تو عمر بھی اسے اوپر جانے کی اجازت نہ دیتا۔ لیکن اسے امید تھی کہ ایسا نہیں ہوگا دوسری صورت میں عمر کے سامنے اس کی بے عزتی ہو جاتی۔ جب عمر نے سر ہلایا تو حماد نے سکون کا سانس لیا۔ عمر نے کہا۔ "میں لفٹ نمبر چار کو مینول کر رہا ہوں۔ اپنا سیل جلدی لے آؤ ورنہ پھر سیکیورٹی آفیسر سے مدد لینا پڑے گی۔"

"ٹھیک ہے۔" حماد نے جلدی سے کہا۔ "میں بس دس منٹ میں آیا۔"

"ارے گڈ بائے، میں تو جا رہا ہوں۔" عمر نے اپنا کمپیوٹر آف کر دیا۔ "تم راشد سے کہنا وہ تمہارے جانے کے بعد لفٹ لاک کر دے۔"

"تمہارا شکریہ۔" حماد نے اپنا بیگ اس کے کاؤنٹر کے پیچھے رکھ دیا اور خود لفٹ نمبر چار کی طرف بڑھا۔ لابی اتنی دیر میں تقریباً سنسان ہو گئی تھی اور اب صرف سیکیورٹی والے تھے جو لائنیں بند کر رہے تھے۔ رات کے وقت صرف ایک لائن کھلی چھوڑی جاتی تھی باقی سب بند کر دی جاتی تھیں مگر یہاں کوئی فرد موجود نہیں ہوتا تھا۔ اس کی ضرورت بھی نہیں تھی مین انٹرنس بند ہوتی تھی اور کوئی اندر نہیں آ سکتا تھا۔ حماد عجلت میں لفٹ کی طرف بڑھا۔ اگر سب چلے جاتے تو اسے سیکیورٹی آفیسر کی مدد لینا پڑتی پھر ہی مین انٹرنس بھی کھلتا۔ اس نے چار نمبر لفٹ میں داخل ہو کر دسویں فلور کا بٹن دبا دیا۔ اب یہ مینول ہو گئی تھی۔ عام لفٹس صرف دسویں فلورز تک جا سکتی تھیں۔ باقی پانچ فلورز کے لیے الگ سے مین لفٹس تھیں اور ان کی لابی بھی الگ تھی۔ ان کے کارڈز بھی منفرد تھے اور عام کارڈ ان لفٹس کو حرکت میں نہیں لا سکتا تھا۔ ظاہر ہے یہ سب سیکیورٹی کے لیے تھا۔ آخر کے پانچ فلورز تک کمپنی کا مخصوص عملہ اور چند ایک اعلیٰ افسران ہی رسائی رکھتے تھے ان کے سوا وہاں کسی کو جانے کی اجازت نہیں تھی۔

لفٹ دسویں فلور پر رکی تو وہاں کی بیشتر روشنیاں بند کر دی گئی تھیں اور راہداریوں میں چند ایک لائٹس آن تھیں۔ اس وقت وہاں سناٹا تھا۔ حماد اس سے پہلے بھی اس وقت یہاں نہیں آیا تھا اس لیے اسے نہیں معلوم تھا کہ چھٹی کے بعد یہاں روشنی اتنی کم کر دی جاتی تھی۔ اس نے سیکیورٹی روم کی طرف دیکھا مگر راشد اسے نظر نہیں آیا۔ شاید وہ واش روم گیا تھا۔ حماد تیز قدموں سے اپنے سیکشن کی طرف بڑھا۔ راہداری میں بعض جگہوں پر روشنی اتنی کم تھی کہ اسے اپنی آنکھوں پر زور دینا پڑ رہا تھا۔ وہ آفس تک پہنچا اور اس نے اندر دیکھا تو ایجنٹ اسے اپنے کیبن میں کمپیوٹر کے سامنے نظر آیا تھا۔ وہ وہاں کیا کر رہا تھا؟ اس نے گلاس ڈور کر

انگلی کی پشت سے بجایا تو اجیت چونکا۔ اس نے مڑ کر حماد کو دیکھا اور حیران ہوا۔ حماد نے اشارے سے کہا کہ وہ دروازہ کھولے۔ اجیت دروازے تک آیا اور کارڈ لگا کر دروازہ کھولا۔ اس نے کسی قدر تعجب سے کہا۔ ”تم گئے نہیں؟“

”جا رہا تھا کہ ایک چیز کا خیال آیا اور مجھے واپس آنا پڑا۔“ حماد نے اندر آ کر کہا اور اپنے کیبن کی طرف بڑھا۔

”کس چیز کا خیال؟“ اجیت اس کے پیچھے لپکا۔

”میں یہ بھول گیا تھا۔“ حماد نے اپنی میز سے آئی فون اٹھا کر دکھایا۔

”اچھا ہوا تمہیں یاد آ گیا ورنہ کل یہ یہاں نہیں ملتا۔ صفائی کرنے والے اسے بھی صاف کر جاتے۔“

”تم میرے کمپیوٹر پر کیا کر رہے ہو؟“ حماد نے کہا۔ اس نے دیکھا کہ کی بورڈ اور مانیٹر کے ساتھ میز پر چند فولڈرز پڑے تھے اور یہ اوپر سے آئے ہوئے فولڈرز تھے جن میں کمپنی کی خفیہ معلومات ہوتی ہیں۔ حماد ان کے مخصوص نمبر اچھی طرح پہچانتا تھا۔ اجیت کے پاس ان فولڈرز کا کوئی کام نہیں تھا کیونکہ وہ صرف کمپیوٹر اینالسٹ تھا۔ حماد کو احساس ہونے لگا کہ کوئی گڑبڑ ہو رہی تھی۔ اسے اچانک فائر کر دیا گیا اور اب اجیت حساس معلومات پر مشتمل فولڈرز سامنے رکھے ہوئے تھا۔ اجیت نے اس کی نظروں کو محسوس کر لیا اور اس نے غیر محسوس انداز میں ان فولڈرز کو ایک نام فائل سے چھپا دیا۔ جب حماد نے اسے دروازہ کھولنے کو کہا تو میز سے اٹھنے سے پہلے اس نے اسکرین پر اسکرین سیور لگا دیا تھا اس لیے حماد نہیں دیکھ سکا کہ وہ اس وقت کیا کام کر رہا تھا۔ البتہ اس کے سوال پر اجیت کا رنگ بدلا تھا۔ اس نے جلدی سے کہا۔

”میرا کمپیوٹر ذرا مسئلہ کر رہا تھا اس لیے میں تمہارے کمپیوٹر پر آ گیا ویسے اب یہ تمہارا نہیں رہا ہے۔“

حماد نے گہری سانس لی۔ ”تم ٹھیک کہہ رہے ہو اب یہ میرا نہیں رہا ہے۔“ اس نے کہتے ہوئے اپنے آئی فون کا کیمرا ویڈیو پر کر کے اسے غیر محسوس انداز میں ایک طرف رکھے پین مگ میں یوں ڈال دیا کہ اس کے کیمرے کا رخ کمپیوٹر کی طرف تھا۔ اجیت کرسی پر بیٹھا ہوا تھا اور اس کی توجہ فولڈرز کی طرف تھی اس نے حماد کی کارروائی نہیں دیکھی۔ وہ کچھ بے چین لگ رہا تھا اس نے حماد سے کہا۔

”تم نے سیل فون لے لیا ہے؟“

”او ہاں۔“ حماد نے یوں جیب پر ہاتھ مارا جیسے اس کا آئی فون جیب میں ہو اور کھڑا ہو گیا۔ ”تمہیں زحمت

ہوئی۔''

''کوئی بات نہیں۔'' اجیت بھی کھڑا ہوگیا۔ وہ واضح طور پر اسے رخصت کرنے کے لیے بے تاب تھا۔ وہ دونوں دروازے تک آئے اور اجیت نے کارڈ سے دروازہ کھولا۔ حماد جاتے جاتے رکا اور اس نے پوچھا۔

''کیا تم نے یہاں کسی سفید فام کو دیکھا ہے؟''

اجیت نے تعجب سے دہرایا۔ ''سفید فام؟''

''وہ میرے سامنے اوپر دسویں فلور پر آیا تھا لیکن یہاں مجھے کہیں نظر نہیں آیا۔''

اجیت نے نفی میں سر ہلایا۔ ''یہاں کوئی اور نہیں ہے۔''

حماد باہر نکل آیا۔ ''شاید وہ واپس چلا گیا۔''

''اپنا خیال رکھنا دوست۔'' اجیت نے ہچکچا کر کہا اور دروازہ بند کر دیا۔ حماد باہر آیا تو اس کا ذہن سن سا ہو رہا تھا۔ اسے لگ رہا تھا کہ اسے قربانی کا بکرا بنایا جا رہا ہے۔ مگر اسے کوئی راستہ سجھائی نہیں دے رہا تھا۔ اب اسے خیال آیا کہ اس نے اپنا آئی فون وہاں رکھ دیا تھا مگر اب وہ اسے وہاں سے اٹھاتا کیسے؟ اس نے سوچا کہ وہ کل صبح آئے گا۔ اسے امید تھی کہ اس کا موبائل اسے واپس مل جائے گا۔ اس کا امکان کم تھا کہ کوئی اور اسے وہاں سے اٹھا لیتا۔ ہاں اگر اجیت دیکھ لیتا تو اس کا بھانڈا پھوٹ جاتا۔ وہ لفٹ کی طرف بڑھا تھا کہ اچانک اسے ایک خیال آیا اور وہ کچھ دیر سوچنے کے بعد ایاز کے کمرے کی طرف بڑھ گیا۔

☆☆☆

ہنٹر نے سیکورٹی روم میں لگے کچھ سوئچ آف کر دیے۔ اب تمام لفٹس بند ہوگئی تھیں اور مین انٹرنس بھی لاک ہوگئی تھی۔ پھر اس نے فلور کے عقبی حصے کا رخ کیا جہاں ایگزیکٹوز کے دفاتر تھے۔ مگر وہ کسی دفتر میں جانے کے بجائے ان کے عقبی حصے میں ایک راہداری میں آیا۔ ہنٹر کے نقوش تیکھے اور ان میں ایک قسم کی سختی اور سفاکی تھی۔ مگر وہ بلاشبہ ہینڈسم مرد تھا اور خواتین میں مقبول تھا تب ہی لفٹ بنا کی ائیر ہوسٹس اتنی آسانی سے اس سے ملاقات کے لیے تیار ہوگئی تھی۔ اس کا سوٹ بیش قیمت اور کلائی میں رولیکس ڈائمنڈ واچ تھی۔ ٹائی پن پر بھی درمیانے سائز کا ہیرا جڑا تھا۔ اس کے بائیں ہاتھ کی درمیانی انگلی میں سرخ یاقوت کی انگوٹھی تھی مجموعی طور پر وہ دولت مند اور آسودہ حال لگ رہا تھا۔ وہ جس طرح یہاں راہداریوں سے گزر رہا تھا اس سے صاف ظاہر تھا کہ اسے یہاں کے نقشے کا اچھی طرح علم تھا۔

دفاتر کی عقبی راہداری میں آ کر اس نے اپنے کوٹ سے ایک چمڑے کا پتلا سا فولڈ بکس نکالا۔ یہ راہداری عام گزرگاہ نہیں تھی بلکہ یہاں دیواروں کے ساتھ جنکشن باکس لگے تھے جن میں مختلف طرح کے وائر گزر رہے تھے۔ اس نے دیوار کے ساتھ لگا ایک جنکشن بکس کا معائنہ کیا۔ وہ لاک تھا۔ ہنٹر نے ایک چھوٹا سا آلہ اس کے لاک کے سوراخ میں داخل کیا اور اسے ذرا سا گھمایا تو لاک کھل گیا۔ اس نے دروازہ کھولا۔ اندر بے شمار وائرز تھے جس سے نازک تار منسلک تھے۔ وہ اس کا ڈایاگرام دیکھ چکا تھا اور اب غور کر رہا تھا۔ وہ ان کا جائزہ لے رہا تھا کہ اچانک عقب سے آواز آئی۔ ''تم کون ہو اور یہاں کیا کر رہے ہو؟''

وہ ذرا بھی نہیں چونکا اور بہت آرام سے مڑ کر دیکھا۔ سامنے ربیعہ عزائی کھڑی تھی۔ ربیعہ کا تعلق لبنان سے تھا۔ کیونکہ وہ انفرریولیب میں بلڈنگ انچارج تھی اس لیے یہاں کوئی کام اور تبدیلی اس کی مرضی کے بغیر ممکن نہیں تھی۔ ربیعہ تقریباً پچاس برس کی لیکن خوب صورت نقوش والی اسمارٹ عورت تھی۔ اسکرٹ کوٹ میں اس کی جسمانی دلکشی نمایاں تھی۔ عمر سے قطع نظر اس نے خود کو بہت سنبھال کر رکھا تھا۔ ربیعہ اسے اس کی صلاحیتوں کی وجہ سے ملا تھا۔ وہ نہ صرف اعلیٰ تعلیم یافتہ بلکہ اپنے شعبے پر مکمل حاوی تھی۔ ہنٹر کے لیے اس کی آمد غیر متوقع تھی مگر اس نے سکون سے کہا۔ ''میں ٹیکنیشین ہوں، یہاں مرمت کا کام کرنے آیا ہوں۔''

''کس نے بلایا ہے؟'' ربیعہ کا لہجہ سخت ہوگیا۔ ''یہاں صرف میں کسی کو بلانے اور اجازت دینے کی مجاز ہوں۔ بائی دی وے تم اوپر کیسے آئے؟''

''میں نہیں جانتا میڈم، میں کوئیک رپیئر کمپنی سے آیا ہوں۔ ہم یہاں مرمت کرتے ہیں۔ مجھے میرے باس نے حکم دیا اور نیچے کاؤنٹر سے مجھے کارڈ ملا ہے۔''

ربیعہ کچھ دیر اسے گھورتی رہی پھر وہ ایک طرف دیوار پر لگے انٹرکام کی طرف بڑھی۔ وہ سیکیورٹی آفیسر سے رابطہ کرنے جا رہی تھی۔ اس کے مڑتے ہی ہنٹر نے کوٹ کی جیب میں ہاتھ ڈالا اور جب وہ باہر آیا تو اس میں ایک لمبی سی نالی والا پستول تھا۔ پستول چھوٹا تھا مگر اس پر لگے سائیلنسر کی وجہ سے اس کی لمبائی بڑھ گئی تھی۔ جیسے ہی ربیعہ نے انٹرکام کا ریسیور اٹھایا عقب سے اس نے اس کے دل میں گولی اتار دی۔ ربیعہ کو بس ایک جھٹکا لگا اور وہ نیچے گرنے سے پہلے مر چکی تھی۔ ہنٹر کو اپنے نشانے پر اتنا اعتماد تھا کہ اس نے ربیعہ کو چیک کرنے کی زحمت بھی نہیں کی اور پستول واپس

رکھ کر اپنے کام میں لگ گیا۔ اس کے سکون سے بالکل نہیں لگ رہا تھا کہ اس نے چند منٹ میں ہی دوسرے انسان کی جان لی تھی۔ وہ اوزاروں کے ساتھ اپنے کام میں مگن تھا اور اس کا نشانہ جنکشن باکس میں لگے سوئچ اور تار تھے۔

☆☆☆

حماد ایگزیکٹو ایریا میں آیا۔ یہاں فرنیچر زیادہ اعلیٰ درجے کا تھا اور آرائش کے ساتھ ساتھ چیزوں کے اعلیٰ درجے کے ہونے کا خاص خیال رکھا گیا تھا۔ فرش پر بچھا قالین شاہانہ قسم کا تھا۔ وہ اباد کے کمرے کی طرف جا رہا تھا کہ اچانک اس کے سامنے ایک راہداری سے ایک شخص نمودار ہوا۔ حماد پھرتی سے ایک ستون کی آڑ میں ہو گیا مگر وہ شخص اس کی طرف دیکھے بغیر آگے بڑھ گیا اگر اس کا رخ اس طرف ہوتا تو وہ لازمی حماد کو دیکھ لیتا اور حماد نے اسے پہچان لیا، یہ وہی سفید فام تھا جو لفٹ سے اوپر آیا۔ اس کے پاس مگر مچھ کی کھال کا بنا ہوا بریف کیس تھا جو اس وقت بھی اس کے ہاتھ میں تھا۔ وہ ننگے قدموں سے ایگزیکٹو ایریا کے عقبی حصے میں جا رہا تھا۔ حماد غیر ارادی طور پر اس کے پیچھے گیا۔ اس تعاقب میں اس کے ارادے کو دخل نہیں تھا۔ پھر وہ عقبی راہداری میں ایک بورڈ کے سامنے رکا۔ اس نے پہلے ٹول بکس نکالا اور پھر بورڈ کا لاک کھولا۔ حماد نے گہری سانس لی۔

"تو یہ ٹیکنیشن ہے کسی کام سے آیا ہے۔" اس نے خود سے کہا اور پلٹ رہا تھا کہ اس نے مخالف سمت سے بلڈنگ انچارج ربیعہ عزائی کو نمودار ہوتے دیکھا۔ وہ سفید فام سے بات کرنے لگی اور پھر وہ انٹرکام کی طرف بڑھی اور اس نے انٹرکام کا ریسیور اٹھایا تھا کہ سفید فام نے اسے عقب سے شوٹ کر دیا۔ حماد نے ذرا تاخیر سے دیکھا۔ ٹھس کی ہلکی سی آواز آئی اور ربیعہ نیچے گر کر ساکت ہو گئی۔ حماد نے اپنے منہ پر ہاتھ رکھ لیا اور تیزی سے دیوار کی آڑ میں ہو گیا۔ اس کے ہاتھ پاؤں کانپ رہے تھے اور اعصاب منتشر تھے۔ اس نے آج تک کسی کو یوں قتل کرتے اور ہوتے نہیں دیکھا تھا۔ سفید فام کا پستول خاموش تھا اور گولی چلنے کی بہت معمولی سی آواز آئی تھی۔ سفید فام ورکر نہیں بلکہ قاتل تھا اور وہ یقیناً کسی اور چکر میں یہاں آیا تھا ورنہ وہ ربیعہ کو کیوں قتل کرتا۔ حماد نے کچھ دیر بعد جھانک کر دیکھا تو سفید فام بورڈ میں کچھ کام کر کے اسے بند کر رہا تھا۔ اس نے اپنے اوزار ٹول بکس میں رکھ کر اسے بریف کیس میں رکھا اور حماد کی طرف آنے لگا۔

"میرے خدا!" حماد نے کہا اور تیزی سے اس طرف لپکا جہاں سے وہ آیا تھا۔ ایگزیکٹو ایریا میں آ کر اس نے مختلف دروازے کھولنے کی کوشش کی مگر وہ سب لاک تھے۔ ان کے لاک مینول تھے یعنی کارڈ سے نہیں کھولے جا سکتے تھے۔ وہ واپس لفٹ والی لابی کی طرف آیا جہاں سیکیورٹی روم تھا۔ وہ راشد سے مدد طلب کر سکتا تھا اور اسے بتا سکتا تھا کہ یہاں ایک قاتل آ گیا ہے جس نے ربیعہ کو قتل کر دیا ہے مگر سیکیورٹی روم خالی تھا اور اس کا دروازہ بھی لاک تھا۔ جنرل ورکر ہال کھلا تھا اور وہ وہاں محفوظ نہیں تھا۔ اسے اپنے کیبن کا خیال آیا۔ مگر اسے واپس جانا پڑتا اور اگر قاتل راہداری سے آ رہا تھا تو اس سے سامنے کا امکان تھا اور اس سے سامنا ہونے کا مطلب موت سے سامنا بھی ہو سکتا تھا۔ وہ کیبن کی دیوار کے ساتھ دبک گیا۔ چند لمحے بعد قاتل نمودار ہوا اور اس نے کارڈ لگا کر سیکیورٹی روم کا دروازہ کھولا اور اندر گیا۔

چند لمحے بعد وہ کرسی کھینچتا ہوا نمودار ہوا۔ وہ واپس جا رہا تھا۔ حماد نے جھانک کر دیکھا تو اسے کرسی پر خون کے داغ دکھائی دیے۔ حماد کی فکر بڑھ گئی۔ راشد کی کرسی پر خون لگا ہوا تھا اور وہ خود غائب تھا۔ شاید یہاں بھی قاتل کوئی کارروائی کر چکا تھا۔ اس کے جاتے ہی حماد باہر نکلا اور اپنے کیبن کی طرف لپکا۔ اس پورے فلور پر شیشے کا استعمال بہت زیادہ تھا اور اکثر کمروں کی دیوار بھی شیشے کی تھیں یا ان میں بہت بڑی شیشے والی کھڑکیاں لگی ہوئی تھیں۔ یہاں چھپنے کی جگہیں بہت کم تھیں۔ وہ سوچ رہا تھا کہ اجیت کو خبردار کرے گا اور پھر مینول لفٹ سے نیچے جائے گا۔ نہ جانے یہ شخص کون ہے اور اس نے ربیعہ کو کیوں قتل کیا؟ وہ بھاگتا ہوا کیبن کے دروازے تک آیا تھا۔ اس نے شیشہ بجایا تو مانیٹر پر جھکا ہوا اجیت اچھل پڑا۔ حماد کو دیکھ کر وہ اس طرف آیا۔ اس نے دروازہ کھولا اور کسی قدر تیز لہجے میں بولا۔ "تم اب تک یہیں ہو؟"

"شش۔" حماد نے اس کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا اور اسے دھکیل کر اندر لے آیا۔ "یہاں ایک قاتل ہے اس نے ربیعہ کو میرے سامنے شوٹ کیا ہے اور اب وہ اس طرف آ رہا ہے۔"

اجیت کی آنکھیں پھیل گئیں۔ "قاتل ہے؟"

"ہاں ہمیں یہاں سے نکلنا ہوگا۔" حماد نے کہا اور اس کا ہاتھ پکڑ کر کھینچا۔ "میرے ساتھ آؤ۔"

دونوں دوڑتے ہوئے لفٹ تک پہنچے مگر جب انہوں

نے بٹن دبا کر لفٹس بلانے کی کوشش کی تو انکشاف ہوا کہ کوئی لفٹ کام نہیں کر رہی ہے۔ تمام لفٹس بند ہو گئی تھیں۔ اچانک حماد کو خیال آیا۔ ''وہ ایک جنکشن باکس کھول کر کچھ کر رہا تھا شاید اس نے تمام لفٹس آف کر دی ہیں۔''

اجیت کے چہرے پر پسینا آ رہا تھا۔ ''پھر ہم کیسے یہاں سے باہر جا سکتے ہیں؟''

حماد تیزی سے سوچ رہا تھا، اس نے اجیت سے کہا۔ ''تم جا کر پولیس کو کال کرنے کی کوشش کرو اور میں سیڑھیوں والا راستہ دیکھتا ہوں۔ اپنا کارڈ مجھے دو۔''

''پھر میں سیکشن میں کیسے جاؤں گا۔'' اجیت نے کہا۔

''میرا موبائل وہیں ہے تمہارا کہاں ہے؟''

''وہ بیٹری لو ہونے سے بند ہو گیا ہے۔'' حماد نے بہانہ کیا۔ وہ اسے کیسے بتاتا کہ اپنا آئی فون اس نے اس کی جاسوسی کے لیے لگایا ہوا تھا۔ ''اور کے تم جاؤ میں دیکھتا ہوں کہ کیا کر سکتا ہوں۔''

''سنو یہاں سیڑھیوں والا راستہ کارڈ سے نہیں کھلتا ہے' اس کی چابیاں سیکیورٹی آفیسر کے پاس ہوتی ہیں۔'' اجیت نے اسے بتایا۔ ''تم سیڑھیوں کی طرف جانے کے بجائے سیکیورٹی آفیسر کو تلاش کرو۔ اس کے پاس چابیاں ہیں اور وہ قاتل سے بھی نمٹ سکتا ہے۔''

سیکیورٹی آفیسر کو سیکیورٹی روم میں ہونا چاہیے تھا مگر وہ وہاں نہیں تھا۔ حماد نے سر ہلایا۔ ''ٹھیک ہے میں اسے دیکھتا ہوں تم جا کر پولیس کو کال کرنے کی کوشش کرو۔''

اجیت پلٹ کر سیکشن کی طرف بڑھ گیا اور حماد پھر سیکیورٹی روم کی طرف روانہ ہوا۔ وہ خوفزدہ تھا مگر جانتا تھا کہ صرف ڈرنے سے کام نہیں بنے گا اگر انہیں اس قاتل سے بچنا اور یہاں سے نکلنا تھا تو ہمت کرنی تھی۔ اس بار بھی سیکیورٹی آفیسر اپنے کیبن میں نظر نہیں آیا۔ جبکہ اسے لازمی یہاں ہونا چاہیے تھا۔ حماد کا احساس شدید ہو رہا تھا کہ اس کی گمشدگی بے معنی نہیں تھی۔ اچانک اسے خیال آیا کہ وہ واش روم میں دیکھے۔ واش روم انگیز بجنڈا ایریا کے پاس ہی تھے۔ وہ واش روم تک آیا۔ اس نے پہلے اندر کی سن گن لی مگر وہاں سناٹا تھا۔ پھر وہ دروازہ کھول کر اندر آیا۔ ایک طرف لائن سے آمنے سامنے تین تین ٹائلٹس تھے اور ایک طرف بڑا سا واش بیسن اور دیوار میں آئینہ لگا ہوا تھا۔ حماد نے جھک کر دیکھا تو ایک ٹائلٹ میں اسے سیکیورٹی آفیسر راشد کی پتلون اور جوتے دکھائی دیے۔ وہ کموڈ پر بیٹھا ہوا تھا۔ حماد نے آہستہ سے دروازہ بجایا اور بولا۔ ''پلیز جلدی باہر آؤ یہاں ایک قاتل ہے۔''

حماد کی آواز دھیمی تھی لیکن اتنی دھیمی بھی نہیں تھی کہ راشد سن نہیں سکتا اس کی طرف سے کوئی ردعمل نہیں ہوا تو حماد نے دھڑکتے دل کے ساتھ دروازہ دھکیلا۔ سامنے انچارج کموڈ پر ساکت بیٹھا تھا اور اس کی کھلی آنکھیں خلا میں گھور رہی تھیں۔

☆ ☆ ☆

اجیت کی حالت بری تھی۔ وہ بیوی بچوں والا آدمی تھا اور اس نے غالباً سوچا بھی نہیں تھا کہ اسے کسی قاتل سے بچنا پڑے گا۔ حماد بھی مذاق کرنے والا آدمی تھا مگر اس نے کبھی اس قسم کے مذاق نہیں کیے تھے اس لیے اجیت کو اس کی بات پر فوراً یقین آ گیا تھا۔ وہ دبے قدموں چھپتا چھپاتا ہوا سیکشن تک آیا اور پہلے سن گن لی کہ وہاں کوئی ہے تو نہیں اور جب اندر جانے کے لیے کارڈ مشین میں لگا رہا تھا' اسی لمحے اندر سے اس کے سیل فون کی بیل سنائی دی۔ اس نے عجلت میں دروازہ کھولا اور سیل فون کی طرف لپکا تھا، اس نے اٹھا کر دیکھا اس کی بیوی کی کال آ رہی تھی۔ اس نے کال ریسیو کی اور بولنے لگا۔ ''میری بات غور سے سنو میں...''

اسی لمحے اس کے شانے پر ایک ہاتھ آیا اور کسی نے سرد لہجے میں کہا۔ ''کوئی غیر ضروری لفظ مت کہنا۔''

اجیت بولتے بولتے رک گیا۔ بولنے والے کا لہجہ اتنا سرد تھا کہ اس کا فون والا ہاتھ کانپنے لگا۔ دوسری طرف سے اس کی بیوی ''ہیلو ہیلو'' کہہ رہی تھی۔ وہ چونکا اور اس نے کہا۔ ''سب ٹھیک ہے ڈیئر۔''

''تم چپ کیوں ہو گئے تھے اور دوسرا کون بولا ہے؟''

''وہ میں آفس میں کسی کے ساتھ ہوں۔'' اجیت نے کہا اور جرأت کر کے پیچھے دیکھا۔ ایک سفید فام سوٹ پوش شخص کھڑا تھا۔ اس نے آہستہ سے اردو میں کہا۔

''اسے کہو کہ وہ پریشان نہ ہو۔''

اجیت کی رہی سہی امید بھی دم توڑ گئی اب وہ اسے دھوکا بھی نہیں دے سکتا تھا۔ مجبوراً اس نے کہا۔ ''ڈیئر تم فکر مت کرو۔''

''یہاں کوئی مسئلہ نہیں ہے۔'' اجنبی نے پیچھے سے ہدایت کاری جاری رکھی اور اجیت میں ذرا بھی مزاحمت باقی نہیں رہی۔ اس نے بلاچون وچرا اس کی بات دہرا دی۔

''یہاں کوئی مسئلہ نہیں ہے۔''

''تم ٹھیک کہہ رہے ہو نا؟'' سریتا نے تصدیق

جاتی۔

"ہاں ڈیئر میں ٹھیک کہہ رہا ہوں، بچے کیسے ہیں؟"

"وہ ٹھیک ہیں، تمہیں یاد کر رہے تھے۔"

"اب اسے کہو کہ تم اس سے محبت کرتے ہو۔" ہنٹر نے پھر کہا۔

"سرجا میں تم سے محبت کرتا ہوں۔" اجیت کی آواز بھرانے لگی۔

"اب اسے گڈبائے کہہ کر کال بند کر دو۔"

"بائے ہنی۔" اجیت نے کہا اور کال کاٹ دی۔

ہنٹر نے پستول نکال کر اس کے سر پر رکھا۔ وہ اجیت کی کیفیت سے لطف اندوز ہو رہا تھا۔ نال سر سے لگی تو اجیت کا جسم لرز اٹھا۔ اسے لگا کہ وہ ابھی گولی چلا دے گا مگر ہنٹر نے گولی چلانے کے بجائے سوال کیا۔ "کیا یہاں تمہارے سوا اور کوئی بھی ہے؟"

اجیت کو حماد کا خیال آیا مگر اس نے انکار کیا۔ "نہیں یہاں رات کو کوئی نہیں ہوتا ہے۔ صرف سیکیورٹی آفیسر اور صفائی کرنے والا ہوتا ہے۔"

ہنٹر چونکا۔ "صفائی کرنے والا؟"

"ہاں وہ ملازمین کے جانے کے بعد یہاں کی صفائی کرتا ہے اور پھر چھٹی کر کے جاتا ہے۔"

"وہ کب تک چھٹی کرتا ہے؟"

"عام طور سے آٹھ بجے تک۔"

"تم یہاں کیا کر رہے ہو؟"

"مجھے اضافی کام دیا گیا تھا، میں وہ کر رہا ہوں۔"

ہنٹر نے پستول اس کے سر سے ہٹا کر اس کی کنپٹی پر رکھا تو وہ رونے لگا۔ "خدا کے لیے مجھے مت مارو، میری بیوی ماں بننے والی ہے میرے دو چھوٹے بچے ہیں۔"

"اوہ!" ہنٹر نے پستول اس کی کنپٹی سے ہٹا لیا اور اسے کوٹ میں رکھتے ہوئے وہ دوسری میز تک گیا وہاں سے اس نے فولڈرز باندھنے والی ڈوری اٹھائی اور عقب سے اچانک اجیت کی گردن میں ڈال کر کسنے لگا۔ سانس رکی تو وہ تڑپا اور ہاتھ پاؤں چلانے لگا، اس کے ہاتھ ڈوری کو کسنے سے روکنے کی کوشش کر رہے تھے مگر وہ ناکام رہا۔ اس کی ٹھوکروں سے میز کا سامان گر گیا تھا۔ مانیٹر گھوم گیا اور آف ہو گیا۔ اس کی پاور کورڈ نکل گئی تھی۔ دو منٹ بعد اس کی مزاحمت دم توڑ گئی اور پھر اس نے بھی دم توڑ دیا۔ ہنٹر نے ڈوری چھوڑی تو اسے اپنے چہرے پر نمی کا احساس ہوا۔ اجیت نے سانس لینے کی کوشش میں منہ سے تھوک اچھالا تھا جو اس کے چہرے اور کوٹ پر آیا تھا۔

اس نے جیب سے رومال نکالا اور منہ صاف کرتا ہوا واش روم کی طرف بڑھا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ اس کا کام بڑھ رہا ہے اب اسے صفائی کرنے والے کا بھی صفایا کرنا تھا۔ بہرحال اسے فکر نہیں تھی کیونکہ وہ اپنے کام سے لطف اندوز ہونے والوں میں سے تھا۔ وہ سیکیورٹی آفیسر کی کرسی لے کر اس جگہ پہنچا جہاں ربیعہ کی لاش پڑی تھی، اس نے لاش اٹھا کر کرسی پر ڈالی اس ریوالونگ چیئرز کے نیچے پہیے تھے اس لیے وہ آسانی سے موو کر سکتی تھی۔ اس نے سوچ لیا تھا کہ لاش کہاں ڈالنی ہے۔ اگرچہ یہاں دیکھنے والا کوئی نہیں تھا مگر وہ لاشیں چھپا رہا تھا۔ اسے اتفاقات سے نفرت تھی اور اتفاق سے کوئی یہاں آسکتا تھا۔ ربیعہ کی لاش ایک جگہ چھوڑ کر وہ وہاں سے نکلنے والا تھا کہ اسے موبائل بیل کی آواز آئی اور وہ تیزی سے حرکت میں آیا۔

☆☆☆

حماد ساکت میں رہ گیا۔ سیکیورٹی آفیسر راشد مقامی شخص تھا۔ وہ بھی کمپنی کے پرانے ملازمین میں سے تھا، کسی قدر خشک مزاج تھا۔ البتہ حماد سے اس کی اچھی سلام دعا تھی۔ اپنا کام ٹھیک سے کرتا تھا۔ اس کی عام طور سے نائٹ ڈیوٹی ہوتی تھی۔ مگر ان دنوں ڈے کر رہا تھا۔ اس کی بائیں کنپٹی میں سوراخ تھا اور اس سے خون بہہ کر اس کے شانے پر آیا ہوا تھا۔ موت فوری واقع ہوئی تھی اس لیے خون کم نکلا تھا۔ حماد کو اس کی کرسی کا خیال آیا جس پر خون لگا تھا اور قاتل کرسی کہیں لے گیا تھا۔ حماد نہ جانے کتنی دیر کھڑا اسے گھورتا رہا پھر وہ چونکا اور اندر آیا۔ راشد کا واکی ٹاکی، فکور کی چابیاں اور اس کا کارڈ اس کی وردی سے لگا ہوا تھا۔ حماد نے کارڈ اتارنے کی کوشش کی تو وہ ہلا اور اس کے ہلنے سے فلش ٹینک کا بٹن دب گیا تھا۔ تیز آواز کے ساتھ پانی جانے لگا، حماد جھک کر پیچھے ہٹا۔ جیسے ہی فلش ٹینک رکا حماد نے واش روم کے باہر دروازہ کھلنے کی مشتبہ آواز سنی۔ وہ ہراساں ہو گیا۔ کیا قاتل اسی طرف آرہا تھا؟ اس کا خدشہ درست نکلا جب چند لمحے بعد واش روم کا دروازہ کھلا اور ہنٹر اپنا چہرہ اور کوٹ صاف کرتا ہوا اندر آیا۔ وہ آئینے کے سامنے رکا اور اپنا چہرہ صاف کرنے لگا۔ پھر اس نے بیسن کا نل کھولتے ہوئے بلند آواز سے کہا۔

"میں تمہاری چابیاں لینے آرہا ہوں۔ مجھے ان کی ضرورت ہے۔"

یہ سن کر حماد نے آس پاس دیکھا۔ قاتل کی نظروں

سے بچنے کے لیے وہ ممکنہ حد تک پیچھے ہٹ گیا مگر اب قاتل یہاں آنے والا تھا۔ اس نے سوچا اور تیزی سے فرش پر لیٹ کر سرکتا ہوا دوسرے ٹائلٹ میں چلا گیا۔ وہ بال بال بچا تھا کیونکہ جیسے ہی وہ اس طرف داخل ہوا ہنٹر نے دروازہ کھول لیا تھا۔ اس نے راشد کی طرف دیکھا اور اس کی بیلٹ سے لگی چابیوں کا گچھا نکال لیا۔ وہ پیچھے ہٹا مگر پھر دوبارہ آگے آیا اور اس بار اس نے راشد کا کارڈ اور وائی فائی نکال کر اسے کموڈ میں ڈالا اور فلش ٹینک چلا دیا۔ وہ پھر سے بھر گیا تھا اس لیے پانی پریشر سے آیا اور دونوں چیزیں بہا لے گیا۔ ہنٹر مسکرایا اور وہاں سے چلا گیا۔ اس کے جاتے ہی کموڈ پر چڑھے حماد نے سکون کا سانس لیا اور نیچے اتر آیا۔ وہ بچ گیا تھا مگر اس کی تشویش کم نہیں ہوئی تھی کیونکہ باہر جانے کا واحد راستہ بھی اب بند ہو چکا تھا۔ سیڑھیوں کی چابیاں قاتل کے قبضے میں جا چکی تھیں۔

☆☆☆

ہنٹر گنگناتے ہوئے لفٹ والی لابی میں آیا۔ اس نے سیکیورٹی آفیسر کے کمرے میں جا کر اس کے سسٹم کی مدد سے تمام لفٹس کو آن کیا اور پھر لفٹ کی طرف آیا۔ وہ ہر لفٹ کا دروازہ کھول کر اسے راشد کی چابی میں لگی ایک مخصوص کی سے لاک کرنے لگا۔ اس لاک سے لفٹ آٹو میٹک سسٹم سے مینول پر آ جاتی تھی اور صرف اسی چابی سے دوبارہ ان لاک کرنے کی صورت میں کام کرتی تھی گویا اب کوئی اس کی مرضی کے بغیر یہاں سے نہیں جا سکتا تھا اور نہ اوپر آ سکتا تھا۔ اسے صفائی کرنے والے کی فکر تھی کیونکہ وہ اسے اب تک کہیں نظر نہیں آیا تھا۔ لفٹس بند کرنے کے بعد اسے اطمینان ہو گیا تھا کہ وہ اب یہاں سے جا نہیں سکتا تھا۔ اس نے خود سے کہا۔ ”اب اصل کام شروع کیا جائے۔“

لفٹ والی لابی سے چوتھی راہداری ریکارڈ روم اور کمپیوٹرز کے سرور روم کی طرف جاتی تھی۔ ہنٹر اس راہداری سے ریکارڈ روم تک آیا۔ اس نے کارڈ لگا کر اس کا دروازہ کھولا اور اندر آیا۔ یہاں انفرا لیب کا عام اور خاص خفیہ ریکارڈ فائلوں اور فولڈرز کی صورت میں فولادی ریکس پر ترتیب سے رکھا ہوا تھا۔ ہال تقریباً پچاس فٹ لمبا اور تیس فٹ چوڑا تھا۔ اس میں ریکس کی تعداد دس سے زیادہ تھی اور یہ الماریوں کی طرح کھڑے ہوئے تھے۔ ہنٹر نے اپنا بریف کیس کھولا اور اس میں موجود پلاسٹک باکس کھولا۔ اس میں سگریٹ کی ڈبیا کے سائز کے آلات ترتیب سے رکھے ہوئے تھے۔ اس نے ان میں سے ایک نسبتاً بڑے سائز کا آلہ نکالا اور اس پر لگا واحد بٹن دبایا تو اس کے ایک طرف بند سے روشن ہو گئے اور پھر کاؤنٹ ڈاؤن ہونے لگا۔ وقت ایک گھنٹے کا تھا۔ ہنٹر نے اس ڈیوائس کو ریک کی دوسری منزل کی چھت پر چپکا دیا۔ اب جب تک کوئی خاص طور سے جھک کر نہ دیکھتا، یہ اسے نظر نہیں آ سکتی تھی۔ ہنٹر نے کام کر کے پلاسٹک باکس اور بریف کیس بند کیا اور مطمئن انداز میں وہاں سے نکل آیا۔

☆☆☆

حماد کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اب کیا کرے؟ اس نے اس امید پر کموڈ میں جھانکا کہ شاید اسے کچھ مل جائے مگر اس کی امید پوری نہیں ہوئی تھی۔ فلش کا تیز بہاؤ کارڈ اور وائی فائی دونوں کو بہا کر لے گیا تھا۔ وہ واپس اپنے کیبن کی طرف آیا۔ اسے نہیں معلوم تھا کہ قاتل کہاں تھا اور کیا کر رہا تھا۔ وہ تو اب تک یہ بھی معلوم نہیں کر سکا تھا کہ اس کا مقصد کیا تھا؟ لفٹس بند ہونے کے بعد ایک ہی امید تھی کہ اجیت پولیس کو کال کر دے اور وہ آ کر انہیں اس قاتل سے بچائے۔ شیشے کا دروازہ بند تھا اور اسے اجیت کھول سکتا تھا مگر وہ نظر نہیں آ رہا تھا۔ اس نے آہستہ سے شیشہ بجایا اور کوئی ردعمل نہیں ہوا تو حماد گھوم کر اس طرف آیا جہاں سے اس کا اور اجیت کا کیبن نظر آتا تھا اور تب اس نے شیشے کے پار سے دیکھا اجیت کرسی پر ساکت پڑا تھا۔ اس کے پاؤں پھیلے ہوئے تھے اور اس کے گلے میں دھنسی ڈوری یہاں سے بھی نظر آ رہی تھی۔ حماد کا دل بیٹھ گیا۔ قاتل نے اجیت کو بھی مار دیا تھا۔ وہ کم سے کم تین افراد کو قتل کر چکا تھا۔ وہ دیوار سے ٹکتے ہوئے فرش پر بیٹھ گیا۔ اسے لگا کہ اب اس کی باری تھی اور قاتل اسے بھی مار دے گا۔

حماد بزدل نہیں تھا مگر وہ ایک عام نوجوان تھا اور اس کا سامنا جس شخص سے تھا، وہ پیشہ ور قاتل لگ رہا تھا جو نہایت ٹھنڈے دماغ سے کسی کو بھی قتل کر سکتا تھا اور اس کی لاش کے ساتھ بیٹھ کر کھا پی بھی سکتا تھا۔ کیا وہ اس شخص سے بچ سکتا تھا!؟ اچانک اسے احساس ہوا کہ وہ ایک کھلی جگہ بیٹھا ہے اور اگر قاتل آ جاتا تو وہ اس کی نظروں سے کیسے بچتا؟ وہ گھبرا کر اٹھا اور تیزی سے ایگزیکٹو ایریا کی طرف بڑھا۔ وہی ایک جگہ تھی جہاں چھپنے کے لیے کمرے تھے۔ مگر ان کے دروازے لاک تھے۔ اس کے پاس موجود کارڈ بیکار تھا۔ اس کی وجہ سے وہ کہیں جا نہیں سکتا تھا۔ وہ ایگزیکٹو ایریا سے سیکیورٹی روم کی طرف آیا مگر اس وقت اس کی سمجھ میں نہیں آیا... کہ وہ وہاں کیوں آیا تھا؟ جب وہ سیکیورٹی روم

کے پاس آیا تو ہر بات اس کی سمجھ میں آ گئی۔ شیشے کا کیبن چاروں طرف سے بند تھا صرف ڈیسک کے سامنے شیشے کے نیچے تین انچ کا خلا تھا جس سے کوئی بھی چیز لی اور دی جا سکتی تھی۔

وہ کارڈ ری نیو کرانے کے لیے یہیں سے سیکیورٹی آفیسر کو دیتے تھے۔ ڈیسک پر مانیٹر، کی بورڈ، ماؤس اور کارڈ ری نیو کرنے والا آلہ رکھا ہوا تھا۔ حماد نے اس خلا کے نیچے سے ہاتھ گزار کر مانیٹر اپنی طرف کیا۔ کی بورڈ سامنے لایا اور پھر کارڈ والے آلے میں کارڈ ڈالا۔ سسٹم آن ہو گیا اور اس پر مینو آیا۔ حماد نے اس میں اپنا نام اور کارڈ نمبر ڈالا۔ فوراً ہی ری نیو کا آپشن آیا اور حماد نے انٹر کا بٹن دبایا۔ سسٹم نے کارڈ ری نیو کرنا شروع کر دیا۔ ایک منٹ سے بھی پہلے اس نے یہ کام کر لیا۔ حماد خوش ہو گیا۔ اب اس کے پاس ایک چیز تو تھی۔ اس نے سب پہلے جیسا کر دیا۔ اس کارڈ کی مدد سے وہ کسی جگہ بھی جا سکتا تھا اور اس کا ارادہ سیکشن میں جانے کا تھا جہاں اس کا موبائل تھا اور اس کی مدد سے وہ باہر سے مدد طلب کر سکتا تھا۔ وہ دبے قدموں سیکشن تک آیا۔ اس نے آس پاس کا جائزہ لیا اور پھر کارڈ سے دروازہ کھولا۔

وہ اندر آیا اور کیبن کی چار فٹ اونچی دیواروں سے نیچے جھک کر آگے بڑھا۔ وہ اپنے کیبن میں داخل ہوا تو وہاں اجیت کی لاش دیکھ کر اس کا دل بوجھل ہو گیا۔ وہ اس کا چار برسوں کا ساتھی تھا۔ انہوں نے صبح سے شام تک کا وقت ساتھ گزارا تھا۔ اسے سریتا اور ان دو بچوں کا خیال آیا جو اپنے باپ سے محروم ہو گئے تھے۔ اسے اس ہونے والے بچے کا خیال آیا جو کبھی اپنے باپ کو نہیں دیکھ سکے گا۔ پھر وہ چونکا، اس نے خود کو یاد دلایا کہ یہ وقت افسوس کرنے کا نہیں ہے، اسے مدد طلب کرنی ہے۔ اس نے ٹک سے اپنا سیل فون نکالا۔ ایک بار ویڈیو پر لگانے سے اس پر دس منٹ کی مووی بن جاتی تھی اور اس کے بعد ریکارڈنگ رک جاتی۔ آئی فون میں ریکارڈنگ رک گئی تھی۔ اس نے ویڈیو چلا کر دیکھی۔ شروع میں کچھ نہیں تھا پھر قاتل آیا اور اس نے پہلے اجیت کے سر سے پستول لگایا اور پھر اسے گلے میں ڈوری ڈال کر ہلاک کر دیا۔ ویڈیو میں سب کچھ بہت واضح تھا۔ حماد نے ویڈیو پوز کر کے ایمرجنسی کا نمبر ڈائل کیا مگر جب کان سے لگایا تو کوئی رزلٹ نہیں ہوا۔ اس نے ایک بار پھر اسکرین کی جانب دیکھا تو اس پر لو بیٹری کا پیغام آ رہا تھا۔

”اوہ نہیں...“ وہ کراہا مگر موبائل آف ہو گیا تھا۔ اس نے لپک کر کمپیوٹر سے نکلی یو ایس بی وائر موبائل میں لگائی اور اسے آن کرنے کی کوشش کرنے لگا کہ سیکشن کا دروازہ کھلنے کی آواز آئی۔ ہنٹر اندر آیا۔ وہ کسی سے بات کر رہا تھا۔ حماد تیزی سے اس حصے سے نکل کر برابر والے حصے میں چلا گیا جو اصل میں اجیت کا تھا۔ وہ اس کی دیوار کے ساتھ دبک گیا۔ ہنٹر اسی طرف آ رہا تھا۔ حماد کا دل رک گیا۔

☆☆☆

ہنٹر ایک منٹ پہلے عام ورکر کے حصے سے گزر رہا تھا۔ اس کے ہاتھ میں پلاسٹک کا سیل لفافہ تھا جو اس کے بریف کیس میں موجود تھا۔ اس نے ایک میز کے پاس سے گزرتے ہوئے وہاں سے قینچی اٹھا کر لفافے کا ایک حصہ کاٹا اور پھر قینچی وہیں ڈال کر آگے بڑھ گیا۔ اس کا ہاتھ لفافہ ٹٹول رہا تھا بالآخر اس نے اندر سے ایک چھوٹا سا کسی قدر پرانی طرز کا فلیپ سیل فون نکالا اور اسے آن کیا۔ موبائل کی بیٹری پوری طرح چارج تھی مگر اس کی فون بک میموری بالکل خالی تھی۔ ہنٹر نے ایک نمبر ملایا اور رابطہ ہونے پر کہا۔ ”میں نے چابیاں حاصل کر لی ہیں، سرور روم کا پاس ورڈ بتاؤ... او کے جلد معلوم کر کے بتاؤ۔“

اس گفتگو کے دوران میں وہ حماد اور اجیت والے سیکشن میں آ گیا تھا۔ اس نے موبائل بند کر کے جیب میں رکھا اور اجیت کی لاش دیکھی۔ وہ مطمئن لہجے میں بولا۔ ”فکر مت کرو دوست تمہاری بیوی ہونے والے بچے کو بھی پال لے گی۔ میری ماں نے سات بچوں کی پرورش کی تھی اور اسے کبھی شوہر نصیب نہیں ہوا۔ تم سمجھ رہے ہو نا میری بات؟“

حماد اس کی بات سنتے ہوئے دیواروں کے درمیان سے ہوتا ہوا تیزی سے سیکشن کے ساتھ اسٹور روم میں گھسا۔ اس کا دہرا دروازہ کھلا ہوا تھا اور وہ نیچے جھکے جھکے اندر گھسا اور دیوار کے ساتھ لگا تھا کہ اسے کسی کی موجودگی کا احساس ہوا۔ اس نے برابر میں دیکھا تو ربیعہ کی لاش تھی۔ وہ بے اختیار دبکا اور پھر اس نے دروازے کے اوپر لگے شیشے سے جھانکا تو ہنٹر اجیت کی لاش بھی کرسی سمیت کھینچتا ہوا اسی طرف لا رہا تھا۔ حماد نے ہراساں ہو کر آس پاس دیکھا مگر وہاں چھپنے کی کوئی جگہ نہیں تھی۔ چاروں طرف ریکس تھے جن پر دفتری ضرورت کا سامان رکھا ہوا تھا۔ حماد اور اس کے ساتھیوں کو کسی چیز کی ضرورت ہوتی تو وہ یہیں سے حاصل کرتے تھے۔ ہنٹر دروازے کے قریب آیا اور اس نے اندر آنا چاہا تھا کہ اس کے پاس موجود سیل فون کی بیل بجی۔

اس نے رک کر سیل فون نکالا اور کال ریسیو کی۔

"نہیں... یہاں کچھ مسئلے ہیں... ان کے بارے میں مجھے بتایا نہیں گیا تھا... میں اصل کام کرنے کے بجائے ان سے نمٹ رہا ہوں۔ میرے پاس سرور روم کا پاس ورڈ بھی نہیں تھا۔" اس کے لہجے میں خفگی آگئی۔ "میں سات گھنٹے کی فلائٹ لے کر یہاں مذاق کرنے نہیں آیا ہوں۔ پاس ورڈ بتانے کا شکریہ۔"

اس نے فون بند کر کے جیب میں رکھا اور دروازہ کھولنے لگا جس کے ساتھ حماد جھک کر کھڑا تھا اور خدا سے اپنی عافیت کی دعا مانگ رہا تھا کیونکہ بہ ظاہر بچت کی کوئی امید نظر نہیں آرہی تھی۔ ہنٹر نے نصف دروازہ کھول لیا تھا اور بس ایک قدم آگے آتا تو اسے حماد نظر آجاتا مگر اس کے ایک قدم اٹھانے سے پہلے کیبن سے موبائل فون کی آواز آئی۔ ہنٹر ایک جھٹکے سے رک گیا۔ وہ کسی قدر غصے میں تھا۔ حماد نے پہچان لیا یہ اس کے موبائل کی ٹون تھی۔ ہنٹر کے لیے بھی یہ غیر متوقع تھی، اس نے اجیت کا موبائل حاصل کر لیا تھا اور اسے ڈرز کر ڈسٹ بن میں ڈال رہا تھا۔ ایک اور موبائل کی موجودگی اس کے گمان میں نہیں تھی۔ وہ پلٹ کر گیا اور اس نے حماد کا چارج ہوتا موبائل اٹھایا۔ سارہ کال کر رہی تھی اور اس کی تصویر آرہی تھی۔ قاتل نے ستائشی نظروں سے دیکھا اور زیرِ لب بولا۔ "خوب صورت لڑکی ہے۔"

اس نے کال کاٹ دی، سارہ کی تصویر ہٹی تو پیچھے وہ ویڈیو کھلی ہوئی تھی جس میں وہ اجیت کا گلا گھونٹ رہا تھا۔ قاتل کے ماتھے پر شکنیں آگئیں۔ اس نے پلے کا بٹن دبایا اور ویڈیو چلنے لگی۔ اس میں واضح طور پر اسے قاتل دکھایا گیا تھا اور دنیا کی کوئی عدالت اور جیوری اس ویڈیو کو دیکھ کر اسے سزا دیے بغیر نہیں رہ سکتی تھی۔ اسے بالکل علم نہیں تھا کہ جب وہ اجیت کو قتل کر رہا تھا تو منظر کی ویڈیو بن رہی تھی۔ ویڈیو میں ذرا بھی جنبش نہیں تھی جیسے اس رخ آئی فون کسی جگہ رکھا ہوا اور ساکت تھا۔ اس نے آس پاس دیکھا اور جلد اسے معلوم ہو گیا کہ آئی فون ٹشو والے ٹرنک میں رکھا ہوا تھا۔ کیا کسی کو معلوم تھا کہ وہ اجیت کو قتل کرنے والا ہے۔ یقیناً نہیں کیونکہ اس نے بالکل اتفاق سے یہ کام کیا تھا اگر اجیت کے موبائل کی بیل نہ بجتی تو اسے پتا بھی نہیں چلتا۔

پھر آئی فون یہاں ویڈیو پر سیٹ کر کے رکھنے کا مقصد کیا تھا؟ اس نے ایک بار پھر ویڈیو دیکھی اور سمجھ گیا کہ کیمرے کا نشانہ کمپیوٹر اسکرین تھی۔ اتفاق سے وہ بھی اسی سمت میں آگیا تھا اور اس کی ویڈیو بن گئی۔ اگر آئی فون کی بیل نہ بجتی تو وہ اس ویڈیو سے لاعلم رہتا اور یہ اس کے گلے کا پھندا بن جاتی۔ آج یقیناً اس کا لکی ڈے تھا۔ اس نے ثمن شکار کیے تھے اور اپنا آدھا مشن مکمل کر لیا تھا۔ اس نے انگلی کی ایک جنبش سے ویڈیو کو ڈیلیٹ کیا۔ پھر اس نے وال پیپر پر دیکھا۔ اس پر حماد کی تصویر آرہی تھی اور اس کے ساتھ لکھا تھا۔ حماد موبائل۔ ہنٹر نے اسے پہچان لیا یہ وہی لڑکا تھا جو اسے لفٹ کے سامنے بینچ پر بیٹھا ہوا نظر آیا تھا۔ اس نے معنی خیز انداز میں سر ہلایا اور ہال میں دیکھا۔ اس نے بلند آواز سے کہا۔

"حماد... مجھے تمہارا موبائل مل گیا ہے... جلد میں تمہیں بھی تلاش کر لوں گا... یہ جگہ چھوٹی ہے اور باہر جانے کا کوئی راستہ نہیں ہے... میں تمہیں تلاش کروں گا اور پھر تمہارے سر میں سوراخ کر دوں گا۔"

حماد ایک میز کے نیچے دبکا ہوا ہنٹر کی دھمکی سن رہا تھا اس کے پلٹتے ہی وہ اسٹور سے نکل کر یہاں آگیا تھا۔ وہ فکر مند تھا کہ اس کی واحد امید اس کا آئی فون بھی ہنٹر کے قبضے میں جا چکا تھا۔ ہنٹر نے اجیت کی لاش بھی کرسی سمیت اسٹور روم میں کی اور پھر باہر نکل گیا۔ حماد نے دروازہ کھلنے اور بند ہونے کی مخصوص آواز سنی تھی۔ مگر وہ کچھ دیر اور وہیں دبکا رہا۔ اسے خطرہ تھا کہ قاتل یہیں نہ موجود ہو۔ اسے دھوکا دینے کے لیے اس نے دروازہ کھولا اور بند کیا ہو اور جیسے ہی وہ باہر نکلے گا وہ اسے شوٹ کر دے گا۔ حماد سوچ رہا تھا کہ یہ سرور روم میں کیوں جانا چاہ رہا تھا۔ سرور روم اسی فلور کے ایک حصے میں تھا لیکن وہ انتہائی محفوظ جگہ تھی جہاں کوئی نہیں جا سکتا تھا۔ اس کا دروازہ صرف سیکیورٹی آفیسر کے پاس موجود چابیوں اور کارڈز کی مدد سے کھلتا تھا۔ اس کے بعد بھی ایک پاس ورڈ لگانا پڑتا تھا۔ ایسا لگ رہا تھا کہ قاتل نے یہ تینوں چیزیں حاصل کر لی تھیں۔ اس فلور پر دو جگہیں بہت محفوظ بنائی گئی تھیں، ایک سرور روم تھا جہاں بڑے کمپیوٹرز تھے جن میں تمام اہم اور خفیہ ڈیٹا رکھا جاتا تھا اور دوسرا ریکارڈ روم جہاں کمپنی کی فائلیں اور ضروری دستاویزات رکھی جاتی تھیں۔ ان دونوں جگہوں کو بلٹ پروف شیشوں اور فولادی دیواروں سے محفوظ بنایا گیا تھا۔

حماد کچھ دیر بعد ہمت کر کے میز کے نیچے سے نکلا۔ اس نے پہلے جھانک کر پورے ہال کا معائنہ لیا اور پھر دروازے تک آیا۔ قاتل جا چکا تھا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ اب یہاں سے کیسے نکلے؟ قاتل درست کہہ رہا تھا یہاں سے باہر جانے کا کوئی راستہ نہیں تھا اور یہ جگہ اتنی بڑی نہیں تھی کہ وہ

زیادہ دیر چھپ سکتا۔ اگر قاتل باریک بینی سے تلاش شروع کرتا تو جلد یا بدیر وہ اسے تلاش کر لیتا اور پھر اپنے وعدے کے مطابق اس کے سر میں سوراخ کر دیتا۔ لہجے سے قاتل اسے یورپ کا رہنے والا لگا تھا اور اس کی مادری زبان انگریزی بھی کیونکہ وہ ذرا مختلف لہجے میں انگریزی بول رہا تھا۔ الفاظ بہت چبے تلے اور چبا کر بولتا۔ جملوں کی ساخت اعلیٰ تعلیم یافتہ لوگوں جیسی تھی۔ مگر اس سے اس حقیقت پر کوئی فرق نہیں پڑتا تھا کہ وہ یہاں تین افراد کو قتل کر چکا تھا۔ اگر اسے حماد مل جاتا تو وہ اسے بھی قتل کر دیتا۔ وہ دھمکی وہ پہلے ہی دے چکا تھا۔

جنکشن سے نکل کر حماد پیچھے سے ہوتا ہوا اس طرف آیا جہاں قاتل نے بورڈ کھولا تھا اور وہیں دیوار پر ربیعہ کا خون بکھرا ہوا تھا۔ اس نے بورڈ کھول کر چیک کیا۔ قاتل نے متعدد وائرز کاٹ دی تھیں اور جنکشن نکال دیے تھے۔ شاید اسی وجہ سے لفٹس بند ہو گئی تھیں۔ شاید کیمرے اور کمیونیکیشن لائنیں بھی ناکارہ ہو گئی تھیں۔ اس نے دیوار پر لگا ہوا انٹرکام اٹھا کر چیک کیا مگر وہ مردہ تھا۔ اسی طرح یہاں کے فون اور انٹرنیٹ بھی کٹ چکا تھا۔ حماد اس راہداری میں مزید آگے آیا تو ایک کمرے سے اسے سڑک پار دوسری عمارت کے متوازی فلور پر وہاں کا سکیورٹی گارڈ دکھائی دیا۔ حماد نے اسے ہاتھ سے اشارہ کیا مگر وہ متوجہ نہیں تھا۔ حماد شیشے کے سامنے اچھلنے کودنے لگا اور گارڈ نے اس کی طرف دیکھا نہیں ویسے بھی ان کا درمیانی فاصلہ سو فٹ ضرور تھا۔

اچانک حماد کی نظر کمرے کی چھت پر لگے فائر الارم پر گئی اور اس نے جلدی سے میز پر چڑھ کر لائٹر نکالا اور اسے جلا کر فائر الارم پر رکھ دیا۔ عام حالات میں یہ الارم ہلکا سا دھواں یا حرارت محسوس کرتے ہی بج جاتا تھا مگر خاصی دیر تک شعلے پر رہنے کے باوجود اس سے کوئی آواز نہیں نکلی۔ تب حماد پر انکشاف ہوا کہ قاتل نے عمارت کا فائر الارم سسٹم بھی ناکارہ بنا رہا تھا۔ جنکشن باکس میں یقیناً فائر الارم کی تاریں بھی تھیں۔ اس نے کوئی راستہ نہیں چھوڑا تھا۔ اب حماد کے پاس اس کے سوا کوئی چارہ نہیں رہا تھا کہ وہ سامنے والی عمارت کے گارڈ کو متوجہ کرے۔ اس نے نیچے اتر کر ایک کاغذ لے کر اسے جلایا اور شیشے کے سامنے لہرانے لگا۔ اسے امید تھی کہ گارڈ شاید آگ دیکھ کر متوجہ ہو جائے مگر وہ کچھ زیادہ ہی مگن تھا۔ ایک کاغذ جل گیا تو حماد نے دوسرا کاغذ جلایا۔

جب گارڈ دوسری بار کاغذ جلانے پر بھی متوجہ نہیں ہوا تو اس نے محسوس کیا کہ بڑی آگ کے بغیر بات نہیں بنے گی۔ حماد نے ڈسٹ بن اٹھا کر ایک جلتا کاغذ اس میں ڈالا اور جب اس میں موجود تمام کاغذوں نے آگ پکڑ لی تو اس نے اسے پردوں کے سامنے الٹ دیا۔ یہ پلاسٹک یا نائلون کے تاروں سے بنے پٹی والے پردے تھے جو آسانی سے آگ پکڑ لیتے ہیں۔ شعلے یک دم بھڑکے تھے اور انہوں نے پردوں کو اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ اس بار سکیورٹی گارڈ کو متوجہ ہونا پڑا۔ اس نے دونوں ہاتھ لہرائے تو حماد نے ہاتھ سے پستول کا اشارہ کیا اور پھر پیچھے کی طرف دیکھا جیسے اسے بتا رہا ہو کہ یہاں ایک پستول بردار موجود ہے۔ پھر اس نے فون سے کال کرنے کا اشارہ کیا۔ گارڈ سمجھ گیا اور اس نے سر ہلایا اور فون اٹھایا۔ اتنی سی دیر میں وہاں دھواں بھر گیا تھا اور اس میں سانس لینا دشوار ہو رہا تھا۔ وہ وہاں سے باہر نکل آیا۔

☆☆☆

ہنٹر اس وقت سرور روم کے پاس تھا اور یہ اس جگہ سے مخالف سمت میں مگر اسی طرف تھا جہاں حماد نے آگ لگائی تھی۔ ہنٹر دروازے کے سامنے تھا اور اسے کھول رہا تھا۔ چابی اور کارڈ سے دونوں لاک کھول کر اس نے کی بورڈ پر پاس ورڈ پنچ کیا تو دروازہ کھل گیا اور وہ اندر داخل ہوا۔ یہ اونچے درجے کا ائرکنڈیشنڈ اور پوری طرح سیل سرور روم تھا۔ درجۂ حرارت صفر کے قریب تھا۔ وہاں قطار سے کوئی ایک درجن بڑے کمپیوٹرز رکھے تھے ان کو ٹھنڈا رکھنا پڑتا تھا ورنہ ان کی کارکردگی میں خلل آتا تھا۔ سیاہ رنگ کے بڑی واشنگ مشین سائز کے یہ سرورز براہ راست انٹرپول کے ہیڈکوارٹرز سے منسلک تھے اور انہیں وہیں سے کنٹرول کیا جاتا تھا۔ یہاں صرف ان سے معلومات حاصل کی جا سکتی تھیں اور وہ بھی ہیڈکوارٹر کی طرف سے مہیا کردہ پاس ورڈ کی مدد سے۔

ہنٹر نے اپنا بریف کیس کھولا اور اس میں سے پلاسٹک باکس احتیاط سے نکالا۔ اس نے باکس کھولا۔ اندر سے سگریٹ کے ڈبے کے سائز کے نصف درجن بم موجود تھے۔ اس نے انہیں ایک سرور چھوڑ کر دوسرے سرور پر چپکانا شروع کر دیا۔ ان پر ایک بٹن تھا جو اصل میں ٹائمر آن کرنے والا بٹن تھا۔ یہ طاقتور بم تھے جو پھٹ کر یہاں آگ لگا دیتے اور سب پر دس منٹ کا وقت سیٹ تھا۔ مگر اس نے ٹائمر کا بٹن نہیں دبایا۔ ابھی اسے حماد کو تلاش کرنا تھا۔ اس کے بعد ہی وہ ٹائمر آن کرتا۔ سرور روم سے پہلے اس نے

ریکارڈ روم میں جو بم لگایا تھا اس پر ایک گھنٹے کا وقت تھا۔ اس کا خیال تھا کہ وہ ایک گھنٹے میں سب نمٹالے گا۔ مگر اب وہ فکر مند تھا کہ کیا ایک گھنٹے میں وہ اپنا کام مکمل کر سکے گا۔ تشویش کی بات یہ تھی کہ ریکارڈ روم عمارت کے بیرونی حصے کے ساتھ تھا اور اگر وہاں آگ لگتی تو اس کی کھڑکیوں سے آس پاس کی عمارتوں سے صاف دکھائی دیتی اور کوئی نہ کوئی پولیس یا ایمرجنسی کو کال کر دیتا۔

اپنا کام مکمل کر کے اس نے پلاسٹک ڈبا ایک طرف پھینک دیا اور بریف کیس بند کیا پھر وہ کمرے کے ایک طرف موجود کھڑکی تک آیا۔ سرور روم ریکارڈ روم کے ساتھ ہی تھا اور یہ بھی فلور کے آخری حصے میں تھا۔ کھڑکی میں فولادی سلاخیں اور شیشہ فٹ تھا اس کے پار اسے دوسری عمارت دکھائی دے رہی تھی۔ ایسی ہی کھڑکیاں ریکارڈ روم میں بھی تھیں۔ سامنے والی عمارت کا بیشتر حصہ بھی شیشے کا تھا۔ دفعتاً ہنٹر ٹھٹکا اسے دوسری عمارت کے شیشوں پر شعلوں کی چمک دکھائی دی تھی۔ یک دم وہ پلٹا اور تقریباً دوڑتا ہوا سرور روم سے باہر آیا۔ دروازہ اس کے عقب میں خود بند ہو جاتا، اسے روکنے کے لیے اس نے اس میں اپنا بریف کیس اٹکا دیا ورنہ اسے پھر کھولنے کے لیے پاس ورڈ درکار ہوتا۔

ہنٹر نے راستے میں ایک طرف دیوار پر لگا آگ بجھانے والا سلینڈر اتارا اور راہداری میں آگے بڑھا تھا جس کے سرے پر دھواں نمودار ہو رہا تھا اور پھر اس دھوئیں سے حماد نکلا۔ اس نے ہنٹر کو دیکھا اور پلٹ کر بھاگا۔ ہنٹر بھی لپکا تھا مگر اسے حماد کی نہیں، آگ کی فکر تھی اگر یہ قابو سے باہر ہو جاتی تو کوئی نہ کوئی دیکھ لیتا۔ حماد سے وہ بعد میں بھی نمٹ سکتا تھا۔ اب اسے اس عام سے شخص پر غصہ آرہا تھا جو اس کے لیے مشکلات پیدا کر رہا تھا۔ اس نے اندر داخل ہوتے ہی آگ پر کاربن ڈائی آکسائیڈ کی بوچھاڑ کر دی اور ایک منٹ سے بھی پہلے اس نے آگ بجھا دی۔ شیشے کے پار اسے دوسری عمارت کا سیکیورٹی گارڈ ہاتھ میں فون کا ریسیور لیے نظر آرہا تھا اور وہ اسی کی طرف دیکھ رہا تھا۔ ہنٹر نے ہاتھ سے اسے کا اشارہ کیا اور اسے کال کرنے سے منع کرنے لگا۔ بالآخر سیکیورٹی گارڈ سمجھ گیا اور اس نے ریسیور واپس کریڈل پر رکھ دیا۔ وہ بھی ہاتھ ہلا رہا تھا۔ ہنٹر نے مسکراتے ہوئے شکریہ ادا کرنے کے انداز میں کہا۔ ”کسی دن میں آکر تمہارے منہ پر گولی ماروں گا۔“

گارڈ بھی مسکرانے لگا۔ ہنٹر کیس سلینڈر سمیت باہر نکلا اور اس کے چہرے پر خوفناک تاثرات تھے۔ اس نے سلینڈر ایک طرف پھینکتے ہوئے کہا۔ ”بہت ہو گیا دوست۔“

☆☆☆

حماد کھانسی پر قابو پاتا ہوا اس راہداری سے نکلا جس میں بورڈ تھا۔ یہاں سے وہ گھوم کر ریسپشن کے سامنے سے گزر کر دوبارہ لفٹ لابی کی طرف آیا۔ جیسے ہی وہ لابی میں آیا اسے مخالف سمت سے دروازے کے پار ہنٹر کی جھلک دکھائی دی اور وہ اسے دیکھتے ہی سیکیورٹی روم کی طرف لپکا اور کارڈ سے دروازہ کھول کر اندر گھس گیا۔ اس نے اندر جاتے ہی سسٹم آن کیا اور اپنا کارڈ مشین میں ڈال کر سوائے اس کے دیگر تمام کارڈز کو ری سیٹ کرنے لگا۔ سسٹم دوسرے کارڈز کے کوڈز ری سیٹ کر رہا تھا۔ ہنٹر لابی کی طرف آنے والی راہداری میں تھا۔ وہ اب عام کمروں کے دروازے کھول کر ان میں حماد کو تلاش کر رہا تھا۔ حماد کاؤنٹر کی ڈیسک کے پیچھے دبک گیا تھا۔ اب ہنٹر سیکیورٹی روم کی طرف آرہا تھا۔ حماد کی نظریں بار پر مرکوز تھیں جو تیزی سے بھر رہی تھی اور جیسے ہی ہنٹر نے دروازے پر اپنا کارڈ استعمال کیا بار مکمل ہو گئی۔ حماد نے نہایت پھرتی سے اپنا کارڈ کھینچا اور کاؤنٹر کے نیچے میز تلے ہو گیا۔ کارڈ کھینچتے ہی سسٹم خود بخود آف ہو گیا۔

ہنٹر اندر آیا۔ اس نے کمرے کا جائزہ لیا۔ شاید اسے محسوس ہوا کہ حماد اتنی غیر محفوظ جگہ نہیں چھپ سکتا جو چاروں طرف سے نظر آتی ہے اس لیے وہ باہر نکل گیا۔ اگر وہ ذرا آگے آجاتا تو اسے حماد نظر آجاتا۔ اتفاق سے اس نے دروازہ ہاتھ سے پکڑا ہوا تھا اگر وہ دروازہ چھوڑ دیتا اور وہ خودکار طریقے سے بند ہو جاتا تو وہ اسے دوبارہ نہیں کھول سکتا تھا کیونکہ اس کے پاس موجود کارڈ اب کارآمد نہیں رہا تھا۔ حماد نے سکون کا سانس لیا۔ اس نے اٹھ کر کارڈ لگانے والی مشین کا تار قینچی سے کاٹ دیا۔ اب اسے کوئی استعمال نہیں کر سکتا تھا۔ اسے خدشہ تھا کہ قاتل واپس آکر اپنا کارڈ کارآمد نہ بنالے۔ اندر آنے کے لیے اسے شیشے کا دروازہ توڑنا پڑتا اور یہ کوئی بہت مشکل کام نہیں تھا۔ اس لیے حماد نے وہ راستہ ہی نہیں چھوڑا تھا جس سے قاتل اپنا کارڈ کارآمد بنا سکے۔ اب وہ اس فلور پر ان جگہوں پر نہیں جا سکتا تھا جہاں جانے کے لیے اس کارڈ کا استعمال لازمی تھا۔

حماد باہر آیا اور اس نے ایگزیکٹو ایریا کا رخ کیا۔ وہاں سناٹا تھا مگر نہیں... اسے محسوس ہوا کہ کوئی بول رہا تھا۔ اس نے کان لگا کر سنا تو اسے آواز ایاز کے کمرے سے آتی ہوئی محسوس ہوئی۔ وہاں کوئی تھا۔ ایک لمحے کو اسے خیال آیا کہ وہاں قاتل نہ ہو مگر وہ کس سے بات کر رہا تھا۔ وہ دبے

قدموں کمرے تک آیا اور اس نے ہینڈل گھمایا تو خلاف توقع دروازہ کھل گیا۔ دروازہ کھلتے ہی اباد کی آواز آئی تھی۔ وہ برہمی سے کچھ کہہ رہا تھا۔ حماد تیزی سے اندر داخل ہوا اور اس نے اندر آتے ہی دروازہ لاک کر لیا۔ اباد اسے دیکھ کر کرسی سے کھڑا ہو گیا اور برہمی سے بولا۔ ”حماد تم یہاں کیا کر رہے ہو؟“

”یہاں ایک قاتل ہے۔“ حماد نے اس کی برہمی نظر انداز کر کے کہا۔ ”وہ مجھے تلاش کر رہا ہے۔“

شیلا اپنی جگہ بیٹھی ہوئی تھی، اس نے آج عجیب سا میک اپ کیا ہوا تھا۔ اس کے چہرے کا ایک حصہ ذرا تاریک تھا اور دوسرا گلابی تھا اسی طرح اس کا ماتھا بھی تنی بھنوؤں کی وجہ سے الگ الگ رنگ میں تھا۔ حماد کی بات پر اس نے نظر اٹھا کر اسے دیکھا، اباد نے کہا۔

”قاتل... یہ کیا بکواس ہے؟“

”میں سچ کہہ رہا ہوں وہ ربیعہ عزائی، سیکیورٹی آفیسر راشد اور اجیت کو قتل کر چکا ہے اور اب میری تلاش میں ہے۔ پلیز کسی کے پاس موبائل ہے، پولیس کو کال کر دو۔“

اسی لمحے حماد کو باہر سے آہٹ سنائی دی اور وہ تیزی سے دروازے کے پیچھے ہو گیا۔ اس نے ہونٹوں پر انگلی رکھ کر اباد کو خاموش رہنے کا اشارہ کیا۔ ہنٹر باہر آ گیا تھا۔ یقیناً اس نے بھی حماد کی طرح آواز سن لی تھی۔ اس نے پہلے دروازہ کھولنے کی کوشش کی اور ناکامی کے بعد اس نے گن استعمال کی اور گولی سے لاک توڑ کر اندر آ گیا۔ اس نے پستول کا رخ اباد کی طرف کر رکھا تھا۔ شیلا اپنی جگہ ساکت رہ گئی۔ ہنٹر نے سرد لہجے میں پوچھا۔ ”حماد کہاں ہے؟“

”میں نہیں جانتا۔“ اباد نے خوف سے کہا۔ ”میں نے اسے فائر کر دیا ہے، اب وہ یہاں نہیں آ سکتا۔“

”وہ یہاں ہے اور کہیں چھپا ہوا ہے۔“ ہنٹر نے کہا۔ اس کی نظریں پورے کمرے میں گردش کر رہی تھیں۔ سوائے اپنے عقب کے جہاں حماد دروازے اور دیوار کے درمیان دبکا ہوا تھا۔ ہنٹر نے ذرا جھک کر اباد کی میز کے ساتھ رکھے صوفے کے پیچھے بھی جھانک لیا۔ اس کمرے میں یہ واحد جگہ تھی جہاں کوئی چھپ سکتا تھا۔ پھر اس نے شیلا سے کہا۔ ”مس شیلا اپنا موبائل میرے حوالے کر دو۔“

شیلا نے بیگ میں ہاتھ ڈالا اور بہ ظاہر ایسا لگا جیسے وہ موبائل نکال رہی ہو مگر اس نے ہاتھ باہر نکالا تو اس میں ایک چھوٹا سا پستول دبا ہوا تھا۔ اس نے برق رفتاری سے اس کا رخ ہنٹر کی طرف کیا مگر وہ تیز نکلا اور اس نے پھرتی سے

> ایک صاحب نے اپنے دوست کو بتایا۔ ”پانچ سال تک میری اور میری بیوی کی زندگی خوشیوں کے جھولے جھولتے گزری لیکن ہمیں خوشیاں راس نہیں آئیں۔ کل شام سے ہمارے درمیان ایک بار پھر جھگڑے شروع ہو گئے ہیں۔“
>
> دوست نے پوچھا: ”اس اچانک تبدیلی کا سبب کیا ہے؟“
>
> جواب ملا: ”بیگم پانچ سال بعد کل سہ پہر کی ٹرین سے میکے سے واپس آئی ہیں۔“
>
> کراچی سے ایمان علی کا تحفہ

پستول شیلا کی طرف کیا اور صرف ایک گولی چلائی۔ اس کا نشانہ درست بیٹھا۔ شیلا صوفے کے کنارے سے الٹ کر نیچے گری اور ساکت ہو گئی۔ اباد کے چہرے پر زلزلے کے تاثرات نمودار ہوئے، اس نے چلا کر کہا۔ ”یہ تم نے کیا کیا؟“

”تم اس کی فکر کرو جو میں اب کروں گا۔“ ہنٹر نے دوبارہ اس پر پستول تان لیا۔ ”حماد کہاں ہے؟“

اباد نے بہ مشکل نفی میں سر ہلایا۔ ”میں سچ کہہ رہا ہوں میں نہیں جانتا وہ کہاں ہے؟“

حماد ہنٹر کے عین پیچھے دروازے کے ساتھ دبکا ہوا تھا اگر وہ مڑ کر دیکھتا تو اسے سامنے پاتا۔ وہ کچھ دیر اباد کو گھورتا رہا پھر وہ شیلا کی طرف بڑھا اور اس کے پرس میں ہاتھ ڈال کر اس کا موبائل نکال لیا۔ ہنٹر نے شیلا کا گرا ہوا پستول اٹھا کر دیکھا اور اسے اپنے کوٹ میں رکھ لیا۔ اس دوران میں حماد موقع پا کر دروازے کے پیچھے سے نکلا اور اباد کی میز کے ساتھ رکھے ہوئے صوفے کے پیچھے چھپ گیا۔ واپس جاتا ہوا ہنٹر لازمی اسے دیکھ لیتا۔ وہ پلٹ کر آیا اور اس نے پھر اباد پر پستول تان لیا۔ اس کا انداز ایسا تھا جیسے وہ اسے شوٹ کر دے گا۔ اباد نے ڈر کر آنکھیں بند کر لی تھیں مگر خلاف توقع ہنٹر نے گولی نہیں چلائی۔ اس نے کہا۔ ”اس کمرے سے باہر مت نکلنا ورنہ تمہاری زندگی کی ضمانت نہیں ہوگی۔“

قاتل کے جاتے ہی حماد صوفے کے پیچھے سے نکل آیا۔ اس نے ایاد سے کہا۔ ”یہ سب کیا ہے؟“

”میں نہیں جانتا۔“ اس نے کہا اور افسوس سے شبلا کو دیکھا۔ گولی اس کے دل سے ذرا اوپر لگی تھی اور اس نے فوراً دم توڑ دیا تھا۔

”یہ کسی سے بات کر رہا تھا کہ وہ سرور روم میں جانا چاہتا ہے۔“ حماد نے اسے آگاہ کیا تو وہ چونکا۔

”سرور روم میں جانا ناممکن ہے۔“

”اس نے سیکیورٹی چیف سے چابیاں اور کسی کو کال کر کے پاس ورڈ بھی لے لیا ہے۔ اس کے پاس کارڈ شروع سے تھا جب یہ لفٹ سے اوپر آیا تھا۔“

ایاد سوچ میں پڑ گیا پھر اس نے کہا۔ ”ہمیں سرور روم دیکھنا ہوگا۔“

وہ دونوں کمرے سے نکلے اور سرور روم کی طرف بڑھے تو حماد کو خیال آیا۔ اس نے ایاد سے کہا۔ ”کیا آپ نے اجیت کو آج کچھ کام کرنے کے لیے روکا تھا؟“

ایاد حیران ہوا۔ ”نہیں، کیا وہ کام کر رہا تھا؟“

”میرے ساتھ آیئے۔“ حماد نے کہا اور وہ حماد کے سیکشن میں آئے۔ حماد نے اسے اپنی میز پر رکھی کمپنی کی خفیہ فائلیں دکھائیں۔ ”اجیت ان کے ساتھ کام کر رہا تھا۔“

ایاد نے نفی میں سر ہلایا۔ ”میں نے یا کسی نے اسے کام کرنے کو نہیں کہا تھا اور اس نے ریکارڈ روم سے یہ فائلیں کیسے نکالیں؟“

”اجیت کو ریکارڈ روم میں جانے کی اجازت نہیں تھی۔“ حماد نے کہا۔ ”مگر وہ کارڈ کی مدد سے وہاں جا سکتا تھا۔“

”ہمیں ریکارڈ روم دیکھنا ہوگا۔“ ایاد نے کہا اور وہ ریکارڈ روم کی طرف بڑھے۔ ”تم یہاں کیسے آئے؟“

”میں اپنا سیل فون بھول گیا تھا، اسے واپس لینے آیا تھا۔“

”میں پوچھ رہا ہوں اوپر کیسے آئے جبکہ تمہارا کارڈ ایکسپائر ہو گیا تھا۔“

حماد ہچکچایا پھر اس نے بتا دیا۔ ”میں نے عمر سے کہا تھا اس نے ایک لفٹ کو معمول کر دیا تھا۔ لیکن اب وہ لفٹ بھی بند ہے۔ انہوں نے تمام سسٹم ناکارہ کر دیے ہیں۔ فائر الارم بھی نہیں بج سکتا۔“

”اس نے چابی کی مدد سے لفٹس لاک کر دی ہوں گی۔“ ایاد نے یقین سے کہا۔ وہ ریکارڈ روم کے سامنے پہنچے اور ایاد نے اپنا کارڈ استعمال کیا۔ مگر دروازہ نہیں کھلا۔ ایاد فکرمند ہو گیا۔ ”ایسا لگ رہا ہے اس نے سیکیورٹی سسٹم بھی بند کر دیا ہے۔“

”یہ کام میں نے کیا ہے۔“ حماد نے کہا اور آگے بڑھ کر اپنا کارڈ ڈالا اور ریکارڈ روم کا دروازہ کھل گیا۔ وہ اندر آئے یہاں لائن سے دھاتی شیلف بنے ہوئے تھے جن پر فولڈرز اور بنڈل کی صورت میں فائلیں رکھی تھیں۔ ان کی تعداد بلاشبہ ہزاروں میں تھی۔ ایاد نے شیلفس کی طرف دیکھا اور بولا۔ ”اگر کسی نے اجیت کو خفیہ فائلیں مہیا کی ہیں تو وہ کون ہو سکتا ہے؟... اجیت خود تو نہیں جانتا کہ کون سی فائلوں میں کس قسم کا ریکارڈ ہے۔“

”اس سے بھی زیادہ اہم بات یہ ہے کہ وہ کون ہو سکتا ہے جس نے اجیت کو یہ کام سونپا ہے؟“

ایاد نے اس سے اختلاف کیا۔ ”نہیں اصل اہمیت فائلوں کی ہے۔“

”میں معلوم کر سکتا ہوں کیونکہ اجیت کام کر رہا تھا اور اسے کمپیوٹر بند کرنے کا موقع نہیں ملا تھا۔“

”آؤ دیکھتے ہیں۔“ ایاد نے کہا اور وہ باہر نکل آئے۔ حماد نے ایک بار پھر اپنا کارڈ استعمال کیا۔ ایاد نے راستے میں اس سے پوچھا۔

”تم نے دوسرے کارڈز کیسے لاک کیے؟“

”میں نے سیکیورٹی آفیسر کو پروسیس کرتے دیکھا ہے۔ مجھے علم ہے کہ یہ سارا کام کیسے ہوتا ہے۔“ حماد نے کہا۔ ”قاتل کے پاس کارڈ ہے اب وہ اسے استعمال نہیں کر سکتا۔“

☆☆☆

ہنٹر ایاد کے کمرے سے باہر آیا۔ اس نے ایگزیکٹو ایریا کے دوسرے کمرے پہلے ہی دیکھ لیے تھے۔ وہ سب لاک تھے اور چابی سے کھلتے۔ گویا حماد ان میں نہیں گھس سکتا تھا۔ اس نے سوچا کہ وہ کہاں جا سکتا ہے۔ جنرل ورکرز کا ہال بڑا تھا اور وہاں بہت سے کیبن تھے لیکن چھپنے کے لیے وہ زیادہ موزوں جگہ نہیں تھی۔ پھر بھی اس نے وہاں دیکھ لینا مناسب سمجھا۔ وہ ہال میں آیا اور خاموشی سے کیبنوں کا جائزہ لے رہا تھا۔ اس نے پستول ایک ہاتھ کی بغل میں دبا رکھا تھا اس لیے وہ دوربین کو پہلی نظر میں دکھائی نہیں دیا۔ وہ صفائی کے آلات لیے ہال میں داخل ہوا تھا اور اس نے ہنٹر کو دیکھا۔ ”کون ہو تم؟“

ہنٹر نے چونک کر اس کی طرف دیکھا اور مسکرایا۔ ”تم

...اچھی بات ہے اب مجھے تم کو تلاش نہیں کرنا پڑے گا۔"

تب روبین نے غور سے اس کے ہاتھ میں دبا پستول دیکھا اور اس کی آنکھیں پھیل گئیں۔ اس نے پلٹ کر بھاگنا چاہا مگر اسے دوسرا قدم اٹھانا نصیب نہیں ہوا۔

☆☆☆

وہ سیکشن کی طرف جانے والی راہداری میں داخل ہونے تھے کہ انہیں سامنے سے ہنٹر آتا دکھائی دیا اور وہ واپس پلٹ کر بھاگے اس نے عقب سے فائر کیا مگر وہ محفوظ رہے تھے۔ حماد نے دوڑتے ہوئے کہا۔ "اسٹور کی طرف سے۔"

انہیں طویل چکر کاٹنا پڑا مگر وہ اسٹور کی طرف سے سیکشن تک پہنچ گئے اور انہوں نے عین موقع پر اسٹور کا عقب میں کھلنے والا دروازہ بند کیا کیونکہ ہنٹر ان کے پیچھے پہنچ گیا تھا۔ ان کی خوش قسمتی کہ اس کے ریوالور کا میگزین ختم ہو گیا تھا اور اسے تبدیل کرنے میں اسے کچھ دیر لگی تھی۔ جب وہ اسٹور روم میں داخل ہو رہے تھے تو ہنٹر وہاں پہنچ گیا اور اس نے ہاتھ سیدھا کر کے فائر کیا۔ مگر گولی فولادی دروازے پر لگی۔ وہ بال بال بچے تھے۔ اندر گھستے ہی حماد نے پھرتی سے دروازہ بند کیا۔ ہنٹر نے آتے ہی مشین سے کارڈ لگایا مگر اس نے سرخ روشنی کی اور رد کرنے والی ٹون سنائی دی۔ ہنٹر نے پھر کارڈ پنچ کیا۔ حماد شیشے کے پاس کھڑا مسکرا رہا تھا۔ ہنٹر نے کہا۔ "تو تم نے دوسرے کارڈ ناکارہ کر دیے ہیں۔"

حماد نے اپنا کارڈ بلند کر کے اسے دکھایا۔ "سوائے اس کے۔"

ہنٹر کچھ دیر اسے گھورتا رہا پھر اچانک ہنسا۔ "بہت دنوں بعد کوئی اچھا شکار ملا ہے۔ دوست جلد تم سے ملاقات ہوگی۔"

ہنٹر پلٹ کر چلا گیا۔ اباد نے ربیعہ اور اجیت کی لاشیں دیکھ لی تھیں اور وہ ساکت رہ گیا۔ حماد نے آہستہ سے کہا۔ "راشد کی لاش واش روم میں ہے۔ اب صرف روبین بچا ہے۔ پتا نہیں وہ بھی بچا ہے یا نہیں۔ یہ شخص مس شیلا سمیت چار افراد کو قتل کر چکا ہے۔"

"پتا نہیں، یہ کون ہے؟"

"مجھے اپنے انداز سے پیشہ ور قاتل لگ رہا ہے۔" حماد نے کہا۔ "اسے یہاں کے بارے میں سب معلوم ہے اور ظاہر ہے اسے کسی اندر کے آدمی نے بریف کیا ہے۔"

"سامنے کی بات ہے۔ اندر کے آدمی کی مدد کے بغیر وہ یہاں گھس بھی نہیں سکتا تھا۔" اباد نے سر ہلایا۔ "عمارت کے سارے فون بند ہو گئے ہیں اور شاید انٹرنیٹ بھی کام نہیں کر رہا ہے۔"

"میں چیک کرتا ہوں اگر انٹرنیٹ کام کر رہا ہے تو ہم مدد طلب کر سکتے ہیں۔" حماد نے اندر جاتے ہوئے کہا۔ وہ سیکشن میں آئے وہاں حماد کا کمپیوٹر آن تھا۔ اس نے جلدی سے تجزیہ جا ہو جانے والا مانیٹر سیدھا کیا اور پاور کو ڈنگا کر اسے آن کیا۔ بکھر جانے والی فائلیں اور دوسری چیزیں ہٹا کر وہ انٹرنیٹ کنکشن چیک کرنے لگا۔ مگر کمپیوٹر انٹرنیٹ سے منسلک نہیں تھا۔ کنکشن کی جگہ "نو کنکٹی ویٹی" لکھا ہوا تھا۔ اس نے گہری سانس لی۔ "اس نے انٹرنیٹ ایکسچینج پوائنٹس بھی کاٹ دیے ہیں۔"

اباد کے چہرے پر مایوسی آ گئی۔ "یعنی ہم مدد طلب نہیں کر سکتے۔"

"ہاں یہاں ہم مجبور ہیں۔ میرا موبائل بھی اس کے قبضے میں جا چکا ہے۔" حماد نے کہا۔

"یہاں سے جانے کا کوئی راستہ نہیں ہے۔"

"آپ زیادہ بہتر جانتے ہیں میرے خیال میں کوئی راستہ نہیں ہے۔" حماد نے نفی میں سر ہلایا۔ وہ کرسی آگے کر رہا تھا کہ باہر راہداری میں کسی کا سایہ نمودار ہوا۔ اباد نے پھرتی سے ٹیبل لیمپ آف کر دیا اور وہ دونوں نیچے جھک گئے۔ ہنٹر کرسی پر کسی کو کھینچ کر لایا تھا۔۔ اس نے بلند آواز سے کہا۔

"حماد تم میری بات سن رہے ہو گے۔ یہ دیکھو کرسی پر روبین ہے اگر تم نے دروازہ نہیں کھولا اور مجھے کارڈ نہیں دیا تو میں اسے ہلاک کر دوں گا۔"

"یہ اسے مار دے گا۔" اباد نے مضطرب لہجے میں سرگوشی کی۔

روبین کرسی پر ساکت بیٹھا ہوا تھا۔ حماد اسے غور سے دیکھ رہا تھا۔ چند لمحے بعد قاتل نے پھر پکارا۔ "حماد تم میری بات کو مذاق سمجھ رہے ہو حالانکہ تم چار لاشیں دیکھ چکے ہو۔" اس نے کھینچ کر پستول کا رخ روبین کے سر کی طرف کر دیا۔ "میں تین تک گنوں گا اور اس کے بعد اس کے بھیجے سے دیوار کو ڈیکوریٹ کر دوں گا۔ ایک۔۔۔۔ دو۔۔۔۔"

"اس کا نک نیم کیا ہے؟" اچانک حماد نے چلا کر پوچھا تو اباد اچھل پڑا۔ اس نے دبی زبان میں کہا۔

"یہ کیا کر رہے ہو؟"

"کیا۔ کہا تم نے؟" قاتل بولا۔

"اس کا نک نیم کیا ہے؟"

"لگتا ہے تم میری بات کو سنجیدہ نہیں لے رہے ہو۔" قاتل نے کہا۔

"تم اسے پہلے ہی مار چکے ہو۔" حماد نے یقین سے کہا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ یہ گولی سے شیشہ توڑ کر اندر کیوں نہیں آ رہا؟

"روبین زندہ ہے۔" ایاو نے کہا۔

"اس نے اسے بھی قتل کر دیا ہے، وہ کرسی پر بالکل ساکت ہے۔" حماد نے کہا۔ اس کی نظریں قاتل پر مرکوز تھیں وہ کچھ دیر کھڑا رہا پھر وہ روبین کو وہیں چھوڑ کر چلا گیا۔ حماد نے اس کے جانے کے بعد کہا۔

"ہمیں یہاں سے نکلنا ہوگا۔"

"ہم کہاں جاسکتے ہیں؟"

"ریکارڈ روم، یہ جگہ غیر محفوظ ہے۔"

ایاو نے سر ہلایا۔ وہ دونوں جھکے جھکے سیکشن کے دروازے تک آ گئے۔ حماد نے کارڈ سے دروازہ کھولا اور وہ باہر آ گئے۔ کرسی پر بیٹھا ہوا روبین مر چکا تھا۔ اس کی شرٹ سامنے سے خون سے رنگین ہو رہی تھی۔ حماد نے دیکھا، قاتل نے اس کی گردن اپ کے صفائی کے ڈنڈے کے ٹکڑے سے اس طرح باندھی تھی کہ وہ سر سیدھا کیے ہوئے تھا۔ اس نے ٹیپ کھول کر ڈنڈا ہٹایا تو اس کا سر پیچھے کی طرف ڈھلک گیا۔ یہ پانچواں فرد تھا جسے قاتل نے پچھلے ڈیڑھ گھنٹے میں قتل کیا تھا اور اب اس فلور پر بس وہی دو افراد زندہ بچے تھے۔ حماد نے ایاو کی طرف دیکھا۔ "آپ اور مس شیلا آج گئے نہیں؟"

ایاو نے نفی میں سر ہلایا۔ "مجھے کچھ کام نمٹانا تھا۔ ہم رک گئے تھے۔"

حماد سوچ میں پڑ گیا۔ جب وہ پہلی بار اگزیکٹو ایریا کی طرف گیا تھا اور قاتل سے بچنے کے لیے دروازے چیک کر رہا تھا تو اس نے ایاو کے کمرے کا دروازہ بھی کھولنے کی کوشش کی تھی اور وہ لاک تھا۔ اندر سے کوئی آواز بھی نہیں آ رہی تھی۔ اس کا مطلب ہے ایاو جھوٹ بول رہا ہے۔ شاید وہ اور شیلا کہیں اور کسی اور مصروفیت میں تھے۔ وہ سوچ رہے تھے کہ اب کیا کرنا چاہیے کہ انہیں دور کہیں دھات سے دھات ٹکرانے کی آواز آئی۔ ایاو فکرمند ہو گیا۔ اس نے کہا۔ "یہ کیسی آواز ہے؟"

"آؤ ہم دیکھتے ہیں۔" حماد نے کہا اور وہ اس طرف بڑھے۔ آواز ریکارڈ روم کی طرف سے آ رہی تھی۔ انہوں نے راہداری کے کونے سے جھانک کر دیکھا تو قاتل ریکارڈ روم کے دروازے پر فائر فائٹر والی کلہاڑی سے حملہ آور دکھائی دیا۔ وہ ان تھک انداز میں کلہاڑی سے دروازے پر وار کر رہا تھا۔ ایاو نے آہستہ سے کہا۔ "یہ بیکار میں اپنی توانائی ضائع کر رہا ہے۔ ریکارڈ روم کا دروازہ فولادی اور بلٹ پروف ہے اس پر لگا ہوا شیشہ بھی بلٹ پروف ہے بلکہ اس فلور کے سارے شیشے بلٹ پروف ہیں۔"

اب حماد سمجھا کہ قاتل کیوں سیکشن میں نہیں گھس سکا تھا۔ اسے معلوم تھا کہ یہاں تمام شیشے بلٹ پروف ہیں اور یہ بات حماد کے علم میں نہیں تھی جو برسوں سے یہاں کام کر رہا تھا۔ اس نے آہستہ سے کہا۔ "قاتل سب جانتا ہے۔"

ایاو نے سر ہلایا۔ "اب مجھے بھی یقین ہو رہا ہے کہ اندر کا کوئی آدمی اس سے ملا ہوا ہے۔"

☆☆☆

بنسز کو طیش آ رہا تھا اور وہ زیر لب حماد کو گالیاں دے رہا تھا۔ کارڈ ناکارہ ہونے سے اب وہ بہت سی جگہوں پر نہیں جاسکتا تھا۔ خاص طور سے ریکارڈ روم میں۔ وہاں اس نے بم لگایا تھا اور اب وقت نہیں تھا اگر وہ اس بم کو فی الحال وہاں سے نہ ہٹاتا تو ریکارڈ روم میں آگ لگ جاتی اور کچھ ہی دیر میں پولیس اور فائر بریگیڈ عملہ یہاں پہنچ جاتا۔ کارڈ حماد کے پاس تھا اور اسے پکڑنا... آسان نہیں تھا۔ جھنجلاہٹ میں اس نے فائر فائٹر والی بھاری کلہاڑی سے ریکارڈ روم کا دروازہ توڑنے کی کوشش کی مگر کلہاڑی اس پر بے اثر تھی۔ اچانک اسے احساس ہوا کہ وہ جذباتی ہو رہا ہے۔ وہ ایک بین الاقوامی قسم کا قاتل تھا اور اب سے پہلے بھی ایسی مشکلات سے نمٹتا آیا تھا۔ یہ پہلا موقع نہیں تھا پھر وہ کیوں جھنجلا رہا تھا؟ یہ سوچ آتے ہی اس کی جھنجلاہٹ غائب ہو گئی اور وہ مسکرانے لگا پھر کلہاڑی سمیت وہاں سے روانہ ہو گیا۔ ایسا لگ رہا تھا کہ اسے کوئی تدبیر سوجھ گئی تھی۔

☆☆☆

آواز رکی تو حماد نے جھانک کر دیکھا۔ قاتل ریکارڈ روم کے سامنے سے غائب تھا۔ اچانک انہیں دور کسی سیل فون کی بیل سنائی دی۔ حماد پرجوش ہو گیا۔ "شاید کسی کا سیل فون یہاں رہ گیا ہے۔ ہمیں تلاش کرنا چاہیے۔ اس کی مدد سے ہم پولیس سے رابطہ کر سکتے ہیں۔"

"میری بات سنو۔" ایاو نے اسے روکنا چاہا مگر حماد اس سے پہلے ہی آگے بڑھ گیا۔ اس نے سوچا نہیں کہ یہ دھوکا بھی ہو سکتا ہے۔ آواز تمام ورکر والے ہال سے آ رہی تھی۔

سے جگہ کھلی ہوئی تھی۔ حماد اندر داخل ہوا اور کیبنوں کی دیواروں کے ساتھ ساتھ جھکتا ہوا اس جگہ پہنچا جہاں ایک پرانے طرز کا فلیپ والا فون بج رہا تھا۔ اس نے فلیپ کھول کر کال ریسیو کی اور پھر ساکت رہ گیا۔ ایاز جو اس کے پیچھے آیا تھا، اب بے چین تھا اور چاروں طرف دیکھ رہا تھا۔ اس نے پوچھا۔ ”کیا ہوا؟“

”یہ میرا نمبر ہے۔ وہ میرے نمبر سے اس پر کال کر رہا ہے۔“

”ٹریپ...“ ایاز نے اتنا ہی کہا تھا کہ ایک طرف سے ہنٹر نمودار ہوا اور پستول سیدھا کرتے ہوئے حماد پر فائر کیا مگر وہ اسے دیکھتے ہی جھک گیا تھا اور اسی طرح جھکے جھکے مخالف سمت میں لپکا۔ جنرل ہال سے نکلنے کے دو راستے تھے۔ ہنٹر بے دریغ گولیاں چلاتا ہوا پیچھے آرہا تھا۔ اچانک ہی ایاز کی چیخ سنائی دی۔ حماد نے پلٹ کر دیکھا تو اس کے بازو سے خون بہہ رہا تھا۔ اس نے جلدی سے واپس آکر ایاز کو سہارا دیا اور آگے بڑھا۔ ہنٹر پیچھے آرہا تھا۔ ریکارڈ روم کی طرف جانے والی ایک راہداری کے دروازے کو کھولتے ہوئے حماد نے ایاز کو اندر گھسیٹا اور قاتل کے آنے سے پہلے دروازہ کھینچ کر بند کر دیا۔ اس کا شیشہ بلٹ پروف تھا مگر فریم لکڑی کا تھا۔ ہنٹر تیزی کے باعث خود کو روک نہ سکا اور دروازے سے ٹکرایا۔ پہلے اس نے پستول سیدھا کیا اور لاک والے حصے کا نشانہ لیا مگر پھر رک گیا۔ اس کے پاس آخری میگزین رہ گیا تھا۔ وہ واپس گیا اور کلہاڑی لے کر آیا۔ اس کی مدد سے لاک والا حصہ کاٹنے لگا۔

حماد اور ایاز خود کو غیر محفوظ پا کر ریکارڈ روم کی طرف بھاگے۔ ہنٹر نے ورکنگ ایریا میں لاک والا حصہ کاٹ رہا تھا اور جب حماد نے کارڈ مشین سے لگایا تو سرخ بٹن روشن ہوا مشین نے کارڈ قبول نہیں کیا۔ ہنٹر کلہاڑی لہراتے ہوئے ان کی طرف آرہا تھا۔ حماد نے جلدی میں الٹا کارڈ لگا دیا تھا۔ اس نے جلدی سے اسے سیدھا کر کے لگایا اور ہری روشنی کے ساتھ لاک کھل گیا۔ حماد نے ایاز کو اندر دھکیلا اور پھر خود بھی اندر گھس کر دروازہ اندر کھینچ لیا۔ اسی لمحے ہنٹر نے بھاگتے ہوئے گھما کر کلہاڑی ماری جو دھاتی دروازے پر لگ کر اچٹ گئی۔ حماد اندر دروازے سے لگا ہوا ہانپ رہا تھا۔ اس نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔ ”اب تم کیا کرو گے؟“

”تم کیا کرو گے؟“ ہنٹر نے پوچھا۔

”پولیس کو کال۔“ حماد نے فلیپ والا موبائل سامنے کیا۔ ”تم نے اچھا ٹریپ لگایا تھا مگر افسوس کہ ایک بار پھر ناکام رہے۔ اب تمہارے پاس موقع نہیں ہے کیونکہ یہاں پولیس دس منٹ میں آجاتی ہے۔“

ہنٹر خلاف توقع ذرا بھی پریشان نہیں تھا بلکہ وہ کچھ موڈ میں تھا۔ اس نے حماد کو مشورہ دیا۔ ”فوراً کال کرو۔“

حماد کھٹکا اور اس نے فلیپ کھولا تو سامنے موبائل اسکرین پر سیکیورٹی کوڈ لکھا آرہا تھا اور نیچے خانہ تھا۔ حماد شاک میں رہ گیا۔ ہنٹر دیکھ رہا تھا اور استہزائیہ انداز میں مسکرا رہا تھا۔

”اپنا سیل فون ہمیشہ سیکیورٹی کوڈ لگا کر رکھنا چاہیے۔ افسوس کہ تم ایسا نہیں کرتے۔“ اس نے کہا اور حماد کا سیل فون سامنے کر دیا۔ اس پر میسج کا پیج کھلا ہوا تھا اور اس پر ایک پیغام لکھا ہوا تھا۔ ”میں آفس میں ہوں کیا تم آسکتی ہو، ایمرجنسی ہے۔“

یہ ایس ایم ایس سارہ کو جا چکا تھا۔ حماد چلایا۔ ”نہیں۔“

”اب اس کا جواب دیکھو۔“ قاتل نے کہا اور ان باکس میں جا کر ایک میسج کھولا۔ یہ سارہ کا میسج تھا اور اس میں لکھا تھا۔ ”میں آرہی ہوں۔“

”تم ایسا نہیں کر سکتے۔“ حماد بولا۔ ”اس کا اس معاملے سے کوئی تعلق نہیں ہے۔“

”میں کر چکا ہوں، وہ آگئی ہوگی۔ میں اسے ریسیو کرنے جا رہا ہوں۔“ ہنٹر نے سکون سے کہا۔ ”بے شک تم فکر مت کرو، میں اسے کوئی تکلیف نہیں دوں گا۔ میں عورتوں کا دل سے احترام کرتا ہوں اور سارہ تو بہت دلکش لڑکی ہے۔“

حماد خود پر قابو پانے کی کوشش کر رہا تھا۔ صورت حال اچانک ہی کہیں زیادہ سنگین ہو گئی تھی۔ سارہ اس کی محبت تھی اور وہ اس پر ذرا سی آنچ بھی برداشت نہیں کر سکتا تھا۔ ”تم نیچے کیسے جاؤ گے تمام لفٹس بند ہیں اور سیڑھیوں والا راستہ کارڈ سے کھلتا ہے۔“

”میں نے تمام لفٹس معطل کر دی ہیں۔“ قاتل نے چابیوں کا گچھا دکھایا۔ ”اس کی مدد سے... انہیں لاک اور ان لاک کیا جا سکتا ہے۔ تم سمجھ رہے ہو یہاں سے کوئی بھی میری مرضی کے بغیر نہ آسکتا ہے اور نہ ہی جا سکتا ہے۔“

”میری بات سنو۔“ حماد چلایا مگر وہ جا چکا تھا۔ حماد پلٹ کر ایاز کے پاس آیا جو کراہ رہا تھا۔ گولی اس کے بازو کے پار ہو گئی تھی۔ حماد نے اپنی ٹائی اتارتے ہوئے اس کے زخم سے ذرا اوپر باندھی اور بولا۔ ”میں کہنے والا ہوں آپ کو تکلیف برداشت کرنی ہوگی۔ خون بہت بہہ رہا ہے۔“

ایاز نے سر ہلایا۔ ''یہ مصیبت کہاں سے آگئی ہے؟''

حماد نے اچانک ناک کی نو ایاز کے حلق سے وہ بار نکلی تھی اور پھر وہ بچوں کی طرح سسکیاں لینے لگا۔ مگر عمار کو اس سے زیادہ سمارہ کی فکر تھی۔ وہ یہاں آنے والی تھی اور قاتل اس کا منتظر تھا۔

☆☆☆

سمارہ گھر سے باہر تھی جب اس نے حماد کو کال کی مگر اس نے ریسیو کرنے کے بجائے کاٹ دی۔ آج اس کا سہیلیوں کے ساتھ باہر کھانے کا پروگرام تھا اور وہ ایک پیکی ریسٹوران میں موجود تھیں۔ سمارہ کی سہیلیاں پاکستانی تھیں اور وہ سب برسوں سے یہاں مقیم تھیں۔ سمارہ ان کے ساتھ گپ شپ کر رہی تھی اس لیے اس نے کال ریسیو نہیں کی مگر پھر حماد کا مسیج آیا۔ ''تم میرے آفس آ سکتی ہو؟''

سمارہ نے وجہ پوچھی تو عمار نے ایمرجنسی کا کہا۔ سمارہ پریشان ہو گئی۔ حماد خوش مزاج تھا مگر وہ بے تکے مذاق نہیں کرتا تھا اور نہ ہی وہ دوسروں کو تنگ کرنے کا عادی تھا۔ سمارہ نے اس کی بات کو پوری طرح سنجیدگی سے لیا تھا۔ اس کے پاس اپنی گاڑی تھی۔ سمارہ نے سہیلیوں سے معذرت کی کہ ایمرجنسی ہے اور اسے جانا ہے۔ انہوں نے ساتھ چلنے کی پیشکش کی مگر سمارہ نے منع کر دیا۔ ''نہیں تم لوگ انجوائے کرو، اگر وقت ہوا تو میں پھر آ جاؤں گی ورنہ میری طرف سے سوری ہے۔''

پورا راستہ سمارہ کا دل بجھا بجھا رہا تھا۔ وہ آرام سے انجیرو لب تک پہنچ گئی۔ شام سات بجے کے قریب وہاں سناٹا اور ویرانی تھی۔ عمارت کا سامنے والا حصہ جو شیشوں سے بند تھا وہاں کوئی آدمی نظر نہیں آ رہا تھا۔ سمارہ داخلی دروازے کی طرف بڑھی اور اسے کھلا پایا مگر سیکیورٹی لائٹس بند تھیں اور صرف ایک لائٹ کھلی تھی مگر اس کی سیکیورٹی مشین بند تھی۔ وہ فکرمند ہو گئی اور اس نے حماد کو کال کی۔ اس بار بھی اس نے کال ریسیو نہیں کی اور کال کاٹ دی۔ سمارہ نے مسیج کیا۔ ''یہاں کوئی نہیں ہے۔''

عمار نے جوابی مسیج کیا۔ ''کوئی بات نہیں تم لفٹ نمبر چار تک آؤ وہ آن ہے دسویں فلور تک آ جاؤ۔''

سمارہ لفٹ والی لابی کی طرف بڑھی۔ تمام لفٹس آف تھیں مگر چار نمبر آن تھی۔ اس نے بٹن دبایا تو لفٹ آنے کی آواز آنے لگی۔ ایک منٹ میں لفٹ کا دروازہ کھلا اور وہ اندر داخل ہوئی۔ اس کا خیال تھا کہ دسویں فلور پر حماد اس کا منتظر ہوگا اور وہ سوچ رہی تھی کہ حماد نے اسے یہاں کیوں بلایا ہے؟ جبکہ یہ جگہ خالی ہو چکی تھی۔ مگر جب لفٹ رکی اور دروازہ کھلا تو سمارہ نے اپنے سامنے ایک سفید فام کو پایا۔ وہ مسکرا رہا تھا اس لیے سمارہ پرسکون ہو گئی۔ اس نے کہا۔ ''حماد...''

''وہ اندر ہے۔'' ہنٹر نے کہا اور آگے بڑھ کر پہلے چابی سے لفٹ لاک کی اور پھر پستول نکال کر سمارہ کے سر پر رکھ دیا اور بہت مہذب لہجے میں بولا۔ ''موبائل پلیز۔''

سمارہ سناٹے میں رہ گئی جب ہنٹر نے پستول کا دباؤ بڑھایا تو اس نے کانپتے ہاتھوں سے اپنا موبائل پرس سے نکال کر اس کے حوالے کر دیا۔ ہنٹر نے اس کا قیمتی موبائل فرش پر پٹخا اور پھر جوتے کی ایڑی مار کر توڑ دیا۔ سمارہ نے وہ چھ مہینے پہلے ہی تقریباً ستر ہزار پاکستانی روپے کا لیا تھا مگر اس وقت اسے موبائل کا خیال بھی نہیں تھا۔ اسے اپنی اور عمار کی فکر تھی۔ ہنٹر نے سمارہ کا بیگ لیا اور اسے چیک کر کے لفٹ میں پھینک دیا اور پھر تحکمانہ انداز میں بولا۔ ''آگے چلو مس سمارہ۔''

☆☆☆

ایاز کی پٹی سے فارغ ہو کر حماد نے دروازہ کھولنا چاہا تو ایاز نے اسے روکا۔ ''وہ باہر ہوگا۔''

''ہاں لیکن سمارہ بھی آ گئی ہوگی۔''

''سمارہ کون؟''

''میری منگیتر ہے۔'' حماد نے کارڈ سے دروازہ کھولا اور باہر آ گیا۔ اس نے ایاز کی طرف دیکھا۔ ''آپ یہیں رکیں، میں ابھی آتا ہوں۔''

''تم کہاں جا رہے ہو؟'' ایاز نے پوچھا۔

''وہ یہ سب اس کارڈ کے چکر میں کر رہا ہے۔'' حماد نے اپنا کارڈ لہرایا۔ ''جیسے ہی اسے یہ کارڈ ملے گا وہ ہم سب کو قتل کر دے گا۔''

ایاز کچھ کہنا چاہ رہا تھا مگر عمار جا چکا تھا۔ اس کا رخ اپنے کیبن کی طرف تھا۔ وہ بذریعہ کارڈ اندر داخل ہوا اور اس نے پہلے اسٹور کا رخ کیا وہاں ایجنٹ کی لاش بدستور گری پڑی ہوئی تھی۔ حماد نے دل کڑا کر کے اس کی تلاشی لی اور اپنے مطلب کی چیز تلاش کر لی۔ اسٹور روم میں ہی فرنیچر کا بیز بھی رکھے تھے اور ان کو چلانے کے لیے کارڈ استعمال کیا جاتا تھا۔ حماد نے اپنا کارڈ مشین کے سامنے لہرایا اور وہ آن ہو گئی۔ پانچ منٹ بعد وہ واپس جا رہا تھا اپنی میز کے پاس سے گزرتے ہوئے اس نے ریک سے چھوٹی قینچی اٹھائی۔ اب اس کا رخ لفٹس کی طرف تھا اور وہ لفٹس کے ساتھ والی

لابی تک پہنچا تھا کہ اسے ہنٹر، سارہ کے ساتھ دکھائی دیا اور اس نے پستول سارہ کے سر سے لگا رکھا تھا۔ حماد اسے دیکھتے ہی آڑ میں ہو گیا مگر اس نے دیکھ لیا تھا۔ وہ بلند آواز سے بولا۔

"درست کوئی حماقت مت کرنا تمہاری محبت موت سے صرف چند انچ کے فاصلے پر ہے۔ اس پستول میں موجود بلٹ نے یہ چند انچ طے کر لیے تو تمہاری محبت ایک لاش رہ جائے گی۔"

"اگر تم نے ایسا کیا تو یہ کارڈ دو ٹکڑے ہو جائے۔" حماد نے آڑ سے ہاتھ نکالے۔ ایک ہاتھ میں کارڈ تھا اور دوسرے ہاتھ میں قینچی جو کارڈ پر لگی تھی۔ "اس صورت میں تم ہار جاؤ گے۔"

"ہم دونوں ہار جائیں گے۔" ہنٹر نے سکون سے کہا۔ "یہ کوئی اچھی بات نہیں ہے۔ مجھے ڈرا اینج سے نفرت ہے۔ مجھے یہ کارڈ چاہیے اب بتاؤ تم کیا چاہتے ہو؟"

حماد نے بلند آواز سے کہا۔ "میں تبادلہ چاہتا ہوں۔ تم کارڈ چاہتے ہو تو سارہ کو ادھر بھیج دو۔"

"نہیں تم کارڈ ادھر پھینکو میں سارہ کو چھوڑ دوں گا۔"

"اس صورت میں تم ہم دونوں کو مار دو گے۔" حماد نے طنزیہ لہجے میں پوچھا۔ "کیا میں تمہیں اتنا ہی احمق نظر آتا ہوں۔"

"نہیں مجھے تسلیم ہے کہ تم بہت چالاک ہو، میری توقع سے زیادہ مگر تم غلط جج کر رہے ہو۔ ذرا سوچو ہم دونوں کے لیے کیا کیا داؤ پر لگا ہے اور اگر نقصان ہوا تو کس کا زیادہ ہو گا۔"

حماد اندر سے کمزور پڑنے لگا۔ قاتل کا مشن ناکام ہوتا مگر وہ تو سب کچھ کھو رہا تھا۔ اس کی آنے والی ساری زندگی سارہ سے عبارت تھی اور وہ نہ رہتی تو اس کے پاس کیا رہ جاتا؟ اچانک اس کے پاس سے اباد گزرا اور ان دونوں کے درمیان آ گیا۔ اس نے اپنا سلامت بازو اوپر کر کے کہا۔ "کسی کا نقصان نہیں ہو گا۔ ایک فیئر ڈیل ہو گی۔ تم پستول پھینک دو گے۔" اس نے قاتل کی طرف دیکھا اور پھر حماد کی طرف گھوما۔ "تم کارڈ آگے پھینک دو۔"

"پہلے یہ پستول پھینکے۔" حماد نے مضبوط لہجے میں کہا۔ "ورنہ اسے شوٹنگ سے کون روکے گا؟"

"او کے، میں پستول پھینک رہا ہوں۔" ہنٹر نے کہا۔ اس نے پستول سارہ کے سر سے ہٹا لیا اور اسے فرش پر ڈالتے ہوئے ٹھوکر سے دور پھینک دیا۔ "اب تم کارڈ دو۔"

حماد نے کارڈ اس کی طرف پھینک دیا جو اس سے کچھ دور گرا تھا مگر ہنٹر نے سارہ کو نہیں چھوڑا اس کے بجائے اس نے اس کی گردن بازو میں جکڑ لی اور اباد سے کہا۔ "کارڈ اٹھا کر مجھے دکھاؤ۔"

اباد آگے آیا۔ اس نے کارڈ اٹھا لیا اور ہنٹر کے سامنے کیا۔ اس پر حماد کی تصویر لگی ہوئی تھی۔ اباد نے کہا۔ "یہ لو اور اسے جانے دو۔ ڈیل ہو گئی ہے۔"

ہنٹر نے کارڈ لے لیا اور سارہ کو چھوڑ دیا۔ وہ آزاد ہوتے ہی حماد کی طرف لپکی تھی۔ حماد اسے آزاد دیکھ کر اتنا خوش ہوا کہ وہ دیکھ ہی نہیں سکا کہ ہنٹر نے کارڈ اٹھاتے ہوئے کوٹ میں ہاتھ ڈالا اور اس کا ہاتھ باہر آیا تو اس میں شیلا کا پستول تھا۔ اس نے اباد سے کہا۔ "سوری ڈیل ابھی مکمل نہیں ہوئی ہے۔"

ہنٹر نے پستول سیدھا کیا اور گولی چلانے والا ہی تھا کہ نزدیک کھڑا ہوا اباد تیزی سے آگے آیا اور ہنٹر کے پستول والے ہاتھ پر اپنا ہاتھ مارا۔ مگر ہنٹر ٹریگر دبا چکا تھا البتہ اس کا نشانہ بہک گیا۔ گولی اوپر کی طرف گئی۔ دھماکے کے ساتھ سارہ نے چیخ ماری اور حماد نے سر جھکاتے ہوئے اسے اپنی طرف کھینچا اور دونوں بھاگ نکلے۔ ہنٹر نے دوبارہ پستول ان کی طرف سیدھا کیا مگر اباد سامنے آ گیا۔ "گولی مت چلاؤ۔"

غصے سے بے قابو ہو کر ہنٹر نے اباد کو گھونسا مارا اور وہ پیچھے جا گرا۔ وہ پہلے ہی تکلیف سے بے حال تھا۔ اس گھونسے نے اس کی رہی سہی مزاحمت بھی ختم کر دی۔ جب ہنٹر نے اسے گریبان سے پکڑ کر اٹھایا تو وہ اٹھتا چلا گیا۔ اس نے سرد لہجے میں کہا۔ "تم بیکار میں زحمت کر رہے ہو۔"

"تمہیں اس لیے نہیں بھیجا گیا ہے۔" اباد نے آہستہ سے کہا۔ "تم اصل کام چھوڑ کر لوگوں کو قتل کرتے پھر رہے ہو۔"

"تم کس لہجے میں بات کر رہے ہو؟" ہنٹر کا لہجہ تمسخرانہ ہو گیا۔ "تمہارا کیا خیال ہے تم باس ہو... ہاں۔" اس نے پستول کی نال اباد کی گردن میں گھسائی۔ "میں تم کو بھی شوٹ کر سکتا ہوں۔"

"ایسا کر کے تم بہت بڑی غلطی کرو گے۔ تم بھول رہے ہو کمپنی میں میری کیا پوزیشن ہے اور تمہیں کمپنی نے ہائر کیا ہے۔ تمہیں اس بات کے لیے ملین ڈالرز نہیں دیے گئے ہیں کہ تم اپنی مرضی سے ٹریگر دباتے رہو۔ تم نے یہاں جو

کچھ کیا ہے اس کا جواب دینا ہوگا۔"

ہنٹر کچھ دیر اسے گھورتا رہا پھر اسے کھینچتا ہوا حماد اور سارہ کے پیچھے جانے لگا۔ ان دونوں کا رخ ریکارڈز روم کی طرف تھا کیونکہ وہی ایک محفوظ جگہ تھی۔ جب ہنٹر اپاوو کو لے ریکارڈز روم کے سامنے پہنچا تو حماد اور سارہ اندر داخل ہو رہے تھے اور اسے دیکھتے ہی حماد نے کھینچ کر دروازہ بند کر دیا۔ آخری لمحے میں ہنٹر اپاوو کو چھوڑ کر ان کی طرف لپکا مگر وہ اندر جا چکے تھے۔ ہنٹر شیشے کے پاس جا کر مسکرایا اور اس نے حماد کا دیا ہوا کارڈ بلند کر کے دکھایا جس پر حماد کی تصویر تھی۔ "کیا خیال ہے تم بچ جاؤ گے؟ میرے پاس اب یہ ہے۔"

"تم نے سوچا نہیں کہ ہم اندر کیسے آئے؟" حماد نے جوابی مسکراہٹ کے ساتھ کہا اور اپنا ہاتھ بلند کیا جس میں ایک کارڈ دبا ہوا تھا اور اس پر حماد کی تصویر تھی۔ "ذرا اپنا کارڈ دیکھو۔"

ہنٹر کی مسکراہٹ غائب ہو گئی اور اس نے اپنے ہاتھ میں موجود کارڈ دیکھا اسے اس کا ایک سرا الگ سے دکھائی دیا۔ اس نے اسے پکڑ کر کھینچا تو اوپر سے کاغذ اتر تا چلا گیا جو اصل میں حماد کے کارڈ کی فوٹو کاپی تھی اور اس کے نیچے اجنبی کا کارڈ تھا جو زخمی انجینئر ہو گیا۔ حماد نے نہایت صفائی سے اسے بے وقوف بنایا تھا۔ ہنٹر کا چہرہ سرخ ہو گیا۔ اس نے فرار ہونے کی طرف دیکھا۔ "تم کیا سمجھتے ہو یہاں محفوظ ہو؟"

"ہاں یہاں ہمیں کوئی خطرہ نہیں ہے۔ کچھ دیر میں نائٹ شفٹ کا انچارج آجائے گا ورنہ ہم کل تک بھی انتظار کر سکتے ہیں۔ تم یہاں ہمیشہ تو نہیں رہو گے۔"

"نہیں۔" ہنٹر نے خود پر قابو پالیا اور مخصوص پرسکون انداز میں بولا۔ "یہاں سے تمہاری لاشیں باہر جائیں گی۔"

ہنٹر وہاں سے چلا گیا۔ حماد فکرمند ہو گیا۔ اس نے خود سے پوچھا۔ "اس نے ایسا کیوں کہا ہے؟"

"حماد یہ سب کیا ہے؟" سارہ نے پوچھا۔ وہ بہت خوفزدہ تھی۔ "یہ شخص کون ہے؟"

"میں نہیں جانتا۔" حماد نے بے خیالی میں جواب دیا۔ اس کا ذہن ہنٹر کی آخری بات میں الجھا ہوا تھا۔ اچانک اس نے ریکس کے درمیان گھوم پھر کر دیکھنا شروع کیا۔ وہ کسی چیز کی تلاش میں تھا۔ سارہ اس کے ساتھ ساتھ تھی۔ اس نے پوچھا۔

"تم کیا ڈھونڈ رہے ہو؟"

"دیکھو یہ شخص یہاں سرور روم کے لیے آیا ہے اور جو کچھ سرور روم کے کمپیوٹرز میں ہے وہی ہارڈ کاپی کی صورت میں یہاں ہے۔ اس نے جو وہاں کیا ہوگا وہی یہاں بھی کیا ہو گا۔ سارہ ریکس میں دیکھو ہر طرف اگر کوئی چیز اجنبی نظر آئے تو مجھے بتانا۔"

دونوں الگ ہو کر تلاش کرنے لگے اور جو چیز حماد تلاش کرنا چاہ رہا تھا وہ سارہ کو نظر آگئی۔ اس نے پکار کر کہا۔ "حماد ادھر آؤ یہ دیکھو۔"

حماد لپک کر آیا۔ ایک ریک پر نیچے والے حصے میں ایک سگریٹ کی ڈبیا کے برابر چیز لگی تھی اور اس پر ڈیجیٹل ٹائمر آن تھا اس کے مطابق دس منٹ رہ گئے تھے۔ "یہ کیا ہے؟"

"کوئی بم ہے۔" سارہ نے یقین سے کہا۔ "ممکن ہے آگ لگانے والا ہو کیونکہ یہاں آگ پکڑنے والی بے شمار چیزیں ہیں۔"

"یقیناً یہ آگ لگانے والا بم ہے اور اس کا مقصد یہاں ریکارڈز کو تباہ کرنا ہوگا۔" حماد نے یقین سے کہا۔

"صرف دس منٹ باقی رہ گئے ہیں۔" سارہ نے گھبرا کر کہا۔ "اسی لیے وہ کہہ رہا تھا کہ یہاں سے ہماری لاشیں باہر جائیں گی۔"

"اسے روکا نہیں جا سکتا؟"

سارہ نے جائزہ لیا اور نفی میں سر ہلایا۔ "اس میں ایسا کوئی بٹن نظر نہیں آرہا ہے شاید یہ پری سیٹ قسم کے بم ہیں جنہیں ایجنسی ویٹ کر دیا جاتا ہے اور یہ مقررہ وقت پر پھٹ جاتے ہیں انہیں ڈی ایجنسی ویٹ نہیں کیا جا سکتا۔"

"ہمیں باہر جانا ہوگا۔" حماد نے کچھ دیر بعد کہا۔

"باہر وہ ہے۔" سارہ بولی۔

"دوسری صورت میں ہم یہاں جل کر مر جائیں گے۔ فائر کنٹرول سسٹم آف ہے اور یہاں آگ بجھانے کے لیے کچھ نہیں ہے۔ سارہ ہمیں باہر جانا ہوگا۔"

سارہ نے سوچا اور مضبوط لہجے میں بولی۔ "میں تمہارے ساتھ ہوں لیکن تم نے سوچا ہے کہ باہر جا کر کیا کرنا ہے؟"

"ہاں میرے ذہن میں ایک پلان ہے۔" حماد نے پُرخیال انداز میں کہا اور سارہ کو بتانے لگا۔ سارہ نے سر ہلایا۔

"میں سمجھ گئی۔"

حماد نے کارڈ لگا کر دروازہ کھولا اور پہلے باہر جھانکا

مگر وہاں ہنٹر اور اباد نظر نہیں آ رہے تھے۔ اس نے سارہ سے کہا۔ ''آؤ میرے ساتھ۔''

وہ دونوں وہاں سے نکلے اور بھاگتے ہوئے الٹفس والی لابی تک پہنچے۔ وہاں ہنٹر کا پھینکا ہوا پستول پڑا تھا۔ حماد نے اسے اٹھا لیا اور بولا۔ ''اب ہم نہتے نہیں ہیں۔''

☆☆☆

ہنٹر خوش تھا کہ حماد اور سارہ نے ریکارڈ روم میں گھس کر اس کا کام آسان کر دیا تھا۔ وہ وہاں لگے بم سے بے خبر تھے۔ وہ اباد کے ساتھ سرور روم میں آیا اور اب وہاں لگے ہوئے بم ایکٹی ویٹ کر رہا تھا۔ اباد اس کے ساتھ تھا۔ اس نے کہا۔ ''تم بلاوجہ کی دیر کر رہے ہو۔ تمہیں اب تک یہ کام کر کے یہاں سے نکل جانا چاہیے تھا۔''

''شٹ اپ۔'' ہنٹر نے آخری بم ایکٹی ویٹ کیا۔ ''مجھے معلوم ہے کہ کب میرا کام مکمل ہوگا اور کب میں یہاں سے نکلوں گا۔ جب تک وہ دونوں زندہ ہیں، میں یہاں سے نہیں جا سکتا۔''

''دیکھو وہ میری ذمے داری ہیں، میں یقین دلاتا ہوں وہ زبان بند رکھیں گے۔'' اباد کے لہجے میں التجا آ گئی۔ ''تم پہلے ہی میرے لیے بہت مشکل کھڑی کر چکے ہو۔ میرے ملک میں قانون بہت سخت ہے اور یہاں کوئی بھی قانون کی گرفت سے بچ نہیں سکتا۔''

مگر ہنٹر پر کوئی اثر نہیں ہوا۔ اس نے کہا۔ ''ریکارڈ روم میں پہلے ہی بم لگا چکا ہوں اور کچھ دیر بعد جب وہ بلاسٹ ہوں گے تو اندر بچنے کی کوئی جگہ نہیں ہوگی۔''

''ان کے پاس کارڈ ہے وہ باہر آ سکتے ہیں۔''

ہنٹر مسکرایا۔ ''باہر میں ہوں گا۔''

ہنٹر نے اپنا کام مکمل کر لیا تھا۔ بریف کیس لگا ہونے کی وجہ سے سرور روم کا دروازہ کھلا رہا تھا۔ ہنٹر نے باہر آ کر بریف کیس ہٹایا تو سرور روم کا دروازہ خودکار طریقے سے بند ہو گیا۔ اس کے بعد ہنٹر نے شلا کے پستول سے اس کی مشین پر فائر کیا۔ مشین سے دھواں اٹھا اور وہ ناکارہ ہو گئی اب کوئی سرور روم کا دروازہ کھولنا بھی چاہتا تو نہیں کھول سکتا تھا۔ وہ ریکارڈ روم کی طرف جانے لگا۔ اباد اس کے پیچھے لپکا۔ اب تک اس نے ہنٹر کے کسی کام پر اعتراض نہیں کیا تھا مگر جب وہ ریکارڈ روم کی طرف بڑھا تو وہ اس کے پیچھے آیا۔ ''دیکھو میری بات سنو۔''

''سوری... باس۔'' ہنٹر نے کہا۔ وہ ریکارڈ روم کے سامنے پہنچے تو ٹھٹک گئے۔ اس کا دروازہ کھلا ہوا تھا اور وہ دونوں غائب تھے۔ ہنٹر بے ساختہ اندر داخل ہوا۔ ''یہ کہاں گئے؟''

اباد خوش نظر آنے لگا۔ ''میرا خیال ہے، وہ نکل گئے۔''

ہنٹر نے نفی میں سر ہلایا۔ ''یہاں سے کوئی باہر نہیں جا سکتا۔ میں انہیں تلاش کر کے ماروں گا۔ اب ان کے پاس چھپنے کے لیے زیادہ جگہیں نہیں ہیں۔''

''کارڈ کے بغیر تم ہر جگہ نہیں جا سکتے۔''

''جا سکتا ہوں مجھے نیچے جا کر سسٹم آن کر کے کارڈ ایکٹی ویٹ کرنا ہوگا۔'' ہنٹر نے کہا۔ ''اس کے بعد میں انہیں ہر جگہ تلاش کر سکوں گا۔'' وہ خوش نظر آنے لگا۔ ''بہت عرصے بعد ایسا شکار ملا ہے جو اتنی مزاحمت کر رہا ہے، اسے شکار کرنے کا اپنا ہی الگ مزہ ہے۔''

اباد دروازے کے پاس کھڑا تھا اور وہ ہنٹر سے متفق نظر نہیں آ رہا تھا۔ ''احمقانہ باتیں مت کرو یہ کوئی گیم نہیں ہے، اربوں ڈالرز کی ملٹی نیشنل کمپنی کی ساکھ داؤ پر ہے۔''

''تم فکر مت کرو، میرا مشن مکمل ہو گیا ہے اور تمہیں بھی کچھ نہیں ہوگا۔ تم کہہ سکتے ہو کہ کچھ لوگ یہاں گھس آئے اور انہوں نے یہ قتل و غارت گری کی ہے تم بھی زخمی ہوئے لیکن چھپ کر اپنی جان بچالی۔'' ہنٹر نے مطمئن لہجے میں کہا۔ ''اب تم جا کر اپنے دفتر میں بیٹھو، میں ان دونوں کو ٹھکانے لگا آتا ہوں۔''

اباد جانتا تھا وہ اسے مجبور بھی نہیں کر سکتا تھا۔ اچانک دروازے کے سامنے حماد نمودار ہوا اس نے ہنٹر کا سائلنسر والا پستول تان رکھا تھا۔ اس نے سرد لہجے میں کہا۔ ''پستول پھینک دو۔''

''اور اگر میں ایسا نہ کروں تو؟'' ہنٹر نے گھبرائے بغیر کہا۔

''کیا تم مجھے آزمانا چاہتے ہو... میں گولی چلا دوں گا۔''

''افسوس کہ تم ایسا نہیں کر سکو گے۔'' ہنٹر نے کہا اور دوسرا ہاتھ جو کوٹ کی جیب میں تھا، اس نے باہر نکال کر سامنے کیا تو اس میں گولیاں تھیں۔ ''تمہارا کیا خیال ہے میں بھرا ہوا پستول تمہیں چھوڑنے کی حماقت کر سکتا ہوں۔''

ہنٹر نے ہاتھ سے گولیاں نیچے گرا دیں اور اپنا پستول سیدھا کیا تھا کہ حماد چلایا۔ ''سارہ!''

ریکارڈ روم کا دروازہ بند ہونے لگا تھا۔ حماد بائیں طرف گیا اور ہنٹر کی چلائی گولی دروازے سے جا لگی تھی۔ اباد

دروازے کے پاس تھا۔ اس نے سر جھکایا اور تیزی سے باہر نکل گیا۔ ہنٹر دور تھا وہ لپکا مگر اس کے دروازے تک پہنچنے سے پہلے وہ بند ہو گیا اور لاک لگنے کی مشینی آواز آئی۔ وہ دروازے سے ٹکرا کر رہ گیا۔ حماد اور وہ ایک بار پھر اس دروازے میں شیشے کے آمنے سامنے تھے۔ فرق صرف اتنا تھا کہ اب حماد باہر تھا۔ ''گڈ بائی مسٹر گلر... ہم نے بم تلاش کر لیے تھے۔''

''بم۔'' ہنٹر کا سانس رک گیا۔ اس نے سرگوشی میں کہا۔ ''بارہ نمبرہ۔'' پھر وہ اس ریک کی طرف لپکا جس میں اس نے بم لگایا تھا۔ اس نے جاتے ہی ہاتھ مارا مگر وہاں نہیں تھا۔ وہ پاگلوں کی طرح ریکس میں اسے تلاش کرنے لگا۔ وہ کھڑکی کے سامنے موجود ایک ریک تک آیا تھا کہ اسی ریک کے آخری حصے سے شعلہ نمودار ہوا اور دھماکے کی لہر نے اسے پیچھے کی طرف اچھالا۔ ہنٹر کا جسم کھڑکی سے ٹکرایا اور فولادی سلاخ و شیشہ توڑتا ہوا وہ ہوا میں گیا اور پھر نیچے گرتا چلا گیا۔ اس کے ہاتھ میں بدستور پستول تھا۔ اس نے کھلی آنکھوں سے زمین کو بہت تیزی سے نزدیک آتے دیکھا اور آنکھیں بند کر لیں۔ آخری خیال اس کے ذہن میں آیا کہ ایک اناڑی نے ایک کھلاڑی کو شکست دے دی۔ پھر ایک دھماکے سے اس کا جسم زمین سے ٹکرایا اور تاریکی چھا گئی۔ یہ موت کی تاریکی تھی۔

☆☆☆

حماد حیران تھا کہ قاتل نے اسے یہ بند سے کیوں بتائے تھے۔ وہ اس کے سامنے دھماکے کے بعد کھڑکی توڑ کر عمارت سے نیچے گرا تھا اور اتنی بلندی سے گرنے کے بعد اس کے بچنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ حماد کے ساتھ ایاد اور سارہ نے بھی یہ منظر دیکھا تھا۔ ایاد خوش تھا۔ اس نے کہا۔ ''یہ اسی انجام کا مستحق تھا۔''

''لیکن یہ صرف ایک مہرہ تھا۔'' حماد نے کہا۔ ''اس کے پیچھے کوئی اور ہے۔''

''وہ بھی سامنے آ جائے گا۔'' ایاد نے کہا اور اپنے کمرے کی طرف چلا گیا۔ اس کے جانے کے بعد سارہ نے کہا۔

''ہم یہاں سے کیسے نکلیں گے؟''

چابیاں قاتل کے ساتھ ہی چلی گئی تھیں اور دروازہ خود نیچے نہیں جا سکتے تھے۔ ''فکر مت کرو کچھ دیر میں پولیس اور فائر بریگیڈ والے یہاں پہنچ جائیں گے۔''

اب سرور روم کی طرف سے دھماکوں کی آوازیں آنا شروع ہو گئیں۔ وہاں لگائے گئے بم پھٹ رہے تھے اور کمپیوٹرز کو تباہ کر رہے تھے۔ سارہ گھبرا رہی تھی۔ ''کہیں یہ آگ پورے فلور پر نہ پھیل جائے؟''

حماد کا بھی یہی خیال تھا مگر اس نے سارہ کو تسلی دی۔

''ایسا نہیں ہوگا۔ آؤ میرے ساتھ۔''

وہ اسے لے کر ریسپشن میں آیا۔ اس نے سارہ کو کچھ بتایا اور بولا۔ ''تم لفٹ والی لابی میں جاؤ۔ یہ کارڈ لو اور سیکیورٹی روم میں خود کو لاک کر لو جب تک باہر سے مدد یا نہ آؤں تم وہاں سے نہیں نکلو گی۔ سمجھ گئیں۔''

سارہ نے سر ہلایا۔ ''سمجھ گئی لیکن تم؟''

''میں ذرا باس سے مل کر آتا ہوں۔''

حماد نے خود سارہ کو سیکیورٹی روم تک چھوڑا اور جب وہ اندر چلی گئی تو حماد ایاد کے کمرے میں آیا۔ وہ اپنی میز پر بیٹھا ہوا تھا اور اس کے سامنے میز پر شراب کا گلاس رکھا ہوا تھا۔ اس کا چہرہ ستا ہوا تھا۔ اس نے نظر اٹھا کر حماد کو دیکھا۔ ''کیا بات ہے؟''

''میں یہ معلوم کرنے آیا ہوں کہ میرے ساتھ بھی وہی ہوگا جس کا آپ نے وعدہ کیا ہے؟''

ایاد کی بھویں سکڑ گئیں۔ ''کیا مطلب؟''

''سر! مجھے شک ہے کہ میرے ساتھ وہ نہیں ہوگا بلکہ مجھے قربانی کا بکرا بنایا جائے گا۔ سرور اور ریکارڈ روم میں موجود فائلوں کے جل جانے کے بعد کیا ثبوت باقی رہے گا کہ جو رپورٹس میڈیا کو جاری کی گئی تھیں، ان کا مواد میں نے لیا ہے۔''

ایاد اسے گھور رہا تھا۔ ''تم کیا کہنا چاہتے ہو؟''

''مجھے فائر کر کے اجنبی کو میری جگہ سونپی گئی۔ اسے لالچ دیا گیا ہوگا اور وہ آپ کے کام کے لیے تیار ہو گیا۔ وہ سرور سے ریکارڈ اڑا رہا تھا۔''

''اگر وہ ایسا کر رہا تھا تو اس سے تمہارا کوئی تعلق نہیں ہے۔''

''میرا تعلق ہے کیونکہ اس کے بعد سارا ملبا مجھ پر ڈال دیا جاتا اور میرے خلاف کیس بنا کر مجھے پولیس گرفتار کر لیتی۔''

ایاد کا انداز بدل گیا۔ ''یہ درست ہے کیونکہ یہ سب تمہارا ہی قصور ہے۔''

''یہی نہیں بلکہ آپ نے یہ قاتل بھی ہائر کیا۔''

''یہ جھوٹ ہے، مجھے ایسا کرنے کی ضرورت نہیں تھی۔''

"اگر آپ نے نہیں کیا تب بھی آپ کے علم میں ضرور تھا۔ آخر اس کو سرور روم کے پاس وارڈز کا علم کیسے ہوا۔ اسے انفرو لیب کا ورکر کارڈ کس نے دیا۔"

"میں نہیں جانتا۔"

"وہ یہاں کس کو کال کرتا رہا۔"

"میں نہیں جانتا۔" ایاد چلایا۔

حماد نے قلیب والا موبائل نکالا۔ "وہ اس سے کسی کو کال کرتا رہا تھا۔"

"یہ لاک ہے تم چلا نہیں سکتے۔"

"بار در نمبر۔" حماد نے موبائل پر نمبر ملایا اور وہ کھل گیا۔ اس نے ڈائل نمبرز میں جا کر دیکھا ایک ہی نمبر کئی بار ڈائل تھا۔ اس نے نمبر ملایا اور چند لمحے بعد ایاد کے کوٹ سے اس کے موبائل کی ٹون آنے لگی۔ اس کا چہرہ بالکل ہی ست گیا تھا۔

"اسی لیے اس نے آپ کا موبائل نہیں مانگا۔" حماد نے آہستہ سے کہا۔ "اس نے باقی سب کے موبائل اپنے قبضے میں کر لیے تھے کیونکہ اس کا آپ سے رابطہ تھا۔"

ایاد نے اپنے سامنے موجود شراب کا گلاس ایک ہی سانس میں خالی کر دیا اور بھرائی آواز میں بولا۔ "میرے پاس اس کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا۔"

"سو افراد جو اس بیکار ویکسین کی وجہ سے مارے گئے اور پانچ افراد یہاں مارے گئے۔ چھٹا خود قاتل مرا۔ ان اموات کا آپ کیا جواز پیش کریں گے؟"

"یہ قیمت ہے خود کو بچانے کی۔" ایاد بولا۔ "میرے وکلا تیاری کر رہے ہیں، ہم ہر کیس پر حرجانہ دیں گے۔ سب کی قیمت ادا کر دوں گا۔"

"کچھ لوگ قیمت نہیں لیں گے۔"

"زلیں۔" ایاد نے گلاس دیوار پر دے مارا، وہ چلا رہا تھا۔ "میری طرف سے وہ جہنم میں جائیں۔ اور تم کیا سمجھتے ہو اگر تم یہاں ملازم ہوتے تو مجھ سے اس لہجے میں بات کر سکتے تھے؟"

"شاید نہیں لیکن اب میں آپ کا ملازم نہیں ہوں۔"

"تم کیا کرو گے؟ پولیس کو میرے خلاف بیان دو گے؟" ایاد نے کہا اور اس کا ایک ہاتھ جو نیچے تھا سامنے آیا تو اس میں ایک چھوٹا سا لیکن جدید پستول دبا ہوا تھا۔ "اگر یہاں موجود لاشوں میں دو کا اور اضافہ ہو جائے تو پولیس مجھ پر شبہ نہیں کرے گی۔"

"آپ مجھے مار سکتے ہیں لیکن سارہ کو نہیں۔" حماد نے سکون سے کہا۔ "وہ سکیورٹی روم میں ہے اور جب تک پولیس نہیں آ جاتی، وہ وہیں رہے گی۔"

ایاد کا چہرہ ایک بار پھر ست گیا۔ اس نے پستول میز پر رکھ دیا اور بولا۔ "حماد تم جاب پر واپس آ سکتے ہو، شبلا کی جگہ۔"

اس نے نفی میں سر ہلایا۔ "میں اب یہاں جاب نہیں کر سکتا۔ مجھے اس جگہ سے انسانوں کے خون کی بو آ رہی ہے۔"

"تب میں تمہیں ضرور قتل کر دوں گا۔" ایاد بولا۔ اس نے پھر پستول اٹھا لیا تھا۔ "میرے خلاف ایک گواہ باقی نہیں رہے گا۔ ریکارڈ پہلے ہی تباہ ہو چکا ہے۔"

"اس سے کوئی فرق نہیں پڑے گا۔ آپ بھول رہے ہیں اس ریکارڈ کی ایک کاپی ایجنٹ کی میز پر تھی اور اب وہ کاپی سارہ کے پاس ہے جو اسے پولیس کے حوالے کرے گی۔ آپ کی بچت کا کوئی امکان نہیں ہے سر۔" حماد نے تلخی سے کہا۔ "آپ چاہیں تو مجھے شوٹ کر سکتے ہیں۔"

ایاد کچھ دیر اسے گھورتا رہا پھر اس نے پستول جھکا لیا اور آہستہ سے بولا۔ "تم جا سکتے ہو۔"

حماد کچھ دیر اسے دیکھتا رہا پھر مڑ کر کمرے سے نکل گیا۔ سارہ سکیورٹی روم میں بے تابی سے اس کی منتظر تھی، اسے دیکھتے ہی اس نے دروازہ کھولا اور جیسے ہی حماد اندر آیا، وہ اس سے لپٹ گئی۔ وہ ہنسا۔ "آرام سے، میں کسی جنگ سے واپس نہیں آیا ہوں۔"

"میرے لیے تو یہ جنگ سے بھی بڑھ کر تھا۔" سارہ نے بھیگے لہجے میں کہا۔ "میں بتا نہیں سکتی کہ یہ کچھ وقت میں نے کیسے گزارا ہے۔"

"اب سب ٹھیک ہے۔" حماد نے کہا۔ انہیں پولیس سائرن کی آواز سنائی دے رہی تھی۔ "میرا خیال ہے پولیس آ گئی ہے۔"

اسی لمحے دگیز بگلو ایریا کی طرف سے ایک فائر کی آواز آئی۔ سارہ سہم گئی۔ "یہ کیا ہے؟"

"میرا خیال ہے انصاف ہو گیا ہے۔"

چند منٹ بعد لفٹس آن ہوئیں اور پولیس والے اور فائر بریگیڈ کے ارکان ایک ساتھ اوپر پہنچے۔ انہیں دیکھ کر حماد اور سارہ باہر نکل آئے تھے۔ حماد کو معلوم تھا کہ ابھی ان کی گلو خلاصی میں خاصی دیر لگے گی مگر وہ بہرحال زندہ تھے اور آزاد تھے۔

گھاؤ

اسما انشا زری

جو لوگ تجربات کی تیز آگ میں جلتے ہیں... وہ جھلس کر خاک نہیں ہوتے... بلکہ زندگی کی تازگی... لطافت اور شگفتگی ان کی شخصیت کو نکھار دیتی ہے... مگر کچھ لوگ جذبات کی تیز آندھی میں اس طرح اڑتے ہیں... کہ ان کی رفتار... گفتار اور کردار سب اس کی نذر ہوتا چلا جاتا ہے... ایک ایسے ہی شخص کا احوال جس کی رگوں میں سچائی... دیانت... محبت کا خون رواں تھا... مگر اچانک ہی زندگی برتنے کے تقاضے بدلنے لگے... خلوص اور سچائی میں ملاوٹ کا عنصر بڑھنے لگا وہ زندگی کے آخری وار کا ایسا شکار ہوا جس کا گھاؤ تاعمر مندمل نہ ہو سکا۔

معاشرتی و معاشی بگاڑ... بھوک، افلاس اور تنگدستی جیسے عوامل کا سفاکانہ شاخسانہ

"چائے۔"

میں آئینے کے سامنے کھڑا بال سنوار رہا تھا کہ صدف کی کھنک دار آواز نے اپنی طرف متوجہ کیا۔ وہ چائے کی پیالی ہاتھ میں لیے دروازے پر کھڑی تھی اور صبح کی طرح ہی فریش لگ رہی تھی۔ اس نے آسمانی اور ہلکے گلابی رنگوں کے امتزاج والا لان کا عام سا مشرقی وضع کا سوٹ پہن رکھا تھا وہ جو بھی پہن لیتی اس پر بے حد کھلتا تھا۔

"چائے پینی ہے یا نہیں۔" مجھے مسلسل خود کو تکتے دیکھ کر اس نے قدرے جارحانہ انداز میں ٹوکا۔ یہ جارحانہ انداز وہ میرے جذبوں کو بے لگام ہونے سے روکنے کے لیے جان بوجھ کر اپناتی تھی اور شرم کے باعث رخساروں پر ابھرنے والی سرخی کو غصے کی سرخی کا رنگ دینے کی کوشش کرتی تھی۔

"شربت دیدار تو نوش جان کر لیں پھر چائے بھی پی لیں گے۔" میں نے جان بوجھ کر اسے چھیڑا کہ لمحہ بھر کے لیے ہی سہی جب اس کی گھنیری پلکیں شرم سے لرزتی تھیں تو مجھے بہت اچھا لگتا تھا۔ اب بھی یہی ہوا لیکن حسب معمول اس نے تیزی سے خود کو سنبھال لیا اور دھمکی آمیز لہجے میں بولی۔

"ٹھیک ہے۔ میں تائی امی سے جا کر کہہ دیتی ہوں کہ آپ کا چائے پینے کا موڈ نہیں ہے۔" اس نے دروازے کی طرف رخ موڑا۔

"رک جاؤ ظالم حسینہ..... یہاں پہلے ہی ٹینشن کی وجہ سے انڈے پراٹھے کے ساتھ بھرپور انصاف نہیں ہو سکا اس پر تم چائے سے بھی محروم کرنے کا ارادہ رکھتی ہو۔ خالی پیٹ میں کیا خاک انٹرویو دوں گا۔" میری دہائی نے اس کے قدم روک دیے اور اس نے چائے کی پیالی میرے ہاتھوں میں تھما دی۔

"دعا کرنا کہ میں کامیاب رہوں۔" چائے کا پہلا گھونٹ بھر کر میں نے اس سے فرمائش کی۔

"آپ کو کہنے کی ضرورت ہے کیا؟" اس کے یاقوتی لبوں پر شکوہ مچلا۔

"نہیں ضرورت تو نہیں ہے پر کہہ دینے سے دل کو کچھ تقویت سی حاصل ہوتی ہے۔" میں نے پوری سچائی سے اسے جواب دیا۔

حقیقت بھی یہی تھی کہ مجھے اپنے لیے اس کی دعاؤں کا پورا

یقین تھا۔ وہ میری غیر اعلانیہ منگیتر تھی۔ بزرگوں کی ایک عام عادت کے مطابق ہماری دادی جان نے اس کی پیدائش کے فوراً بعد یہ اعلان کر دیا تھا کہ یہ میرے "کوکی" کی دلہن بنے گی۔ آنے والے وقتوں میں دادی کی اس بات کو کسی باقاعدہ بندھن میں تو تبدیل نہیں کیا گیا لیکن بات بہرحال اپنی جگہ برقرار رہی جس کا ثبوت اس صورت ملتا رہا کہ مختلف رشتے داروں یا عزیزوں کی طرف سے جب بھی مجھے یا صدف کو اس حوالے سے چھیڑا گیا تو دونوں ہی کے بزرگوں میں سے کسی نے کوئی اعتراض کیا نہ تنبیہی جملہ کہا۔ باقاعدہ منگنی نہ کرنے کا شاید یہ سبب تھا کہ ہم ایک ہی مکان میں رہائش پذیر تھے۔ دادا کی طرف سے ورثے میں ملنے والے اس اسی گز کے مکان کو ابا اور چچا نے مل کر ازسرنو تعمیر کروایا تھا۔ اوپر کے پورشن میں چچا اور نیچے ہم لوگ رہتے تھے۔ دونوں ہی گھروں میں بچوں کی تعداد برابر تھی۔ ہم دو بھائی اور ایک بہن تھے جبکہ چچا نے تیسری بیٹی کی پیدائش پر ہار مان کر بیٹے کی خواہش سے دست برداری اختیار کر لی تھی۔ دونوں گھرانوں میں رواداری بھی سو خوش اسلوبی سے گزارہ ہو رہا تھا۔ حالات وہی تھے جو عام سے سفید پوش گھرانوں میں ہوتے ہیں لیکن پچھلے ایک سال سے ہمارے گھر کے حالات ذرا سخت ہو چلے تھے کیونکہ ابا جان میرے ایم اے کے آخری پیپر والے دن بالکل اچانک ہی ہارٹ فیل کی وجہ سے ہمیں چھوڑ گئے تھے۔ وہ ہائی اسکول میں کیمسٹری کے ٹیچر تھے اور جیسا کہ گورنمنٹ کے اداروں کا دستور ہوتا ہے کہ ریٹائرڈ یا فوت شدہ شخص کے واجبات کی ادائیگی میں اس قدر تاخیر کی جاتی ہے کہ اگر آمدنی کا کوئی اور ذریعہ نہ ہو تو فاقوں تک نوبت چلی جائے، یہی صورت حال ہمارے ساتھ پیش آئی۔ آٹھ ماہ کی بھاگ دوڑ کے بعد میں واجبات کے حصول اور امی کے نام پنشن جاری کروانے میں کامیاب ہو پایا۔ اس عرصے میں، میں خود بھی اپنے لیے کسی معقول ملازمت کے حصول کے لیے سرگرداں رہا لیکن تاحال ناکام ہی تھا اور ایک ٹیوشن سینٹر میں اکنامکس اور انگریزی پڑھا کر گزارہ کر رہا تھا۔ اس مختصر آمدنی میں چار افراد پر مشتمل ایک ایسے گھرانے کا جس میں دو بچے بالترتیب ایف ایس سی اور میٹرک کے طالب علم ہوں، گزارہ ویسے ہی مشکل تھا کہ قسمت کی ستم ظریفی سے امی بھی شدید بیمار ہو گئیں۔

انہیں بریسٹ کینسر ہو گیا تھا۔ ابا جان کو ملنے والے فنڈ کی رقم ان کے علاج کے سلسلے میں خرچ ہو گئی اور مکمل صحت یابی سے پہلے حالات خراب سے خراب تر ہوتے چلے گئے۔ چچا نے ان حالات میں حتی المقدور ساتھ دیا لیکن وہ خود محدود آمدنی والے آدمی تھے جن پر تین بیٹیوں کی ذمے داری تھی۔ ایک حد سے آگے وہ بھی مدد کرنے سے قاصر تھے۔ البتہ ان کے اہل خانہ کی طرف سے اخلاقی تعاون مسلسل جاری تھا۔ چچی دن میں دو تین بار نیچے کا چکر لگا کر امی کی خیریت معلوم کرتی رہتی تھیں جبکہ ان کی تینوں بیٹیاں بھی میری چھوٹی بہن شائلہ کے ساتھ گھریلو ذمے داریاں ادا کرنے میں اس کا ہاتھ بٹاتی تھیں بلکہ دیکھا جائے تو زیادہ تر کام صدف اور اس سے چھوٹی عاشفہ ہی کرواتی تھیں۔ شائلہ کو ایک تو چھوٹی ہونے کی وجہ سے گھریلو کام کاج میں مہارت نہیں تھی۔ دوسرے اس کی پڑھائی کی بھی مصروفیت تھی۔ میٹرک کا تعلیمی سال ہر اچھے طالب علم کے لیے بہت اہم ہوتا ہے اسی لیے صدف اور

عاشقہ اس کا خاص خیال رکھتی تھیں۔ سب سے چھوٹی صنم تو خیر تھی ہی شائلہ کی عمر کی جو اسے امی کی بیماری کی ٹینشن سے نکال کر اپنے ساتھ پڑھائی میں مصروف رکھتی تھی۔

''اللہ نے چاہا تو آج آپ ضرور کامیاب لوٹیں گے۔ میں رات سے آپ کی کامیابی کے لیے خصوصی دعائیں کر رہی ہوں اور میرے دل کو یقین سا ہو چلا ہے کہ آج ضرور آپ انٹرویو میں کامیاب رہیں گے۔'' اپنی ملائم آواز میں بولتی وہ میرا حوصلہ بڑھا رہی تھی۔

''اللہ تمہارے اس یقین کی لاج رکھے۔'' میں نے جواب میں آہستہ سے کہا اور چائے کی خالی پیالی اسے واپس تھما کر صوفے کے نیچے رکھے جوتے نکال کر پہننے لگا۔

''شوز تو بڑے شاندار ہیں۔ برانڈڈ لگتے ہیں۔'' جوتوں کو دیکھ کر صدف نے تبصرہ کیا تو میں یکدم بوکھلا سا گیا۔ اپنے اس تبصرے میں اس نے ایک جملہ نہیں کہا تھا کہ یہ اتنے مہنگے اور قیمتی جوتے مجھ جیسے قلاش کے پاس کہاں سے آئے لیکن ظاہر ہے وہ جانتی تھی کہ کل دوپہر تک میرے پاس یہ جوتے موجود نہیں تھے اور نہ ہی میری جیب میں اتنی رقم تھی کہ میں اتنے مہنگے تو کیا کوئی نسبتاً کم قیمت ہی جوتوں کی جوڑی خرید پاتا۔

''انٹرویو کے لیے ایک دوست سے مانگ کر لایا ہوں۔'' میں نے نظریں جھکا کر جوتے پہنتے ہوئے اسے جواب دیا کہ نظر ملا کر اس سے جھوٹ بولنا میرے لیے ممکن نہیں ہوتا تھا۔

☆☆☆

ایچ ایچ بلڈرز کے آفس میں داخل ہوتے ہوئے میں امید وبیم کے درمیان جھول رہا تھا۔ اشتہار میں انہوں نے اکاؤنٹس کے شعبے کے لیے جو کوالیفکیشن طلب کی تھی وہ میرے پاس موجود تھی لیکن میں جانتا تھا کہ اس اشتہار کو پڑھ کر میرے جیسے کئی انٹرویو کے لیے یہاں پہنچ گئے ہوں گے اور یہ ضروری تو نہیں تھا کہ میں سب کو مات دیتا ہوا اس ملازمت کے لیے منتخب ہو جاتا۔ تیسری منزل کے ہال نما کمرے میں پہنچ کر میری ان تین افراد سے ملاقات ہوگئی جو آج کے انٹرویو میں میرے مقابل تھے۔ شکل وصورت اور حلیے سے وہ سب بھی میری ہی طرح متوسط طبقے سے تعلق رکھنے والے ضرورت مند جوان ہی محسوس ہوتے تھے۔ اپنا نام سیکریٹری نما لڑکی کے پاس درج کروا کر میں ان تینوں کے ساتھ ہی قطار میں بیٹھ گیا۔ میرے بعد وہاں دو افراد مزید آئے اور یوں امیدواروں کی تعداد چھ ہوگئی۔

انٹرویو ٹھیک وقت پر شروع ہوا اور اندر جانے والے پہلے امیدوار کے ساتھ ہی مجھ سمیت شاید سب ہی کے دلوں کی دھڑکن تیز ہوگئی۔ ہم دبی آواز میں آپس میں گفتگو کرتے اندازے اور تخمینے لگانے لگے۔ تقریباً پندرہ منٹ بعد وہ باہر نکلا تو ویسے ہی امید اور ناامیدی کے درمیان لٹکا ہوا تھا جیسے انٹرویو سے قبل۔ ظاہر ہے انٹرویو لینے والے نے اسے فوری طور پر تو کوئی حتمی جواب نہیں دیا ہوگا اور یہی کہا ہوگا کہ بعد میں آپ کو فیصلے سے آگاہ کر دیا جائے گا۔ سچ بات ہے کہ مجھے خود وہ بندہ بس یوں ہی سا لگا تھا اور اسے میں نے خود ہی اس جاب کے لیے مسترد کر دیا تھا۔ اپنے ساتھ وہاں موجود پانچ افراد میں سے حقیقتاً مجھے صرف دو امیدواروں سے خطرہ محسوس ہو رہا تھا۔ ایک وہ اسکائی بلیو شرٹ والا اسمارٹ سا لڑکا تھا جو بڑی روانی سے انگریزی بول رہا تھا اور اپنے انداز سے ہی خاصا تیز طرار اور ذہین محسوس ہوتا تھا جبکہ دوسری سب سے آخر میں آنے والی گندمی رنگت اور تیکھے نقوش والی لڑکی تھی۔ میں جانتا تھا کہ اکثر جگہوں پر خوش شکل اور کوالیفائیڈ لڑکیوں کو مردوں پر ترجیح دینے کا رجحان ہو چلا ہے اس لیے وہ لڑکی مجھے اپنی سب سے زیادہ سخت حریف محسوس ہو رہی تھی۔ مختلف قسم کے خیالات وجذبات دل و دماغ میں لیے آخرکار وہ وقت بھی آ گیا جب سیکریٹری نے میرا نام پکار کر مجھے انٹرویو کے لیے اندر کمرے میں جانے کو کہا۔ میں خود کو مجتمع کرتا ہوا اس دروازے کی طرف بڑھا جو میری روٹھی ہوئی قسمت کو کھولنے کا سبب بن سکتا تھا۔

''پلیز سٹ ڈاؤن۔'' میز کے قریب پہنچنے پر مہنگے تھری پیس سوٹ میں ملبوس شخص نے اپنی سخت سی آواز میں مجھے حکم دیا تو میں تھینک یو کہتا ہوا کرسی پر ٹک گیا۔ میں نے اس کے اشارے پر اپنے ڈاکومنٹس کی فائل اس کی طرف بڑھائی۔ اس نے فائل کھول کر دیکھنے کی زحمت نہیں کی اور اپنی تیز نگاہوں کو کچھ دیر تک میرے چہرے پر جمائے مجھے دیکھتا رہا۔ اس کا یہ انداز خاصا کنفیوز کرنے والا تھا سو میں نروس ہونے لگا۔

''مسٹر کامران احمد۔'' آخرکار اس کی آواز میری سماعتوں تک پہنچی۔ ''کیا آپ مجھے بتا سکتے ہیں کہ آپ نے جو شوز پہن رکھے ہیں وہ آپ نے کہاں سے حاصل کیے ہیں؟'' اس نے گویا میری سماعتوں میں بم بلاسٹ کر دیا۔ میں کچھ پل کے لیے حواس باختہ سا اسے دیکھتا رہ گیا۔ بہت گہرائی تک اندر اتر جانے والی وہ آنکھیں گویا مجھے پوری طرح پڑھ رہی تھیں۔ اس کی آنکھوں میں کچھ ایسا تھا کہ میں

صدق کی طرح اس سے جھوٹ بولنے کی ہمت نہیں کر سکا لیکن سچ بولنا بھی آسان نہیں تھا۔ میں حد سے زیادہ کنفیوز ہو گیا۔ اس انٹرویو کے لیے میں نے بہت تیاری کی تھی لیکن اس نے تو پہلا ہی سوال لاجواب کر ڈالا تھا۔ یکدم ہی میرے ذہن میں جھماکا سا ہوا اور مجھے خیال آیا کہ آخر اس نے مجھ سے یہ سوال کیا ہی کیوں ہے؟ کیوں کا جواب کسی الہام کی طرح مجھ پر اترا اور مجھے اندازہ ہو گیا کہ میں اس سے صرف سچ بول سکتا ہوں البتہ یہ ہو سکتا ہے کہ اس سچ میں اتنی اثر پذیری ہو کہ میرے حق میں کوئی بہتر نتیجہ نکل آئے چنانچہ میں گلا کھنکھارتے ہوئے بولنے کے لیے تیار ہو گیا اور مستقل آواز میں بولنے لگا۔

"آپ کا سوال میرے لیے حیرت انگیز ہے سر لیکن شاید یہ آپ کی نظر کی گہرائی ہے کہ آپ نے میرے اور ان جوتوں کے درمیان موجود مناسبت کو محسوس کر لیا۔ ظاہر ہے ان کی قیمت میری حیثیت سے بہت اونچی ہو گی۔ اگر میں آپ سے یہ کہوں کہ میں نے یہ جوتے اس انٹرویو کے لیے اپنے کسی دوست سے مستعار لیے ہیں تب بھی شاید آپ کو یقین نہ آئے کیونکہ آدمی کے دوست بھی عموماً اس کی حیثیت کے ہوتے ہیں۔ ان جوتوں کی حالت ایسی بھی نہیں ہے کہ میں انہیں سیکنڈ ہینڈ خریدنے کا دعویٰ کروں چنانچہ میرے پاس ایک ہی راہ رہ جاتی ہے کہ میں آپ سے سچ بولوں، ہاں یہ ضرور ہے کہ اس سچ کے بعد مجھے یہاں ملازمت ملنے کا امکان معدوم ہی رہ جائے گا لیکن کم از کم اتنا تو ہو گا کہ میں جھوٹ کے بوجھ سے آزاد ہو جاؤں گا۔" حقیقت بتانے سے قبل میں نے وہ تمہید باندھی جو حالات کو میرے حق میں بہتر کر سکتی تھی۔ اس کے بعد میں نے والد کی وفات، والدہ کی بیماری اور چھوٹے بھائی بہن کی کفالت کی ذمے داریوں کا ذکر کرتے ہوئے اپنی معاشی صورتِ حال اور اس ملازمت کے حصول کے لیے اپنی طلب کی شدت سے اس کو آگاہ کیا اور مزید بولا۔

"ان حالات کو سن کر آپ اندازہ کر سکتے ہیں کہ میں ایک مناسب ملازمت کے حصول کا کتنی شدت سے خواہش مند ہو سکتا ہوں۔ آپ نے اشتہار میں اس ملازمت کے لیے جو کوالیفکیشن مانگی تھی وہ میرے پاس تھی لیکن میں جانتا ہوں کہ صرف ڈگری اٹھا کر ملازمت کے حصول کے لیے انٹرویو دینے نہیں جایا جاتا۔ اپنی قابلیت سے پہلے اپنا سراپا بھی سلیقے سے پیش کرنا پڑتا ہے اور اس کے لیے لباس اور اچھے جوتے اہم لوازم ہیں۔ اچھے دنوں میں ایک عزیز کی شادی پر بنایا گیا یہ سوٹ میں نے عرصے سے سنبھال کر رکھا ہوا تھا لیکن جوتے کثرتِ استعمال سے خراب ہو گئے تھے۔ حسبِ جوتوں کی فکر میں مبتلا کل میں جمعے کی نماز پڑھنے گیا تو وہاں مجھے یہ جوتے نظر آ گئے اور مجھے لگا کہ میرا مسئلہ حل ہو گیا ہے۔ کسی بری نیت سے نہیں، صرف اور صرف اس انٹرویو کے لیے میں نے یہ جوتے مسجد سے حاصل کر لیے۔ ارادہ یہی تھا کہ انٹرویو سے فارغ ہو کر جوتے واپس مسجد میں لے جا کر رکھ دوں گا۔ معلوم نہیں تھا کہ اللہ کے گھر کی گئی پہلی چوری کا حساب اتنی جلدی اور اس جگہ دینا پڑے گا۔"

آخر میں میرے ہونٹوں پر خود بخود ہی ایک پھیکی سی بے جان مسکراہٹ دوڑ گئی۔ انٹرویو لینے والے نے میرا یہ پورا بیان بغیر کسی مداخلت کے خاموشی سے سنا اور بعد میں بھی کچھ دیر تک خاموشی سے میری طرف دیکھتا رہا۔ میں نظریں جھکا کر بیٹھا تھا اور اس کی خاموشی کے یہ پل میرے لیے کسی پل صراط سے کم نہیں تھے۔ میں نے بڑا دل کر کے ایک داؤ کھیلا تھا اور اب یہ دیکھنا یہ تھا کہ اس کا نتیجہ کیا نکلتا ہے۔

"تمہارے سچ نے مجھے خوش کیا۔ تم چاہے کتنا ہی اچھا جھوٹ بولتے مجھے دھوکا نہیں دے سکتے تھے کیونکہ یہ جوتے میرے ہی ہیں۔" اس کی آواز سماعتوں سے ٹکرائی تو میں نے دل میں "یاہو" کا نعرہ مارا اور خود کو شاباش دی کہ صحیح وقت پر بالکل صحیح اندازہ لگایا تھا۔ اس کا سوال سن کر مجھے یہی گمان گزرا تھا کہ ہو نہ ہو یہ جوتے اسی کے ہیں ورنہ کوئی دوسرا شخص انٹرویو لیتے وقت اتنا بیہودہ سوال کیسے کر سکتا تھا۔ بہرحال میں نے اپنی اندرونی خوشی کا تاثر چہرے پر نہیں آنے دیا اور وقت کے تقاضے کے مطابق شرمندگی اور ندامت سجائی۔

"میں کوئی نمازی آدمی نہیں ہوں لیکن کل اتفاق سے ایک پارٹی کو پروجیکٹ دکھانے لے گیا تو راستے میں ہی نماز کا ٹائم ہو گیا۔ وہ نمازی ٹائپ کے بندے تھے چنانچہ ان کی خواہش پر مجھے بھی ان کے ساتھ نماز پڑھنے کے لیے مسجد میں جانا پڑا۔ واپسی میں جوتے غائب تھے۔" اب وہ دوستوں کی طرح مجھے خود پر گزرے واقعے کے بارے میں بتا رہا تھا۔

"آئی ایم ویری سوری سر۔ میں نے آپ کو بتایا نا کہ میں نے کس مجبوری کے تحت اور کس نیت سے آپ کے جوتے چرائے تھے۔" میں نے اس بار زبان سے بھی اظہارِ شرمندگی کو ضروری سمجھا۔

"اٹس اوکے۔ جو ہوا سو ہوا۔ شاید اسی طرح ہماری

ملاقات طے تھی۔ اس واقعے کے سبب مجھے تمھیں زیادہ اچھی طرح سمجھنے کا موقع ملا ہے۔ تمہارے سچ نے مجھے متاثر کیا ہے۔ اچھا یہ بتاؤ کہ کیا تم پابندی سے نماز پڑھتے ہو؟'' بولتے بولتے اس نے اچانک ہی سوال کیا۔

''نہیں، بس جمعے کے جمعے حاضری لگانے چلا جاتا ہوں۔'' میں بھی آج صاف گوئی کے ریکارڈ قائم کرنے پر تلا ہوا تھا کیونکہ محسوس یہی ہو رہا تھا کہ سچ بولنے سے فائدہ ہو رہا ہے ورنہ جھوٹ بولنا بھی میرے لیے کوئی ایسا کام دشوار نہیں تھا۔ مجھے اس فن میں بھی ٹھیک ٹھاک مہارت حاصل تھی۔

''مسٹر کامران احمد!'' اس نے اپنی اندر تک اتر جانے والی آنکھیں میری آنکھوں پر فوکس کیں اور کچھ ایسے انداز میں میرا نام پکارا کہ میں ہمہ تن گوش ہو گیا۔

''تم سے بات کر کے محسوس ہوتا ہے کہ تم ہی ہمارے مطلوبہ فرد ہو اس لیے میں نے اس ملازمت کے لیے تمہارا انتخاب کر لیا ہے۔ تین ماہ کی آزمائشی مدت میں اگر تم نے اپنے انتخاب کو درست ثابت کر دکھایا تو تمہاری جاب مستقل ہو جائے گی اور سیلری میں اضافے کے علاوہ وہ ساری مراعات حاصل ہوں گی جو ہم اپنی کمپنی کے ملازمین کو دیتے ہیں۔'' آخرکار اس نے مژدہ سنا دیا۔ پہلے ہی کچھ کچھ اندازہ ہو جانے پر مجھ پر شادیٔ مرگ کی سی کیفیت طاری ہونے لگی۔ کیسا عجیب واقعہ ہوا تھا کہ انٹرویو لینے والے نے نہ تو میرے ڈاکومنٹس دیکھے تھے اور نہ ہی مجھ سے کوئی پیشہ ورانہ سوال کیا تھا اور میں صرف اور صرف ایک جوتے کی جوڑی چرانے کی وجہ سے منتخب کر لیا گیا تھا۔

''تم کچھ دیر باہر بیٹھو۔ میں تمہارا اپائنٹمنٹ لیٹر جاری کرنے کا آرڈر دیتا ہوں۔ لیٹر ساتھ لے کر ہی گھر جانا۔'' اس کے یہ الفاظ میں نے خواب کے سے عالم میں سنے اور کرسی سے اٹھ کھڑا ہوا۔ اسی وقت میری نظر اپنے پیروں میں موجود جوتوں پر پڑی۔

''یہ شوز سر۔۔۔'' میں صرف اتنا ہی کہہ سکا۔

''اب یہ تم ہی رکھ لو۔ تمہارے پیروں میں جچ رہے ہیں۔'' اس نے بے نیازی سے جواب دیا تو میں نے یہ سوچتے ہوئے قدم باہر کی طرف بڑھا دیے کہ کیسا عجیب اتفاق ہے کہ ایسے شخص کے جوتے کا ناپ مجھ جیسے ٹھیک ٹھاک قد کاٹھ کے بندے کے برابر ہے۔ یعنی اس کے پاؤں اپنی جسامت کی مناسبت سے زیادہ بڑے تھے اور یقیناً اپنی شخصیت سے متضاد اتنے بڑے جوتے اس پر قطعی نہیں جچتے ہوں گے۔

☆☆☆

اس روز اپائنٹمنٹ لیٹر ہاتھ میں لیے میں ایچ ایچ بلڈرز کے دفتر سے نکلا تو میرا چہرہ خوشی سے کھلا پڑ رہا تھا۔ خوشی کی اس کیفیت میں مجھے بس اسٹاپ پر دھوپ میں کھڑے ہو کر بس کا انتظار کرنے میں بھی کوئی کوفت محسوس نہیں ہو رہی تھی۔ دوپہر کا وقت ہونے کی وجہ سے اسٹاپ پر زیادہ رش نہیں تھا شاید اسی وجہ سے بائیک پر وہاں سے گزرتے میرے دوست فرباد کی مجھ پر نظر پڑ گئی اور اس نے بائیک میرے قریب روک دی۔

''اوئے کالی۔۔۔ یہاں کیسے یار؟'' اس نے مجھ سے گرم جوشی سے ہاتھ ملاتے ہوئے کہا۔

''بس یار یہاں انٹرویو دینے آیا تھا۔'' میں نے اسے بتایا۔

''پھر کیا رہا؟'' اس نے تجسس سے پوچھا پھر شاید خود ہی میرے چہرے کے تاثرات سے اندازہ ہو گیا سو زرا جوش سے بولا۔ ''لے بھئی لے۔ لگتا ہے اپنا شیر بازی جیت کر آ رہا ہے۔''

''ہاں یار، اس بار لک کام کر گئی۔'' مجھے خود بھی کسی سے یہ خوشی بانٹنے کی بے چینی تھی۔ فوراً ہی اسے اطلاع دی، اس نے بھی مجھے مبارک باد دے اور گلے لگانے میں کوئی تاخیر نہیں کی۔

''بڑی اچھی خبر سنائی تو نے۔ سن کر دل خوش ہو گیا۔ چل اب اس خوشی میں بھائی کو اچھی سی ٹریٹ تو دے دے۔'' مبارک باد کے بعد اس نے وہی مطالبہ کیا جو ایسے موقعوں پر دوستوں کی طرف سے ہوتا ہے لیکن میری جیب اس مطالبے کو پورا کرنے کی پوزیشن میں نہیں تھی اس لیے مجھے اس سے معذرت کرنی پڑی۔

''ابھی نہیں یار، سیلری کے بعد ہی یہ ٹریٹ وغیرہ کا چکر رکھیں گے۔''

''چل ٹھیک ہے جیسی تیری سہولت لیکن دیکھ بھولنا نہیں۔'' اس نے فوراً ہی ڈال دی۔ دوست تھا اتنا تو سمجھ ہی سکتا تھا کہ میرے انکار کا کیا سبب ہو گا۔

''نہیں بھولوں گا بابا پر ابھی تو جانے دے۔ وہ دیکھ میرے روٹ کی بس آ رہی ہے نکل گئی تو پھر گرمی میں گھنٹا بھر انتظار کرنا پڑے گا۔'' میں نے دور سے آتی بس کو دیکھ کر کچھ بے تابی کا مظاہرہ کیا۔

''کیا بات کرتا ہے۔ چل سیدھی طرح میرے پیچھے بیٹھ جا۔ میں چھوڑ دوں گا تجھے۔'' اس نے ایسے لہجے میں کہا

کہ مجھے انکار کی ہمت ہی نہیں ہوئی۔ وہ سڑکوں پر بائیک دوڑاتا اور اونچی آواز سے مجھ سے باتیں بھی کرتا رہا۔ وہ شاید ایسا لاابالی اور ملنسار سا لڑکا۔ دورانِ تعلیم بھی پورے ڈپارٹمنٹ میں شاید ہی کوئی ایسا شخص ہو جس سے اس کی جان پہچان نہ ہو۔ ہر ایک سے کھلے دل سے ملتا اور ہر دم ہنستا مسکراتا رہتا۔ مزاج کی اس خوش گواری میں شاید کچھ دخل مالی آسودگی کا بھی تھا۔ اب بھی اس نے بائیک اچانک ایک ریسٹورنٹ کے سامنے لے جا کر روک دی۔

”یہاں کہاں؟“ میں نے اسے ٹوکا۔

”لنچ ٹائم ہے۔ چل کر کوئی پزا شزا کھاتے ہیں۔ تھوڑی دیر گپ شپ بھی رہے گی۔ اتنے عرصے بعد ملے ہیں ذرا ڈھنگ سے ایک دوسرے کا حال احوال تو معلوم کرلیں۔“ وہ میرا ہاتھ تھام کر مجھے ریسٹورنٹ میں لے گیا۔ اندر کے ٹھنڈے ماحول میں پہنچ کر میرا موڈ بھی خوش گوار ہو گیا اور پھر واقعی ہم نے دل کھول کر باتیں کیں اور ایک دوسرے کو یونیورسٹی سے پاس آؤٹ کرنے کے بعد کے حالات سے آگاہ کرتے رہے۔ وہ حسب توقع اپنے والد کے کاروبار میں ان کا ہاتھ بٹا رہا تھا لیکن چونکہ والد صاحب ابھی تک خود خاصے ایکٹو تھے اس لیے اس پر کوئی خاص ذمے داری نہیں تھی۔ میں نے بھی اپنے حالات کی تنگی کا احوال کچھ کاٹ چھانٹ کر اس کے گوش گزار کر دیا۔ وہ ذہین تھا یقیناً وہ سب بھی سمجھ گیا ہوگا جو میں نے کھل کر نہیں بتایا۔ اس نے موضوعِ گفتگو بہت خوب صورتی کے ساتھ یونیورسٹی کے سنہری دنوں کی طرف موڑ دیا اور ہم یادوں کو دہرانے لگے۔ وقت کتنی تیزی سے گزرا ہمیں خود اندازہ نہیں ہو سکا۔ کئی گھنٹے ایک دوسرے کے ساتھ گزارنے کے بعد جب اس نے مجھے میرے گھر کے قریب ڈراپ کیا تو... سہ پہر ڈھل چکی تھی۔ دروازہ صدف نے کھولا۔ اس کے چہرے پر بے چینی اور پریشانی رقم تھی۔ مجھے دیکھ کر اس نے واضح طور پر سکون کا سانس لیا۔

”کہاں رہ گئے تھے؟ اتنی دیر لگا دی یہاں سب کو پریشانی ہونے لگی تھی۔“ اس نے کچھ خفگی سے کہا۔

”بس یار! باس کے آفس کے آگے چوکڑی مار کر بیٹھ گیا تھا کہ ملازمت دو گے تو یہاں سے جاؤں گا ورنہ نہیں۔“ میں نے شوخ لہجے میں جواب دیا تو اس نے چونک کر مجھے دیکھا۔

”کاشی! آپ کو جاب مل گئی۔“ خوشی کے مارے اس کی آواز کانپنے لگی تھی۔

”جی ہاں، میں تمہیں یہی بتا رہا ہوں۔“ میرے تو ثیق کر دینے پر اس کا چہرہ کھل اٹھا پھر ذرا ہی دیر میں پورے گھر میں یہ خوش خبری پھیل چکی تھی۔ اوپر سے چچا کی فیملی بھی پوری کی پوری اتر کر آ گئی۔ چچا نے فوراً مٹھائی منگوا کر سب کو کھلائی۔ سارا گھر ایسے خوش تھا کہ جیسے آج عید کا دن ہو۔ صدف کا چہرہ تو مارے خوشی کے جگمگانے لگا تھا۔ امی کا بھی کچھ ایسا ہی حال تھا۔ وہ بار بار اللہ کا شکر ادا کر رہی تھیں کہ اس نے ان کی سن لی۔ چچا کی فیملی بھی اس خوشی میں ہمارے ساتھ برابر کی شریک تھی لیکن وہ لوگ بس آدھا پون گھنٹا ہی نیچے ٹھہرے پھر چچی کے اشارے پر صدف سمیت تینوں بیٹیاں ان کے ساتھ اوپر چلی گئیں۔ ان لوگوں، خاص طور پر صدف کے چلے جانے سے میں کچھ بجھ سا گیا لیکن پھر چچا کی وضاحت نے سارا تکدر دور کر دیا۔ انہوں نے بتایا۔

”عاطفہ کے رشتے کے سلسلے میں کچھ لوگ آنے والے ہیں۔ تمہاری چچی اور بچیوں کو اسی سلسلے میں کچھ انتظامات کرنے ہیں۔ اس لیے جلدی اٹھ گئی ہیں۔ لیکن رات کو میری طرف سے دعوت پکی ہے۔ رات کا کھانا سب لوگ اوپر ہی کھائیں گے۔“

”اس تکلف کی کیا ضرورت ہے چچا جان؟“ میں نے اخلاقاً انہیں منع کرنا چاہا۔

”تکلف کیسا؟ اپنے بیٹے کی خوشی میں خوش ہونے کا ہمیں بھی حق ہے۔“ وہ صوفے پر میرے برابر میں ہی بیٹھے ہوئے تھے چنانچہ آسانی سے مجھے اپنے بازو کے گھیرے میں لے لیا۔ امی دیکھ کر مسکرانے لگیں۔ تھوڑی دیر بعد چچا بھی اٹھ کر اوپر چلے گئے۔ امی سے شاید وہ لوگ پہلے ہی کہہ چکے تھے اس لیے جب رشتے کے سلسلے میں مہمان آئے تو امی بھی اوپر پہنچ گئیں۔ مہمانوں کے جانے کے بعد چچا کے پورشن میں ہم سب کی محفل جمی۔ چچی اور صدف کی محنت سے تیار کیے گئے پُرتکلف اور ذائقے دار کھانے نے خوشی کا مزہ دوبالا کر دیا۔ رات گئے جب ہم سونے کے لیے نیچے آئے تو میں سوچ رہا تھا کہ ابا کے انتقال کے بعد یہ میری زندگی میں آنے والا پہلا دن تھا جو آغاز سے انجام تک اتنا خوش گوار رہا تھا اور یہ سب اس لیے تھا کہ میں ایک مناسب جاب حاصل کرنے میں کامیاب ہو گیا تھا۔ اچھی جاب کا مطلب تھا گھر کے ان بہت سے مسائل کا حل جو پیسے سے جڑے ہوئے تھے لیکن خوشی کا پیسے سے گہرا تعلق تھا ورنہ اس گھر کے مکین تو کل تک وہی تھے لیکن ایسی خوشی اور طمانیت کا کہیں گزر نہیں تھا۔

☆☆☆

ایچ ایچ بلڈرز کے آفس میں میرا پہلا دن بہت اچھا گزرا۔ چیف اکاؤنٹنٹ سہیل صاحب نے بہت دوستانہ انداز میں مجھے میرے کام کی نوعیت سمجھائی۔ ساتھ ہی یہ تسلی بھی دے دی کہ کوئی کام سمجھ نہ آنے کی صورت میں گھبرانے یا پریشان ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ میں جب چاہوں ان سے کسی بھی مسئلے کے حل کے لیے رابطہ کر سکتا ہوں۔ میں نے اس مہربانی پر ان کا شکریہ ادا کیا اور تن دہی سے ان فائلوں کے مطالعے میں مصروف ہو گیا جو انہوں نے میرے حوالے کی تھیں۔ آرام دہ اور خوش گوار ماحول میں بیٹھ کر کام کرنا مجھے خود بھی بہت اچھا لگ رہا تھا۔ میں تقریباً ڈیڑھ دو گھنٹے تک فائلوں کے مطالعے میں غرق رہا۔ کمپیوٹر سے بھی چھیڑ چھاڑ کی لیکن طبیعت کی بشاشت پر کوئی فرق نہیں پڑا۔ بارہ کے قریب میرے سامنے رکھا انٹرکام بجا اور اطلاع ملی کہ باس مجھے اپنے آفس میں یاد کر رہے ہیں۔ میں فوراً کرسی سے کھڑا ہو گیا اور اپنے حلیے پر ایک طائرانہ سی نگاہ ڈال کر مطمئن ہونے کے بعد باس کے سامنے حاضری کے لیے روانہ ہو گیا۔ باس وہی صاحب تھے جنہوں نے مجھے اس ملازمت کے لیے منتخب کیا تھا اور جن کا چہرہ اترا ہوا تھا میں اس وقت بھی بیٹھے ہوئے تھا۔ ان کے دائیں جانب قریباً انیس بیس سال کی ایک لڑکی جدید تراش خراش کا سوٹ پہنے بے نیاز بلکہ قدرے بیزاری بیٹھی ہوئی تھی۔

"مسٹر کامران! ان سے ملیے یہ ہیں ایچ ایچ بلڈرز کی اونر اور میری بھتیجی ہانیہ حسین۔" مجھے کرسی پر بیٹھنے کا اشارہ کرنے کے بعد باس نے میرا اس کی سے تعارف کروایا۔ تعارف نے مجھے بوکھلا دیا اور میں نے جلدی سے ہانیہ حسین کو سلام کیا۔ اس نے محض سر کی معمولی سی جنبش سے میرے سلام کا جواب دیا اور پہلے کی طرح بے نیاز ہو گئی۔

"ہانیہ کا کام فائنل ایئر کی اسٹوڈنٹ ہے۔ آگے اس کا ایم بی اے کرنے کا ارادہ ہے۔ اپنی تعلیمی مصروفیت کی وجہ سے یہ آفس کو وقت نہیں دے پاتی اس لیے میں نے وقتی طور پر یہ ذمے داری سنبھال رکھی ہے۔" باس فیصل رضا نے اس کے بارے میں کچھ اور معلومات فراہم کیں لیکن وہ یوں بیٹھی رہی جیسے اس کے بجائے کسی اور کا ذکر ہو رہا ہو۔

"آپ سے مل کر خوشی ہوئی۔" میں ملازم تھا اس کی طرح بے نیازی تو دکھا نہیں سکتا تھا اس لیے اخلاقاً یہ رسمی جملہ کہہ ڈالا جس کے جواب میں اس کی طرف سے کوئی ردعمل ظاہر نہیں ہوا۔

"ہانیہ! یہ کامران احمد ہیں۔ میں نے انہیں اکاؤنٹس ڈپارٹمنٹ کے لیے اپائنٹ کیا ہے اور انہوں نے آج ہی سے جوائن کیا ہے۔" باس صاحب اب تعارف کی باقی رسم نبھا رہے تھے۔

"گڈ!" اس نے اپنے اسی بے نیاز انداز میں میری طرف دیکھ کر یہ واحد لفظ ادا کیا اور پھر نگاہوں کا رخ موڑ کر فیصل صاحب سے مخاطب ہوئی۔ "اوکے انکل، میں چلتی ہوں۔ مجھے کسی کام سے جانا ہے۔"

"ٹھیک ہے جیتی رہو۔" فیصل صاحب نے اسے جواب دیا۔ ویسے وہ ان کے جواب دینے سے قبل ہی اپنی سیٹ چھوڑ چکی تھی۔

"میرے بڑے بھائی عنایت حسین کی دو سال قبل ایک روڈ ایکسیڈنٹ میں ڈیتھ ہو گئی تھی۔ ان کی وائف ہانیہ کی پیدائش پر ہی دنیا سے رخصت ہو گئی تھیں۔ بھائی صاحب نے ہانیہ کی خاطر دوسری شادی نہیں کی اور بہت لاڈ پیار سے اس کی پرورش کی۔ یہی وجہ ہے کہ دو سال گزر جانے کے باوجود یہ ابھی تک خود کو مکمل طور پر سنبھال نہیں سکی ہے اور اسی طرح لوگوں سے اکھڑی اکھڑی رہتی ہے۔" فیصل صاحب نے غالباً اس کے رویے کی وضاحت کے لیے مجھے یہ ساری تفصیل سنائی تھی۔ سن کر واقعی مجھے ہانیہ حسین سے ہمدردی محسوس ہوئی۔

"بہت افسوس ہوا سر! میں اندازہ کر سکتا ہوں کہ اتنی عزیز ہستی کے اچانک بچھڑ جانے پر مس ہانیہ پر کیا گزر رہی ہو گی۔" میں نے اظہار افسوس کیا۔

"اسے دیکھ دیکھ کر میرا دل کڑھتا ہے۔ یہ میرے مرحوم بھائی کی نشانی ہے اور میری سمجھ میں نہیں آتا کہ کیسے اس کے لیے خوشی کا سامان کروں۔" فیصل صاحب کے چہرے پر گہری اداسی تھی۔

"آپ پریشان نہ ہوں سر، وقت بہت بڑا مرہم ہے۔ انسان کے سارے زخم مندمل کر دیتا ہے۔ مس ہانیہ بھی آگے زندگی کی مصروفیات میں بہت کچھ بھول جائیں گی خاص طور پر شادی اور بچوں وغیرہ کی آمد سے بہت فرق پڑتا ہے۔" میں نے بڑے خلوص سے ان کی اداسی دور کرنے کی کوشش کی۔

"ہاں یہ تو تم ٹھیک کہہ رہے ہو۔ میں بھی اسی طرح سوچتا ہوں اور آج کل ہانیہ کے لیے کوئی اچھا لڑکا تلاش کرنے کی کوشش کر رہا ہوں۔" انہوں نے مجھے کچھ غور سے دیکھا اور پھر موضوع بدل کر بولے۔ "خیر تم بتاؤ آفس پسند

آیا؟''

''جی سر، بہت اچھا ہے۔'' میں نے پوری سچائی سے جواب دیا۔ اس کے بعد ہمارے درمیان اسی حوالے سے مزید چند جملوں کا تبادلہ ہوا پھر انہوں نے مجھے اپنے آفس سے جانے کی اجازت دے دی۔ اس کے بعد بھی آفس میں میرا سارا دن بہت اچھا گزرا۔ سب سے اچھی بات یہ ہوئی کہ کیشیئر نے جیبی سے نقل مجھے ایڈوانس میں ہاف سیلری کا لفافہ تھما دیا۔ ظاہر ہے یہ بھی باس کی ہدایت کے مطابق تھا۔ شاید میری مالی حالت کا اندازہ ہونے کے سبب انہوں نے یہ مہربانی کی تھی۔ بہرحال میں بہت خوش تھا اسی لیے چھٹی کے بعد گھر پہنچا تو بھی چہرے پر تازگی اور بشاشت تھی۔

''بھائی تو ایسے فریش واپس آئے ہیں جیسے پکنک منا کر آ رہے ہوں۔'' ننھے کھٹے سی شانتا نے مجھے دیکھ کر بے ساختگی سے تبصرہ کیا۔

''تمہارے بھائی کو جاب ہی اتنی شاندار ملی ہے کہ تھکن کا احساس ہی نہیں ہو رہا۔'' میں نے کالر جھاڑتے ہوئے ذرا شوخی ماری۔

''ماشاء اللہ، اللہ نظر بد سے بچائے۔'' دونی نے فوراً کہا۔ مجھے خوش دیکھ کر وہ بھی خوش نظر آ رہی تھیں۔ میں نے جا کر کپڑے وغیرہ تبدیل کیے پھر واپس ان کے پاس آیا تو چچا اور چچی بھی وہیں موجود تھے۔ دونوں میرے آفس میں گزرنے والے پہلے دن کے بارے میں سوال جواب کرنے لگے۔ اس دوران صدف بھی چائے کی ٹرے اٹھائے وہیں آ گئی اور چہرے پر چمک لیے میری بتائی تفصیلات سنتی رہی۔

''اللہ کا شکر ہے کہ تمہیں اچھی جگہ ملازمت مل گئی ہے ورنہ آج کل تو ملازمت ملنے کے بعد ایڈجسٹمنٹ کا بھی بہت مسئلہ ہوتا ہے۔ کہیں مالکان سخت گیر ہوتے ہیں تو کہیں اپنے ہی کولیگز جڑیں کاٹنے لگتے ہیں اور دونوں ہی صورتوں میں جاب جاری رکھنا مسئلہ بن جاتا ہے۔ شکر ہے کہ یہاں تمہیں دونوں ہی طرح کے مسائل کا سامنا نہیں ہے۔'' تفصیلات سن کر چچا نے تبصرہ کیا۔

''جی بس آپ سب کی دعائیں ساتھ تھیں جو اللہ نے میرے لیے یہ بندوبست کر دیا۔'' میں نے تابعداری سے یہ جملہ ادا کرتے ہوئے بطور خاص صدف کی طرف دیکھا۔ میرے انٹرویو کے لیے جاتے ہوئے وہی سب سے زیادہ پر یقین تھی کہ میں کامیاب لوٹوں گا کیونکہ بقول اس کے اس نے بہت دعائیں کی تھیں۔

''بزرگوں کا تو کام ہی دعا دینا ہے بیٹا۔ بس آگے یہ تم لوگوں پر ہے کہ اپنے لیے کن راہوں کا انتخاب کرتے ہو۔ محنت اور ایمانداری کو ہمیشہ اپنا اصول بنائے رکھو۔ انشاءاللہ... بہت ترقی کرو گے۔'' چچا نے مجھے نصیحت کی۔ ہر نوجوان کی طرح میں نصیحت سننے کا شوق بالکل نہیں رکھتا تھا لیکن چچا کے لحاظ میں فرمانبرداری کا مظاہرہ کرتا رہا۔ میری ایک ایک رگ سے واقف صدف اس صورت حال سے محظوظ ہوتی مسکراتے لبوں سے چائے کی پیالیاں سمیٹ کر ٹرے میں رکھنے کے بعد کمرے سے باہر نکل گئی۔

''ارے ہاں یاد آیا چچی۔ وہ عاشفہ کے رشتے کا کیا ہوا؟ ان لوگوں نے دوبارہ کوئی رابطہ وغیرہ کیا۔'' چچا کی گفتگو میں وقفہ آیا تو میں نے موضوع گفتگو بدلنے کے خیال سے چچی کو مخاطب کرتے ہوئے پوچھا۔

''ہاں فون آیا تو تھا لیکن ہماری سمجھ میں نہیں آ رہا کہ کیا جواب دیں۔'' چچی نے آہستہ سے جواب دیا۔

''کیا مطلب! لڑکے کا بائیو ڈیٹا تو بڑا اچھا تھا اور آپ کے مطابق لوگ بھی بہت اچھے ہیں پھر یہ تذبذب کیسا؟ اگر لڑکے اور اس کے گھر والوں کے بارے میں کسی قسم کی چھان بین کروانی ہو تو اس کے لیے میں حاضر ہوں۔'' میرے لیے ان کا جواب خاصا مبہم تھا اس لیے میں نے ذرا وضاحت چاہی۔

''چھان بین کا تو اتنا خاص مسئلہ نہیں ہے بیٹا۔ وہ لوگ میری بہن کے سسرالی رشتے داروں میں سے ہیں اور میرے بہنوئی ان کی ہر طرح کی ضمانت لینے کے لیے تیار ہیں۔ خود میں بھی ان لوگوں سے واقف ہوں لیکن انہوں نے مطالبہ ہی ایسا کیا ہے کہ میں اور تمہارے چچا کشمکش میں پڑ گئے ہیں۔'' چچی نے وضاحت بھی کی تو ویسی کہ میرے لیے کچھ نہیں پڑا۔ امی بھی سوالیہ نظروں سے ان کی طرف دیکھنے لگیں۔

''کیسا مطالبہ؟ کہیں انہوں نے جہیز میں کسی قیمتی چیز کی فرمائش تو نہیں کر دی۔ اگر ایسا ہے تو صاف انکار کر دیں۔ لالچی لوگوں کے ساتھ ساری زندگی نباہ نہیں ہوتے۔'' میں نے خود ہی اندازہ قائم کرتے ہوئے مشورے سے بھی نوازا۔

''ارے نہیں بیٹا، ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ ایسے اوچھے لوگ نہیں ہیں وہ۔ ان کے پاس تو خود اللہ کا دیا سب کچھ موجود ہے۔ انہیں اگر جہیز وغیرہ کا لالچ ہوتا تو ہمارے جیسے سفید پوش گھرانے کا رخ ہی کیوں کرتے۔ ان کی تو کوئی اور ہی خواہش ہے۔''

''آخر کیا خواہش ہے ان کی؟ تم پہلیاں بجھوانے کے بجائے سیدھے سیدھے بتا ہی ڈالو۔'' اس بار امی نے چچا کے مبہم جوابوں سے جھنجلا کر روٹوک پوچھا تو وہ ذرا جھینپ گئیں پھر چچا کو اشارہ کیا۔ ان کے اشارے پر چچا کھنکھار کر گلا صاف کرتے ہوئے قدرے پست آواز میں بولے۔

''بات یہ ہے بھابی جان کہ وہ ہمارے گھر رشتہ کرنے کے خواہش مند تو ہیں لیکن انہیں عاشفہ سے زیادہ صدف بھا گئی ہے۔ بڑی ہونے کی وجہ سے اصولاً پہلا حق ہے بھی صدف کا لیکن ہم اماں کی کہی بات کے لحاظ میں اس کے معاملے میں خاموشی اختیار کیے ہوئے ہیں۔ میں نے تو اس بار بھی ساجدہ سے کہہ دیا تھا کہ ان لوگوں کو صاف بتا دو کہ صدف اپنی تائی کی بہو بنے گی لیکن یہ ذرا سوچ بچار میں پڑ گئی ہے۔ اس کا کہنا ہے کہ اماں نے جو بات کہی بھی جانے اسے آپ لوگوں نے سیریس لیا بھی تھا یا نہیں۔ بچپن کی بات الگ ہوتی ہے، بڑے ہونے کے بعد بچے مختلف طبیعتوں کے نکلتے ہیں۔ اللہ جانے آپ کو ہماری صدف بہو کی حیثیت سے قبول بھی ہے یا نہیں۔ اس کے علاوہ کامران میاں کو بھی کوئی اعتراض ہو سکتا ہے۔ ہو سکتا ہے صدف ان کے معیار پہ پوری نہ اترتی ہو یا کسی بھی اور وجہ سے یہ اس رشتے کو جوڑنے میں دلچسپی نہ رکھتے ہوں تو صدف بے چاری کو خوامخواہ انتظار میں لٹکانے کا کیا فائدہ ہوگا اس لیے بہتر ہے کہ ہم اتنا اچھا رشتہ ہاتھ سے نکالنے کے بجائے پہلے کھل کر آپ سے بات کر لیں۔'' چچا نے ساری بات کھول کر سامنے رکھ دی تو ہم پر صورتِ حال واضح ہوئی۔ امی نے سکون سے ساری بات سنی اور پھر اطمینان سے بولیں۔

''اماں نے صدف کو کامران سے منسوب کرنے کا جو فیصلہ سنایا تھا وہ مجھے ہمیشہ یاد رہا لیکن کبھی تجدید اسی غرض سے نہ کی کہ نا معلوم بڑے ہونے کے بعد بچوں کا کیا رجحان ہو۔ جہاں تک میری پسند کی بات ہے مجھے صدف دل و جان سے قبول ہے۔ اسے اپنی بہو بنا کر مجھے بہت اچھا لگے گا البتہ کامران کی رائے میں ابھی آپ کے سامنے ہی معلوم کر لیتی ہوں۔ کیوں کامران...... تم کیا کہتے ہو؟''

امی اچانک مجھ سے مخاطب ہوئیں تو میں تھوڑا سا گڑبڑا گیا لیکن انکار کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ صدف کو میں ہمیشہ سے خاص حوالے سے ہی دیکھتا آیا تھا اور اپنی تمام تر دلکشی کے ساتھ وہ میرے دل پر قابض بھی تھی۔ بہرحال چچا کے سامنے قلبی کیفیت تو کھل کر بیان نہیں کی جا سکتی تھی اس لیے نہایت برخوردارانہ انداز میں بولا۔ ''جیسی آپ بزرگوں کی مرضی۔ آپ لوگوں نے سوچ سمجھ کر ہماری بہتری کے لیے ہی یہ فیصلہ کیا ہوگا۔''

''جیتے رہو بیٹا! تم نے میرا مان رکھ لیا۔ تم میرے مرحوم بھائی کی نشانی ہو اور کسی بھی دوسرے شخص کے مقابلے میں مجھے تمہیں اپنا داماد بنا کر زیادہ خوشی ہوگی۔'' دل گیر لہجے میں بولتے ہوئے چچا نے اپنے بازو وا کیے تو میں فوراً ان کی چھاتی سے جا لگا۔ ہم دونوں ہی کی گرفت میں خاصا جوش تھا اس لیے ہم ایک دوسرے کی دلی کیفیت کا اندازہ لگا سکتے تھے۔ میں ان کے سینے سے لگا ابا کی شفقت کو یاد کر رہا تھا تو وہ بھی مجھ سے اپنے بیٹے کی محرومی کو مٹانے کی کوشش کر رہے تھے۔

''اب تو تمہیں کوئی الجھن نہیں ہے نا ساجدہ۔ اب صدف بیٹی کی طرف سے بے فکر ہو جاؤ۔ کامران اپنی جاب پر اچھی طرح سیٹ ہو جائے تو میں باقاعدہ خاندان میں مٹھائی تقسیم کروا کر اس رشتے کا اعلان کر دوں گی۔'' امی، چچی کو مخاطب کرتے ہوئے یہ سب کہہ رہی تھیں اور میری نظریں دروازے پر منڈلا رہی تھیں۔ مجھے وہاں صدف کے دھانی آنچل کی جھلک نظر آئی جس کا مطلب تھا کہ کمرے میں ہونے والی گفتگو سے وہ بھی واقف ہو گئی ہے۔ اس کی دلی کیفیت کا تصور کر کے میرے ہونٹ خود بخود مسکرا اٹھے۔

☆☆☆

ایچ ایچ بلڈرز میں ملازمت کرتے ہوئے مجھے ہفتہ ہو چلا تھا۔ خوش گوار ماحول اور کولیگز کے تعاون نے مجھے بہت جلد وہاں ایڈجسٹ کر دیا تھا۔ میں بھی محنت سے اور دل لگا کر وہاں کام کر رہا تھا۔ فیصل صاحب کا سلوک بھی میرے ساتھ بہت اچھا تھا۔ روزانہ کم از کم ایک بار میری ان سے ملاقات ضرور ہوتی تھی۔ پیشہ ورانہ امور پر گفتگو کرنے کے ساتھ ساتھ وہ مجھ سے دیگر موضوعات پر بھی ہلکی پھلکی گفتگو کر لیا کرتے تھے۔ ان گفتگو کے نتیجے میں جہاں انہیں میرے حالات سے اچھی طرح واقفیت ہو گئی تھی وہیں مجھے بھی بہت کچھ جاننے کا موقع ملا تھا۔ میں جان چکا تھا کہ اس کمپنی میں ان کے صرف دس فیصد شیئرز ہیں جبکہ باقی شیئرز کے مالک ان کے مرحوم بھائی عنایت حسین تھے۔ اصل میں دونوں بھائیوں کا شمار چھوٹے کاروباری افراد میں ہوتا تھا لیکن خوش قسمتی سے عنایت صاحب ہانیہ کی والدہ صوفیہ کو بھا گئے۔ صوفیہ کے والد ایک بڑے بزنس مین تھے

اس لیے جہیز میں وہ اپنے ساتھ بے شمار دولت لے کر آئیں۔ یہ دولت اتنی تھی کہ عنایت حسین چاہتے تو اپنا علیحدہ کاروبار سیٹ کر سکتے تھے لیکن انہوں نے چھوٹے بھائی کو خود سے الگ کرنا پسند نہیں کیا۔ یوں دونوں بھائی واضح فرق کے باوجود ایک دوسرے کے ساتھ رہے۔ فیصل کو اندازہ تھا کہ بھائی کے ساتھ جڑے رہنے میں انہیں جو فائدہ ہے وہ اپنے الگ کاروبار سے ہرگز نہیں ہو سکتا چنانچہ وہ ساری زندگی بھائی کے احسان مند رہے اور اب ان کے دنیا سے چلے جانے کے بعد بھی اس کمپنی کو سنبھالے ہوئے تھے۔ انہیں اپنی بھتیجی ہانیہ حسین سے بھی بہت زیادہ محبت کا دعویٰ تھا اور میرے سامنے متعدد بار انہوں نے اس بات کا اظہار کیا تھا کہ جوں ہی ہانیہ کے لیے کوئی معقول لڑکا نظر آیا وہ اس کی شادی میں تاخیر نہیں کریں گے۔ معقول لڑکے کے لیے ان کا کیا معیار تھا اس کا مجھے علم نہیں تھا کیونکہ جہاں تک میرا اندازہ تھا ہانیہ جیسی دولت مند لڑکی سے شادی کے خواہش مند بہت ہوں گے۔ اس کی سب سے بڑی خوبی یہی تھی کہ وہ بہت دولت مند تھی۔ شکل صورت کی بھی بری نہیں تھی اگر کوئی کمی تھی بھی تو وہ پہننے اوڑھنے کے سلیقے سے پوری ہو جاتی تھی۔ دولت یوں بھی انسان کے بہت سے عیب چھپا لیتی ہے۔ میں نے اس ایک ہفتے کے دوران اسے صرف دو بار وہاں دیکھا تھا۔ کچھ بے نیازی لڑکی تھی۔ آس پاس موجود لوگوں پر نظر بھی نہیں ڈالتی تھی بلکہ مجھے تو ایسا لگتا تھا کہ وہ کسی الجھن میں مبتلا بس اپنے آپ میں ہی مگن رہتی ہے۔ خیر مجھے ان سب باتوں سے کیا لینا دینا تھا۔ میں خوش تھا کہ ایک اچھی ملازمت مل گئی ہے جس میں معقول تنخواہ کے ساتھ ساتھ بہت سی دیگر مراعات بھی حاصل تھیں۔ چھٹی بھی ہفتہ اتوار دو دن کی ہوتی تھی۔

یہ ہفتے والے دن کا ذکر ہے میں اپنے کیبن میں بیٹھا تن دہی سے کام نمٹانے میں مصروف تھا۔ آفس ٹائم ختم ہونے والا تھا اس لیے میری خواہش تھی کہ جلد از جلد کام مکمل کرلوں لیکن اس سے قبل ہی فیصل صاحب نے مجھے اپنے آفس میں بلوالیا۔ ہانیہ بھی وہیں موجود تھی۔ میں نے اسے سلام کیا جس کا اس نے سر کی معمولی جنبش سے جواب دیا۔

”آؤ بھئی کامران، اصل میں اس وقت میں نے تمہیں ایک ذاتی کام سے زحمت دی ہے۔ امید ہے تم انکار نہیں کرو گے۔“ فیصل صاحب کا رویہ اپنی بھتیجی کے مقابلے میں میرے ساتھ ہمیشہ پرجوش ہوتا تھا۔

”زحمت کی کیا بات ہے سر آپ حکم کریں۔“ میں نے بھی فرماں برداری کا مظاہرہ کیا۔

”تمہیں ہانیہ کے ساتھ گھر تک جانا ہوگا۔ اصل میں آج اس کا ڈرائیور چھٹی پر ہے اور یہ خود اپنی گاڑی ڈرائیو کر کے یہاں آگئی ہے۔ اس کی طبیعت بھی کچھ ٹھیک نہیں ہے اس لیے میں نہیں چاہتا کہ اب یہ اکیلی واپس جائے۔ تمہیں ہانیہ کے ساتھ گھر جانا ہوگا۔“ انہوں نے کہا۔

”او کے سر! نو پرابلم میں چلا جاتا ہوں۔“ جواباً میں نے بھی مستعدی کا مظاہرہ کیا۔

”جاؤ بھئی ہانیہ، اب میری طرف سے تمہیں اجازت ہے۔ کامران تمہارے ساتھ ہوگا تو مجھے فکر نہیں رہے گی۔“ اس بار فیصل صاحب کی مخاطب ہانیہ حسین تھی جو ان کی بات سنتے ہی اپنی جگہ سے کھڑی ہوگئی اور سپاٹ چہرے کے ساتھ فوراً ہی دروازے کی طرف بھی بڑھ گئی۔ میں بھی لپک کر اس کے پیچھے ہولیا۔ گاڑی پاس نہ ہونے کے باوجود میں اپنے دوستوں کی بدولت ڈرائیونگ جانتا تھا اور پُراعتماد تھا کہ آسانی سے ہانیہ حسین کی گاڑی کو ڈرائیو کرلوں گا لیکن اس نے مجھے موقع نہیں دیا اور خود ڈرائیونگ سیٹ سنبھالنے کے بعد مجھے پیچھے بیٹھنے کا حکم دیا۔ اس صورت حال پر میں تھوڑا سا جزبز تو ہوا لیکن حکم حاکم مرگ مفاجات والا معاملہ تھا۔ اس کے حکم کی تعمیل میں مجھے پچھلی نشست پر بیٹھنا پڑا۔ میرے بیٹھتے ہی اس نے ایک جھٹکے سے گاڑی آگے بڑھا دی۔ انداز سے صاف ظاہر تھا کہ وہ صرف اپنے چچا کی خواہش پر مجھے ساتھ رکھنے پر مجبور ہے ورنہ قطعاً ایسا نہ کرتی۔ مجبور میں بھی تھا چنانچہ سفر جاری رہا۔ ابھی کوئی سات آٹھ منٹ ہی گزرے تھے کہ ہانیہ نے ایک سائیڈ پر کر کے گاڑی روکی اور دونوں ہاتھوں سے یوں سر تھام کر بیٹھ گئی جیسے اسے چکر آرہے ہوں۔

”آر یو او کے میم!“ میں نے ذرا تشویش سے اس سے پوچھا لیکن اس کی طرف سے جواب نہیں آیا۔ میں پریشان ہو کر گاڑی سے اتر گیا اور ڈرائیونگ سیٹ کے ساتھ والی کھڑکی سے جھانک کر اس کا جائزہ لیا۔ اس کے چہرے پر پسینے کے قطرے نظر آرہے تھے اور یوں لگتا تھا کہ اسے اپنے آپ کو سنبھالنے میں مشکل پیش آرہی ہے۔ موسم اگرچہ گرم تھا لیکن گاڑی میں چلتے اے سی کی موجودگی میں اس کی یہ حالت سمجھ میں نہیں آرہی تھی۔ میں نے کھڑکی کے بند شیشے کو انگلیوں سے بجا کر اسے اپنی طرف متوجہ کیا تو اس نے فوراً ہی لاک کھول دیا۔

”آر یو او کے میڈم!“ وہ لاک کھول کر گاڑی سے

باہر نکلنے لگی تو میں نے اس سے ایک بار پھر دریافت کیا۔

"میں ذرا موڈ نہیں کرسکوں گی تم گاڑی چلاؤ۔" اس نے دراز دبی ہوئی آواز میں مجھ سے کہا اور خود پچھلی سیٹ پر بیٹھ گئی۔ میں نے فوراً اس کے حکم کی تعمیل کی۔

"کیا آپ کو کسی ہاسپٹل لے چلوں؟" گاڑی آگے بڑھاتے ہوئے میں نے اس سے پوچھا۔ وہ پشت گاہ سے ٹیک لگائے آنکھیں بند کیے بالکل نڈھال بیٹھی ہوئی تھی اس لیے میں نے یہ سوال کرنا ضروری سمجھا۔

"نہیں سیدھے گھر لے چلو۔" اس نے انکار کردیا تو مجھے بھی اپنی مرضی چلانے کی ہمت نہیں ہوئی۔ اس کی رہائش گاہ کے بارے میں مجھے علم تھا کہ کس علاقے میں ہے۔ متمول لوگوں کے اس رہائشی علاقے میں پہنچنے کے بعد اس کی کوٹھی تک بانیہ نے خود مجھے گائیڈ کردیا۔ اب وہ سنبھلی ہوئی نظر آرہی تھی۔ کوٹھی پر پہنچنے کے بعد اس نے مجھے واپسی کی اجازت دے دی۔ میں کچھ کنفیوز سا وہاں سے چل پڑا۔ آفس ٹائم ختم ہوچکا تھا لیکن میں فیصلہ نہیں کر پا رہا تھا کہ لوٹ کر آفس جاؤں یا سیدھا گھر چلا جاؤں۔ اوپر سے یہ علاقہ بھی ایسا تھا کہ کسی سواری کے ملنے کا سوال پیدا نہیں ہوتا تھا۔ سواری کے لیے مجھے خاصا چل کر روڈ تک جانا پڑتا۔ مرتا کیا نہ کرتا چلتا رہا۔ اسی دوران ہی میں نے فیصل صاحب کو کال کرکے صورت حال سے باخبر کردیا۔

"بانیہ کا بی پی اکثر لو ہوجاتا ہے اسی لیے میں اسے اکیلے گاڑی لے جانے کی اجازت نہیں دیتا۔ تمہارا بہت بہت شکریہ کہ تم نے اسے گھر تک پہنچا دیا۔ اب گھر والے خود ہی اسے دیکھ لیں گے۔" میری رپورٹ کے جواب میں فیصل صاحب نے کہا تو میں نے جھجکتے ہوئے پوچھا۔

"میرے لیے کیا حکم ہے سر۔ واپس آفس پہنچوں یا گھر چلا جاؤں!"

"آفس ٹائم تو ختم ہوگیا ہے یار۔ تم یہاں آکر کیا کرو گے؟ میں بھی اب نکلنے ہی والا ہوں۔ ایک پارٹی کے ساتھ سائٹ پر جانا ہے۔ تم بھی اب اپنے گھر چلے جاؤ۔" انہوں نے بے تکلفی سے جواب دیا تو میں ہلکا پھلکا ہوگیا۔ مین روڈ تک کا اچھا خاصا راستہ پیدل طے کرنے کے بعد میں ابھی اسٹاپ پر پہنچا ہی تھا کہ میرے موبائل پر کال آنے لگی۔ نمبر اس موبائل کا تھا جو عموماً میرے چھوٹے بھائی جبران کے استعمال میں رہتا تھا۔ جبران کے اس وقت کال کرنے سے میں کچھ الجھن میں مبتلا ہوگیا۔

"آپ کہاں ہیں بھائی!" میری "ہیلو" کے جواب میں جبران نے جس انداز میں مجھ سے یہ سوال کیا، میرا ماتھا ٹھنک گیا۔

"خیریت تو ہے جبران؟" میں نے شدید تشویش سے پوچھا۔

"امی کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔ ہم انہیں اسپتال لے کر آگئے ہیں۔ آپ بھی سیدھے یہیں آجائیں۔" اس نے مجھے اسپتال کا نام بتایا۔ اس کی آواز میں کپکپاہٹ تھی۔ ظاہر ہے وہ ابھی خاصا کم عمر تھا اور اس صورت حال پر گھبرا گیا تھا۔

"تم پریشان مت ہو۔ میں بس آدھے گھنٹے کے اندر پہنچ رہا ہوں۔" اسے تسلی دے کر میں نے کال منقطع کی تو مجھے احساس ہوا کہ میرا اپنا دل تو اپنی جگہ نہیں ہے لیکن پھر ہمت کرکے خود کو سنبھالا اور ایک رکشے کو روک کر اس میں بیٹھ گیا۔

☆ ☆ ☆

پچھلی کے دوران جس اذیت میں گزرے، وہ ناقابل بیان ہے۔ ماں جیسی ہستی کو تکلیف میں دیکھنا کوئی معمولی بات نہیں ہوتی۔ میری ماں بھی شدید تکلیف میں مبتلا تھیں اور میں ان کے لیے کچھ کرنے سے قاصر تھا۔ ڈاکٹرز کے مطابق ان کا مرض ایک بار پھر پھیلنا شروع ہوگیا تھا۔ کسی نے مجھے بتایا نہیں لیکن میں خود ہی سمجھ گیا کہ امی کو تکلیف کئی دن سے تھی لیکن انہوں نے اپنی تکلیف سب سے چھپائے رکھی۔ انہیں خیال ہوگا کہ ان کی بیماری کی وجہ سے پہلے ہی کل جمع پونجی ختم ہوگئی ہے اس لیے انہوں نے پوری کوشش کی کہ کسی کو ان کی حالت کا علم نہ ہونے پائے لیکن انسان کی برداشت کی بھی ایک حد ہی ہوتی ہے۔ وہ حد ختم ہوگئی تو امی اپنے ہوش و حواس سے بیگانہ ہوگئیں اور گھر والے گھبرا کر انہیں اسپتال لے آئے۔

اب صورت حال یہ تھی کہ امی کا علاج جلد از جلد شروع کروانے کی ضرورت تھی لیکن میں بالکل خالی ہاتھ تھا جو چند ہزار پاس تھے وہ بھی ان دو دنوں میں خرچ ہوگئے تھے۔ ایسی پریشانی تھی جس کا کوئی حل بھی نظر نہیں آتا تھا۔ قرض ادھار مانگنے نکلتا تو کس سے اور کہاں تک مانگتا۔ علاج کے لیے لاکھوں درکار تھے۔ ملازمت بھی نئی نئی تھی۔ ہم قیمتی زیورات یا کسی جائیداد کے بھی مالک نہیں تھے کہ اسے بیچ کر امی کا علاج کروالیتے۔ لے دے کر ایک گھر ہی تھا جو ہماری اور چچا کی مشترکہ ملکیت تھی۔ امی کی خاطر میں بے گھر ہونا بھی قبول کرلیتا لیکن چچا کے سر سے چھت چھیننے کا حوصلہ نہیں

تھا۔ گھر بیچنے کی صورت میں وہ اپنے حصے کی آدھی رقم سے کوئی دوسرا مناسب مکان نہیں خرید سکتے تھے اور اپنی مجبوری میں انہیں یوں جوان بیٹیوں کے ساتھ دربدر ہونے پر مجبور کرنا قطعی غیر اخلاقی عمل تھا۔ اسی طرح کے خیالات میں ڈوبا میں بستر پر کروٹیں بدل رہا تھا۔ مغرب کے بعد چچا نے اسپتال پہنچ کر مجھے زبردستی گھر بھیج دیا۔ ... تم رات گھر میں گزار کر آرام کر لو تاکہ صبح آفس جا سکو۔ میرا آفس جانے کو بھی دل نہیں چاہتا تھا لیکن اتنی مشکل سے ملنے والی ملازمت کی طرف سے بے پروائی برتنا بھی حماقت ہوتی اس لیے میں ان کے حکم پر گھر چلا آیا لیکن دل کو قرار نہیں تھا نو نیند کیسے آنکھوں میں اترتی بس یونہی بستر پر پڑا رہا۔ ابھی سوچوں میں گم تھا کہ صدف دودھ کا گلاس لے کر آ گئی۔

”اس کی کیا ضرورت تھی۔ میرا دل نہیں چاہ رہا تم یہ لے جاؤ۔“ میں نے قدرے رو کھے لہجے میں اس سے کہا۔

”پلیز پی لیجئے آپ نے کھانا بھی ٹھیک سے نہیں کھایا ہے۔ اسی طرح تو آپ بیمار ہو جائیں گے۔“ میرے روکھے پن کے جواب میں وہ نہایت ملائمت سے بولی۔

”میری بھوک پیاس اڑ گئی ہے صدف۔ میں کھانے پینے کی کوئی چیز اپنے منہ کی طرف لے جانے لگوں تو تائی کا خیال آ جاتا ہے اور مجھ سے کھایا نہیں جاتا۔“ اس بار میں نے اپنی بے بسی کا اظہار کیا۔

”تائی امی کی تکلیف کا احساس ہم سب کو ہے کاشی لیکن ان مشکل حالات سے نمٹنے کے لیے ہمیں حوصلہ تو کرنا ہوگا۔ آپ کو بھی ان حالات میں ہمت اور حوصلے سے کام لینا چاہیے۔ چلیں شاباش یہ دودھ پی لیں پھر ہم غور کریں گے کہ کیا کچھ کیا جا سکتا ہے۔“ اس نے کچھ ایسے انداز میں اصرار کیا کہ میں انکار نہیں کر سکا۔

”میں آپ سے کچھ کہنا چاہتی ہوں کاشی لیکن پہلے وعدہ کریں کہ میری بات ماننے سے انکار نہیں کریں گے۔“

”ایسی کیا بات ہے کہ تمہیں اس طرح تمہید باندھنی پڑ رہی ہے۔ میں تو ہمیشہ سے تمہاری بات کو اہمیت دیتا آیا ہوں۔“

”میں جو کچھ کہنے آئی ہوں وہ اس مان کے ساتھ کہہ رہی ہوں کہ ہم دونوں ایک دوسرے سے الگ نہیں ہیں۔ ہماری خوشیاں اور غم سب مشترک ہیں اور ہمیں حق ہے کہ ہر طرح کے حالات میں ایک دوسرے کا ساتھ دیں۔ کیا آپ میرا یہ حق تسلیم کرتے ہیں کاشی؟“

”کیوں نہیں صدف۔ میرے لیے بھلا تم سے بڑھ کر کون اپنا ہے۔ میں اپنی ذات پر تمہارا ہر حق تسلیم کرتا ہوں۔“

”تو اسی حق سے ہی آپ مجھے اجازت دیں کہ میں تائی امی کے علاج کے لیے کچھ چیزیں آپ کے حوالے کر سکوں۔“ اس نے یکدم ہی ایک پوٹلی میرے سامنے رکھ دی۔

”کیا ہے اس میں؟“ میں نے حیرانی سے پوچھا۔

”آپ خود ہی دیکھ لیں۔“ اس نے کہا تو میں نے پوٹلی کی گرہ کھولی۔ اندر پانچ سو، ہزار اور سو کے نوٹوں پر مشتمل ایک گڈی، دو عدد سونے کی چوڑیاں اور سیٹ موجود تھا۔

”یہ کیا ہے؟“ میں نے قدرے متوحش ہو کر پوچھا۔

”میری جمع پونجی۔ میں چاہتی ہوں کہ آپ اسے تائی امی کے علاج پر خرچ کریں۔“ اس بار اس نے اعتماد سے جواب دیا۔

”پاگل ہو گئی ہو کیا؟ میں تمہاری اتنی محنت سے جوڑی ہوئی چیزیں کیسے لے سکتا ہوں؟“ میں نے قدرے ناراضی کا اظہار کرتے ہوئے پوٹلی کو دوبارہ باندھنا شروع کر دیا۔ میرے علم میں تھا کہ صدف نے یہ رقم اور زیور کتنی جدوجہد کے بعد جوڑے ہیں۔ وہ شروع سے ایک قناعت پسند اور محنتی لڑکی تھی۔ میں نے بچپن سے آج تک اسے کبھی روپے ضائع کرتے نہیں دیکھا تھا۔ یہاں تک کہ وہ ملنے والی عیدی اور اچھے رزلٹ پر دی جانے والی انعامی رقم بھی جمع کرنے کی عادی تھی۔ میٹرک کے بعد اس نے محلے کے بچوں کو ٹیوشن پڑھانا شروع کر دی تھی بعد میں گھر کے قریب ہی موجود ایک پرائیویٹ اسکول بھی جوائن کر لیا۔ صدف سلائی کڑھائی کے ہنر میں بھی ماہر تھی اور لوگوں کی فرمائش پر یہ کام بھی اجرت کے عوض کر دیا کرتی تھی اس لیے مناسب رقم پس انداز کرنے میں کامیاب ہو جاتی تھی۔ اس رقم سے ہی چچی نے اسے یہ زیورات بنوا کر دیے تھے۔

”آپ مجھ سے وعدہ کر چکے ہیں کاشی کہ آپ میری بات ماننے سے انکار نہیں کریں گے۔“ اس نے فوراً مجھے ٹوکا۔

”مجھے اندازہ نہیں تھا کہ تم یہ سب کرنے والی ہو۔ ان چیزوں کو سنبھال کر رکھو۔ یہ چچی نے تمہارے جہیز کے لیے رکھی ہوں گی۔“ میں نے پوٹلی اس کی طرف بڑھائی۔

”جہیز کا کیا مسئلہ ہے؟ مجھے کون سا بیاہ کر کہیں اور جانا ہے۔ کیا آپ بغیر جہیز کے مجھے قبول نہیں کریں گے؟“ اس

نے کچھ ایسی معصومیت سے پوچھا کہ مجھے اس پر بے تحاشا پیار آ گیا۔

"تم تو مجھے ہر حال میں دل و جان سے قبول ہو صدف۔ تم جیسی لڑکی کو قبول کرنے سے انکار کرنا کفرانِ نعمت ہوگا لیکن ان چیزوں کو لینے کے لیے میرا دل راضی نہیں ہوتا۔ تمہارا خلوص اور جذبہ دونوں انمول ہیں لیکن ذرا سوچو کہ میں تمہیں ان چیزوں سے محروم بھی کردوں تو کیا فائدہ ہوگا۔ اس رقم سے امی کا مکمل علاج تو پھر بھی ممکن نہیں ہے نا۔" اس بار میں نے اسے ذرا رسان سے سمجھایا۔

"مجھے معلوم ہے کہ علاج کے لیے اس سے بہت زیادہ رقم کی ضرورت ہوگی لیکن اس کی مدد سے فی الحال آغاز تو کیا جاسکتا ہے۔ آگے کے لیے بھی میں نے کچھ سوچ لیا ہے۔" وہ جیسے ہار ماننے کے لیے تیار نہیں تھی۔

"کیا سوچ لیا ہے تم نے؟" اس بار میں نے قدرے جھنجلاہٹ کا مظاہرہ کیا۔

"میں ابو سے بات کروں گی کہ یہ مکان سیل کردیں۔ ہم لوگ کرائے کے گھر میں بھی رہ سکتے ہیں۔ فی الحال تائی امی کا علاج سب سے زیادہ اہم ہے۔" اس نے اپنے ارادے ظاہر کیے تو میں اچھل پڑا۔

"یہ تم کیسی باتیں کررہی ہو؟ چچا اور چچی کیا سوچیں گے۔ چچی کے دل میں تو یقیناً یہی خیال آئے گا کہ تمہیں یہ پٹی میں نے پڑھائی ہے۔ میری محبت میں اس حد تک مت جاؤ صدف کہ میں رسوا ہو جاؤں۔ اگر تمہارے کہنے پر چچا راضی بھی ہو گئے تو اسنے لوگوں کو بے چھت کرنے کا بوجھ میں نہیں سہار سکوں گا۔ امی کو بھی شاید یہ بات منظور نہ ہو کہ ابو اور چچا کی محنت سے بنایا گیا یہ گھر بیچ دیا جائے۔"

"ٹھیک ہے میں نے مان لیا کہ آپ کی ساری باتیں درست ہیں لیکن یہ بتائیں کہ پھر اس مسئلے کا کیا حل ہے؟ کیا ہم تائی امی کو بغیر علاج کے چھوڑ سکتے ہیں؟" اس نے قدرے تیکھے لہجے میں کہا اور ایک جھٹکے سے اٹھ کر باہر نکل گئی۔ میں ایک ہاتھ میں پوٹلی اور دوسرے سے اپنا سر تھامے بیٹھا رہ گیا۔ راضی حل تو کوئی نہیں تھا میرے پاس۔

☆☆☆

"کیا بات ہے کامران آج تم کچھ ڈسٹرب لگ رہے ہو؟" اگلے روز آفس پہنچ کر بھی میرا ذہن اسی میں الجھا ہوا تھا اور یقیناً یہ الجھن میرے چہرے سے بھی ظاہر تھی۔ جب میں فیصل صاحب کی کال پر ان کے آفس پہنچا تو انہوں نے روزمرہ کی گفتگو کے بعد ہی مجھ سے یہ سوال کر ڈالا۔

مجھے میں مزید ضبط کا یارا نہیں تھا سو انہیں ساری تفصیل کہہ سنائی۔

"تمہیں چاہیے تھا کہ مجھ سے رابطہ کرتے۔ خواہ مخواہ دو دن تک پریشان ہوتے رہے۔" تفصیل سن کر انہوں نے جو جملہ کہا اس نے مجھے حیرت میں مبتلا کردیا۔ وہ اچھے سہی لیکن مجھے ان سے اس حد تک غم گساری کی امید نہیں تھی۔

"حیران کیوں ہو رہے ہو بھئی۔ تمہارا مسئلہ ہمارا مسئلہ ہے۔ تم پریشان رہو یہ کچھ اچھا تو نہیں لگتا۔" انہوں نے ایک بار پھر میری حیرت میں اضافہ کیا۔

"ٹھیک ہو سوچ کر کہ آپ نے مجھے اس قابل سمجھا لیکن میں اپنی ایک ہفتے کی ملازمت میں یہ ہمت کیسے کرسکتا تھا کہ آپ سے کوئی مطالبہ کرتا۔" میں نے جھجکتے ہوئے کہا۔

"حالانکہ اس ایک ہفتے کے دوران ہی تمہیں اندازہ ہو جانا چاہیے تھا کہ تمہارا یہاں ایک خاص مقام ہے اور میں تمہیں دیگر اسٹاف کے مقابلے میں زیادہ اہمیت دیتا ہوں۔" انہوں نے اطمینان سے کہا۔

"یہ تو آپ کی مہربانی ہے ورنہ میں کس قابل ہوں۔" میرے لہجے میں حقیقی انکساری تھی۔

"تم قابل ہو اسی لیے تمہیں اتنی اہمیت دی جاتی ہے لیکن قابلیت سے مراد تمہاری پیشہ ورانہ قابلیت نہیں ہے۔ اس روز انٹرویو کے لیے جو لوگ یہاں آئے تھے ان میں سے کچھ اکیڈمک ریکارڈز اور تجربے کے اعتبار سے تم سے زیادہ لائق تھے لیکن میں نے تمہارا انتخاب صرف تمہاری راست گوئی اور ایمان داری کو دیکھتے ہوئے کیا تھا۔ تمہارے پیروں میں موجود جوتوں کے بارے میں سوال کرتے ہوئے مجھے قطعی امید نہیں تھی کہ تم اتنی سچائی سے کام لوگے۔ تم نے سچ بولا تو مجھے بہت اچھا لگا اور محسوس ہوا کہ تم وہی نوجوان ہو جس کی مجھے تلاش ہے۔ مجھے یہ کہنے میں کوئی عار نہیں ہے کہ اپنے آفس میں تمہیں ملازمت دینے کا مقصد محض تمہیں مزید جانچنا تھا ورنہ حقیقتاً پہلی ہی ملاقات میں ...... میں نے تمہیں اپنی پیاری بیٹی ہانیہ حسن کے لیے منتخب کرلیا تھا۔" انہوں نے گویا میرے سر پر کوئی بم پھاڑا۔

"یہ ...... یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں سر؟" میں بوکھلا سا گیا۔

"غلط نہیں کہہ رہا ہوں۔ ہانیہ مجھے بہت عزیز ہے اور میں چاہتا ہوں کہ اس کی زندگی کا ساتھی ایسے شخص کو بناؤں جو ہمیشہ اس کا بہت خیال رکھ سکے۔ تم میں مجھے ایسی خوبیاں نظر آتی ہیں کہ مجھے پورا یقین ہے ہانیہ تمہارے ساتھ خوش

رہے گا۔"

"لیکن میں تو کسی بھی طرح مس ہانیہ کے لائق نہیں ہوں سر۔ انہیں اپنی کلاس میں مجھ سے بہت بہتر شخص بھی مل سکتا ہے۔" بیٹھے بٹھائے ایک نہایت امیر لڑکی کا پرپوزل میرے سامنے رکھ دیا گیا تھا اور میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ ایسا کیونکر ممکن ہے۔ میں تو ہمیشہ سے صرف صدف کو اپنا جیون ساتھی بنانے کے خواب دیکھتا رہا تھا اور یہاں مجھے ہانیہ جیسی لڑکی سے شادی کی پیشکش کی جا رہی تھی۔

"تمہاری بات ایک حد تک ٹھیک ہے۔ بزنس کمیونٹی میں ہی سے کئی لوگ ایسے ہیں جو ہانیہ کو اپنی بہو بنانا چاہتے ہیں لیکن مجھے معلوم ہے کہ ان کی نظریں ہانیہ سے زیادہ اس کی دولت پر ہیں۔ دولت کی تو چلو کوئی بات نہیں وہ جس سے بھی شادی کرے گی اس کی دولت اسے ہی ملے گی لیکن یہ جو ہماری کلاس کے لڑکے ہیں نا ان میں سے مشکل ہی سے کوئی ملے گا جو اتنا مینجر ٹائپ ہو کہ ہانیہ کو سنبھال سکے۔ میں نے تمہیں بتایا تھا نا کہ بھائی صاحب کی ڈیتھ کے بعد ہانیہ جذباتی بہت ڈسٹرب ہو گئی ہے۔ اسے بہت زیادہ خیال اور توجہ کی ضرورت ہے اور مجھے اپنی کمیونٹی کے کسی لڑکے سے اتنی زیادہ امید نہیں ہے۔ جو خود ناز و نعم اور نخروں میں پلے بڑھے ہوں وہ دوسروں کے نخرے اٹھانے کی صلاحیت نہیں رکھتے۔ یہ کام وہی لوگ کر سکتے ہیں جنہوں نے زندگی کی سختیاں اور مسائل دیکھے ہوں اور جنہیں معلوم ہو کہ رشتے نبھانے کے لیے کیسی جدوجہد کرنی پڑتی ہے۔"

انہوں نے الفاظ کا انتخاب بہت اچھا کیا تھا اور لہجہ بھی شائستہ تھا لیکن میں سمجھ گیا کہ وہ اپنی لاڈلی بھتیجی کے لیے شوہر کی صورت ایک زرخرید غلام کے خواہش مند ہیں جو اس کے آگے پیچھے ہاتھ باندھ کر گھوم سکے۔ اس مقصد کے لیے مجھ سے اچھا انتخاب بھلا کیا ہو سکتا تھا۔ میرے معاشی اور گھریلو مسائل ان کے سامنے تھے۔ میں تعلیم یافتہ اور اسمارٹ بھی تھا چنانچہ وہ آسانی سے مجھے اپنے حلقے میں شامل کر سکتے تھے۔

"کس سوچ میں ہو کامران؟ میں نے تمہیں ایک نہایت مناسب آفر کی ہے اور بہت صاف الفاظ میں بتایا ہے کہ تم ہانیہ کے لیے مجھے پسند ہو۔ میرے خیال میں تو یہ ایک اچھا پرپوزل ہے۔ ہانیہ ایک قبول صورت، کم عمر اور دولت مند لڑکی ہے جس کی زندگی میں شامل ہونے سے تم اپنے بہت سے مسائل بہ آسانی حل کر سکو گے۔ تمہاری والدہ کا علاج ہو گا۔ چھوٹا بھائی اور بہن اچھی تعلیم حاصل کر کے اپنی لائف میں سیٹل ہو سکیں گے۔ تم خود عیش و آرام کی زندگی گزارو گے اور اس سے بڑھ کر بھلا تمہیں کیا چاہیے۔ ہر شخص زندگی میں بس یہی خواہشات تو رکھتا ہے۔" مجھے خاموش پا کر انہوں نے ایک بار پھر سمجھانے کا سلسلہ شروع کر دیا۔

"مجھے سوچنے کے لیے تھوڑی سی مہلت درکار ہے سر۔" آخر کار میں نے حوصلہ کر کے ان سے کہہ ڈالا۔

"واٹ ناٹ! تم جتنی چاہے مہلت لے لو لیکن اس بات کو ذہن میں رکھنا کہ تم فیصلہ کرنے میں جتنی دیر کرو گے تمہاری والدہ کی تکلیف میں اسی قدر اضافہ ہوتا چلا جائے گا۔ رفعت کی اہمیت مجھ سے زیادہ تمہارے پیش نظر ہونی چاہیے۔" بہت ٹھہرے ہوئے لہجے میں یہ جملے ادا کر کے انہوں نے گویا گفتگو کا اختتام کر دیا۔ میں ان سے اجازت لے کر اپنے کیبن میں واپس آ گیا۔ آفس میں پورا دن اسی ادھیڑ بن میں گزر گیا کہ کیا فیصلہ کروں۔ میرے کولیگز کو بھی امی کی طبیعت کے بارے میں علم ہو گیا تھا چنانچہ وہ میرے چہرے پر چھائی پریشانی کو دیکھ کر مجھے تسلی دلاسے دیتے رہے۔ آفس ٹائم ختم ہونے کے بعد میں سیدھا اسپتال پہنچ گیا۔ امی کی حالت ہنوز خراب تھی اور ڈاکٹرز کا یہی کہنا تھا کہ جلد از جلد ان کا ٹریٹمنٹ شروع کرنے کی ضرورت ہے۔

میں کئی گھنٹے اسپتال میں گزار کر گھر واپس لوٹا تب بھی الجھا ہوا تھا البتہ ذہن بار بار یہ مشورہ دینے لگا کہ مجھے فیصل صاحب کی پیشکش قبول کر کے اپنے جملہ مسائل کو حل کرنے کا سامان کر لینا چاہیے۔ دماغ کے اس مشورے کو حتمی فیصلے کی شکل دینے میں کوئی رکاوٹ تھی تو وہ صدف کی ذات تھی۔ میرے راہ بدل لینے سے اس پر قیامت ٹوٹ جاتی۔ وہ کتنا چاہتی تھی مجھے۔ اس سے میری تکلیف اور پریشانی نہیں دیکھی گئی تھی جب ہی تو کل رات اپنی عمر بھر کی پونجی میرے سپرد کر گئی تھی لیکن کیا ستم تھا کہ اس بہت محبت سے لائی مال لڑکی کی عمر بھر کی بچت ہانیہ حسنین کی دولت کے سمندر کے سامنے ایک بوند جیسی حیثیت رکھتی تھی۔ صدف میرے دکھوں پر میرے ساتھ رو تو سکتی تھی لیکن اس کے پاس ہانیہ حسنین کی طرح بے تحاشا دولت کی وہ طاقت نہیں تھی جو بہت سے مسائل چٹکی بجاتے حل کر دیتی ہے۔ اسپتال سے گھر آ کر بھی میں تقریباً ساری رات جاگتا رہا اور جب کوئی حتمی فیصلہ کرنے کی جرأت نہیں کر سکا تو فجر کے بعد چچا جان کے سامنے جا بیٹھا۔ انہیں میں نے بلا کم و کاست فیصل صاحب کی پیشکش کے بارے میں سب بتا ڈالا۔ سن کر وہ بھی کنگ

Italiano
Permanent Hair Colour Cream
Colour Your Life
✓ Gives strength to hair
✓ Soft and glossy hair
✓ Even coverage
✓ No greys
Italiano
Italiano
Available in 10 Different Shades

رہ گئے۔

"پھر تم نے کیا فیصلہ کیا؟" کچھ دیر کی خاموشی کے بعد بالآخر انہوں نے مجھ سے دریافت کیا۔

"کوئی فیصلہ ہی تو نہیں کر پا رہا ہوں چچا جان۔ فیصل صاحب کی آفر قبول کرتا ہوں تو سارے مسائل حل ہوتے نظر آتے ہیں لیکن فوراً ہی اس کمٹمنٹ کا خیال آجاتا ہے جو میرے اور صدف کے حوالے سے آپ بزرگوں کے درمیان ہو چکی ہے۔ یہ کمٹمنٹ ٹوٹی تو بقیناً سب کو بہت دکھ ہوگا۔" میں نے پیشانی مسلتے ہوئے ان کے سامنے اپنی الجھن بیان کی۔

"تم اس حوالے سے بے فکر رہو کامران میاں۔ صدف میری بچی ہے وہ بہت صابر اور ایثار پسند طبیعت کی مالک ہے۔ کل وہ بھی مجھ سے کہہ رہی تھی کہ تائی امی کے علاج کے لیے رقم کا بندوبست کرنے کے لیے ہمیں یہ مکان فروخت کر دینا چاہیے۔ میں نے اس سے وعدہ کیا تھا کہ اس کی اس تجویز پر غور کروں گا۔" چچا بہت حوصلے سے بات کر رہے تھے پھر بھی مجھے اندازہ تھا کہ ان کے دل کو صدمہ ہوا ہے۔

"صدف نے اس بات کا ذکر میرے سامنے بھی کیا تھا لیکن میں نے اس سے انکار کر دیا تھا۔ مکان بیچ کر سب لوگ بہت پریشان ہو جائیں گے۔ کرائے کے گھروں میں رہنا کوئی اتنا آسان نہیں ہوتا۔ سر پر چھت اپنی ہو تو آدمی روکھی سوکھی بھی کھا کر گزارہ کر لیتا ہے لیکن ہر مہینے ایک بڑی رقم کرائے میں دینا مشکل ہوگا۔ آپ کی ریٹائرمنٹ میں چند سال ہی باقی ہیں۔ آپ کے سر پر تین بیٹیوں کی شادی کی ذمے داری ہے۔ ایسے میں آپ کہاں کرائے کے گھروں میں خوار ہوتے پھریں گے۔ ہماری طرف کے حالات بھی سب کو معلوم ہیں کہ کتنے تشویش ناک ہیں۔ امی کے علاج کے لیے کتنی مدت اور رقم درکار ہوگی کچھ اندازہ نہیں ہے۔ عمران اور شائلہ کی تعلیم ابھی جاری ہے۔ دو چار سال میں شائلہ کی شادی کی بھی فکر کرنی ہوگی۔ اتنے سارے مسائل سے آخر کیسے نمٹا جائے گا؟ مجھے تو لگتا ہے کہ فیصل صاحب کی پیشکش سے انکار کرنے کے بعد میری جاب بھی باقی نہیں رہے گی۔ صدف کا پیش کردہ حل محض جذبات کا اظہار ہے۔ اس سے "مسئلہ" حل نہیں ہوگا بلکہ دوسرے کئی مسائل اٹھ کھڑے ہوں گے۔" مجھے احساس نہیں ہوا کہ بولتے بولتے میرا لہجہ قدرے تلخ ہو گیا۔

"تم ٹھیک کہہ رہے ہو لیکن صدف نے جو تجویز دی تھی وہ کل تک کے حالات کے مطابق تھی۔ تمہارے پاس آج ایک زیادہ بہتر اور آسان حل موجود ہے اس لیے تم چاہو تو اس موقع سے فائدہ اٹھا سکتے ہو۔" چچا کا سپاٹ لہجہ میں رہا گیا جواب مجھے ہوش میں لے آیا میں تڑپ اٹھا۔

"ناراض مت ہوں چچا جان۔ میں آپ کے مشورے اور اجازت کے بغیر قطعی کوئی فیصلہ نہیں کروں گا۔"

"میں ناراض نہیں ہوں بیٹا۔ میں بھی یہی محسوس کر رہا ہوں کہ موجودہ حالات میں تمہارے لیے اپنے باس کی آفر قبول کر لینا ہی سب سے زیادہ مناسب رہے گا۔ تم اللہ کا نام لے کر انہیں ہاں کر دو اور اس طرف سے بے فکر رہو کہ ہماری طرف سے کوئی شکایت یا ناراضی سامنے آئے گی۔ تمہارے اور صدف کے رشتے کی بات ابھی تک گھر میں ہی تھی اس لیے میرا خیال ہے کہ اس بات سے صدف کے مستقبل پر کوئی برا اثر نہیں پڑے گا۔ میری بچی بہت سادہ اور نیک فطرت کی مالک ہے۔ یقیناً اللہ تعالیٰ اس کے لیے کوئی اور بہت اچھا انتظام کر دیں گے۔"

"انشاءاللہ!" چچا کے بے حد رسان سے کہے گئے جملوں کے اختتام پر میں نے زیرِ لب کہا اور یوں ہلکا پھلکا ہو گیا جیسے کوئی بھاری بوجھ میرے شانوں سے ہٹا دیا گیا ہو۔

☆☆☆

فیصل صاحب کو ہانیہ حسین کے لیے ہاں کرتے ہوئے مجھے اندازہ نہیں تھا کہ وہ شادی کے لیے اتنی جلدی مچائیں گے۔ انہوں نے ہفتہ بھر بعد ہی شادی انجام دینے کا فیصلہ سنا ڈالا۔ بقول ان کے اب ان سے ہانیہ کی ویران زندگی مزید نہیں دیکھی جاتی اور وہ چاہتے تھے کہ ان کی بچی جلد از جلد زندگی کے رنگوں اور خوشبوؤں میں شامل ہو جائے۔ میرے پاس بھی انکار کی گنجائش نہیں تھی۔ میری ہاں کے ساتھ ہی فیصل صاحب نے امی کے علاج کے سلسلے میں بھرپور تعاون شروع کر دیا تھا۔ اب وہ ایک انتہائی مشہور نیورولوجسٹ کے زیرِ علاج تھیں اور ان کو نمایاں افاقہ ہوا تھا۔ یہاں تک کہ وہ اس لائق بھی ہو گئی تھیں کہ صرف ایک گھنٹے کے لیے سہی میری شادی کی تقریب میں شرکت کر سکیں۔ اس موقع پر میں نے ان کی آنکھوں میں خوشی کے بجائے اداسی کے رنگ دیکھے تھے۔ حقیقتاً سب ہی بہت اداس تھے۔ صدف کے بجائے کسی اور کو میری دلہن کے روپ میں دیکھنا ان سب کے لیے ہی ایک امتحان تھا لیکن مجبوری ایسی تھی کہ کوئی کھل کر اعتراض بھی نہیں کر سکتا تھا۔

چچا جان کی پوری فیملی نے صدف سمیت شادی میں شرکت کی تھی۔ چچی کا رویہ ذرا کھنچا ہوا تھا لیکن باقی سب ایسا برتاؤ کر رہے تھے جیسے میرا حوصلہ بڑھانے کی کوشش کر رہے ہوں۔ یہاں تک کہ صدف نے بھی اپنے دل کا غم چہرے پر نہیں آنے دیا تھا اور ہونٹوں پر ایک دھیمی سی مسکراہٹ لیے شادی کی تقریب میں شریک رہی تھی۔ چچا جان نے اس کے بارے میں بالکل ٹھیک کہا تھا۔ وہ واقعی بڑی صابر اور ایثار پسند لڑکی تھی۔ وہ نہ تو میرے سامنے روئی تھی اور نہ ہی راستہ بدلنے پر بے وفائی کے طعنے دیے تھے اور یوں ہو گئی تھی جیسے کچھ ہوا ہی نہ ہو لیکن کچھ کیسے نہیں ہوا تھا۔ میرے دل کی بے چینی کہہ رہی تھی کہ میں نے بہت مہنگا سودا کیا ہے۔ شہر کی مشہور ترین ڈیزائنر کے تیار کردہ قیمتی عروسی جوڑے میں ملبوس، ہیرے جڑے زیورات میں سجی ہانیہ حسین میرے پہلو میں بیٹھ کر بھی میرے دل کو اس طرح نہیں کھینچ رہی تھی جس طرح وہ ادھر ادھر مہمانوں کے درمیان گھومتی صدف کی طرف کھنچا جا رہا تھا۔

شادی کی تقریب میں شہر کے بہت سے معززین نے شرکت کی تھی۔ مجھے بھی فیصل صاحب نے اجازت دی تھی کہ میں جسے چاہوں انوائٹ کرلوں لیکن میں نے بس چند بہت ہی قریبی رشتے داروں کو مدعو کیا تھا۔ چچا جان نے بھی میرے اس فیصلے کی تائید کی تھی کیونکہ ہانیہ کا تعلق جس کلاس سے تھا ہمارے رشتے داروں کو ان کے ساتھ ایڈجسٹ کرنے میں مشکل پیش آتی اور خواہ مخواہ کوئی ناخوش گوار صورت حال کری ایٹ ہونے کا اندیشہ رہتا۔ رخصتی کا وقت آیا تو دلہن کے بجائے دولہا کی رخصتی عمل میں آئی۔ فیصل صاحب نے مجھے پہلے ہی بتا دیا تھا کہ میری خواہش پر میرے گھر والوں کے لیے بہترین رہائش گاہ کا بندوبست کر دیا جائے گا لیکن میں انہیں اپنے ساتھ ہانیہ کی کوٹھی میں نہیں رکھ سکوں گا کیونکہ یہ عمل ہانیہ کو گراں محسوس ہو سکتا ہے۔ میں اس بات پر خاصا جز بز ہوا تھا اور پریشان تھا کہ گھر والوں کے علم میں کیسے یہ بات لاؤں لیکن ان کی طرف سے سامنے آنے والے فیصلے نے خود ہی مجھے کشمکش سے نکال دیا۔ جبران نے بہت صاف الفاظ میں مجھ سے کہا کہ حالات کے پیش نظر اگرچہ ان لوگوں نے میری شادی کو قبول کر لیا ہے لیکن وہ اپنا گھر چھوڑ کر کسی دوسرے کے گھر جانا بالکل پسند نہیں کریں گے۔ یہ اس کا، ابی کا اور شائستہ کا مشترکہ فیصلہ تھا جو مجھے بھاری دل سے قبول کرنا پڑا۔ ہاں اتنا اطمینان ضرور تھا کہ وہ لوگ چچا کے سایۂ شفقت میں رہیں گے اور چچا آئندہ بھی مجھ سے ہر ممکن تعاون کرتے رہیں گے۔

رخصتی کے بعد میں اور ہانیہ بھی سجائی بڑی سی قیمتی گاڑی میں جسے باوردی شوفر چلا رہا تھا ہانیہ کی کوٹھی پہنچ گئے۔ کوٹھی بقعۂ نور بنی ہوئی تھی۔ ہماری گاڑی کے پیچھے ہی فیصل صاحب کی گاڑی بھی پورچ میں آ کر رکی۔ اس گاڑی میں ان کے ساتھ ان کی مسز اور اکلوتی بیٹی طوبیٰ موجود تھیں۔ ہانیہ کے مقابلے میں طوبیٰ ایک بے حد حسین لڑکی تھی جس کے ہونٹوں پر مستقل کھیلتی مسکراہٹ اس کے خوش مزاج ہونے کا بھی پتا دیتی تھی۔ اس کے انداز میں ہانیہ جیسا کروفر اور بے نیازی نہیں تھی۔ شاید اس لیے کہ وہ ہانیہ جیسی بے اندازہ دولت کی مالک نہیں تھی اور اس کے باپ کے ایچ ایچ بلڈرز میں صرف دس فیصد شیئرز تھے۔ طوبیٰ نے ہانیہ کو گاڑی سے اتار کر اندر لے جانے کے لیے سہارا دیا جبکہ فیصل صاحب اور ان کی مسز وہیں رکے رہے۔ اس صورت میں مجھے بھی وہیں رکنا پڑا۔

”میری لاڈلی بھتیجی تمہارے حوالے ہے کامران۔ مجھے امید ہے کہ تم اس کا ہر طرح سے خیال رکھو گے اور اس کی ہر غلطی کو خندہ پیشانی سے نظر انداز کر دو گے۔ آج سے یہ گھر تمہارا اور ہانیہ کا ہے اور تم دونوں ہی نے مل کر اس کی عزت اور وقار کا خیال رکھنا ہے۔ ہم سب یہاں تم دونوں کی اجازت سے مہمانوں کی طرح آئیں گے اور واپس چلے جایا کریں گے۔ ہر کام کے لیے ملازم موجود ہیں۔ تمہیں یہاں کسی قسم کی تکلیف نہیں ہو گی اور ان سب کے بدلے میں، میں تم سے صرف یہ چاہتا ہوں کہ ہانیہ کو کبھی تمہاری ذات سے کوئی تکلیف نہ ہو۔“ فیصل صاحب نے ایک بار پھر مجھ سے وہ سب کچھ کہا جو پچھلے پورے ہفتے میں متعدد بار کہہ چکے تھے۔ ان کے چہرے پر ایک بیٹی کے باپ کا حقیقی تاثر تھا البتہ ان کی مسز کے انداز میں قدرے بے نیازی اور بے زاری تھی۔

”آپ بے فکر رہیں سر! میں ہانیہ کا خیال رکھنے کی پوری کوشش کروں گا۔“ میں انہیں یقین دہانی کروا رہا تھا کہ طوبیٰ واپس آ گئی۔ اس کے ہونٹوں پر مستقل موجود رہنے والی مسکراہٹ اسے کچھ چنچل محسوس ہو رہی تھی۔ ”آپ پاپا کو سر کیوں کہہ رہے تھے۔ اب آپ کو انہیں انکل کہنا چاہیے کیونکہ اب آپ ہماری فیملی کا حصہ ہیں۔“ اس نے مجھے ٹوکا تو اس کے ہونٹوں کی مسکراہٹ دوبارہ واپس آ چکی تھی۔

"طوبیٰ بالکل ٹھیک کہہ رہی ہے کامران۔ اب تمہیں مجھے بانیہ کی طرح انکل ہی کہنا چاہیے۔" فیصل صاحب نے بھی بیٹی کی تائید کی۔

"جی جیسی آپ کی مرضی۔" میں نے فوراً فرماں برداری کا مظاہرہ کیا جواب میں وہ میرے شانے کو تھپک کر واپس گاڑی میں جا بیٹھے۔ ان کی مسز اور طوبیٰ نے بھی ان کی پیروی کی۔ گاڑی حرکت میں آئی تو طوبیٰ نے ہاتھ ہلا کر مجھے بائے کہا۔ جواب میں میرا ہاتھ بھی اٹھ گیا۔ ان لوگوں کو رخصت کرنے کے بعد میں اندر آیا تو دل میں یہ خیال تھا کہ صدف کی محبت کو بھول کر بانیہ کو وہ سب دکھ دوں گا جو اس کا حق ہے۔ اندر ایک ملازمہ نے میری بانیہ کے بیڈروم تک راہ نمائی کی۔ قیمتی فرنیچر اور ڈیکوریشن پیسز سے سجا بیڈروم اس وقت بے حد خوبصورت حجلۂ عروسی کا منظر پیش کر رہا تھا لیکن اس منظر میں دلہن غیر موجود تھی۔ میں نے سوچا کہ شاید وہ باتھ روم میں ہو چنانچہ خود ایک ریز صوفے پر بیٹھ کر اس کا انتظار کرنے لگا۔ تقریباً دس بارہ منٹ بعد باتھ روم کا دروازہ کھلا اور وہاں سے بانیہ برآمد ہوئی۔ اسے دیکھ کر میرا منہ کھلا کا کھلا رہ گیا۔ اس کی دلہن کی ساری سج دھج غائب تھی اور وہ نہائی دھوئی کاٹن کی آرام دہ نائٹی میں اس طور میرے سامنے موجود تھی کہ میری طرف اس کی ذرا بھی توجہ نہیں تھی۔ باتھ روم سے نکلنے کے بعد اس نے ڈریسنگ ٹیبل پر موجود ڈھیروں ٹیوبس اور بوتلوں میں سے ایک ٹیوب منتخب کی اور اس میں سے کریم نکال کر اپنے چہرے اور ہاتھوں پر مساج کرنے لگی۔ اس عمل سے فارغ ہونے کے بعد وہ میری طرف نگاہ غلط ڈالے بغیر ایک ملحقہ دروازہ کھول کر دوسری طرف چلی گئی۔ میں ششدر سا اپنی جگہ بیٹھا رہ گیا۔ ایسا سلوک تو شاید کبھی کسی دلہن نے اپنے دولہا کے ساتھ نہ کیا ہو۔ میں کچھ دیر متذبذب سا اپنی جگہ بیٹھا رہا۔ فیصل صاحب نے مجھ سے اپنی لاڈلی بھتیجی کو خوش رکھنے کی فرمائش کی تھی لیکن بھتیجی صاحبہ نے تو مجھے قطعی نظر انداز کر دیا تھا۔ اس کے اس انداز پر مجھے توہین کا بھی احساس ہو رہا تھا۔ اس سے قبل کہ یہ احساس مجھے مشتعل کرنے لگتا مجھے اپنی مجبوریوں کے ساتھ ساتھ فیصل صاحب کی باتیں بھی یاد آنے لگیں۔ انہوں نے مجھے پہلے ہی بتا دیا تھا کہ اپنے والد کی ڈیتھ کے بعد سے بانیہ مسلسل ڈسٹرب ہے۔ وہ اپنے والد سے اتنی شدید محبت کرتی تھی تو یقیناً اپنی زندگی کے اس موقع پر اس نے انہیں بہت مس کیا ہوگا اور مزید ڈسٹرب ہوگئی ہوگی۔ اب یہ میرا کام تھا کہ اسے اس ڈپریشن سے نکالنے کی کوشش کرتا۔ بانیہ کے لیے اپنے دل میں ہمدردی کے جذبات محسوس کرتا ہوا میں اپنی جگہ سے اٹھا اور اس دروازے کی طرف بڑھا جس کے پیچھے وہ غائب ہوئی تھی۔ دروازے کے قریب پہنچنے پر مجھے اندر سے اس کی سسکیوں کی آوازیں سنائی دیں اور جذبۂ ہمدردی مزید گہرا ہو گیا۔

میں نے ناب گھما کر آہستہ سے دروازہ کھولا۔ کمرے میں زیادہ روشنی نہیں تھی لیکن دیواروں میں جڑے بک شیلف فوراً ہی نظر آ گئے۔ مجھے یاد آیا کہ بانیہ کے متعلق معلومات فراہم کرتے ہوئے فیصل صاحب نے مجھے بتایا تھا کہ بانیہ کتابوں کی بہت رسیا ہے اور گھر میں موجود اپنے والد کی بڑی سی اسٹڈی کے علاوہ بھی اس نے اپنے بیڈروم کے ساتھ ایک اسٹڈی روم بنوا رکھا ہے۔ جہاں وہ اتنا زیادہ وقت گزارتی تھی کہ اس کے والد نے اس کے آرام کے خیال سے وہاں ایک صوفہ کم بیڈ ڈلوا دیا تھا۔

میں نے دروازے کو دھکیلا اور دھکیلا تو مجھے وہ صوفہ کم بیڈ اور اس پر موجود بانیہ دونوں نظر آ گئے۔ بانیہ کے ہاتھوں میں ایک تصویر تھی جسے دیکھتے ہوئے وہ اتنی شدت سے رو رہی تھی کہ اسے میری موجودگی کا بھی علم نہیں ہو سکا تھا۔ میں سمجھ گیا کہ تصویر اس کے والد کی ہے یعنی میرا یہ اندازہ درست تھا کہ اپنی زندگی کے اس اہم موقع پر وہ اپنے عزیز والد کو یاد کر رہی ہے اور ڈپریشن کا شکار ہے۔ دل میں ہمدردی کا موجزن سمندر لیے میں دبے قدموں اس کی طرف بڑھا اور آہستہ سے اس کا نام پکارتے ہوئے اس کے برابر میں بیٹھ گیا۔ میرا ارادہ تھا کہ اس کے پہلو میں بیٹھ کر اسے اپنے بازو میں سمیٹ لوں گا اور اس کے ساتھ اس کا غم بانٹوں گا لیکن وہ تو میری آواز سن کر یوں اچھل کر کھڑی ہوئی جیسے بچھو نے ڈنک مار دیا ہو۔ ہاتھ میں پکڑی تصویر کو اب اس نے اپنے سینے سے لگا لیا تھا۔ میرا اسے خود میں سمیٹنے کے لیے اٹھا بازو ہوا میں ہی معلق رہ گیا۔ "تم...... تمہاری ہمت کیسے ہوئی بلا اجازت یہاں آنے کی۔" تو ری جھٹکے سے سنبھلنے کے بعد وہ بے حد طیش کے عالم میں چلائی۔

"میں تمہارا شوہر ہوں بانیہ اور مجھے حق ہے کہ میں کسی بھی قسم کی اجازت کے بغیر تمہارے پاس آ سکوں۔" اس کا انداز برا لگنے کے باوجود میں نے نرم لہجے میں اسے احساس دلایا۔

"کسی غلط فہمی میں مت رہنا مسٹر۔ یہ میرا گھر ہے اور اس پر صرف میرا حق ہے۔ یہاں رہنے والے ہر فرد کو میری مرضی کے مطابق رہنا ہوگا جسے قبول نہ ہو وہ یہاں سے جا سکتا

ہے۔'' شعلہ فشاں لہجے میں بولی وہ کہیں سے بھی ایک کم عمر اور معصوم لڑکی نہیں لگ رہی تھی۔ مجھ سے اتنی توہین برداشت نہ ہوسکی اور اٹھ کر باہر نکل گیا۔ توہین کا احساس اتنا شدید تھا کہ میں بیڈروم میں بھی نہیں ٹھہر سکا اور باہر نکل کر لان میں پہنچ گیا۔ میرے بس میں ہوتا تو ہانیہ، حسین اور اس کی کوٹھی پر لعنت بھیج کر یہاں سے نکل جاتا لیکن میرے پیروں میں مجبوری کی زنجیریں پڑی ہوئی تھیں۔ میں بہت دیر تک لان میں ٹہلتا رہا اور آخرکار خود کو یہ باور کروانے میں کامیاب ہوگیا کہ اگر مجھے امی کا بہترین علاج کروانے کے ساتھ ساتھ اپنا اور اپنے بہن بھائی کا مستقبل سنوارنا ہے تو اس بدمزاج و بددماغ لڑکی کو برداشت کرنا ہوگا۔ میں ذرا برداشت اور ہوشیاری سے کام لیتا تو چند سال میں اتنا سمیٹ سکتا تھا کہ ہانیہ کو چھوڑ کر بھی اچھی زندگی گزار سکوں۔ ہانیہ کی دولت کے سہارے میرا مستقبل سنور جاتا تو اس کی بدمزاجی سہنے کی چند سالہ مشقت کا ازالہ بھی ہوسکتا تھا۔ کیا عجب تھا کہ اس وقت صدف بھی میرے سنگ ہوتی۔ یہ کوئی ایسی ناممکن بات تو نہیں تھی۔ میں صدف سے اس سلسلے میں بات کرسکتا تھا۔ وہ مجھ سے اتنی محبت کرتی تھی کہ چند سال انتظار کرسکتی تھی۔ میں اپنی پسند کے حساب سے فیصلہ کرچکا تو کھولتا ہوا دماغ بھی معمول پر آگیا اور میں بڑے اطمینان سے جاکر سجے سجائے حجلۂ عروسی میں بنا دلہن کے لمبی تان کر سوگیا۔

☆☆☆

انسان کا مقدر بھی اس کے سوچے سمجھے فیصلوں کے تابع نہیں ہوتا۔ اس بات کا علم مجھے اگلے روز ہی ہوگیا۔ دوسرے روز دوپہر کے بعد فیصل صاحب کی فیملی دوبارہ کوٹھی پہنچ چکی تھی۔ میں کیونکہ صبح کے قریب ہی سویا تھا اس لیے دوپہر تک سوتا ہی رہا۔ نہا دھو کر نیچے پہنچا تو فیصل صاحب اور ان کی فیملی سے ملاقات ہوگئی۔ ہانیہ بھی کاٹن کے اسٹائلش سے سوٹ میں ہلکے پھلکے میک اپ کے ساتھ وہاں موجود تھی۔ میرے نیچے پہنچتے ہی ملازمین ڈائننگ ٹیبل سجانے لگے۔ ہمارے ساتھ بالکل ویسا ہی سلوک کیا جارہا تھا جیسا کسی نئے شادی شدہ جوڑے کے ساتھ کیا جاتا ہے۔ میں دیکھ رہا تھا کہ ہانیہ یہ سب قبول کررہی ہے اور اس کے انداز میں ایسی کوئی بات نہیں جس سے دیکھنے والوں کو یہ اندازہ ہوسکے کہ کل رات وہ اپنے مجازی خدا کے ساتھ کیسا توہین آمیز سلوک کرچکی ہے۔ میں نے بھی مصنوعی چہرے پر خوشی اور اطمینان کا نقاب چڑھا لیا۔ شام تک فیصل صاحب اور دیگر اہل خانہ ہمارے ساتھ ہی رہے پھر فیصل صاحب نے خود ہی حکم دیا کہ مجھے اور ہانیہ کو اپنے گھر والوں سے ملنے کے لیے جانا چاہیے۔ ہانیہ نے یہ حکم بھی خندہ پیشانی سے قبول کرلیا۔ فیصل صاحب کی فیملی اور ہم لوگ آگے پیچھے ہی کوٹھی سے روانہ ہوئے۔ گاڑی چلتے ہی ہانیہ کے چہرے پر موجود خوش اخلاقی کی جگہ سنجیدگی اور بیزاری نے لے لی۔

''میں بہت تھکی ہوئی ہوں اس لیے پندرہ بیس منٹ سے زیادہ تمہارے گھر پر نہیں ٹھہر سکوں گی۔'' اس نے فیصلہ کن لہجے میں مجھے بتایا۔

''ٹھیک ہے تم ڈرائیور کے ساتھ واپس آجانا۔ میں وہیں رک جاؤں گا۔'' اس کا انداز برا لگنے کے باوجود میں نے کوئی اعتراض نہیں کیا۔ باقی کا سفر خاموشی سے طے ہوا۔ گھر پہنچے پر دروازہ جبران نے کھولا۔ اندر داخل ہوتے ہی مجھے اندازہ ہوگیا کہ مہمان آئے ہوئے ہیں۔ ڈرائنگ روم سے باتوں کی آوازیں آرہی تھیں۔ شمائلہ، عاشقہ اور سنبل کچن میں تھیں۔ البتہ صدف نظر نہیں آئی۔ ان تینوں نے کچن کی کھڑکی سے مجھے دیکھا تو خوش ہوگئیں اور ایک ساتھ بلند آواز میں سلام کیا۔ شمائلہ اور سنبل جوش میں باہر نکل آئی تھیں۔ ان کی آوازیں یقیناً اندر ڈرائنگ روم میں بھی پہنچی تھیں جب ہی وہاں سے چچا جان برآمد ہوئے۔ مجھے اور ہانیہ کو دیکھ کر انہوں نے بھی خوشی کا اظہار کیا اور ہمیں اپنے ساتھ ڈرائنگ روم میں لے گئے۔ وہاں تین چار خواتین اور دو حضرات موجود تھے جس میں سے ایک ادھیڑ عمر جبکہ دوسرا جوان اور اسمارٹ تھا۔ میں نے بلند آواز سے سلام کرنے کے بعد دونوں مردوں سے مصافحہ کیا۔ چچا جان میرا اور ہانیہ کا مہمانوں سے تعارف کروانے لگے۔ ان کی گرم جوشی کے جواب میں ہانیہ کا انداز سرد اور اکھڑا ہوا تھا جس کی تلافی کے لیے مجھے زیادہ ہی خوش اخلاقی کا مظاہرہ کرنا پڑ رہا تھا لیکن تعارف کے اگلے مرحلے میں میرے لیے بھی یہ امر مشکل ہوگیا۔ چچا جان بتا رہے تھے۔

''کامران میاں یہ وہی لوگ ہیں جو کافی عرصے سے صدف کے رشتے کے خواہاں ہیں۔ ہماری طرف سے انکار کے باوجود بھی ان کی طرف سے اصرار جاری تھا۔ آج صبح بھی بہن جی نے اس سلسلے میں فون کیا تو میں نے بھابی بیگم کے مشورے سے انہیں مدعو کرلیا۔ اب یہ لوگ چاہتے ہیں کہ بغیر کسی تکلف کے ابھی اسی وقت منگنی کی رسم ادا کردی جائے بعد میں آپس میں مشورہ کرنے کے بعد شادی کی کوئی تاریخ مقرر کرلی جائے گی۔''

میں جو سوچ رہا تھا کہ ہانیہ حسنین کے ساتھ مشکل کے چند سال گزارنے کے بعد دوبارہ صدف کے پاس لوٹ آؤں گا پہلے ہی مرحلے پر اس مایوس کن خبر کو سن کر ساکت رہ گیا۔

''یہ بالکل مناسب فیصلہ ہے منیر۔ میرے خیال میں کسی تاخیر کے بغیر صدف بیٹی کو یہاں بلواؤ اور یہ فریضہ انجام دے ڈالو۔ نیک کام میں دیر نہیں ہونا چاہیے۔'' میری خاموشی کو فوراً ہی امی کی آواز نے توڑا۔ اس کے بعد وہاں ہلچل سی مچ گئی۔ چچی کی ہدایت پر محلے کی لڑکیاں صدف کو اپنے گھیرے میں لیے ڈرائنگ روم میں پہنچ گئیں۔ صدف نے گلابی رنگ کا ہاتھ کی کڑھائی والا کاٹن کا جوڑا پہن رکھا تھا۔ گلابی دوپٹے کے ہالے میں اس کی گلابی رنگت دمک رہی تھی۔ سنگھار کے نام پر اس کی آنکھوں میں کاجل اور ہونٹوں پر گلابی لپ اسٹک کے سوا کچھ نہیں تھا پھر بھی وہ اتنی حسین لگ رہی تھی کہ ہانیہ کی کل کی سجی سجائی تیاری اس کے سامنے ہیچ تھی۔ سوگواری صدف کو اس نوجوان کے برابر والے صوفے پر بٹھا دیا گیا جسے مجھ سے عاکف وقاص کے نام سے متعارف کروایا گیا تھا۔ مہمان خواتین جن میں سے ایک عاکف کی والدہ، دوسری چچی اور باقی دو بہنیں تھیں فوراً حرکت میں آگئیں۔ مٹھائی اور پھل کے ٹوکروں کے ساتھ لائے گئے پھولوں کے ہار پہلے ہی میری نظر میں آچکے تھے، بعد میں اندازہ ہوا کہ وہ لوگ مکمل تیاری کے ساتھ آئے ہیں۔ عاکف کی والدہ نے صدف کی مخروطی انگلی میں سونے کی جڑاؤ انگوٹھی پہنائی۔ چچی نے لفافہ تھمایا اور دونوں بہنوں نے کلٹ چیک تھمائے۔ اتنا اہتمام دیکھ کر چچا یقیناً بوکھلا گئے تھے اور انہوں نے بھی کوشش کی کہ جواب میں عاکف کو کچھ نقد رقم دے سکیں لیکن اس نے صاف کہہ دیا کہ وہ منہ میٹھا کرنے کے علاوہ کچھ بھی لینا پسند نہیں کرے گا۔ چچا کے اصرار کو بھی اس نے بہت محبت اور سلیقے سے رد کر دیا۔ پورے گھرانے کے انداز و اطوار سے ظاہر تھا کہ وہ نہایت شائستہ اور مہذب لوگ ہیں۔ اصولاً مجھے خوش ہونا چاہیے تھا کہ صدف کو اتنا اچھا گھرانا ملنے والا ہے لیکن میرا دل میرے قابو میں نہیں تھا اور اس کے کسی اور کا ہو جانے کا خیال مجھے تکلیف دے رہا تھا۔ میں بس مارے باندھے ہی اس محفل میں شریک تھا۔ ہانیہ بھی بڑی بیزاری سے یہ سب دیکھ رہی تھی۔ آخر اس نے مجھے چلنے کا اشارہ دے دیا۔ میں جو دیر تک گھر والوں کے ساتھ رکنے کا ارادہ لے کر آیا تھا خود بھی مزید نہ بیٹھ سکا اور ہانیہ کی تھکن کا بہانہ کر کے خود بھی اس کے ساتھ ہی وہاں سے روانہ ہو گیا۔

واپسی کے سفر میں بھی ہمارے درمیان خاموشی رہی لیکن مجھے اس خاموشی سے کیا فرق پڑتا۔ میرے تو اپنے اندر ہنگامہ مچا ہوا تھا۔

☆☆☆

شب و روز بڑی بے کیفی کے عالم میں گزر رہے تھے۔ صدف کی رخصتی صرف پندرہ دن بعد ہونے طے پائی تھی۔ مجھے اندازہ تھا کہ چچا کے لیے اتنی جلدی انتظامات کرنا مشکل ہوگا اس لیے میں نے انہیں اخراجات کے سلسلے میں ایک معقول رقم پیش کی جسے انہوں نے یہ کہہ کر قبول کرنے سے انکار کر دیا کہ عاکف وقاص کی جانب سے جہیز میں ایک تنکا بھی قبول کرنے سے انکار کر دیا گیا ہے۔ ان کی طرف سے اصرار ہے کہ نہایت سادگی سے مسجد میں نکاح کی رسم ادا کی جائے اور ہر طرح کے فضول اخراجات سے گریز کیا جائے۔

چچا نے مجھے یہ بھی بتایا کہ عاکف، صدف کو اس علیحدہ فلیٹ میں رکھے گا جو شادی کے موقعے پر اس کے والد کی طرف سے اسے تحفے میں دیا جا رہا ہے۔ عاکف کے والد کا خیال تھا کہ ایک گھر میں رہنے سے تمام تر کوشش کے باوجود خواتین کے درمیان ساس بہو اور نند والی روایتی چپقلش پیدا ہو جاتی ہے اس لیے بہتر یہی ہے کہ بہو اور بیٹے کو الگ رہ کر اپنی زندگی گزارنے کا موقع دیا جائے تاکہ روایتی جھگڑے پیدا ہی نہ ہو سکیں۔ مجھے ان لوگوں کی اتنی کشادہ دلی پر حیرت ہوئی اور خود پر تھوڑا سا رشک بھی کہ میں چچا کے کسی کام نہیں آسکا۔ اپنی اس ذہنی مجروح حالت کو سہارا دینے کے لیے میں نے دو تین بار ہانیہ کی طرف پیش قدمی کی کوشش بھی کی لیکن اس نے ہر بار مجھے دھتکار دیا اور صاف لفظوں میں بتا دیا کہ اس نے صرف اپنے انکل ..... کے کہنے پر یہ شادی کی ہے ورنہ اسے مجھ سے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔ اس کی طرف سے اس رویے کے بعد میرے پاس صرف دو ہی مصروفیات رہ گئی تھیں۔ امی کے علاج کے سلسلے میں بھاگ دوڑ کرنا اور آفس کے معاملات دیکھنا۔ آفس میں اب میرا مقام تبدیل ہو گیا تھا۔ کل تک میں جن لوگوں کا کولیگ تھا آج وہ مجھے باس کی حیثیت سے عزت دینے لگے تھے۔ مجھ جیسی معمولی حیثیت کے شخص نے ازدواجی زندگی میں ناکامی کے بعد اس عزت پر ہی قناعت کر لی تھی۔ مجھے کون سی ہانیہ سے محبت تھی کہ میں اس کے قرب کے لیے ترستا۔ ہاں دن رات میں اس فکر میں ضرور رہتا تھا کہ جلد از جلد زیادہ سے زیادہ مال

سیٹ سکوں اور اس رشتے سے نجات پاؤں۔

فیصل صاحب ہنوز مجھ پر مہربان تھے۔ میں نے انہیں ہانیہ کے رویّے کے بارے میں کچھ نہیں بتایا تھا۔ انہوں نے بھی مجھ سے ایسی کوئی بات نہیں کی تھی جس سے یہ اندازہ ہوتا ہو کہ وہ میری اور ہانیہ کی شادی سے غیر مطمئن ہیں۔ وہ مجھے ایک داماد کے طور پر بھرپور عزت دیتے تھے۔ مجھے ہلکا سا شبہ تھا کہ ہانیہ شاید کسی اور کو پسند کرتی ہے اس لیے مجھ سے اتنی غافل ہے لیکن ایسے آثار بھی نظر نہیں آتے تھے۔ میں نے جب بھی اسے چیک کیا تھا وہ گھر پر ہی موجود ہوتی تھی۔ وہ فون وغیرہ کے استعمال میں بھی زیادہ مصروف نظر نہیں آتی تھی جس سے یہ شبہ ہو کہ وہ کسی سے رابطے میں ہے پھر پتا نہیں کیا بات تھی کہ وہ مجھے قطعی لفٹ کروانے کو تیار نہیں تھی۔ اس روز میں آفس سے واپس آیا تو اسے کسی سے فون پر بات کرتے سنا۔ وہ کسی سے دبئی کے دو ٹکٹس کی بات کر رہی تھی۔ پل بھر کے لیے مجھے یہ خوش فہمی ہوئی کہ دوسرا ٹکٹ میرے لیے ہے لیکن میرے سامنے ہی اس نے اگلی کال طوبیٰ کو کی اور اسے اطلاع دی کہ وہ اس کے ساتھ دبئی جا رہی ہے۔

''تم دبئی جا رہی ہو جبکہ میں نے تمہیں بتایا تھا کہ صدف کی شادی ہے۔ تم شادی میں شرکت کے بعد بھی جا سکتی ہو۔'' وہ فون سے فارغ ہوئی تو میں نے اعتراض کیا۔

''تمہاری کزن کی شادی تمہارا مسئلہ ہے۔ تم شوق سے شرکت کرو اور گفٹ کے لیے جتنی رقم کی ضرورت ہو لے لو لیکن مجھ سے فضول مطالبات کرنے کی کوشش مت کرو۔'' اس نے اپنے مخصوص اکھڑ لہجے میں جواب دیا اور کمرے سے نکل گئی۔ اس کے ایسے انداز مجھے تلملانے پر مجبور کرتے تھے لیکن اس کی دولت نے میرے ہاتھ پاؤں باندھ رکھے تھے۔ میری مرضی کے خلاف وہ طوبیٰ کے ساتھ دبئی روانہ ہو گئی۔ مجھے گھر والوں کے سامنے عذر تراشنا پڑا کہ وہ ایک بزنس ڈیل کے لیے گئی ہے یوں ان کے علاج اور صدف کی شادی میں شرکت کی وجہ سے نہ جا سکا اس لیے اسے جانا پڑا۔ کسی نہ کسی طور بات نبھ گئی۔ گھر والوں نے بھی شاید میرا بھرم رکھنے کے لیے یہ عذر قبول کر لیا ورنہ ہانیہ کا رویّہ تو سب کے سامنے ہی تھا۔ پہلی بار کے بعد اس نے دوبارہ میرے گھر والوں سے ملنے کی زحمت نہیں کی تھی اور نہ ہی کبھی انہیں اپنی کوٹھی پر مدعو کیا تھا۔

صدف پرائی ہو گئی۔ ابّی کا علاج جاری رہا۔ علاج کے لیے ملنے والی رقم کے علاوہ بھی میں نے چند لاکھ ہوشیاری سے اپنے اکاؤنٹ میں منتقل کر لیے۔ امید یہی تھی کہ چند سال میں بہت سا مال بنانے میں کامیاب ہو جاؤں گا۔ فیصل صاحب مجھ پر اندھا اعتماد کرتے تھے اور میں اس اعتماد کا بھرپور فائدہ اٹھا رہا تھا۔ اب میں نے امراء کے طور طریقے بھی اپنانے شروع کر دیے تھے۔ ہانیہ کی عدم موجودگی میں میں بالکل آزاد تھا اس لیے آفس کے بعد میرا وقت رات گئے تک یا تو کلب میں گزرتا یا میں کسی رنگین محفل کے سنگ شہر میں آوارہ گردی کرتا پھرتا۔ اس رات بھی میں کوئی ڈیڑھ بجے کے قریب گھر واپس آیا تھا۔ امراء کے فیشن کے مطابق میں نے شراب بھی پی رکھی تھی لیکن اتنی مقدار میں نہیں کہ ہوش و حواس سے بیگانہ ہو جاؤں۔ ملازمہ خاص نے گھر پہنچنے پر حسبِ معمول مجھ سے کھانے کے لیے دریافت کیا لیکن میں نے انکار کر دیا اور صرف کافی کی فرمائش کی۔

''او کے سر، میں ابھی دس منٹ میں بنا کر لاتی ہوں۔'' اس نے مستعدی سے جواب دیا پھر واپس پلٹنے سے پہلے بولی۔ ''آج شام ہانیہ بی بی کی کسی سہیلی کا ڈرائیور ان کی ڈائری دینے آیا تھا۔ کہہ رہا تھا بی بی اپنی سہیلی کے گھر بھول کر آ گئی تھیں۔ اسٹڈی تو لاک ہے۔ میں نے ڈائری آپ کے بیڈ روم میں رکھ دی ہے۔''

''ٹھیک ہے۔'' میں نے ملازمہ کو مختصر جواب دیا اور بیڈ روم کی طرف بڑھ گیا۔ اسٹڈی کو لاک کر کے ہانیہ نے میری تسلی کا ایک اور انتظام کیا تھا جس پر جلتا کڑھتا میں بیڈ روم میں آ گیا۔ بیڈ کی سائڈ ٹیبل پر رکھی ڈائری فوراً ہی میری نظر میں آ گئی۔ یکایک مجھے خیال آیا کہ ڈائری پڑھ کر ہانیہ کی شخصیت کے بارے میں بہت کچھ جانا جا سکتا ہے۔ چنانچہ فوراً ہی ڈائری لے کر بیٹھ گیا۔ ابتدائی چند صفحات کے بعد ہی مجھ پر اس کے راز کھلنا شروع ہو گئے۔

''کافی سر۔'' میری محویت کو ملازمہ کی آواز نے توڑا۔ میں چونک کر اس کی طرف متوجہ ہوا۔

''میں نے بہت دل لگا کر بالکل آپ کی پسند کے مطابق کافی بنائی ہے۔ پہ مزہ آئے گا(؟) سر، آپ پیتے ہی خوش ہو جائیں گے۔'' اس نے کافی کا مگ سائڈ ٹیبل پر رکھتے ہوئے مسکرا کر مجھ سے کہا۔ وہ تقریباً پینتیس سال کی ایک خوش اطوار عورت تھی جسے کوٹھی کے دیگر ملازمین کے مقابلے میں زیادہ اہمیت حاصل تھی اس لیے جب وہ بات کرتی تھی تو اس کے لہجے میں ایک خاص اعتماد ہوتا تھا۔

''ڈونٹ وری، تمہارے ہاتھ کی بنی ہوئی کافی میں

خود بھی مس کرنا پسند نہیں کروں گا۔'' ڈائری کے مندرجات نے اگرچہ میرے ذہن کو منتشر سا کر دیا تھا پھر بھی میں نے اسے خوش اخلاقی سے جواب دیا۔ وہ واپس چلی گئی تو میں ایک بار پھر ڈائری کی طرف متوجہ ہو گیا۔ ڈائری پڑھتے ہوئے میں کافی کی چسکیاں بھی لیتا رہا۔ ڈائری کیا تھی بس انکشافات ہی انکشافات تھے۔ ابتدائی صفحات میں ہانیہ نے اپنے ڈیڈی کے انتقال کے بعد خود پر گزرنے والی کیفیات کا ذکر کیا تھا۔ اس نے جو کچھ لکھا تھا اس سے اندازہ ہو رہا تھا کہ واقعی وہ اپنے باپ سے بے تحاشا محبت کرتی تھی۔ درد و الم سے بھرے ان ایام کے تذکرے کے دوران بتدریج کامران نامی ایک لڑکے کا ذکر آنے لگا۔ کامران اس کے ڈیڈی کے کسی دوست رستم کا بیٹا تھا جس نے ہانیہ کو غم اور صدمے کی کیفیت سے نکال کر دوبارہ زندگی میں شامل ہونے کا حوصلہ دیا۔ کامران کی اس توجہ اور خلوص نے ہانیہ کو اس حد تک متاثر کیا کہ وہ اس کی محبت میں گرفتار ہو گئی۔ اس محبت میں اتنی شدت اور تندی تھی کہ وہ دونوں تمام حدود پار کرتے چلے گئے اور نتیجہ وہی نکلا جو نکلنا چاہیے تھا۔ اس سے قبل کہ ہانیہ اس سلسلے میں کامران سے کوئی بات کر پاتی اس کی زندگی میں دوسرا بڑا حادثہ پیش آ گیا۔ کامران ایک شدید روڈ ایکسیڈنٹ میں زندگی کی بازی ہار گیا۔ ظاہر ہے صدمے نے ہانیہ کو دیوانہ کر دیا لیکن اپنی طبیعت کی خرابی نے اسے زیادہ دن دیوانگی بھی نہیں دکھانے دی۔ اپنی کزن اور ہم راز سیمی طوبیٰ کے ذریعے اس نے یہ اطلاع اپنی چچی کو دی۔ چچی نے اس کو ابارشن کا مشورہ دیا لیکن ہانیہ اپنی محبت کی نشانی کو مٹانے کے لیے تیار نہیں ہوئی چنانچہ طے یہ پایا کہ خاندان کی عزت بچانے کے لیے کوئی کاٹھ کا الو تلاش کیا جائے۔ ظاہر ہے ایسا الو وہی آدمی بن سکتا تھا جسے اپنی ضرورتوں اور مسائل نے مجبور کر رکھا ہو۔ چچا نے لاڈلی بھتیجی کا گناہ چھپانے کے لیے تلاش شروع کر دی اور بڑی آسانی سے مجھے پا لیا۔ اتفاق سے میرا نام بھی کامران تھا اس لیے ہانیہ حسین نے میرے انتخاب پر مہر تصدیق ثبت کر دی کہ اس طرح اس کے ہونے والے بچے کو وہی نام ملتا جو اس کے اصل باپ کا تھا۔ دولت سے خریدے گئے تماشائی شوہر کے ساتھ وہ وہی سلوک کرتی تھی جو اس کے خیال میں درست تھا کیونکہ اس طرح وہ اپنے مرحوم محبوب سے وفا نبھا رہی تھی۔ ان ساری تفصیلات کو پڑھ کر میں سمجھ گیا کہ وہ اسٹڈی میں بیٹھ کر جس تصویر کو سینے سے لگا کر روتی ہے وہ اس کے باپ کی نہیں بلکہ محبوب کی ہوگی۔ ساری صورت حال سمجھ کر میرا فشارِ خون بلند ہونے لگا۔ چچا بھتیجی نے کس چالاکی سے گیم کھیلا تھا اور کتنی آسانی سے مرے ہوئے عاشق کی نشانی کو زرخرید شوہر کا نام دینے کا انتظام کر لیا تھا۔ شادی کے بعد اتنی جلدی بچہ دنیا میں آتا تو دنیا والوں سے کہہ دیا جاتا کہ قبل از وقت پیدائش ہوئی ہے۔ میری کیا اوقات تھی کہ تردید کر سکتا اور لوگوں کو بتاتا کہ جس بچے کو میرا نام دیا جا رہا ہے اس کی ماں کو تو مجھے ہاتھ لگانے کا بھی شرف حاصل نہیں ہو سکا ہے۔ وہ پیسے والے لوگ تھے۔ ہر طرح کا کھیل تماشا کر سکتے تھے لیکن مجھے حقیقتاً خود کو الو بنائے جانے پر غصہ آ رہا تھا۔ اگر انہیں ایسی کوئی ڈیل کرنی ہی تھی تو تمیز طریقے سے کرتے۔ ہو سکتا تھا کہ اپنی مجبوریوں کے بدلے میں حقائق جاننے کے باوجود بھی بچے کو راضی ہو جاتا لیکن اس صورت میں، میں اپنی صحیح قیمت تو لگا سکتا تھا۔ یہاں تو انہوں نے سارا سودا اپنی مرضی کا کیا تھا۔ غصے اور اضطراب کی کیفیت میں، میں اٹھ کر کمرے میں ٹہلنے لگا۔ کچھ سمجھ نہیں آیا تو فیصل صاحب کا نمبر ملا ڈالا۔

''کیا بات ہے کامران، اتنی رات کو کیسے فون کیا ہے؟'' انہوں نے کئی گھنٹیوں کے بعد کال ریسیو کی اور غنودہ سی آواز میں پوچھا۔

''رات ہوگی تمہارے لیے۔ میری آنکھیں تو ابھی کھلی ہیں۔'' میں نے بگڑتے ہوئے لہجے میں بدتمیزی سے جواب دیا۔ مجھے احساس تھا کہ میری آواز لہرا رہی ہے۔ شاید شراب اور غصے نے مل کر اعصاب پر اثر انداز ہونا شروع کر دیا تھا۔

''کیا مطلب؟ تمہاری طبیعت تو ٹھیک ہے؟'' انہوں نے حیرت سے پوچھا۔

''میری طبیعت ٹھیک ہے لیکن میں تم چچا بھتیجی کا دماغ ٹھیک کرنا چاہتا ہوں۔ تم نے مجھے دھوکا دیا! میں اپنے ساتھ کیے گئے اتنے بڑے دھوکے کو ہرگز معاف نہیں کروں گا۔''

میں اتنی زور سے دہاڑا کہ میرے گلے میں خراش سی پڑ گئی۔ پھر مجھے مزید گفتگو جاری رکھنے کا حوصلہ نہیں ہوا اور میں بستر پر گر گیا۔ اعصاب پر بہت دیر سے حملہ کرتی دھند اب پوری طرح غالب آنے لگی تھی۔ اس دھند نے کچھ اس طرح مجھے اپنی لپیٹ میں لیا کہ میں ذرا سی دیر میں ہوش و حواس سے بیگانہ ہو گیا۔ دوبارہ میری آنکھ چہرے پر ڈالے جانے والے ٹھنڈے پانی کی وجہ سے کھلی۔ کچھ پل کے لیے تو میری سمجھ میں کچھ نہ آیا اور میں ٹکر ٹکر ان پولیس والوں کو دیکھنے لگا جو میرے اطراف کھڑے ہوئے تھے۔ ان پولیس

والوں کے درمیان مجھے فیصل... کا چہرہ بھی دکھائی دیا۔ ان کے بال بکھرے ہوئے تھے اور چہرے پر گہرے غم کے آثار تھے۔

"ہتھکڑی لگا دو اسے۔" مجھے ہوش میں دیکھ کر پولیس انسپکٹر نے اپنے ماتحت کو حکم دیا۔

"لیکن کس جرم میں؟" میں ہتھکڑی لگوانے میں مزاحمت کرنے لگا۔ مجھے یاد آنے لگا کہ رات میں نے سونے سے قبل فون پر فیصل سے کچھ بدتمیزی کی تھی لیکن اس کا مطلب یہ تو نہیں تھا کہ وہ مجھے ہتھکڑی لگوا دیتے۔

"یہ سب کیا ہے انکل؟ آپ مجھے اریسٹ کیوں کروا رہے ہیں۔ گھر کی بات تو گھر میں بھی طے پا سکتی تھی۔" مجھے معلوم تھا کہ میں کس حیثیت کا آدمی ہوں اور میرے چچا سسر کی کیا حیثیت ہے اس لیے فوراً ہی مفاہمت پر اتر آیا۔

"بکواس بند کر کمینے۔ میں تجھے اپنی بھتیجی کا قتل کسی صورت میں معاف نہیں کر سکتا۔" مجھے نفرت بھری نظروں سے گھورتے ہوئے وہ دہاڑے۔ تو میرے چودہ طبق روشن ہو گئے۔ ہانیہ فوت ہو چکی تھی اور یہاں مجھ پر اس کے قتل کا الزام لگایا جا رہا تھا۔ میں نے اس سلسلے میں لب کشائی کی کوشش کی اور بہت چیخا پکارا لیکن پولیس والے مجھے گھسیٹتے ہوئے باہر لے گئے۔

☆☆☆

حوالات کے فرش پر پڑا میں بری طرح کراہ رہا تھا۔ تھانے لانے کے بعد میری ٹھیک ٹھاک پٹائی کی گئی تھی۔ تب تک مجھ پر اس حقیقت کا انکشاف ہوا تھا کہ ہانیہ آج صبح سویرے دبئی سے واپس آ گئی تھی۔ مجھ پر الزام تھا کہ میں نے شدید اشتعال اور نشے کی حالت میں اسے چھرے سے وار کر کے قتل کیا ہے۔ کیونکہ میرے علم میں یہ بات آ گئی تھی کہ میری نوبیاہتا بیوی تین مہینے کی حاملہ ہے اور کسی اور کا گناہ میرے سر تھوپنے کی کوشش کر رہی ہے۔ میں پولیس والوں سے لاکھ کہتا رہا کہ میرا ہانیہ کے قتل سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ میں تو یہ بھی نہیں جانتا تھا کہ وہ آج واپس آنے والی ہے لیکن انہوں نے میری ایک نہ سنی۔ مجھے نہیں معلوم تھا کہ میرے گھر والوں کو ان حالات کا علم ہے یا نہیں کیونکہ یہاں مجھ سے کوئی ملنے نہیں آیا تھا۔ دن بھر میں اپنی چوٹوں کو سہلاتا حوالات کے فرش پر بھوکا پیاسا پڑا رہا۔ رات دس بجے کے بعد جب تھانے میں ذرا چہل پہل کم ہوئی تو پہرے پر موجود ایک سپاہی نے مجھے اشارے سے اپنے قریب بلایا۔ میں حیران سا سلاخوں کے پاس پہنچ گیا۔

"تمہیں پھنسانے کی کوشش کی جا رہی ہے شہزادے، تمہارے گھر سے ایک بزرگوار تم سے ملنے آئے تھے لیکن ایس ایچ او صاحب نے اجازت نہیں دی۔ انہیں مقتولہ کے چچا کی طرف سے سخت ہدایت ہے کہ تمہارے ساتھ کسی قسم کی رعایت نہیں کی جائے۔ تمہارے خلاف بڑی سخت ایف آئی آر کاٹی گئی ہے اور کل عدالت میں پیش کرنے کے لیے بڑے پکے ثبوت اور گواہ تیار کیے گئے ہیں۔ سمجھو کہ تم پر بڑی مصیبت آنے والی ہے۔" سپاہی دھیمی آواز میں مجھے منحوس خبریں سنانے لگا لیکن اس کا انداز ہمدردی اور اپنائیت لیے ہوئے تھا اس لیے میں بھی ان کے سامنے اپنے دل کی بھڑاس نکالنے لگا۔

"مجھے تو کچھ سمجھ نہیں آ رہی سنتری بادشاہ کہ یہ میرے ساتھ کیا ہو رہا ہے۔ مجھے تو یہ بھی نہیں معلوم تھا کہ میری بیوی گھر آ چکی ہے اور ان لوگوں نے مجھ پر اتنا بڑا الزام لگا دیا۔ میں غریب آدمی ہوں اور میرے سسرال والے اونچی حیثیت کے لوگ۔ میں تو ان کے مقابلے میں اپنا بچاؤ بھی نہیں کر سکتا۔" میں سپاہی کی ہمدردی پا کر تقریباً رو پڑا۔

"بچاؤ کی ایک صورت نکل رہی ہے تمہارے لیے۔ چاہو تو اس سے فائدہ اٹھا سکتے ہو۔" سپاہی نے سرگوشی کی تو میں ہکا بکا اس کی صورت دیکھنے لگا۔

"ایسے کیا بٹر بٹر دیکھ رہے ہو بچے کبوتر..... کل عدالت میں حاضری کے وقت ذرا ہوشیار رہنا۔ وہاں بہت کچھ ہونے کا امکان ہے۔" سپاہی نے ایک آنکھ دبا کر مجھ سے کہا تو پوری بات سمجھ نہ آنے کے باوجود میرا دل زور زور سے دھڑکنے لگا اور میں نے وضاحت طلب نظروں سے ان کی طرف دیکھا۔

"تفصیل ابھی بتائی نہیں جا سکے گی۔ ابھی تم آرام سے بیٹھو۔ میں تمہارے لیے کچھ کھانے پینے کے بندوبست کرتا ہوں۔"

وہ وہاں سے چلا گیا۔ اس کی واپسی تقریباً آدھے گھنٹے بعد ہوئی۔ کھانے میں وہ میرے لیے تندوری روٹی اور نہاری لایا تھا۔ میں سارا دن کا بھوکا تھا۔ چنانچہ سپاہی کے دل سے لایا گیا کھانا بھی خوب ڈٹ کر کھایا۔ کھانے کے بعد دودھ پتی نے مزہ دوبالا کر دیا۔ سپاہی نے مجھے درد کی دو گولیاں بھی دیں اور آخر میں جلتا ہوا سگریٹ بھی پیش کیا۔ اس کے ہم منصب ساتھی یہ سب کچھ بے نیازی سے دیکھتے رہے اور کسی نے بھی مخل اندازی نہیں کی کیونکہ تھانہ کلچر میں یہ ایک عام سی بات تھی کہ گرفتار شدہ شخص یا اس کے اقارب کی

طرف سے کھلا خرچہ پانی ملنے پر سپاہی ہر طرح کی سہولت فراہم کر دیتے تھے۔ مجھے نہیں معلوم تھا کہ مجھے یہ سہولتیں کس کے ایما پر فراہم کی جا رہی ہیں۔ میں بس الجھا الجھا سا فائدہ اٹھاتا رہا۔ پیٹ میں غذا گئی اور درد کشا گولیوں نے اثر دکھانا شروع کیا تو مجھ پر غنودگی کا غلبہ ہونے لگا۔ میں ننگے فرش پر ہی لیٹ کر گہری نیند سو گیا۔ صبح اٹھا تو خود کو ناصا تازہ دم محسوس کر رہا تھا۔ ناشتے میں مجھے سپاہی نائل چائے کا کپ اور دو پاپے تھمائے گئے اور پھر عدالت جانے کا وقت آ گیا۔ باری آنے پر جب عدالت میں میرے کیس کی سماعت شروع ہوئی تو واقعات کو کچھ اس طرح سامنے لایا گیا۔

''ایچ ایچ بلڈرز کے شیئر ہولڈر فیصل صاحب نے مجھے ایک شریف اور محنتی نوجوان جانتے ہوئے اپنی اکلوتی بھتیجی کا شوہر منتخب کیا تھا۔ انہیں امید تھی کہ میں ان کی بچی کا بھرپور خیال رکھوں گا لیکن بعد میں حالات مختلف طریقے سے سامنے آئے اور انہیں اندازہ ہونے لگا کہ میں ایک لالچی انسان ہوں جو والدہ کی بیماری کے علاوہ بھی مختلف طریقوں سے اپنے اکاؤنٹ میں رقم منتقل کر رہا ہوں۔ رقم کی منتقلی والی بات درست تھی جس سے میں انکار نہیں کر سکتا تھا۔ مزید جو واقعات بیان کیے گئے ان کے مطابق میرا رویہ ہانیہ کے ساتھ سرد مہری کا تھا اس لیے وہ دل بہلانے کے لیے اپنی چچازاد طوبیٰ کے ساتھ کچھ عرصے کے لیے دبئی چلی گئی۔

بیوی کی غیر موجودگی میں، میں آوارہ گردی کرنے لگا۔ گھریلو ملازمہ کے بیان کے مطابق وقوعہ والی رات بھی میں نشے میں دھت گھر آیا اور ہانیہ کی اسٹڈی میں جا گھسا۔ ملازمہ حکم کے مطابق کافی پہنچانے بیڈ روم میں پہنچی تو اس نے مجھے ہانیہ کی پرسنل ڈائری پڑھتے ہوئے پایا۔ وہ خاموشی سے واپس پلٹ گئی۔ صبح کی فلائٹ سے ہانیہ کی واپسی پر ڈرائیور اسے ائرپورٹ سے لے کر آیا تو ملازمہ نے ہمارے بیڈ روم سے لڑنے جھگڑنے کی آوازیں سنیں۔ پھر اسے ہانیہ کی ایک دو چیخیں بھی سنائی دیں لیکن وہ ہمت نہیں کر سکی کہ دخل اندازی کرے۔ بہت سوچ بچار کے بعد اس نے فیصل صاحب کو فون کیا۔ انہوں نے کوٹھی پر پہنچ کر پہلے بیڈ روم کے دروازے پر دستک دی اور کوئی ردعمل ظاہر نہ ہونے پر چابی کی مدد سے لاک کھولنے کا حکم دیا۔ لاک کھول کر وہ لوگ اندر پہنچے تو انہوں نے مجھے جوتوں سمیت بستر پر سویا ہوا پایا۔ بیڈ روم بری طرح بکھرا ہوا تھا۔ فیصل صاحب نے اسٹڈی میں جا کر دیکھا تو وہاں ہانیہ کی خون میں لت پت لاش ملی۔ انہوں نے فوراً علاقے کے تھانے میں فون کیا جس کے بعد میری گرفتاری عمل میں آئی۔ پولیس نے میرے خون وغیرہ کے جو نمونے لیے تھے ان سے یہ ثابت ہو گیا کہ میں نا صرف شراب پیے ہوئے تھا بلکہ کوئی اور بھی زود اثر نشہ استعمال کیا تھا اس لیے قتل جیسی واردات کر کے فرار ہونے کے بجائے وہیں پڑ کر سو رہا۔ پولیس نے قتل کا محرک پیش کرنے کے لیے ہانیہ کی ڈائری اپنے قبضے میں لے لی تھی۔ میں انگشت بدنداں یہ تمام مڑے حقائق سنتا رہا اور پھر عدالت کے سامنے اپنا بیان دیا لیکن ظاہر ہے پولیس کی طرف سے جس انداز سے کیس تیار کیا گیا تھا عدالت نے آسانی سے اسے میرا ایک ہفتے کا جسمانی ریمانڈ دے دیا۔ جج کے اس فیصلے کے بعد مجھے عدالت سے باہر لے جایا جانے لگا تو رات مجھ سے ہمدردی سے پیش آنے والا سپاہی میرے ساتھ ساتھ چل رہا تھا۔

''ملزم کو حاجت کے لیے بیت الخلا جانا ہے۔'' چار چھ قدم چلنے کے بعد ہی اس نے اپنے دیگر ساتھیوں سے بلند آواز میں کہا۔ میں اس کی تردید کے لیے منہ کھولنا چاہتا تھا کہ اس نے زور سے میرا ہاتھ دبایا۔ میرا جسم یکدم اکڑ گیا اور مجھے اس کی رات والی ہدایت یاد آ گئی۔ اب میں سپاہیوں کے جلو میں بیت الخلا کی طرف جا رہا تھا۔

''ہوادان کی سلاخیں نکلی ہوئی ہیں۔ وہاں سے دوسری طرف اتر جاؤ تو ایک بندہ تمہاری مدد کے لیے موجود ہو گا۔'' بیت الخلا کے دروازے تک صرف وہی سپاہی میرے ساتھ آیا تھا اور اس نے مجھ سے سرگوشی میں یہ بات کہی تھی۔ میں اندر جا کر کچھ دیر تذبذب میں گھرا رہا کہ آیا اس کی بات مانوں یا نہیں۔ آخرکار میں نے فرار کا فیصلہ کر لیا کیونکہ جس انداز میں کیس تیار کیا گیا تھا اس سے صاف ظاہر تھا کہ مجھے پھنسانے کے لیے بھرپور سازش کی گئی ہے اور میں پولیس کے قبضے میں رہا تو اپنی جان بچانے کے لیے ذرا ہاتھ پیر نہیں مار سکوں گا۔ البتہ یہ بات اپنی جگہ ایک معما تھی کہ مجھے فرار ہونے کا موقع کس کے اشارے پر دیا جا رہا ہے۔ میں بیت الخلا کے ہوادان سے نکل کر باہر پہنچا تو سپاہی کے کہنے کے مطابق ایک بندہ میرے انتظار میں موجود تھا۔ اس نے مجھے ایک چادر اوڑھنے کے لیے دی جسے اپنے گرد لپیٹ کر میں آسانی سے وہاں سے نکل گیا۔

''تم مجھے کہاں لے جا رہے ہو؟'' میں اس کے ساتھ نیلے رنگ کی گاڑی میں بیٹھ کر روانہ ہوا تو دریافت کیا۔

''تمہارے ایک ہمدرد کے پاس۔ باقی تعارف وہ

ملاقات ہونے پر خود کر دا ئیں گے۔" اس نے مجھے جواب دیا اور میرے مزید اصرار پر کچھ بھی بتانے سے انکار کر دیا۔ مجبوراً میں خاموشی سے اس کے ساتھ والی سیٹ پر بیٹھا رہا۔ اتنی ہمت بھی نہیں تھی کہ اسے گاڑی روکنے کے لیے کہتا۔ مجھے تو ایسا لگ رہا تھا کہ فرار کے بعد سارے شہر کی پولیس میری تلاش پر مامور کر دی گئی ہوگی اور عافیت صرف اس گاڑی کے اندر ہے۔ آخرکار گاڑی متوسط طبقے کی آبادی کے ایک گھر کے سامنے جارکی۔ میرے ساتھ موجود آدمی نے نیچے اتر کر گھنٹی بجائی تو فوراً دروازہ کھل گیا۔ دروازہ کھولنے والی ایک بیس پچیس سال کی عورت تھی جس نے شوخ رنگ کی ساڑی پہن رکھی تھی۔ اس کے چہرے پر خاصا میک اپ تھا اور بال بھی سلیقے سے بنے ہوئے تھے۔ ماتھے پر موجود بندیا اور مانگ میں بھری سندور سے ظاہر ہو رہا تھا کہ عورت ہندو ہے۔ اس نے ہمیں اندر آنے کا راستہ دیا اور گیٹ دوبارہ بند کر لینے کے بعد ایک کمرے کی طرف اشارہ کیا۔ مجھے اپنے ساتھ لانے والا میرا ہاتھ پکڑ کر اس کمرے کی طرف بڑھ گیا۔ دستک کے جواب میں کسی نے رعب دار آواز میں اندر آنے کی اجازت دی۔ اجازت کے جواب میں مجھے اندر جانے کا اشارہ کر کے میرے ساتھ آنے والا خود باہر کھڑا رہا۔ میں جھجکتے ہوئے کمرے میں داخل ہوا۔ یہ ڈرائنگ روم کی طرز پر سجا کمرا تھا جہاں میرا سامنا ایک صوفے پر بیٹھے درمیانی جسامت کے تقریباً پچپن سالہ آدمی سے ہوا۔ اس کا لباس قیمتی تھا اور چہرے پر موجود وقار سے ظاہر ہو رہا تھا کہ وہ کسی اونچی حیثیت کا مالک ہے۔

"تشریف رکھیے مسٹر کامران۔ میرا نام بیرسٹر رستم ملک ہے اور میرے ہی کہنے پر آپ کو مصیبت سے نکال کر یہاں لایا گیا ہے۔" مجھے بیٹھنے کے لیے کہتے ہوئے اپنا تعارف کروایا تو میں چونک گیا۔

"بیرسٹر رستم ملک۔۔۔ کامران ملک کے والد اور ہانیہ حسین کے والد عنایت حسین کے دوست؟" ہانیہ کی ڈائری سے حاصل شدہ معلومات کی روشنی میں میں نے اس سے تصدیق چاہی۔

"بالکل صحیح پہچانا۔ میں ہی ہوں کامران ملک کا بدنصیب باپ۔" اس نے ایک سرد آہ کے ساتھ اقرار کیا۔

"میں سمجھ نہیں سکا کہ آپ نے میری مدد کیوں کی؟" میں نے جھجکتے ہوئے سوال کیا۔

"انسانیت کے ناتے۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ میرے بیٹے کی طرح ایک اور بے گناہ نوجوان فیصل جیسے شیطان کی سازش کے جال میں پھنس کر اپنی زندگی سے ہاتھ دھو بیٹھے۔" رستم ملک کے جواب پر میں بھونچکا رہ گیا۔

"یعنی آپ کے خیال میں یہ سب فیصل صاحب نے کروایا ہے؟" میں نے ہکلاتے ہوئے پوچھا۔

"اور کون ہے جسے یہ سب کرنے کی ضرورت ہوتی؟" اس نے تلخی سے جواب دیا تو میں سر تھام کر بیٹھ گیا۔

"میری سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا کہ یہ سب کیا ہے؟"

"حالانکہ بات بالکل واضح ہے۔ فیصل کو ایک قربانی کے بکرے کی ضرورت تھی جو تمہاری صورت اسے مل گیا۔" ان کا لہجہ اب بھی تلخ لیکن مدھم تھا۔

"کیا آپ کچھ اور وضاحت کریں گے؟" حالات نے میرا سر چکرا کر رکھ دیا تھا اس لیے میں نے وضاحت چاہی۔

"تم ذرا سا غور و خوض کرو تو خود بھی سمجھ سکتے ہو لیکن شاید اس وقت تمہارا دماغ کام نہیں کر رہا ہے اس لیے میں ہی سمجھا دیتا ہوں۔" انہوں نے نرمی سے جواب دیا اور سگار سے کش لینے کے بعد گفتگو کا سلسلہ شروع کیا۔

"میرے دوست عنایت حسین کی کل جائداد کی مالک ان کی اکلوتی بیٹی ہانیہ حسین تھی لیکن اسے اس جائداد کا مختار اس وقت بنایا جاتا جب اس کی شادی ہو جاتی۔ ایچ ایچ بلڈرز میں دس فیصد شیئرز کا مالک عنایت کا بھائی فیصل کاروباری فیصلے کرنے کا اختیار تو رکھتا ہے لیکن کل انتظام کی نگرانی میرے ذمے ہے۔ عنایت نے اپنی وصیت میں بالکل واضح کر دیا تھا کہ ہانیہ کو ہر ماہ اخراجات کے لیے ایک بڑی رقم ضرور دی جائے گی لیکن یہ رقم مخصوص تھی۔ شادی سے پہلے اگر کسی بھی وجہ سے ہانیہ کی موت ہو جاتی تو ساری پراپرٹی ٹرسٹ کے حوالے کر دی جاتی۔ شادی شدہ اور صاحب اولاد ہونے کی صورت میں ہانیہ کے بچے اس کے وارث ہوتے۔ شاید عنایت کو اپنے قریبی رشتوں سے کسی قسم کا کوئی خطرہ تھا اس لیے اس نے اپنی زندگی میں ہی بہت سوچ سمجھ کر یہ وصیت تیار کروائی تھی۔ عنایت کا انتقال ہوا تو میں نے اس وصیت پر عمل کروانا شروع کر دیا کیونکہ میں اس کا لیگل ایڈوائزر تھا۔ فیصل یہ جان کر کہ بھتیجی کی جائداد پر اس کا کوئی کنٹرول نہیں ہے اور وہ کسی بہانے اسے لوٹ نہیں سکتا بہت جز بز ہوا۔ اس کی کوئی اولاد نرینہ ہوتی تو شاید وہ ہانیہ کی اس سے شادی کی کوشش کرتا۔ بہرحال ایسا نہیں تھا اور دوسری طرف میرے بیٹے کامران اور ہانیہ کی بچپن کی دوستی محبت میں بدل گئی تھی۔ فیصل نے مجھ پر الزام لگایا کہ میں نے ہانیہ کی دولت ہتھیانے کے

لیے اپنے بیٹے کو اس کے پیچھے لگایا ہے۔ میں نے اسے سمجھانے کی کوشش کی کہ یہ ان دونوں کا اپنا فیصلہ ہے اور میرا اس میں کوئی دخل نہیں لیکن فیصل نے اس بات کو تسلیم نہیں کیا پھر ایک روز میرا بیٹا کامران ایک ٹریفک حادثے میں ہلاک ہو گیا۔ وہ بہت زیادہ نشے کی حالت میں گاڑی چلا رہا تھا۔ بعد میں، میں نے تحقیقات کروائیں تو معلوم ہوا کہ حادثے سے پہلے کامران فیصل کے گھر پر تھا اور وہیں اس نے بہت زیادہ شراب نوشی کی تھی، کیوں اور کس لیے اس کا مجھے علم نہیں۔ نہ ہی میں اس بنیاد پر فیصل کے خلاف کوئی کیس کر سکتا تھا اس لیے چپ بیٹھا رہا۔ ہانیہ نے کامران کی موت کا بہت اثر لیا اور اکثر میرے پاس آتی رہتی تھی۔ ایک دن اچانک ہی اس نے مجھے بتایا کہ وہ شادی کر رہی ہے تو میں حیران رہ گیا لیکن جب اس نے بتایا کہ وہ میرے کامران کی نشانی کو باعزت طور پر دنیا میں لانے کے لیے اس شادی پر مجبور ہے تو مجھے بھی اس کے فیصلے کی تائید کرنی پڑی۔ میں تمہاری شادی کی تقریب میں شریک تھا اور مجھے معلوم ہو چکا تھا کہ تم ایک مجبور نوجوان ہو۔ مجھے یقین تھا کہ اپنے ساتھ دھوکے کا علم ہونے پر بھی تم کوئی بڑا قدم نہیں اٹھا سکو گے اور معاملہ کسی ڈیل سے طے پا جائے گا لیکن ہانیہ کے تمہارے ہاتھوں قتل کا سن کر میں حیران رہ گیا اور جب کیس کی تفصیلات میرے علم میں آئیں تو میں سمجھ گیا کہ اس سب کے پیچھے فیصل کی سازش ہے۔ میں نے تمہیں اس سازش سے بچا کر نکالنے کا بندوبست کر دیا لیکن ظاہر ہے کہ پولیس تمہاری تلاش میں ہو گی اور تم اس وقت تک آزادانہ زندگی نہیں گزار سکو گے جب تک فیصل اپنے انجام کو نہیں پہنچ جاتا اس لیے تمہارا سب سے پہلا کام یہ ہونا چاہیے کہ تم فیصل سے نمٹو۔ اس سے اس کا جرم اگلواؤ اور اپنے لیے نجات پالو۔ میں اس سلسلے میں تمہاری مالی معاونت کرنے کے علاوہ مزید کچھ نہیں کر سکتا۔ آگے سب کچھ تمہیں اپنے بل بوتے پر کرنا ہوگا۔“

رستم ملک نے سازش کے سارے تانے میرے سامنے رکھ دیے۔ فیصل رضا کی ساری سازش سامنے آ جانے کے بعد میں اپنے دل میں اس شخص کے لیے شدید نفرت محسوس کر رہا تھا اور چاہتا تھا کہ ایک پل کی بھی تاخیر کیے بغیر اس کی گردن ناپنے کے لیے نکل کھڑا ہوں لیکن رستم ملک نے مجھے سمجھایا کہ میں جوش سے کام لینے کے بجائے تھوڑی عقل مندی کا مظاہرہ کروں۔ میں مفرور مجرم ہوں اس لیے بہتر ہے کہ دن کے اجالے میں باہر نکلنے کے بجائے رات کی تاریکی میں چھپ کر نکلوں۔ مجھے ان کی بات سمجھ آ گئی۔ دن ڈھلے میرے لیے فیصل کے بنگلے میں داخل ہونا ویسے بھی مشکل ثابت ہوتا۔ ”میرے خیال میں تمہیں یہ وقت آرام کرنے اور آگے کی پلاننگ میں صرف کرنا چاہیے۔ تھوڑی دیر میں، میں یہاں سے چلا جاؤں گا لیکن یہاں موجود عورت تمہارا پورا خیال رکھے گی۔ تمہیں اپنے کام کے لیے جن چیزوں کی ضرورت ہو اسے بتا دینا۔ سارا بندوبست ہو جائے گا۔“ مجھے... سوچ بچار میں مبتلا دیکھ کر انہوں نے کہا اور اپنی جگہ سے کھڑے ہو گئے۔ ان کے جانے کے بعد پہلے سے بند نظر آنے والی عورت کمرے میں داخل ہوئی۔

”میں نے آپ کے لیے باتھ روم میں کپڑے لٹکا دیے ہیں۔ آپ باتھ لے لیں پھر میں کھانا لگا دیتی ہوں۔“ اس عورت نے کہا۔ اس کی راہنمائی میں، میں غسل خانے تک پہنچ گیا۔ حوالات میں گزرے وقت نے میرا حلیہ ہی بدل کر رکھ دیا تھا۔ جسم کے کئی حصوں میں درد تھا۔ نیم گرم پانی سے بھرپور غسل لینے کے بعد میں نے خود کو خاصا بہتر محسوس کیا۔ میں باہر نکلا تو وہ مجھے کچن میں نظر آئی۔

”بس پانچ منٹ انتظار کرو۔ میں کھانا لگا رہی ہوں۔“ اس نے مسکرا کر مجھ سے کہا اور فرائنگ پین میں موجود شامی کبابوں کو پلٹنے لگی۔ کبابوں کی اشتہا انگیز خوشبو نے میری بھوک کو چمکا دیا۔ صبح ملنے والا چائے پاپوں پر مشتمل ناشتا تو جانے کب کا ہضم ہو چکا تھا لیکن بھوک کا احساس ذرا سکون ملنے پر اب جاگا تھا۔

”آپ کا نام کیا ہے؟“ میں نے ساڑی میں ملبوس عورت کو ماہرانہ انداز میں ہاتھ چلاتے ہوئے دلچسپی سے دیکھا اور دریافت کیا۔

”شگفتہ!“ اس نے اپنی لوچ دار آواز میں جواب دیا۔

”یہ آپ کا گھر ہے؟“ میں نے اگلا سوال داغا۔

”ہمارا ہی سمجھیے۔“ اس نے قدرے مبہم جواب دیا پھر کھانا لگانے لگی۔ کھانے میں شامی کباب کے علاوہ بکرے کے گوشت کا پلاؤ اور چکن تکے بھی شامل تھے۔ رائتے اور سلاد کا بھی اہتمام کیا گیا تھا۔ ”یہ اتنی بہت سی چیزیں آپ نے کس وقت تیار کر لیں؟“ میں نے ڈائننگ ٹیبل کو دیکھ کر حیرت کا اظہار کیا تو وہ دلکش انداز میں مسکرائی اور بولی۔ ”رستم جی نے صبح فون پر بتا دیا تھا کہ ان کا ایک مہمان آنے والا ہے سو ہم نے تھوڑی بہت تیاری کر لی لیکن آپ زیادہ متاثر ہونے کی غلطی مت کیجیے۔ یہ شامی کباب، تکے اور رائتا سب زینب مارکیٹ سے منگوایا گیا ہے۔ ہم نے صرف پلاؤ اور سلاد تیار

کہا ہے۔'' اس کے بولنے میں بڑی بے ساختگی تھی۔ مجھے اس سے بات چیت کرنے میں مزہ آرہا تھا اور وقتی طور پر بھول گیا تھا کہ میں کس مشکل میں پھنسا ہوا ہوں۔

''رستم صاحب سے آپ کی کیا رشتے داری ہے، کیا آپ ان کی عزیزہ ہیں؟'' اس کے نام اور حلیے سے ظاہر تھا کہ اس کا رستم سے کوئی شرعی و قانونی رشتہ ہونے کا امکان نہیں پھر بھی میں نے اپنے تجسس سے مجبور ہو کر سوال کیا۔

''نہیں لیکن ہم انہیں بہت عزیز ہیں۔'' اس نے اسی بے ساختگی سے جواب دیا اور کھلکھلا کر ہنس دی۔ مجھے محسوس ہوا کہ اب مزید سوال کرنا بدتہذیبی میں شمار ہوگا اس لیے خاموشی سے کھانا کھانے لگا۔

''ہمارے تعارف میں کس لیے خود کو الجھانے لگے۔ اس مقصد پر توجہ رکھیے جس کی خاطر یہاں موجود ہیں۔''

مجھے خاموش پا کر اس نے نصیحت کی پھر اسی طرح کی باتیں کرنے لگی جس سے مجھے اندازہ ہوا کہ اسے میرے حالات کا اچھی طرح علم ہے۔ اس نے مجھے صلاح دی کہ مجھے فیصل جیسے دھوکے باز اور مکار شخص کے ساتھ کسی رعایت سے کام نہیں لینا چاہیے۔ میں خود بھی کچھ اسی انداز میں سوچ رہا تھا۔ کھانے کے بعد میں اس کے فراہم کردہ نوٹ پیڈ پر ان چیزوں کے نام لکھنے لگا جن کی مجھے ضرورت پڑ سکتی تھی۔ شگفتہ نے مجھ سے میری پلاننگ کے بارے میں پوچھا اور سن کر خود بھی کئی مشورے دیے۔ اور مجھے آرام کرنے کا مشورہ دیتے ہوئے ایک کمرے میں پہنچا دیا۔ میں آرام دہ بستر پر لیٹا تو پھر کوئی ہوش نہیں رہا۔ مغرب کے بعد ہی میری آنکھ کھلی۔ میں باہر آیا تو شگفتہ نے مجھے میرا مطلوبہ سامان دکھایا۔ فہرست میں درج ہر چیز موجود تھی۔ میں سارا سامان چیک کرنے کے بعد مطمئن ہو گیا تو اس نے مجھے چائے پیش کی۔ چائے پینے کے دوران شگفتہ نے مجھے بتایا کہ مسٹر رستم ملک ایک بے حد ہمدرد انسان ہیں جو اپنے جوان بیٹے کی موت کے بعد اندر سے ٹوٹ پھوٹ کر رہ گئے ہیں۔

اس نے انکشاف کیا کہ وہ خود فلموں کے شوق میں گھر سے بھاگی ہوئی لڑکی ہے جو روایت کے مطابق ہیروئن تو نہ بن سکی لیکن سوشل بدمعاشوں کے ہاتھ لگ گئی۔ ابتدائی ذلت کے بعد قسمت سے اس کی رستم ملک سے ملاقات ہو گئی۔ رستم ملک ایک ایسی این جی او کے کرتا دھرتاؤں میں سے تھے جو بے سہارا خواتین اور بچوں کے لیے کام کرتی ہے۔ شگفتہ کی کہانی جان کر انہیں اس سے ہمدردی محسوس ہوئی اور انہوں نے اسے مطلب پرستوں کے شکنجے سے نکال کر اس گھر میں لا بٹھایا۔ شگفتہ کے مطابق وہ یہاں خوش تھی اور عزت کی زندگی گزار رہی تھی۔ ایک پل کے لیے مجھے شک ہوا کہ رستم ملک کی یہ ہمدردی بے وجہ تو نہیں ہوگی اور وہ شگفتہ کے آنچ دیتے حسن سے ضرور آگ تاپتا ہوگا لیکن پھر میں نے خود ہی اپنے آپ کو جھڑک دیا۔ مجھے کوئی حق نہیں پہنچتا تھا کہ میں ان کے بارے میں اس انداز سے سوچوں۔ اگر وہ غلط آدمی ہوتے تو شگفتہ ہرگز بھی ان کی اتنی عزت نہ کرتی۔ تقریباً ساڑھے آٹھ بجے شگفتہ نے مجھے لائٹ سا ڈنر کروایا۔ ایکٹو رہنے کے لیے ضروری تھا کہ زیادہ شکم سیری نہ کی جائے۔ ساڑھے بارہ بجے رات کو میں وہاں سے روانہ ہوا۔ میرا سامان ایک چھوٹے شولڈر بیگ میں رکھا ہوا تھا۔ صرف پسٹل کو میں نے اپنے بیلٹ میں اڑس لیا تھا۔ ٹی شرٹ اور پینٹ پر مشتمل گہرے رنگ کا یہ لباس بھی مجھے میری فرمائش پر فراہم کیا گیا تھا۔ باہر نکل کر میں نے ایک ٹیکسی لی اور فیصل کے بنگلے کی طرف روانہ ہو گیا۔ منزل کے قریب پہنچ کر میں نے ٹیکسی بنگلے سے کافی پہلے ہی رکوا لی۔ ان لمحات میں خون میری کنپٹیوں میں ٹھوکریں مار رہا تھا۔ مجھے شدید غصہ تھا کہ فیصل نے مجھے مجبور پا کر بلیک میل کرنے کی کوشش کی۔ میں اندازہ کر سکتا تھا کہ ان حالات نے میرے گھر والوں کو کتنی بری طرح متاثر کیا ہوگا۔ میں نے احتیاطاً اپنے گھر والوں سے رابطہ کرنا بھی مناسب نہیں سمجھا تھا۔ پولیس والے سب سے پہلے ان کے ذریعے ہی مجھ تک پہنچنے کی کوشش کرتے اور میں دوبارہ گرفتاری سے قبل فیصل سے دو دو ہاتھ کرنا چاہتا تھا۔ بنگلے کے قریب پہنچ کر میں باہر ہی رک گیا۔ یہ بنگلا میرا اچھی طرح دیکھا بھالا تھا۔ حفاظت کے لیے چوکیدار کے علاوہ دو کتے موجود تھے جو رات کے وقت کھلے چھوڑ دیے جاتے تھے۔ میں ان کتوں کے انتظام کا سامان ساتھ لایا تھا۔ بنگلے کی پچھلی گلی میں پہنچ کر میں نے اپنا بیگ کھولا اور پلاسٹک کے تھیلوں میں سے گوشت کے پارچے باہر نکالے۔ ان پارچوں میں ایک زود اثر زہر کی آمیزش کی گئی تھی۔

میں نے دیوار کے دوسری طرف لان میں پارچوں کو پھینکا تو چند سیکنڈوں میں ہی رد عمل ظاہر ہو گیا۔ کتے ہلکی آواز میں بھونکتے ہوئے اس طرف آتے محسوس ہوئے پھر یقیناً انہوں نے گوشت سے لطف اندوز ہونا شروع کر دیا۔ کچھ دیر توقف کرنے کے بعد میں نے دیوار پر چڑھ کر اندر جھانکا۔ گوشت میں شامل زہر نے کتوں کے معدے میں پہنچ کر اثر دکھانا شروع کر دیا تھا اور وہ زمین پر پڑے تڑپ

رہے تھے۔ تکلیف کی وجہ سے ان کے حلق سے دردناک آوازیں بھی نکل رہی تھیں۔ یہ آوازیں یقیناً چوکیدار کے کانوں تک پہنچ گئی ہوں گی۔ جب ہی وہ بھاگتا ہوا اسی طرف آرہا تھا۔ کتوں کے قریب پہنچ کر اس نے پہلے تو تشویش سے انہیں دیکھا پھر چوکنا ہو کر اِدھر اُدھر نظریں دوڑانے لگا۔ اس سے قبل کہ وہ سر اٹھا کر دیوار کی طرف دیکھتا، میں نے چھلانگ لگائی اور سیدھا اس کے اوپر جا کر گرا۔ میرا وزن پڑنے کی وجہ سے وہ اپنا توازن برقرار نہیں رکھ سکا اور ہم دونوں اس طرح زمین پر گرے کہ میں اس کے اوپر تھا۔ گرنے سے مجھے بھی چوٹیں آئیں لیکن میں ان چوٹوں پر توجہ نہیں دے سکتا تھا۔ چوکیدار کے سنبھلنے سے پہلے ہی میں نے اپنی بیلٹ میں اڑسا پسٹل نکالا اور چوکیدار کے سر پر لگاتار دو وار کر ڈالے۔ میں اس قسم کے کاموں میں قطعی مہارت نہیں رکھتا تھا لیکن اپنی سی کوشش ضرور کی تھی کہ وہ صرف بے ہوش ہو سکے۔ چوکیدار نے ہاتھ پیر ڈھیلے چھوڑ دیے تو میں اس کے اوپر سے اتر گیا اور بیگ میں سے رسّی نکال کر اس کے ہاتھ پیر باندھ ڈالے۔ اب وہ ہوش میں آ بھی جاتا تو میرے لیے خطرہ نہیں بن سکتا تھا۔ آگے میرا کام آسان تھا۔ میں جانتا تھا کہ چوکیدار کے علاوہ بنگلے میں کوئی دوسرا کل وقتی ملازم موجود نہیں ہوتا۔ مختلف کام انجام دینے والے ملازم زیادہ سے زیادہ رات ساڑھے دس گیارہ بجے تک وہاں سے رخصت ہو جاتے تھے چنانچہ مجھے صرف گھر کے مکینوں سے ہی نمٹنا تھا۔ جلد ہی میں نے اندر تک پہنچنے کا راستہ تلاش کر لیا۔ لان کا نظارہ کرنے کے لیے بنائی گئی گلاس وال کاٹ کر اندر داخل ہونے کے لیے مجھے تھوڑی سی محنت کرنی پڑی تھی لیکن کام صفائی سے ہو گیا۔

رستم ملک کے تعاون نے مجھے وہ سارا سامان مہیا کر دیا تھا جو شاید میں خود اپنے بل بوتے پر حاصل نہ کر پاتا۔ اندر داخل ہونے کے بعد میں نے سیڑھیوں کا رخ کیا کیونکہ رہائشی کمرے اوپری منزل پر تھے۔ پہلے پڑنے والا بیڈ روم طوبیٰ کا تھا۔ میرے اندازے کے مطابق یہ شوخ و شنگ لڑکی اپنے باپ کے ساتھ اس جرم میں شامل نہیں ہو سکتی تھی چنانچہ میں اس کے ساتھ کسی قسم کا سخت برتاؤ نہیں کرنا چاہتا تھا۔ میں نے اس کے بیڈ روم کے دروازے کو کھولنے کی کوشش کی تو دروازہ آسانی سے کھل گیا۔ اسے اندر سے لاک نہیں کیا گیا تھا۔ نائٹ بلب کی روشنی میں، میں نے طوبیٰ کو بستر پر محوِ خواب دیکھا۔ میں دبے قدموں چلتا ہوا اس کے قریب پہنچا اور کلوروفام میں ڈوبا رومال اس کے منہ پر رکھ دیا۔ وہ ذرا سا کسمسانے کے بعد بے ہوش ہو گئی۔ اس کے بعد میں نے فیصل کے بیڈ روم کا رخ کیا۔ اس کا بیڈ روم اندر سے لاک تھا۔ میں نے مزید احتیاط پسندی کا مظاہرہ کرنے کے بجائے پسٹل کی نال لاک پر رکھ کر ٹریگر دبا دیا۔ ایک زوردار دھماکا ہوا لیکن مجھے امید تھی کہ اس دھماکے کی آواز بنگلے کے اندر ہی گونج کر رہ جائے گی اور اردگرد کے بنگلوں کے مکین متوجہ نہیں ہوں گے۔ لاک ٹوٹتے ہی میں دروازے کو دھکیل کر پھرتی سے اندر داخل ہو گیا۔ فیصل ... اور اس کی بیوی تو بیرے اندر داخل ہونے تک اٹھ کر بیٹھ چکے تھے اور خاصے گھبرائے ہوئے لگ رہے تھے۔ میں نے فوراً ہی پسٹل ان پر تان دیا۔ ''یہ کیا بدتمیزی ہے۔'' مجھے سامنے پا کر فیصل برہمی کا اظہار کرنا چاہا۔

''اس بدتمیزی پر تم نے مجھے مجبور کیا ہے۔ دولت کی ہوس میں اپنی بہن کے خون سے ہاتھ رنگنے والے سفاک انسان تیرا یوم حساب آچکا ہے۔ تو نے اپنی یتیم بہن کے ساتھ جو کچھ کیا اس کا حساب تو تو اوپر پہنچ کر دے گا لیکن میرے خلاف کی جانے والی سازش کا جواب تجھے ابھی اور اسی وقت دینا ہوگا۔'' میں کسی پنجابی فلم کے ہیرو کی طرح بھڑک کر بولا۔

''بکواس مت کرو۔ بانیہ کو میں نے نہیں تم نے قتل کیا ہے۔ مجھے بتاؤ مسجد سے جوتے چرانے والے دو ٹکے کے انسان میں اتنی غیرت کہاں سے آگئی تھی کہ اس نے اپنی بیوی کو قتل کر ڈالا؟'' فیصل نے دوبدو جواب دیا۔

''یہ سارا تیرا اسٹیج کیا ہوا ہے ڈرامہ ہے کمینے۔ تو نے ہی جان کر اس رات مجھے بانیہ کی ڈائری بھجوائی تھی کہ صبح اس کا قتل ہو تو پولیس کے سامنے مجھے قاتل قرار دینے کا جواز پیش کیا جا سکے۔ مجھے تو معلوم بھی نہیں تھا کہ بانیہ کب دبئی سے واپس آرہی ہے۔ مجھے تو نیند ... سے جگا کر بتایا گیا کہ میں اپنی بیوی کا قتل کر چکا ہوں اور یہ سارا کھیل تو نے کھیلا۔ تو ہے بانیہ کا قاتل۔'' میں اتنی زور سے چیخا کہ گلے کی رگیں پھول گئیں۔

''بکواس مت کرو۔ میرے پاس بانیہ کو قتل کرنے کا کوئی جواز نہیں تھا۔'' فیصل نے پھر ایک بار میرے الزام کی تردید کی۔ مجھے غصہ آگیا اور میں نے اس کا گریبان پکڑ کر اسے جھنجھوڑ ڈالا۔

''کیسے نہیں تھا جواز؟ جواز تو تھا۔ بانیہ کے قتل کے الزام میں مجھے پھانسی پر لٹکانے کے بعد ایک تو ہی تو ہے اس کا سگا بچا جو اس کی دولت کا وارث قرار پائے گا۔''

''نہیں۔ بانیہ کے قتل کے بعد مجھے کچھ نہیں مل سکتا۔ اگر وہ اپنے بچے کی پیدائش تک زندہ رہتی تو اس صورت میں

پھر بھی مجھے کوئی فائدہ ہوسکتا تھا۔ اس کے بعد میں اس کے بچے کا سرپرست قرار پاتا اور بانیہ کی پراپرٹی کی دیکھ بھال بھی مجھے کرنی ہوتی۔ اب تو اس کی ساری پراپرٹی ٹرسٹ کو چلی جائے گی اور مجھے اپنے دس فیصد شیئرز کے سوا کچھ نہیں ملے گا۔'' فیصل نے وضاحت دی تو میں سوچ میں پڑ گیا۔ بیرسٹر رستم علی نے بھی مجھ سے وصیت کے سلسلے میں ایسی ہی کوئی بات کہی تھی یعنی فیصل کا ذاتی بانیہ کے قتل سے کوئی تعلق نہیں ہوسکتا تھا۔ اس کے بعد کون سا ایسا فرد تھا جس سے میں باز پرس کرتا۔ یکلخت ہی میرے ذہن میں بانیہ کی ملازمہ خاص نسرین کا خیال آیا۔ اس نے ہی بانیہ کے قتل والی رات مجھے اس کی ڈائری دی تھی۔ اس ڈائری کے مندرجات نے مجھے قاتل ثابت کرنے میں اہم کردار کیا تھا۔ اس کے علاوہ نسرین نے گواہوں کے کٹہرے میں کھڑے ہوکر بھی چند ایسی باتیں کہی تھیں جو میرے خلاف جاتی تھیں۔ اب تک تو میں اسے فیصل کا ہی آلۂ کار سمجھ رہا تھا لیکن فیصل کے پاس قتل کا کوئی محرک موجود نہ ہونے کی صورت میں یہ سوال اٹھتا تھا کہ نسرین کس کے کہنے پر میرے خلاف سرگرم عمل ہے۔ میرے دل میں خواہش پیدا ہونے لگی کہ میں فوری طور پر اس تک پہنچوں اور باز پرس کروں۔ اسی خیال کے تحت میں نے فیصل سے اس کی بابت پوچھا۔

''وہ اپنے گھر پر ہوگی۔ بانیہ والی کوٹھی کو تالا لگا کر میں نے فی الحال سب ملازموں کو چھٹی دے دی ہے۔ کوٹھی پر ایک چوکیدار کے سوا کوئی نہیں ہے۔'' اس نے نہایت شرافت سے میرے سوال کا جواب دیا۔ پھر نہایت غور سے میری شکل دیکھتے ہوئے بولا۔ ''کیا سچ مچ تمہارا بانیہ کے قتل سے کوئی تعلق نہیں ہے؟'' اس سوال سے میں جھنجلا گیا۔

''نہیں ہے میرا کوئی تعلق کیونکہ تمہارے اندازے کے عین مطابق میں سچ مچ اتنا غیرت مند نہیں ہوں کہ حقیقت جاننے پر اسے قتل کردیتا۔ میں غصے میں ضرور تھا لیکن اچھی طرح جانتا تھا کہ زبانی برا بھلا کہنے کے سوا تم لوگوں کا کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔'' بولتے ہوئے میرے اندر کی شکست و ریخت لہجے سے ظاہر ہونے لگی تھی۔ فیصل کے برابر میں اب تک خاموش بیٹھ کر ساری گفتگو سنتی اس کی بیوی نے ذرا ہمدردی سے مجھے دیکھا۔ دونوں میاں بیوی ابھی تک اپنے بیڈ پر ہی بیٹھے ہوئے تھے۔

''مجھے افسوس ہے لیکن تم خود کو میری جگہ رکھ کر دیکھو تو سمجھ سکو گے کہ میرے پاس خاندان کی عزت بچانے کا صرف یہی ایک راستہ تھا۔'' فیصل نے کسی مجبور شخص کی سے لہجے میں کہا تو مجھے قائل ہونا پڑا۔ میں جو غصہ اور اشتعال دل میں لے کر یہاں آیا تھا اب اس کا رخ ملازمہ نسرین کی طرف مڑ گیا تھا۔ میں نے اس کا پتا جاننا چاہا تو ثوبیہ نے بتایا کہ موہنی کالونی کے علاقے میں کہیں اس کا گھر ہے۔ مکمل پتا انہیں بھی نہیں معلوم تھا البتہ انہوں نے خیال ظاہر کیا کہ بانیہ کے ڈرائیور کو معلوم ہوگا۔ میرا وہاں مزید رکنا بے کار تھا۔ اس لیے واپسی کے لیے مڑا۔ ٹوٹے ہوئے لاک والے دروازے کو میں نے یوں ہی بھیڑ دیا تھا۔ باہر نکلنے کے لیے میں نے ہینڈل پر دباؤ ڈال کر ذرا سا ہی دروازہ کھولا تھا کہ دروازے کے دوسری طرف کسی کی جھلک دکھائی دی۔ پولیس کی یونیفارم پہچاننے میں مجھے ذرا وقت نہیں ہوئی اور میں دروازے کو واپس دھکیل کر تیزی سے کمرے میں موجود سلائیڈنگ گلاس ونڈو کی طرف بھاگا۔ میرے کھڑکی کھول کر اس کی سلِ پر چڑھنے تک پولیس والے اندر داخل ہوچکے تھے۔ کھڑکی کے عین نیچے گرل نما لوہے کا وہ جال تھا جو پہلی منزل پر ہوا کی آمد و رفت جاری رکھنے کے لیے عموماً چھت کے کچھ حصے میں استعمال کیا جاتا ہے۔

''کامران رک جاؤ۔'' میرا ارادہ بھانپ کر مجھے پیچھے سے پکارا گیا۔ میں نے پکارنے والے کی طرف پلٹ کر دیکھنے کی زحمت کیے بغیر چھلانگ لگادی کیونکہ ایک بار پھر پولیس کے ہاتھوں میں آجانے کے بعد میں اپنے لیے کچھ نہیں کرسکتا تھا۔ جال پر گرنے کے بعد جیسے ہی میں سیدھا کھڑا ہوا اوپر سے گولی چلنے کی آواز آئی اور گلاس ونڈو کے شیشے ریزہ ریزہ ہوکر برسات کی صورت میرے اوپر گرنے لگے۔ میں نے بے ساختہ ہی اپنا سر دونوں بازوؤں سے چھپا کر اپنے چہرے کو بچانے کی کوشش کی۔ اضطراری طور پر میرے ہاتھ میں موجود پستول چل گیا۔ گولی کی آواز کے ساتھ ہی میں نے اس کی نال سے نکلتا دھواں بھی واضح طور پر دیکھا۔

''تم پوری طرح ہمارے گھیرے میں ہو کامران۔ بھاگنے کی احمقانہ کوشش مت کرنا ورنہ نقصان اٹھاؤ گے۔''

اس بار کسی نے اوپر کھڑکی میں کھڑے ہوکر مجھے تنبیہ کی۔ ہوسکتا ہے عالم دیوانگی میں، میں کان نہ دھرتا لیکن میں نے دیکھ لیا کہ بنگلے کے باہر بھی پولیس والے موجود ہیں۔ مجبوری میں مجھے اپنے ہاتھ بلند کرکے سرینڈر کرنا پڑا۔ پولیس والوں نے مجھے ہتھکڑیاں نہیں لگائیں لیکن ہتھیاروں کے سائے میں لیے بنگلے سے باہر نکلے۔ باہر پولیس وین کی فرنٹ سیٹ پر سادہ لباس میں موجود شخص کو دیکھ کر میں ٹھٹک گیا۔ وہ عاکف وقاص تھا۔ چچا کا داماد اور

صدف کا خوش قسمت شوہر۔

☆☆☆

گرفتار ہو کر تھانے جاتے ہوئے میرے دل کی عجیب حالت تھی۔ صدف کے شوہر کے ہاتھوں گرفتار ہونا کتنی بڑی ذلت تھی یہ کچھ میں ہی محسوس کرسکتا تھا۔ میں پورا راستہ خاموش رہا۔ عاکف نے بھی مجھ سے کوئی بات نہیں کی لیکن تھانے پہنچ کر صورت حال یکسر بدل گئی۔ عاکف نے وہاں ایک کمرے میں مجھ سے تنہائی میں ملاقات کی۔

”مجھے افسوس ہے کامران صاحب کہ مجھے اس طرح آپ کو گرفتار کروا کر یہاں لانا پڑا لیکن امید ہے کہ آپ میری مجبوری کو سمجھ سکیں گے۔ مجھے قانونی تقاضے پورے کرنے کے لیے یہ فریضہ انجام دینا ہی تھا۔“ وہ بڑی اپنائیت سے میرے سامنے وضاحت پیش کر رہا تھا۔ میں بغیر کسی ردعمل کے سنتا رہا۔

”میرا انکل آپ کے لیے بہت پریشان تھے اور انہوں نے ہی مجھ سے اس کیس کو دیکھنے کی درخواست کی تھی۔ انہیں پورا یقین تھا کہ آپ پر قتل کا جھوٹا الزام لگا کر کوئی سازش کی گئی ہے۔ ان کے اس یقین نے ہی مجھے مجبور کیا کہ میں اس کیس کو خود ہینڈل کروں۔“ وہ حکومت کے ایک خفیہ ادارے سے وابستہ تھا اور اس طرح کے کیسز دیکھنا اس کا کام نہیں تھا لیکن ظاہر ہے اپنے سسر یعنی میرے چچا کی فرمائش بھی وہ رد نہیں کرسکتا تھا۔ چچا کی خود سے بے لوث محبت نے ایک بار پھر مجھے متحیر کردیا۔ وہ ایک ایسے شخص کے لیے پریشان تھے جو ان کی لاڈلی بیٹی کو چھوڑ کر اپنی قسمت بنانے کے لیے راہ بدل گیا تھا۔

”آپ کے عدالت سے فرار نے کیس کو خاصا خراب کردیا تھا تاہم میں نے تمام معلومات حاصل کر کے یہ اندازہ لگا لیا تھا کہ آپ کن کن مقامات کا رخ کرسکتے ہیں۔ ہانیہ حسین والی کوٹھی، آپ کے اپنے گھر اور فیصل صاحب کا بنگلا یہ تین جگہیں تھیں جہاں آپ کے جلد یا بدیر پہنچنے کا امکان تھا۔ میں نے تینوں جگہوں پر پولیس کے سپاہی تعینات کروا دیے کیونکہ میں نہیں چاہتا تھا کہ آپ کوئی حماقت کریں اور یہ کیس مزید الجھ جائے۔“ میری خاموشی سے بے نیاز وہ بولے جا رہا تھا۔

”آپ کا کیس جس طرح سامنے آیا اس میں مجھے ملازمہ نسرین کا کردار سب سے زیادہ اہم لگا کیونکہ اس کی گواہی نے ہی آپ کو قاتل ثابت کرنے میں سب سے اہم کردار ادا کیا تھا۔ کہنے کو تو یہ کہہ دیا گیا تھا کہ نشے کی زیادتی کی وجہ سے آپ اپنی بیوی کو قتل کرنے کے بعد وہاں سے فرار نہیں ہوسکے تھے لیکن میری عقل اسے تسلیم نہیں کرتی تھی۔ ایک عام آدمی بھی ہر حال میں سب سے پہلے موقع واردات سے فرار کی کوشش کرتا ہے لیکن آپ تو پولیس والوں کو اپنے بیڈروم میں سوتے ہوئے ملے تھے۔ بس اسی بنیاد پر میں نے نسرین کو گرفتار کروالیا۔ پہلے تو وہ آئیں بائیں شائیں کرتی رہی لیکن جب اسے لیڈی پولیس کے حوالے کیا گیا تو اس نے سب اگل دیا۔ وہ ہانیہ حسین کی سب سے خاص ملازمہ تھی اس لیے اسے علم تھا کہ وہ کب دبئی سے واپس آرہی ہے۔ چنانچہ اس نے اس شخص کو اطلاع دے دی جس نے اس خدمت کے عوض اسے بھاری رقم ادا کی تھی۔ نسرین کے خیال کے مطابق آپ کو ہانیہ صاحبہ کی واپسی پہنچا دینا کوئی ایسی بڑی بات نہیں تھی۔ اس پر صورت حال کی خطرناکی اس وقت کھلی جب ہانیہ قتل کردی گئی اور اسے جھوٹی گواہی دینے پر مجبور کیا گیا۔ وہ پھنس چکی تھی اس لیے نہ چاہتے ہوئے بھی اسے گواہی دینی پڑی۔ ادھر آپ کے ذہن میں یہ بات تھی کہ ہانیہ کے قتل میں آپ کو پھنسانے کے بعد فائدہ اس کے چچا کو حاصل ہوگا اس لیے آپ انہیں مجرم سمجھتے ہوئے ان سے حساب کتاب کرنے ان کے بنگلے پر پہنچ گئے۔ ڈیوٹی پر موجود سپاہیوں نے ہدایت کے مطابق آپ سے چھیڑ چھاڑ کرنے کے بجائے ہمیں اطلاع دے دی اور یوں ہم آپ کو یہاں لانے میں کامیاب ہوگئے۔“ وہ مجھے ساری تفصیل سنا رہا تھا۔

”نسرین کو رشوت دینے والا شخص کون تھا؟“ میں نے بے چینی سے سوال کیا کہ اسی سوال کے جواب میں ہانیہ کے قاتل کا نام جانا جاسکتا تھا۔

”معلوم نہیں۔“ عاکف نے اپنے شانے اچکائے۔ ”نسرین کا کہنا ہے کہ اس سے فون پر رابطہ کیا جاتا تھا جبکہ رقم ایک مخصوص وقت پر کوئی شخص کپڑے میں لپیٹ کر چار دیواری کے اندر ایک مخصوص جگہ پھینک گیا تھا۔“

”ایسا شخص کون ہوسکتا ہے؟ ظاہر ہے وہ کوئی ایسا فرد ہوگا جسے ہانیہ کی موت سے فائدہ پہنچے لیکن موجودہ حالات میں تو ایسا کوئی بھی نظر نہیں آتا۔“ میں نے پہلی بار لب کشائی کرتے ہوئے اپنی الجھن کا اظہار کیا۔

”ہاں بظاہر تو ایسا کوئی نہیں ہے لیکن میں آپ کو ایک دلچسپ حقیقت بتانا چاہتا ہوں۔“ عاکف کے چہرے پر ایک پراسرار مسکراہٹ تھی۔ میں ہمہ تن گوش ہوگیا۔

”ہانیہ حسین کے قتل کا فیصلہ بہت پہلے ہی ہوچکا تھا اور قربانی کا بکرا بنانے کے لیے بھی آپ کا انتخاب کرلیا گیا تھا لیکن اوریجنل پلاننگ کے مطابق چند ماہ بعد اس وقت ہونا تھا جب ہانیہ کا بچہ دنیا میں آجاتا اور آپ سمجھ سکتے ہیں کہ اس صورت میں فائدہ کس کا ہوتا۔“

”ہانیہ کے انکل فیصل کا۔“ میں نے بے ساختگی سے

جواب دیا۔

"بالکل صحیح لیکن ہوسکتا ہے کہ اس سے پہلے ہی کسی اور نے کام کر رکھا ہو اور فیصل ہاتھ ملتا رہ گیا۔ مجھ پر یہ اہم انکشاف فیصل کی بیٹی طوبیٰ نے کیا ہے۔ وہ اور ہانیہ بچپن کی سہیلیاں تھیں۔ اتفاقاً ایک دن طوبیٰ نے اپنے ماں باپ کے درمیان ہونے والی گفتگو سن لی لیکن فوری قدم اس لیے نہیں اٹھایا کہ فوری طور پر اسے ہانیہ کے قتل کا ڈر نہیں تھا۔ وہ شش و پنج میں مبتلا تھی کہ اس سلسلے میں کیا قدم اٹھائے۔ لیکن ہانیہ قتل ہوگئی تو اس سے برداشت نہیں ہوا اور اس نے اپنے والدین پر شک ظاہر کر دیا لیکن میں نے جان بوجھ کر فیصل کو نہیں چھیڑا اور صرف نگرانی کرواتا رہا کیونکہ میرے لیے یہ نکتہ بہت اہم تھا کہ فیصل کو ہانیہ کی موت کا فائدہ اسی صورت ہوسکتا تھا کہ وہ صاحب اولاد ہوتی اور بچے کی سرپرستی کے بہانے فیصل... فائدہ اٹھاتا رہتا۔ یہاں تو مجھے کوئی اور ہی ہاتھ ملوث نظر آرہا تھا۔"

"پھر کیا اندازہ لگایا آپ نے؟ میں تو ایسے کسی شخص سے واقف نہیں ہوں جو ہانیہ کی موت سے فائدہ اٹھا سکے۔" میں نے اپنی بے بسی کا اظہار کیا۔

"پہلے یہ بتائیے کہ آپ کو فرار کروانے میں کس شخص نے مدد دی؟" عاکف نے مجھ سے ایک بالکل مختلف سوال کیا تو میں چونک گیا اور فوری طور پر جواب نہیں دے سکا۔ رستم ملک نے میری مدد کی تھی اور میں اسے یوں پھنسوانا نہیں چاہتا تھا۔

"آپ یہ تو نہیں کہہ سکتے کہ آپ از خود فرار ہوئے تھے کیونکہ یہ کوئی ایسا آسان کام نہیں ہوتا۔ پھر آپ فرار کے چند گھنٹوں بعد ہی جس طرح پوری تیاری کے ساتھ فیصل کے بنگلے میں داخل ہوئے اس سے بھی ظاہر ہے کہ کوئی ہے جو آپ کی بھرپور مدد کرتا رہا ہے۔" عاکف کا انداز بے حد سنجیدگی لیے ہوئے تھا۔ میں اس سے مزید چھپانے کی ہمت نہیں کرسکا۔

"ہانیہ کے وکیل رستم ملک نے میری مدد کی کیونکہ فیصل نے ہانیہ سے محبت کے جرم میں ان کے جوان بیٹے کامران کو ٹریفک حادثے میں قتل کروا دیا تھا۔ وہ نہیں چاہتے تھے کہ کامران کی طرح میں بھی فیصل... کی کسی سازش کا نشانہ بنوں۔" میں نے آہستہ سے بتایا۔

"دوسرے الفاظ میں وہ اپنے بیٹے کے قاتل کو آپ کے ہاتھوں سے سزا دلانا چاہتے تھے۔" عاکف نے پُرسوچ لہجے میں کہا تو میں چپ رہ گیا۔ حقیقت اس کے برخلاف نہیں تھی۔ رستم ملک کا نام جاننے کے بعد عاکف نے مجھ سے کوئی سوال نہیں کیا۔

اس کے بعد مجھے پولیس اسٹیشن کے ہی ایک کافی بہتر کمرے میں رکھا گیا اور وہاں سلوک بھی بہتر ہی ہوتا رہا۔ بعد میں عاکف نے اس کیس پر کام کر کے جو کچھ نتائج حاصل کیے اس کا خلاصہ یہ تھا کہ ہانیہ کی دولت کے لالچ میں رستم ملک ہی نے اپنے بیٹے کو ہانیہ کے پیچھے لگایا تھا۔ کامران حقیقتاً ایک آوارہ مزاج لڑکا تھا جس نے نہایت کامیابی سے ہانیہ کی آنکھوں پر محبت کی پٹی باندھ دی لیکن فیصل رستم ملک جیسے چالاک اور ہوشیار آدمی کے بیٹے سے ہانیہ کی شادی کے لیے کسی طور تیار نہیں تھے۔ اسی دوران بد اتفاق سے شدید نشے میں گاڑی چلاتے ہوئے کامران حادثے کا شکار ہو کر چل بسا۔ رستم ملک نے مجھ سے جھوٹ بولا تھا کہ اس کے بیٹے کا قاتل فیصل... ہے۔ اگر ایسا ہوتا تو رستم کوئی اتنا بے بس آدمی نہیں تھا کہ خاموش بیٹھ جاتا۔ بہرحال کامران کی موت کے بعد جب فیصل کو ہانیہ کی حالت کے بارے میں علم ہوا تو اس نے اپنا منصوبہ تیار کرلیا۔ ہانیہ قتل ہوجاتی، میں پھانسی چڑھ جاتا تو وہی ہوتا جو بچے کا سرپرست بننے کے بعد عیش کرتا لیکن رستم ملک اس منصوبے کے آڑے آگیا۔ اسے کامران کے سامان میں سے ہانیہ کی ڈائری اور کچھ دوسری ایسی چیزیں مل گئی تھیں جنھوں نے اسے اپنا منصوبہ تیار کرنے کی راہ سجھائی۔ فیصل... اور رستم ملک دو ایسے افراد تھے جن کے درمیان ہانیہ کی جائداد کے حصول کے لیے رسّاکشی جاری تھی۔ رستم ملک نے اپنے بیٹے کی مدد سے ہانیہ کو زیر کر کے تقریباً کامیابی حاصل کرلی تھی لیکن فیصل... ہانیہ سے اپنے رشتے کا فائدہ اٹھا کر کامران اور ہانیہ کی شادی کی راہ میں رکاوٹ بنا رہا۔ ہوسکتا تھا کہ رستم ملک بیٹے کی مدد سے ہانیہ کو بغاوت کی راہ پر بھی ڈال دیتا لیکن کامران کو پیش آنے والے حادثے نے سب کچھ تبدیل کر ڈالا۔ گھر آئی لکشمی راہ بدل گئی اور اس کے حریف فیصل... کے لیے راہیں کھلنے لگیں۔ ہانیہ سے بے پناہ محبت جتانے والا فیصل... اگر اپنے منصوبے میں کامیاب ہوجاتا تو دولت پر اس کا قبضہ ہوتا۔

اعتذار

کراچی سے ہماری ایک محترم قاری نے بذریعہ فون "بارجیت" کے عنوان سے شائع ہونے والی کہانی کے ایک فقرے پر بجا اعتراض کیا ہے۔ ہم معذرت خواہ ہیں کہ مذکورہ فقرہ سہواً شائع ہوا۔ ہم تمام تر احتیاط کرتے ہیں کہ کسی لفظ یا فقرے سے کسی معزز قاری کی دل آزاری نہ ہو تاہم آئندہ اس ضمن میں مزید احتیاط کی جائے گی۔ (ادارہ)

چنانچہ رستم ملک نے بروقت کارروائی کی۔ بانیہ قتل ہوگئی، میں قاتل نامزد ہوگیا اور بعد میں اس نے مجھ سے ہمدردی جتا کر فیصل... کا کانٹا بھی ہمیشہ کے لیے نکالنے کی کوشش کی۔ اس رات اگر میں فیصل.... کو جذبات میں آکر قتل کر ڈالتا تو آج دوہرے قتل کے الزام میں سلاخوں کے پیچھے ہوتا۔ مجھ جیسے بے حیثیت آدمی کے کیس کی پیروی کے لیے ڈھنگ کا وکیل کرنا بھی مشکل ہوجاتا اور شاطر رستم ملک سکھ کی بانسری بجاتا ہوا بانیہ کی دولت پر عیش کرتا کیونکہ بانیہ کے بے اولاد مرنے کی صورت میں رقم جس ٹرسٹ کو منتقل ہوتی اس کا کرتا دھرتا خود رستم ملک ہی تھا۔ رستم ملک جس کردار کا مالک تھا اس کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا تھا کہ اس نے پناہ کی تلاش میں اس تک پہنچنے والی شگفتہ کو رکھیل بنا کر ایک گھر میں ڈال رکھا تھا۔ یہ اور بات کہ در در رسوا ہونے والی شگفتہ نے ہر روز ایک نئے بندے کے ہاتھوں لٹنے کے مقابلے میں ایک شخص تک محدود ہونے کو قبول کرلیا تھا اور اپنی موجودہ حیثیت پر تقریباً خوش ہی تھی لیکن رستم ملک کی مکاری کا تو کوئی جواب ہی نہیں تھا۔ ایک طرف وہ جوان بیٹے کی موت پر رنجیدہ ہونے کا ڈھونگ کرتا تھا تو دوسری طرف اس بیٹے کی نشانی کو دنیا میں آنے سے قبل ہی مٹا ڈالا تھا۔ اس نے اپنے مرحوم دوست عنایت سے بھی دھوکا کیا تھا حالانکہ عنایت حسین نے اپنے سگے بھائی سے زیادہ اسے عزت و اہمیت دی تھی۔ رستم ملک کو میں نے ٹی وی پروگرامز میں بھی دیکھا تھا۔ اپنی این جی او کے حوالے سے عورتوں پر ظلم و ستم اور ان کی عصمت دری کے واقعات بیان کرتے ہوئے وہ باقاعدہ آبدیدہ ہوجاتا تھا لیکن حقوق نسواں کے اس علم بردار نے اپنی پناہ میں آنے والی ایک لڑکی کو رکھیل بنا کر ثابت کر دیا تھا کہ اس کے ظاہر و باطن میں کتنا فرق ہے۔ سچی بات تو یہ ہے کہ جو شخص اتنا سخت دل ہو کہ اپنی جوان اولاد کے مرنے کے بعد بھی دولت کے لیے چالیں چلتا پھرے وہ دنیا میں کچھ بھی کرسکتا ہے جیسا کہ اس نے بانیہ کو قتل کر دیا تھا۔ بے چاری بانیہ نے اپنی دولت کی وجہ سے ہر ایک سے دھوکا کھایا اور اپنی دولت ہی کی وجہ سے ماری گئی۔ یہ دولت بھی عجیب شے ہے۔ پاس ہو تو بھی قاتل، نہ ہو تو بھی قاتل۔ بانیہ اپنی دولت کی وجہ سے قتل ہوئی تھی اور میں دولت کے نہ ہونے سے جیتے جی قتل ہوا تھا اور اپنی ماں کو بھی نہیں بچا سکا تھا۔ جی ہاں...... وہ کینسر سے تو نہیں مری تھیں لیکن مجھ پر قتل کا الزام سن کر انہیں ہارٹ اٹیک ہوگیا تھا اور وہ چند دن آئی سی یو میں رہنے کے بعد چل بسی تھیں۔ مجھے رہا ہونے کے بعد پہلا صدمہ ان کی میت کو کندھا دینے کا ہی اٹھانا پڑا تھا۔ یہ ثابت ہونے کے بعد کہ رستم ملک نے کرائے کے قاتل کی مدد سے بانیہ کو قتل کروایا تھا، مجھے رہا کر دیا گیا تھا۔ فیصل بھی اپنے تمام تر گھناؤنے کردار کے باوجود آزاد تھا کہ اسے اپنے منصوبے پر عمل کرنے کا موقع ہی نہیں ملا تھا۔

آج اس واقعے کو چار برس گزر گئے ہیں لیکن میں اس کے اثرات سے نہیں نکل سکا حالانکہ ان چار برسوں میں کیا کیا تبدیلیاں نہیں آگئیں۔ محبت میں قربانی دینے کا سلیقہ رکھنے والی صدف آج دو پیارے پیارے بچوں کی ماں ہے اور عاکف کی چاہت بھری قربت میں سکھ کی زندگی گزار رہی ہے۔ عاطفہ کی بھی شادی ہوچکی ہے اور سنبل اور شائلہ منگنی شدہ تھیں۔ جبران اپنی محنت اور لگن سے میڈیکل کالج میں پہنچ چکا ہے۔ وہ ایک ذہین طالب علم ہے اس لیے اسکالر شپ حاصل کرنے میں کامیاب رہا ہے۔ شام کے اوقات میں ایک دو بڑے گھرانوں میں ٹیوشنز دیتا ہے چنانچہ مجھ پر اس کا کوئی بوجھ نہیں ہے۔ البتہ شائلہ کے سلسلے میں، میں اپنی ذمے داریاں ادا کرنے کی بھرپور کوشش کرتا ہوں۔

رہائی کے بعد عاکف کے تعاون سے مجھے ایک ملازمت مل گئی تھی جو بہت پرکشش نہ سہی لیکن بری بھی نہیں ہے۔ باقی کسر میں اکیڈمی میں پڑھا کر پوری کرلیتا ہوں اور عزت سے گزارہ ہوجاتا ہے لیکن ایک احساس زیاں ہے جو جان نہیں چھوڑتا۔ صدف کو عاکف کے ساتھ دیکھتا ہوں تو دل کو کچھ ہونے لگتا ہے لیکن مجھے پوری ایمان داری سے یہ اعتراف ہے کہ صدف جیسی لڑکی اس جیسے نفیس انسان کو ڈیزرو کرتی ہے۔ اگر چچا کی درخواست پر عاکف میرے کیس پر توجہ نہ دیتا تو آج میں کہاں ہوتا؟ جیل میں یا پھر زندگی بچانے کی کوشش میں دربدر ہوتا۔ اس کا مجھ پر احسان ہے کہ آج میں کم از کم اپنوں کے درمیان تو موجود ہوں۔

چچا آج بھی روز اول کی طرح میرے ساتھ شفقت سے پیش آتے ہیں۔ وہ اکثر مجھ سے شادی کے لیے بھی اصرار کرتے ہیں لیکن میں انہیں ٹال جاتا ہوں۔ کیا کہوں اور کیسے بتاؤں کہ مجھ جیسے تہی داماں کے پاس کسی کو دینے کے لیے کچھ نہیں ہے۔ انسان کے پاس سب سے اہم متاع اپنی ذات کا غرور ہوتا ہے اور میں اس سے محروم ہوگیا تھا۔ شاید زندگی جینے کے لیے شارٹ کٹ تلاش کرنے والے مجھ جیسے ہر شخص کا یہی انجام ہوتا ہے۔ زندگی کو پوری جدوجہد اور خلوص کے ساتھ نہ برتو تو یہ جواب میں ایسا وار ضرور کرتی ہے جس کا گھاؤ گہرائی تک اثر کرتا ہے۔ اب یہ سمجھنے اور محسوس کرنے والوں پر ہوتا ہے کہ اس گھاؤ کو پہچان پاتے ہیں یا نہیں۔